

اثر نگارش
اہلِ تسلیم کی ایک جماعت

زیرِ نظر
استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد ۱۲

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی حوٹا شریف علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضائستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ



پیشکش: حوزہ علمیہ جامعہ المنتظر لاہور
جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب _____ تفسیر نمونہ
جلد _____ ۱۲
زیر نظر _____ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم _____ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
ناشر _____ مصباح القرآن ٹرسٹ، ارگنکارام بلڈنگ
شاہراہ قائد اعظم، لاہور
مطبع _____ معراج دین پرنٹرز، لاہور
تاریخ اشاعت _____ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
ہدیہ _____ 200/=

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴، الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۴۱۲۲۲۲۳-۴۳۱۴۳۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

عَرَضِ نَاشِرٍ

قارئین محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔
الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔ کلام حکیم اور عمدہ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر۔ تفسیر نمونہ۔ کو فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کروانے کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخ دلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ تالیفیں جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکر اللہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایا تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقیوی اعلیٰ اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی ”پیام قرآن“ از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور ”قرآن کا دائمی منشور“ از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل ایک جلدی قرآن پاک عمدہ حاضر کے مقبول اردو تراجم کے ساتھ زیر طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جدید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ ”انوار القرآن“ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہو گئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۲ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ۲۱ میں سے صفحہ ۱۳۵ تا ۲۲۶ اور جلد ۲۲ میں سے صفحہ ۲۷ تا ۳۲۸ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ دخان، سورہ جاثیہ، سورہ احقاف، سورہ محمد، سورہ فتح، سورہ حجرات، سورہ ق اور سورہ ذاریات کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مرد مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومین ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِہْدَاء

”مرکز مطالعات اسلامی و نجات نسل جوان“

جو تمام طبقات میں عموماً — اور

نوجوانوں میں خصوصاً

اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو قرآن مجید کے متعلق

بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ - قسّم



یہ تفسیر

حسب ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محمد جعفر امامی

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے داؤد الہامی

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے عبد الرسول حسنی

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے حسین شجاعی

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محمود عبد اللہی

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محسن قرآتی

حجۃ الاسلام و المسلمین آقائے محمد محمدی

پندرہ تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

مشہور مفسر علامہ طبرسی	از	۱- تفسیر مجمع البیان
دانشمند فقید بزرگ شیخ طوسی	از	۲- تفسیر تبیان
علامہ طباطبائی	از	۳- تفسیر المیزان
علامہ محسن فیض کاشانی	از	۴- تفسیر صافی
مرحوم عبدعلی بن جمعۃ الحویزی	از	۵- تفسیر نور الثقلین
مرحوم سید ہاشم بحرینی	از	۶- تفسیر برہان
علامہ شہاب الدین محمود آلوسی	از	۷- تفسیر روح المعانی
مختار رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبد	از	۸- تفسیر المنار
سید قطب مصری	از	۹- تفسیر فی ظلال القرآن
محمد بن احمد انصاری قرطبی	از	۱۰- تفسیر قرطبی
واحدی (ابوالحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)	از	۱۱- اسباب النزول
احمد مصطفیٰ مراغی	از	۱۲- تفسیر مراغی
فخر راز	از	۱۳- تفسیر مفاتیح الغیب
ابوالفتوح ازی	از	۱۴- تفسیر روح البیان



گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومین میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

تفسیر نمونہ جلد ۱۲

فہرست

		<u>سورہ دخان</u>	
۵۷	یہی موت ہے بس	۲۰	
۵۹	معاد کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ	۲۱	سورہ دخان کے مضامین
۶۱	آیت ۳۷ تا ۳۹	۲۲	سورہ دخان کی تلاوت کا ثواب
۶۱	آیا وہ بہتر ہیں یا قوم تبع؟	۲۳	آیت ۸ تا ۸
۶۳	قوم "تبع" کون تھی	۲۴	مبارک رات میں قرآن کا نزول
۶۷	آیت ۴۰ تا ۴۲	۲۵	قرآن دفعتاً نازل ہوا ہے یا تدریجی طور پر؟
۶۷	جدائی کا دن یا یوم الفصل	۳۱	قرآن مجید کا شب قدر سے رابطہ
۷۰	آیت ۴۳ تا ۵۰	۳۳	آیت ۹ تا ۱۶
۷۱	تھوہر کا درخت	۳۴	جب ہولناک دُھواں آسمان پر چھا جائے گا
۷۲	جسمانی اور روحانی سزائیں	۳۶	دخان مبین سے کیا مراد ہے؟
۷۶	آیت ۵۱ تا ۵۷	۴۰	آیت ۱۷ تا ۲۱
۷۷	پرہیزگار لوگ اور بہشت کی گونا گوں نعمتیں	۴۱	خود ایمان نہیں لاتے تو دوسروں کو تو نہ روکو
۸۰	پہلی موت کیا ہے؟	۴۵	آیت ۲۲ تا ۲۹
۸۳	آیت ۵۸، ۵۹		محلات، باغات اور خزانوں کو چھوڑ کر
۸۳	آپ بھی منتظر رہیں اور وہ بھی منتظر ہیں	۴۶	چلے گئے
۸۴	چند نکات	۵۳	آیت ۳۰ تا ۳۳
	<u>سورہ جاثیہ</u>	۵۴	بنی اسرائیل کی آزمائش
۸۶		۵۷	آیت ۳۴ تا ۳۶

- ۱۳۹ آیت ۳۲ تا ۳۷
 جس دن انسان کے بُرے اعمال ظاہر
 ہو جائیں گے۔

سُورَةُ احْقَافِ

- ۱۳۶ سُورہ احقاف کے مضامین
 ۱۳۷ اس سُورہ کے فضائل
 ۱۳۸ آیت ۳
 اس کائنات کی تخلیق حق کی بنا پر ہے
 ۱۳۹ آیت ۴ تا ۶
 گمراہ ترین لوگ
 ۱۴۰ آیت ۷ تا ۱۰
 کہہ دیجیے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں
 ۱۴۱ آیت ۱۱ تا ۱۴
 شانِ نزول
 کامیابی کی دو شرطیں
 ۱۴۲ آیت ۱۵ تا ۱۶
 اے انسان اپنے والدین سے نیکی کر
 چند اہم نکات
 ۱۴۳ ۱۔ بہشتی انسانوں کی صفات
 ۱۴۴ ۲۔ وصینا الانسان
 ۱۴۵ ۳۔ احسان کی تعبیر
 ۱۴۶ ۴۔ اولاد کی پرورش میں مال کی تکالیف
 ۱۴۷ ۵۔ قرآنی آیات میں خاندانی رشتے

- ۸۷ سُورہ جاثیہ کے مضامین
 ۸۸ سُورہ جاثیہ کی تلاوت کا ثواب
 ۸۹ آیت ۶
 ہر جگہ اس کی نشانیاں موجود ہیں
 ۹۰ آیت ۷ تا ۱۰
 گناہگار جھوٹے پر پھٹکار
 ۹۱ آیت ۱۱ تا ۱۵
 سب تیرے سرگردان اور تیرے
 زیر فرمان ہیں۔
 ۹۲ آیت ۱۶ تا ۲۰
 بنی اسرائیل کی ناشکری
 ۹۳ آیت ۲۱ تا ۲۳
 ان لوگوں کا مزاجینا ایک سانہیں
 چند اہم نکات
 ۹۴ ۱۔ خواہشاتِ نفسانی سب سے زیادہ
 خطرناک بُت ہیں۔
 ۹۵ ۲۔ شیطان کے لیے مؤثر ترین راستہ
 ۹۶ ۳۔ نفس پرستی ہدایت سے محرومی کا سبب
 ۹۷ ۴۔ خدا کے قائل
 ۹۸ ۵۔ ہوس پرستی کا انجام
 ۹۹ آیت ۲۴-۲۵
 دھریوں کے عقائد
 ۱۰۰ آیت ۲۶ تا ۳۱
 سب گھٹنے ٹیک دیں گے

۲۱۶ اولوالعزم پیغمبر کون تھے؟
 ۲۱۹ آنحضرتؐ صبر و استقامت کا مجسم نمونہ تھے

سُورہ محمدؐ

۲۲۳ سُورہ محمدؐ کے مضامین
 ۲۲۴ سُورہ محمدؐ کی تلاوت کی فضیلت
 ۲۲۵ آیت ۱ تا ۳
 ۲۲۶ مومن حق کی اور کافر باطل کی اتباع کرتے ہیں۔
 ۲۲۸ آیت ۲ تا ۶
 ۲۳۲ میدانِ جنگ میں ارادے کی پختگی ضروری ہے۔
 ۲۳۳ چند نکات
 ۲۳۸ ۱۔ شہداء کا بلند مقام
 ۲۳۸ ۲۔ اسلام میں جنگ کے مقاصد
 ۲۴۱ ۳۔ باضی میں غلاموں کا دردناک انجام
 ۲۴۳ (۱) اسلام غلامی کا موجد ہرگز نہیں
 ۲۴۴ ۴۔ اسلام اور غلامی
 ۲۴۵ ۵۔ غلاموں کی آزادی کے لیے اسلام کا مفہوم
 ۲۴۶ آیت ۷ تا ۱۱
 ۲۵۲ تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔
 ۲۵۵ آیت ۱۲ تا ۱۴
 ۲۶۰

۱۸۲ آیت ۱۷ تا ۱۹
 ۱۸۳ والدین کے حقوق پائمال کرنے والے
 ۱۸۶ یہ آیت بنی امیہ کی طرف کیسے تحریف کی گئی؟
 ۱۸۸ آیت ۲۰
 ۱۸۸ زہد اور آخرت کا ذخیرہ
 ۱۸۹ چند اہم نکات
 ۱۸۹ ۱۔ کفار کا جہنم کو پیش کیا جانا
 ۱۹۰ ۲۔ اذہبتم طبیباتکمہ کا مفہوم
 ۱۹۱ ۳۔ طبیبات کا وسیع مفہوم
 ۱۹۱ ۴۔ عذاب الہون
 ۱۹۱ ۵۔ اہل جہنم کے دو گناہوں کا تذکرہ
 ۱۹۱ ۶۔ غیر الحق
 ۱۹۳ آیت ۲۱ تا ۲۵
 ۱۹۵ قوم عاد اور تباہ کن آندھی
 ۲۰۰ آیت ۲۶ تا ۲۸
 ۲۰۱ تم قوم عاد سے زیادہ طاقتور نہیں ہو
 ۲۰۵ آیت ۲۹ تا ۳۲
 ۲۰۶ شانِ نزول
 ۲۰۸ جنات ایمان لاتے ہیں
 ۲۱۰ چند نکات
 ۲۱۱ ۱۔ مؤثر تبلیغ
 ۲۱۲ ۲۔ عظمت قرآن کی بہترین دلیل
 ۲۱۳ آیت ۳۳ تا ۳۷
 ۲۱۴ اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کریں

۳۰۲	کفر کی حالت میں مرنے والے نہیں بخشے جائیں گے۔
۳۰۳	ثواب ضائع ہونے کے اسباب
۳۰۳	۱- احسان جتانا اور تکلیف پہنچانا
۳۰۴	۲- عجب اور خود پسندی
۳۰۴	۳- حسد
۳۰۴	مرنے دم تک ایمان پر قائم رہنا بقائے عمل کی اہم ترین شرط ہے۔
۳۰۶	آیت ۳۵
۳۰۶	بے جا اور رسوا کن صلح
۳۰۹	آیت ۳۶ تا ۳۸
۳۱۰	اگر تم رُوگردانی کرو گے تو دوسرے لوگ آجائیں گے۔

سورہ فتح

۳۱۶	سورہ فتح کے مطالب
۳۱۷	سورہ فتح کی تلاوت کی فضیلت
۳۱۸	آیت ۱
۳۲۱	فتح المبین
۳۲۱	داستان "صلح حدیبیہ"
۳۲۲	"صلح حدیبیہ" کے سیاسی، اجتماعی اور مذہبی نتائج۔
۳۲۴	آیت ۲، ۳
۳۲۸	فتح مبین کے عظیم نتائج

۲۶۱	مؤمنین اور کفار کا انجام
۲۶۶	آیت ۱۵
۲۶۷	بہشت کی ایک اور صفت
۲۶۹	چند نکات
۲۶۹	۱- بہشت کی چار نہریں
۲۶۹	۲- شرابِ طہور
۲۶۹	۳- شراب نہ ہونے والے مشروبات
۲۷۰	۴- پھل کیوں؟
۲۷۰	۵- سقوا۔
۲۷۱	آیت ۱۶ تا ۱۹
۲۷۲	قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں
۲۷۵	کیا پیغمبر اسلام کی بعثت قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہے؟
۲۷۸	اشراط الساعة کیا ہیں؟
۲۸۲	آیت ۲۰ تا ۲۴
۲۸۳	وہ جہاد کے نام سے بھی ڈرتے ہیں
۲۸۳	چند نکات
۲۸۸	۱- قرآن فکر و عمل کی کتاب ہے
۲۹۰	۲- امام جعفر صادقؑ کی حدیث
۲۹۱	آیت ۲۵ تا ۲۸
۲۹۲	وہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے؟
۲۹۶	آیت ۲۹ تا ۳۱
۲۹۷	منافقین اندازِ گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں
۳۰۱	آیت ۳۲، ۳۳

۳۶۸	آیت ۱۹، ۱۸	چند نکات
۳۶۸	بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں سے خدا کی خوشنودی	۱۔ چند اہم سوالات کے جواب
	ایک نکتہ	۲۔ "ما تقدم" اور "ما تأخر" سے کیا مراد ہے؟
۳۶۱	"بیعت" اور اس کی خصوصیات	آیت ۲
۳۶۳	بیعت کی ماہیت	۳۳۳
۳۶۶	"بیعت" علی کے ارشادات میں	۳۳۳
۳۶۹	آیت ۲۰، ۲۱	یہ سکینہ کیا تھا؟
۳۶۹	صلح حدیبیہ کی مزید برکات	چند نکات
	ایک نکتہ	۱۔ بے مثال آرام و سکون
۳۸۲	جنگ خیبر کا ماجرا	۲۔ مراتب ایمان کا سلسلہ
۳۸۵	آیت ۲۲ تا ۲۵	۳۔ سکون کے دو اہم وسیلے
۳۸۶	اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی	آیت ۷ تا ۷
۳۹۲	آیت ۲۶	فتح مبین کا ایک اور نتیجہ
	تعصب اور حمیت جاہلیت، کفار کے لیے بزرگ ترین سدراہ	ایک نکتہ
۳۹۲	ایک نکتہ	خدا کے بارے میں سوئے ظن کون لوگ رکھتے ہیں؟
۳۹۵	حمیت جاہلیت کیا ہے؟	آیت ۱۰ تا ۱۰
۳۹۹	آیت ۲۷	پیغمبر کی حیثیت کا استحکام اور لوگوں کی پیغمبر کی حیثیت کا استحکام اور لوگوں کی
۴۰۰	پیغمبر کا سچا خواب	اس کے بارے میں ذمہ داری
۴۰۱	اس آیت میں کچھ قابل توجہ نکات	آیت ۱۱ تا ۱۱
۴۰۳	عمدۃ القضاء	پچھ رہ جانے والوں کی عذر تراشی
۴۰۵	آیت ۲۸، ۲۹	ایک نکتہ
۴۰۶	دشمنوں کے مقابلہ میں سخت گیر اور دوستوں کیلئے مہربان	گناہ کی توجیہ کرنا ایک عام بیماری ہے
		آیت ۱۵ تا ۱۵
		پچھ رہ جانے والے آمادہ طلب

۲۵۰ -۱۔ باغیوں سے جنگ کرنے کی شرائط

۲۵۲ -۲۔ اخوتِ اسلامی کی اہمیت

۲۵۶ آیت ۱۱، ۱۲

۲۵۷ شانِ نزول

استنزاء، بدگمانی، غیبت، تجسس اور بُرے

۲۵۸ [القاب سے یاد کرنا ممنوع ہے۔

چند نکات

۱۔ معاشرے میں کامل اور ہر پہلو سے

۲۶۳ [امن و امان۔

۲۶۵ -۲۔ تجسس نہ کرو

۲۶۶ -۳۔ غیبت بہت بڑا گناہ ہے

۲۶۸ -۴۔ غیبت کا مفہوم

۲۶۹ -۵۔ غیبت کا علاج اور اس سے توبہ

۲۷۰ -۶۔ استثنائی مواقع

۲۷۱ آیت ۱۳

۲۷۱ تفسیر

۲۷۱ تقویٰ بہترین انسانی صفت

نکتہ

۲۷۳ -۱۔ سچی اور جھوٹی قدریں

۲۷۷ -۲۔ تقویٰ کی حقیقت

۲۸۱ آیت ۱۴، ۱۵

۲۸۲ "اسلام" اور "ایمان" کا فرق

۲۸۵ آیت ۱۶ تا ۱۸

۲۸۵ شانِ نزول

چند نکات

۲۱۳ -۱۔ تنزیہ صحابہ کی داستان

۲۱۵ -۲۔ اسلامی باہمی محبت

سورہ حجرات

۲۱۸

۲۱۹

۲۲۰

۲۲۲

۲۲۳

۲۲۵

۲۲۲

۲۲۳

۲۲۵

۲۲۵

۲۳۰

۲۳۳

۲۳۴

۲۳۴

۲۳۷

۲۳۸

۲۴۰

۲۴۰

۲۴۸

۲۴۰

۲۴۰

۲۴۰

۲۴۵

۲۴۵

۲۴۷

۲۴۸

۲۴۸

۲۴۸

۲۴۸

۲۴۸

۲۴۸

۲۴۸

۲۴۸

۲۴۸

۲۴۸

سورہ حجرات کے مطالب

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

آیت ۵ تا ۵

شانِ نزول

پیغمبر کی بارگاہ کے آداب

چند نکات

۱۔ ادب افضل ترین سرمایہ ہے

۲۔ پیغمبر کی قبر کے پاس آواز بلند کرنا

۳۔ ہر چیز اور ہر جگہ انضباطِ اسلامی

آیت ۶ تا ۸

شانِ نزول

فاسقوں کی خبروں پر اعتبار نہ کرو

چند نکات

۱۔ خدا کی ہدایت اور ارادہ کی آزادی

۲۔ رہبری اور اطاعت

آیت ۹، ۱۰

شانِ نزول

مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں

چند نکات

- ۵۳۲ آیت ۳۱ تا ۳۷
- ۵۳۵ اے مجرمو! فرار کی کوئی راہ نہیں ہے!
- ۵۴۱ آیت ۳۸ تا ۴۰
- ۵۴۱ [آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا مردوں
کو زندہ کرنے پر قادر ہے
- نکتہ
- ۵۴۵ صبر و شکیبائی ہر کامیابی کا راز ہے
- ۵۴۷ آیت ۴۱ تا ۴۵
- قیامت کی صحیح (چیخ) کے ساتھ ہی
- ۵۴۸ سب زندہ ہو جائیں گے

سورہ ذاریات

- ۵۵۲ سورہ ذاریات کے مطالب
- ۵۵۳ اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت
- ۵۵۵ آیت ۱ تا ۶
- طوفان اور بارش لانے والے بادلوں
- ۵۵۶ [کی قسم
- ۵۵۹ آیت ۷ تا ۱۲
- قسم ہے آسمان کی اور اس کی زیبا شکنوں کی
- ۵۶۵ آیت ۱۵ تا ۱۹
- ۵۶۵ نیکو کار سحر خیزوں کا اجر
- چند نکات
- ۱۔ "خدا" اور "خلق خدا" کی طرف توجہ ۵۷۰
- ۲۔ شبِ نیکو عاشقانِ بربش راز کنند ۵۷۰

۴۸۶ مسلمان ہونے کا احسان مت جتلاؤ

سورہ ق

- ۴۹۰ سورہ ق کے مطالب و مضامین
- ۴۹۱ آیت ۱ تا ۵
- ۴۹۳ ہٹ دھرم مُنکرین اپنے کام میں سرگرداں ہیں
- ۴۹۸ آیت ۶ تا ۱۱
- ۴۹۹ ایک لمحہ کے لیے آسمان کی طرف دیکھو
- ۵۰۳ آیت ۱۲ تا ۱۵
- صرف تم ہی نہیں ہو جس کا دشمن سے
- ۵۰۴ [مقابلہ ہو؟
- ۵۰۷ آیت ۱۶ تا ۱۸
- تمہاری چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی وہ
- ۵۰۷ [لکھتے ہیں۔
- ایک نکتہ
- ۵۱۳ دوست مجھ سے بھی زیادہ میرے نزدیک ہے
- ۵۱۵ آیت ۱۹ تا ۲۲
- ۵۱۵ قیامت اور تیز بین آنکھیں
- چند نکات
- ۱۔ موت کی حقیقت
- ۲۔ سکرات موت
- ۳۔ موت حق ہے
- ۵۲۱ آیت ۲۳ تا ۳۰
- ۵۲۶ فرشتوں اور شیاطین میں سے انسان کے ہم نشین
- ۵۲۷

۳۔ سائل و محروم کا حق

۵۷۲

آیت ۲۰ تا ۲۳

۵۷۳

خدا کی نشانیاں تمہارے وجود کے اندر ہیں،
کیا تم دیکھتے نہیں؟

۵۷۳

چند نکات

۵۷۸

۱۔ اصمعی کی لرزادینے والی داستان

۵۷۹

۲۔ بہشت کہاں ہے؟

۵۸۰

۳۔ حق تعالیٰ کی نشانیوں سے فائدہ

"

اٹھانے کے لیے آمادگی ضروری ہے

۵۸۰

۲۔ رزق حق ہے

۵۸۲

آیت ۲۲ تا ۳۰

۵۸۳

ابراہیمؑ کے مہمان

ایک نکتہ

۵۸۷

پیغمبروں کی سخاوت

۵۸۹

آیت ۲۱ تا ۳۷

۵۹۰

قوم لوط کے بلا دیدہ شہر ایک آیت اور

۵۹۰

عبرت ہیں۔

۵۹۲

ایک نکتہ

۵۹۲

قوم لوط کے شہر کہاں تھے؟

۵۹۵

آیت ۳۸ تا ۴۶

۵۹۶

گذشتہ لوگوں کی تاریخ میں یہ سب عبرت

۵۹۶

کے درس ہیں۔

۶۰۱

چند نکات

۶۰۱

۱۔ عذابِ الہی کی مختلف صورتیں

۶۰۱ ۲۔ تولید کرنے والی اور بانجھ ہوائیں

۶۰۳

آیت ۴۷ تا ۵۱

ہم ہمیشہ آسمانوں کو وسعت دیتے
رہتے ہیں۔

۶۰۴

۶۱۰

آیت ۵۲ تا ۵۵

نصیحت کر کیونکہ نصیحت و تذکر
فائدہ مند ہے

۶۱۰

ایک نکتہ

حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ
دلوں کی ضرورت ہے

۶۱۲

۶۱۳

آیت ۵۶ تا ۵۸

قرآن کی نظر میں انسان کی خلقت کا مقصد

۶۱۴

چند نکات

۶۱۷

۱۔ خدا غنی مطلق ہے

۶۱۷

۲۔ وہ صاحبِ قوت اور متین ہے

۶۱۷

۳۔ جنوں کا ذکر پہلے کیوں؟

۶۱۸

۴۔ فلسفہ کی نظر سے خلقت کا فلسفہ

۵۔ انسان کی خلقت کے فلسفہ کے

سلسلہ میں اسلامی روایات پر

۶۲۲

ایک نظر۔

۶۲۳

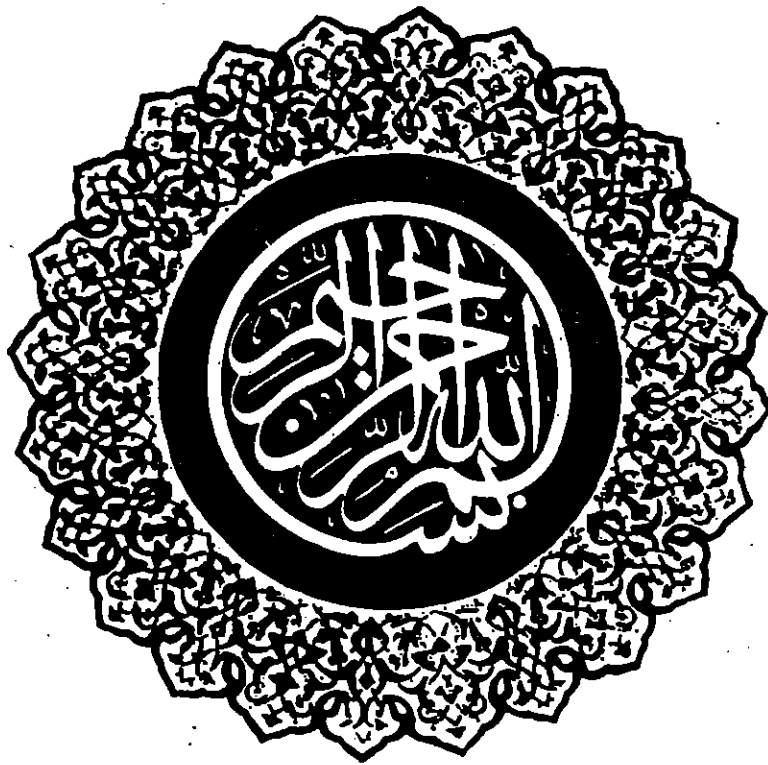
۶۔ ایک سوال کا جواب

۶۲۵

آیت ۵۹، ۶۰

۶۲۵

تیر بھی عذابِ الہی میں حصہ دار ہیں



اللهم صل على محمد وآل محمد
عجل فرجهم



تفسیر نمونہ جلد ۱۲

اس میں مندرجہ ذیلے سورتیں شامل ہیں

سورہ دخان: مکی سورت ہے اور اس کی ۵۹ آیات ہیں۔

پارہ ۲۵

سورہ جاثیہ: مکی سورت ہے اور اس کی ۳۷ آیات ہیں۔

پارہ ۲۵

سورہ احقاف: مکی سورت ہے اور اس کی ۳۵ آیات ہیں۔

پارہ ۲۶

سورہ محمد: مدنی سورت ہے اور اس کی ۳۸ آیات ہیں۔

پارہ ۲۶

سورہ فتح: مدنی سورت ہے اور اس کی ۲۹ آیات ہیں۔

پارہ ۲۶

سورہ حجرات: مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۸ آیات ہیں۔

پارہ ۲۶

سورہ ق: مکی سورت ہے اور اس کی ۴۵ آیات ہیں۔

پارہ ۲۶

سورہ ذاریات: مکی سورت ہے اور اس کی ۶۰ آیات ہیں۔

پارہ ۲۶ — ۳۰ تا ۳۱ پارہ ۲۷ — ۳۱ تا ۳۰

سُورَةُ دُخَانَ

* — مکہ میں نازل ہوئی

* — اس کی ۹۵ آیتیں ہیں

تامیخ آغانز

۳ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ

سورہ دخان کے مضامین

یہ ”حوامیم“ کی سات سورتوں میں سے پانچویں سورت ہے، چونکہ یہ سکتی سورتوں میں سے ہے لہذا انہیں کے مضامین کی مثال بھی ہے، یعنی اس میں زیادہ تر گفتگو مبداء، معاد اور قرآن پاک کے بارے میں کی گئی ہے۔ اس بارے میں اس کی آیات یوں منظم کی گئی ہیں کہ سوتے ہوئے اور غافل دلوں کو صبح و شکر بیدار کر رہی ہیں۔ اور انہیں ایمان، تقویٰ، حق اور عدالت کی دعوت دے رہی ہیں۔

اس سورت کو سات حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

① سورت کی ابتدا حروف مقطعات سے ہوتی ہے، پھر عظمت قرآن کا تذکرہ ہے اور اسی تذکرے میں پہلی بار بتایا گیا ہے کہ اس کا نژدہل شب قدر میں ہوا ہے۔

② اس کے دوسرے حصے میں خدا کی توحید کا ذکر ہے اور کائنات میں اس کی عظمت کی کچھ نشانیوں کا بیان ہے۔

③ اس کے اچھے خاصے حصے میں کفار کا انجام اور انہیں ملنے والے طرح طرح کے دردناک عذاب کا تذکرہ ہے۔

④ اس کے ایک اور حصے میں ان غفلوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے فرعون اور فرعون کے ساتھیوں اور بنی اسرائیل کے مقابلے میں فرعونوں کی زبردست شکست اور تباہی و بربادی کے تذکرے ہیں۔

⑤ آیات کے ایک حصے میں قیامت کے منظر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس دن جنہیوں کے دردناک عذاب اور پرہیزگاروں کے لیے رُوح پر درجزا کو بیان کیا گیا ہے۔

⑥ متعدد آیات میں تخلیق کائنات کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ”آدم“، زمین کی تخلیق بے فائدہ نہیں ہے۔

⑦ جس طرح سورت کا آغاز عظمت قرآن کے ذکر سے ہوا ہے، اسی طرح اس کا اختتام بھی قرآن کی عظمت کے تذکرے کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس سورت کی دسویں آیت میں ”دخان مبین“ کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے اس کا نام سورہ ”دخان“ ہے۔

سورة دغان کی تلاوت کا ثواب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

”من قرأ سورة الدخان ليلة الجمعة ويوم الجمعة بغي الله له بيتا
في الجنة“

”جو شخص شب جمعہ اور جمعہ کے دن سورہ دغان کی تلاوت کرے گا خدا اس کے لیے بہشت میں گھر
بنائے گا۔“

آپ ہی سے روایت ہے۔

”من قرأ سورة الدخان في ليلة، أصبح ليستغفر له سبعون الف ملك“
”جو شخص سورہ دغان کو رات کو پڑھے، ایسی حالت میں صبح کرے گا کہ ستر ہزار فرشتے اس کے لیے
استغفار کرتے ہوں گے۔“

ایک اور حدیث میں ابو حمزہ ثمالی نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے یوں روایت کی ہے:
”من قرأ سورة الدخان في فرائضه ونوافله بعثه الله من الأمنين يوم
القيامة، واظله تحت ظل عرشه، وحاسبه حسابا يسيرا، واعطى كتابه
بيمينه“

”جو شخص اپنی فرض و نفل نمازوں میں سورہ دغان کی تلاوت کرے گا خدا سے ان لوگوں کے ساتھ
محشور کرے گا جو قیامت کے دن امن و امان میں ہوں گے، اسے اپنے عرش کے زیر سایہ رکھے گا،
ان کا حساب آسان طریقے سے لے گا اور اس کے نامہ اعمال کو اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا۔“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ حَمْدٌ

۲۔ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ

۳۔ اِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبَرَّكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ

۴۔ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ

۵۔ أَمْراً مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ

۶۔ رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

۷۔ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوقِنِينَ

۸۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَائِكُمُ الْاَوَّلِينَ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حمد

۲۔ اس واضح کتاب کی قسم۔

۳۔ کہ جسے ہم نے مبارک رات میں نازل کیا، ہم ہمیتہ سے ڈرانے والے تھے۔

۴۔ وہ رات کہ جس میں ہر امر خدا کی حکمت کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔

۵۔ ہماری طرف سے ایک حکم، ہم ہی نے (محمد کو) بھیجا ہے۔

۴۔ یہ سب تمہارے پروردگار کی رحمت کی وجہ سے ہے، بیشک وہ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

۵۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے، اگر تم اہل یقین ہو۔

۸۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی جلاتا اور مارتا ہے، تمہارا پروردگار اور تمہارے اگلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے۔

تفسیر

مبارک رات میں قرآن کا نزول

اس سورت کے آغاز میں بھی گزشتہ چار اور آئندہ دو سورتوں کی طرح، جو مجموعی طور پر سات سورتیں بنتی ہیں، ہم ایک بار پھر حروف مقطعات (حُم) کی زیارت کر رہے ہیں۔ حروف مقطعات کے بارے میں ہم پہلے ہی تفصیل کے ساتھ مکمل تفسیر بیان کر چکے ہیں۔ لہ

خصوصی طور پر "حُم" کے بارے میں "حوامیم" میں سے پہلی سورت (مومن) اور پھر سورت "حُم سجدہ" کے آغاز میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس مقام پر بعض مفسرین نے "حُم" کی قسم کے معنی سے تفسیر کی ہے۔ یعنی اس جگہ دو قسمیں بیان ہو رہی ہیں، ایک اسی "حُم" کے ساتھ اور دوسری بعد کی آیت میں "کتاب مبین" کے ساتھ۔ دونوں قسمیں پے درپے اور ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔ ایک تو "حُم" کے حروف کے ساتھ قسم اور دوسری اس مقدس کتاب کے ساتھ قسم جس نے ان جیسے حروف سے ہی کتاب کی شکل اختیار کی ہے۔

اس سورت کی دوسری آیت میں، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، "قرآن مجید" کی قسم کھائی گئی ہے کہ "قسم ہے اس اشکار

لہ اس بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول سورت بقرہ کے آغاز، تفسیر نمونہ جلد ۲ سورت آل عمران کے آغاز اور جلد ۴ سورت اعراف کے آغاز کا مطالعہ فرمائیے۔

کتاب کی : (والکتاب المبین)۔

ایسی کتاب جس کے مندرجات روشن، جس کے معارف آشکار، جس کی تعلیمات زندہ، جس کے احکام تعمیری اور جس کے پروگرام منظم اور سچے تلے ہیں۔ ایسی کتاب جو اپنی حقانیت کی آپ دلیل ہے، آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ ۱۰
اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ قسم کس لیے کھائی گئی ہے؟ بعد والی آیت اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتی ہے یقیناً ہم نے قرآن مجید کو جو پیغمبر اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے (مبارک رات میں نازل کیا ہے۔) (انا انزلناه فی لیلة مبارکة)۔
”مبارک“ ”برکت“ کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے ہنود مند، نفع بخش اور دائمی۔

یہ کوئی رات ہے جو تمام اچائیوں کا مبداء اور پاییدار خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اکثر مفسرین نے اس سے شب قدر مراد لی ہے۔ یہ ایسی بابرکت رات ہے جس میں عالم بشریت اور دنیائے انسانیت کی تقدیر قرآن کے نزول کی وجہ سے نیا رنگ اختیار کر گئی ہے۔ ایسی رات جس میں مخلوق کا انجام اور اس کی تقدیر یکجا طور پر قلم بند کی جاتی ہے۔ جی ہاں! قرآن ایسی تقدیر ساز رات میں پیغمبر اکرم کے پاک و پاکیزہ دل پر اترا۔

یہ محنت بھی قابل ذکر ہے کہ آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام قرآن شب قدر میں نازل ہوا۔
لیکن اس کے نزول کا اصل مقصد کیا ہے؟ وہی جس کی طرف اسی آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ ”ہم ہمیشہ سے ڈرانے والے تھے“ (اٹاکنے کا مندرین)۔

یہ ہمارا دیرینہ طریقہ کار ہے کہ ہم اپنے انبیاء اور رسولوں کو ظالموں اور مشرکوں کے ڈرانے کے لیے مامور کرتے آئے ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتاب دے کر بھیجا بھی اسی سلسلے کی آخری کڑی ہے۔
یہ ٹھیک ہے کہ انبیائے کرام ”انذار“ (ڈرانے) کے لیے آتے ہیں وہ ”بشارت“ (خوشخبری دینے) کے لیے بھی ہوتے ہیں، لیکن چونکہ ظالم اور مجرم لوگوں کے لیے ان کی دعوت کی اصل بنیاد زیادہ تر انذار اور ڈرانے پر ہی استوار ہوتی ہے لہذا انذار پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

قرآن دفعتاً نازل ہوا ہے یا تدریجی طور پر؟

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور غور طلب ہیں :-

- ① ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید پیغمبر اسلام کی نبوت کے ۲۳ سالہ دور میں نازل ہوا تھا ہے پھر یہ کہ قرآن مجید کے مضامین ایسے ہیں جن کا پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی ۲۳ سالہ زندگی کے مختلف واقعات سے تعلق ہے، اگر ان واقعات کو قرآن مجید سے جدا لیا جائے تو وہ بے معنی ہو جائیں۔
اس صراحت کے پیش نظر یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآن مجید شب قدر میں مکمل طور پر کس طرح نازل ہوا؟

۱۰ قرآن مجید کی قسموں کے فلسفے اور ان کے اہداف و مقاصد کے بارے میں انشاء اللہ ہم آخری پارے کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے جس کی بہت سی آیات میں قسموں کا ذکر ہے۔

اس سوال کے جواب میں بعض مفسرین نے قرآن کا یہاں معنی آغاز نزول قرآن کیا ہے۔ لہذا یہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کا آغاز تو شب قدر میں ہوا اور ۲۲ سال تک اس کے نزول کا سلسلہ جاری رہا۔

لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں یہ تفسیر زیر نظر آیت اور دوسری آیات کے ظاہری معنی سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے اس بات کی طرف توجہ کرنا ہوگی کہ آیت میں ایک طرف تو یہ ہے کہ ”قرآن مبارک رات میں نازل ہوا ہے“ جب کہ دوسری طرف سورہ بقرہ کی ۱۸۵ ویں آیت میں ہے:

”نشهر رمضان الذي انزل فيه القرآن“

”ماہ رمضان میں رونے رکھا کر، یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اُترتا ہے۔“

جب کہ سورہ قدر میں ہے:

”انا انزلناه في ليلة القدر“

”ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے۔“

مجموعی طور پر ان آیات سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہ مبارک رات جو زیر تفسیر آیت میں ذکر ہوتی ہے شب قدر ہے جو ماہ رمضان المبارک میں ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر اور بھی کئی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کے تدریجی نزول سے پہلے اس سے آگاہ تھے، جیسا کہ سورہ طہ کی ۱۱۴ ویں آیت میں ہے:

”ولا تعجل بالقرآن من قبل ان يقضى اليك وحيه“

”وحی کے نازل ہونے سے پہلے قرآن کے بارے میں جلدی نہ کیجیے۔“

اسی طرح سورہ قیامت کی ۱۶ ویں آیت میں ہے:

”لا تحرك به لسانك لتعجل به“

”اپنی زبان کو قرآن کے لیے جلدی جلدی حرکت نہ دیں۔“

ان تمام آیات کو ملا کر جو نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کے دو طریقے تھے۔ ایک ”دفعتاً نزول“ کہ ایک ہی مرتبہ مجموعی صورت میں خدا کی طرف سے پیغمبر کے پاک دل پر ماہ رمضان المبارک کی شب قدر میں نازل ہوا اور دوسرا ”تدریجی نزول“ جو حالات، واقعات اور ضروریات کے پیش نظر ۲۲ سال تک آنحضرت پر نازل ہوتا رہا۔

اس بات کا ایک اور گواہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات میں ”انزال“ اور بعض میں ”نزول“ کا لفظ استعمال ہوا ہے بعض لغات سے معلوم ہوتا ہے کہ ”تنزیل“ کا اطلاق عام طور پر ایسے مواقع پر ہوتا ہے جہاں پر تدریجی طور پر نازل ہونا مقصود ہوتا ہے لیکن ”انزال“ کا مفہوم وسیع ہے جو تدریجی اور دفعتاً دونوں طرح کے نزول کا معنی دیتا ہے۔ لہ

اور یہ بات بھی بڑی لائق توجہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام آیات میں جہاں پر قرآن کے ماہ رمضان اور شب قدر میں نازل ہونے کا ذکر ہے وہاں پر ”انزال“ کے کلمہ کا استعمال ہوا ہے جو ”دفعاً نزول“ کے معنی سے ہم آہنگ ہے اور جہاں پر ”تدریجی نزول“ کی بات ہوئی ہے وہاں پر صرف ”تنزیل“ کا کلمہ استعمال ہوا ہے۔

لیکن قلب پیغمبر پر ”دفعاً نزول“ کس صورت میں ہوا؟ آیا اسی موجودہ قرآن کی صورت میں یا مختلف آیات اور سورتوں کی صورت میں؟ یا ان کے مجموعی مفہوم اور حقائق کی صورت میں؟

اس بارے میں بات پوری طرح واضح نہیں ہے۔ مندرجہ بالا قرینے سے صرف اسی قدر بات سمجھی جاسکتی ہے کہ ایک مرتبہ تو یہ قرآن پاک پیغمبر اسلام کے مقدس قلب پر ایک ہی رات میں نازل ہوا اور دوسری مرتبہ ۲۳ سال کی تدریجی مدت میں۔

② اس بات کا ایک اور شاہد یہ بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں قرآن کے لفظ سے مراد تمام قرآن مجید ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کا لفظ ”کُل“ اور ”جزو“ دونوں کے لیے بولا جاسکتا ہے، لیکن اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ جب تک اس لفظ کے ساتھ کوئی اور قرینہ موجود نہ ہو اس وقت تک اس سے مراد تمام قرآن مجید ہے۔

بعض مفسرین نے زیر تفسیر آیت کا مفہوم ”نزول قرآن کا آغاز“ لیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیت ماہ رمضان کی شب قدر میں نازل ہوئی۔ یہ تفسیر آیت کے ظاہری معنی کے بالکل خلاف ہے۔

اور اس سے بھی کم و تران لوگوں کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ”چونکہ سورہ حمد تمام قرآن کا پختہ اور خلاصہ ہے اور وہ شب قدر میں نازل ہوئی ہے، لہذا اسے ”انا انزلناہ فی لیلة القدر“ کہا گیا ہے“

یہ سب کے سب احتمالات قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہیں کیونکہ آیات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام قرآن شب قدر میں نازل ہوا ہے نہ کہ اس کا کچھ حصہ۔

یہاں پر ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ تفسیر علی بن ابراہیم میں حضرت امام محمد باقر، حضرت امام جعفر صادق اور امام موسیٰ کاظم علیہم السلام سے بہت سی روایات درج کی گئی ہیں جو انہوں نے ”انا انزلناہ فی لیلة مبارکة“ کی تفسیر میں ارشاد فرمائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے،

”ہی لیلة القدر انزل اللہ عزوجل القرآن فیہا الی البیت المعمور
جملة واحدة، ثم نزل من البیت المعمور علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
والہ فی طول عشرين سنة۔“

اس مبارک رات سے مراد شب قدر ہے، جس میں خدائے بزرگ و برتر نے قرآن کو ایک ہی مرتبہ ”بیت المعمور“ کی طرف نازل کیا پھر بیس سال کے عرصے میں رسول پاک پر تدریجی طور پر نازل فرمایا۔

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس روایت میں قرآن مجید کے دفعاً نزول کے بارے میں ”انزال“ اور تدریجی نزول کے بارے میں ”نزل“ کے کلمات استعمال ہوئے

ہیں۔ لے

”بیت المعمور کہاں واقع ہے؟ اس بارے میں متعدد روایات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ آسمانوں میں خانہ کعبہ کے مقابل میں ایک گھر ہے جو فرشتوں کی عبادت گاہ ہے، اور روزانہ ستر ہزار فرشتے اس میں داخل ہوتے ہیں، جو قیامت تک اس کی طرف واپس نہیں پلٹیں گے۔

اس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ طور کی آیت نمبر ۲ میں بیان ہوگی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ”بیت المعمور“ کون سے آسمان میں واقع ہے؟ اس بارے میں مختلف روایات میں ہے کہ وہ چوتھے آسمان پر ہے اور بعض روایات میں ہے کہ آسمان اول (آسمان دنیا) میں ہے اور بعض دوسری روایات میں ساتویں آسمان سے متعلق بتایا گیا ہے۔ مرحوم طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں سورہ طور کی تفسیر میں حضرت علی علیہ السلام بیت المعمور کے بارے میں یہ روایت نقل کی ہے:

”هو بیت فی السماء الزابحة بحیال الکعبة معمرة الملائكة بما
یکون منها فیہ من العبادۃ، ویدخلہ کُل یوم سبعون الف
ملائکۃ لا یعودون الیہ ابداً“

”وہ خانہ کعبہ کے مقابل میں چوتھے آسمان میں واقع ہے۔ روزانہ ستر ہزار ایسے فرشتے اس میں داخل ہوتے ہیں کہ جو پھر تا ابد اس کی طرف نہیں آئیں گے“ لے

صورت حال خواہ کچھ ہو، قرآن مجید کا شب قدر میں مکمل طور پر بیت المعمور کی طرف نازل ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ رسول پاکؐ اس سے باخبر تھے، کیونکہ آنحضرتؐ لورج محفوظ جو خدا کا مخفی علم ہے کے سوا دوسرے تمام عالموں سے آگاہ ہیں۔ بالفاظ دیگر تمام مذکورہ آیات سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم دو مرتبہ آنحضرتؐ پر نازل ہوا۔ ایک مرتبہ ”دفننا نزول“ کی صورت میں اور دوسری مرتبہ ”تدریجی نزول“ کی صورت میں جو آپؐ پر ۲۲ سال کے عرصے میں نازل ہوتا رہا۔ یہ بات مندرجہ بالا حدیث کے منافی بھی نہیں ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن پاک شب قدر میں بیت المعمور پر نازل ہوا، کیونکہ پیغمبرؐ کا قلب مبارک، ”بیت المعمور سے بھی تو آگاہ ہے۔“

اس سوال کے جواب سے ایک اور سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید شب قدر میں نازل

لے تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۶۲۔ اس حدیث میں قرآن کے تدریجی نزول کی مدت میں سال بتانے کی گئی ہے، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ نبوت کا دورانہ کہ جس میں قرآن نازل ہوتا رہا ۲۲ سال ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تعبیر یا تو راوی کی طرف سے غلط فہمی کی وجہ سے ہے یا پھر حدیث کے نسخوں میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

لے تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۶۳۔ مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار جلد ۵ ص ۵۵ پر ”بیت المعمور“ سے متعلق روایات کو جمع کیا ہے۔

ہوا ہے تو پھر آنحضرتؐ کی تاریخ بعثت سے کس طرح مطابقت رکھتا ہے؛ جبکہ مشہور روایات کی بنا پر تاریخ بعثت ۲۷ رجب ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کا دفعتاً نزول تو ماہ رمضان المبارک میں ہوا ہے اور ۲۷ رجب المرجب میں اس کا تدریجی نزول شروع ہوا ہے۔ لہذا اس صورت میں کوئی مسئلہ غیر واضح نہیں رہتا۔

بعد کی آیت میں شب قدر کی توصیف اور توضیح ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: شب قدر وہ رات ہے جن میں ہر امر خدا کی حکمت کے مطابق تفصیل کے ساتھ مرتب ہوتا ہے۔ (فیہا یفرق کلّ امر حکیم)۔

”یفرق“ کے لفظ کے ساتھ اس بات کی طرف ارشاد کیا گیا ہے کہ اسی رات میں تمام تقدیر ساز امور اور مسائل مقدر میں کچھ دیئے جاتے ہیں اور ”حکیم“ کا لفظ اس خدائی تقدیر کے استحکام کے ناقابل تغیر اور اس کے حکم ہونے کو بیان کر رہا ہے۔ البتہ قرآن مجید میں یہ صفت عام طور پر خداوند تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتی ہے اگر کسی اور چیز کو اس سے متصف کریں تو یہ اس کی تاکید کے لیے ہو گا۔

یہ بیان ان بہت سی روایات کے ساتھ ہم آہنگ ہے جن میں کہا گیا ہے کہ شب قدر میں تمام لوگوں کی سال بھر کی تقدیر کچھ دی جاتی ہے اور رزق اور عمر وغیرہ بھی اسی رات کو عین کر دیئے جاتے ہیں۔

شب قدر سے متعلق تمام امور پر سورہ قدر کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ انسان کا اپنا ارادہ خدا کی تقدیر اور مشیت سے متصادم نہیں ہوتا۔

بعد کی آیت میں اس بات کی ایک بار پھر تاکید کی گئی ہے کہ قرآن مجید خدا کی جانب سے ہی ہے، چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: شب قدر میں قرآن کا نزول ہماری طرف سے ایک حکم تھا اور ہم ہی نے پیغمبر اسلام کو مبعوث کیا اور بھیجا ہے (امرًا من عندنا انا کنا مرسلین)۔ ۲۷

۱۷ تفسیر المیزان میں اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ، اس کائنات کے امور دو مراحل پر مشتمل ہیں۔ ایک اجمال اور ابہام کا مرحلہ جسے ”حکیم“ سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرا تفصیل اور کثرت کا مرحلہ جسے ”یفرق“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (جلد ۱۸ ص ۱۲۱)

۱۸ ”امرًا من عندنا...“ کا جملہ اعراب کے لحاظ سے کیا واقعہ ہو رہا ہے اور گزشتہ آیات کی کس بحث سے اس کا تعلق ہے؟ اس بارے میں کئی احتمال ذکر کئے گئے ہیں جن میں سے زیادہ مناسب یہی ہے کہ ”امرًا من عندنا“ ”انزلنا“ میں موجود منقول کی ضمیر کا مال واقع ہو رہا ہو۔ جس کا معنی یہ ہو گا کہ ”ہم نے قرآن کو نازل کیا جب کہ یہ ہماری طرف سے ایک امر ہے۔“ اور اس صورت میں ”انا کنا مرسلین“ کے جملہ سے مکمل طور پر ہم آہنگ بھی ہے جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا تذکرہ ہے۔

نیز یہ احتمال بھی ہے کہ یہ ”کل امر حکیم“ کی دماحت ہو اور اس کی نصب اختصاصی ہے اور ایسی صورت میں اس کا معنی یہ ہو گا ”اعنی بهذا الامرًا حاصلًا من عندنا“

پھر نزول قرآن، ارسال پیغمبر اور شب قدر میں تمام چیزوں کی تقدیر کے اصل سبب کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ سب تمہارے پروردگار کی رحمت کی وجہ سے ہے (رحمة من ربك)۔

جی ہاں! اس کی ناپیدائش رحمت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے حال پر نہ چھوڑ دے۔ بلکہ ان کے لیے کوئی پروگرام اور رہنما بھیجے تاکہ وہ ان کی ہر ہر موڑ پر ارتقا اور خدا کی جانب رہنمائی کرے۔ بنیادی طور پر کائنات کی ہر چیز اس کی بے انتہا رحمت سے مینن یاب ہو رہی ہے، لیکن انسان باقی چیزوں سے زیادہ اس رحمت کا شمول ہے۔

اسی آیت کے آخر میں اور بعد کی دوسری آیات میں خداوند عالم کی سات صفات کا تذکرہ ہے جو سب کی سب اس کے مقام وحدانیت کو بیان کرتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ بے شک بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (انہ هو السميع العليم)۔

وہ اپنے بندوں کی دعاؤں اور درخواستوں کو سنتا ہے اور ان کے رازوں سے آگاہ ہے۔

پھر تیسری صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ ایسا خدا ہے جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے۔ اگر تم اہل یقین ہو۔ (رب السماوات والارض وما بينهما ان كنتم موقنین)۔ یہ چونکہ بہت سے مشرکین کئی خداؤں اور کئی ارباب کے قائل تھے اور ہر نوع کے لیے علیحدہ رب کا عقیدہ رکھتے تھے اور ممکن تھا کہ گذشتہ آیت میں ”ربك“ (تیرا رب) سے ان کے دل میں یہ توہم پیدا ہو کہ محمد مصطفیٰ کا رب اور ہے اور دوسری چیزوں کا رب اور ہے۔ لہذا اس آیت میں ”رب السماوات والارض وما بينهما“ کہہ کر باقی تمام خداؤں پر خط تیغ کھینچ دیا گیا ہے اور واضح کر دیا گیا ہے کہ تمام موجودات عالم کا ایک ہی رب ہے۔

”ان كنتم موقنین“ (اگر تم اہل یقین ہو) کا جملہ جو جملہ بشرطیہ کی صورت میں آیا ہے، یہ سوال ذہن میں پیدا کر رہا ہے کہ آیا پروردگار عالم کی ربوبیت ایسی شرط سے مشروط ہے؟

لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جملے کے ذکر سے مندرجہ ذیل دو امور میں سے کوئی ایک یا دونوں امور مقصود ہیں۔

ایک تو یہ کہ اگر تم یقین کے طلب گار ہو تو اس کا واحد راستہ یہی ہے۔ واحد راستہ یہی ہے کہ تم پروردگار عالم کی ربوبیت مطلقہ کے بارے میں غور و فکر سے کام لو۔

دوسرا یہ کہ ”اگر تم اہل یقین ہو تو بہترین یقین پیدا کرنے کا مقام یہی ہے، اگر تم تمام کائنات میں خدا کی ربوبیت کے آثار

لے ”رحمة من ربك“ یا تو ”انا انزلنا“ کا مقول لہ ہے یا ”يفرق كل امر حكيم“ کا مقول لہ ہے یا دونوں کا مقول لہ ہے۔

لے اس آیت میں ”رب“ کا کلمہ گزشتہ آیت میں مذکور ”رب“ کا بدل ہے۔

لے ان كنتم موقنین“ جملہ بشرطیہ ہے اور اس کی جزار مخدوف ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے۔

ان كنتم من اهل اليقين او في طلب اليقين علمتم ان الله رب السماوات

والارض وما بينهما

دیکھ رہے ہو اور ہر ذرے کے دل کو شگافتہ کر کے اس میں اس کی ربوبیت کے نشان پاتے ہو، پھر بھی اس کی ربوبیت پر یقین نہیں رکھتے تو پھر کائنات کی کس چیز پر ایمان اور یقین پیدا کرو گے؟

چوتھی، پانچویں اور چھٹی صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی جلاتا اور مارتا ہے (لا الہ الا ہو حی ویمیت)۔ لہ

تمہاری زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے، تمہارا اور تمہارے کائنات کا پروردگار وہی ہے۔ اسی لیے اس کے بغیر کوئی معبود ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، آیا جس کے پاس نہ تو ربوبیت کا عہدہ ہے اور نہ ہی موت و حیات کا مالک ہے، وہ معبود بن سکتا ہے؟

ساتویں اور آخری صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار اور تمہارے اگلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے (ربکم ورب ابائکم الاولین)۔

اگر بت پرستی کے جواز کے لیے تمہاری دلیل یہ ہے کہ تمہارے باپ دادا ان کی پرستش کیا کرتے تھے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا پروردگار بھی خدائے وحدہ لا شریک ہے، لہذا تمہارا اپنے آباؤ اجداد سے یہ تعلق بھی اسی بات کا متقاضی ہے کہ خدائے واحد و یحیتا کے علاوہ کسی کے آستان پر سر نہ جھکاؤ اور اگر ان کا بھی اس کے علاوہ کوئی اور راستہ تھا تو وہ بھی یقیناً غلطی پر تھے۔

واضح سی بات ہے کہ موت اور حیات کا تعلق بھی پروردگار عالم کی تدبیر سے ہے۔ اگر اس نے اسے خصوصی طور پر ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ اسے خاص طور پر اہمیت دینا ہے اور حتمی طور پر معاد کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید نے موت و حیات کا مسئلہ بیان کیا ہے، بلکہ کئی مرتبہ اسے خداوند عالم کے مخصوص انعام میں سے ایک نعل کی صورت میں بیان کیا جا چکا ہے کیونکہ یہ انسانی زندگی کا تقدیر ساز اور کائنات کا ایک پیچیدہ ترین مسئلہ ہے اور قدرت الہی کی ایک روشن ترین دلیل ہے۔

قرآن مجید کا شب قدر سے رابطہ

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں اشارے کے طور پر اور سورۃ قدر میں صراحت کے ساتھ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ قرآن مجید شب قدر میں نازل ہوا ہے اور یہ بات کس قدر معنی اخیز ہے۔

لہ "لا الہ الا ہو" کا جملہ ممکن ہے کہ جملہ استینافیہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بتدرج محذوف کی خبر ہو جس کی تقدیر یہ ہو۔

"ہو لا الہ الا ہو"

لیکن پہلا امکان زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یہ ایسی رات ہے جس میں بندوں کی تقدیر اور رزق روزی مقدر کی جاتی ہے، اسی رات کو رسول پاک کے مقدس اور پاکیزہ قلب پر قرآن نازل ہوا۔ آیا اس کا یہ معنی تو نہیں کہ تم لوگوں کی تقدیر اور انجام اسی آسمانی کتاب کے مندرجات ہی سے مربوط اور متعلق ہے اور ان کا آپس میں نزدیکی رابطہ ہے۔

آیا اس کلام کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ صرف تمہاری مصونی زندگی کا ہی نہیں بلکہ مادی زندگی کا بھی اس سے الٹا رابطہ ہے، شہنشاہ پر تمہاری آزادی، سرفرازی اور استقلال اور تمہاری بستیوں اور شہروں کی آبادی اسی سے وابستہ ہے۔ جی ہاں! جس رات میں کائنات کی تقدیر متعین ہوتی ہے اسی رات میں یہ نازل ہوا ہے۔

- ۹۔ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ ○
 ۱۰۔ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ○
 ۱۱۔ يَغْشى النَّاسُ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ○
 ۱۲۔ رَبَّنَا اكشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ○
 ۱۳۔ اِنِّى لَهُمُ الذِّكْرَى وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ○
 ۱۴۔ ثُمَّ تَوَلَّوْا عُنُقَهُ وَقَالُوا مَعَلَمْ مَجْنُونَ ○
 ۱۵۔ اِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنْ كُمْ عَايِدُوْنَ ○
 ۱۶۔ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَى اِنَّا مُنْتَقِمُونَ ○

ترجمہ

- ۹۔ لیکن یہ لوگ تو شک میں پڑے (حقائق کے ساتھ) کھیل رہے ہیں۔
 ۱۰۔ اس دن کا انتظار کر کہ جب آسمان سے ظاہر بظاہر دھواں نکلے گا۔
 ۱۱۔ وہ تمام لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ دردناک عذاب ہے۔
 ۱۲۔ (وہ کہیں گے) پروردگارا! ہم سے عذاب کو دُور کر دے کہ ہم ایمان لاتے ہیں۔
 ۱۳۔ وہ کس طرح سے اور کہاں نصیحت حاصل کریں گے جب کہ ان کے پاس (روشن معجزات اور دلائل کے ساتھ) آشکار رسول آچکا۔
 ۱۴۔ پھر وہ اس سے روگردان ہو کر کہنے لگے یہ تو دیوانہ ہے جسے دوسرے لوگ

سکھاتے پڑھاتے ہیں۔

۱۵۔ ہم تھوڑے سے عرصہ کے لیے عذاب کو ٹال دیتے ہیں، لیکن تم اپنے کاموں کی طرف لوٹ جاتے ہو۔

۱۶۔ ہم ان سے پورا بدلہ تو اس دن لیں گے جس دن سخت گرفت کریں گے، یقیناً ہم ان سے بدلہ لے کر رہیں گے۔

تفسیر

جب هولناك دھواں آسمان پر چھا جائیگا

گزشتہ آیات میں اس باب کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی کہ اگر وہ یقین کے خواہاں ہیں، تو یقین کے حصول کے اسباب بہت ہیں اور فراہم بھی ہیں۔ زیر تفسیر آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ یقین اور حق کے طلب کار نہیں ہیں، بلکہ وہ تو شک میں پڑے (حقائق کے ساتھ) کھیل رہے ہیں؛ (بل ہم فی شک یلعبون)۔

اگر وہ اس آسمانی کتاب اور آپ کی نبوت کی حقیقت میں شک کرتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ ہے، بلکہ اس لیے شک کرتے ہیں کہ اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے، بلکہ ہنسی مذاق میں بات کو ٹال دیتے ہیں کبھی تو اس کا تسخر اڑاتے ہیں اور کبھی از خود تجاہل عارفانہ کا اظہار کرتے ہیں اور نت نئے کھیل میں لگے رہتے ہیں۔

”یلعبون“ لعب ”لعب“ کے مادہ سے ہے جس کا معنی ”مفردات“ میں ”راغب“ کے بقول وہ ”لعب وہن“ (تھوک) ہے جو منہ سے ٹپکتا ہے۔ چونکہ کھیل اور مذاق کے موقع پر انسان کا اپنے کام سے کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا، لہذا اسے ایسی تھوک سے تشبیہ دی گئی ہے جو انسان کے منہ سے ٹپکتی ہے۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ مسائل پر سنجیدگی سے غور و خوض انسان کو حقائق کی شناخت میں بہت مدد دے سکتا ہے اور غیر سنجیدہ طریقہ کار حقائق کے چہرے پر پردے ڈال دیتا ہے۔

بعد کی آیت میں رسول پاک کو مخاطب کرتے ہوئے ان ہٹ دھرم اور سخت منکرین کو دھمکی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس دن کا انتظار کرو کہ جس دن آسمان سے ظاہر بننا ہر دھواں نکلے گا۔ (فان رقب یوم تأقی السماء بدخان مبین)۔

ایسا دھواں جو تمام لوگوں کو ڈھانک لے گا۔ (یغشی الناس)۔

پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ خدا کا دردناک عذاب ہے۔ (ہذا عذاب الیم)۔

وحشت اور اضطراب ان کے تمام وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ ان کی آنکھوں سے تمام پردے ہٹا دیئے جائیں گے، اور وہ اپنی عظیم غلطیوں سے واقف ہو جائیں گے۔ بارگاہ ایزدی کی طرف رجوع کر کے کہیں گے: پروردگارا! ہم سے عذاب دور کر دے کہ ہم ایمان لاتے ہیں۔ (ربنا اکشف عنا العذاب انا مؤمنون)۔

لیکن ان نابکاروں کے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ کس طرح سے اور کہاں نصیحت حاصل کریں گے جب کہ ان کے پاس روشن معجزات اور دلائل کے ساتھ رسول آپکا (انٹی لہم الذکر ای وقد جائئہم رسول مبین)۔

ایسا پیغمبر جو خود بھی ظاہر اور آشکار تھا اور اس کی تعلیمات، پروگرام، دلائل اور معجزات بھی واضح تھے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ اس رسول کے سامنے تسلیم خم کر دیتے، خداوند واحد لا شریک کی ذات پر ایمان لے آتے اور اس کے احکام کو جان و دل سے قبول کرتے، اس سے روگردان ہو کر کہنے لگے یہ تو دیوانہ ہے جسے دوسرے لوگ ایسی باتیں سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ (ثم توتواعنه وقالوا معلم مجنون)۔

کبھی وہ کہتے تھے کہ ایک ”رومی غلام“ انبیاء کے قصے کہانیاں سن کر انہیں بتاتا ہے اور یہ آیات انہی قصوں کی بنیاد پر گھڑی گئی ہیں۔ خداوند عالم اس بارے میں فرماتا ہے:

”ولقد علم انہم یقولون، انما یعلمہ بشر لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین“

”ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ کوئی بشر اسے تعلیم دیتا ہے، حالانکہ جس شخص کی طرف یہ الحادی نسبت دیتے ہیں، اس کی زبان عجمی ہے اور اس کی زبان واضح اور کھلم کھلا عربی ہے“

(نحل - ۱۰۳)

کبھی کہتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہیں اور اسی اختلال کے سبب ان سے یہ باتیں سرزد ہو رہی ہیں، یعنی وہ دماغی توازن کھو چکے ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: ہم تھوڑے سے عرصے کے لیے تم سے عذاب کو ٹال دیتے ہیں، لیکن تم عبرت حاصل نہیں کرتے اور پھر اپنے کاموں کی طرف لوٹ جاتے ہو (انا کاشفوا العذاب قلیلاً انکم عاٹدون)۔

یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کبھی وہ عذاب کے چنگل میں پھنس جاتے تو اپنے کئے پر اظہارِ ندامت کرتے اور اپنی کرتوتوں پر نظر ثانی کرنے کی ٹھان لیتے جو عارضی ہوتی تھی، لیکن جو بنی طوفانِ حوادث تم جاتا تو وہ اپنی سابقہ کرتوتوں میں لگ جاتے۔

زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم ان سے پورا بدلہ تو اس عظیم اور سخت سزا کے دن لیں گے، یقیناً ہم بدلہ لے کر رہیں گے۔ (ایوم نبطش البطشۃ الیکبری انا منتقمون)۔

لہ اس جملے کی ترکیب میں بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔ جس احتمال کو اکثر مفسرین نے قبول کیا ہے اور آیت کے (بقیہ ماشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

”بطش“ (بروزن” نقش) کا معنی کسی چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا ہے۔ یہاں پر سخت سزا کے لیے گرفت میں لینے کے معنی میں ہے اور ”بطشة“ کو ”کبریٰ“ سے موصوف کرنا اس سزا کی شدت اور سنگینی کی طرف اشارہ ہے، جو ان لوگوں کے انتظار میں ہے۔

خلاصہ یہ کہ بالفرض اگر ان کی عارضی سزائیں کمی واقع ہو جائے یا عارضی طور پر ختم ہو جائے تو شدید اور سخت ترین سزا ان کے انتظار میں ہے، جس سے راہ فرار اختیار نہیں کی جاسکتی۔

”منتقمون“ ”انتقام“ کے مادہ سے ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اس کے معنی سزا دینا ہے۔ اگرچہ یہ کلمہ آج کل کے روزمرہ کے استعمال میں ایک اور معنی اختیار کر چکا ہے اور وہ ہے عتق کی آگ بھانے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے سزا دینا۔ لیکن اس کے لغوی معنی میں یہ چیزیں نہیں پائی جاتیں۔

”دخان مبین“ سے کیا مراد ہے؟

ان آیات میں مذکور ”دخان“ (دھوئیں) سے کیا مراد ہے جو عذاب الہی کی ایک علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آرا ہیں۔ ان میں سے دو نظریے اہم ہیں:

① اس سزا کی طرف اشارہ ہے، جس میں کفار قریش پیغمبر اکرم کے زمانے میں مبتلا ہوئے تھے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں نفرین اور بددعا کی تھی اور کہا تھا:

”اللہم سنن کسفی یوسف“

”خداوند! انھیں یوسف علیہ السلام کے زمانے کی سی قحط سالی اور خشک سالی میں مبتلا فرما“

اس کے بعد قحط سالی مکہ کے اطراف میں ایسی حکم فرما ہوئی کہ مکہ کے لوگ بھوک اور پیاس کی شدت میں مبتلا ہو گئے اور اس ابتلا کے دور میں جب بھی وہ آسمان کی طرف نگاہ کرتے تو انھیں ہر طرف دھواں ہی دھواں دکھائی دیتا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ مردار اور مردہ جانوروں کی ہڈیاں تک کھانے پر مجبور ہو گئے۔

وہ پیغمبر گرامی قدر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر کہنے لگے۔

”محمد! آپ ہی تو ہمیں مسئلہ رومی کا حکم دیتے ہیں، جب کہ آپ ہی کے رشتہ دار اس صورت حال کی وجہ سے فنا و برباد ہو رہے ہیں۔ (اگر یہ عذاب ہم سے برطرف ہو گیا تو ہم یقیناً ایمان

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶) اندازے بھی مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ”یوم“ کا کلمہ ”ننتقم“ فعل سے متعلق ہے جو ”انا منتقمون“ کے جملے سے سمجھا جاتا ہے۔ بنا بریں اس کی تقدیری مؤرت یہ ہوگی۔

”ننتقم منہم یوم نبطش البطشة الکبریٰ انا منتقمون“

لے آئیں گے؟

آنحضرتؐ نے ان کے حق میں دُعا کی، نعمت کی فراوانی انہیں نصیب ہوئی اور عذاب ان سے دُور ہو گیا۔ لیکن انہوں نے اس ماجرے سے بھی عبرت حاصل نہیں کی اور اپنی اصلی حالت (کفر) کی طرف پلٹ گئے۔ لہٰذا اسی تفسیر کے مطابق ”بطشہ کبریٰ“ جو سخت اور سنگین سزا ہے، سے مراد جنگ بدر ہے، جس میں مشرکین نے مسلمانوں سے زبردست شکست کھائی۔

اس تفسیر کے مطابق حقیقت میں دھوئیں کا کوئی وجود نہیں تھا، بلکہ بھوکے پیاسے لوگوں کی نگاہوں میں آسمان سیاہ اور تاریک ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس مقام پر ”دخان“ مجازی حیثیت رکھتا ہے اور اس سخت اور وحشت ناک حالت کی طرف اشارہ ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر عربی ادبیات میں ”دخان“ عمومی مصیبت اور بلا کے لیے کنایہ ہے۔ لہٰذا بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ خشک سالی اور بارش کی کمی کی وجہ سے عام طور پر سیاہ اور بیزگرددغبار آسمان پر چھاتا ہے، جسے ”دخان“ سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ بارش ہی گرد و غبار کو فرد کر کے فضا کو صاف و شفاف بناتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ تمام اوصاف کے پیش نظر اس تفسیر کے مطابق ”دخان“ کے کلمہ کا معنی مجازی ہوگا۔

② ”دخان میں“ سے مراد وہ گہرا دھواں ہے جو کائنات کے خاتمے اور قیام قیامت سے پہلے تمام آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور یہی چیز دُنیا کے اختتام اور ظالموں اور مفسدین کے لیے عذاب الیم کے آغاز کی نشانی ہوگی۔ ایسے موقع پر ظالموں کا یہ ٹولہ خواب غفلت سے بیدار ہوگا اور عذاب دُور کرنے اور دُنیا کی معمول کی زندگی کی طرف بازگشت کی درخواست کرے گا، جو قبول نہیں کی جائے گی۔

اس تفسیر کے مطابق ”دخان“ کا حقیقی معنی مراد ہے اور ان آیات کا مضمون بھی وہی ہے جو دوسری قرآنی آیات کا ہے کہ قیامت کے قریب کے زمانے میں یا خود قیامت کے دن گناہگار اور کافر لوگ عذاب کے بر طرف ہونے اور دُنیا میں لوٹ جانے کی درخواست کریں گے، لیکن ان کی یہ درخواست مسترد کر دی جائے گی۔ لہٰذا

اس تفسیر کے مطابق ایک مشکل باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ یہ تفسیر ”اِنَّا كَا شَفَوْا الْعَذَابَ قَلِيلًا اِنَّكُمْ عَائِدُونَ“ (ہم تھوڑا سا عذاب بر طرف کریں گے، لیکن تم لوگ پھر اپنی کارستانیوں کی طرف لوٹ جاؤ گے) کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ دُنیا کے خاتمے یا قیامت کے دن خدا کا عذاب کم نہیں ہوگا کہ وہ لوگ کفر یا گناہ کی حالت کی طرف پلٹ جائیں۔ لیکن اگر اس جملے کا ایک تفسیر شرطیہ کی صورت میں معنی کریں ہر چند کہ تھوڑا سا ظاہر میں تو مخالف ہوگا۔ لیکن یہ مشکل ضرور بر طرف

لہٰذا مجمع البیان جلد ۹ ص ۱۱۱ اپنی آیات کے ذیل میں۔

لہٰذا فرمائی کہتے ہیں ”ان العرب یسمون الشر الثالب بالذخان“ (جلد ۲، ص ۲۴۲)

لہٰذا تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ ص ۱۱۱۔

لہٰذا اس بارے میں سورہ انفام کی آیات ۲۰ تا ۲۱ کی طرف دیکھیں۔

ہو جائے گی کیونکہ آیت کا مفہوم یوں ہوگا: جب ہم ان سے تھوڑا سا عذاب برطرف کریں گے تو وہ اپنی پہلی راہ روش کو دوبارہ اختیار کر لیں گے۔ جو درحقیقت سورہ انعام کی ۲۸ ویں آیت کے مانند ہو جائے گا، جس میں کہا گیا ہے۔

”ولو ردوا العاد والمانہوا عنہ“

”اگر وہ دنیا کی طرف لوٹنا بھی دیتے جائیں تو جن اعمال سے انہیں روکا گیا تھا، ان کا ارتکاب کریں گے۔“

اس کے علاوہ ”البطشة الكبرى“ سخت اور شدید سزا کی جگہ بدر کے واقعے سے تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے، جبکہ یہ تعبیر قیامت کی سزاؤں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ لہ

دوسری تفسیر کا ایک اور شاہد وہ روایات ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہیں اور جن میں ”دخان“ کی تفسیر اس دھوئیں سے کی گئی ہے جو قرب قیامت کے زمانہ میں تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ مثلاً جناب حذیفہ میمانیؓ پیغمبر اکرم سے روایت کرتے ہیں:

”چار چیزیں قرب قیامت کی علامات ہیں۔ پہلی دجال کا ظاہر ہونا، دوسری عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا، تیسری سرزمین عدن کی گہرائیوں سے آگ کا اٹھنا، اور چوتھی دھواں۔“

حذیفہ نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ ”دخان“ (دھواں) کیا ہے؟ تو آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

”فارتقب لیوم تاتی السماء بدماء یخسفون بہا“

پھر فرمایا۔

”یملأ ما بین المشرق والمغرب، یمکث اربعین یوماً ولیلة، اما المؤمن فیصیبه منه کھیئة الزکمة، واما الکافر بمذلة السکران ینخرج من منخریه و اذنیہ و دنبہ۔“

”وہ مشرق اور مغرب کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور چالیس شبانہ روز چھایا رہے گا۔ مومن کی یہ حالت ہوگی جیسے کسی کو زکام ہوتا ہے، اور کافر کی حالت یہ ہوگی جیسے کوئی مدہوش ہوتا ہے۔“

دھواں اس کی ناک کے نتھنوں، کانوں اور پیچھے سے باہر نکلتا رہے گا۔ لہ

ایک اور روایت میں ابوماک اشعری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

لہ راغب اپنی کتاب ”معرفات“ میں کہتے ہیں۔

”لبطش ہوتا ناول الشیء لبسولة۔“

لبطش کا معنی کسی چیز کو پوری طاقت سے پھلانا ہے۔

جو عام طور پر سزا دینے کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔

” ان ربكما نذركم ثلاثا، الدخان يأخذ المؤمن منه كالزكوة، و
يأخذ الكافر فينفع حتى يخرج من كل مسع منه، والشانية الدابة والثالثة
الدجال“

” تمھارے پروردگار نے تمھیں تین چیزوں سے ڈرایا ہے، ایک تو ’دخان‘ (دھواں) جسے جس کی وجہ سے مومن کو زکام جیسی تکلیف ہوگی اور کافر کا تمام جسم پھول جائے گا اور دھواں اس کے تمام مشاہم بدن سے باہر نکلے گا، دوسرے دابۃ الارض ہے اور تیسرے دجال ہے۔ لہ

” دابۃ الارض“ کے بارے میں سورہ نمل کی آیت ۸۲ کے ذیل میں (تفسیر نمونہ جلد ۸ میں) تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

’دخان‘ کے بارے میں ابوسعید خدریؓ نے آنحضرتؐ سے اسی طرح کی ایک اور روایت بھی بیان کی ہے۔ لہ
اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ذریعہ سے نقل ہونے والی روایات میں بھی اسی قسم کی تعبیرات ملتی ہیں، بلکہ اس سے زیادہ مفصل جن میں
سے ایک وہ روایت بھی ہے جو امیر المؤمنینؑ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی ہے آپ فرماتے ہیں۔

” عشر قبل الساعة لا بد منها، السفیانی، والدجال، والدخان، والدابة وخرج
القائم^۳ وطلوع الشمس من مغربها ونزول عیسیٰ ونحسف بالمشرق، وخصف بجزيرة
العرب و نار تخرج من قعر عدن تسوق الناس الى المحشر۔“

” قیامت کے قبل دس نشانیاں ہر صورت میں ظاہر ہو کر رہیں گی: سفیانی، دجال، دخان (دھواں)، دابۃ الارض
قیام مہدی، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ کا نزول، مشرق زمین پر ایک زلزلہ جس سے زمین دھنس جائے
گی، جزیرۃ العرب میں بھی اسی نوعیت کا زلزلہ اور زمین عدن کی گہرائیوں سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہینکا
کرے۔ محشر میں لے آئے گی۔ لہ

مجموعی گفتگو سے یہ نتیجہ نکلا کہ دوسری تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

- ۱۶- وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ۝
 ۱۸- أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝
 ۱۹- وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَيَّ اللَّهُ إِنِّي آتِيكُمْ بِسُلْطَنِ مُبِينٍ ۝
 ۲۰- وَإِنِّي عُدْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ ۝
 ۲۱- وَإِنْ لَمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاَعْتَرِزُوا ۝

ترجمہ

۱۶- اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی اور ان کے پاس ایک پیغمبر بزرگوار آیا۔

۱۸- (اور کہا) اے خدا کے بندو! جس چیز کا تمہیں حکم ملا ہے اسے بجا لاؤ اور میرے سامنے سر تسلیم خم کرو کہ میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

۱۹- اور خدا کے سامنے تجھ نہ کرو، کیونکہ میں تمہارے پاس ایک واضح اور روشن دلیل لے کر آیا ہوں۔

۲۰- اور اس بات سے کہ تم مجھے مہتم (یا سنگسار) کرو، میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔

۲۱- اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو کم از کم مجھ سے کنارہ کشی کر لو (اور دوسروں کو تو ایمان لانے سے نہ روکو)۔

تفسیر

خود ایمان نہیں لاتے تو دوسروں کو تو نہ روکو

گزشتہ آیات میں مشرکین عرب کی سرکشی اور حق کے آگے ان کے نہ بھجنے کا ذکر تھا ان آیات میں گزشتہ امتوں کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے کہ جنہوں نے اسی راستے کو اختیار کیا جس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب کا شکار اور شکست فاش سے دوچار ہوئے تاکہ جہاں پر یہ بات مؤمنین کے دل کی تسلی کا باعث ہو وہاں پر ہٹ دھرم منکرین کے لیے تشبیہ اور تہدید بھی بن جائے۔ اور وہ ہے موسیٰ اور فرعون کی داستان، جس کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی ا و لقد فتنا قبلہم قوم فرعون۔

”فتنا“ کا کلمہ ”فتنہ“ کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے کندہ بنانے کے لیے سونے کو آگ کی بھٹی میں ڈالنا، بعد ازاں انسان کے خلوص کی ہر گونہ آزمائش و امتحان پر اس کا اطلاق ہونے لگا، ایسی آزمائش جو تمام انسانی زندگی اور انسانی معاشرے پر محیط ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کی زندگی کا تمام دورانیہ انہی آزمائشوں اور امتحان میں گزرتا رہتا ہے، کیونکہ یہ دنیا ہے ہی امتحان کا گھر۔

قوم فرعون ایک طاقت ور حکومت، بے پناہ دولت اور بے اندازہ وسائل کا مالک ہونے کی وجہ سے نہایت شان و شوکت کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسی شان و شوکت نے اسے مغرور بنا دیا اور وہ مختلف گناہوں اور ظلم و ستم کا ارتکاب کرنے لگی۔ اور اسی اثنا میں ان کے پاس ایک بزرگوار رسول آیا۔ (وجاءہم رسول کریم۔)

”اخلاق و اوصاف کے لحاظ سے ”کریم“ بارگاہِ حق میں مقام و مرتبہ کے لحاظ سے ”کریم“ نسب کے لحاظ سے ”کریم“ اور یہ

رسول جناب موسیٰ بن عمرانؑ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

موسیٰ علیہ السلام نے نہایت سنبھلے ہوئے انداز میں اور سنجیدہ لہجے میں، دل پذیر اور محبت بھرے انداز سے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ اسے خدا کے بندو! میرے سامنے سر تسلیم فرمادو اور جس چیز کا تمہیں حکم ملا ہے اسے ادا کرو کہ میں اس کا بھیجا ہوا ہوں۔ (ان اذوا الی عباد اللہ)۔

لے مفرداتِ راغب کے مطابق لفظ ”کریم“ جب خدا کی صفت کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا معنی ظاہر ظاہر انعام و احسان ہوتا ہے اور جب کسی انسان کی صفت کے لیے استعمال ہو تو اس کا معنی حسن اخلاق اور اعمالِ مستند ہوتا ہے، جو انسان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ البتہ قرآن مجید میں یہ لفظ دوسری چیزوں کی صفت کے طور پر بھی آیا ہے۔ جیسے کتاب کریم، کل زوج کریم، رزق کریم، مقام کریم، اور اجر کریم وغیرہ۔ لے ”اذوا الی عباد اللہ“ میں لفظ ”ان“ اس فعلِ مقدر کی تفسیر ہے جو اس سے ماقبل کلام سے سمجھا جاتا ہے اور وہ تقدیر یوں ہے۔ (بقیہ ما شیخ صفیر بکرنیہ)

اس تفسیر کے مطابق 'عباد اللہ' مخاطب ہے اور اس سے مراد قوم فرعون ہے۔ اگرچہ قرآنی آیات کی رو سے یہ تعبیر خدا کے نیک بندوں کے بارے میں استعمال ہوئی ہے، لیکن بہت سے مقامات پر کفار اور گناہگاروں کی دل جوئی اور ان کی حق کی طرف تالیف قلب کے لیے بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے۔ لہ

بنابریں "ادوا" دادا کروا سے مراد فرمان الہی کی اطاعت اور اس کے احکام کی بجا آوری ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ "عباد اللہ" سے مراد "بنی اسرائیل" ہیں اور "ادوا" سے مراد انھیں موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کرنا اور انھیں قید و بند سے آزاد کرنا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے سورہ شعرا کی ۷۷ اور آیت میں مذکور ہے۔

"ان ارسل معنا بنی اسرائیل"

"میری تجویز یہ ہے کہ تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔"

یہی بات سورہ اعراف کی ۵۵ اور سورہ طہ کی ۴۷ میں آیت میں بھی بیان ہوئی ہے۔

لیکن جو چیز اس تفسیر سے ہم آہنگ نہیں وہ لفظ "ادوا" ہے، جو عام طور پر مال، امانتوں اور فرائض کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ افراد سپرد کرنے کے لیے۔

اس کلمہ کے استعمال سے اس کا موضوع بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

بہر حال، آیت کے آخر میں اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "میں تمہارا ایک امانت دار سپنیر ہوں" (انی لکم رسول امین)۔

یہ تعبیر درحقیقت ان ناجائز الزامات کی پیش بندی کے طور پر ہے جو فرعونوں نے ان پر لگائے تھے مثلاً جادوگری، جاہ و منصب اور سرزمین مصر میں اپنی حکومت کا قیام، نیز اس سرزمین کے اصل باشندوں کو باہر نکال دینے کا قصد وغیرہ۔ ان الزامات کے بارے میں مختلف آیات قرآنی میں اشارہ ہوا ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام انہیں اطاعت خداوندی کی دعوت یا بنی اسرائیل کی رہائی کی پیش کش کے طور پر فرماتے ہیں: میں اس بات پر بھی مامور ہوں کہ تمہیں یہ بتاؤں کہ "خدا کے سامنے سرکشی اور تکبر نہ کرو۔ اپنی حدود میں رہو۔ کیونکہ میں تمہارے لیے ایک واضح اور روشن دلیل لے کر آیا ہوں" (وان لا تقلوا علی اللہ انی اتیکم بسطان مبین)۔

واضح معجزات بھی اور کھلم کھلا منطقی دلائل بھی۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ کا۔)

"جئکم ان ادوا الی عباد اللہ"

لہ جیسے سورہ فرقان آیت ۱۷، سورہ سبا آیت ۱۳ اور سورہ فرقان آیت ۵۰ وغیرہ۔

خدا کے سامنے "علو" نہ کرنے سے مراد ہر قسم کا وہ عمل ہے جو بندگی کے اصولوں کے منافی ہے۔ خواہ وہ خدا کی مخالفت اور نافرمانی ہو یا خدا کے رسول کو ایذا رسانی ہو یا خدائی کا دعویٰ ہو، سب اسی زمرے میں آجاتے ہیں۔ چونکہ دنیا پرست منکمرین جب اپنے ناجائز مفادات پر زور پڑتی دیکھتے ہیں تو کسی قسم کی تہمت، الزام تراشی، ناروا باتوں، حتیٰ کہ قتل اور موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی نہیں چوکتے، اسی لیے موسیٰ علیہ السلام نے حفظ ماتقدم کے طور پر پہلے ہی سے کہہ دیا کہ اس بات سے کہ تم مجھے مہتم یا سنگسار کرو میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں۔ (وانی عدت بری وربکم ان ترجموں)۔

ممکن ہے یہ بات اس چیز کی طرف بھی اشارہ ہو کہ مجھے تمہاری دھمکیوں کی پرواہ نہیں ہے اور میں آخر دم تک اپنے موقف پر ڈٹا ہوا ہوں۔ خدا میرا محافظ اور نگہبان ہے۔

اس قسم کی تعبیر خدائی رہبروں کے عزم اور حوصلے کو تقویت پہنچاتی، دشمنوں کے حوصلوں کو پست کرتی، اور دوستوں کے عزم و استقلال میں اضافے کا موجب بنتی ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا قائد اور رہبر آخری سانس تک اپنے موقف پر ڈٹا رہے گا۔

"رجم" (سنگسار) کی بات شاید اس لیے کی گئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے قبل بہت سے انبیاء کو "رجم" کی دھمکی دی گئی تھی۔ جیسا کہ نوح علیہ السلام کے بارے میں ہے:

"فَالْوَالِئِ لِمُتْنَتِهِ يَانُوحَ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ -
"وہ کہنے لگے اے نوح! اگر تم اپنے کام سے باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔"

(شعرا - ۶ - ۱۱۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آذر نے سنگسار کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا:

"لَنْ لِمُتْنَتِهِ لَارْجَمَنَّكَ"

(مریم - ۲۶)

"اگر تو باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر دوں گا۔"

جناب شعیب علیہ السلام کو بت پرستوں نے دھمکی دیتے ہوئے کہا:

"وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ"

"اگر تیرے قبیلے کا پاس نہ ہوتا تو تجھے سنگسار کر دیتے" (ہود - ۹۱)

موت کی تمام سزاؤں میں سنگساری کی سزا کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ سب سے زیادہ سخت سزا ہوتی ہے۔ بعض ارباب لغت کے بقول "رجم" کا کلمہ مطلقاً قتل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بہت سے مفسرین کی طرف سے یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ "رجم" کا معنی کسی کو مہتم کرنا، کسی پر الزام لگانا اور کسی کو گالی دینا ہے، کیونکہ یہ لفظ اس معنی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور یہاں پر اس کا استعمال درحقیقت ان الزامات کی پیش بندی ہے جو بعد میں موسیٰ پر لگائے گئے۔

اس کلمے کا استعمال وسیع صورت میں دونوں معانی کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں حرف آخر کے طور پر جناب موسیٰؑ اٹھیں فرماتے ہیں: اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو کم از کم مجھے چھوڑ دو، مجھ سے دُور ہو جاؤ اور دوسرے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھو۔ (وان لحدتؤ منوالی فاعتزلون)۔

کیونکہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام پوری طرح مطمئن تھے کہ وہ اپنے واضح اور آشکار معجزات، پختہ دلائل اور خدا کے پکے وعدوں کی وجہ سے مختلف لوگوں میں اپنے مشن کو جاری رکھیں گے اور اپنے انقلاب کو ساحلِ کامرانی سے ہم کنار کر دیں گے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے یقین کی بنا پر ان لوگوں سے کہا کہ میرے لیے سدا رہ نہ بنو اور میرے رستے میں روڑے نہ اٹھاؤ۔ لیکن کیا یہ بات ممکن ہے کہ مغرور اور سرکش ظالم اور جاہل لوگ جو اپنی شیطانی طاقتوں اور ناجائز مفادات کو خطرے میں پڑتا دیکھتے ہیں وہ خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں اور اس قسم کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیتے ہیں؟ آئندہ آیات ہی ماجرا بیان کرتی ہیں۔

- ۲۲۔ فَدَعَا رَبَّهُ أَنْ هُوَ لَأَقَوْمٌ مُجْرِمُونَ ○
 ۲۳۔ فَاسْرِبْ بَعَادِي لَيْلًا إِنَّكُمْ مُتَّبِعُونَ ○
 ۲۴۔ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ هَوًّا إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُغْرَقُونَ ○
 ۲۵۔ كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّتٍ وَعُيُونٍ ○
 ۲۶۔ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ○
 ۲۷۔ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ○
 ۲۸۔ كَذَلِكَ تَقْشُرْنَا لَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ○
 ۲۹۔ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ ○

ترجمہ

- ۲۲۔ (موسیٰ نے) اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کیا کہ یہ مجرم لوگ ہیں۔
 ۲۳۔ (موسیٰ کو خدا کا حکم ملا) تو میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جا، جبکہ وہ تیرے پیچھے آئیں گے۔
 ۲۴۔ (جب تو دریا عبور کر لے تو) دریا کو کھلا اور ٹھہرا ہوا رہنے دے کہ وہ غرق ہونے والا لشکر ہے۔
 ۲۵۔ وہ لوگ کتنے باغات اور چشمے چھوڑ گئے۔
 ۲۶۔ اور کھیتیاں اور دلکش دگراں قیمت مہلات۔
 ۲۷۔ اور دوسری بہت سی نعمتیں جن میں وہ عیش کیا کرتے تھے۔

- ۲۸۔ یہ تھا ان کا ماجرا اور ہم نے ان تمام چیزوں کا دوسرے لوگوں کو وارث بنایا۔
۲۹۔ نہ تو آسمان نے ان پر گریہ کیا اور نہ ہی زمین نے اور نہ انھیں مہلت ہی دی گئی۔

تفسیر

محلات، باغات اور خزانوں کو چھوڑ کر چلے گئے

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان مجرموں کے تاریک دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے ہدایت کے تمام وسائل بروئے کار لائے لیکن فرعونیوں میں ان کا ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا۔ ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کہیں کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اسی لیے وہ ان سے مایوس ہو گئے اور ان پر نفرین کے علاوہ انھیں اور کوئی رستہ دکھائی نہ دیا۔ کیونکہ جس فاسد قوم کی ہدایت کی کوئی امید باقی نہ رہے، نظام آفرینش میں اسے جینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس کے لیے صرف ایک ہی راہ ہوتی ہے کہ اس پر عذاب الہی نازل ہو کہ جو اس کا ستیاناس کر کے اس کے ناپاک وجود کو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ اسی لیے زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: موسیٰ نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں عرض کیا کہ یہ مجرم اور گناہگار لوگ ہیں۔ (فعد عارتد ان ھؤلأء قوم مجرمون)۔

کیسی عمدہ بددعا ہے؟ موسیٰ یہ نہیں کہتے کہ خدایا ان کے ساتھ یہ کر اور وہ کر بلکہ صرف یہی کہتے ہیں کہ یہ مجرم لوگ ہیں ان کی ہدایت کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی۔

خدانے بھی ان کی دعا قبول فرمائی اور فرعونیوں پر عذاب کے نزول اور بنی اسرائیل کی اس عذاب سے نجات کے مقدمے کے طور پر موسیٰ کو حکم دیا: تو میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جا، کیونکہ فرعون اور اس کے لشکر دالے تمہارے پیچھے آئیں گے (فاسر بعبادی لیلاً انکم متبعون)۔

لیکن گھبراؤ نہیں! ضروری ہے کہ وہ تمہارا پیچھا کریں تاکہ اس انجام کو دیکھ لیں، جس کے وہ منتظر ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ راتوں رات خدا کے نمون بندوں یعنی بنی اسرائیل کو کہ جو ان پر ایمان لاپکے تھے اور کچھ دوسرے مصریوں کو جو ایمان لانے پر آمادہ تھے اور ان کی آواز پر لبیک کہہ چکے تھے، اپنے ساتھ لے کر چل پڑیں اور نیل کے ساحل پر پہنچ جائیں اور معجزانہ طریقے پر دریائے نیل کو عبور کر کے اپنی موعود سرزمین یعنی فلسطین پہنچ جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضرت موسیٰ اور ان کے پیروکاروں نے رات کو یہ سفر اختیار کیا، لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ اتنی بڑی تعداد کا سفر اختیار کرنا زیادہ عرصے تک فرعونیوں کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا، شاید اس واقعے کو چند ہی گھنٹے گزرے

ہوں گے کہ فرعون کے جاسوسوں نے اُسے اس عظیم واقعے یا با الفاظ دیگر "غلاموں کے اجتماعی فرار" کی خبر پہنچادی۔ فرعون نے حکم دیا کہ ایک عظیم لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا جائے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام مطالب اور یہ سب کچھ مندرجہ بالا آیت میں ایک نہایت ہی مختصر سے جملے میں بیان کر دیا گیا ہے اور وہ ہے:

"انکم متبعون"

"تھارا تعاقب کیا جائے گا"

جو کچھ یہاں پر اختصار کے لیے حذف ہوا ہے وہ قرآن کی دوسری آیات میں مختصر عبارتوں کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جیسا کہ سورہ طہ کی ۷۷ ویں آیت میں ہے۔

"ولقد اوحینا الی موسیٰ ان اسر بادی فاضرب لهم طریقاً فی البحر
یسئلاً تخاف درکاً ولا تخشی"

"ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات باہر لے جا اور ان کے لیے دریا میں خشک راستہ کھول، نہ تو تجھے دشمن کے تعاقب کا خوف ہوگا اور نہ ہی غرق ہونے کا خدشہ"

پھر زیر تفسیر آیات میں بیان فرمایا گیا ہے: جب تم سلامتی کے ساتھ دریا کو عبور کر لو تو دریا کو کھلا اور ٹھہرا ہوا رہنے دو۔
(واترك البحر رهواً)۔

ان آیات میں دریا سے مراد وہی عظیم دریائے نیل ہے۔

مفسرین کرام اور ارباب لغت نے "رہو" (بروزن "سہو") کے دو معانی ذکر کیے ہیں۔ ایک معنی ہے "ٹھہرا ہوا" اور دوسرا "کھلا ہوا"۔ اس مقام پر دونوں معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم کیوں دیا گیا؟ تو یہ ایک فطری ہی بات ہے کہ جناب موسیٰؑ اور بنی اسرائیل تو یہ چاہتے تھے کہ جب وہ اس دریا سے گزر جائیں تو فوراً دونوں طرف کا پانی آپس میں مل جائے اور یہ خشکی کا راستہ فوراً بھر جائے، تاکہ وہ بلدی اور سلامتی کے ساتھ لشکر فرعون سے دور ہو جائیں اور موعود سرزمین کی طرف چل پڑیں، لیکن انھیں حکم ملتا ہے کہ دریا کو عبور کرتے وقت بلد بازی سے کام نہ لیں اور دریا کو اسی حال پر رہنے دیں تاکہ فرعون اور اس کی فوج کا آخری شخص تک اس میں داخل ہو جائے، کیونکہ نیل کی ٹھانٹیں مارتی ہوئی موجوں کو انچی تباہی اور بربادی کا حکم دیا جا چکا ہے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: وہ سب غرق شدہ لشکر ہیں (انہم جند مفروقون)۔

خدا کا یہ حتمی فرمان ان مفرد اور سرکش لوگوں کے بارے میں ہے کہ انھیں نیل کے اس عظیم دریا میں غرق ہونا چاہیے جو ان کی ثروت اور طاقت کا سرچشمہ ہے اور جہان کی زندگی اور حیات کا عامل ہے اسے ہی خدا کے ایک فرمان کے ذریعے موت اور تباہی و بربادی کا سبب بننا چاہیے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، جب فرعون اور اس کے لشکر والے نیل کے ساحل پر پہنچے تو اس وقت تک بنی اسرائیل دوسرے کنارے سے دریا عبور کر چکے تھے۔ چونکہ اس قسم کے راستے کانیل کے درمیان میں نمودار ہونا ہر اجداد خواں بچے کو خدا کے ایک عظیم معجزہ

ہونے کی جانب متوجہ کرنے کے لیے کافی تھا لیکن غرور اور تکبر نے ان عقل کے اندھوں کو اس کھلم کھلا حقیقت کو سمجھنے کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی غلطی کو محسوس کرتے اور خدا کی بارگاہ میں سرسجود ہو جاتے۔ شاید انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ نیل میں اس قسم کی تبدیلی بھی فرعون کے حکم سے عمل میں آئی ہے۔ اور شاید فرعون یہ بات اپنے پیروکاروں سے کہہ کر اس دیوانی راستے پر چل پڑا اور اس کے پیروکاروں کا آخری فرد بھی اس کے پیچھے آ گیا۔ وہ سب دریا کے درمیانی حصے میں پہنچ گئے تو اچانک نیل کی ٹھاٹھیں مارتی موجیں بوسیدہ عمارت کی طرح یک دم ان پر آگریں اور سب کو دیا میں غرق کر دیا۔

ایک نکتہ جو ان آیات میں انسان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرواتا ہے وہ ان آیات کا نہایت ہی اختصار ہے اور وہ اپنے اس اختصار کے باوجود جامع بھی ہیں، کیونکہ ان اضافی جملوں کو حذف کر دیا گیا ہے جو یا تو قرآن کی وجہ سے یا پھر دوسرے جملوں کی وجہ سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ایک مفصل داستان کو تین آیتوں یا تین مختصر جملوں میں بیان کیا جا رہا ہے اور وہ تین جملے صرف یہی کہہ رہے ہیں کہ:

”موسیٰ نے اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کی یہ لوگ مجرم ہیں۔“

”اسے کہا گیا کہ میرے بندوں کو راتوں رات یہاں سے نکال لے جا کہ تمہارا تعاقب ہوگا۔“

”دریا کو کھلا اور بٹھا ہوا چھوڑ دے کہ وہ غرق شدہ لشکر ہیں۔“

باوجودیکہ وہ ابھی غرق نہیں ہوئے تھے ان کے لیے ”غرق شدہ“ کی تعبیر خدا کے اس فرمان کے قطعی اور حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ فرعون اور فرعونوں کے غرق ہونے کے بعد کون کون سے عبرت انگیز واقعات رونما ہوئے۔ قرآن کریم نے بعد کی آیات میں ان کی اس عظیم دولت کو پانچ موضوعات کی صورت میں بیان کیا ہے جو ان کی تمام زندگی کی فہرست بنتی ہے اور وہ بنی اسرائیل کو میراث کی صورت میں ملے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ کتنے باغات اور چشمے چھوڑ کر چلے گئے۔ (کے ترکو من جنات و

عیون)۔

باغات اور چشمے ان کے تمام اموال میں زیادہ قیمتی اور نہایت اہم سرمایہ تھے کیونکہ نیل ہی کی بدولت مصر کی سرزمین زرخیز اور ثمر آور تھی۔ ان چشموں سے مراد نمکین ہے وہ چشمے ہوں جو بعض پہاڑوں سے پھوٹ کر زمینوں کو سیراب کیا کرتے تھے یا پھر وہ چھوٹے بڑے ندی نالے ہوں جو دریائے نیل سے نکالے گئے تھے اور ان کے سرسبز و شاداب اور خرم و آباد باغوں سے گزرتے تھے اور ان ندی نالوں پر ”عین“ (چشمے) کا اطلاق بعید نہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: اور کھیتیاں اور دل کش، خوبصورت اور گراں قیمت مہلات۔ (و ذروع و مقام کریم)۔

یہ دونوں بھی ان کا اہم سرمایہ تھے۔ عظیم ترکھیتی باڑی جس کی نیل کے پانی سے آبپاشی کی جاتی تھی اور پورے مصر کا اس

پر دار و مدار تھا۔ انواع و اقسام کی اجناس کی پیداوار اور دوسری زرعی چیزیں جن سے خود بھی استفادہ کرتے تھے اور دوسرے

نملوں کو بھی برآمد کیا کرتے تھے اور پورے ملک کا اقتصادی نظام اسی زراعت کا مہون منت تھا۔

یہی حال اونچے اونچے محلات اور آبادیوں کا ہے، کیونکہ انسانی زندگی میں انھیں بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔
البتہ ان محلات کا ”کریم“ اور قیمتی ہونا، ظاہری نقطہ نظر سے ہے اور خود ان کے اپنے نظریے کا بیان ہے، وگرنہ قرآنی
منطق کی روش سے تو اس قسم کے طاغوتی ٹھاٹھ باٹھ اور یاد خدا سے غافل کرنے والے مکانات اور محلات کسی قسم کی ”کریمی“ کے حامل
نہیں ہیں۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ”مقام کریم“ سے مراد جشن و شادمانی کی مجلسیں ہیں اور زیادہ منبر ہیں جن پر قصیدہ خواں اور شعرا لوگ
بیٹھ کر فرعون کی قصیدہ خوانی کیا کرتے تھے۔ لیکن یہاں زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ ان کے پاس مذکورہ چار اہم امور کے علاوہ بڑی مقدار میں حصول نعمت کے اور بھی بہت سے وسائل تھے، جن کی طرف
ایک مختصر سے جملے میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور دوسری بہت سی نعمتیں جن میں عیش و عشرت کیا کرتے تھے اور ناز
و نعمت کے ساتھ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ (ونعمۃ کاناو فیہا فاکھین)۔ لہٰذا

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جی ہاں! ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور ہم نے فرعون والوں کی تمام دولت و سلطنت اور اموال
کا وارث دوسرے لوگوں کو بنا دیا (کذالک واورثناھا قومًا اخرین)۔ لہٰذا

”قومًا اخرین“ سے مراد بنی اسرائیل ہیں کیونکہ سورہ شعرا کی آیت ۵۹ میں اس بارے میں تصریح ہو چکی ہے اور لفظ،
”ارث“ سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ وہ کسی دکھ درد اور تکلیف اٹھانے اور خون جگر دینے بغیر ان تمام اموال اور
ثروت کے مالک بن گئے جس طرح انسان کو کسی تکلیف کے بغیر وراثت ملتی ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسی آیت سے اور اس جیسی سورہ شعرا کی آیت سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ فرعون
اور فرعون کے ساتھیوں کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل سرزمین مصر کی طرف لوٹ آئے اور فرعون کی میراث کے وارث بنے
اور وہیں پر اپنی حکومت قائم کی اور حالات کا رخ بھی ہی بتا دیا۔ مصر میں فرعونوں کے اقتدار اور حکومت کے خاتمے کے بعد موسیٰ علیہ السلام
ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ وہ ملک کسی قسم کے سیاسی خلفشار کا شکار ہو جائے۔

لہٰذا ”نعمۃ“ (دولت پر بربر کے ساتھ) کا معنی حصول نعمت ہے۔ اور لوزن کی زیر کے ساتھ ہو تو معنی نعمت کا بھیجنا ہے۔ یہ تصریح بیشتر
مفسرین اور ارباب لغت کی ہے، جب کہ دوسرے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور ہر قسم کا اہم نائدہ اس کے مفہوم
میں شامل ہے۔

لہٰذا ”فاکھین“ کا معنی بھی تو ”فنا کد“ یعنی پھیلوں سے استفادہ کرنے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی فنا ہی اور دل گلی کی باتوں کے معنی میں
اور کبھی کبھی ہر قسم کی لذت اٹھانے اور نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے معنی میں بھی آسکتا ہوتا ہے۔ البتہ آخری معنی دوسرے تمام معنوں سے زیادہ
جامع ہے۔

لہٰذا ”کذالک“ مقتدائے محذوف کی خبر ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے، الامر کذالک“ اور اس طرح کے الفاظ تاکید کے لیے استعمال
ہوتے ہیں، بعض مفسرین نے اس کی ترکیب کے متعلق اور بھی کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے۔

لیکن یہ بات قرآن مجید کی ان تصریحات کے منافی نہیں ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل، فرعون والوں کے چنگل سے آزاد ہو جانے کے بعد فلسطین کی موعود سرزمین کی طرف چل دیئے، جس کے واقعات بھی قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جن کے قبضے میں مصر کی زمین آچکی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نمائندوں کی حیثیت سے وہیں پر رہ گئے ہوں اور دوسرے بہت سے لوگ راہی دیار فلسطین ہو گئے ہوں۔

(اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے سورہ شجرہ کی ۵۹ ویں آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ کی ۸ ویں جلد کا مطالعہ فرمائیں۔)

اسی سلسلے کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: نہ تو آسمان نے ان پر گریہ کیا اور نہ ہی زمین نے اور نہ ہی انھیں بلاؤں کے نازل ہونے کے وقت کوئی مہلت دی گئی۔ (فما بکت علیہم السماء والارض وما کانوا منظرین)۔

ان پر آسمان و زمین کے گریہ نہ کرنے سے شاید ان کی حقارت، اور ان کے لیے کسی دوست اور مددگار نہ ہونا مراد ہے کیونکہ عربوں میں یہ معمول ہے کہ جب کسی پر واقع ہونے والی مصیبت کے موقع پر اس کے مقام کی عظمت اور اہمیت کو جتلا نا چاہیں تو کہتے ہیں ”اس پر آسمان و زمین روتے اور اس کے فقدان پر سوچ اور چاند تاریک ہو گئے“۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ”زمین و آسمان والوں کا گریہ ہے“۔ کیونکہ وہ مومنین اور خدا کے مقربین کے لیے گریہ کرتے ہیں نہ کہ فرعونوں جیسے جاہلوں کے لیے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آسمان و زمین کا گریہ حقیقی گریہ ہوتا ہے جو ایک قسم کی تبدیلی اور مخصوص سُرخی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے (طلوع و غروب کے موقع پر رونما ہونے والی سُرخی کے علاوہ)۔

جیسا کہ ایک روایت میں ہے:

”لما قتل الحسين بن علی بن ابی طالب بکت السماء علیہ و
بکا نھا حمرة اطرافھا“

”جب حسین بن علی بن ابی طالب کو شہید کر دیا گیا تو آسمان نے آپ پر گریہ کیا اور یہ ردنا ایک خاص سُرخی کی صورت میں تھا جو اس کے کناروں پر نمایاں ہوئی۔“

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے۔

”بکت السماء علی یحییٰ بن زکریا و علی الحسین بن علی (علیہما السلام)
اربعین صباحاً ولم یتک الا علیہما، قلت وما بکاءہا؟ قال کانت
تطلع حمراء و تغیب حمراء“

آسمان یحییٰ بن زکریا علیہ السلام (جو اپنے زمانے کے طاغوت کے ہاتھوں نہایت ہی دردناک

صورت میں شہید کیے گئے اور حسین بن علی علیہما السلام پر چالیس دن روتا رہا اور ان دونوں کے علاوہ کسی اور پر نہیں رویا۔ راوی نے کہا: میں نے امام سے پوچھا کہ آسمان کا روزا کس قسم کا تھا؟ تو امام نے فرمایا: طلوع اور غروب آفتاب کے وقت ایک خاص سُرخ آسمان پر ظاہر ہو جایا کرتی تھی۔ لے

لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک اور حدیث میں ہے:

”مؤمن مؤمن الاولہ باب یصدق منہ عملہ و باب یتزل منہ رزقہ فاذا مات بکیا علیہ“

”کوئی مومن ایسا نہیں ہے جس کے لیے آسمان میں ایک دروازہ نہ ہو کہ جس سے اس کے اعمال اوپر جاتے ہیں اور ایک دروازہ ایسا ہے جس سے اس کا رزق نازل ہوتا ہے جب وہ مر جاتا ہے تو یہ دونوں دروازے اس پر گرہ کر رہتے ہیں۔ لے

ان روایات میں کسی قسم کا باہمی تضاد نہیں ہے کیونکہ حضرت امام حسینؑ اور حضرت یحییٰ بن زکریا کی شہادت کے ارے میں مسئلے کی عمومی حیثیت ہے کہ تمام آسمانوں نے ان پر گرہ کر لیا، جب کہ آخری روایت ایک خاص اور محدود پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔ لے

بہر صورت ان تفاسیر کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے اور سب آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتی ہیں۔

ہاں البتہ یہ بات یقینی ہے کہ ظالموں اور تباہ کاروں کی موت پر نہ تو چشم فلک کو رونا آیا اور نہ ہی سورج پژمرد ہوا، کیونکہ وہ ایسے غیثت افراذ تھے گویا ان کا ثبات اور عالم بشریت کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔

جب عالم سے یہ بیگانے دھتکار دیئے گئے تو کسی کو بھی ان کی جُدائی کا صدمہ نہ ہوا، نہ تو رُوسے زمین پر اور نہ ہی افلاک کی بلندیوں پر اور نہ ہی انسانی دلوں کی گہرائی میں۔ اسی لیے کسی نے بھی ان کی موت پر ایک آنسو تک نہیں بہایا۔

ہم ان آیات کے بارے میں امیر المؤمنین علیہ السلام کی ایک روایت نقل کر کے اپنی بات ختم کرتے ہیں۔ روایت میں ہے کہ جب امیر المؤمنین علیہ السلام مدائن سے گزر رہے تھے تو آپ کا گزر کسریٰ (نوشیروان اور ساسانی بادشاہوں کے آثار سے ہوا۔ آپ نے ان آثار کا مشاہدہ فرمایا جو گرنے کے بالکل قریب تھے تو آپ کے ہم رکاب لوگوں میں سے ایک

۱۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۷ ص ۳۰۔ (اسی آیت کے ذیل میں۔)

۲۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۷ ص ۳۰۔

۳۔ تفسیر درمنثور میں ایک حدیث بیان کی گئی ہے، جس میں ان روایات کو جمع کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

(منقول از تفسیر المیزان جلد ۱۸، ص ۱۵۱)

شخص نے عجزت کے عنوان سے یہ شعر پڑھا:

جبرت السریاح علی رسوم ديارهم فكأنهم كانوا علی میعاد
 ”ہوائیں ان کی سرزمین کے باقی ماندہ آثار پر چلنے لگیں (اور ان کے محلات سے سوائے ہوا کی
 سناہٹ کے اور کچھ نہ تائی نہ دیا) گویا ان سب کی ایک وعدہ گاہ تھی جس کی طرف وہ روانہ ہو
 چکے ہیں“

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا تم نے اس شعر کے بجائے یہ آیت کیوں نہیں تلاوت کی:
 ”کم ترکوا من جنات و عیون و زروع و مقام کریم و نعمة كانوا
 فیہا فاکھین... فما بکت علیہم السماء و الارض و ما كانوا
 منظرین۔ لہ

- ۳۰۔ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝
 ۳۱۔ مِنْ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ كَانَ عَلِيًّا مِنَ الْمُسْرِفِينَ ۝
 ۳۲۔ وَلَقَدْ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝
 ۳۳۔ وَاتَّيْنَاهُمْ مِنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُّبِينٌ ۝

ترجمہ

- ۳۰۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو رسوا کُن عذاب سے نجات دلائی۔
 ۳۱۔ فرعون سے، کہ وہ ایک متکبر شخص اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا۔
 ۳۲۔ اور ہم نے اپنے علم کی بنا پر انہیں عالمین میں سے منتخب کیا اور برتری دی۔
 ۳۳۔ اور ہم نے انہیں (اپنی قدرت کی) ایسی نشانیاں دیں کہ جن میں انکی صیرح آزمائش تھی۔
 (لیکن انہوں نے کفران نعمت کیا اور سزا پائی)۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی آزمائش

گزشتہ آیات میں فرعونوں کے غرق اور ہلاک ہونے اور ان کی شان و شوکت اور اقتدار کے غاتے اور اقتدار اور شان و شوکت کا دوسروں کو منتقل ہونے کا تذکرہ تھا۔ زیر تفسیر آیات میں اس کے دوسرے پہلو یعنی بنی اسرائیل کی نجات کی بات ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو رسوا کُن عذاب سے نجات دلائی (وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ)۔

سخت اور طاقت فرسا جسمانی اور روحانی اذیتوں سے کہ جو ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی تھیں۔ یعنی نوموؤد لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اور خدمت اور ہوس بازی کے لیے لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا تھا، ان سے بے کاری جاتی تھی اور کس قدر دردناک ہے ایسی قوم کا مقدر جو اس قسم کے خونخوار اور دیوسیرت دشمن کے چنگل میں پھنس جائے۔

جی ہاں! خداوند عالم نے موسیٰ علیہ السلام کے حکم خدا قیام اور تحریک کی وجہ سے اس مظلوم قوم کو تاریخ کے سفاک ظالموں کے چنگل سے نجات بخشی لہذا اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے: "فرعون کے چنگل سے" (من فرعون)۔

کیونکہ وہ ایک تکبر شخص اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا۔ (انہ کان عالیاً من المسرفین)

یہاں پر "عالی" سے مراد مقام و منزلت کی سر بلندی نہیں بلکہ اس کی برتری کی خواہش اور تجاوز اور اسراف میں مبتلا ہے، جیسا کہ سورہ قصص کی چوتھی آیت میں بھی آچکا ہے کہ:

"ان فرعون علا فی الارض"

"فرعون نے زمین میں برتری چاہی اور برتری کی خواہش اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے

خدائی کا دعویٰ کر ڈالا اور خود کو رب اعلیٰ کہلانے لگا۔"

"مسرف" "اسراف" کے مادہ سے ہے جو حد سے ہر قسم کے تجاوز کو کہتے ہیں، خواہ وہ اعمال میں ہو یا کفار میں۔ اسی لیے قرآن مجید کی مختلف آیات میں تباہ کاریوں کے بارے میں "مسرف" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو ظلم و فساد میں حد سے بڑھ گئے ہیں نیز مطلقاً لگا ہوں کو بھی "اسراف" کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورہ زمر کی ۵۳ ویں آیت میں ہے۔

"قل یا عبادہ الذین اسرفوا علیٰ انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ"

"کہہ دے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے آپ سے زیادتی کی ہے! خدا کی رحمت

سے نا امید نہ ہو۔"

بعد کی آیت میں بنی اسرائیل پر خدا کی ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ہم نے انہیں اپنے علم کی بنا پر اس زمانے کے عالمین پر برتری دی اور انہیں برگزیدہ کیا۔ (ولقد احترناہم

علیٰ علم علیٰ العالمین)

لیکن انہوں نے ان نعمتوں کی قدر نہیں جانی، بلکہ کفران نعمت کیا اور اپنے کیے کی سزا پائی۔

اس طرح سے وہ اپنے زمانے کی برگزیدہ امت تھے۔ کیونکہ "عالمین" اس دور کے لوگ ہیں نہ کہ تمام

زمانوں کے لوگ، کیونکہ قرآن نے صاف طور پر سورہ آل عمران کی ایک سو دسویں آیت میں امت اسلام سے خطاب کرتے

ہوئے فرمایا ہے:

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس....."

"تم بہترین امت تھے، جنہوں نے لوگوں کے مفاد کے لیے عرصہ وجود میں قدم رکھا۔"

جس طرح کہ ان سرزمینوں کے بارے میں ہے جن کے بنی اسرائیل وارث ہوئے، چنانچہ سورہ اعراف کی ۱۷۴ ویں

آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

”وادرثنا القوم الذین کانوا یتضعفون مشارق الارض ومغربہا
الذی بارکنا فیہا“

ہم نے اس مستضعف قوم کو بابرکت زمین کے مشارق و مغارب کا وارث بنایا۔
ظاہری بات ہے کہ نبی اسرائیل اس زمانے میں تمام دُنیا کے وارث نہیں بنے تھے بلکہ ان کے اپنے علاقہ کے
مشرق و مغرب مراد ہیں۔

البتہ بعض مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ نبی اسرائیل میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو تاریخی طور پر
صرف انہی کے ساتھ مخصوص ہیں جن میں سے ایک، انبیاء کی کثرت ہے کیونکہ کسی قوم میں سے اس قدر انبیاء مبعوث
نہیں ہوئے۔

لیکن یہ بات علاوہ اس کے کہ ان کی مطلق خصوصیت ثابت نہیں کرتی، ان کی کسی قسم کی خصوصیت بھی نہیں بن سکتی
کیونکہ ممکن ہے ہم ان میں سے کثیر تعداد میں انبیاء کے قیام کو ان کی نہایت سرکشی اور ڈھٹائی کی دلیل سمجھیں۔ جیسا کہ جناب
موسیٰؑ کے قیام کے بعد والے واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا کیا
کچھ کیا؟

بہر حال ہم نے جو کچھ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ ایسی چیز ہے جسے بہت سے مفسرین نے نبی
اسرائیل کی بالنسبہ لیاقت کے طور پر قبول کیا ہے۔

لیکن اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہ ہٹ دھرم قوم بقول قرآن مجید ہمیشہ اپنے انبیاء کو ستاتی رہی،
اور پوری ہٹ دھرمی اور خاص تعصب کی بنا پر احکام الہی کا مقابلہ کرتی رہی، حتیٰ کہ جب وہ تازہ تازہ دبیائے نیل سے نجات
پانچ تھی موسیٰ علیہ السلام کو بت سازی کی تجویز پیش کر دی، ممکن ہے یہ بات کہی جائے کہ مندرجہ بالا آیت ان کے کسی
موسیٰ امتیاز کو بیان نہیں کر رہی، بلکہ ایک اور حقیقت کی نشاندہی کر رہی ہے اور اس آیت کا معنی یوں ہے۔

”باوجودیکہ ہم جانتے تھے وہ خدا کی نعمتوں سے ناجائز نمانا ڈھٹائیں گے، پھر بھی ہم نے انہیں

سر بلندی عطا کی تاکہ ہم انہیں آزماتیں۔“

جیسا کہ بعد کی آیت سے بھی ہی سمجھا جاسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابھیر رجحانیں عطا کیں تاکہ انہیں آزمائے۔
تو اس طرح سے اللہ کا یہ انتخاب نہ فقط ان کی کسی خصوصیت کی دلیل نہیں ہے، ضمنی طور پر ان کی مذمت کا حامل بھی ہے
کیونکہ انہوں نے اس نعمت کا حق ادا نہیں کیا اور اس امتحان سے عمدہ برآ نہیں ہوئے۔

زیر تفسیر آیات کے سلسلے کی آخری آیت میں ان بعض نعمتوں کا ذکر ہے جو خدا نے انہیں عطا کی تھیں، چنانچہ ارشاد
ہوتا ہے: اور ہم نے انہیں اپنی عظمت اور قدرت کی ایسی نشانیاں دیں جن میں ان کی صریح آزمائش تھی رواستینا ہومن
الآیات منافہ بلاء مبین۔

کبھی تو سینا کے صحراؤں اور تیسہ کی وادیوں میں ان کے سروں پر بادلوں کا سایہ کیا، کبھی ان پر "من وسلویٰ" نازل کیا، کبھی سخت پتھروں کے دل سے پانی کا چشمہ ان کے لیے جاری کیا اور کبھی دوسری مادی اور روحانی نعمتیں ان کے نصیب کیں۔ لیکن یہ سب کچھ امتحان اور آزمائش کے لیے تھا، کیونکہ خدا تعالیٰ کچھ لوگوں کو مصیبت کے ذریعے آزماتا ہے، اور کچھ کو نعمت کے ذریعے، جیسا کہ سورۃ اعراف کی ۱۶۸ ویں آیت میں ہے:

"وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ"

"ہم نے نبی اسرائیل کو نعمتوں کے ذریعے آزمایا کہ شاید وہ غلط راستے سے باز آجائیں۔"

نبی اسرائیل کی یہ سرگزشت صدر اسلام کے مسلمانوں کے لیے بیان کرنے کا مقصد شاید یہ ہو کہ وہ دشمنوں کی کثرت اور ان کی طاقت سے نہ گھبرائیں اور مطمئن رہیں کہ جو خدا فرعونوں کی طاقت، اقتدار اور عظمت کو خاک میں ملا سکتا ہے اور نبی اسرائیل کو ان کے ملک اور حکومت کا وارث بنا سکتا ہے وہ مستقبل قریب میں اس قسم کی کامیابی تمہارے نصیب بھی کر سکتا ہے لیکن جیسا کہ نعمتوں کے ذریعے ان کی آزمائش ہوئی ہے، تمہیں بھی اسی طرح امتحان کی بھٹی میں ڈالا جائے گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اقتدار اور طاقت کے حصول کے بعد تم کیا کرو گے؟

اور یہ زبردست تنبیہ ہے تمام اقوام اور ملتوں کے لیے کہ جب انھیں خدائی مہربانی، کامیابی اور نعمت نصیب ہو جاتی ہے تو اس موقع پر سخت امتحان کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔

- ۳۲۔ اِنَّ هٰؤُلَاءِ لَيَقُولُوْنَ ۝
 ۳۵۔ اِنَّ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُولٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝
 ۳۴۔ فَاَتُوْا بِاٰبَانَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ

- ۳۲۔ یہ (مشرکین) کہتے ہیں۔
 ۳۵۔ ہمیں تو صرف ایک بار مرنا ہے اور ہرگز زندہ نہیں ہوں گے۔
 ۳۴۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لے آؤ (تاکہ وہ گواہی دیں)

تفسیر

یہی موت ہے اور بس

گذشتہ آیات میں فرعون اور فرعونوں کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی تھی اور ان کے کُفر و انکار کے انجام کا تذکرہ تھا۔ اب ایک بار پھر مشرکین کی باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے اور معاد کے بارے میں ان کے شکوک کو جو کہ سُورت کے آغاز میں مذکور ہو چکے ہیں ایک مرتبہ پھر دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا رہا ہے؛ یہ مشرکین یوں کہتے ہیں۔ (اِنَّ هٰؤُلَاءِ لَيَقُولُوْنَ)۔

ہمیں تو صرف ایک بار مرنا ہے اور ہم ہرگز دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے (اِنَّ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُولٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ)۔

لے ضمیر "ہی" کا مرجع کیا ہے؛ اس بارے میں مفسرین کے مختلف نظریات ہیں۔ بعض مفسرین اسے "موت" کی طرف پٹاتے ہیں کیونکہ کلام کے سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ بنا بریں آیت کا معنی یہ ہوگا؛

(بقیہ مانشیہ اگلے صفحہ پر)

"مالموتة الاموتتنا الاولى"

معاد، حیات بعد الموت، جزا و سزا اور جنت و جہنم کے بارے میں محمدؐ جو کچھ کہتے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ سرے سے حشر و نشر کا ہی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مشرکین صرف پہلی موت پر ہی کیوں زیادہ زور دیتے ہیں؟ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس موت کے بعد دوسری موت نہیں ہے، جبکہ ان کی مراد حیات بعد الموت کی نفی ہونا ہے نہ کہ دوسری موت کا انکار۔ دوسرے لفظوں میں انبیاء کرام علیہم السلام نے حیات بعد الموت کی خبر دی ہے نہ کہ دوسری موت کی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مراد بعد از مرگ دوسری حالت کے وجود کا انکار ہے، یعنی ہم فقط ایک بار مریں گے اور یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد نہ تو دوبارہ زندگی ہوگی اور نہ ہی دوبارہ موت۔ جو کچھ ہے صرف یہی ایک موت ہے (غور کیجئے گا)۔

درحقیقت اس آیت کا مفہوم سورہ النعام کی ۲۹ ویں آیت سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، جس میں کہا گیا ہے:

”وقالوا انھی الا حیاتنا الة نیا و ما نحن بمبعوثون“

”انھوں نے کہا: زندگی تو صرف یہی دنیاوی زندگی ہے اور ہم ہرگز دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے“

اس کے بعد ان کی گفتگو کو نقل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے بے بنیاد دعوے کے لیے پورے دلائل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں: اگر تم سچ کہتے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے ہمارے پاس لے آؤ تاکہ وہ تمہاری سچائی کی گواہی دیں (فائقو با بائمان کنتہ صادقین)۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ باتیں کہنے والا ابو جہل تھا، جس نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متہرک کر کے کہا:

”اگر تو سچ کہتا ہے تو اپنے جد ”قصی بن کلاب“ کو زندہ کر کیونکہ وہ ایک سچا انسان تھا اور ہم اس سے موت

کے بعد کے حالات دریافت کریں گے“۔

(بقیہ حاشیہ سابقہ ص ۵۸) ملاحظہ ہو تفسیر تبیان، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر کشاف۔

جبکہ بعض دوسرے مفسرین ضمیر کا مرجع ”عاقبہ“ اور ”نہایہ“ کو جانتے ہیں، تو ایسی صورت میں آیت کا معنی یوں گا۔

”ما عاقبہ امرنا الا الموتة الاولى“

(دیکھئے تفسیر روح المعانی اور تفسیر المیزان)

البتہ نتیجے کے لحاظ سے ان میں چنداں فرق نہیں ہے۔

لے مفسرین نے اس جملے کی تفسیر میں کئی ادراحتات کو بھی ذکر کیا ہے جو سائے کے سائے بعینہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے ”موتہ اولیٰ“ کو اس دنیا میں موت قبل از حیات کے معنی میں لیا ہے، تو اس قول کی بنا پر اس جملے کا مفہوم یوں ہوگا کہ وہ موت جو اس حیات کے

بعد ہے فقط وہی موت ہے جو ہم اختیار کر چکے ہیں اور ہم سب مٹی تھے لیکن ہماری دوسری موت کے بعد پھر زندگی کا وجود ہرگز نہیں ہے۔

لے دیکھئے تفسیر مجمع البیان جلد ۹ ص ۶۶ اور بعض دوسری تفسیریں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب ان کے چیلے بہانے تھے۔ اگرچہ خداوند عالم کا طریقہ کار یہ نہیں ہے کہ مردوں کو اس دُنیا میں زندہ کئے تاکہ وہ اُس جہان کی خبریں اِس دُنیا میں لوگوں کو بتائیں، لیکن اگر بالفرض ایسا کام آنحضرتؐ سے انجام پا بھی جاتا تو پھر یہ لوگ کوئی اور راگ الاپنا شروع کر دیتے اور اسے جادو یا کسی اور چیز کا نام دے دیتے۔ جس طرح انہوں نے بارہا آنحضرتؐ سے معجزے طلب کیے اور آپؐ نے وہ معجزے انہیں دکھائے بھی لیکن وہ ان کا انکار کر دیتے۔

معاذ کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ

مشرکین، خاص کر مشرکین عرب کا اعتقادی مسائل میں ایک رویہ نہیں تھا۔ وہ عقیدہ مشرک میں مشترک ہونے کے باوجود اعتقادی خصوصیات میں ایک دوسرے سے زبردست اختلاف رکھتے تھے۔

کچھ لوگ تو وہ تھے جو نہ تو خدا کو مانتے تھے اور نہ ہی معاذ کو، یہ وہ لوگ تھے جن کی باتوں کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”ماھی الاحیاءنا الة نیا نموت ونحیا وما یمھلکنا الا الدھر“

”اِس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں، کچھ لوگ مرجاتے ہیں تو کچھ لوگ پیدا ہو جاتے

ہیں۔ اور ہمیں تو صرف طبیعت ہی موت دیتی ہے۔ (جاثیہ - ۲۴)

کچھ لوگ ایسے تھے جو خدا کو مانتے تھے اور بتوں کو اس کی بارگاہ کے لیے شفیع سمجھتے تھے، لیکن معاذ کے منکر تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کہا کرتے تھے:

”من یحی العظام وھو یمیم“

”ان گلی مٹری ہڈیوں کو کون دوبارہ زندہ کرے گا؟“ (یس - ۷۸)

یہ لوگ بتوں کے لیے حج بھی بجالاتے تھے اور قربانی بھی کیا کرتے تھے، حلال و حرام کے قائل بھی تھے۔ اور اکثر مشرکین عرب اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

بہت سے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرح سے بقائے رُوح کے قائل بھی تھے، خواہ تنازع اور تازہ

ابدان میں ارواح کے انتقال کی صورت میں یا کسی اور طرح سے۔ لہ

خاص کر ”حامۃ“ نامی ایک پرندے کے متعلق ان کا عقیدہ مشہور ہے۔ عربوں کی داستانوں میں مذکور ہے کہ ان میں

کچھ لوگ ایسے تھے جن کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانی رُوح ایک پرندہ ہے جو اس کے جسم میں پھیلا ہوا ہے۔ جب انسان مرجاتا ہے یا قتل ہو

جاتا ہے تو وہ اس کے جسم سے باہر آ کر اس کے جسم کا وحشت ناک صورت میں چکر لگانا شروع کر دیتا ہے اور اس کی قبر کے ارد

گرد و پا پھینتا رہتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ پرندہ پہلے پہل تو چھوٹا ہوتا ہے، لیکن بعد میں بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُلوجتنا، چلانا

ہے اور وہ ہمیشہ تنہائیوں میں رہتا ہے اور اس کا اکثر ٹھکانا پڑا نے کھنڈرات، خالی گھر، قبریں اور قتل گاہیں ہوتی ہیں۔
ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ اگر کسی کو قتل کر دیا جاتا تو ”ہامہ“ اس کی قبر پر بیٹھ کر یہ فریاد کرتا رہتا ہے:

”اسقونی فانی صدیۃ“

”مجھے پانی پلاؤ کیونکہ میں بہت پیاسا ہوں“۔ لہ

اسلام نے ان تمام خرافاتی عقائد پر خط تینچ کھینچ دیا، لہذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مشہور حدیث منقول ہے کہ:

”لاہامۃ“

”ہامہ کا عقیدہ جھوٹ ہے“۔ لہ

بہر حال اگرچہ وہ معاد اور انسان کی بعد از موت زندگی کی طرف واپسی کے معتقد نہیں تھے، لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرح کے تنازع اور بقائے رُوح کے قائل ضرور تھے۔

لیکن جہانی معاد کے متعلق قرآن نے جو تصریحات پیش کی ہیں ان سب کے منکر تھے۔ مثلاً انسان کی مٹی دوبارہ اکٹھی کی جائے گی اور وہ نئی زندگی کا آغاز کرے گا اور رُوح اور جسم مشترکہ طور پر معاد کے حامل ہوں گے، وغیرہ، وہ ان عقائد کا انکار ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان سے خائف بھی تھے۔ قرآن مجید نے مختلف بیانات کے ذریعہ ان عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کا ثبوت پیش کیا ہے۔

۳۷۔ اَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمٌ تُبَعِّعُ لَآ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ

كَانُوا مُجْرِمِينَ ○

۳۸۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِلْعَبِثِينَ ○

۳۹۔ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۳۷۔ آیا وہ بہتر ہیں یا قوم تبع اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟ ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا کیونکہ وہ مجرم لوگ تھے۔

۳۸۔ ہم نے آسمانوں کو اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

۳۹۔ ہم نے ان دونوں کو صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر

آیا وہ بہتر ہیں یا قوم تبع؟

سرزمین یمن جزیرۃ العرب میں واقع ہے اور اس کا شمار دنیا کی ایسی آباد اور بارکست زمینوں میں ہوتا ہے، جو ماضی میں

دُشمنہ تمدن کی حامل تھیں۔ اس سرزمین پر ایسے بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے جن کا نام ”بتع“ (جس کی جمع ”تبابعہ“ ہے) تھا۔ چونکہ لوگ ان کی ”اتباع“ کیا کرتے تھے، اس لیے ان کو ”بتع“ کہتے تھے یا پھر اس لیے کہ وہ کئی پشتوں تک یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آتے رہے۔

بہر حال، بتع کی قوم ایسے افراد پر مشتمل تھی جن کے پاس بے پناہ طاقت تھی اور جو وسیع وسیع مملکت کی مالک تھی۔ مشرکین مکہ اور ان کے معاد و قیامت کے انکار کے تذکرے کے بعد ”قوم بتع“ کی داستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ خدا کا عذاب قیامت ہی میں ان کا منتظر نہیں ہے بلکہ اس دُنیا میں بھی ”قوم بتع“ جیسی کافر اور گناہگار قوم جیسے انجام سے بھی دوچار ہوں گے۔

چنانچہ فرماتا ہے ”آیا وہ بہتر ہیں یا قوم بتع اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟ ہم نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا۔ کیونکہ وہ مجرم لوگ تھے۔ (اھم خیرا مرقوم تبع والذین من قبلہم اھلکناھم انھم کانتوا مجرمین)۔

ظاہر ہے کہ حجاز کے باشندے جو ”قوم بتع“ کے پڑوس میں رہتے تھے کہ کم و بیش ان کی سرگذشت سے بھی آگاہ تھے۔ اسی لیے آیت میں اس داستان کو تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا۔ بس اتنا کہا گیا کہ اس بات سے ڈرو کہ کہیں تمہارا انجام بھی بتع کی قوم یا اس جیسی دوسری قوموں کا سانہ ہو جو تمہارے ارد گرد شام و مصر کے رستوں میں تمہارے نزدیک رہتی تھی۔

بالفرض اگر تم قیامت کے منکر ہو بھی جاؤ تو کیا اس عذاب کا انکار کر سکتے ہو جو ان مجرم اور سرکش قوموں پر نازل ہوا؟
”الذین من قبلہم“ سے مراد قوم نوح، عاد اور ثمود جیسی قومیں ہیں۔

اور ”قوم بتع“ کے بارے میں انشا اللہ تفصیلی گفتگو بعد میں آئے گی۔

گفتگو کا رخ ایک بار پھر مسئلہ معاد کی جانب موڑ دیا گیا ہے اور لطیف پیرائے میں اس حقیقت کو استدلال کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، غرض سب کو بے فائدہ اور بے مقصد پیدا نہیں کیا (وما خلقت السموات والارض وما بینہما لاعبین)۔
یقیناً اس عظیم اور وسیع تخلیق کا کوئی مقصد ضرور ہے، اگر تمہارے بقول موت، زندگی کے خاتمے کا نام ہے اور چند روز تک کھانے، پینے، سونے، لذتیں اٹھانے اور حیوانی خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد یہ دُنیا و زندگی فنا ہو جائے گی اور تمام چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا، پھر تو یہ آفرینش بے کار و بیہودہ اور بے فائدہ ہوگی۔

لیکن یہ ماننے والی بات نہیں ہے کہ صاحب قدرت و حکمت خدا نے اس قدر عظیم کائنات کو صرف اس چند روزہ اور

۱۔ ”لاعب“ ”لعب“ کے مادہ سے ہے اور راغب کے بقول اس عمل کو کہتے ہیں جو کسی صحیح ارادہ کے بغیر انجام پائے اور ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ ”ما بینہما“ میں تشبیہ کی ضمیر آسمان اور زمین کو جوہر سے ہے۔

زود گزر زندگی کے لیے بے مقصد اور طرح طرح کے رنج و غم اور دکھ درد کے ہمراہ تخلیق کیا ہو۔ یہ بات خدا کی حکمت کے چند شایان شان نہیں۔

بنابریں اس کائنات کا وضعی مشاہدہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کائنات ایک اور عظیم تر اور ابدی و دائمی کائنات کے لیے ایک دالان کی حیثیت رکھتی ہے۔ تم اس بارے میں غور و فکر سے کام کیوں نہیں لیتے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ مثلاً سورۃ انبیاء آیت ۱۶ میں فرمایا گیا ہے:

”وما خلقتنا السماء والارض وما بينهما لاعبین“

سورۃ واقفہ کی آیت ۶۲ میں ہے:

”ولقد علمتم النشأة الاولى فلولا تذکرون“

”تم اپنی پہلی نشأۃ کو دیکھ چکے ہو پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے؟“

بہر حال اس دنیا کی تخلیق اس وقت با مقصد ہوگی جب ایک اور کائنات اس کے بعد ہو، اس لیے تو الحادی مکتب فکر کے پیروکار اور مواد کے منکرین اس کائنات کی تخلیق کو بے مقصد اور بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ پھر اس بات کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان دونوں کو صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (ما خلقتنا ہما الا بالحق)۔

اس کائنات کا برحق ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا کوئی معقول ہدف اور مقصد ہو اور یہ مقصد اس وقت پورا ہوتا ہے جب ایک اور جہاں کے وجود کو تسلیم کیا جائے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اس کا حق ہونا اس بات کا خواہاں ہے کہ نیک اور بدکار افراد یکساں نہ ہوں۔

چونکہ ہم کو اس دنیا میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ تیکو کاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا صحیح معنی میں ملتی ہو، اسی لیے حق کا تقاضا یہی ہے کہ ایک اور جہاں میں حساب و کتاب اور سزا و جزا ہوتا کہ ہر شخص اپنے کیے کا پھل پالے۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت میں ”حق“ ایک تو تخلیق کائنات کے با مقصد ہونے کی طرف اشارہ ہے دوسرے انسانوں کی آزمائش کی طرف، تیسرے قانون ارتقار کی طرف اور چوتھے اصول عدالت کے اجراء کی طرف۔

”لیکن ان میں سے اکثر لوگ ان حقائق کو نہیں جانتے۔ (ولکن اکثر ہم لا یعلمون)۔“

کیونکہ وہ اپنی سوجھ بوجھ اور سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ اگر وہ ایسا کرنے لگ جائیں تو مبادیہ و مواد کے دلائل واضح اور آشکار صورت میں موجود ہیں۔

قوم تبع کون تھی؟

قرآن مجید میں صرف دو مقامات پر ”تبع“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ایک تو انہی آیات میں اور دوسرے سورۃ ”ق“ کی

۱۲ ویں آیت میں جہاں پر ارشاد ہوتا ہے:

”واصحاب الايكة وقوم تبع كل كذب الرسل فحق وعيد“
”گھنے درختوں کی سزمین والی قوم شعیب اور قوم تبع، ہر ایک نے خدا کے رسولوں کو جھٹلایا
تو خدا کی تمہیں بھی ان کے بارے میں سچ ثابت ہوگئی۔“

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ”تبع“ یمن کے بادشاہوں کا ایک عمومی لقب تھا، جس طرح ایران کے بادشاہوں کو کسریٰ ترک، سلاطین کو خاقان، مصر کے بادشاہوں کو فرعون اور روم کے شہنشاہوں کو قیصر کہا جاتا تھا۔
یمن کے بادشاہوں کو ”تبع“ یا تو اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہ لوگوں کو اپنی پیروی کی دعوت دیا کرتے تھے، یا پھر اس کے لیے کہ وہ یکے بعد دیگرے سریر آرائے منکمت ہوا کرتے تھے۔

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے یمن کے تمام بادشاہوں کی بات نہیں کی، بلکہ کسی خاص بادشاہ کا ذکر کیا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے معاصر خاص فرعون کی بات کی ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس کا نام ”اسعد الکرب“ تھا۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ وہ بذات خود حق طلب اور صاحب ایمان شخص تھا، انہوں نے قرآن مجید کی دونوں آیات سے استدلال کیا ہے، کیونکہ قرآن پاک کی مذکورہ دونوں آیات میں اس کی ذات کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ اس کی قوم کی مذمت کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جانے والی روایت بھی اسی بات کی شاہد ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

”لا تسبوا تبعاً فانہ قد اسلم“

”تبع“ کو بوجہ امت کہو کیونکہ وہ ایمان لایا تھا۔“

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

”ان تبعاً قال للاوس والخزرج كودنوا هاهنا حتى

يخرج هذا النبی، اما اننا لو ادركته لخدمته وخرجت

معه“

”تبع نے اوس اور خزرج سے کہا: تم ہمیں پرہ جاؤ! یہاں تک کہ اس پیغمبر کا ظہور ہو جائے، اگر مجھے ان کا زمانہ نصیب ہو جاتا تو میں ان کی پوری پوری خدمت کرتا، اور

ان کے ساتھ قیام کرتا۔ لہ

ایک اور روایت میں ہے کہ جب ”تبع“ اپنے کشتور کشانی کے ایک سفر میں مدینہ کے قریب پہنچا تو وہاں کے ساکن یہودی علماء کو پیغام بھیجا کہ اس سرزمین کو ویران کرنا چاہتا ہوں تاکہ کوئی بھی یہودی اس جگہ نہ رہنے پائے، اور عرب قانون حکم فرما ہو۔

یہودیوں کا سب سے بڑا عالم شامول تھا۔ اس نے کہا: اے بادشاہ! یہ وہ شہر ہے جو حضرت اسماعیل کی نسل سے پیدا ہونے والے ایک پیغمبر کی ہجرت گاہ بنے گا۔ پھر اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند صفات گنوائیں۔ ”تبع“ جس کے ذہن میں گویا اس بارے میں کچھ معلومات تھیں، نے کہا: تو پھر اس شہر کو ویران نہیں کروں گا۔ لہ
حتیٰ کہ ایک اور روایت میں اسی داستان کے ذیل میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس نے ”اوس“ اور ”خزرج“ کے بعض قبائل کو جو اس کے ہمراہ تھے، حکم دیا کہ وہ اسی شہر میں رہ جائیں اور جب پیغمبر موعود ظہور کریں تو وہ ان کی امداد کریں اور اپنی اولاد کو بھی وہ اسی بات کی وصیت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس نے ایک خط بھی تحریر کر کے اس کے سپرد کر دیا، جس میں پیغمبر اسلام پر ایمان لانے کا اظہار کیا گیا تھا۔ لہ
صاحبِ اعلام قرآن رقمطراز ہیں:

”تبع“ یمن کے عالمگیر بادشاہوں میں سے ایک تھا کہ جس نے ہندوستان تک فوج کشی کی اور اس علاقے کی تمام حکومتوں کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ اپنی فوج کشی کی ایک مہم کے دوران میں وہ مکہ معظمہ پہنچا اور اس نے خانہ کعبہ کے منہدم کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن وہ ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا کہ طیب اس کے معالجات سے عاجز آگئے۔

اس کے ہمراہوں میں کچھ اہل علم بھی موجود تھے، جن کا سرپرست شامول نامی ایک حکیم تھا، اس نے کہا: آپ کی بیماری کا اصل سبب خانہ کعبہ کے بارے میں بُری نیت ہے۔

”تبع“ اپنے مقصد سے باز آ گیا اور نذر مانی کہ وہ خانہ کعبہ کا احترام کرے گا اور صحت یاب ہونے کے بعد خانہ کعبہ پر میانہ چادر کا غلاف چڑھائے گا۔

دوسری تاریخوں میں بھی خانہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کی داستان منقول ہے جو تو اتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ یہ

لہ تفسیر مجمع البیان، انہی آیات کے ذیل میں۔

لہ تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ ص ۱۱۸۔

لہ تفسیر روح المعانی جلد ۲۵ ص ۱۱۸۔

فوج کشی اور کعبہ پر غلاف چڑھانے کا مسئلہ شہ عیسوی میں وقوع پذیر ہوا۔ اب بھی شہر مکہ میں ایک جگہ موجود ہے جس کا نام "دار التباہ" ہے۔ لہ

بہر حال یمن کے بادشاہوں (تباہ یمن) کی داستان کا ایک بہت بڑا حصہ تاریخی لحاظ سے ابہام سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی تعداد اور انکی حکومت کے عرصہ کے بارے میں زیادہ معلومات مہیا نہیں ہیں۔ اس بارے میں بعض متضاد روایتیں بھی ملتی ہیں۔ جو کچھ اسلامی روایات میں ہے وہ تفسیری مواد ہو یا تاریخی اور حدیثی، صرف اسی بادشاہ کے بارے میں ہے، جس کا قرآن میں دو مرتبہ ذکر ہوا ہے۔

- ۴۰۔ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ اَجْمَعِينَ ۝
 ۴۱۔ يَوْمَ لَا يَغْنِي مَوْلَى عَنْ مَوْلَى شَيْئًا وَلَا هُمْ يَنْصُرُونَ ۝
 ۴۲۔ اِلَّا مَنْ رَحِمَ اللهُ طِنَّةٌ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝

ترجمہ

- ۴۰۔ (باطل سے حق کی) جدائی کا دن ان سب کے لیے مقرر گھڑی ہے۔
 ۴۱۔ جس دن کوئی دوست اپنے دوست کی ذرہ بھرا امداد نہیں کر سکے گا اور کسی طرف سے انہیں کمک نہ پہنچ سکے گی۔
 ۴۲۔ مگر جس پر خدا اپنی رحمت کرے، کیونکہ وہی عزیز و رحیم ہے۔

تفسیر

جدائی کا دن یا یوم الفصل

زیر نظر آیات درحقیقت معاد کے بارے میں گزشتہ آیات کا نتیجہ ہیں کہ جن میں اس کائنات کی تخلیق کی حکمت کے حوالے سے قیامت کے وجود پر استدلال کیا گیا تھا۔
 سب سے پہلی آیت میں اس استدلال سے یہ نتیجہ حاصل کیا جا رہا ہے کہ ”یوم الفصل“ یا جدائی کا دن ان سب کے لیے مقرر گھڑی ہے (اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ اَجْمَعِينَ)۔
 قیامت کے دن کو ”یوم الفصل“ سے تعبیر کرنا کس قدر دلچسپ ہے کہ جس روز حق کو باطل سے جدا کر دیا جائے گا اور نیک لوگوں کی صفیں بدکاروں سے علیحدہ ہو جائیں گی، اور انسان اپنے نزدیک ترین دوستوں تک سے جدا ہو جائے گا۔ جی ہاں وہی دن تمام مجرمین کیلئے

مقرر شدہ ہے۔ لہ

پھر اس جہائی کے دن کی کچھ تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے؛ اس دن کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی فریاد کو نہیں پہنچے گا اور کوئی دوست اپنے دوست کی ذرہ بھر امداد نہیں کر سکے گا اور کہیں سے انہیں لگتے نہیں پہنچے گی۔ (یوم لا یغنی مولیٰ عن مولیٰ شیئاً ولا ہم ینصرون)۔

یقیناً! وہی دن فصل اور جہائی کا دن ہوگا کہ جب انسان اپنے عمل کے سوا باقی تمام چیزوں سے جدا ہو جائے گا۔ ”مولیٰ“ جس معنی میں بھی ہو یعنی دوست ہو یا سرپرست، دلی نعمت ہو یا قریبی رشتہ دار، ہمسایہ ہو یا مددگار وغیرہ قیامت کی مشکلات میں ایک معمولی سی مشکل بھی حل کرنے سے عاجز ہوگا۔

”مولیٰ“ ولاء کے مادہ سے ہے جس کا معنی دو چیزوں کا ایسا باہمی لاابظہ ہے جن کے درمیان کوئی اجنبی نہ ہو۔ اس معنی کے کئی مصداق ہیں، جو لغت کی کتابوں میں اس لفظ کے مختلف معانی کے طور پر ذکر ہوئے ہیں، کیونکہ ان سب کی بنیاد اور اصل معانی مشترک ہیں۔ لہ

وہاں پر نہ صرف دوست ایک دوسرے کی فریاد کو نہیں پہنچ سکیں گے اور رشتہ دار ایک دوسرے کی گمشدگی نہیں کر سکیں گے بلکہ تمام منصوبے نقش بر آب ثابت ہوں گے، تمام تدبیریں الٹی ہو جائیں گی اور تمام تیر نشانے سے چوک جائیں گے جیسا کہ سورہ طور کی آیت ۲۶ میں ہے۔

”یوم لا یغنی عنہم کیدہم شیئاً ولا ہم ینصرون“

”وہ دن ایسا ہوگا کہ جس میں ان کی تمام تدبیریں کسی مشکل کو حل نہیں کر پائیں گی اور ان کی کسی قسم کی مدد نہیں کی جاسکے گی۔“

”لا یغنی“ اور ”ولا ہم ینصرون“ میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں بہترین قول یہ ہے کہ پہلا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی شخص اکیلا اور بذات خود اس دن کسی کی کوئی مشکل حل نہیں کر سکے گا اور دوسرا جملہ اس بات کی

لہ ”میساتھم“ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے، اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔ بعض مفسرین اسے تمام انسانوں کی طرف پٹاتے ہیں۔ بعض مفسرین بالخصوص ان اقوام کی طرف جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے۔ یعنی جمع کی قوم اور اس سے پہلے کی ظالم اقوام، لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

لہ لغت کی کتابوں میں ”مولیٰ“ کے بہت سے معانی ذکر ہوئے ہیں، حتیٰ کہ بعض ارباب لغت نے اس کے ستائیس سے زیادہ معانی لکھے ہیں۔ ۱۔ رب، ۲۔ چچا، ۳۔ چچا زاد بھائی، ۴۔ بیٹا، ۵۔ بھانجا، ۶۔ آزاد کرنے والا، ۷۔ آزاد ہونے والا، ۸۔ بندہ، ۹۔ مالک، ۱۰۔ تابع، ۱۱۔ جس کو نعمت مل چکی ہو، ۱۲۔ شریک، ۱۳۔ ہم پیمان، ۱۴۔ دوست، ۱۵۔ ہمسایہ، ۱۶۔ ہمان، ۱۷۔ داماد، ۱۸۔ قریبی رشتہ دار، ۱۹۔ نعمت عطا کرنے والا، ۲۰۔ صالح ہونے والا، ۲۱۔ سرپرست، ۲۲۔ زیادہ مناسب، ۲۳۔ آقا، ۲۴۔ دوست رکھنے والا، ۲۵۔ مددگار، ۲۶۔ اولیٰ بالتحرف، ۲۷۔

طرف اشارہ ہے کہ سب مل کر بھی ایک دوسرے کی مشکلات حل نہیں کر سکیں گے، کیونکہ نصرت کا اطلاق ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں کوئی شخص کسی دوسرے کی امداد کو پہنچے اور اس کی مدد کرے تاکہ دونوں مل کر مشکلات پر قابو پالیں۔

وہاں پر صرف ایک گروہ مستثنیٰ ہوگا، جیسا کہ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے؛ مگر وہ کہ جس پر خدا نے رحمت کی ہو، کیونکہ خدا صاحبِ غلبہ اور رحیم ہے (الآن من رحم اللہ انہ هو العزیز الرحیم)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ خدا کی یہ رحمت بلا شرط نہیں ہے، بلکہ صرف ان مومنین کے شامل حال ہوگی جو عمل صالح انجام دے چکے ہیں اور اگر ان سے کوئی لغزش سرزد ہوئی بھی ہوگی تو بھی اس حد تک نہیں کہ ان کے خدا کے ساتھ رابطے کو منقطع کرنے۔ ایسے ہی لوگ لطفِ الہی کے دامان سے وابستہ ہوں گے۔ اس کے دریا نے جو دو کرم سے پہرہ در، اس کے چشمہ رحمت سے سیراب اور اس کے اولیاء کی شفاعت کے حق دار ہوں گے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس دن ہر قسم کے دوست، ولی اور یا دور کی نفی مسئلہ شفاعت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ شفاعت بھی اذن و فرمانِ رب العزت کے بغیر حاصل نہیں ہوگی۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ خدا کے "عزیز" اور "رحیم" ہونے کی صفات ایک دوسرے کے ساتھ ذکر ہوئی ہیں جن میں سے پہلی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے انتہا قدرت کا مالک اور ناقابل شکست ہے اور دوسری اس کی بے پایاں رحمت کی طرف اشارہ ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ قدرت رکھنے کے باوجود رحمت کا مالک ہے۔ اہل بیت اطہار سے منقول بعض روایات میں ہے کہ "الآن رحم اللہ" سے مراد وحی رسول امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور ان کے پیروکار ہیں۔ لہ

ظاہر ہے کہ ایسی روایات کا مقصد آیت کا ایک واضح مصداق بیان کرنا ہے۔

- ۲۳۔ اِنَّ شَجَرَتَ الرَّقُوْمِ ۙ
 ۲۴۔ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۙ
 ۲۵۔ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُوْنِ ۙ
 ۲۶۔ كَغَلِي الْحَمِيْمِ ۙ
 ۲۷۔ خُذُوْهُ فَاَعْتَلُوْهُ اِلَى سَوَاءِ الْجَحِيْمِ ۙ
 ۲۸۔ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۙ
 ۲۹۔ ذُقْ ۙ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۙ
 ۵۰۔ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۙ

ترجمہ

- ۲۳۔ تھوہر کا درخت ...
 ۲۴۔ گناہگاروں کی سزا ہے۔
 ۲۵۔ پگھلی ہوئی دھات کی طرح، پیٹ میں ابال کھائے گا۔
 ۲۶۔ جیسے کھولتا ہوا پانی۔
 ۲۷۔ اس مجرم کا نر کو بچڑو اور دوزخ کے بیچ میں پھینک دو۔
 ۲۸۔ پھر اس کے سر پر کھولتا ہوا عذاب ڈالو۔

۴۹۔ (اس سے کہا جائے گا) مزا چکھ، کیونکہ تو (اپنے خیال کے مطابق) زبردست طاقت ور اور قابل احترام تھا۔

۵۰۔ یہ وہی چیز ہے جس میں تم لوگ ہمیشہ شک کیا کرتے تھے۔

تفسیر

تھوہر کا درخت

گذشتہ آیات میں ”یوم الفضل“ یا جدائی کے دن کی بابت بات ہو رہی تھی، لیکن ان آیات میں دوزخیوں کے دشت ناک اور لرزادینے والے عذاب کی ایک جھلک پیش کی جا رہی ہے جو درحقیقت گذشتہ آیات کا تتمہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تھوہر کا درخت۔ (ان شجرت الزقوم)۔

گناہگاروں کی مزا ہے۔ (طعام الاثیم)۔

یہی لوگ ہوں گے جو اس کڑوے بد مزہ بدبودار اور مہلک درخت کو کھائیں گے۔

جیسا کہ ہم سورہ صافات کی آیت ۶۲ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ مفسرین اور ارباب لغت کے بقول ”زقوم“ ایک ایسے پودے کا نام ہے جو کڑوا، بد مزہ اور بدبودار ہوتا ہے، جس کے پتے چھوٹے ہوتے ہیں اور جزیرۃ العرب کی سرزمین ”تہامہ“ میں پیدا ہوتا ہے اور جس سے مشرکین بھی آشنا تھے۔ یہ ایک ایسا پودا ہے جس کا شیره کڑوا ہوتا ہے۔ اگر یہ شیره بدن کو لگ جائے تو بدن سوج جاتا ہے۔ لہ

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ”زقوم“ کا اصلی معنی ”نگنا“ ہے۔ لہ

جبکہ بعض دوسرے لوگوں نے اسے جہنیوں کی ہر قسم کی نفسرت انجیز غذا کے معنی میں لیا ہے۔ لہ

ایک روایت میں ہے کہ جب یہ لفظ قرآن مجید میں نازل ہوا تو کفار قریش کہنے لگے، اس قسم کا پودا ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتا، تم میں سے کس شخص کو ”زقوم“ کے معنی کا علم ہے؟ تو وہاں پر ایک افریقی شخص بھی موجود تھا۔ اس نے

لہ تفسیر مجمع البیان، تفسیر روح البیان اور تفسیر روح المعانی۔

لہ لسان العرب مادہ ”زقم“۔

لہ مفردات راجع مادہ ”زقم“۔

کہا " ہماری زبان میں " زقوم " کا معنی " کھجور اور مکھن ہے " شاید اس کا مقصد بھی مذاق اڑانا تھا، جب ابو جہل نے یہ بات سنی تو اس نے استہزاء کے طور پر اپنی کینز کو بلا کر کہا " تھوڑا سا مکھن اور خرمالے آؤ تاکہ اس سے زقوم بنائیں " چنانچہ " زقوم " تیار کیا گیا اور وہ کھاتے بھی جاتے تھے اور مذاق بھی اڑاتے جاتے تھے اور کہتے تھے " محمد، ہمیں اسی چیز سے ڈراتا ہے "۔

ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ لغت عرب اور قرآنی استعمال میں " شجرہ " کا لفظ کہیں پر تو " درخت " کے معنی میں آیا ہے اور کہیں پر مطلق " پودے " کے معنی میں۔

" اشیم " " اشم " کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ایسا شخص جو ہمیشہ گناہوں میں غرق رہتا ہے " یہاں پر ہٹ دھرم، حد سے تجاوز کرنے والے اور گناہوں میں غرق کفار مراد ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: پگھلی ہوئی دھات کی طرح وہ گناہگاروں کے پیٹ میں ابال کھائے گا۔ (کالمہل یغلی فی البطون)۔

جیسے کھولتا ہوا پانی۔ (کغلی الحیم)۔

بہت سے مفسرین اور ارباب لغت کے بقول " مہل " کے معنی پگھلی ہوئی دھات ہے اور مفردات میں راغب نے اور بعض دوسرے صاحبان لغت نے اس کا معنی " گھی یا تیل کی تلچھٹ " بتایا ہے، جو نہایت ہی ناپسندیدہ چیز ہوتی ہے لیکن اس کا پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

" حیم " کے معنی " کھولتا ہوا گرم پانی " ہے اور کبھی اس کا اطلاق گہرے اور پختے دوست پر بھی ہوتا ہے، لیکن یہاں پر پہلا معنی مراد ہے۔

بہر حال جب تھوہران کے جسم میں پینچے گا تو انتہائی زیادہ حرارت پیدا کر کے کھولتے ہوئے پانی کے مانند پیٹ میں ابال پیدا کر دے گا، یہ غذا قوت اور طاقت کا ذریعہ بننے کے بجائے مصیبت، عذاب اور دکھ درد کا سبب بن جائے گی۔

پھر فرمایا گیا ہے کہ دوزخ پر مامور فرشتوں کو خطاب ہوگا: گناہوں میں غرق ان مجرموں کو پکڑو اور انہیں جہنم میں پھینک دو۔ (خذوا فاعتلوہ الی سواء الجحیم)۔

" فاعتلوہ " "عتل" (بروزن "قتل") کے مادہ سے ہے، جس کا معنی پکڑنا، گھسیٹنا اور پھینکنا ہے۔ جیسا برتاؤ

قانون کی خلاف ورزی کرنے والے سرکش مجرمین کے ساتھ سرکاری کارندے کرتے ہیں۔

" سواء " کا معنی "درمیان" ہے، کیونکہ اس کا فاصلہ ہر طرف سے مساوی ہوتا ہے۔ ایسے افراد کو جہنم کے درمیان میں

لے جانے کا مقصد یہ ہوگا کہ وہاں کی حرارت نسبتاً زیادہ شدید ہوگی اور آگ کے شعلے اسے ہر طرف سے گھیرے ہوں گے۔

پھر ان کی ایک اور المناک سزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پھر دوزخ پر مامور فرشتوں کو حکم دیا

جائے گا اس کے سر پر کھولتا ہوا عذاب ڈالوا ثم صبوا فوق رؤسہ من عذاب الحمیم)۔^۱
اس طرح سے ایک تودہ اندر سے جلیں گے اور دوسرے باہر سے جہنم کی آگ ان کے تمام وجود کو اپنی لپیٹ میں لے گی اور آگ کے درمیان میں بھی ان پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور آیت سورہ حج میں بھی بیان ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:
”یصب من فوق رؤوسہم الحمیم“ (حج، ۱۹)

ان تمام دردناک جسمانی عذابوں کے بعد انہیں جانکاہ روحانی سزائوں سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ ارشاد ہوتا ہے، کہ اس گناہگار سرکش اور بے ایمان مجرم سے کہا جائے گا: مزہ چکھو! کیونکہ تو وہی شخص تو ہے جو بزعم خویش سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ قابل احترام تھا۔ (ذق اذک انت العزیز للکریم)۔

تو ہی تو تھا جس نے بینوا مظلوموں کو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، ان پر ظلم و ستم کیا کرتا تھا۔ اپنی ناقابل تسخیر طاقت کا لوہا منوانے کے دپے تھا اور لوگوں سے اپنا بہت زیادہ احترام کرواتا تھا۔

جی ہاں! یہ تو ہی تھا کہ اس تمام غرور کے ساتھ ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کیا کرتا تھا۔ اب تو اپنے تمام اعمال کا مزہ چکھ کہ سب کچھ تیری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو چکا ہے۔ جس طرح تو دنیا میں لوگوں کے جسم و روح کو جلا یا کرتا تھا اب تو خود اندر اور باہر سے خدا کے قہر کی آگ اور کھولتے ہوئے گرم پانی میں جل رہا ہے۔

روایت میں ہے کہ ایک دن رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجہل کا ہاتھ پکڑ کر کہا،
”اولی لک فناولی“

”ابوجہل! انتظار کرو، انتظار“

یہ سن کر ابوجہل ناراض ہو گیا اور اپنا ہاتھ چھڑا کر کہنے لگا:

”بای شیء تهددنی؟ ما لتستطیع انت وصاحبک ان تفعلابی شیئاً!

انی لمن اعزہذا الوادی واکرمہ“

”مجھے کس بات کی دھمکی دے رہے ہو؟ نہ تو تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو اور نہ ہی تمہارا صاحب

(خدا) میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ میں مکہ کی تمام دھرتی میں سب سے زیادہ طاقت ور اور صاحب

احترام شخصیت ہوں“

مندرجہ بالا آیت اسی چیز کو بیان کر رہی ہے۔ آیت کہتی ہے کہ جب اسے آتش جہنم میں ڈالا جائے گا تو اسے

کہا جائے گا: اے طاقت ور سرزمین مکہ کے معزز انسان! اس عذاب کا مزہ چکھ۔^۲

^۱ ”عذاب الحمیم“ اضافت بیانہ“ ہے یعنی یہ کھولتا ہوا گرم پانی ایک عذاب ہے جو ان پر ڈالا جائے گا۔

^۲ تفسیر مراغی جلد ۲۵ ص ۱۲۵ (اسی آیت کے ذیل، تفسیر روح المعانی اور تفسیر کبیر فیخر الدین رازی۔)

اس سلسلے کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: انہیں خطاب ہوگا، یہ وہی چیز ہے، جس کے بارے میں تم لوگ ہمیشہ شک و شبہ کیا کرتے تھے۔ (ان ہذا ما کُنْتُمْ بِہِ تَمْتَرُونَ)۔

قرآن کی کس قدر آیات میں مختلف دلائل کے ذریعے اس دن کی حقیقت تمہارے گوش گزار کی گئی؟ آیا ہم نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم قیامت کا ثبوت عالم نباتات میں دیکھو کیونکہ ”کذالک الخروج“ قیامت کے دن تم بھی اسی طرح زندہ کیے جاؤ گے۔ (ق - ۱۱)

آیا تمہیں نہیں کہا تھا کہ جس طرح بارش مردہ زمینوں کو زندہ کرتی ہے تمہارا حشر و نشر بھی اسی طرح آسان ہے ”کذالک النشور“ (فاطر - ۹)

کیا تمہیں نہیں بتایا گیا تھا کہ مردوں کو زندہ کرنا خدا کے لیے بہت آسان ہے ”وذاک علی اللہ یسیر“ (تغابن - ۷)

کیا تمہیں نہیں کہا گیا تھا کہ آیا پہلی تخلیق ہمارے لیے مشکل تھی کہ تم قیامت کے بارے میں شک کرتے ہو؟ ”افعیینا بالخلق الاول“ (ق - ۱۵)

خلاصہ کلام مختلف طریقوں سے حقیقت تم سے بیان کر دی گئی تھی، لیکن افسوس کہ تمہارے پاس سننے والے کان نہیں تھے۔

جسمانی اور روحانی سزائیں

ہم جانتے ہیں کہ قرآنی تصریحات کے مطابق معاد دو پہلوؤں کی حامل ہے، ایک جسمانی اور دوسرے روحانی۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ سزا اور جزا بھی دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہو، لہذا آیات و روایات میں ان دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ عوام الناس کی زیادہ توجہ جسمانی پہلو کی طرف ہوتی ہے۔ لہذا زیادہ تر وضاحت اور تشریح بھی جسمانی سزا و جزا کی لگتی ہے۔ لیکن روحانی سزا اور جزا کی طرف بھی کم اشارات نہیں ہیں۔

اسی بات کا ایک واضح نمونہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں دیکھ لیا ہے کہ جن میں کچھ دردناک جسمانی سزائوں کو بیان کرنے کے بعد مستحکم اور سرکش ظالموں کو روحانی سزائوں کی طرف معنی خیز اشارے ملتے ہیں۔

قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی روحانی جزائوں کے بارے میں اشارے ملتے ہیں سورہ توبہ کی آیت ۲، میں فرمایا گیا ہے:

”ور حنوان من اللہ اکبر“

”خدا کی خوشنودی اور رضامندی تمام جزائوں سے برتر ہے۔“

سورہ یس آیت ۵۸ میں فرمایا گیا ہے:

”سلام قولاً من رب رحیم“

” ان کے لیے سلام و مبارک بادی ہے رحیم اور مہربان خدا کی جانب سے،“

سورۃ حجر کی ۴۷ ویں آیت میں ہے:

” و نزعنا ما فی صدورہم من غلّ اخوانا علیٰ سدر متقابلین۔“

” ہم ان کے دلوں سے ہر قسم کا حسد، کینہ اور دشمنی نکال دیں گے، سب بھائی بھائی ہوں گے

اور تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے براجمان ہوں گے۔“

صاف ظاہر ہے کہ وہاں کی روحانی لذتیں بھی وسیع اور بے انتہا ہوں گی کہ جن کی تعریف و توصیف نہیں کی جا

سکتی۔ اسی لیے قرآنی آیات میں بھی عام طور پر صرف اشاروں اشاروں سے کام لیا گیا ہے لیکن روحانی سزاؤں کو حقارت

ڈانٹ ڈپٹ، سرزنش، افسوس اور رنج و غم کی صورت میں منعکس کیا گیا ہے کہ جن کا ایک نمونہ مندرجہ بالا آیات میں

آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

- ۵۱۔ اِنَّ الْمُتَّقِينَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۝
 ۵۲۔ فِيْ جَنَّتٍ وَعُيُوْنٍ ۝
 ۵۳۔ يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقْبِلِيْنَ ۝
 ۵۴۔ كَذٰلِكَ تَقَفَّ وَاَوْجُنُهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝
 ۵۵۔ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِيْنِيْنَ ۝
 ۵۶۔ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَةَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُولٰٓئِ وَوَقَّهُمْ عَذَابَ
 الْجَحِيْمِ ۝
 ۵۷۔ فَضَلًا مِّنْ تَرْتِيْبِكَ ۙ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

ترجمہ

- ۵۱۔ پرہیزگار لوگ امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔
 ۵۲۔ باغوں اور چشموں میں۔
 ۵۳۔ ریشم کی نازک اور دبیز پوشائیں پہنیں گے۔ اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔
 ۵۴۔ اسی طرح ہیں بہشت والے، اور ہم ان کی حوالہ لینے کے ساتھ تزیین کریں گے۔
 ۵۵۔ وہ جس قسم کے پھل چاہیں گے انھیں دیئے جائیں گے، وہاں پر نہایت اطمینان

سے رہیں گے۔

۵۴۔ وہاں پہلی دفعہ کی موت کے سوا جس کی دنیا میں تلخی چکھ چکے ہیں، ان کو موت کی تلخی چکھنی نہ پڑے گی، اور خدا اٹھیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا۔
۵۷۔ یہ تمہارے پروردگار کا فضل اور اس کی بخشش ہے، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر

پرہیزگار لوگ اور بہشت کی گونا گون نعمتیں

چونکہ گذشتہ آیات میں جنمیوں کے دردناک عذاب کا تذکرہ تھا، لہذا ان آیات میں اہل بہشت کی نعمتوں اور جزا کو شمار کر کے ان ہردو کی اہمیت کو زیادہ آشکار کیا گیا ہے۔
اہل بہشت کی جزا کو سات قسموں میں خلاصہ کیا گیا ہے:
پہلی یہ کہ "پرہیزگار لوگ امن و امان کی جگہ میں ہوں گے" (ان المتقين في مقام امين)۔
اسی لیے انہیں کسی تکلیف اور بے چینی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ آفات و بلیات، رنج و غم اور شیطانوں اور طاغوتوں سے بالکل محفوظ ہوں گے۔

پھر دوسری نعمت کو بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ باغوں اور چشموں میں رہیں گے اور ان کی قیام گاہوں کو ہر طرف سے چشموں اور باغوں نے اپنے گھیرے میں لیا ہوگا۔ (فی جنات و عيون)۔
"جنات" (گھنے باغات) کی تعبیر شاید باغوں کی مختلف تعداد کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ بہشت کے سب باغات یکساں نہیں ہیں، بلکہ بہشتیوں کے مختلف درجات کی وجہ سے باغات بھی مختلف ہوں گے۔
تیسرے مرحلے پر ان کے زیبا اور خوبصورت لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ نرم و نازک اور ضخیم

لے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "امین" کو مقام اور جگہ کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، گویا بہشت والوں کا خود مقام امین ہوگا اور ان سے کسی قسم کی خیانت کا اظہار نہیں کرے گا، اس قسم کی تعبیرات عام طور پر تاکید اور مبالغے کے لیے آتی ہیں۔

دبیز ریشمی لباس زیب تن کریں گے اور تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ (سیلسون من سندس واستبرق متقابلین)۔

”سندس“ ریشم کے نرم و نازک اور لطیف کپڑے کو کہتے ہیں۔ بعض نے اس کے ساتھ زربافت کی قید بھی لگائی ہے۔ یعنی زربافت نرم و نازک ریشمی کپڑا۔

”استبرق“ ریشم کے ضخیم اور دبیز کپڑے کو کہتے ہیں۔ بعض اہل لغت اسے ”استبر“ یا ”ستبر“ (بمعنی ضخیم) فارسی لفظ کا معرب سمجھتے ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اسے عربی کا لفظ ”برق“ (چمک دکھ) سے لیا گیا ہو جو جس خاص چمک دکھ کے جو اس قسم کے کپڑوں میں ہوتی ہے۔

البتہ بہشت میں نہ تو سخت سردی ہوگی اور نہ ہی سخت گرمی کہ جسے اس قسم کے لباس کے ذریعے روکا جائے، بلکہ یہ بہشت والوں کے گونا گوں اور طرح طرح لباسوں کی طرف اشارہ ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ہمارے الفاظ و کلمات جو دنیا میں ہماری روزمرہ کی مباحث پر اصرار کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں اس عظیم اور مشکل جہان کے مسائل بیان کرنے پر قادر نہیں ہیں بلکہ صرف ان کی طرف ایک اشارہ ہو سکتے ہیں۔ بعض علماء نے لباس کے مختلف ہونے کو اہل بہشت کے مقام قرب کے تفاوت کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ بہشت والوں کا ایک دوسرے کے زور و بڑبڑیٹنا اور ان کے درمیان ہر قسم کے امتیاز اور برتری کی نفی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی باہمی نشستوں میں انس و محبت اور اخوت اور بھائی چارے کی رُوحِ علم فرما ہوگی اور اس فضائیں صدق و صفا اور روحانیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

چوتھے مرحلے میں ان کی ازواج کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جی ہاں! اسی طرح ہیں اہل بہشت اور ہم انکی حوا عین کے ساتھ تزویج کر دیں گے۔ (كذالك وزوجنا هم بحور عین)۔

”حور“ جمع ہے ”حوراء“ اور ”حور“ کی جس کا معنی ہے، اس کی آنکھوں کی سیاہی مکمل طور پر سیاہ اور سفیدی مکمل طور پر شفاف ہے۔

”عین“ (بروزن ”عین“) ”اعین“ اور ”عیناء“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے موٹی آنکھ۔ چونکہ انسان کی خوبصورتی سب سے زیادہ اس کی آنکھوں میں ہوتی ہے، اسی لیے یہاں پر حور العین کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف کی گئی ہے۔ البتہ قرآن کی دوسری آیات میں اس کی دوسری خوبصورتیوں کو بھی خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اہل بہشت کی پانچویں نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ جس قسم کے پھل چاہیں گے انھیں دینے جائیں گے اور وہ وہاں پر نہایت ہی اطمینان سے رہیں گے۔ (سیدعون فیہا بكل فاكهة امنین)۔

حتیٰ کہ دنیا میں پھلوں سے استفادہ کرنے کے لیے جو مشکلات درپیش ہوتی ہیں ان کے لیے وہ بھی نہیں ہوگی۔ تمام پھل ان کے نزدیک اور ان کی دسترس میں ہوں گے۔ لہذا اونچے اونچے درختوں سے پھل چننے کی زحمت بھی انھیں گوارا نہیں کرنا پڑے گی، کیونکہ ”قطوفہا دانیۃ“ (حاقۃ-۲۳)

جو پھل وہ چاہیں گے ان کا انتخاب بھی خود کریں گے۔ "وفاکہمہ مما یتخیرون" (واقعہ - ۲۰)۔
 وہ بیماری اور تکلیف جو بعض اوقات دنیا میں پھل کھانے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے، وہاں پر نہیں ہوگی اور نہ ہی ان
 میوؤں کے خراب ہونے، کمیاب ہونے اور ختم ہونے کا خطرہ ہوگا۔ غرض ہر لحاظ سے وہ مطمئن ہوں گے۔
 بہر حال اگر جنہیں کی غذا "زقوم" ہوگی جو ان کے پیٹ میں کھولتے ہوئے پانی کی طرح اُبال پیدا کر دے گی تو بہشتیوں
 کی غذا لذیذ پھل ہوں گے جو ہر قسم کی تکلیف سے مُبرا ہوں گے۔
 بہشت اور بہشتی نعمتوں کا دوام اور ہمیشگی، متیقن کے لیے خدا کی چھٹی نعمت ہوگی کیونکہ "وصال" کے وقت جو چیز انسان
 کو بے چین کر دیتی ہے وہ "فراق" کا اندیشہ ہے۔ اسی لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: وہاں پہلی دفعہ کی موت کے سوا جس کی تلخی وہ دنیا
 میں چکھ چکے ہوں گے انہیں موت کی تلخی نہیں چھینی پڑے (لا یدوقون فیہا الموت الا الموتۃ الاولیٰ)۔
 یہ بات بڑی دل چسپ ہے کہ قرآن مجید نے بہشت کی نعمتوں کے جاودانی ہونے کو مختلف تعبیرات کے ساتھ بیان کیا
 ہے، کہیں پر فرماتا ہے:

"خالدین فیہا"

"وہ بہشت کے باغوں میں ہمیشہ رہیں گے" ۱۰

کبھی فرماتا ہے:

"عطاء غیر یجذوذ"

"یہ ایسی عطا ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی" (ہود، ۱۰۸)

یہاں پر "الموتۃ الاولیٰ" (پہلی موت) کیوں کہا گیا ہے؟ اس بارے میں ایک تفصیلی گفتگو ہے، جو بعد میں
 بیان ہوگی۔

آخر میں اس سلسلے کی ساتویں اور آخری نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور خدا انہیں دوزخ کے عذاب
 سے محفوظ رکھے گا۔ (ووقاہم عذاب الجحیم)۔

ان نعمتوں کی تکمیل اس بات سے ہو رہی ہے کہ عذاب کا احتمال اور سزا کا خوف بہشت والوں کو پریشان نہیں
 کرے گا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر پرہیزگاروں میں کسی قسم کی لغزش بھی ہوگی تو خداوند عالم اپنے لطف و کرم سے
 انہیں معاف کر دے گا اور انہیں اطمینان دلانے کا کہ وہ اس لحاظ سے پریشان نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر معصومین کے علاوہ
 سب لوگ کسی نہ کسی لغزش کے مرتکب ضرور ہوتے ہیں۔ اگر خدا کی رحمت اور مغفرت ان کے شامل حال نہ ہو تو انہیں ہمیشہ

۱۰ اس قسم کی تعبیرات قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئی ہیں، بمنہ ان کے سورۃ آل عمران کی آیات ۱۵ اور ۱۶، سورہ نسا کی آیت ۱۲

اور ۱۲۲ اور سورۃ بقرہ کی آیت ۸۵ وغیرہ بھی ہیں۔

یہ خطرہ لاحق رہتا۔ لہذا یہ آیت انہیں اطمینان دلا رہی ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ بعض مومنین اپنے گناہوں کی وجہ سے ایک عرصے تک جہنم میں رہیں گے، پھر وہ پاک ہو کر داخل بہشت ہوں گے، تو کیا مندرجہ بالا آیت کا اطلاق ان پر بھی ہوگا؟
جواباً گزارش ہے کہ مندرجہ بالا آیت بلند پایہ پرہیزگاروں کی بات کر رہی ہے جو ابتداء ہی میں بہشت میں داخل ہونگے اور دوسرے افراد کے بارے میں یہ آیت خاموش ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ایسے لوگ بھی بہشت میں داخل ہونے کے بعد جہنم کی طرف واپس جانے کے خوف سے بے نیاز ہو جائیں گے اور بالکل امن و سکون سے زندگی بسر کریں گے۔ یعنی مذکورہ آیت ان کی بہشت میں داخل ہونے کے بعد کی تصویر کشی بھی کر رہی ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں مذکورہ ساتوں صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نتیجہ کے طور پر فرمایا گیا ہے، یہ سب تمہارے پروردگار کا فضل اور اس کی بخشش ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے، جو پرہیزگاروں کے شامل حال ہے۔
(فضلاً من ربك ذالك هو الفوز العظيم) یہ

یہ ٹھیک ہے کہ پرہیزگاروں نے دنیا میں بہت زیادہ نیکیاں اور کار خیر انجام دیئے ہوں گے، لیکن ان ناچیز اعمال کی جزا اس قدر بے انتہا اور جاددانی نعمتیں نہیں ہیں۔ یہ تو خدا کا فضل و کرم ہے جس کی وجہ سے انہیں یہ عظیم نعمتیں میسر آئیں گی۔

اس کے علاوہ اگر دنیا میں خدا کا فضل و کرم ان کے شامل حال نہ ہوتا تو وہ اس حد تک نیک اعمال انجام نہ دے سکتے۔ خدا نے انہیں عقل و دانش عطا کی، انبیار اور آسمانی کتابیں بھیجیں اور ہدایت اور عمل کی توفیق ان کے شامل حال کی۔
جی ہاں! خداوند عالم کی اس قدر عظیم توفیقات سے بہرہ مند ہونا اور اس حد تک جزائے الہی تک پہنچنا ان توفیقات کے پر تو میں ہی "فوز عظیم" اور بہت بڑی کامیابی ہے، جو اس کے لطف و کرم کے سایہ ہی میں حاصل ہوتی ہے۔

"پہلی موت" کیا ہے؟

ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا ہے کہ بہشتی لوگ پہلی موت کے علاوہ کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔ اس سلسلے میں تین سوال پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا یہ کہ "موت اولیٰ" یا پہلی موت سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد وہ موت ہے جو زندگی کے خاتمہ کا سبب

لے "فضلاً" کے اعراب کے بارے میں کئی احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ فعل محذوف "فضلاً" کا مفعول مطلق ہے۔ دوسرے یہ کہ "مفعول لہ"

واقع ہو رہا ہے اور تیسرے حال واقع ہو رہا ہے۔

نبی ہے تو پھر یہ کیوں کہتا ہے کہ "اہل بہشت پہلی موت کے علاوہ کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے" جبکہ وہ تو اس سے پہلے یہ ذائقہ چکھ چکے ہیں۔ (یہاں پر فعل ماضی استعمال ہونا چاہیے تھا نہ کہ فعل مضارع)۔

تو اس سوال کے جواب میں بعض مفسرین نے "الا الموتة الاولى" میں "الا" کو "بعد" کے معنی میں لیا ہے۔ ان کے بقول آیت کا معنی یوں ہوگا، "اس پہلی موت کے بعد کسی اور موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔"

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر ایک جملہ مقدر ہے جو یہ ہے:

"الا الموتة الاولى التي ذاقوها"

"سوائے پہلی موت کے جو پہلے سے چکھ چکے ہیں"۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں پر صرف پہلی موت کا تذکرہ کیوں ہوا ہے حالانکہ ہم سب کو معلوم ہے کہ انسان نے دو موتوں کا مزہ چکھنا ہوتا ہے، ایک موت دنیاوی زندگی کے خاتمے پر اور دوسری برزخ کی زندگی کے اختتام پر۔

اس سوال کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں، جن میں سے کوئی بھی قابل قبول نہیں ہے، لہذا ہم بھی انہیں یہاں پر لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ برزخ کی زندگی اور موت معمول کی زندگی اور موت سے کسی بھی طرح مشابہ نہیں ہے بلکہ مواد جسمانی کے بموجب قیامت کی زندگی دنیاوی زندگی کے ساتھ کئی جہات سے مماثلت رکھتی ہے البتہ بلند اور بالاسطح پر۔ اسی لیے اہل بہشت سے کہا جائے گا کہ جو موت تم دنیا میں پا چکے ہو، وہی کافی ہے۔ اب تمہیں موت نہیں آئے گی اور چونکہ برزخ کی موت اور زندگی اس کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی لہذا اس کا ذکر ہی نہیں ہوا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ قیامت میں موت کا نہ ہونا صرف بہشت والوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اہل دوزخ کو بھی تو موت نہیں آئے گی، تو پھر اس بارے میں خاص طور پر اہل بہشت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟

مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں اس کا نہایت ہی خوبصورت جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے ہے تاکہ اہل بہشت کے لیے خوشخبری ہو کہ ان کے لیے خوشگوار حیات جاوید ہے، رہ گئے جنہی تو چونکہ ان کی زندگی گاہر لمحہ موت ہوگا گویا وہ ہمیشہ مرتے اور زندہ ہوتے رہیں گے، لہذا انہیں ایسی بات باور کروانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔

بہر حال یہاں پر "لا ید وقون" (نہیں چکھیں گے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل بہشت کے لیے موت کی کمترین علامت بھی ظاہر نہیں ہوگی۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ:

لے بنا بریں مندرجہ بالا استنباط بھی استثنائے منقطع ہے۔ کیونکہ ایسی موت کا ذائقہ بہشتی لوگ نہیں چکھیں گے بلکہ اس سے پہلے وہ چکھ چکے ہوں گے (غور کیجیے گا)

۳۔ برزخ کی موت و حیات کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۱ سورہ مؤمن کی گیارہویں آیت کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

خدا بروز قیامت کچھ ہشتیوں کے بارے میں کہے گا۔

”وعزتی وجلالی وعلوی وارتفاع مکانی، لانحلن له الیوم خمسة
اشیاء..... الا انهم شباب لا یهرمون، واصحاء لا یسقمون، و
اغنیاء لا یفتقرون، وفرحون لا یحزنون، واحیاء لا یموتون،
شمتت لاهذه الایة: لا یذوقون فیها الموت الا الموتة الاولى“
”مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم اور بلندی و علو مقام کی قسم، میں انہیں پانچ چیزیں عطا کروں گا۔۔۔
وہ ہمیشہ جوان رہیں گے، کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے، تندرست رہیں گے، بیمار نہیں ہوں گے
تو ٹگر رہیں گے غریب نہیں ہوں گے، مسرور رہیں گے، غمگین نہیں ہوں گے، زندہ رہیں گے
میں گے نہیں“

پھر آپ نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

”لا یذوقون فیها الموت الا الموتة الاولى“ لہ

۵۸۔ فَإِنَّمَا يَسْتَرْنَهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝

۵۹۔ فَأَرْتَقِبْ إِنَّهُمْ مُرْتَقِبُونَ ۝

ترجمہ

۵۸۔ ہم نے یہ (قرآن) تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔
۵۹۔ (لیکن) اگر وہ نصیحت قبول نہ کریں (تو تو بھی منتظر رہ اور وہ بھی منتظر ہیں) (تو خدا کی طرف سے کامیابی کا اور وہ عذاب اور شکست کا انتظار کریں)

تفسیر

آپ بلی منتظر رہیں اور وہ بھی منتظر رہیں

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سورہ دغان کا آغاز قرآنی آیات کی عظمت، گہرائی اور گیرائی کے ذکر کے ساتھ ہوا ہے اور یہ مندرجہ بالا آیات پر اختتام پذیر ہو رہی ہے جو قرآنی آیات کی گہری تاثیر بیان کر رہی ہیں تاکہ سورت کا آغاز اور انجام ہم آہنگ ہو جائے اور اس ابتدا اور انتہا کے درمیان کا حصہ بھی قرآنی نصح اور مواظبت کی تاکید کا مظہر ہے۔
ارشاد فرمایا گیا ہے: ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں (فانقسا یسرناہ بلسانک لعلہم یتذکرون)۔

اس کے مندرجات نہایت عمیق اور گہرے ہیں، اس کے تمام پہلو بہت وسیع اور گہرے ہیں، اس کے مطالب ایسے سادہ اور روان ہیں کہ ہر شخص کے لیے قابل فہم اور ہر طبقے کے لیے قابل استفادہ ہیں، اس کی مثالیں زیبا ہیں، اس کی تشبیہیں فطری اور زور دہن ہیں، اس کی داستانیں حقیقی اور سبق آموز ہیں، اس کے دلائل روشن اور پختہ، اس کا بیان سادہ، مختصر اور پُر مغز ہے، ساتھ ہی اس حد تک شیریں اور پرکشش ہے کہ انسانی قلوب تک جا پہنچے، بے خبروں کو آگاہ اور آمادہ دلوں کو متوجہ کرتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے، جس کے مطابق اس سے یہ مراد ہے کہ باوجودیکہ تو نے کسی کے آگے زانوئے تلمذتہ نہیں کیا تاہم آسانی اور سہولت کے ساتھ ان پُر مغز آیات کی تلاوت کر سکتا ہے جو خدا کے اعجاز اور وحی کی حامل ہیں۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ آیت سورہ قمر کی اس آیت سے ملتی جلتی ہے، جس کا بار بار تکرار کیا گیا ہے یعنی:

”وَلَقَدْ يَسْرْنَا الْقُرْآنَ لِلذَّكَرِ فَمَلَّ مِنْ مَدَكِرٍ“

”ہم نے قرآن کو نصیحت کے حصول کے لیے آسان بنا دیا ہے، آیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟“

لیکن چونکہ ان اوصاف کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کلام حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے ہیں لہذا آخری آیت میں انھیں سخت الفاظ میں تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اگر وہ اس کے باوجود نصیحت قبول نہیں کرتے، تو تو بھی منتظرہ اور وہ بھی منتظر ہیں (فانتظروا انہم مردقبنون)۔

آپ تو کفار پر کامیابی کے سلسلے میں وعدہ الہی کی تکمیل کے منتظر رہیں اور وہ شکست کے۔ آپ، اس ظالم اور ہٹ دھرم قوم کے بارے میں خدا کے دردناک عذاب کے منتظر رہیں اور وہ جو زعم خویش آپ کی شکست اور ناکامی کے منتظر ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان دو میں سے کس کا انتظار صحیح ہے۔

نا بریں اس آیت سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ خداوند عالم اپنے پیغمبر کو حکم دے رہا ہے کہ تبلیغ سے ہاتھ اٹھالیں اور اپنی تمام سعی و کوشش کو متوقف کر کے صرف انتظار پر ہی اکتفا کر لیں، بلکہ یہ ایک قسم کی تہدید اور تنبیہ ہے جو ہٹ دھرم قوم کو بیدار کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

چند نکات

- ۱۔ ”ارتقب“ دراصل ”رقبۃ“ (بروزن طلبہ) کے مادہ سے لیا گیا ہے، جن کا معنی ”گردن“ ہے۔ اور چونکہ انتظار کرنے والے لوگ ہمیشہ گردن اٹھا اٹھا کر اس کا انتظار کرتے ہیں، لہذا یہ کسی چیز کے انتظار کے معنی میں آتا ہے۔
- ۲۔ مندرجہ آیات اس بات کی بخوبی نشاندہی کر رہی ہیں کہ قرآن مجید کا کسی خاص طبقے یا گروہ سے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ عمومی طور پر ہم وادراک، متوجہ کرنے اور پند و نصیحت کے لیے ہے۔ لہذا جو لوگ قرآن مجید کو مبہم مفہوم اور نامعلوم مسائل کے پیچ و خم میں الجھا دیتے ہیں کہ اس کے ادراک کا تعلق صرف ایک طبقے اور گروہ سے مخصوص ہے اور وہ خاص گروہ یا طبقات بھی اس سے کچھ سمجھ نہیں پاتے، وہ درحقیقت قرآن مجید کی اصل روح سے غافل ہیں۔

قرآن مجید کو ہر شعبہ زندگی میں موجود ہونا چاہیے، خواہ شہر ہو یا دیہات، انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، پرائمری اسکول ہو یا یونیورسٹی، مسجد ہو یا میدان جنگ، غرض ہر جگہ پر اس کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ خدا نے اسے سہل، سادہ، آسان اور روان

بنادیا ہے تاکہ سب لوگ اس کو سمجھ سکیں۔

اسی طرح اس آیت نے ان لوگوں کے افکار پر بھی خطِ تنبیح کھینچ دیا ہے کہ جنہوں نے قرآن مجید کو تلاوت اور تجویدی قواعد کے پیچ و خم میں منحصر کر دیا ہے، جن کے پیش نظر صرف الفاظ کی مخارج سے ادائیگی اور وقف و وصل کے اصولوں کو مد نظر رکھنا ہوتا ہے۔ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ کتاب ساری کی ساری نصیحت پر مبنی ہے، ایسی نصیحت جو متحرک اور تعمیر کا عامل ہوتی ہے۔ ظاہری الفاظ کے اصولوں کو ملحوظ رکھنا اپنی جگہ پر بجا، لیکن اس کا انتہائی مقصود معافی نہیں، الفاظ نہیں۔

۳۔ ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے،

”لولا تسیرہ لما قدر احد من خلقہ ان یتلفظ بحرف من

القران، واتی لہم ذالک وھو کلام من لم یزل ولا یزال“

”اگر خدا نے قرآن کو زبانوں پر آسان نہ کر دیا ہوتا تو کوئی شخص بھی اس کا ایک حرف زبان پر نہ

لا سکتا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا، کیونکہ یہ خداوندِ ازل وابدی کا کلام ہے (اور اس قسم کے کلام کی عظمت

و شوکت اس قدر ہوتی ہے کہ اس کے فضل و کرم کے بغیر کوئی انسان اسے ادا نہیں کر سکتا)۔

خداوند! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو تیرے اس عظیم و بے نظیر کلام یعنی قرآن پاک سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور

تمام جہات میں اپنی زندگی کو اس کے ہم آہنگ کرتے ہیں!

خداوند! جو سکون و اطمینان تو پر ہینر گاروں کو عنایت کرتا ہے اور طوفانِ حوادث میں ان کے دل کی ڈھارس بندھاتا ہے

ہمیں بھی عنایت فرما۔

بارِ الہا! تیری نعمتیں بے شمار، تیری رحمت بے حساب اور تیری سزا دردناک ہے۔ ہمارے اعمال ایسے نہیں ہیں جو ہمیں تیری رحمت

سے ہم کنار اور سزا سے دور کر سکیں۔ اپنا وہ فضل ہمارے شامل حال فرما، جس کا تو نے متیقن سے وعدہ کیا ہے، وگرنہ ہم کسی قیمت پر

بھی تیری جاودانی بہشت کی آغوش کے لائق نہیں۔

تفسیر سورہ دخان ختم ہوئی

منگل ۲۵ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ

سُورَةُ الْجَاثِيَةِ

- ۔ مکہ میں نازل ہوئی
- ۔ اس کی ۳۷ آیات ہیں

آغازِ تفسیر

۲۵ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ

سورۃ جاثیہ

کے

مضامین

”حوامیم“ سورتوں میں سے یہ چھٹی سورت ہے اور اس کا شمار مکی سورتوں میں ہوتا ہے۔ یہ اس زمانے میں نازل ہوئی جب مکہ کی اجتماعی فضا مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان انتہائی کشیدہ تھی۔ اسی بنا پر اس سورت میں زیادہ تر توحید، شرک کے ساتھ نبرد آزمائی، قیامت کے عدل و انصاف سے ظالموں کو تنبیہ، اعمال کا لکھا جانا اور اسی طرح گزشتہ سرکش اقوام کے انجام جیسے مسائل کو زیادہ تر بیان کیا گیا ہے۔ اس سورت کے مندرجات کو سات حصوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے

- ① — قرآن مجید کی عظمت اور اس کی اہمیت۔
- ② — مشرکین کے سامنے توحید کے کچھ دلائل کا بیان۔
- ③ — نیچر لوں کے کچھ دعوے اور ان کے منہ توڑ جوابات۔
- ④ — بنی اسرائیل جیسی بعض اقوام کے انجام کی طرف کچھ اشارہ جو سورت کے مباحث پر شاہد ہے۔
- ⑤ — ان گمراہ لوگوں کو زبردست تنبیہ جو اپنے گمراہ کن عقاید پر سختی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔
- ⑥ — حق کی راہ سے سرمو انحراف کیے بغیر عفو و درگزر و شمت سے کام لینے کی دعوت۔
- ⑦ — قیامت کے لرزا دینے والے واقعات کی طرف اشارے، خاص کر نامہ اعمال کا تذکرہ جو انسان کے تمام اعمال کو بے کم و کاست بیان کرنے کا۔

یہ سورت خداوند عالم کے ”عزیز“ و ”رحیم“ جیسے بزرگ ناموں سے شروع ہوتی ہے اور انہی ناموں پر ختم ہوتی ہے۔ اس سورت کا نام ”جاثیہ“ اس لیے ہے۔ اس کی ۲۸ ویں آیت سے یہ لفظ لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ”گھٹنے ٹیکنے والا“۔ قیامت کے دن عدل الہی کی دادگاہ میں بہت سے لوگوں کی یہی کیفیت ہوگی۔ مرحوم طبری نے ”مجمع البیان“ میں اس کا ایک اور نام بھی تحریر کیا ہے جو زیادہ مشہور نہیں ہے اور وہ ہے ”شریعت“ جو اسی سورت کی ۱۸ ویں آیت کی مناسبت سے ہے۔

سورت جاثیہ کی تلاوت کا ثواب

پیغمبر اسلام کی ایک حدیث میں ہے :

”من قرأ حامیم الجاشیة ستر الله عورته وسكن روعته

عند الحساب“

”جو شخص سورۃ جاشیہ کی تلاوت کرنے کا (البتہ اس کے مطالب میں غور و فکر کرے گا، اور اپنی زندگی کو ان مطالب کے مطابق ڈھالے گا، خدا بروز قیامت اس کے تمام عیوب کی پردہ پوشی کرے گا اور اس کے خوف کو اطمینان میں بدل دے گا۔“

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے، آپ فرماتے ہیں :-

”من قرأ سورة الجاشیة كان شواہبها ان لا ییری النار ابداً، ولا یسمع

زفر جہنم ولا شہیقها، وهو مع محمد“

جو شخص سورۃ جاشیہ کی غور و فکر کے ساتھ جو عمل کا مقدمہ ہے، تلاوت کرے گا اُس کا ثواب یہ ہے

کہ وہ آتش جہنم کو ہرگز نہیں دیکھ پائے گا اور دوزخ کی آواز نہیں سن پائے گا اور اسے حضرت

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہم نشین کا شرف حاصل ہوگا۔“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ حَمَّ

۲۔ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝

۳۔ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝

۴۔ وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبِئْتُ مِنْ دٰآبَّةٍ اٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّوقِنُوْنَ ۝

۵۔ وَاِخْتِلَافِ الْیَلِّ وَالنَّهَارِ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ

رِزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیْحِ اٰیٰتٍ

لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

۶۔ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ فَبِآیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهِ

یُّؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حم

۲۔ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو غالب و دانا ہے۔

۳۔ بے شک آسمان اور زمین میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

۴۔ اور اسی طرح تمھاری اور زمین میں پھیلے ہوئے چلنے پھرنے والوں کی خلقت میں نشانیاں ہیں، اُن کے لیے جو اہل یقین ہیں۔

۵۔ اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس نے آسمان سے جو رزق نازل فرمایا ہے اور اس کے ذریعے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کیا ہے۔ اس میں بھی اور ہواؤں کے چلنے میں بھی عقل سے کام لینے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

۶۔ یہ خدا کی آیات ہیں جن کو ہم حق کے مطابق تیرے سامنے پڑھتے ہیں، تو خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی، جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟

تفسیر

ہر جگہ اس کی نشانیاں موجود ہیں

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ چھٹی سورت ہے جس کا آغاز حروف مقطوعہ (لحم) سے ہو رہا ہے۔ بعد کی سورت (احقاف) سے مل کر یہ پوری سات سورتیں ہو جاتی ہیں۔ حروف مقطعات کے بارے میں ہم سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ اعراف اور اسی طرح "لحم" سورتوں کے آغاز میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ مشہور مفسر طبرسی اس آیت کے آغاز میں فرماتے ہیں:

"بہترین قول یہ ہے کہ یہ کہا جائے "لحم" اس سورت کا نام ہے، (پھر بعض مفسرین سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں) اسے "لحم" کے نام سے موسوم کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قرآن جو سراپا اعجاز ہے، حرفِ تہجی سے تشکیل یافتہ ہے۔"

جی ہاں! یہ کتاب جو نور و ہدایت، راہنما اور رہبر ہے اور پیغمبرِ اسلام کا زندہ جاوید معجزہ ہے اپنی سادہ سے حروفوں کی ترکیب سے وجود میں آئی ہے۔ یہ اس کی نہایت عظمت کی دلیل ہے کہ اس قدر اہم کتاب اس قدر سادہ سے حروفوں سے تشکیل پائی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ فوراً قرآن کی عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے

جو غالب و دانا ہے۔ (تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ) یہ
 ”عزیز“ کا معنی صاحبِ قدرت اور ناقابلِ شکست ہے اور ”حکیم“ کا معنی ایسی ذات ہے جو تمام چیزوں کے
 اسرار سے آگاہ ہے اور جس کے تمام افعال سچے نئے اور حکمت پر مبنی ہیں۔
 ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب نازل کرنے کے لیے ایسی ہی بے انتہا حکمت اور غیر محدود قدرت ضروری ہوتی ہے جو
 خدا کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ آیت بعینہ قرآن مجید کی چار سورتوں کی ابتداء میں آئی ہے، جن میں سے تین حوامیم سورتیں ہیں
 (مؤمن، جاثیہ اور احقاف) اور ایک سورہ زمر ہے، جو حوامیم کے علاوہ ہے۔ یہ تکرار اور تاکید اس لیے ہے کہ تمام لوگوں
 کی توجہ قرآنی اسرار کی گہرائی اور گیرائی اور اس کے مطالب کی عظمت کی طرف مبذول کروائی جائے تاکہ وہ اس کی کسی تعبیر کو معمولی
 نہ سمجھیں، کسی کلمہ کو بے حساب و کتاب نہ سمجھیں اور نہ ہی فہم و ادراک کی کسی حد پر قانع ہو جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ”عزیز“ کے لفظ کے ساتھ بعض مقامات پر خود قرآن مجید کی بھی توصیف کی گئی ہے،
 جیسے ”وانزلنا کتاباً عزیزاً“ یعنی قرآن مجید وہ کتاب ہے جو طاقت و رازنا قابلِ شکست ہے (الحکم سجدہ ۵-۴)۔
 یا وہ لوگوں کی اس تک دسترس نہیں ہو سکتی۔ مرد زمانہ کے ساتھ اس کی قدر و قیمت میں کمی نہیں آ سکتی۔ اس کے
 حقائق کبھی بوسیدہ نہیں ہو سکتے۔ تحریف کرنے والوں کو رسوا کرتے ہوئے روز بروز آگے بڑھتا جائے گا۔
 بعض مقامات پر خود قرآن نازل کرنے والے کی توصیف کی گئی ہے، جیسے زیر تفسیر آیت میں ہے اور دونوں جگہ
 اس کا استعمال صحیح ہے۔

پھر آفاق و انفس میں عظمت خداوندی کی آیات اور نشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: بے شک آسمانوں
 اور زمین میں ایمان والوں اور حق کے طلب گاروں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ (ان فی السموات والارض لآیات
 للمؤمنین)۔

آسمانوں کی عظمت ایک طرف اور اس کا محیر العقول نظام کہ جس پر کروڑوں سال گزرنے کے باوجود اس میں سرسبز
 انحراف نہ آنا دوسری طرف اور زمین کی ساخت اور اس کے عجائبات تیسری طرف، سب مل جمل کر خدا کی نشانیوں
 میں سے ہیں۔

زمین، جو بعض دانش وروں کے بقول ۱۴ قسم کی حرکت کی حامل ہے اور بہت تیزی کے ساتھ اپنے محور کے گرد
 گھوم رہی ہے اور بڑی سرعت کے ساتھ سورج کے گرد گھوم رہی ہے اور پھر منظوم شمسی کے ہمراہ ایک اور حرکت بھی

۱۔ ”تَنْزِيلُ الْكِتَابِ“ ایک مضاف کی خبر ہے، جس کی تقدیر ”هَذَا تَنْزِيلُ الْكِتَابِ“ ساتھ ہی یہ بتاتے
 ہیں کہ ”تَنْزِيلُ“ مصدر ہے اور یہاں پر اہم مفعول کے معنی میں ہے اور موصوف مضاف کی طرف مضاف ہے، جو
 تقدیری طور پر ”هَذَا كِتَابٌ مَنْزِلٌ.....“ ہے۔

ہے جو کہکشاں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس طرح سے وہ اپنی بے انتہا مسافت میں سرگرم عمل ہے۔ لیکن ان تمام حرکات کے باوجود اس قدر چر سکون ہے کہ انسانی آسائش و آرام کا گہوارہ اور تمام موجودات کے لیے باعث سکون و اطمینان ہے اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس میں ذرہ بھر بھی حرکت ہے۔

نہ تو اس قدر سخت اور ٹھوس ہے کہ اس میں زراعت نہ کی جاسکے اور گھر نہ بنائے جاسکیں۔ اور نہ ہی اس قدر نرم اور ملائم ہے کہ اس میں رہائش اختیار نہ کی جاسکے اور بقاء کے تسلسل کو آگے نہ بڑھایا جاسکے۔

گذشتہ موجودہ اور آئندہ اربوں کھربوں انسانوں کے لیے ذخائر، معدنیات اور وسائل زندگی اس میں فراہم کر دیئے گئے ہیں اور پھر اس قدر جاذب نظر اور زیبا ہے کہ انسان کو اپنا مسوؤر بنا لیتی ہے۔ اس میں موجود پہاڑ ہوں یا دریا اور فضا غرض ہر چیز خدا کی اسرار آمیز آیت اور نشانی ہے، لیکن توحید اور عظمت خالق کی نشانیوں کو صرف صاحبان ایمان یعنی راہِ خدا پر گامزن اور حق کے طلبکار سمجھتے ہیں اور بے خبر دل کے اندھے اور مغرور لوگ ان کے ادراک سے محروم ہیں۔

پھر ان "آفات" آیات کے بعد "انفسی" آیات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور تمہاری تخلیق میں بھی اور زمین میں پھیلے ہوئے جانوروں کی خلقت میں بھی یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں (و فی خلقکم وما یبیت من دابة آیات لقوم یوقنون)۔

امیر المؤمنین علیؑ سلام کی طرف منسوب ایک مشہور عبارت میں یہ جملہ ملتا ہے۔

"یہ انسان ایک چھوٹا سا جرم (جسم) ہے جس میں ایک بہت بڑا عالم سایا ہوا ہے۔"

یعنی درحقیقت جو کچھ ایک عالم کبیر میں موجود ہے، اس کا ایک نمونہ انسان ہی کے جسم و جان میں موجود ہے۔ اس کے خصائل و صفات تمام ذی روح اور متحرک مخلوق کی صفات و خصائل کا مرکب ہیں اور اس کی نوع پر مبنی تخلیق اس عظیم کائنات کے مجموعی امور کا پتھر ہے۔

اس کے ایک خلیے کی ساخت ایک اسرار آمیز عظیم صنعتی شہر جیسی ہے۔ اس کے ایک بال کی تخلیق اپنی مختلف خصوصیات کے ساتھ کہ جو علم و دانش اور سائنس کے ذریعے دریافت ہوئی ہیں، آیات الہی میں سے خود ایک عظیم آیت ہے۔ اس کے بدن میں ہزاروں کلو میٹر چھوٹی بڑی نہایت باریک، نازک اور لطیف رگیں ہیں اور ہزار کلو میٹر سلسلہ اعصاب کی کیموسیکل اور اطلاعی تاریں ہیں اور ان کا دماغ کی کانٹے کے مرکز کے ساتھ طاقتور، اسرار آمیز اور پیچیدہ رابطہ موجود ہے۔ بدن کی ہر ایک داخلی مشینری کا طریقہ کار اور ناگہانی واقعات کے موقع پر ان کی عجیب و غریب ہم آہنگی اور خارجی عوامل کی یورش کے وقت بدن کی محافظ طاقتوں کا زبردست دفاع، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر خدا کی قدرت کاملہ کی ایک نشانی ہیں۔

پھر انسان کے علاوہ زمین پر چلنے والے حیوانوں کی لاکھوں قسمیں ہیں، خواہ وہ خورین سے دیکھی جانے والی ہوں یا نول پکیر، ہر ایک خدا کی ایک آیت ہیں۔ ان کی اپنی خصوصیات اور ساخت ہوتی ہے، جو بالکل متنوع اور ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، حتیٰ کہ بعض قسمیں ایسی بھی ہیں، جن میں سے کسی ایک قسم کے مطالعہ پر سائنس دانوں اور دانش ورؤں کی ایک

جماعت اپنی تمام عمریں صرف کر دے یا ان کے تخلیقی اسرار پر ہزاروں کتابیں لکھی جائیں پھر بھی ان کے بارے میں ہماری معلومات کا دائرہ معلومات کی نسبت بہت کم ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر مبرائے آفرینش کی حکمت اور اس کے بے پایاں علم کی ایک آیت اور نشانی ہے۔

تو پھر کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ بیسیوں سال ان آیات میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ذرہ برابر معلومات حاصل نہیں کر سکتے؟ تو اس کی وجہ صرف وہی ہے، جس کی قرآن مجید نے ان الفاظ میں نشاندہی کر دی ہے کہ ”یہ آیات ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں، جو صاحبان ایمان و یقین ہیں اور غور و فکر کے مالک ہیں۔“ ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اپنے دل کے دریچے باز کرتے ہیں اور اپنے تمام وجود کے ساتھ علم و دانش اور یقین کے طلب گار ہوتے ہیں، حتیٰ کہ کسی تھوڑی سے تھوڑی حرکت اور چھوٹے سے چھوٹے موجود کو بھی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ کئی کئی گھنٹے اس کے بارے میں سوچنے پر صرف کر دیتے ہیں۔ ”ذات خدا تک سائی“ کے لیے اس سے زینہ کا کام لیتے ہیں اور معرفت کر دگار کے لیے اسے ذریعہ بناتے ہیں۔ پھر اس سے راز و نیاز کرتے ہیں اور اپنے جام دل کو اس کے بادلہ عشق سے لبریز کرتے ہیں۔ اگلی آیت میں تین عظیم نعمتوں کا تذکرہ ہے جو انسان اور دوسری مخلوقات کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ہر ایک آیات خداوندی میں سے ایک آیت ہے، اور وہ نعمتیں ہیں نور، پانی، اور ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس نے آسمان سے جو رزق نازل فرمایا ہے اور اس کے ذریعے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کیا ہے، اس میں بھی اور ہواؤں کے چلنے میں بھی عقل سے کام لینے والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں (واختلاف اللیل والنہار وما انزل اللہ من السماء من رزق فأحیایہ بالارض بعد موتہا وتصریف الریاح آیات لقوم یعقلون)۔

”نور و ظلمت“ اور رات دن کے آنے جانے کا مسئلہ جو ایک خاص نظم کے ساتھ ایک دوسرے کے خلیفہ اور جانشین ہوتے رہتے ہیں، حساب شدہ اور تعجب آور ہے۔ اگر ہمیشہ دن رہتا یا بے انتہا لمبا ہوتا تو اس کا درجہ حرارت اس قدر اُپر چلا جاتا کہ تمام زندہ مخلوق بل کر رکھ ہو جاتی اور اگر رات ہمیشہ رتی یا حد سے زیادہ طولانی ہوتی تو سردی کی شدت سے ہر چیز منجمد ہو جاتی۔ آیت کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اختلاف کا معنی ایک دوسرے کی جانشینی نہ ہو بلکہ اس فرق کی طرف اشارہ ہو جو سال بھر کے مختلف موسموں میں رات اور دن کے درمیان پیدا ہوتا رہتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان کو مختلف فوائد یعنی مختلف فصلیں، خیرات، پھل، برف و باراں کا نزول اور دوسری برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ سائنسدان کہتے ہیں رُوئے زمین کے مختلف خطوں میں شب و روز کی لمبائی میں جو فرق ہوتا ہے اگر سال بھر کے تمام دنوں کا حساب کیا جائے اور اسی حساب سے سورج کی روشنی کو تقسیم کیا جائے تو بالکل ٹھیک ٹھیک صورت میں ہر ایک خطہ دوسرے خطے کے برابر اس روشنی سے استفادہ کرتا ہے۔ لہ

دوسرے مرحلے میں زندگی عطا کرنے والے آسمانی رزق یعنی بارش کا تذکرہ ہے کہ نہ تو جس کی لطافت طبع میں کوئی حرف ہے اور نہ ہی اس کی زندگی عطا کرنے والی قدرت میں کوئی کلام۔ ہر جگہ زندگی، تروتازگی اور زیبائی کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو؟ جب کہ انسانوں اور بہت سے دوسرے جانوروں اور نباتات کے بدن کا اصل حصہ اسی پانی سے تشکیل پاتا ہے۔

تیسرے مرحلے پر ہواؤں کے چلنے کی بات ہو رہی ہے۔ ایسی ہوا میں جو آکسیجن ایک سے دوسری جگہ پہنچاتی رہتی اور جانداروں کی ضرورت پوری کرتی رہتی ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ سے آلودہ ہواؤں کو صاف کرنے کے لیے دشت و جنگل اور صحراؤں کی طرف بھیجتی رہتی ہیں اور صاف ہونے کے بعد انھیں دوبارہ شہروں اور آبادیوں کی طرف لے آتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ زندہ موجود کے یہ دونوں گروہ یعنی ”حیوانات“ اور ”نباتات“ بالکل ایک دوسرے کے برعکس عمل کرتے ہیں، حیوانات آکسیجن گیس حاصل کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں جبکہ نباتات کاربن ڈائی آکسائیڈ حاصل کرتے ہیں اور آکسیجن خارج کرتے ہیں تاکہ نظام زندگی میں توازن برقرار رہے اور مرور ایام کے ساتھ زمین پر موجود مفید ہواؤں کے ذخائر ختم نہ ہونے نہ پائیں۔

اس کے علاوہ سی ہوا میں ہوتی ہیں جو نباتات میں نسل کشی کا کام دیتی ہیں، انہیں ثمر آور بناتی ہیں، مختلف زمیوں میں مختلف قسم کی تخم پاشی کرتی ہیں۔ قدرتی چراگا ہوں اور جنگلوں کو پروان چڑھاتی ہیں۔ سمندروں کے دل میں موجیں ابھارتی ہیں، جن سے سمندروں کی حیات اور حرکت کا پتہ چلتا ہے، پانی کو بدبودار اور خراب ہونے سے بچاتی ہیں اور یہی ہوا میں ہیں جو سفینوں کو سمندروں کے سینول پر رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں پہلے تو آسمانوں اور زمین کے آیات ہونے کی بات ہوئی ہے اور آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اس میں ”اہل یقین“ کے لیے نشانیاں ہیں، پھر دوسری زندہ مخلوق کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اس میں ”اہل یقین“ کے لیے نشانیاں ہیں اور نور و ظلمت اور باد و باران کے نظام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس میں ”عقل سے کام لینے والوں“ کے لیے نشانیاں ہیں۔ تعبیرات کے اس اختلاف کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان ”معرفة اللہ“ کی راہوں کو تین مراحل میں طے کرتا ہے پھر کہیں جا کر منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ پہلا مرحلہ ”فکر“ کا ہے دوسرا ”یقین و علم“ کا اور تیسرا مرحلہ ”ایمان“ کا ہے، جسے اصطلاح میں قلبی عقیدہ کہتے ہیں۔

اگرچہ مرتبے کے لحاظ سے ایمان پہلے مرحلہ پر یقین دوسرے مرحلے پر اور فکر تیسرے مرحلے پر ہوتے ہیں اور آیات مذکورہ میں بھی اسی ترتیب سے ذکر کیے گئے ہیں لیکن خارجی وجود کے اعتبار سے فکر پہلے مرحلے پر یقین دوسرے اور ایمان تیسرے مرحلے پر ہیں۔ بالفاظ دیگر جو اہل ایمان ہوتے ہیں وہ آیات الہی کے مشاہدے ہی سے اس اعلیٰ ترین مرحلے تک پہنچتے ہیں اور جو اہل ایمان نہیں ہیں وہ کم از کم یقین یا فکر کے مرحلے تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

(تفسیر حاشیہ ص ۳۱۱) کی آیت ۱۹۰ کے ذیل میں، جلد ۵، سورۃ یونس کی آیت ۶ کے ذیل میں اور جلد ۹، سورۃ قصص کی آیت ۱۱ کے ذیل میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔

لے ”اباد و باران“ کے آثار کے سلسلے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۹ میں سورۃ روم کی آیات ۲۶ تا ۵۰ کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

مفسرین نے اس بارے میں اور بھی وجوہات کو ذکر کیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔ اسی سلسلے کی آخری آیت میں گزشتہ آیات کا مجموعی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے قرآنی آیات کی عظمت و اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: یہ خدا کی آیات ہیں، جن کو ہم ٹھیک ٹھیک تمہارے سامنے پڑھتے ہیں (تلك آیات اللہ نلتوہا علیک بالحق)۔

آیا "تلك" کا کلمہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ ہے یا آفاق و انفس میں خدا کی آیات کی طرف جو گزشتہ آیات میں مذکور ہو چکی ہیں؟ اس بارے میں مفسرین نے دونوں قسم کی آیات کا احتمال ذکر ہے۔ لیکن "نلتوہا" کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قرآنی آیات مراد ہیں، البتہ یہ قرآنی آیات ساری کائنات میں خدا کی نشانیوں کو بیان کر رہی ہیں تو اس طرح سے دونوں قسم کی تعبیریں یکجا ہونے کے قابل ہیں۔ (غور کیجئے گا)

بہر حال "تلاوت" "نلتوہا" (بروزن فکر) کے مادہ سے ہے، جس کا معنی بات کو مسلسل بیان کرنا ہے۔ اسی لیے قرآنی آیات کی تلاوت کا معنی ان کا مسلسل اور پے در پے پڑھنا ہے۔

"حق" کی تعبیر ان آیات کے مضامین و مندرجات کی طرف بھی اشارہ ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور خدا کی وحی کی حقانیت کی طرف بھی۔ بالفاظ دیگر "یہ آیات اس حد تک واضح و آشکار اور استدلال پر مبنی ہیں کہ بذات خود اپنی اور اپنے بھیجنے والے کی حقانیت کی دلیل بھی انہی میں مضمر ہے۔

سچ مچ اگر یہ لوگ ان آیات پر ایمان نہیں لائیں گے تو پھر کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تو خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی جس پر یہ کافر لوگ ایمان لائیں گے۔ (فباعت حدیث بعد اللہ وایاتہ یؤمنون)۔

مروجہ طبری "مجمع البیان" میں فرماتے ہیں کہ کلمہ "حدیث" سے گذشتہ اقوام اور ان کی عبرت آموز داستانوں کی طرف اشارہ ہے، جبکہ آیات "ان دلائل کو کہا جاتا ہے جو صحیح کو باطل سے جدا کرتی ہیں اور قرآن مجید کی آیات دونوں چیزوں کو بیان کر رہی ہیں۔

سچ مچ قرآن مجید توحید کے استدلال اور برہان و وعظ و نصیحت کے لحاظ سے اس قدر مضامین کا حامل ہے کہ جس نل میں ذرہ بھر بھی آمادگی اور جس سر میں تھوڑی سی حق کی قبولیت کی آمادگی موجود ہے اسے خدا، طہارت اور تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر یہ آیات بینات کسی پر اثر انداز نہیں ہوتیں تو ان کی ہدایت کی امید بھی نہیں رکھنی چاہیے۔

لے بعد اللہ کی تعبیر میں ایک مندرجہ پایا جاتا ہے جس کی تقدیر یوں ہے:

"فبای حدیث بعد حدیث اللہ"

- ۷- وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝
- ۸- يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يَصِرُ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝
- ۹- وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝
- ۱۰- مِنْ وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

ترجمہ

- ۷- جھوٹے گناہ گار کے لیے افسوس ہے۔
- ۸- کہ اس پر خدا کی آیات مسلسل پڑھی جاتی ہیں اور انہیں سُننا رہتا ہے پھر بھی غرور سے مخالفت پراڑا رہتا ہے۔ گویا اس نے ان کو سُننا ہی نہیں، تو ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے۔
- ۹- اور جب اسے ہماری آیتوں میں سے کسی آیت سے آگاہ کیا جاتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے۔
- ۱۰- اور جہنم ان کے پیچھے ہی پیچھے ہے اور جو کچھ وہ کما چکے ہیں وہ انہیں نجات

نہیں دلائے گا اور نہ ہی وہ کہ جن کو انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے سر پرست بنایا تھا اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے۔

تفسیر

گناہگار جھوٹے پر پھٹکار

گزشتہ آیات سے معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا کے کلام کو مختلف توجیدی دلائل اور وعظ و نصیحت کے ساتھ سنتے تو ہیں لیکن ان کے دل پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔
 زیر تفسیر آیات میں ایسے لوگوں سے متعلق اور ان کے انجام کے بارے میں تفصیل گفتگو ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہر جھوٹے گناہگار پر افسوس ہے۔ (ویل لکئل اقاٹ اشیم)۔
 ”اقاٹ“ مبالغے کا صیغہ ہے اور ایسے شخص کے معنی میں ہے جو بہت جھوٹ بولتا ہے اور کبھی بڑے جھوٹ کے معنی میں بھی آتا ہے ہر چند کہ زیادہ نہ ہو۔

”اشیم“ ”اشم“ کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے مجرم اور گناہگار۔ یہ لفظ بھی مبالغے کا معنی دیتا ہے۔ ان آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ آیات الہی کے مقابلے میں معاندانہ رد عمل ان لوگوں کا کام ہوتا ہے جو سر سے پاؤں تک گناہوں میں غرق اور جھوٹ سے آلودہ ہوتے ہیں، نہ کہ پاک طینت اور نیک سیرت لوگوں کا۔ پھر ان کی معاندانہ روش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، اس پر خدا کی آیات مسلسل پڑھی جاتی ہیں اور وہ انہیں سنتا رہتا ہے پھر وہ غرور کے باعث مخالفت پر اڑا رہتا ہے گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں (یسمع آیات اللہ تتلی علیہ ثم یصر مستکبرا کان لم یسمعھا)۔
 اس طرح سے گناہ، جھوٹ، تبخیر اور خود پسندی اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ ان آیات کو ان سنا کر دے اور خود کو بہر بنا دے۔ جیسا کہ سورہ لقمان کی آیت، میں بھی بیان ہوا ہے۔ کہ:
 ”واذا تتلی علیہ آیاتنا ولی مستکبرا کان لم یسمعھا کان فی اذنیہ وقرا۔“

”جب اسے ہماری آیات سنائی جاتی ہیں مستکبر بن کر ان سے روگردانی کر لیتا ہے گویا اس نے

کچھ نہیں سنا، گویا اس کے کان بالکل بہرے ہیں۔
 زیر تفسیر آیت کے آخر میں انھیں زبردست تہدید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ایسے شخص کو دردناک عذاب کی خوشخبری
 دے دے (فبشره بعداب الیم)۔

جس طرح اس نے رسول اللہ اور مومنین کے دلوں کو دکھایا ہے اسی طرح ہم بھی اسے دردناک عذاب میں مبتلا کریں
 گے، کیونکہ قیامت کا عذاب دنیا میں انسان کے اعمال کا تجسم ہے، یعنی دنیا میں انجام دیئے ہوئے اعمال آخرت میں مجسم ہو کر
 سامنے آجائیں گے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے اس آیت اور اس کے بعد کی آیت کی شان نزول ذکر کرتے ہوئے انھیں ابوہل یا نصر بن
 حارث کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو عجمیوں کے افسانوں اور داستانوں کو اکٹھا کر کے لوگوں کو سنایا کرتے تھے تاکہ اس طرح
 سے وہ انھیں ایسے ہی قصے کہانیوں کے ساتھ پہلائے پھسلاتے رہیں اور آئین حق سے منحرف کیے رکھیں، لیکن ظاہری بات
 ہے کہ یہ صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر دور کے تمام جھوٹے مجرمین اور مستکبرین کے بارے میں ہے۔ وہ
 لوگ جو آیات الہی، فضائل انبیاء و عظیم پیشواؤں سے سنی ہوئی باتوں کو ان سنی کرتے ہیں کیونکہ ایسی باتیں انھی نفسانی خواہشات اور میلانات سے میل نہیں کھاتیں
 اور ان کے شیطانوں کی تائید نہیں کرتے، ان کی غلط رسوم و عادات اور اندھی تقلید کے موافق نہیں ہیں۔ جی ہاں! ایسے
 سب لوگوں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیئے۔

اگرچہ عذاب کی "بشارت" (خوشخبری) سے مناسبت نہیں ہے، لیکن یہ تعبیر ایسے لوگوں کی توہین، تحقیر اور تمسخر کیلئے
 استعمال ہوتی ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: جب یہ ہٹ دھرم مستکبر ہماری آیات میں سے کسی آیت سے واقف ہو جاتا ہے اور اسے جان لیتا
 ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے (واذا علم من آیاتنا شیئاً اتخذها ہزواً)۔

درحقیقت ان خود غرض جاہلوں کی دو حالتیں ہو کرتی ہیں، پہلی تو یہ کہ وہ زیادہ خدا کی آیات کو سنتے ہیں لیکن سنی ان سنی
 کر دیتے ہیں، بڑی بے پرواہی سے گزر جاتے ہیں گویا انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں، دوسری یہ کہ اگر سنتے بھی ہیں اور ان کی طرف
 توجہ بھی دیتے ہیں اور اس پر اپنے رد عمل کا اظہار بھی کرتے ہیں تو یہی کہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور مسخرہ بازی سے کام لیتے ہیں۔ وہ
 سب لوگ ان دونوں کاموں میں شریک ہیں۔ کبھی وہ اور کبھی یہ۔ اسی لیے اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں کسی قسم کا
 تضاد نہیں پایا جاتا۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ پہلے تو فرمایا گیا ہے کہ اگر ہماری آیات میں سے کسی سے واقف ہو جاتا ہے لیکن بعد میں یہ نہیں فرمایا
 کہ جسے جان چکا ہے اس کا استہزاء کرنا ہے، بلکہ فرمایا گیا ہے کہ ہماری سب آیات کا (خواہ انہیں جان چکا ہے یا نہیں) مذاق
 اڑاتا ہے۔

جبکہ یہ جہالت اور بے علمی کی انتہا ہے کہ انسان کسی ایسی چیز کا انکار کرے یا اس کا مذاق اڑائے جسے وہ سرے سے نہیں سمجھتا اور یہ ان کی ہٹ دھرمی اور عناد کی بہت بڑی دلیل ہے۔

آیت کے آخر میں ایسے لوگوں کی سزا کو ان لفظوں میں بیان فرمایا گیا ہے، ان کے لیے ذلیل و خوار کرنے والا عذاب ہے (اولئک لہم عذاب مہین)۔

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ وہ آیات الہی کا مذاق اڑا کر اپنی شخصیت اور مقام و منزلت بنانا چاہتے ہیں، لیکن خدا تعالیٰ انہیں اس کام کی سزا دے کر انہیں ذلیل و خوار اور لپست دے کر قیمت کر دے گا۔ انہیں ایسے رسوا کُن اور تحقیر آمیز طریقے پر عذاب قیامت میں گرفتار کرے گا کہ انہیں منہ بل زمین پر گھسیٹا جائے گا اور عذاب کے فرشتے طوق و زنجیر پہنا کر اور ملامت و سرزنش کرتے ہوئے جہنم میں لے جائیں گے۔

یہیں پر یہ بات بھی اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ گزشتہ آیت میں عذاب کی صفت ”المیم“ اور اس آیت میں ”مہین“ اور بعد کی آیت میں ”عظیم“ کیوں بیان کی گئی ہے؟ درحقیقت ان میں سے ہر صفت ان کے گناہوں کی کیفیت سے مناسبت رکھتی ہے۔

بعد کی آیت اس ”عذاب مہین“ کی یوں تشریح کرتی ہے: اور جہنم ان کے پیچھے ہی پیچھے ہے (من ورائہم جہنم)۔

”پیچھے ہی پیچھے“ کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی ہے حالانکہ جہنم تو ان کے آگے آگے ہوگی اور وہ آگے جا کر ہی ہل پھینگی؟ ممکن ہے یہ اس لحاظ سے ہو کہ وہ دنیا کی طرف مُٹھ کر کے آخرت اور خدا کے عذاب کو پس پشت ڈال چکے ہیں۔ ایسے موقع پر اس قسم کی تعبیر عام طور پر استعمال ہو کرتی ہے۔ جب انسان کسی چیز سے بے اعتنائی کرتا ہے تو کہتے ہیں وہ اسے پس پشت ڈال چکا ہے، قرآن مجید بھی سورہ دھُر کی آیت ۲۷ میں فرماتا ہے:

”ان ہؤلآء یُحِبُّون العاجلۃ ویذرون ورائہم یومًا ثقیلاً“

”وہ لوگ دنیا کی زودگر زندگی کو پسند کرتے ہیں اور اس سنگین دن کو پس پشت ڈال دیتے ہیں“

کچھ مفسرین کہتے ہیں کہ ”وراء“ کا کلمہ ”مورات“ سے لیا گیا ہے اور ”مورات“ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان سے پوشیدہ ہو۔ پس پشت کو بھی ”وراء“ کہا جاتا ہے اور سامنے کی چیز کو بھی جو دور اور پوشیدہ ہو۔ اس طرح سے کلمہ ”وراء“ کا ایک جامع مفہوم ہے جو دو متضاد مصداقوں پر بولا جاتا ہے۔ لہ

یہ تفسیر بھی بعید معلوم نہیں ہوتی کہ ہم کہیں کہ ”وراء“ کی تعبیر سے ”عدت و معلول“ کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اگر تم نے یہ مضر غذا استعمال کی تو اس کے پیچھے پیچھے بیماری ہے، یعنی مضر غذا کھانا اس بیماری کی علت ہے

۱۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر ”وراء“ کو فاعل کی طرف مضاف کیا جائے تو اس کا معنی پس پشت ہوتا ہے اور اگر مفعول کی طرف مضاف ہو تو سامنے کے معنی دیتا ہے۔ (دیکھو تفسیر روح البیان جلد ۸ ص ۲۹) لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔

اور بیماری اس کی معقول۔ اسی طرح یہاں پر بھی ان کے اعمال بھی دوزخ کے رسوا کُن عذاب کا سبب اور عامل ہیں۔ بہر صورت، آیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اگر ان کا یہ گمان ہو کہ بے پناہ مال و دولت، بُت اور مصنوعی خدا انھیں عذاب سے نجات دلائیں گے تو یہ ان کی بھول ہے، کیونکہ جو کچھ وہ مچکے ہیں وہ انھیں عذاب سے نجات نہیں دلائے گا اور نہ ہی وہ کہ جنہیں انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنا سرپرست بنایا تھا "ولا یغنی عنہم ما کسبوا شیئاً ولا ما اتخذوا من دون اللہ اولیاء"۔

چونکہ فرار اور نجات کی کوئی راہ نہیں ہوگی لہذا انھیں خدا کے تہر و غضب کی آگ میں ہمیشہ جلنا ہوگا اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے " (ولہم عذاب عظیم)۔

ان لوگوں نے دنیا میں خدائی آیات کو معمولی سمجھا لہذا خدا نے ان کے عذاب کو بڑا کر دیا۔ وہ بڑائی کا اظہار کرتے تھے لہذا خدا بھی ان کو عذاب عظیم دے گا۔

ایسا عذاب ہر لحاظ سے عظیم بھی ہوگا اور جاودانی بھی، شدید بھی ہوگا اور رسوا کُن بھی اور گناہگاروں کے دل کی گہرائیوں اور ہڈیوں کے جوڑوں تک جا پہنچے گا۔ جی ہاں! خداوند عظیم کے سامنے گناہ عظیم کی سزا بھی عذاب عظیم ہوگی۔

- ۱۱۔ هَذَا هُدًى وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رَّجْزٍ أَلِيمٌ ۝
- ۱۲۔ اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلُكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝
- ۱۳۔ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ ۝
- ۱۴۔ قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝
- ۱۵۔ مَن عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَن أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۝

ترجمہ

- ۱۱۔ یہ (قرآن) سبب ہدایت ہے اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا، ان کے لیے سخت اور دردناک عذاب ہے۔
- ۱۲۔ خدا ہی تو ہے جس نے دریا کو تمھارے مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ اس کے فضل سے اپنا حصہ حاصل کرو اور شاید کہ اس کی نعمتوں کا

شکر بجالاؤ۔

۱۳۔ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے تمہارا مسخر کیا ہے اس میں اہل فکر کے لیے اہم نشانیاں ہیں۔

۱۴۔ مومنین سے کہہ دیجیے، جو لوگ خدا کے دنوں (روزِ قیامت) کی توقع نہیں رکھتے ان سے درگزر کریں تاکہ خدا اس دن ہر قوم کو اس کے ان اعمال کی جزا دے جو وہ انجام دیتی رہی ہے۔

۱۵۔ جو شخص نیک کام کرتا ہے اپنے لیے ہی انجام دیتا ہے اور جو بُرا کام کرے گا، اس کا وبال اسی پر ہوگا۔ پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تفسیر

سب تیرے لیے سرگرداں اور تیرے زیر فرمان ہیں

گزشتہ آیات میں آیات الہی کی عظمت کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ زیر تفسیر آیات بھی اس موضوع پر گفتگو کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ قرآن مجید سب ہدایت ہے۔ (ہذا ہدٰی)۔

حق کو باطل سے جدا کرتا ہے، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ راہِ حق کے راہیوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں منزل مقصود تک پہنچاتا ہے، لیکن جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا ہے، ان کے لیے سخت اور دردناک عذاب ہے (والذین کفروا بآیات ربہم لہم عذاب من رجب الیم)۔

کتاب مفردات میں راعب کے بقول ”رجز“ (بروزن ”حصص“) کا اصلی معنی اضطراب، لرزہ اور بد نظمی ہے، خاص کر جب اُونٹ بیمار ہوتا ہے تو زبردست کمزوری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے اور غیر منظم قدم اٹھاتا ہے، ایسی حالت کو عرب اپنی زبان میں ”رجز“ کہتے ہیں۔

طاعون کی بیماری سخت مصیبت یا زبردست برف باری اور زلزلہ باری کو ”رجز“ کہتے ہیں۔ اسی طرح شیطان دوسوں وغیرہ پر بھی اس کلمہ کا اطلاق ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب اضطراب دہے چینی، تزلزل اور بد نظمی کا باعث ہوتے ہیں اور اگر جنگی اشارہ کو

”رجز“ (بروزن ”عزن“) کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اشعار کے مقطع چھوٹے اور قریب ہوتے ہیں (یا پھر دشمن کے پیکر میں تزلزل اور اضطراب پیدا ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں)۔

پھر سلسلہ گفتگو کو توحید کی بحث کی جانب موڑ دیا گیا ہے۔ اس سورت کی ابتدائی آیات میں بھی اس ضمن میں گفتگو موجود ہے مگر اس کو توحید اور خدا شناسی کے نوٹر درس دیئے گئے ہیں۔

کبھی قرآن ان کے احساسات کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتا ہے: خدا ہی تو ہے، جس نے دریا کو تمھارے لیے مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور اس کے فضل سے تم اپنا حصہ حاصل کرو، شاید کہ اس کی نعمتوں کا شکر بجلاؤ (اللہ الذی سخر لکم البحر لتجرى الفلك فيه بامرہ ولتبتغوا من فضله ولعلکم تشكرون)۔ کس ذات نے بحری جہازوں اور کشتیوں میں یہ خاصیت خلق فرمائی ہے کہ وہ پانی میں ڈوبتی نہیں ہیں اور کس نے ان کی حرکت کے لیے پانی کو ایسا نرم بنایا ہے کہ وہ آرام سے اس پر چلتی رہتی ہیں اور کس نے ہواؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ منظم صورت میں سمندروں کی سطح پر چلتی رہیں اور کشتیوں کو اس پر رواں دواں رکھیں (یا کس نے بھارات کی طاقت کو ہواؤں کا جانشین بنایا ہے تاکہ وہ ان عظیم جہازوں کو بڑی تیزی کے ساتھ جاری و ساری رکھیں؟

ہم جانتے ہیں کہ گوشتہ اور موجودہ دور میں انسان کے وسائل کی حمل و نقل کا عظیم ترین اور اہم ترین ذریعہ چھوٹی بڑی اور غول پیکر کشتیاں اور بحری جہاز ہیں جو سال بھر لاکھوں انسانوں اور ان سے زیادہ تجارتی مال کو دنیا کے دور دراز ترین علاقوں سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض بحری جہاز تو ایسے بھی ہیں جو ایک چھوٹے سے شہر قبئی وسعت اور آبادی کے حامل ہوتے ہیں اور تمام قسم کے وسائل اور ہر قسم کی چیزیں ان میں موجود ہوتی ہیں۔

یقیناً اگر یہ تینوں طاقتیں موجود نہ ہوتیں تو انسان اپنی دوسری معمولی سواریوں کے ذریعے حمل و نقل کی مشکلات کو کس طرح حل کر سکتا؟ ہر چند کہ دوسرے ذرائع آمد و رفت بھی اس کی نعمت ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر مفید ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سورہ ابراہیم کی بیسویں آیت میں فرمایا گیا ہے:

”وَسَخَّر لَكُمُ الْفَلَكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ“

”کشتیوں کو تمھارے تابع فرما کر دیا ہے تاکہ اس کے حکم کے مطابق دریا میں چلتی رہیں۔“

لیکن یہاں پر فرمایا گیا ہے: ”دریا کو تمھارے تابع فرما کر دیا ہے تاکہ اس میں کشتیاں چلتی رہیں۔“ کیونکہ وہاں پر زیادہ نظر تفسیر پر ہے۔ لہذا اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے:

”وَسَخَّر لَكُمُ الْأَنْهَارَ“

”اور اس نے نہروں کو بھی تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے۔“

لیکن یہاں پر کشتیوں کی تسخیر پیش نظر ہے۔ صورت حال خواہ کچھ ہو دونوں چیزیں حکم خدا کے مطابق انسان کے لیے مسخر اور اس کے تابع ہیں اور اس کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہیں۔

اس تسخیر کا مقصد یہ ہے کہ تم فضل خداوندی سے اپنا حصہ پاؤ۔ کیونکہ اس قسم کی تعبیر عام طور پر تجارت اور اقتصادی سرگرمیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ البتہ مسافرن کی نقل و حرکت اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی تعبیر بھی اس میں پائی جاتی ہے اور خداوند تعالیٰ کے فضل سے بہرہ برداری کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے احساس شکرگزاری کو متحرک کیا جاسکے اور اس کے تمام احساسات کو ایک جگہ متحد کیا جاسکے تاکہ اس طرح سے انسان "معرفة اللہ" کی راہوں کو طے کر سکے۔

لفظ "فلک" (کشتی) جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں مفرد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دریاؤں، کشتیوں اور ان کے فائدوں اور برکتوں کی بیشتر وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں سورہ نحل کی آیت ۱۴ و ۱۵ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

کشتیاں اور بحری جہاز ایسی نعمت ہیں جو انسان کی روزمرہ کی زندگی سے زیادہ قریب کا تعلق رکھتی ہے۔ اس کے ذکر کے بعد تمام مخلوق کی تسخیر کو کلی طور پر بیان فرماتے ہوئے کہتا ہے، اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب کو اپنی طرف سے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ (و مسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعاً منہ)۔

اس نے تمہیں اس قدر حیثیت، قدر و قیمت اور عظمت عطا فرمائی ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں اور وہ تمہارے مفادات کی نگرانی کر رہی ہیں۔ آفتاب اور مہتاب، باد اور باران، پہاڑ اور درے، جنگل اور صحرا، درخت اور حیوان، معدنیات اور زیر زمین ذخائر فرض اس کائنات کی تمام چیزوں کو اس نے تمہاری خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے اور ہر چیز کو تمہارے زیر فرمان کر دیا ہے تاکہ تم اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور غفلت کا شکار نہ ہو جاؤ۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہ فرماتا ہے: "جمیعاً منہ" یہ تمام چیزیں اپنی خصوصیات اور اختلاف کے باوجود اسی ذات کی پیدا کردہ ہیں اور اسی کے زیر فرمان تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہیں۔

جب تمام نعمتیں اس کی جانب سے ہیں اور ساری کائنات کی خالق، مدبر اور پروردگار اسی کی ذات پاک ہے تو پھر انسان دوسروں کے پیچھے کیوں جاتے اور اپنا سر ضعیف مخلوق کے آستانے پر کیوں جھکائے اور منہم حقیقی کی معرفت سے کیوں غافل ہو؟ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، اس میں اہل فکر کے لیے اہم نشانیاں ہیں (ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون)۔

پہلی آیت میں انسانی احساسات سے استفادہ کیا گیا ہے اور اس آیت میں ان کے عقول و افکار سے کام لیا گیا ہے۔

لہ "جمیعاً منہ" کے اعراب اور اس کی ترکیب میں متحد و احتمال ملتے ہیں۔ زمخشری نے اپنی تفسیر کشف میں دو احتمال ذکر کیے ہیں، پہلا یہ کہ "جمیعاً منہ" "ما فی السموات وما فی الارض" کا حال واقع ہو رہا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر ہے، حالانکہ اسی کی طرف سے ہے۔ دوسرا یہ کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو تہذیری صورت میں یوں ہے "ہی منہ جمیعاً"۔

بعض مفسرین نے ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ جملہ "ما فی السموات وما فی الارض" کی تاکید ہے۔

کیونکہ خداوند مہربان ہر ممکنہ زبان کے ذریعے اپنے بندوں کے ساتھ باتیں کرتا ہے، کبھی تو دل کی زبان کے ساتھ اور کبھی عقل و فکر کی زبان کے ساتھ۔ ان سب میں سوائے ایک ہدف کے اور کچھ بھی مطلوب و مقصود نہیں اور وہ ہے غافل انسانوں کی بیداری اور انہیں خدائی راستے پر گامزن کرنا۔

کائنات کی مختلف موجودات کی تسخیر کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۶ میں سورۃ ابراہیم کی آیات ۳۱ تا ۳۳ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

پھر کفار کے ساتھ میل جول کے موقع پر مومنین کو ایک اخلاقی سبق دیا جا رہا ہے تاکہ سابق منطقی بحثوں کو اس کے ذریعے سے بائیں تکمیل تک پہنچایا جاسکے۔ اسی لیے روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، مومنین سے کہہ دے کہ جو لوگ خدا کے دنوں (روز قیامت) کی توقع نہیں رکھتے، ان سے درگزر کریں اور سخت گیری سے کام نہ لیں۔

(قل للذین آمنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ)۔
ممکن ہے کہ وہ ایمان اور خدائی تربیت کی مبادیات سے دور ہونے کی وجہ سے سخت اور نامناسب روش اپنائے ہوئے ہوں اس لیے غلط الفاظ استعمال کرتے ہوں، لہذا تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم اپنی طرف سے عظمت کا ثبوت دو اور کھلے دل کے ساتھ ایسے لوگوں سے ملاپ رکھو، مبادا ان کی ہٹ دھرمی میں اضافہ ہو اور حق سے ان کا فاصلہ بڑھتا جائے۔ تمہاری طرف سے حسن خلق اور کھلے دل کے ساتھ میل ملاپ کا مظاہرہ ایک توان کے دباؤ میں کمی کر دے گا اور دوسرے ممکن ہے کہ ان کی ایمان کی طرف کشش کا موجب بن جائے۔

اس طرح کا حکم قرآن مجید میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ مثلاً سورۃ زخرف آیت ۸۹ میں ہے۔

”فاصفح عنہم وقل سلام فوسف یعلمون“

ان سے چشم پوشی کیجیے اور کہہ دیجیے ”سلام ہو تم پر، لیکن بہت جلد وہ اپنا انجام جان لیں گے“

اصولی طور پر بے سمجھ لوگوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ اور سزا پر اصرار، عام طور پر کسی خاطر خواہ نتیجے کا باعث نہیں بن سکتا اور ان سے بے پرواہی اور عظمت کا مظاہرہ ہی انہیں بیدار کرنے کا ذریعہ اور ہدایت کا عامل بنتا ہے۔

البتہ یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے، کیوں کہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ مقام ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں پر سختی اور سزا کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہوتا، لیکن ایسا اتفاق کم ہوتا ہے۔

ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ویسے تو تمام دن خدا کے دن ہوتے ہیں لیکن ”ایام اللہ“ کا اطلاق خاص دنوں پر ہوتا ہے، کیونکہ یہ ان کی اہمیت اور عظمت کی علامت ہے۔

اس قسم کی تعبیر قرآن مجید میں دو مقام پر آئی ہے، ایک تو اسی آیت میں اور دوسرے سورۃ ابراہیم میں، جہاں اس کے وسیع معانی ہیں۔

احادیث میں ”ایام اللہ“ کی تفسیر میں مختلف دنوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں سے علی بن ابراہیم کی تفسیر میں مذکور ہے کہ ”ایام اللہ“ سے تین روز مراد ہیں۔

حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کا دن، موت کا دن اور قیامت کا دن۔
ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

«ایام اللہ نعماتہ و بلائہ و بلائہ سبحانہ»

«ایام اللہ» خدا کی نعمتوں کے دن ہیں اور اس کی طرف سے آزمائش و ابتلاؤں کے ذریعے ہوتی ہے۔

بہر حال یہ تعبیر روز قیامت کی اہمیت کی علامت ہے، خداوند عالم کی آشکار اور واضح صورت میں ہر چیز اور ہر شخص پر
حاکمیت کا دن، عظیم عدل و انصاف کا دن۔

تاکہ اس قسم کے لوگ اس عظمت اور عفو و درگزر سے نا جا آئے فائدہ نہ اٹھائیں، اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے تاکہ
خداوند عالم اس دن ہر قوم کو اس کے ان اعمال کی جزا دے جو وہ انجام دیتی رہی ہے۔ (لیجزی قومًا بما کانتوا
یکسبون)۔

کچھ مفسرین نے اس جملے کو کفار اور مجرمین کے لیے ایک قسم کی دھمکی مراد لیا ہے جبکہ بعض نے اسے مومنین کے عفو و درگزر
کی جزا کے معنوں میں لیا ہے۔

لیکن اس بات سے کوئی چیز نافع نہیں ہے کہ یہ کفار کے لیے دھمکی اور مومنین کے لیے خوشخبری ہو، جیسا کہ بعد کی آیت
میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: جو شخص نیک کام کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے کرتا ہے اور بُرا کام کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر
ہوگا، پھر تم سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور اپنے اعمال کا نتیجہ پا لو گے۔ (من عمل صالحًا فلنفسہ
ومن اساء فلنفسہ الیٰ ربکم ترجعون)۔

یہ تعبیر جو قرآنی آیات میں کہی بار ذکر ہوئی ہے اور مختلف عبارتوں کے ساتھ بیان ہوئی ہے اُن لوگوں کا جواب ہے جو یہ
کہتے ہیں کہ ہماری اطاعت یا نافرمانی خدا کو کیا نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہے اور اس کی اطاعت یا معصیت سے نہی پر اصرار کے کیا
معنی ہیں؟

یہ آیت کہتی ہے کہ یہ سب نفع یا نقصان تمہارے ہی لیے ہے اور تم ہی اپنے اعمال صالحہ کے پر تو میں ارتقائی مراحل طے
کرد گے اور قرب الہی کے آسمان تک پرواز کرو گے؛ یا جرم و گناہ کے نتیجے میں پستی میں جا کر گے اور غضب الہی کے گڑھوں اور
رحمت خداوندی کے بعد اس کی ابدی لعنت کی اتھاہ گہرائیوں میں جا کر گے۔

ادلے فرض کے تمام پروردگار، انبیاء کی لعنت اور کتابوں کا نزول بھی اسی لیے ہے۔ اسی لیے قرآن مجید ایک جگہ پر فرماتا ہے۔

«ومن یشکر فاثمنا یشکر لنفسہ ومن کفر فان اللہ غنی حمید»

«جو شخص شکر بجالاتا ہے اپنے فائدہ ہی کے لیے شکر گزاری کرتا ہے اور جو شخص کفر کرتا ہے تو خدا

عنی وحمید ہے۔ (لقمان / ۱۲)

ایک اور جگہ پر فرمایا گیا ہے:

” فمن اهتدى فلنفسه ومن ضل فانما يضل عليها “
 ” جو شخص ہدایت حاصل کرتا ہے اپنے ہی فائدہ کے لیے کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے اس کا نقصان بھی اسے ہی ہوگا۔ “
 (زمر / ۴۱)

ایک اور مقام پر ہے:

” ومن تزكى فانما يترقى لنفسه والى الله المصير “
 ” جو شخص پاکیزگی اپناتا ہے اپنے ہی فائدے کے لیے اپناتا ہے اور سب لوگوں کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے “
 (فاطر / ۱۸)

خلاصہ یہ کہ اس قسم کی تعبیری اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ ”خدا کی طرف بلائے والے افراد“ کی دعوت، ہر پہلو سے انسانیت کی ایک عظیم خدمت ہے نہ کہ خدا کی جو ہر چیز سے بے نیاز ہے اور نہ ہی خود انبیاء کی خدمت ہوتی ہے، کیونکہ ان کا اجر تو صرف خدا کے پاس ہے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ، اطاعت الہی کی طرف اقدام اور گناہوں سے پرہیز کا ایک نہایت مؤثر عامل ہے۔

- ۱۶- وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنَاهُمْ
مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝
- ۱۷- وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ
الْعِلْمُ بِغِيَابِ بَيْنِهِمْ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا
كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝
- ۱۸- ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ
الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝
- ۱۹- إِنَّهُمْ لَن يُغْنُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ
أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ۝
- ۲۰- هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝

ترجمہ

- ۱۶- اور ہم نے بنی اسرائیل کو آسمانی کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی اور انہیں پاکیزہ
رزق دیا اور انہیں (اپنے زمانے کے) تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی۔
- ۱۷- اور ان کو نبوت و شریعت کے روشن دلائل عطا کیے، تو ان لوگوں نے علم آچکنے کے
بعد بس ظلم اور برتری کی خواہش کی بنا پر ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔ لیکن یہ

لوگ جن باتوں میں اختلاف کر رہے ہیں، قیامت کے دن تیرا پروردگار ان میں فیصلہ کر دے گا۔

۱۸۔ پھر ہم نے تجھے برحق شریعت اور دین پر برقرار رکھا پس اسی کی پیروی کرتا رہ اور نادان سرکشوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا۔

۱۹۔ یہ لوگ خدا کے مقابلے میں ہرگز تجھے بے نیاز نہیں کر سکتے اور نہ ہی عذاب سے بچا سکتے ہیں، اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہیں، جبکہ خداوند عالم پر ہیزگاروں کا مددگار ہے۔

۲۰۔ یہ (قرآن اور آسمانی شریعت) ان لوگوں کے لیے بینائی کے وسائل اور ہدایت و رحمت کے ذرائع ہیں جو ان پر یقین رکھتے ہیں۔

تفسیر

بنی اسرائیل کی ناشکری

گذشتہ آیات میں خداوند عالم کی مختلف نعمتوں، شکرگزاری اور اعمالِ صالحہ سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ ان آیات میں ان بعض گذشتہ اقوام کا تذکرہ ہے جن کو خدا کی نعمتیں ملیں، لیکن انہوں نے ان کی قدر دانی نہیں کی۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو آسمانی کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی اور انہیں پاکیزہ رزق دیا اور انہیں (اپنے) زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی (ولقد اتینا بنی اسرائیل الكتاب والحکم والنبوۃ ورزقناہم من الطیبات وفضلناہم علی العالمین)۔

اس آیت میں ان پانچ نعمتوں کا تذکرہ ہے جو خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو عطا کی تھیں۔ بعد میں ذکر ہونے والی نعمت کو ملا کر یہ چھ عظیم نعمتیں بن جاتی ہیں۔ سب سے پہلی نعمت تو آسمانی کتاب یعنی تورات ہے جو دینی معارف، حلال و حرام اور ہدایت و سعادت کی راہیں

بیان کرتی تھی۔

دوسری نعمت حکومت اور منصب ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک نہایت ہی طاقت ور اور وسیع و عظیم حکومت کے مالک رہے ہیں، نہ صرف حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام منصب حکومت پر فائز رہے ہیں، بلکہ بنی اسرائیل کے دوسرے بہت سے افراد بھی اپنے دور کے طاقت ور حکمران رہے ہیں۔

قرآنی تعبیر میں ”حکم“ عام طور پر فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن چونکہ عدل و انصاف کا حکم ہمیشہ حکومت ہی کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے اور حکومت کی امداد اور طاقت کے بغیر ”قاضی“ کے فیصلوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی لہذا التزامی دلالت کے طور پر اس کا اطلاق حکمرانی پر بھی ہوتا ہے۔

تورات کے بارے میں سورہ مائدہ کی ۲۲ ویں آیت میں ہے کہ:

”يُحْكِمُهَا النَّبِيُّونَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا“

”جو انبیاءِ حکم خدا کے سامنے سر جھکا چکے تھے وہ تورات ہی کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلے کرتے تھے۔“

ان پر خدا کی طرف سے تیسری نعمت ”نبوت“ کی تھی، کیونکہ خداوند عالم نے بنی اسرائیل میں سے بہت انبیاء منتخب کئے تھے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے:

بنی اسرائیل میں سے بزرگ و پیرہ انبیاء کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاء کی تعداد چار ہزار افراد تھی۔

یہ سب ان پر خدا کی نعمتیں تھیں۔

جو تھے مرطے پر مادی نعمتوں کا تذکرہ ہوتا ہے، نہایت ہی جامع اور مانع تذکرہ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انہیں پاک و پاکیزہ

روزی عطا فرمائی (و سرزقتنا هم من الطيبات)

پانچویں نعمت بلا شرکت غیرے فضیلت و برتری اور قدرت و طاقت تھی، جیسا کہ اسی آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا

گیا ہے: اور انہیں اپنے زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی (و فضلناهم علی العالمین)

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں پر ”عالمین“ سے مراد اس زمانے ہی کے لوگ ہیں، کیونکہ سورہ آل عمران کی ۱۱۰ ویں آیت

کہتی ہے:

”كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“

”تم مسلمان ایک بہترین امت تھے، جنہوں نے انسانوں کے فائدہ کے لیے عالم وجود میں قدم رکھا۔“

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء ہیں اسی طرح آپ کی اُمت بھی افضل ترین اُمت ہوگی، جیسا کہ سورہ نحل کی ۸۹ ویں آیت میں ہے:-

”وَلَيَوْمَ نَبُذُ فِي كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَجُنَّا بَلَدٍ شَهِيدًا
عَلَىٰ هَؤُلَاءِ“

”اس دن کا سوچیے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ خود انہی میں سے مبعوث کریں گے اور آپ کو ان سب پر گواہ ٹھہرائیں گے“

بعد کی آیت میں خداوند عالم اس چھٹی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے جو اس قدر ناشناس قوم کو عطا کی گئی، فرماتا ہے: اور ہم نے ان کو نبوت اور شریعت کے روشن دلائل عطا کیے (وَأَتَيْنَاهُم بَيِّنَاتٍ مِنَ الْاَمْرِ)۔ ممکن ہے ”بیّنات“ سے ان روشن معجزات کی طرف اشارہ ہو جو خداوند عالم نے جناب موسیٰ بن عمران اور نبی اسرائیل کے دوسرے انبیاء کو عطا فرمائے، یا پھر منطقی اور آشکار دلائل دہرائیں، قوانین اور محکم اور نچتہ احکام کی طرف اشارہ ہو۔

بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ یہ تعبیر ان روشن علامات و آیات کی طرف اشارہ ہے جو خداوند عالم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں انہیں عطا کی تھیں کہ جن کے ذریعے وہ پیغمبر خاتم الانبیاء کو اپنی اولاد کی طرح پہچان سکتے تھے، جیسا کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

”الَّذِينَ اٰتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ ابْنَاهُمْ“
”جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ اُسے (رسولِ اسلام کو) یوں پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے

ہیں“ (بقرہ - ۱۲۴)

لیکن اگر یہ تمام معانی آیت میں جمع کر لیے جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

بہر حال ان تمام عظیم نعمتوں اور روشن دلیلوں کے ہوتے ہوئے اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی، لیکن ان ناشکروں نے بہت جلد آپس میں اختلاف کھڑے کر دیئے، جیسا کہ اسی آیت کے ضمن میں قرآن فرماتا ہے: انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اپنے پاس علم و معرفت کے آجانے کے بعد اور اس اختلاف کا منشا وہی جاہ طلبی اور بالادستی کی خواہش تھی (فما اختلفوا الا من بعد ما جاؤهم العلم بذيٰ ابينهم)۔

جی ہاں! انہوں نے سرکشی کے جھنڈے بلند کر دیئے اور ایک گروہ دوسرے کی جان کے دسپے ہو گیا، یہاں تک کہ اتحاد و اتفاق کے ذرائع کو اختلاف اور تفرقہ بازی کے اسباب بنا لیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی طاقت کمزوری میں بدل گئی، ان کی عظمت کے ستارے ڈوب گئے، ان کی حکومت دگرگوں ہو گئی اور خود در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہ اختلاف ہیں جو انہوں نے پیغمبر اسلام کی صفات جاننے کے بعد ان کے بارے میں ظاہر کیے۔

قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں انہیں خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے: لیکن یہ لوگ جن باتوں میں اختلاف کر رہے ہیں، قیامت

کے دن تمہارا پروردگار ان کے بارے میں فیصلہ کر دے گا۔ (ان ربک یقضى بینہم یوم القیامۃ فیما کانوا فیہ یختلفون)۔

تو گویا آپس میں اختلاف کر کے ایک تو انہوں نے دنیا میں اپنی عظمت اور طاقت کو کھودیا اور دوسرے اپنے لیے آخرت کا عذاب مول لے لیا۔

خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو جو نعمتیں عطا کی تھیں اور انہوں نے کفران نعمت کیا، اس کے ذکر کے بعد اس عظیم نعمت کا بیان ہے جو خالق کائنات نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے مسلمانوں کو عطا فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پھر ہم نے تجھے برحق شریعت اور دین پر برقرار رکھا (لقد جعلناک علی شریعۃ من الامر)۔

”شریعت“ کا معنی ایسا راستہ ہے جو پانی تک پہنچنے کے لیے دریا وغیرہ کے کنارے پر بنایا جاتا ہے کہ جہاں پر پانی کی سطح دریا کے سطح سے نیچے ہوتی ہے۔ بعد ازاں اس کا اطلاق ہر اس راستے پر ہونے لگا جو انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے اور دین حق کے بارے میں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ وہ (دین حق) انسان کو وحی کے سرچشمہ اور خدا کی رضا اور سعادت ابدی تک پہنچاتا ہے جو آپ حیات کے مانند ہے یہ لفظ قرآن مجید میں صرف ایک بار استعمال ہوا ہے اور وہ بھی صرف اسلام کے بارے میں۔

یہاں پر ”الامر“ سے مراد دین حق ہی ہے جس کی طرف گزشتہ آیت میں ارشاد ہو چکا ہے، جہاں پر کہا گیا ہے:

”بینات من الامر“

چونکہ یہ راستہ، نجات اور کامیابی کا ضامن ہوتا ہے، لہذا اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے۔ ”اے میرے رسول! بس تو اس کی پیروی کرتا رہ (فاتبعھا)۔“

اور چونکہ اس کے برعکس جاہلوں کی خواہشات کی پیروی ہی ہوتی ہے لہذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور نادان سرکشوں کی خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرنا۔ (ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون)۔

حقیقت یہ ہے کہ دو راستوں کے علاوہ تیسرا راستہ نہیں ہے ایک تو انبیاء اور وحی کا راستہ اور دوسرے جاہلوں کی خواہشات نفسانی کا راستہ۔ اگر کوئی شخص پہلے راستے سے مُنہ موڑ لے گا تو دوسرے راستے پر چل پڑے گا اور اگر جاہلوں کے راستے سے روگردانی کرے گا تو انبیاء کی راہوں پر چل سکے گا۔ اسی لیے تو قرآن مجید نے ہدایت کے ہر اس طرز عمل پر خطیخ کھینچ دیا ہے جو سرچشمہ وحی سے مدد حاصل نہیں کرتا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ رؤساء قریش پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر عرض کرنے لگے، آئیے! آپ اپنے بزرگوں کے دین کی طرف پلٹ آئیے، کیونکہ وہ ایک تو آپ سے افضل تھے اور دوسرے صحت مند۔

اس زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی مکہ میں ہی تھے کہ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اس میں ان قریشیوں کو جواب دیا گیا ہے کہ حق تک پہنچنے کا راستہ آسمانی وحی ہے جو تجھ پر نازل ہوئی ہے، نہ کہ جن خواہشات کا

یہ قریشی جاہل تقاضا کرتے ہیں۔

ہمیشہ سچے دینی رہبروں نے جب بھی کوئی تازہ اور پاک دین پیش کیا، انہیں جہلاء کے ایسے ہی دوسوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کہتے کہ کیا تم بہتر سمجھتے ہو یا تمہارے وہ بزرگ اور آباؤ اجداد جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں؟ ان کا اصرار ہوتا کہ وہ اسی خرافاتی روش کو اپنائیں جس پر وہ لوگ خود کا مزہ لیں۔ اگر ان کی اس قسم کی تجویز پر عمل درآمد کیا جاتا تو انسان ارتقار کی طرف ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا۔ بعد کی آیت درحقیقت مشرکین کے آگے ٹھکنے کی نہی کی ایک دلیل اور علت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ لوگ خدا کے بے میں تو تجھے بے نیاز کر سکتے ہیں اور نہ خدا سے بچا سکتے ہیں (انتم لمن یفسدوا عنک من اللہ شیئا)۔

اگر کوئی شخص ان کے باطل دین کی پیروی کرے گا اور عذاب الہی اس کے دامن گیر ہوگا تو یہ لوگ ہرگز نہ اس کی امداد نہیں کر سکیں گے اور اگر خداوند عالم کوئی نعمت اس سے سلب کر لے تو وہ لوگ اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ اس آیت میں اگرچہ رستے سخن پیغمبر اسلام کی ذات کی طرف ہے، لیکن مراد تمام مومنین ہیں۔

پھر فرمایا گیا ہے: ظالم لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہیں (وان الظالمین بعضهم اولیاء ن)۔

یہ سب ایک قماش کے لوگ ہیں اور ایک ہی راستے کے راہی ہیں، سب کمزور و ناتواں ہیں۔

لیکن یہ باور بھی آپ ہرگز نہ کریں کہ آپ اور دوسرے با ایمان افراد اس وقت اگر اقلیت میں ہیں تو آپ لوگوں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے، کیونکہ ”اللہ پر ہی تم گارنٹل کا مددگار ہے“ (واللہ ولی المتقین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ بظاہر وہ لوگ بہت بڑی تعداد میں ہیں اور بڑی طاقت و دولت کے مالک بھی ہیں، لیکن حق کی بے انتہا قدرت کے سامنے تو وہ ایک ناچیز ذرے سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے۔

زیر تفسیر سلسلے کی آخری آیت میں گزشتہ مضامین اور دین الہی کی پیروی کی طرف انبیاء کی دعوت پر تکیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ قرآن اور شریعت ان لوگوں کے لیے بنیائی کے دسائل اور ہدایت و رحمت کے ذرائع ہیں جو ان پر یقین رکھتے ہیں۔ (ہذا بصائر للناس و ہدی و رحمۃ لقوم یوقنون)۔

”بصائر“ جمع ہے ”بصیرت“ کی جس کے معنی ہیں بینائی۔ ہر چند کہ یہ لفظ زیادہ تر عقلی اور فکری بینش کے بارے میں بولا جاتا ہے، لیکن کبھی ان سب امور پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو مطلب کے ادراک اور فہم کا سبب ہوتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ”یہ قرآن اور شریعت بینائیاں ہیں“ یعنی یہ خود عین بینائی ہیں۔ وہ بھی نہ صرف ایک بینائی بلکہ کئی بینائیاں جو صرف ایک پہلو کے لحاظ سے بلکہ تمام پہلوؤں کی رُو سے زندگی میں انسان کو صحیح بینش عطا کرتی ہیں۔

اس قسم کی تعبیرات قرآن مجید کی کئی اور آیات میں بھی ہیں، جن میں سے ایک سورہ انعام کی آیت ۱۰۴ بھی ہے، جس میں ارشاد ہوتا ہے:

”قد جاءکم بصائر من ربکم۔“

”تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بینائیاں آچکی ہیں۔“

یہاں پر آیت میں تین موضوع بیان ہوئے ہیں، ایک ”بصائر“ دوسرے ”ہدایت“ اور تیسرے ”رحمت“ کہ بالترتیب

تینوں ایک دوسرے کے علت و معلول بن رہے ہیں۔ روشنی عطا کرنے والی آیات اور بینائی عطا کرنے والی شریعت انسان کو ہدایت کی طرف لے جاتی ہیں اور ہدایت بھی رحمت الہی کا ذریعہ ہے۔

یہ بات بھی دل چسپ ہے کہ ”بصائر“ کو عامۃ الناس کے لیے بیان کیا گیا ہے، لیکن ”ہدایت“ اور ”رحمت“ کو ان لوگوں سے مخصوص کیا گیا ہے جو صاحبان یقین ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ قرآنی آیات کسی قوم اور قبیلے سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ جو لوگ بھی ”التناس“ کے مفہوم میں آتے ہیں، اس میں شریک ہیں۔ اس میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک فطری امر ہے کہ ہدایت یقین کی ایک شاخ ہے اور رحمت خداوندی بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لہذا ہر ایک کے شامل حال نہیں ہو سکتی۔

بہر حال یہ جو فرمایا گیا ہے کہ قرآن میں عین بصیرت اور عین ہدایت و رحمت ہے، یہ ایک نہایت ہی خوبصورت تعبیر ہے، جو اس آسمانی کتاب کی عظمت و تاثیر اور گہرائی و گیرائی پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لیے جو ہر منزل اور متلاشی تھی ہیں۔

۲۱- أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝
 ۲۲- وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

۲۳- أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝

ترجمہ

۲۱- جو لوگ برے کاموں کے مرتکب ہوئے ہیں، کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام بھی کرتے رہے کہ ان سب کا جینا مرنا یکساں ہوگا؟ یہ لوگ کیا برا فیصلہ کرتے ہیں؟

۲۲- اور خدا نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

۲۳- کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ اور خدا نے سمجھ بوجھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے (کیونکہ وہ ہدایت کے لائق ہی نہیں، اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے، تو پھر

ایسی حالت میں خدا کے سوا سے اور کون ہدایت کر سکتا ہے؟ کیا تم غور نہیں کرتے ہو؟

تفسیر

ان لوگوں کا مرنا جینا ایک سا نہیں ہے

گزشتہ آیات میں دو مختلف اور متضاد گروہوں کا ذکر تھا، ایک مومنین کا گروہ اور دوسرا کافروں کا یا ایک پرہیزگاروں کا اور دوسرا مجرمن کا۔ اس کے بعد زیر نظر آیات میں ان دونوں گروہوں کو آنے سے سامنے رکھ کر ان کا باہمی تقابل کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے، جو لوگ بُرے کاموں کے مرتکب ہوئے ہیں کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کے برابر کریں گے جو ایمان لائے اور اچھے اچھے کام بھی کرتے رہے کہ ان کا مرنا جینا یکساں ہوگا (ام حسب الذین اجتروا الحیات ان نجعلہم کالذین امنوا وعملوا الصالحات سواء محیاهم ومماتہم)۔

یہ لوگ کیا بڑا فیصلہ کرتے ہیں (ساء ما یحکمون)۔

کیا یہ بات ممکن ہے کہ نور اور ظلمت، علم اور جہل، نیک اور بد اور ایمان اور کفر یکساں ہوں؟ آیا یہ بات ممکن ہے کہ نابرابر امور کا نتیجہ اور پھل مساوی ہو؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ نیک عمل مومنین، بے ایمان مجرمن سے ہرگز علیحدہ ہیں۔ ایمان ہو یا کفر، نیک اعمال ہوں یا بُرے، ان میں سے ہر ایک کو ان کی زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ یہ آیت سورہ ص کی ۲۸ ویں آیت کے مانند ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

”ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصالحات کالمفسدون فی الارض

ام نجعل المتقین کالمنجاری

”کیا جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل انجام دیتے ہم ان کو ”مفسدین فی الارض“

جیسا بنا دیں؟ یا پرہیزگاروں کو فاجروں کے مانند؟

سورہ قلم کی ۳۵ و ۳۶ ویں آیت میں بھی فرمایا گیا ہے۔

”ان جعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون“

”آیا ہم مسلمانوں کو گناہگاروں جیسا بنا دیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیسے فیصلے کرتے ہو؟“

”اجتروا“، ”جرح“ کے مادہ سے ہے، جس کا معنی وہ زخم یا اثر ہے جو بیماری یا کسی اور تکلیف کی وجہ سے انسان کے بدن پر ہوتا ہے۔ چونکہ گناہ کا ارتکاب بھی گویا انسانی رُوح کو مروج کرتا ہے، اسی لیے ”اجتراح“ کا مادہ گناہوں کی انجام دہی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس سے بھی وسیع تر معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی ہر قسم کا اکتساب اور ارتکاب۔

نیز انسانی اعضاء کو اس لئے جو ارجح کہتے ہیں کہ ان کے ذریعے انسان اپنے مقاصد انجام دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے حاصل کرتا ہے اور کھاتا ہے۔

بہر حال یہ آیت کہتی ہے کہ یہ ایک غلط سوچ ہے کہ کوئی شخص یہ تصور کر لے کہ ایمان یا گناہ اور کفر کا انسانی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ایسا بالکل نہیں ہے، ان دونوں قسم کے لوگوں کی زندگی اور موت مکمل طور پر مختلف ہے۔ مومنین کرام ایمان اور عمل صالح کے پر تو میں ایک مخصوص قسم کے اطمینان کے حامل ہوتے ہیں، حتیٰ کہ حوادث ثابت زمانہ کے سخت سے سخت ادوار بھی ان کی رُوح پر ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ جب کہ بے ایمان اور گناہوں میں لہڑے ہوئے لوگ ہمیشہ مضطرب، بے چین اور پریشان خیالی کا شکار رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ نعمتوں میں سرمست ہوں، پھر بھی انہیں ہمیشہ ان کے زوال کا خطرہ رہتا ہے اور اگر مصیبت اور تکالیف میں مبتلا ہوں، تو بھی ان کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے، جیسا کہ سورۃ انعام کی ۸۲ دین آیت میں ہے۔

«الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم اولہم لہم الآمن و

ہم مہتدون»

«جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے اطمینان خاطر ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں»

صاحب ایمان افراد خدا کے وعدوں پر مطمئن ہیں اور اس کی خاص عنایتوں کے زیر سایہ ہیں، جیسا کہ سورۃ مؤمن کی ۵۱ ویں آیت میں ہے۔

«انا لنصر مرسلنا والذین آمنوا فی الحیوة الدنیا و یوم یقوم الاضداد»

«ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے ہیں، دنیاوی زندگی میں بھی یقیناً مدد کرتے ہیں اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے، اس دن (روز قیامت) بھی۔»

نور ہدایت، پہلے گروہ کے لوگوں کے دل کو منور کرتا ہے اور وہ اپنی مقدس منزل مقصود کی جانب استوار اور مضبوط قدموں کے ساتھ رواں دواں ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے،

«اللہ ولی الذین آمنوا ینصرہم من الظلمات الی النور»

اللہ ایمان داروں کا ولی ہے، انہیں ظلمت سے نور کی تاب ہدایت کرتا ہے»

(بقرہ ۲۵۷)

لیکن دوسرا گروہ جس کی زندگی کا نہ تو کوئی واضح مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی واضح پہلو گرام ہوتا ہے وہ ظلمات کی لہروں میں ٹانک ٹوٹیاں مارتا پھرتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

«والذین کفروا اولیائہم الطاغوت ینصرہم من النور الی

الظلمات۔

جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے دلی طاغوت اور شیطان ہوتے ہیں کہ جو انہیں نور سے نکال کر ظلمت کی طرف لے جاتے ہیں۔
(بقرہ/۲۵۴)

مؤمنین کی یہ حالت تو اس جہان کی دُنیاوی زندگی کی ہے، لیکن بوقت وفات جو ان کے لیے عالم بقا کی جانب ایک درِ بچہ اور آخرت کے لیے ایک دروازہ ہوتا ہے، قرآن کی زبان میں ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ:

«الذین تتوفاهم الملائكة طيبين يقولون سلام عليكم ادخلوا الجنة بما كنتم تعملون۔»

”پیر ہیزگاروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان کی رُوح کو قبض کرتے ہیں تو وہ پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں۔ فرشتے انہیں کہتے ہیں تم پر سلام، بہشت میں داخل ہو جاؤ، یہ ان اعمال کا نتیجہ ہے جو تم انجام دیتے ہو۔“
(نحل/۳۲)

جب کہ بے ایمان مجرمین کے ساتھ دوسرے لفظوں میں بات کرتا ہے، جیسا کہ اسی سورت (نحل) کی ۲۸ ویں اور ۲۹ ویں آیات میں ہے کہ:

«الذین تتوفاهم الملائكة ظالمی انفسهم فالقوا التلہ ما کننا نعمل من سوء بلی ان اللہ علیہم بما کنتم تعملون ، فادخلوا ابواب جہنم خالدين فیہا فلیبئس مقوی المتکبرین۔»

”ظالم کافروں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب فرشتے ان کی رُوح قبض کرتے ہیں تو وہ بے بسی کی حالت میں سر جھکا کر یہی کہتے ہیں کہ ہم بُرے کام نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے خدا کی سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ اب تم دونوں کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اور اس میں ہمیشہ رہو۔ یہ متکبرین کے لیے کیسا بُرا ٹھکانا ہے۔“

خلاصہ کلام یہ کہ ان دونوں گروہوں کے درمیان دُنیاوی زندگی کے تمام شعبوں، بوقت مرگ، عالم برزخ اور قیامت میں واضح فرق موجود ہے۔ لہ

لہ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں مفسرین نے کئی اور احتمالات بھی ذکر کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ”سواء عیالہم ومماتہم“ کے جُملے سے مراد یہ ہے کہ بے ایمان مجرمین کی زندگی اور موت برابر ہیں، نہ تو زندگی میں ان سے خیر و برکت اور اطاعت الہی کی امید ہوتی ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد وہ زندہ تو ہیں، لیکن مردوں کے مانند تو ایسی صورت میں دونوں ضمیریں مجرمین کی لوٹ رہی ہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ حیات سے مراد قیامت کے دن کی زندگی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ مؤمنین اور بے ایمان لوگوں کا موت کے وقت اور قیامت کے دن زندہ ہونے کے موقع پر ایک جیسا انجام ہو، لیکن آیت کا ظاہری اعتبار ہی معنی صحیح ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

بعد کی آیت درحقیقت گزشتہ آیت کی تفسیر اور توجیہ ہے پروردگار فرماتا ہے: اور خداوند عالم نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے (وخلق الله السماوات والارض بالحق)۔ تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (ولتجزی کل نفس بما کسبت وهم لا یظلمون)۔

ساری کائنات اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے اسے محو برحق پر ٹھہرایا ہے اور ہر مقام پر حقیقت و عدالت حکم فرما ہے۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ صالح العمل مومنین اور بے ایمان مجرمین کو ایک جیسا قرار دے اور یہ بات قانون خلقت میں ایک استثنائی صورت حال اختیار کر لے؟

فطری بات ہے کہ جو لوگ حقیقت و عدالت کے اس قانون کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں وہ کائنات کی برکتوں اور خدا کی مہربانوں سے بھی بہرہ مند ہوتے ہیں اور جو لوگ اس کے برخلاف قدم اٹھاتے ہیں انہیں غضب الہی کی آگ کا ایندھن ہی بننا چاہیے اور عدالت کا بھی یہی تقاضا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ”عدالت“ کا معنی ”مساوات“ یا ”برابری“ نہیں بلکہ عدالت اس بات کا نام ہے کہ ہر شخص اپنی لیاقت اور اہلیت کی بنا پر نفعات الہی سے بہرہ مند ہو۔

زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت کافروں اور مومنوں کی عدم مساوات پر ایک اور دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بھلا تو نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے (افترأیت من اتخذ الہة ہواہ)۔

اور چونکہ خدا جانتا تھا کہ وہ ہدایت کے لائق ہی نہیں، لہذا اُس نے اسے گمراہی میں ہی چھوڑ دیا ہے (واضلہ اللہ علی علمہ)۔

”اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے“ تاکہ وہ گمراہی کی دادی میں بھٹکتا پھرے (وختم علی سمعہ وقلبہ وجعل علی بصرہ غشاوة)۔

تو پھر ایسی حالت میں خدا کے سوا اسے کون ہدایت کر سکتا ہے (فمن یرہد یدہ من بعد اللہ)۔

”تو کیا اب بھی تم لوگ غور و فکر نہیں کرتے ہو؟“ اور ایسے شخص کے اور اس شخص کے درمیان فرق نہیں سمجھتے ہو جو راہ حق کو پا چکا ہے۔ (افلات تذکرون)۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا لے؟

تو یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جب انسان خدائی فرمان کو پس پشت ڈال دے اور اپنے دل اور ہوائے نفس کا مطیع و فرمانبردار بن جائے اور ہوائے نفس کی اطاعت کو حق کی اطاعت پر مقدم کر لے تو یہی ہوائے نفس کی پرستش ہے، کیونکہ عبادت اور پرستش کا ایک معنی اطاعت بھی تو ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بارہا شیطان یا علمبردار اور احبار یہود کے

باسے میں آیا ہے:

”کہ کچھ لوگ شیطان کی عبادت کرتے ہیں“ (یس ۶۰/۱)
اور یہود کے متعلق ہے کہ:

”انہوں نے اپنے علماء کو اپنا رب اور پروردگار بنا لیا ہے۔ (توبہ ۳۱/۱)
اور حدیث میں ہے کہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام فرماتے ہیں کہ:

اما والله ما صاموا لهم ولا صلوا، ولکنتم اهلوا لهم حراما وحرما
عليهم حلالا، فاتبعوهم وعبدوهم من حيث لا يشعرون“
”خدا کی قسم ان لوگوں (یہود و نصاریٰ) نے اپنے پیشواؤں کے لیے نماز اور روزے بجا نہیں
لائے، لیکن ان کے پیشواؤں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے دیا اور انہوں نے
اس کو تسلیم کر لیا اور ان کی پیروی کی اور بغیر توجہ کیے، ان کی عبارت اور پرستش شروع
کردی۔“

لیکن بعض مفسرین نے اس تعبیر کو قریش کے بت پرستوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جس چیز کے متعلق ان کا جی چاہتا تھا
اس کا بت بنا دیتے تھے اور اس کی عبادت کرنا شروع کر دیتے تھے، اور جب کسی دوسری عبادت کو دیکھتے تو پہلے
بت کو چھوڑ کر اس کا بت بنا کر اس کی عبادت میں لگ جاتے تھے۔ اس طرح سے ان کا معبود وہ چیز ہوتی ہے جسے ان کی
نفسانی خواہشات پسند کرتی ہیں۔

لیکن ”من اتخذ الله هوا“ (جس شخص نے اپنا معبود اپنی خواہشات نفسانی کو بنا لیا ہے) کی تعبیر پہلی تفسیر
سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

”اصنہ الله علی علم کے بارے میں مشہور تفسیر تو وہی ہے جو سطور بالا میں بیان ہو چکی ہے اور جو اس بات کی طرف
اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے چراغ ہدایت گل کر لیا ہے اور نجات کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے
ہیں اور واپسی کے راستے برباد کر چکے ہیں تو ایسی صورت میں اللہ نے اپنے لطف و کرم اور رحمت و مہربانی کو ان سے سلب
کر لیا ہے، نیک و بد کی پہچان کی صلاحیت ان سے واپس لے لی ہے، گویا ان کے دل اور کانوں کو محفوظ مقام پر بند کر دیا
ہے اور اس پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر دھندلے پردے ڈال دیئے ہیں۔“

درحقیقت یہ سب کچھ اس چیز کے آثار ہیں جو انہوں نے اپنے لیے منتخب کی ہے اور ایسے بد بخت معبود کا نتیجہ
ہے جسے انہوں نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔

سچ منجھ نفس پرستی کس قدر خطرناک بُت ہے، جو رحمت اور نجات کے تمام دروازوں کو انسان پر بند کر دیتا ہے اور اس بارے میں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث کس قدر ناطق اور واضح ہے کہ:

” ما عبدت تحت السماء الا الله ابغض الى الله من الهوى “

” آسمان کے زیر سایہ ہرگز کسی معبود کی عبادت نفس پرستی جیسی عبادت سے زیادہ ناپسندیدہ نہیں

ہے “

لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نفس پرست اور خود سر ہٹ دھرم افراد جان بوجھ کر ہدایت کی راہوں سے ہٹ کر گمراہیوں کو اختیار کرتے ہیں، کیونکہ نہ تو علم و دانش ہمیشہ ہدایت کے ہمراہ ہوتے ہیں اور نہ ہی گمراہی ہمیشہ جمالت کے ہم رکاب ہوتی ہے۔

علم اس وقت سبب ہدایت بنتا ہے جب انسان اس کے لوازمات کو اپنائے اور اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھائے، تب کہیں جا کر منزل مقصود تک پہنچاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کچھ ہٹ دھرم کافر لوگوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے۔

” و جحدوا بها واستيقنتها الفسهم “

” انہوں نے خدا کی آیات کا انکار کر دیا، حالانکہ ان کے دل اس کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے “

(نمل / ۱۴)

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت میں موجود ضمیروں کا مرجع خدا تعالیٰ ہے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے، کیونکہ قرآن فرماتا ہے کہ خدا نے اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے۔ ہمارے اس بیان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آیت میں عقیدہ جبری کے بارے میں کوئی علامت نہیں ملتی، بلکہ اختیار کے اصول اور انسان کے اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر سنوانے پر تاکید کی گئی ہے۔

خداوند عالم کے انسان کے دل اور کانوں پر مہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول میں سورہ بقرہ کی ساتویں آیت کی تفسیر میں ہم تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ خواہشات نفسانی سب سے زیادہ خطرناک بُت سے؛ ہم ابھی حدیث میں پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب بتوں سے ناپسندیدہ ترین بُت کہ جس کی عبادت کی جاتی ہے نفس پرستی کا بت ہے۔ اس بات میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہے، کیونکہ عام قوم کے بُت ایسی چیزیں ہیں جن کی اپنی کوئی خاصیت اور خصوصیت نہیں

۱۔ تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۵۹۴، تفسیر موع البیان اور تفسیر مراغی اسی آیت کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر المیزان جلد ۱۸ ص ۱۴۴۔

ہوتی، لیکن خواہشات نفسانی کا بُت گمراہ کن ہے اور مختلف گناہوں اور گمراہیوں اور بے راہروی کی جانب لے جاتا ہے۔
مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس بُت میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جنہوں نے اسے سب سے زیادہ قابل نفرت بُت کے نام کا مستحق بنا دیا ہے۔

یہ بُت برائیوں کو انسان کی نگاہ میں اتنا مزین کر دیتا ہے کہ وہ اپنے بُرے کارناموں پر فخر کرتا دکھائی دیتا ہے اور،

”وہم یحسبون انہم یحسنون صنعا“ (کہف/۱۰۴)

کے مصداق انسان لے صالح العمل سمجھ کر فخر کرتا ہے۔

۲۔ شیطان کے لیے موثر ترین راستہ؛ شیطان کے عمل دخل کا موثر ترین راستہ خواہشات کی اطاعت ہے، کیونکہ جب تک انسان کے اندرونی وجود میں شیطان کا ٹھکانا نہ ہو اس وقت تک وہ دلوں میں دوسے پیدا نہیں کر سکتا اور وہ ٹھکانا نفس پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہی چیز کہ خود شیطان جس کی وجہ سے اپنے مقام سے گر گیا اور فرشتوں کی صف اور قرب الہی سے راندہ گیا۔

۳۔ نفس پرستی ہدایت سے محرومی کا سبب؛ نفس پرستی حقائق کے صحیح ادراک جیسے ہدایت کے اہم ترین ذریعے کو انسان سے سلب کر لیتی ہے اور انسان کی آنکھوں اور عقل پر پردے ڈال دیتی ہے۔ جیسا کہ زیر تفسیر آیات میں نفس پرستی کے مسئلے کو بیان کرنے کے بعد صاف طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات بھی اس حقیقت کی گواہ ہیں۔

۴۔ خدا کے مقابل؛ نفس پرستی انسان کو (نعمت باللہ) خدا سے مقابلے کے مرحلے تک لے جاتی ہے۔ جیسا کہ خواہشات پرستی کا پیشوا یعنی شیطان اس منحوس انجام سے دوچار ہوا اور آدم کو سجدہ کرنے کے مسئلے پر اس نے حکمت خداوندی پر اعتراض کیا، اور اسے غیر حکیمانہ سمجھا۔

۵۔ ہوس پرستی کا انجام؛ اس حد تک منحوس اور دردناک اور خطرناک ہوتا ہے کہ کبھی ایک لمحے کی نفس پرستی انسان کو زندگی بھر کی پشیمانی اور ندامت سے دوچار کر دیتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لمحے کی نفس پرستی انسان کی ساری زندگی کے نتائج اور اس کے اعمال صالحہ کو تباہ و برباد اور طیامیٹ کر دیتی ہے۔ اسی لیے قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں اس بات کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے اور اس سے خبردار کیا گیا ہے، جیسا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں آیا ہے:

”ان اخوف ما اخاف علی امتی الہوی و طول الامل اما الہوی فاند
یصد عن الحق، واما طول الامل فینسی الاخرة“

”دو چیزیں ایسی خطرناک ہیں، جن سے مجھے اپنی امت کے بائے میں خوف آتا ہے، ایک تو خواہشات نفسانی کی پیروی اور دوسری لمبی چوڑی امیدیں کیونکہ نفس پرستی انسان کو حق سے باز رکھتی ہے اور لمبی چوڑی آرزوئیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں۔“

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ

”ای سلطان اغلب واقسوی“

”کون سی طاقت زیادہ غالب اور طاقت ور ہے؟“

تو آپؑ نے فرمایا:

”الہوی“

”خواہشاتِ نفسانی“ لہ

ایک اور روایت میں ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

”وعزتی وعظمتی وجلالی وبہائی وعلوی وارترفاع مکانی، لایؤثر عبد

ہوای علی ہواہ الا جعلت ہمہ فی آخرتہ، وغناہ فی قلبہ، وکففت

عندہ ضیعتہ، وضمنت السموات والارض رزقہ، واتتہ الدنیا

وحمرا غمۃ“

”مجھے اپنی عزت، عظمت، جلال، نورانیت اور بلند مقام اور مرتبے کی قسم کوئی بندہ بھی میری خواہشات

کو اپنی خواہشات پر مقدم نہیں کرتا مگر یہ کہ میں اس کی تمام تر توجہات کو آخرت کی طرف مبذول کر

دیتا ہوں، مخلوق سے بے نیازی کو اس کے دل میں جاگزیں کر دیتا ہوں، معاشی مسائل کو اس کے

لیے آسان کر دیتا ہوں، آسمان اور زمین کو اس کی روزی کا ضامن بنا دیتا ہوں اور دنیادی نعمتیں سر

تجھکائے اس کے حضور پہنچ جاتی ہیں۔ لہ

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”احذر واہوائکم کما تحذرون اعدائکم، فلیس شیء اعدی للرجال

من اتباع اہوائہم وحصائد السننہم“

”خواہشاتِ نفسانی سے دلیسے بچو، جیسے اپنے دشمنوں سے بچتے ہو، کیونکہ انسان کے لیے

خواہشاتِ نفسانی کی پیروی اور زبان پر جاری ہونے والے کلمات سے بڑھ کر اس کا کوئی اور

دشمن نہیں ہے۔ لہ

آخر میں ایک اور حدیث جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، پیش خدمت ہے:

۱ لہ بحار الانوار جلد ۱۰، ص ۵۵ تا ۵۶۔

۲ لہ بحار الانوار جلد ۱۰، ص ۵۵ تا ۵۶۔

۳ لہ اصول کافی جلد ۲ باب اتباع الہوی حدیث ۱۔

”انی لارجوالنجاۃ لہذہ الامۃ لمن عرف حقنا منہم الا لواحدا ثلاثۃ

صاحب سلطان جائز، و صاحب ہوی و الفاسق المعلن“

”اس امت سے جن لوگوں نے ہمارے حق کو پہچانا ہے میں ان کی نجات کی امید رکھتا ہوں سوائے تین قسم کے لوگوں کے۔ ایک ظالم بادشاہوں کے ساتھی، دوسرے نفس پرست اور تیسرے جو کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں (اور کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرتے)۔“ لہ

اس بائے میں بہت سی آیات اور روایات موجود ہیں۔

ہم اپنی اس گفتگو کو ایک با معنی جملے کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں، جو شانِ نزول کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور ہمارے مدعا پر زندہ گواہ ہے۔ ایک مفسر کہتے ہیں۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ ابو جہل ولید بن مغیرہ کے ہمراہ خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول تھا۔ طواف کے دوران اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بات شروع کر دی۔ ابو جہل نے کہا: واللہ انی لاعلم انتہ صادق (خدا کی قسم میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ سچا ہے)۔

”ولید نے کہا: ”چپ رہو تم کہاں سے جانتے ہو کہ وہ سچا ہے؟“

ابو جہل نے کہا: ہم اسے بچپن اور لڑکپن میں ”صادق اور امین“ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اب جبکہ اس کی عقل کامل ہو چکی ہے اور وہ شعور کے درجہ کمال تک پہنچ چکا ہے تو پھر اسے ہم کذاب اور گمان کیونکر کہہ سکتے ہیں؟ میں ایک بار پھر کہتا کہ ”وہ سچ کہتا ہے“

ولید نے کہا: تو پھر تم اس کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟

ابو جہل نے کہا: تم چاہتے ہو کہ قریشی عورتیں آپس میں بیٹھ کر یہ کہیں کہ شکست کے خوف سے ابوطالب کے بھتیجے کے سامنے بھگ گیا ہوں۔ لات وعزلی کی قسم میں ہرگز اس کی اتباع نہیں کروں گا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: و ختم علی سمعہ و قلبہ ۱۱

۲۴- وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْدِكُنَا
إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ○
۲۵- وَإِذَا تَتَلَّى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا
اأَمْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

ترجمہ

۲۴- اور ان لوگوں نے کہا کہ ہماری زندگی تو بس دنیا ہی کی ہے۔ کچھ لوگ ہمس میں سے
مرتے ہیں اور کچھ لوگ ان کی جگہ لے لیتے ہیں اور ہم کو بس فطرت اور زمانہ ہی ہلاک
کرتا ہے اور وہ اپنی ان باتوں پر یقین بھی نہیں رکھتے، بلکہ بے بنیاد گمان ہی
کرتے ہیں۔

۲۵- اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی اور روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے مقابلے
میں ان کے پاس کوئی دلیل تو ہوتی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ کہیں اگر تم سچے
ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لے آؤ (تاکہ وہ گواہی دیں)۔

تفسیر

دھریوں کے عقائد

ان آیات میں منکرین توحید کے بارے میں ایک اور بحث کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ البتہ یہاں پر منکرین کے ایک

خاص گروہ یعنی ”دہریوں“ کا نام لیا گیا ہے جو عالم ہستی اور اس کائنات میں صانع حکیم کے وجود کا مطلقاً انکار کرتے تھے، جبکہ اکثر و بیشتر مشرکین عام طور پر ظاہر میں خدا پر ایمان رکھتے تھے اور بتوں کو اس کی بارگاہ تک رسائی کے لیے اپنا شیخ بچھتے تھے، خداوند عالم فرماتا ہے: انہوں نے کہا ہماری زندگی تو بس دنیا ہی کی ہے، ہم میں سے کچھ لوگ مرتے ہیں اور کچھ پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اور اس طرح سے انسانی نسل کا سلسلہ جاری ہے۔ (وقالوا ما ہی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا۔ اور ہمیں تو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے (وما یمہلکنا الا الذہر)۔

اس طرح وہ ایک تو ”معاذ“ کا انکار کرتے تھے اور دوسرے ”مبداء“ کا۔ پہلا جملہ ان کے معاد کے انکار کی غمازی کرتا ہے، جبکہ دوسرا جملہ مبداء کے انکار کی۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس جیسی آیات قرآن مجید کے دو اور مقامات پر بھی موجود ہیں۔ ایک سورہ انعام کی ۲۹ ویں آیت ہے، جس میں ہے:-

”وقالوا ان ہی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین“

”اور انہوں نے کہا کہ ہماری زندگی فقط اسی دنیا کی ہے اور ہم پھر نہیں اٹھائے جائیں گے“

اور دوسری سورہ مومنوں کی ۳۷ ویں آیت ہے، جس میں ہے:

”ان ہی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما نحن بمبعوثین“

”ہماری زندگی اسی دنیا کی ہے۔ نہیں مرتے جیتے ہیں اور ہم پھر نہیں اٹھائے جائیں گے“

لیکن ان دونوں آیتوں میں صرف معاد کے انکار کی جھلک ملتی ہے، جبکہ زیر تفسیر آیت میں مبداء اور معاد دونوں کا انکار کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ زور معاد کے انکار پر تھا، اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ خائف اور وحشت زدہ تھے۔ اس کے اقرار سے ان کی زندگی میں جو تبدیلی ممکن تھی وہ اس سے بھی پریشان تھے۔

”نموت ونحیا“ (ہم مرتے اور زندہ ہوتے ہیں) کی مفسرین نے کئی تفسیریں بیان کی ہیں۔ پہلی تفسیر تو وہی ہے جو ہم سطور بالا میں بیان کر چکے ہیں، یعنی بڑے اور عمر رسیدہ لوگ چلے جاتے ہیں اور نو مومنون عرصہ زندگی میں قدم رکھتے اور ان کی جگہ لیتے ہیں۔

دوسری یہ ہے کہ یہاں پر یہ جملہ تقدیم اور تاخر کی صورت میں ہے، جس کا اصل معنی یہ ہے کہ ہم زندہ ہوتے اور مرتے رہتے ہیں اور اس زندگی اور موت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

تیسری یہ کہ بعض لوگ مرتے ہیں اور بعض زندہ رہ جاتے ہیں (ہر چند کہ انجام سب کا موت ہی ہے) چوتھی یہ کہ ہم ابتداء میں مردہ اور بے جان تھے، پھر ہمیں حیات و زندگی کا لباس پہنایا گیا۔ لیکن سب سے مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔

پہر حال یہ عقیدہ کہ اس کائنات کا نائل حوادث دہر اور زمانہ ہے یا کچھ دوسرے لوگوں کی تعبیر کے مطابق افلاک کی گردش

اور ستاروں کی کیفیت ہے۔ گزشتہ زمانے میں یہ کچھ مادہ پرستوں کا عقیدہ تھا۔ وہ واقعات روزگار کے سلسلے کی کڑی کو افلاک تک جا ملاتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ کائنات میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ سب انہی کی بدولت ہے۔ لہٰذا حتیٰ کہ دہریے فلسفی وغیرہ بھی افلاک کے لیے عقل کے قائل تھے اور اس کائنات کے نظم و نسق کا ذمہ دار انہیں جانتے تھے۔

اس قسم کے خرافاتی عقائد مردرد ایام کے ساتھ آہستہ آہستہ ختم ہوتے گئے۔ خاص کر ”علم ہیئت“ کی ترقی سے یہ بات پائیدار ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ”افلاک“ (بلویریں، پیاز کے تڑتہ چھلکے کے مانند) نام کی کسی چیز کا خارجی اور ظاہری وجود بالکل نہیں ہے عالم بالا کے ستاروں کی بھی کڑہ زمین جیسی ساخت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کچھ بجھے ہوئے ہیں اور دوسرے کڑوں سے نور حاصل کرتے ہیں اور کچھ جل رہے ہیں اور نور افشانی کر رہے ہیں۔

دہریے جب کبھی تلخ اور ناخوشگوار حوادث کا شکار ہو جاتے تو زمانے کو برا بھلا کہتے تھے، اور تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے عقائد کے آثار آج کی ادبیات میں بھی پائے جاتے ہیں کہ جن میں خدا پرست شعرا نے ”دھوکے باز زمانے“ اور ”فلک کج رفتار“ کو برا بھلا کہا ہے اور زمانے پر نقروں کی ہے کہ اس نے ان کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ ایک مشہور شعر ہے:

فلک پر مردم نادان دہد زمام مراد تو اہل دانش و فضل ہمیں گناہت بس
”فلک تو نادان اور ان پڑھ لوگوں کی مرادیں بر لاتا ہے، تم چونکہ اہل علم و فضل ہو یہی تمہارا بہت بڑا
گناہ ہے۔“

ایک اور شاعر کہتا ہے:

روزگار است ایچکہ گہ عزت دہد کہ خار دارد چرخ بازیگر از این بازیچہ ہا بسیار دارد
یہ زمانہ ہے کبھی عزت عطا کرتا ہے اور کبھی ذلیل و خوار کرتا ہے، بازیگر فلک اس قسم کے کھیل
روزانہ کھیلتا رہتا ہے۔

”دھر“ (زمانہ) کے بارے میں بھی شعرا کا کلام ملتا ہے۔

دہر چون نیزنگ دارد چرخ چون دستان کند مغز را آشفته سازد عقل را حیران کند
(زمانے کی نیزنگیاں اور فلک کی کج رفتاریاں ہی ذہن کو پریشان اور عقل کو حیران کر دیتی ہیں۔

لیکن احادیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں منقول ہے کہ:

”لا تسبوا ائدھرفان اللہ ہوالدھر۔“

لہٰذا بعض مفسرین نے ایک پانچواں احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ یہ تنازع (ادواگون) کے عقیدہ کی طرف اشارہ ہے، جس کے کئی بخت پرست معتقد تھے۔ اور وہ کہتے تھے کہ ہم ہمیشہ مرتے رہتے ہیں اور اسی دنیا میں دوسرے ڈھانچوں اور جموں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اور یہیں پر زندہ رہتے ہیں۔ لیکن یہ تفسیر ”وما یصلکنا الا الدھر“ سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ کیونکہ اس جملے میں صرف ہلاکت کی بات ہو رہی ہے۔ (غور کیجئے گا)

”زمانے کو گالیاں نہ دو کیونکہ خدا ہی زمانہ ہے۔ لہ

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمانہ تو صرف ایک لفظ ہے، لیکن اس جہان اور عالم کا مدبر اور اس کا نظم و نسق چلانے والا تو خداوند تعالیٰ ہی ہے۔ اگر تم نے اس کائنات اور عالم کے مدبر کو برا بھلا کہا تو بے سوچے سمجھے خداوند قادر متعال کو برا بھلا کہو گے۔ اس بات پر شاہد ناطق ایک اور حدیث ہے، جسے حدیث قدسی کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”يُؤذِي ابْنَ آدَمَ لَيْسَ الدَّهْرُ، وَآلَا الدَّهْرُ، بَيْدَى الْأَمْرِ الْقَلْبُ
اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ“

”فرزند آدم جب زمانے کو گالیاں دیتا ہے تو اس کی یہ بات مجھے تکلیف پہنچاتی ہے کیونکہ زمانہ میں خود ہوں، ساری چیزیں میرے ہاتھ میں ہیں اور شب و روز کو میں ہی الٹ پھیر کرتا ہوں۔“
البتہ بعض جگہ ”دہر“ کا معنی ”زمانے والے“ اور ”انرا زمانہ“ کیا گیا ہے جن کی بے وفائی کا شکوہ بزرگوں نے بھی کیا ہے۔ جیسے وہ مشہور شعر ہے جو حضرت امام حسین علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے شب عاشور فرمایا۔
يَا دَهْرَافِ لِمَنْ خَلِيلٌ كَمَلِكٍ بِالْأَشْرَاقِ وَالْأَصِيلِ
مَنْ صَاحِبٌ وَطَالِبٌ قَنِيلٌ وَالِدُهُ لَا يَقْنَعُ بِالْبَدِيلِ!
”اے زمانے! تجھ پر افسوس ہے کہ تو اچھا دوست ثابت نہیں ہوا، کتنی صحیح اور شائیں یوں گزرتی رہیں کہ تو نے ہمارے دوستوں اور چاہنے والوں کو قتل کیا اور زمانہ بدلہ لے کر بھی راضی نہیں ہوتا“

اس طرح سے ”دہر“ کے گویا دو معنی ہوتے۔ ایک تو ”زمانہ اور افلاک“ جو ہمیشہ دہریوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور وہ اسے آفاقی اور انسانی زندگی پر حکمران سمجھتے تھے، اور دوسرے ”اہل زمانہ اور انانے روزگار“
یقینی بات ہے کہ پہلے معنی کے لحاظ سے ”دہر“ صرف ایک خیالی چیز ہی ہے اور اگر کوئی چیز ہے بھی تو پھر اس کی تعبیر میں غلطی کی جاتی ہے اور تمام عالم وجود پر خداوند عالم کی حکمرانی ہے۔ اسی لیے اسے ”دہر“ کا نام دیتے ہیں، لیکن دوسرے معنی کے لحاظ سے ”دہر“ وہ چیز ہے، جس کی دینی پیشواؤں اور بزرگوں نے بھی مذمت کی ہے۔

بہر حال قرآن مجید نے ان لوگوں کی فضول باتوں کا جواب ایک مختصر لیکن جامع جملے میں دے دیا ہے، اور قرآن مجید کے اور بھی بہت سے مقامات پر یہی جواب ملتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ جو یہ کہتے ہیں کہ کوئی معاد نہیں ہے اور جہان کا مدبر بھی زمانہ ہی ہے، اپنی ان باتوں پر یقین

نہیں رکھتے، بلکہ بے بنیاد گمان ہی کرتے ہیں۔ (و ما لہم بذالک من علم ان ہم الا یظنون)۔

اس سے جلتی جلتی گفتگو سورہ نجم کی ۲۸ ویں آیت میں ان لوگوں کے بارے میں ہے جو فرشتوں کی خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے، ارشاد ہوتا ہے،

”و ما لہم بہ من علم ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً“

”وہ جو بیانات کہتے ہیں اس پر انہیں خود کو یقین نہیں ہے وہ تو صرف بے بنیاد گمان کی پیروی کرتے ہیں اور گمان تو حق سے کبھی بھی بے نیا نہیں کرتا“

یہی تعبیر حضرت عیسیٰ کے قتل کی نسبت کے بارے میں (نساء/ ۱۵۷) اور مشرکین عرب کے بتوں کے بارے میں عقیدے سے متعلق (یونس/ ۶۶) بھی بیان کی گئی ہے۔

یہ آسان ترین دلیل ہے جو اس قسم کے لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ تمہارے پاس اپنے ما کے ثبوت میں کوئی منطقی دلیل اور ناطق گواہ موجود نہیں ہے، صرف اٹکل بچپنوں اور تھمینوں سے کلام چلاتے رہتے ہو۔

بعد کی آیت میں معاد کے بارے میں ان لوگوں کے عقیدے کے سلسلے میں بہانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی اور روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے مقابلے میں ان کے پاس کوئی دلیل تو ہوتی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ کہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لے آؤ تاکہ وہ تمہاری صداقت کی گواہی دیں۔ (و اذا تتلی علیہم آیاتنا بینات ما کان حجتہم الا ان قالوا ائتوا باایاتنا ان کنتم صادقین)۔ لہ

وہ اس بات کے مدعی تھے کہ اگر مردوں کو زندہ کرنا حق ہے تو نمونے کے طور پر ہمارے بزرگوں اور آباؤ و اجداد کو زندہ کر دو تاکہ ہم اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھیں اور یقین کریں اور ان سے پوچھیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ دیکھتے ہیں، کہ کیا وہ تمہاری تصدیق کرتے ہیں۔

جی ہاں! ان کی صرف یہی دلیل تھی اور کس قدر بودی اور بے بنیاد دلیل۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے تو مردوں کو زندہ کرنے پر اپنی قدرت کی مختلف دلیلیں پیش کی ہیں مثلاً سب سے پہلے انسان کی مٹی سے پیدائش، رحم میں نطفہ کی مختلف تبدیلیاں وسیع و عریض زمین و آسمان کی آفرینش، نزول باران کے بعد زمینوں کا زندہ ہونا جو کہ قرآنی آیات میں قیامت کے قیام پر منہ بولتی دلیل ہے اب ان دلائل کے باوجود پھر کس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

اس کے علاوہ وہ عملی طور پر ثابت کر چکے تھے کہ بہانہ تراشی کے علاوہ ان کا کوئی اور مقصد ہے ہی نہیں اور بالفرض اگر یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو بھی جاتا تو وہ فوراً کہہ اٹھتے کہ یہ تو جادو ہے۔ جیسا کہ اس قسم کے مواقع پر انہوں نے ایسا کہا بھی ہے۔

ان کی بے بنیاد گفتگو کو "حجت" سے تعبیر کرنا درحقیقت اس بات سے کنا یہ ہے کہ ان کے پاس کٹ جتی کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

- ۲۶۔ قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ
لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝
- ۲۷۔ وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُومِئِدِ
بِخَسِرِ الْمُبْطِلُونَ ۝
- ۲۸۔ وَ تَرَى كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً تَقُومُ كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَى إِلَى كِتَابِهَا الْيَوْمَ
تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝
- ۲۹۔ هَذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنسِخُ مَا كُنتُمْ
تَعْمَلُونَ ۝
- ۳۰۔ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي
رَحْمَتِهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ۝
- ۳۱۔ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَاقِعٌ أَفْلَمْ تَكُنْ آيَتِي تَتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ
وَ كُنتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝

ترجمہ

- ۲۶۔ کہہ دیجئے کہ خدا تم کو زندہ کرتا ہے، پھر وہی تمہیں ماتا ہے، پھر قیامت کے دن
کہ جس میں کسی طرح کا شک نہیں تمہیں جمع کرے گا، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔
- ۲۷۔ اور آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خاص خدا ہی کی ہے اور جس دن

قیامت برپا ہوگی اُس دن اہل باطل خسارے میں ہوں گے۔

۲۸۔ اس دن تم ہر اُمت کو دیکھو گے کہ (خوف اور وحشت کی شدت سے) گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی، اور ہر اُمت اپنے نامہ اعمال کی طرف بلائی جائے گی (اور اس سے کہا جائے گا) جو کچھ تم لوگ کیا کرتے تھے، آج اس کا تم کو بدلہ دیا جائے گا۔

۲۹۔ یہ ہماری کتاب ہے جو تم سے حق بات کہہ رہی ہے (اور تمہیں تمہارے اعمال بتا رہی ہے) جو کچھ تم انجام دیتے تھے، ہم لکھتے جاتے تھے۔

۳۰۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے، انہیں ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یہ بہت واضح کامیابی ہے۔

۳۱۔ لیکن جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان سے کہا جائے گا تو کیا تمہارے سامنے ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ تم نے تو تجبر کیا اور تم لوگ تو تھے ہی مجرم

تفسیر سب گھٹنے ٹیک دیں گے

یہ آیتیں درحقیقت ان دہریوں کا ایک اور جواب ہیں جو مبارک اور ماد کے منکر تھے اور گزشتہ آیات میں ان کی باتوں کی طرف اشارہ بھی ہو چکا ہے۔

چنانچہ ان آیات میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ خدا ہی تم کو زندہ کرتا ہے، پھر وہی تمہیں مارتا ہے پھر تمہیں قیامت کے دن حساب و کتاب کے لیے جمع کرے گا، وہی دن کہ جس کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ (قل اللہ یحییٰکم ثم یمیتکم ثم یرجمکم الی یوم القیامۃ)

لا ریب فیہ۔

وہ نہ تو خدا کو مانتے تھے اور نہ ہی روز جزا کو اور اس آیت کے مضامین و حقیقت ان دونوں قسموں کے لیے استدلال ہیں، کیونکہ پہلے تو ”حیات“ کے مسئلے پر زور دیا گیا ہے، بالفاظ دیگر وہ پہلی زندگی کے وجود اور بے جان چیزوں سے زندہ چیزوں کی پیدائش کا انکار نہیں کر سکتے تھے اور یہ بات بذات خود اس امر کی دلیل ہے کہ کوئی علم کل اور عقل کل موجود ہے۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ زندگی کا محیر العقول نظام، کائنات کے پیچیدہ اسرار اور گونا گوں صورتیں کہ جس کے بارے میں تمام دانشوروں کی عقلیں مات، مہوت اور حیران و سرگرداں ہیں، صاحب قدرت اور صاحب علم خدا کے وجود کے بغیر منصفہ شہود پر آسکتے ہیں؟

اسی لیے تو قرآن مجید کی مختلف آیات میں حیات کے مسئلے کو توحید کی ایک علامت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جو ذات پہلی مرتبہ زندگی عطا کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ زندگی عطا کرنے پر کیونکر قدرت نہیں رکھتی؟

”لا ریب فیہ“ (اس میں کسی قسم کا شک نہ ہو)، یہ عبارت جو قیامت کے بارے میں ہے اور اس کے ”واقع“ ہونے کی خبر دے رہی ہے نہ کہ اس کے ”امکان“ کی، ممکن ہے کہ پروردگار عالم کے ”قانون عدالت“ کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ یہ بات تو یقینی ہے کہ اس دنیا میں تمام حق داروں کو صحیح معنوں میں ان کا حق نہیں مل پاتا اور نہ ہی تمام ظالموں کو ان کے کیے کی صحیح معنوں میں سزا ملتی ہے اور اگر قیامت کی عدالت بھی نہ ہو تو پھر پروردگار کی عدالت اپنا مفہوم کھودے گی۔ نیز چونکہ بہت سے لوگ ان آیات میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (ولکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

قیامت کا ایک نام کہ جس کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے ”یوم الجمع“ بھی ہے، کیونکہ تمام اولین و آخرین اور انسانوں کی تمام قیامتیں اس روز ایک جگہ پر جمع ہوں گی۔ یہ تعبیر قرآن کی چند دیگر آیات میں بھی بیان ہوئی ہے، جن میں سے سورہ شوریٰ کی آیت، اور سورہ تغابن کی آیت ۹ بھی ہے۔

بعد کی آیت معاد کے مسئلے پر ایک اور دلیل ہے اور اس طرح کی گفتگو ہم قرآن کی اور بھی آیات میں پڑھ چکے ہیں ارشاد فرمایا گیا ہے: اور سائے آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خاص خدا کے لیے ہے۔ (وللہ ملک السموات والارض)۔

جو ذات تمام کائنات کی مالک اور حاکم ہے وہ یقیناً مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہے اور ایسا کام اس کی قدرت کے لیے قطعاً مشکل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو آخرت کی کھیتی اور مرنے کے بعد کے جہان کے لیے نفع بخش تجارت کا مرکز قرار دیا ہے۔ لہذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جس دن قیامت برپا ہوگی، اس دن اہل باطل خسارے میں رہیں گے (ویوم تقوم الساعۃ یومئذ ینسخر المبتلون)۔

کیونکہ وہ زندگی کا سرمایہ کھو بیٹھے ہوں گے اور اس سے کوئی تجارت بھی نہیں کی ہوگی اور انہوں نے حسرت و غم کے سوا کوئی مال نہیں خریدا ہوگا۔

اس تجارتی منڈی میں حیات، عقل و ہوش اور دنیاوی نعمتیں انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ باطل پرست افراد سے یہیں پر جلد ختم ہو جانے والے مال کے بدلے میں بیچ ڈالتے ہیں جب کہ روزِ قیامت صرف قلبِ سلیم، ایمان اور عمل صالح ہی کام آئیں گے۔ لیکن وہ لوگ اپنے خسارے کو اپنی ہی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔

”یحسن“ خسران کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے ”سرمائے کو ضائع کر دینا“ اور مفردات میں راعب کے بقول کبھی تو اس کی نسبت خود انسان کی طرف دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے ”خسر فلان“ یعنی فلان شخص نے نقصان اٹھایا اور کبھی تجارت کی طرف دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے ”خسرت تجارت“ یعنی اس کی تجارت نے نقصان اٹھایا۔ اگرچہ دنیا پرست لوگ اس تعبیر کو مال، مقام، منصب اور مادی نعمتوں کے بارے میں استعمال کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مادی خسارے سے زیادہ اہم نقصان عقل و ایمان کے سرمائے اور ثواب کو کھو دینا ہوتا ہے۔

”مبطل“ ”البطل“ کے مادہ سے ہے، جس کے لغت میں بہت سے معانی ہیں، مثلاً کسی چیز کو باطل کر دینا، جھوٹ بولنا، ہنسی مذاق کرنا اور باطل چیز پیش کرنا وغیرہ۔ مذکورہ تمام معانی کا اطلاق مندرجہ بالا آیت پر ہو سکتا ہے۔

جن لوگوں نے حتیٰ کو باطل کر دیا، جنہوں نے باطل عقائد کا پرچار کیا، جنہوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کے سامنے جھوٹ بولا اور ان کی باتوں کا تمسخر اڑایا، غرض سب اس دن اپنا نقصان اور خسارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

بعد کی آیت قیامت کے منظر کی نہایت واضح الفاظ میں تصویر کشی کر رہی ہے اور کہتی ہے: اس دن تم ہر امت کو دیکھو گے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی (وستری کل امة جاثیة)۔

بعض عظیم مفسرین کے اقوال سے استفادہ ہوتا ہے کہ گوشتہ زمانے میں مدعی اور مدعی علیہ قاضیوں اور حکام کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے وہ دوسروں سے الگ نظر آئیں۔ قیامت کے دن بھی وہ خدا کی عظیم عدالت میں اسی طرح گھٹنے ٹیک کر بیٹھیں گے تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جائے نیز یہ بات بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر ان کی خدا کے ہر قسم کے احکام و فرمان کی بجا آوری کے لیے مکمل آمادگی کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ جو لوگ بالکل تیاری کی حالت میں ہوتے ہیں وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا کرتے ہیں۔ یا پھر ہو سکتا ہے ان کی کمزوری، ناتوانی، خوف و ہراس کی طرف اشارہ ہو جو انہیں لائق ہوگا کہ یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتے ہیں۔

”جاثیہ“ کے کئی اور معانی بھی ہیں جن میں سے ”لوگوں کا جم غفیر“ اور ”ٹوٹے ٹوٹے“ ہونا بھی ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ کی عدالت میں لوگوں کا جم غفیر ہوگا یا ہر امت اور ہر ٹولہ علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مشہور اور مناسب ہے۔

پھر قیامت کے ایک اور منظر کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اور ہر امت اپنے نامہ اعمال کی طرف بلائی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا جو کچھ تم لوگ کیا کرتے تھے آج اس کا تم کو بدلہ دیا جائے گا۔ (کل امة تدعی الی کتبا ہما

الیوم تجزون ما کنتم تعملون۔

”یہ کتاب“ نامہ اعمال ہی ہے کہ جس میں انسان کی تمام نیکی، برائی، رفتار، گفتار اور کردار درج ہوں گے اور قرآنی الفاظ میں ”لا ینفادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا“ یعنی کوئی بھی چھوٹا اور بڑا کام ایسا نہیں ہوگا جو اس میں درج نہ ہو۔

(کہف: ۴۹)

”کل امة تدعی الی کتابھا“ کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے انفرادی اعمال نامے کے علاوہ ہر امت اور گروہ کے اجتماعی اعمال نامے بھی ان کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ انسان کے دو قسم کے اعمال نامے ہوں گے۔ اگر اس معنی پر توجہ کی جائے تو بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر غور سے کام لیا جائے تو دو طرح کے اعمال ناموں کا ہونا ایک قطری بات ہے۔

”تدعی“ کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنا نامہ اعمال پڑھنے کی دعوت دی جائے گی۔ یہ معاملہ بعینہ سورہ بنی اسرائیل کی چودھویں آیت سے ملتا جلتا ہے، جس میں کہا گیا ہے:

”اقرا کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حساباً“

”اپنے نامہ اعمال کو پڑھو، آج یہ بات کافی ہے کہ تم اپنا حساب خود ہی کرو“

ایک بار پھر انھیں خدا کی طرف سے خطاب ہوگا اور تاکید کے طور پر ان سے کہا جائے گا:

یہ ہماری کتاب ہے جو تم سے حق کہہ رہی ہے اور تمہیں تمہارے اعمال بتا رہی ہے (ہذا کتابنا ینطق علیکم

بالحق)۔

اس دن تم جو چاہتے تھے انجام دیتے تھے اور اس بات کا ہرگز گمان تک نہیں کرتے تھے کہ تمہارے اعمال کہیں درج بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم نے حکم دے دیا تھا کہ جو کچھ بھی تم انجام دو گے لکھتے رہیں (اناکم نستسخ ما کنتم تعملون)۔

”نستسخ“ استسخ کے مادہ سے ہے۔ یہ دراصل ”نسخ“ سے لیا گیا ہے۔ اس کا معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز

کے ذریعے زائل کرنا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے:

”نسخت الشمس الظل“

”سورج نے سایے کو زائل کر دیا۔“

بعد ازاں اس کا استعمال ایک کتاب سے دیکھ کر دوسری کتاب پر اس طرح سے لکھنے کے لیے بھی ہوا ہے کہ

اصل اور پہلی کتاب بھی محفوظ رہے۔

لہ بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ مذکورہ آیت میں ”کتاب“ سے مراد آسمانی کتاب ہے، جو اس امت پر نازل ہوئی ہے۔ لیکن بظاہر آیت کا اپنا معنی

اور بعد کی آیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، کتاب کا معنی نامہ اعمال ہے اور اکثر مفسرین اسی کے قائل ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خدا نے حکم دیا ہے کہ انسان کے اعمال کو "استنساخ" کریں تو اس سے پہلے کوئی کتاب ہونی چاہیے، جس سے دیکھ کر اس کے نامہ اعمال لکھے جائیں۔ اسی لیے تو بعض مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ تمام لوگوں کے اعمال پہلے سے ہی "لوح محفوظ" میں لکھے جا چکے ہیں اور انسانی اعمال کے محافظ فرشتے انہیں لوح محفوظ سے نقل کر کے نامہ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ معنی زیر تفسیر آیت سے چندال مناسب نہیں ہے، جو معنی مناسب معلوم ہوتا ہے وہ ان دونوں معانی میں سے ایک ہے، پہلا یہ کہ یہاں پر "استنساخ" سے مراد خود "لکھنا" ہے۔ (جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں) اور دوسرا یہ کہ انسان کے اپنے اعمال بذات خود ایک تکوینی کتاب کے مانند ہیں جسے دیکھ کر فرشتے نسخہ کتاب تیار کرتے ہیں اور اس کی کاپی تیار کرتے ہیں، اسی لیے قرآن کی دوسری آیات میں اس لفظ کے بجائے "کتابت" کا کلمہ استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورہ یس کی بارہویں آیت میں ہے۔

"ان نحن ننحی الموتی ونکتب ما قدموا واثارهم"

"ہم مردوں کو زندہ کریں گے اور جو کچھ وہ پہلے بھیج چکے ہیں اسے اور ان کے باقی ماندہ آثار کو لکھتے رہتے ہیں"۔

اعمال کے اندراج کے بارے میں کتابوں کا ذکر سورہ یس کی آیت ۲ کے تحت تفسیر نمونہ کی جلد ۱۰ میں تفصیل سے کیا گیا ہے، جس میں انسان کے ذاتی نامہ اعمال، امتوں کے نامہ اعمال اور تمام انسانوں کی جامع اور عمومی کتاب کے بارے میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

بعد کی آیت میں قیامت کی عدالت کے آخری مرحلے کا ذکر کیا گیا ہے، جب کہ ہر گروہ اپنے اعمال کا نتیجہ پائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: لیکن جو لوگ ایمان لائے اور وہ اچھے اعمال بجالائے، تو ان کو ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا (فاما الذین امنوا وعملوا الصالحات فیدخلہم ربہم فی رحمۃ)۔

یہاں پر "فاء تغدیہ" کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال کی حفاظت اور عدالت الہی کا نتیجہ یہی ہے کہ مومنین

۱۔ امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں ہے:

"ان الله ملائكة ينزلون في كل يوم يكتبون فيه اعمال بني آدم"

"خدا کی طرف سے کچھ فرشتے ہیں جو روزانہ آسمان سے نازل ہوتے ہیں اور بنی آدم کے اعمال لکھتے رہتے ہیں؟"

شیخ طوسی "تفسیر تبیان" میں مذکور آیت کے ذیل میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"نستسخ" سے مراد یہ ہے کہ ہم انسانی اعمال کے محافظ فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ جو اعمال ثواب یا عذاب کا

موجب ہوتے ہیں وہ اس گروہ سے لے کر درج کریں اور بقیہ اعمال پر شرط تنسیخ کھینچ دیں، کیونکہ پہلا گروہ انسان کے تمام اعمال

کو لکھ دیتا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر تبیان جلد ۹ صفحہ ۲۶)

رحمت الہی میں داخل ہوں گے۔

اس آیت کی رو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صرف ایمان کافی نہیں ہے، بلکہ عمل صالح کی بجا آوری بھی اس کے ساتھ شرط ہے۔

”رتبہ“ ان کا پروردگار کی تعبیر خداوند کریم کے خاص لطف و کرم کی غمازی کر رہی ہے اور بہشت کے بجائے ”رحمت“ کی تعبیر اس لطف و کرم کے کمال کو ظاہر کر رہی ہے۔

آیت کے آخری جملے میں فرمایا گیا ہے: یہ بہت واضح کامیابی ہے (ذالک هو الفوز المبین) یہ جملہ اس لطف و کرم کو اوج کمال پر پہنچا رہا ہے۔

”رحمت الہی“ کا وسیع مفہوم ہے جو دنیا اور آخرت دونوں پر محیط ہے۔ قرآنی آیات میں بہت سے معانی پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔ کبھی ہدایت پر، کبھی دشمن کے جنگل سے چھٹکارا حاصل کرنے پر، کبھی بابرکت بارش پر اور کبھی نور و ظلمت جیسی دوسری نعمتوں پر اور بہت سے مقامات پر بہشت اور قیامت میں خدا کی نعمتوں پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔

”ذالک الفوز المبین“ کا جملہ ایک مرتبہ سورۃ النعام کی آیت ۶۱ میں بھی آیا ہے، لیکن وہاں پر ”فوز مبین“ (واضح کامیابی) کا ان لوگوں کے بارے میں ذکر ہوا ہے جو عذاب الہی سے بچ جائیں گے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

”من ینصرف عنہ لیومئذ فقد رحمہ وذالک الفوز المبین“

لیکن یہاں پر ان لوگوں کے بارے میں ہے جو بہشت اور رحمت خداوندی میں داخل ہوں گے اور حقیقت میں یہ دونوں بڑی کامیابیاں ہیں، عذاب الہی سے نجات اور رحمت حق کے سایے میں داخلہ۔

یہاں پر ممکن ہے یہ سوال پیش ہو کہ جو مومنین عمل صالح سے عاری ہیں آیا وہ بہشت میں نہیں جائیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ضرور جائیں گے، لیکن قبل ازیں وہ جہنم میں اپنی بد اعمالیوں کی سزایاں گے اور پاک صاف ہو کر داخل جنت ہوں گے۔ حساب و کتاب کے بعد وہی لوگ براہ راست رحمت الہی میں داخلہ حاصل کر سکیں گے جو ایمان کے علاوہ عمل صالح کے سرمائے کے بھی حامل ہوں گے۔

”فوز“ کا لفظ جس طرح کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے اس ”کامیابی“ کے معنی میں ہے جس کے ساتھ ”صحت و سلامتی“ بھی ہو۔ یہ کلمہ قرآنی آیات میں ۱۹ مرتبہ استعمال ہوا ہے کہیں پر تو اس کی ”مبین“ کے لفظ کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے اور کہیں پر ”کبیر“ کے لفظ کے ساتھ، لیکن اکثر آیات میں ”عظیم“ کے لفظ کے ساتھ اس کی توصیف کی گئی ہے اور عام طور پر بہشت ہی کے سلسلے میں ہے لیکن بعض مقامات پر اطاعت الہی اور گناہوں کی بخشش وغیرہ کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے۔

بعد کی آیت میں ایک اور ٹولے کے انجام کا ذکر ہے، جو ٹھیک اس گروہ کا مد مقابل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، لیکن جو لوگ نے کفر اختیار کیا ان سے کہا جائے گا: کیا تمہارے سامنے ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں؟ تم نے تکبر کیا اور حق کے سامنے سر نہیں جھکایا اور تم لوگ تو گناہگار تھے (واما الذین کفروا افلہم تکن ایاتی تلی علیکم فاستکبرتم

وکنتم قومًا مجرمین)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ آیت صرف کفر کے متعلق گفت گو کر رہی ہے۔ لیکن اس میں بڑے اعمال کا تذکرہ نہیں ہے جو عذاب الہی میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ مسئلہ کفر ہی بذات خود عذاب کا موجب ہوتا ہے، یا پھر اس لیے کہ آیت کے ذیل میں ”مجرمین“ کی تعبیر ہی اس معنی کو ذکر کرنے کے لیے کافی ہے۔

ایک اور نکتہ یہ بھی ہے کہ یہاں پر دوزخ کی سزاؤں کا ذکر نہیں ہوا۔ دراصل پروردگار عالم کی سزائیں کا ذکر ہی بہت بڑی سزا محسوب ہوتی ہے، جس کے مقابلہ میں دوزخ کی اہمیت بہت کم ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انبیاء کی بعثت، رسولوں کے بھیجنے اور آیات الہی کے نزول پر سے اصطلاح میں احکام عقل کی احکام شریعت کے ساتھ تاکید کا نام دیا جاتا ہے، کے بغیر خداوند رحمان کی جانب سے سزا نہیں ملے گی اور یہ اس کا انتہائی لطف کرم ہے۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ اس ٹولے کے لیے سب سے بڑی مصیبت ایک تو آیات الہی کے مقابلے میں ”استکبار“ کا مظاہرہ ہے اور دوسری ”جرم و گناہ کا دوام“ ہے۔ جو ”کنتم قومًا مجرمین“ کے جملے سے سمجھی جاتی ہے۔

- ۳۲- وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَأَرِيبٌ فِيهَا قُلْتُمْ مَا
تَدْرِي مَا السَّاعَةُ إِنَّ نَظْنَ الْأَظْطَانَا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ○
- ۳۳- وَبَدَّ لَهُمْ سَيِّئَاتٍ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ
يَسْتَهْزِءُونَ ○
- ۳۴- وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنْسِكُمْ كَمَا نَسَيْتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا وَمَا أُولَئِكَ
النَّارُ وَمَا لَكُمْ مَن نُّصِرِينَ ○
- ۳۵- ذَلِكُمْ بِأَنَّكُمْ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ هُزُؤًا وَغَرَّتْكُمْ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ○
- ۳۶- فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○
- ۳۷- وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ○

ترجمہ

۳۲- اور جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں ہے
تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے؟ ہم تو اس بارے میں صرف
گمان رکھتے ہیں اور اس پر یقین ہرگز نہیں رکھتے۔

۳۳۔ اور ان کے کرتوتوں کی برائیاں ان پر ظاہر ہو جائیں گی اور جس کی یہ ہنسی اڑایا کرتے تھے ان پر واقع ہو کر رہے گا۔

۳۴۔ اور ان سے کہا جائے گا، آج ہم بھی تمہیں اس طرح بھلا دیں گے، جس طرح تم نے آج کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں۔

۳۵۔ یہ اس لیے ہے کہ تم لوگوں نے خدا کی آیتوں کو ہنسی مذاق بنا رکھا تھا اور دنیاوی زندگی نے تمہیں غرور میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آج کے دن یہ لوگ نہ تو دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ہی ان سے کوئی عذر قبول کیا جائے گا۔

۳۶۔ بنا بریں حمد و ستائش خدا ہی کے لیے سزاوار ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور سارے جہانوں کا مالک ہے۔

۳۷۔ اور آسمانوں اور زمین میں اس کے لیے عظمت اور بڑائی ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے۔

تفسیر

جس دن انسان کے بُرے اعمال ظاہر ہو جائیں گے

زیر تفسیر آیات میں سب سے پہلی آیت درحقیقت ان امور کی وضاحت ہے جو گزشتہ آیات میں اجمالی صورت میں بیان ہوئے ہیں اور خدا کی آیات اور انبیاء کی دعوت کے مقابلے میں کفار کے استکبار کی تشریح ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں ہے تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا چیز ہے، ہم تو اس بارے میں صرف گمان رکھتے ہیں اور اس پر ہرگز یقین نہیں رکھتے (و اذا قیل ان وعد اللہ حق و

الساعة لاریب فیہا قلتما مندری ما الساعة ان لظننا ومانحن بمستقینین۔
 ”ما مندری ما الساعة“ (ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے) کی تعبیر کیوں بیان کی گئی ہے؟ جب کہ قیامت کا مفہوم ان کے لیے کوئی پیچیدہ بات نہیں تھی اور اگر انہیں کوئی شک تھا بھی تو صرف اس کے وجود کے بارے میں تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ تکبر کا شکار تھے اور بالکل بے اعتنائی سے کام لیتے تھے۔ اگر ان میں حق طلبی کی تڑپ ہوتی تو روز قیامت کی حقیقت بھی ان کے لیے روز روشن کی طرح ظاہر تھی اور اس کے وجود کے دلائل بھی بہت تھے۔ یہیں سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر وہ قیامت کے بارے میں واقفانہ شک شبہ میں پڑے ہوئے تھے تو اس بارے میں نہ تو ان پر کسی قسم کا گناہ تھا اور نہ ہی ان پر کوئی ذمہ داری بنتی تھی، کیونکہ ان کا یہ شک و شبہ تو حق کے واضح نہ ہونے کی وجہ نہیں تھا، بلکہ تکبر، غرور، ہٹ دھرمی اور معاندانہ رویے کی وجہ سے تھا۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ان کی اس تضاد بیانی کا مقصد مذاق اور مسخرانا تھا۔

بعد والی آیت ان کی سزا اور عذاب کی بات کر رہی ہے۔ یہ سزا ہماری دنیاوی مقرر کردہ سزاؤں جیسی نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہاں پر ان کے کرتوتوں کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی۔ (وبدالہم شیئات ما عملوا)۔ تمام برائیاں مجسم ہو کر سامنے آ جائیں گی اور ان کے روبرو واضح اور آشکار صورت میں پیش ہوں گی، ان کی ہم دم اور ہم نشین ہو کر انہیں ہمیشہ دکھ پہنچاتی رہیں گی۔ آخر کار جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہ ان پر واقع ہو کر رہے گی (وحاق بہم ما كانوا بہ یستہزؤن)۔ یہ سب سے دردناک بات یہ ہے کہ خداوند رحمان و رحیم کی جانب سے انہیں خطاب ہوگا۔ ”اور کہا جائے گا آج ہم بھی تمہیں اسی طرح بھلا دیں گے، جس طرح تم آج کے دن کی ملاقات کو بھلا چکے تھے“ ”وقیل الیوم تنساکم کما نسیتم لقاء یومکم هذا۔“

یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو مختلف صورتوں میں قرآن پاک میں کئی مرتبہ آئی ہے، جیسا کہ سورہ اعراف کی ۵۱ ویں آیت میں ہے۔

”فالیوم تنساہم کما نسوا لقاء یومہم هذا“

”آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے، جس طرح کہ انہوں نے آج کے دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا“

یہی چیز سورہ ”المسجد“ کی ۴۱ ویں آیت میں ایک اور انداز میں ذکر کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خداوند عالم کی ذات پاک کے لیے فراموشی ایک بے معنی سی بات ہے، کیونکہ اس کا علم تو تمام کائنات

لہ ”حاق“ ”حوق“ کے مادہ سے ہے جس کا معنی داخل ہونا، نائل ہونا، جاگنا، پہنچ جانا اور گھیر لینا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ کلمہ دراصل ”حق“ ہے (جس کا معنی ثابت ہونا ہے) پہلی قاف کو داؤ میں تبدیل کر کے پھر اسے الف میں بدل دیا گیا ہے۔

پر حاوی ہے۔ دراصل یہ ایک لطیف کنایہ ہے ایک مجرم اور گناہگار انسان سے بے پروائی اور بے نیازی کے لیے۔ حتیٰ کہ ہمارے روزمرہ میں بھی یہی بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ہم کہتے ہیں۔ ”تم فلاں بے وفادوست کو ہمیشہ کے لیے بھلا دو“ یعنی ایک بھولے لبرے انسان کے مانند اس سے سلوک کرو، اس کے ساتھ مہر و محبت، دیدار و ملاقات، دل جوئی اور حال احوال پوچھنا ترک کر دو اور کبھی اس کا نام تک نہ لو۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر اعمال کے مجسم ہونے اور ”جرم و سزا کی مناسبت“ کے مسئلے پر ایک اور تاکید ہے، کیونکہ ان کا قیامت کو فراموش کر دینا اس بات کا سبب بن جائے گا کہ خداوند تعالیٰ بھی انہیں فراموشی کے خانے میں ڈال دے اور کس قدر جاننا اور دردناک ہوگی یہ عظیم مصیبت کہ خداوند رحیم اور بہرہ بان کسی شخص کو گوشہ فراموشی میں ڈال کر اسے ہر قسم کے لطف و کم سے محروم کر دے۔

مفسرین نے یہاں پر اس سیاق کی مختلف تفسیریں بیان کی ہیں، جن سب کی روح تقریباً وہی مذکورہ بالا جامع معنی بن جاتی ہے، لہذا ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ روز قیامت کی فراموشی سے مراد اس روز واقع ہونے والے تمام واقعات کی فراموشی ہے، خواہ وہ حساب کتاب ہو یا کوئی اور معاملہ کہ قیامت کے انکار کے ضمن میں وہ ان سب کا انکار کر جاتے تھے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد قیامت کے دن لقاء الہی (خدا کی ملاقات) کی فراموشی ہے۔ کیونکہ قیامت کے دن کو قرآن مجید میں ”یوم لقاء اللہ“ (خدا کی ملاقات کا دن) کہا گیا ہے۔ البتہ یہ ملاقات اور مشاہدہ ظاہری اعضا اور آنکھوں سے نہیں، بلکہ باطنی اعضاء اور دل کی آنکھوں سے ہوگا۔

آیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان سے کہا جائے گا ”تمھارا ٹھکانا جہنم ہے“ (وما واکف المتار)۔

اور اگر تمھارا یہ گمان ہو کہ کوئی شخص تمھاری مدد کو پہنچے گا تو یہ بھی دو ٹوک الفاظ میں سن لو کہ ”تمھارا کوئی مددگار نہیں ہوگا“ (وما لکم من ناصرین)۔

لیکن تم کیوں اور کس لیے اس مصیبت میں گرفتار ہوئے ہو؟ تو سن لو کہ ”یہ اس لیے ہے کہ تم لوگوں نے خدا کی آیات کو ہنسی مذاق بنا رکھا تھا اور دنیاوی زندگی نے تمہیں غرور میں مبتلا کر رکھا تھا“ (ذالکم بانکم اتخذتم آیات اللہ ہزواً وغرتکم الحیوة الدنیا)۔

اصولی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں، ایک ”غرور“ اور دوسرے ”استغناء“ مغرور اور خود پسند افراد دوسروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور عام طور پر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے غرور کا اصل سبب بھی دنیاوی زندگی کا مال و متاع، قدرت و طاقت، مال و دولت اور عارضی کامیابی ہوتی ہے جو کم ظرف لوگوں کو اس قدر غافل کر دیتی ہے کہ وہ انبیائے الہی کی دعوت تک ذرہ بھرا ہمت نہیں دیتے، بلکہ اپنے آپ کو ان کی دعوت کے مطالبے تک کی زحمت دینا گوارا نہیں کرتے۔

آیت کے آخر میں ایک مرتبہ پھر اسی چیز کو دوسرے لفظوں میں دہرایا گیا ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے جو گذشتہ آیت میں بیان ہو چکی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: آج کے دن وہ نہ تو دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ہی ان سے کوئی عذر قبول کیا جائے گا (فالیوم لایخرجون منها ولا ھم یستعتبون)۔

وہاں پر ان کے ٹھکانے اور مستقل جگہ کی بات ہو رہی تھی اور یہاں پر ان کے دوزخ سے نہ نکلنے کی گفتگو ہو رہی ہے۔ وہاں پر بتایا گیا تھا کہ ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا اور یہاں پر فرمایا گیا ہے کہ ان کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے لیے کوئی راہ نجات نہیں ہے۔

اس سورت کے آخر میں توحید اور معاد کی بحث کو تکمیل کے لیے دو آیتوں میں ربوبیت کی وحدت اور خداوند عالم کی عظمت، قدرت اور سحمت کو بیان کیا جا رہا ہے اور اس حصے میں خداوند عالم کی پانچ صفات کو منعکس کیا جا رہا ہے اور یہی اس سورت کا اہم ترین حصہ ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: بنا بریں تمام حمد و ستائش خدا ہی کے سزاوار ہے۔ (فللہ الحمد)۔ کیونکہ وہی ہے ”جو سارے آسمانوں کا پروردگار، زمین کا رب اور سارے جہانوں کا مالک ہے“ (رب السماوات ورب الارض رب العالمین)۔

”رب“ کا معنی مالک، مدبر، حاکم اور اصلاح کرنے والا ہے۔ اسی لیے جو بھی خیر اور برکت ہے، اسی کی ذات پاک کی جانب سے ہے۔ اسی لیے تمام تعریفیں اسی کی ذات کی طرف لوٹ جاتی ہیں، حتیٰ کہ پھول کی تعریف، چمن کی لطافت، نسیم سحر کی دلربائی اور ستاروں کی زیبائی کا ذکر اسی پاک ذات کی ستائش ہے، کیونکہ ان کا سب کچھ ذاتِ کریمہ کی جانب سے اور اسی کے لطف و کرم سے ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ایک مرتبہ فرماتا ہے کہ سارے آسمانوں کا پروردگار، پھر کہتا ہے زمین کا رب اور آخر میں فرماتا ہے کہ تمام کائنات اور کائنات والوں کا مالک، یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ ارباب الشوع اور مختلف خداؤں کے عقیدے کی نفی کی جائے، جس کے بہت سے لوگ معتقد تھے اور ان سب کو ربوبیت کی توحید کی جانب متوجہ کیا جائے۔ ذاتِ کریمہ کی ”حمد“ و ”ربوبیت“ کے ساتھ توصیف کرنے کے بعد تیسری صفت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: سارے آسمانوں اور زمین میں اس کے لیے بڑائی، عظمت، سر بلندی اور بلند و بالا مرتبہ ہے (ولہ العکبر یا فی السماوات والارض)۔

کیونکہ اس کی عظمت کے آثار آسمانوں کی وسعتوں اور زمین کی پنائیوں، بلکہ سراسر کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے پہلی آیت میں اس کی ربوبیت یعنی کائنات کی مالکیت اور تدبیر کی بات ہو رہی تھی اور یہاں پر اس کی

عظمت کا تذکرہ ہے کہ ہم جس قدر زمین و آسمان کی آفرینش کے بارے میں غور و فکر کرتے جائیں اسی قدر اس سے زیادہ آشنا اور آگاہ ہوتے جائیں گے۔

آخر میں چوتھی اور پانچویں صفت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہی غالب اور ناقابل تسخیر قادر اور مطلق صورت میں حکمت والا ہے (وہو العزیز الحکیم)۔

اس طرح سے ”علم“ ”قدرت“ ”عظمت“ ”ربوبیت“ اور ”محمودیت“ کی مجموعی صورت مکمل ہو جاتی ہے اور یہ اس کی اہم ترین صفات اور اسماء الحسنیٰ کا مجموعہ ہے۔

اور گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ:

«لله الحمد فاحمدوه، وهو الرب فاشكروا له، وله الكبرياء فكبروه،

وهو العزيز الحكيم فاطيعوه»

”حمد اسی کی ذات کے لیے مخصوص ہے، لہذا اس کی حمد بجالاؤ، وہی پروردگار ہے۔ لہذا اسی

کا شکر ادا کرو، عظمت اسی کی ذات کو زیبا ہے، لہذا اس کی تجسیم بجالاؤ اور وہ عزیز و حکیم

لہذا اسی کی اطاعت کرو“

اس طرح سے سورۃ ”جاثیہ“ جو خداوندِ عالم کی ”عزیز و حکیم“ صفات کے ساتھ شروع ہوئی تھی، انہی اوصاف کے

ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے، اس سورت کے سارے مندرجات بھی اس کی بے انتہا عزت و حکمت کے گواہ ہیں۔

پروردگارا! تجھے اپنی عظمت و کبریائی کی قسم، تجھے اپنے مقام ربوبیت، عزت
 و حکمت کی سوگند، ہمیں اپنے فرمان کی بجا آوری کے رستوں پر ثبات قدم رکھ!
 خداوند! ہر قسم کی حمد و ستائش تیری ذات کے لیے مخصوص ہے اور ہر
 قسم کی توفیق کہ جو ہمارے نصیب میں ہے، تیرے بے پناہ الطاف و اکرام کی وجہ سے
 ہے، ان نعمتوں کو ہمارے لیے قائم و دائم اور روز افزوں فرما!
 بارالہما! ہم سب تیرے احسانوں میں مستغرق ہیں، تو ہمیں اپنے شکر کی
 بجا آوری کی توفیق عنایت فرما۔
 آمین یا رب العالمین

تفسیر سورۃ جاثیہ تمام ہوئی

۱۲ شعبان ۱۴۵ھ

سُورَةُ احْقَافٍ

مکہ میں نازل ہوئی

اس کی ۳۵ آیات ہیں

تاریخ آغاز

۱۲ شعبان ۱۲۰۵ھ

سُورَةُ احْتِفَافِ کے مضامین

یہ سُورتِ مکی سُورتوں میں سے ہے۔ البتہ کچھ مفسرین کی رائے میں اس کی چند آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس کی تشریح ہم اپنی آیات کے ضمن میں کریں گے۔ زمان و مکان کے پیش نظر اس کا نزول اس زمانے میں ہوا جب شرک کے خلاف جدوجہد جاری تھی، توحید، معاد اور اسلام کے بنیادی مسائل کی طرف دعوت دی جا رہی تھی، لہذا یہ سُورت بھی اسی تناظر میں گفتگو کر رہی ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس سُورت کے پیش نظر مندرجہ ذیل امور ہیں:-

- ① قرآن کی عظمت کا بیان۔
- ② ہر طرح کے شرک اور بت پرستی کے خلاف دو لوگ موقوف۔
- ③ لوگوں کو معاد اور پروردگار کی عدالت کے مفہوم کی فہمائش۔
- ④ ضمنی طور پر مشرکین اور مجرمین کے لیے تنبیہ کے طور پر قوم عاد کی داستان کا ایک حصہ بھی بیان کیا گیا ہے جو سرزمینِ احقاف میں سکونت پذیر تھی (سُورت کا نام بھی یہیں سے لیا گیا ہے)۔
- ⑤ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے عمومی اور وسیع ہونے کا تذکرہ، اس حوالے سے کہ یہ انسانوں کے علاوہ جنات کے لیے بھی ہے۔
- ⑥ مومنین کے لیے تشویق اور کفار کے لیے انداز بھی اس سُورت میں موجود ہے اور امید و خوف کے مبادی بھی اس میں موجود ہیں۔
- ⑦ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے اور گزشتہ عظیم پیغمبروں کے نقش قدم پر زیادہ سے زیادہ چلنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اس سُورت کے فضائل

ایک حدیث کہ جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، اس میں اس سُورت کی فضیلت بول وارد ہوئی ہے:-

”من قرأ سورة الاحقاف اعطى من الاجر بعدد كل رمل في الدنيا عشر

حسنات، ومحي عنه عشر سيئات ورفع له عشر درجات۔

”جو شخص سورہ احقاف کی تلاوت کرے گا اسے دُنیا میں موجود ریت کے ہر قطرے کے برے

دس نیکیاں دی جائیں گی اور دس برائیاں مٹائی جائیں گی اور دس دہے بلند کیے جائیں گے۔

”احقاف“ جمع ہے ”حقف“ دروزن رزق کی، جس کا معنی ایسی چلنے والی ریت ہے جو جھگول اور بیابان میں ہواؤں کے چلنے سے مستطیل اور ٹیڑھی ٹیڑھی شکل میں ایک دوسرے پر جمع ہوتی رہتی ہے۔ قوم عاد کی سرزمین کو بھی اسی وجہ سے ”احقاف“ کہتے تھے کہ وہ اس نوعیت کا ایک ریگستان تھی۔ مندرجہ حدیث کی تعبیر بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

ظاہری بات ہے کہ اس قسم کے حنات اور درجات صرف الفاظ کی تلاوت سے حاصل نہیں ہو جاتے، بلکہ ایسی تلاوت مراد ہے جو تعمیری، بیدار کرنے والی اور ایمان و تقویٰ کے راہ پر چلانے والی ہو اور سچ سچ سورہ احقاف کے مضامین اپنے اندر ایسا اثر رکھتے بھی ہیں، بشرطیکہ انسان طالب حقیقت اور آمادہ عمل ہو۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”من قرأ كل ليلة او كل جمعة سورة الاحقاف لم يصبه الله

عز وجل بروعة في الحياة الدنيا، وامنه من فزع يوم القيامة

ان شاء الله۔“

”جو شخص ہر رات یا ہر جمعہ کو سورہ احقاف کی تلاوت کرتا ہے، خداوند بزرگ برتر اس سے دُنیا کی وحشت اور خوف اٹھالیتا ہے اور قیامت کے دن کی وحشت سے بھی وہ اس کی امان میں آجاتا ہے۔“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ حَمْرٌ

۲۔ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۝

۳۔ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاجَلٍ مُّسَمًّیٍّ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّا اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حَمْرٌ

۲۔ یہ کتاب عزیز اور حکیم خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔

۳۔ ہم نے سارے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اُسے صرف حق کے ساتھ ایک خاص معین وقت تک کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن کافروں کو جن چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے وہ ان سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔

تفسیر

اس کائنات کی تخلیق حق کی بنیاد پر ہے

یہ سورہ "حوامیم" کے خاندان کی سات سورتوں میں سے ایک ہے، جن کے اوائل میں "حَمْرٌ" کا کلمہ مذکور ہے

حروفِ مقطعات کی تفسیر میں عموماً اور ”حَمْد“ کی تفسیر میں خصوصاً سورۃ بقرہ، آل عمران، اعراف اور گزشتہ ”حَمْد“ سورتوں کے آغاز میں بہت سے مطالب بیان ہو چکے ہیں، یہاں پر ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اسی حد تک اکتفا کرتے ہیں کہ یہ جنجھوڑ کر رکھ دینے والی، متحرک انگیز اور معانی و مطالب سے مملو قرآنی آیات ”حَا“ اور ”مِیْم“ وغیرہ، جیسے سادہ — حروفِ تہجی سے مرکب ہیں۔ خدا کی عظمت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اس قدر عظیم چیز کو اس حد تک سادہ حرفوں سے وجود میں لایا ہے کہ اگر لوگ قیامت تک بھی اس کے سرار و رموز میں غور و فکر سے کام لیتے رہیں تو بھی نت نئے مطالب حاصل کرتے رہیں گے۔

شاید اسی لیے فوراً ہی فرمایا گیا ہے: ”یہ کتاب خداوند عزیز و حکیم (قادر و توانا) کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔“
 (تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ)۔

یہ وہی تعبیر ہے جو ان تین سورتوں کے آغاز میں بیان ہو چکی ہے، جن کے اقل میں ”حَمْد“ ہے (سورہ مؤمن جا شیعہ اور احقاف)۔

یقینی بات ہے کہ ایک ناقابلِ تسخیر قدرت اور بے کراں حکمت ضروری ہے کہ جو اس قسم کی کتاب نازل کرے۔

”تدوینی کتاب“ کے بعد ”تکوینی کتاب“ کا ذکر فرمایا گیا ہے اور آسمانوں اور زمین کی عظمت اور حقانیت کی بات کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تو سارے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کو صرف حق کی اسماں پر پیدا کیا ہے (مَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ)۔

نہ تو اس کی آسمانی کتاب میں کوئی خلاف حق کلمہ موجود ہے اور نہ ہی اس کی کائنات میں غیر موزوں اور حق کے مخالف کوئی چیز موجود ہے، سب کچھ موزوں، نپاتلا اور حق کے ہم کام اور ہم آہنگ ہے۔
 لیکن جس طرح اس تخلیق کا آغاز ہے اسی طرح اس کا انجام بھی ہے۔ لہذا آیت کے اگلے حصے میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اس کے لیے ایک خاص وقت معین کر دیا ہے (وَأَجَلٌ مُّسَمًّى)۔

جس کے پنیچے ہی دُنیا فنا ہو جائے گی۔ چونکہ یہ کائنات حق پر استوار ہے اور کسی مقصد کے تحت تخلیق ہوئی ہے لہذا نظری طور پر اس کے بعد ایک اور جہان ہونا چاہیے، جس میں اعمال کے نتائج کی جہان پھٹک کی جائے۔ بنا بریں اس کائنات کی حقانیت ہی بذاتِ خود معاد کے وجود پر ایک دلیل ہے، وگرنہ یہ کائنات کھوکھلی، بے بنیاد اور بے انداز ظلم کی حامل ہوتی۔

باوجودیکہ قرآنِ حق ہے اور تخلیق کائنات بھی برحق، ہسٹ دھرم کفار جن چیزوں سے ڈرائے جاتے ہیں، ان سے مُنہ پھیر لیتے ہیں (وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا أَنْذَرُوا مَعْزُونَ)۔

ایک طرف تو قرآنی آیات پے درپے انہیں اس بات کا خوف دلا رہی ہیں کہ تمہیں ایک عظیم عدالت کا سامنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

- ۱۔ اِحْمَ
- ۲۔ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ
- ۳۔ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّیٍّ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّا اُنذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱۔ اِحْم۔
- ۲۔ یہ کتاب عزیز اور حکیم خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔
- ۳۔ ہم نے سارے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اُسے صرف حق کے ساتھ ایک خاص معین وقت تک کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن کافروں کو جن چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے وہ ان سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔

تفسیر

اس کائنات کی تخلیق حق کی بنیاد پر ہے

یہ سورہ "حواہم" کے خاندان کی سات سورتوں میں سے ایک ہے، جن کے ادائل میں "احم" کا کلمہ مذکور ہے

کرنا ہے، دوسری طرف اپنے خاص نظام کے تحت تخلیق کائنات بذات خود متنبہ کر رہی ہے کہ حساب و کتاب ہوگا، لیکن یہ بے پرواہ غافل نہ تو اس پر توجہ کرتے ہیں اور نہ ہی اُس پر۔

”معروضوں“ ”اعراض“ کے مادہ سے ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ تکوینی اور تدوینی آیات کا سامنا کریں تو حقائق کا ادراک کر لیں گے، لیکن وہ تو اپنا منہ ہی پھیرے ہوئے حق سے گریز پا ہیں تاکہ ان کی تقلیدی، تخیلات پر مبنی اور خواہشات نفسانی کے تحت عمل میں آنے والی رفتار میں کوئی تبدیلی نہ آجائے۔

- ۴۔ قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هَذَا أَوْ أَثَرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○
- ۵۔ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَن لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَن دُعَائِهِمْ غَفِلُونَ ○
- ۶۔ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ○

ترجمہ

۴۔ ان سے کہہ دیجیے کہ مجھے بتاؤ کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو، کیا تم نے ان کو دیکھا ہے کہ انہوں نے زمین میں کچھ پیدا کیا ہو یا آسمانوں کے بنانے میں ان کی کچھ شکر ت ہو؟ اگر تم سچ کہتے ہو تو اس سے پہلے کوئی آسمانی کتاب یا گزشتہ لوگوں کے علم کے آثار میں سے کچھ ہو تو میرے سامنے پیش کرو (تاکہ تمہاری بات کی سچائی کی دلیل بن سکے)۔

۵۔ اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو خدا کے بجائے ایسے کو پکارے جو اسے قیامت تک جواب ہی نہ دے، بلکہ بالکل ان کی آواز ہی نہیں سنتے۔

۶۔ اور جب لوگ عرصہ قیامت میں جمع کیے جائیں گے، تو وہ معبودان کے دشمن ہو

جائیں گے، حتیٰ کہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے۔

تفسیر

گمراہ ترین لوگ

گذشتہ آیات میں زمین و آسمان کی تخلیق کی بات ہو رہی تھی کہ یہ سب کچھ خداوند عزیز و حکیم کی طرف سے ہے۔ اس بات کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کائنات میں اس کے سوا کوئی اور موجود نہیں ہے، کیونکہ وہی ذات عبادت کے لائق ہے جو کائنات کی خالق اور مدبر ہے اور یہ دونوں صفات اس کی ذات پاک میں موجود ہیں۔

اس بحث کی تکمیل کے لیے زیر تفسیر آیات میں رُوتے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر کے فرمایا گیا ہے: ان مشرکین سے کہہ دے کہ مجھے بتاؤ کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو کیا تم نے دیکھا ہے انہوں نے زمین میں کیا چیز پیدا کی ہے؟ (قل امرؤیتہم ماتدعون من دون اللہ ارونی ما اذا خلقوا من الارض)۔

”یا آسمانوں کی تخلیق، مالکیت اور ان کے چلانے میں ان کی کچھ شرکت ہے؟ (امر لہم شرک فی

السموات)۔

جب تمہیں یہ بات تسلیم ہے کہ بتوں کا نہ تو ارضی موجودات کی تخلیق میں کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی آفتاب ماہتاب ستاروں اور عالم بالا کی مخلوق کی آفرینش میں اور تم خود علی الاعلان اس بات کا اعتراف کرتے ہو کہ ان سب کا خالق اللہ ہے تو پھر اپنی مشکلات کے حل اور برکتوں کے حصول کے لیے بے خاصیت اور عقل و شعور سے عاری مخلوق یعنی بتوں کے دامن سے کیوں وابستہ ہو؟

اگر فرض کیجیے تم یہ کہتے ہو کہ تخلیق و آفرینش کے معاملے میں ان کی شرکت ہے تو پھر اگر تم سچ کہتے ہو تو اس سے پہلے کوئی آسمانی کتاب جو تمہاری باتوں کی تصدیق کرے یا گزشتہ لوگوں کے علم کے آثار جو اس بات کی گواہی دیں، میرے سامنے پیش کرو (ایتونی بکتاب من قبل ہذا واثارة من علم ان کنتم صادقین)۔

قصہ مختصر یہ کہ دلیل یا تو نقلی پہلو کی حامل ہوگی اور آسمانی وحی کے ذریعے پیش ہوگی یا عقلی اور منطقی ہوگی یا پھر دانش ورانہ کی گواہی کے ذریعے ہوگی، جب کہ تم لوگ بتوں کے متعلق دعویٰ کے سلسلے میں نہ تو وحی الہی اور آسمانی کتاب سے ثبوت پیش

کر سکتے ہو اور نہ ہی زمین و آسمان کی تخلیق کے بارے میں ان کی شرکت کو ثابت کر سکتے ہو تا کہ اس عقلی دلیل کے ذریعے تم ان کی خدائی کو منوا سکو اور نہ ہی گزشتہ لوگوں کے علوم کے آثار تمہاری باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دین او مسک خرافات اور جھوٹے توہمات اور خیالات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اسی لیے ”ارونی ماذا خلقوا من الارض“ کا مجملہ عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے اور ”ایتونی بکتاب من قبل هذا“ آسمانی وحی کی طرف اشارہ ہے اور ”اثارة من علم“ کی تیسرے گزشتہ انبیاء اور ان کے اوصیاء کی سنت یا سابقہ و الشوریوں کے آثار میں سے ”اثارة“ (بروزن حلاوة) کے بارے میں علمائے لغت اور ارباب تفسیر نے چند ایک معانی ذکر کیے ہیں۔ ”کسی چیز سے باقی رہ جانے والا حصہ“ ”روایت“ اور ”علامت“ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ سب معانی ایک ہی مطلب کی طرف لوٹ رہے ہیں اور وہ کسی چیز کا اثر ہوتا ہے جو باقی رہ جاتا ہے اور اس کے وجود کی دلیل ہوتا ہے۔ اس سے ملتی جلتی گفتگو اور بت پرستوں کے مقدمے اور ان کے مواخذے کے بارے میں سورہ فاطر کی چالیسویں آیت میں یوں بیان ہوا ہے۔

”قل اربیت مشرکاء کم الذین تدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض امر لہم شرک فی السماوات امر اتینا ہم کتابا فہم علی بیت منہ بل ان یعد الظالمون بعضهم بعضاً الاغروکاً“

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زمین کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

”ماذا خلقوا من الارض“

”زمین میں سے کیا چیز خلق کی ہے؟“

اور آسمانوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

”امر لہم شرک فی السماوات“

”یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کی کوئی شرکت ہے؟“

یعنی دونوں جگہوں پر شرکت کی بات ہو رہی ہے کیونکہ شرک در عبادت کا اصل سرچشمہ خالقیت اور تدبیر میں شرک ہی ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مشرکین عام طور پر خلقت کے معاملے کو ذاتِ خدا ہی سے مخصوص سمجھتے تھے تو پھر ان تین دلائل میں سے کسی ایک کا مطالبہ کس لیے کیا گیا ہے؟

جواباً گزارش ہے کہ اس قسم کا مطالبہ مشرکین میں سے مختصر تعداد کے لوگوں سے ہے جو بت پرستوں میں موجود تھے اور بتوں کو تخلیقی امور میں حصہ دار سمجھتے تھے۔ یا پھر یہ مسئلہ فرض کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے، یعنی بالفرض اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ کائنات

لہ اصول کافی میں ایک روایت میں امام محمد باقر سے منقول ہے جو آپ نے اس جملے کی تفسیر میں ارشاد فرمائی ہے کہ ”اشعاعنی بذالک علم اوصیاء الانبیاء یعنی گزشتہ انبیاء کے اوصیاء کا باقی ماندہ علم مراد ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۰۰۔“

کی تخلیق میں بُت بھی شریک ہیں تو تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تمہارے پاس اس دعویٰ کی نہ تو کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ ہی عقلی اور نہ عقلا کی کوئی گواہی تمہارے پاس موجود ہے۔

اس سے اگلی آیت میں ان مشرکین کی گمراہی کی گہرائیوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہو سکتا ہے جو خدا کو چھوڑ کر کسی ایسی چیز کی پرستش کرے جو اس کی پکار کا قیامت تک جواب ہی نہ دے سکے (ومن اضل معن یدعو امن دون الله من لا يستجيب له الی یوم القیامة)۔

نہ صرف ان کے بلا دے کا جواب نہیں دیتے بلکہ ان کی باتوں کو بھی بالکل نہیں سن پاتے۔ "اور وہ ان کی دُعا اور نداء بھی بالکل غافل ہیں" (وهم عن دعائهم غافلون)۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں ضمیر کا مرجع بے جان بتوں کو جانا ہے اس نسبت سے کہ مشرکین عرب کے اکثر و بیشتر مجذوب ہی بُت تھے اور بعض نے ان فرشتوں اور انسانوں کو ضمیر کا مرجع جانا ہے جو مجبور بنائے گئے تھے، کیونکہ جنات اور فرشتوں کے عبادت گزار بھی عربوں میں کم نہیں تھے۔ اس آیت کی تمام تعبیریں چونکہ ذی العقول سے مناسبت رکھتی ہیں لہذا اسی معنی کی زیادہ تائید کرتی ہیں۔

لیکن اس بات سے بھی کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم آیت کے مفہوم کی وسیع معنوں میں تفسیر کریں اور اس طرح کے تمام مجبور آیت میں جمع ہوں خواہ جانداروں یا بے جان، صاحبان عقل ہوں یا بے عقل چیزیں۔ البتہ ذی العقول سے مناسبت رکھنے والی تعبیریں اصطلاحی طور پر "غلبہ" کے باب سے ہوں۔

اگر آیت یہ کہتی ہے کہ وہ مجبور انہیں تا قیامت جواب نہیں دیں گے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ قیامت کے دن انہیں جواب دیں گے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ یہ ایک مروجہ تعبیر ہے کہ جو ابدی اور ہمیشہ کی نفی کے لیے استعمال ہوتی ہے، جس طرح ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ اگر تم اس سے قیامت تک بھی مانگتے رہو تو وہ تمہیں ہرگز قرضہ نہیں دے گا۔ یعنی وہ یہ کام بالکل نہیں کرے گا، نہ یہ کہ قیامت کے دن تمہاری درخواست قبول کرے گا۔

یہ بھی معلوم ہے کہ ہر قسم کی سعی و کوشش جستجو اور دعاؤں کی قبولیت صرف اسی دنیا میں سُو د مند ہے، جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی تو یہ ساری باتیں بھی از خود ختم ہو جائیں گی۔

اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہوگی کہ "جب مشرک لوگ قیامت کے دن جمع کیے جائیں گے تو وہ مجبور ان کے دشمن ہو جائیں گے، حتیٰ کہ ان کی عبادت کا بھی ہنکار کریں گے" (واذا حشرنا لتاس کاناوا لہم اعداء وکانوا بعبادتهم کافرین)۔

جو مجبور صاحبان عقل ہیں وہ تو باقاعدہ طور پر ان سے دشمنی کریں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے عبادت گزاروں سے برات کا اظہار کریں گے اور فرشتے بھی اسی طرح کریں گے، حتیٰ کہ شیاطین اور جنات بھی ان سے نفرت اور سیزاری کا اظہار کریں گے۔ اور جو بے عقل چیزیں ہیں خدا تعالیٰ انہیں بھی زندگی اور عقل عطا فرمائے گا تاکہ وہ لب کشائی کر کے اپنے عابدوں سے دشمنی اور نفرت کا اظہار کریں۔

اس سے ملتا جلتا معنی قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی ذکر ہوا ہے، جن میں سے ایک سورہ فاطر کی چودھویں آیت ہے۔ اس میں مشرکین سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

”ان یتدعونم لایسمعوا دعاءکم ولوسمعوا ما استجابوا لکم ویوم

القیامة یکفرون بشرکم ولا ینبتلک مثل خبیر“

”اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو نہیں سنتے، اگر سن بھی لیں تو اس کو قبول نہیں کر سکتے اور قیامت کے دن بھی تمہارے شرک اور عبادت کا انکار کر دیں گے اور خدا جیسی آگاہ ذات کے مانند تمہیں اور کوئی مطلع نہیں کر سکتا۔“

اس آیت میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو زیر تفسیر آیت میں ہیں۔ البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ، لیکن معبود اپنے عابدوں کی عبادت سے کیسے انکار کریں گے، جب کہ وہاں پر تو انکار کی جگہ بھی نہیں ہوگی؟ ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ درحقیقت اپنی خواہشات نفسانی کی عبادت کیا کرتے تھے نہ کہ معبودوں کی کیونکہ بت پرستی کا اصل سرچشمہ خواہش پرستی ہی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قیامت کے دن معبودین کی اپنے عبادت گزاروں سے عداوت اور دشمنی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا ذکر صرف یہیں پر کیا گیا ہو بلکہ انسانیت کے بطل جلیل حضرت ابراہیمؑ بت شکن کا ایک قول سورہ عنکبوت کی ۲۵ ویں آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ:

”وقال انما اتخذتم من دون الله اوثانا مودة بینکم فی الحیوة الدنیا

شدة یوم القیامة یکفرون بعضکم بعض ویلعن بعضکم بعضاً“

”ابراہیمؑ نے کہا تم نے تو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے لیے خدا بنا لیا ہے، جو اس دنیاوی زندگی میں ہی تمہاری دوستی کا ذریعہ ہیں، لیکن قیامت کے دن ایک دوسرے سے کافر ہو جاؤ گے اور ایک دوسرے کو لعنت کر دو گے۔“

سورہ مریم کی ۸۲ ویں آیت میں ہے:

”کلا سیکفرون بعبادتهم ویکونون علیہم صنڈاً“

”وہ بہت جلد عبادت کرنے والوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کی مخالفت کریں گے“

- ۷۔ وَإِذْ أَنْتَلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَلِلَّهِ الْحَقُّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝
- ۸۔ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۗ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتَهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۗ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۗ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝
- ۹۔ قُلْ مَا كُنْتُ بِدُعَاءِ مِنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۗ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝
- ۱۰۔ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَأَمَنْ وَأَسْتَكْبَرْتُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

ترجمہ

- ۷۔ جب ہماری واضح آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کفار اس حق کے بارے میں جو ان کے لیے آچکا ہے، کہتے ہیں یہ تو کھلم کھلا جادو ہے۔
- ۸۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ان آیات کی خدا کی طرف جھوٹ نسبت دی ہے، تو کہہ دے کہ اگر میں نے ان کی خدا کی طرف جھوٹ نسبت دی ہے تو (ضروری

ہے کہ وہ مجھے ذلیل و خوار کرے اور تم خدا کے سامنے میرا دفاع نہیں کر سکو گے۔ وہ ان کاموں کو بہتر جانتا ہے جن میں تم داخل ہوتے ہو، یہی بات کافی ہے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور وہی بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۹۔ کہہ دے کہ میں نیا رسول نہیں ہوں، اور میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کرے گا؟ میں تو صرف اسی بات کی پیروی کروں گا جو مجھ پر وحی ہوتی ہے، اور میں تو بس علانیہ طور پر ڈرانے والا ہوں۔

۱۰۔ یہ بھی کہہ دے کہ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار کر بیٹھو، حالانکہ نبی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے دے اور ایمان بھی لے آئے اور تم تکبر کر بیٹھے (تو تم سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا؟) خداوند عالم ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

کہہ دیجئے میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں

یہ آیات بھی حسب سابق مشرکین کی کیفیت بیان کر رہی ہیں اور آیات خداوندی کے ساتھ ان کے بڑاؤ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: جب ہماری واضح آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کفار اس حق کے بارے میں جو ان کے لیے اچکا ہے، کہتے ہیں یہ تو کھلم کھلا جادو ہے (و اذا اتلى عليهم آياتنا بينات قال الذين كفروا للحق لما جاءهم هذا سحر مبين)۔

وہ ایک طرف تو قرآن مجید کی دلوں میں زبردستی اور عجیب گہری تاثیر کا انکار بھی نہیں کر سکتے تھے اور دوسری طرف قرآن مجید کی حقانیت اور عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار بھی نہیں تھے، لہذا قرآن پاک کی اس تاثیر کو گمراہ کن تفسیر کے ساتھ کھلم کھلا جادو کا نام دیتے تھے، جو بذات خود ان کا درپردہ ایک قسم کا یہ اعتراف تھا کہ قرآن انسانی قوت

میں انتہائی زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔

بنا بڑی مندرجہ بالا آیت میں لفظ ”حق“ انہی قرآنی آیات کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ بعض مفسرین نے اس کا معنی ”نبوت“ یا ”اسلام“ یا ”پیغمبر اسلام“ کے دوسرے معجزات، کیا ہے، لیکن آیت کے آغاز کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور کھلے بندوں ”کہتے ہیں، اس نے ان آیات کو خدا کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے“ (امریقولون افتراء)۔

اس موقع پر خداوند عالم اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کا منہ توڑ جوابے دیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ان سے کہہ دے اگر ایسا ہی ہے، جیسے تم سمجھتے ہو اور میں نے اس قرآن کو خدا کی طرف جھوٹ منسوب کر دیا ہے، تو لازم ہے کہ وہ مجھے رسوا کرے اور تم لوگ خدا کے سامنے میرا دفاع نہیں کر سکو گے۔ (قل ان افتريتہ فلدا تملکون لی من اللہ شیئا)۔ ۱۰

یہ بات کیسے ہو سکتی ہے کہ خداوند عالم ان ”آیات بینات“ اور اس جاودانی معجزے کو کسی جھوٹے شخص کے ہاتھوں پر ظاہر کرے؟ یہ بات خدا کی حکمت اور اس کے کٹف سے بعید ہے۔ جیسا کہ سورہ حاقہ کی آیات ۴۲ تا ۴۴ میں ہے:

”ولو تقول علینا بعض الاقاول، لاخذنا منہ بالیمن، ثم لقطعنا

منہ الوتین، فما منکم من احد عنده حاجزین“

”وہ اپنے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہماری طرف ناروا باتوں کی نسبت دیتا ہے، تو ہم اسے اپنی طاقت کے ذریعے پکڑیں گے اور اس کے دل کی رگ کو کاٹ ڈالیں گے۔ اور تم میں سے ایک شخص بھی ہمیں اس کا سے نہیں روک سکتا اور نہ ہی اس کا دفاع کر سکتا ہے۔“

اس لیے یہ بات کیسے ممکن ہے کہ میں تمہاری خاطر اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈالوں اور تم کیونکر باور کر سکتے ہو کہ میں اس قسم کا جھوٹ بولنے لگوں اور خدا بھی مجھے ایسے ہی چھوڑ دے، بلکہ بڑے بڑے معجزات میرے اختیار میں دے دے؟

پھر ان کی تبنیہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: لیکن خدا ان کاموں کو دوسرے لوگوں سے بہتر جانتا ہے جن میں تم داخل ہوتے ہو اور وقت آنے پر تمہیں سخت سے سخت سزا دے گا (ہو اعلم بما تفیضون فیہ)۔ ۱۰

۱۰ ”ان افتريتہ“ کا جملہ مجملہ شرطیہ ہے کہ جس کی جزاء محذوف ہے اور تقدیری طور پر یوں ہے۔

”ان افتريتہ اخذنی وعاجلنی بالعقوبۃ۔“

۱۰ ”ما تفیضون فیہ“ میں ”ما“ کا کلمہ ممکن ہے کہ موصول ہو اور نداء تمتوں کے معنی میں ہو جو پیغمبر پر لگائی جاتی (یعنی ماشیہ الگے صغیر)۔

جی ہاں! وہ ان سب تہمتوں کو جانتا ہے جو تم ٹھہر پڑ گاتے ہو، اس کے بھیجے ہوئے کے مقابلے میں کھڑے ہو چکے ہو، اسے بھی جانتا ہے اور زہریلے پرو پگنڈے کے ذریعے لوگوں کو راہِ حق سے منحرف کر رہے ہو، اس سے بھی باخبر ہے۔ بعد کے جملے میں اس بات کو مزید زور دے کر بیان کیا جا رہا ہے، لیکن کچھ اور جملے میں یہی بات کافی ہے کہ خدا میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے (کفی بہ شہیداً بینی و بینکم)۔

وہ رسالت کی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں میرے صدق و صفا، میری سعی و کوشش اور میری ہنگامت کو بھی جانتا ہے اور تمہارے کذب و افتراء، تمہاری ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور یہی چیز میرے اور تمہارے لیے کافی ہے۔

البتہ انہیں تو یہ اور راہِ راست پر آجانے کی رہنمائی کے طور پر فرمایا گیا ہے: ”وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی“ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے (وہو الغفور الرحیم)۔

وہ تو بر کرنے والوں کو بخش دیتا ہے اور انہیں اپنی رحمت و اسعہ میں شامل فرما لیتا ہے۔

اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: کہہ دے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں جو دوسرے رسولوں سے مختلف ہو (قل ما كنت بدمًا من الرسل)۔

اور کیا میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ کیا کرے گا اور تمہارے ساتھ کیا کرے گا؟ (وما ادري ما يفعل بي ولا بكم)۔

میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں، جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے (ان اتبع الا ما يوحي الي)۔

”اور میں تو بس اعلانیہ طور پر ڈرانے والا ہوں“ (وما انا الا نذير مبين)۔

یہ مختصر لیکن جامع اور معنی خیز جملے مشرکین کے بہت سے اعتراضات کے جواب ہیں۔ کبھی تو وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت پر تعجب کرتے تھے کہ ایک بشر کیونکر خدا سے تعلق پیدا کر سکتا ہے؟

کبھی کہتے کہ کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازار میں کیوں چلتا پھرتا ہے؟

کبھی وہ عجیب و غریب معجزات کا تقاضا کرتے اور ہر ایک کی اپنی اپنی تمنا ہوتی۔

کبھی انہیں یہ توقع ہوتی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیب کا دروازہ کھولا ہوا ہے اور انہیں آئندہ کے تمام واقعات سے مطلع فرمادیں گے۔

اور کبھی تو وہ توحید کی دعوت اور عبود کے وعدہ لا شریک ہونے پر بھی تعجب کرتے تھے۔

(باقی حاشیہ صفحہ نمبر سے) تھیں۔ اس لحاظ سے ”فنیہ“ کی ضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے اور اگر یہ ”ما“ مصدریہ ہوتی ”فنیہ“ کی ضمیر یا ”قران“ کی طرف لوٹے گی یا پھر ”حق“ کی طرف۔ تو ایسی صورت میں ”تفیضون“ کا معنی کسی کام میں فساد ڈالنے کی غرض سے داخل ہونا ہوگا۔

یہ آیت ایک اجمالی جواب ہے ان تمام باتوں اور حیلہ سازیوں کا۔ رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ میں کوئی نیا تازہ پیغمبر نہیں ہوں کہ جس نے توحید کی دعوت کی ہے، مجھ سے پہلے کئی انبیاء ہو گزرے ہیں جو سب کے سب نوح بشر میں سے تھے۔ وہ لباس بھی پہنتے تھے اور کھانا بھی کھاتے تھے، ان میں سے کوئی بھی مطلق غیب جاننے کا دعوے دار نہیں تھا۔ بلکہ ہر ایک یہی کہتا کہ ہم غیب کے بارے میں وہی کچھ جانتے ہیں جو کچھ خدا نے ہمیں بتایا ہے۔

ان میں سے کوئی بھی لوگوں کی قدم قدم پر محجروں کی فرمائش اور نفسانی آرزو کے سامنے نہیں جھکا۔ یہ اس لیے ہے کہ سب لوگوں کو پتہ چل جائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ ہیں۔ ان کی قدرت اور ان کا علم بھی خدا کے علم و قدرت کے مقابلے میں محدود ہے، قدرت مطلقہ اور علم مطلق صرف اور صرف ذاتِ کریمہ کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ ایسے حقائق ہیں جن سے لوگوں کو باخبر رہنا چاہیے اور اپنے ناروا اعتراضات کا سلسلہ بند کر دینا چاہیے۔

یہ سب جوابات اس گفتگو کے بعد ذکر ہوئے ہیں جو گزشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے کہ کبھی تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادوگری کی تہمت سے متہم کرتے اور کبھی ان پر افتراء اور کذب کی تہمت لگاتے۔ ان سب ناجائز تہمتوں کا اصل سبب وہ توہمات تھے جن کا اس آیت میں جواب دیا گیا ہے۔ یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس آیت کا مفہوم ان دوسری آیات کے منافی نہیں ہے، جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیب سے باخبر ہیں، جیسا کہ سورہ فتح میں مکہ کی فتح اور مسجد الحرام میں داخلے کے بارے میں ہے (ملاحظہ ہو سورہ فتح آیت ۲۷) یا جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں سورہ آل عمران آیت ۴۹ میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

” انبئکم بما تاکفون وما تذخرون فی بیوتکم۔“

” میں تمہیں ان چیزوں سے باخبر کرتا ہوں جو تم کھاتے ہو یا جمع کرتے ہو۔“

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات کیونکہ جس آیت کی ہم تفسیر کر رہے ہیں وہ ”مطلق علم غیب“ کی نفی کر رہی ہے نہ کہ مطلقاً ”علم غیب“ کی بالفاظ دیگر یہ آیت استقلالی اور ذاتی علم غیب کی نفی کر رہی ہے، لیکن وہ آیات اس علم غیب کی بات کر رہی ہیں جو خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔

ہماری اس گفتار پر شاہد سورہ جن کی ۲۶ ویں اور ۲۷ ویں آیات ہیں، جن میں کہا گیا ہے:

” عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احدًا الا من یرتضیٰ من رسول۔“

” خدا ہی عالم غیب ہے اور کسی بھی شخص کو اپنے محقق علم سے آگاہ نہیں کرتا، مگر جن رسولوں

کے لیے وہ چاہے۔“

بعض مفسرین نے زیر تفسیر آیت کی شان نزول یوں بیان کی ہے۔

”جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ پر مکہ میں مشکلات بہت بڑھ گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر رہے ہیں جس میں نخلستان ہیں، درختوں اور پانی کی فراوانی ہے۔ چنانچہ آپ نے یہ خواب اپنے دوستوں سے بیان کیا تو وہ سب بہت خوش ہوئے اور سمجھ گئے کہ بہت جلد مشرکین کے آزار اور اذیت سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔ ایک عرصے تک صبر کیے رکھا، لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! آپ نے جو فرمایا تھا اس کا تو کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ آپ نے جس سرزمین کا خواب دیکھا تھا، ہم کب وہاں کو ہجرت کر جائیں گے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے اور اس ہنگام میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی کہ ”وما ادری ما یفعل بی ولا بکم“ (میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ کیا کرے گا اور تمہارے ساتھ کیا کرے گا)۔

لیکن اس آیت کے لیے یہ شان نزول بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس آیت میں مخاطب پیغمبر کے دشمن ہیں نہ کہ دوست، لیکن یہ بات ممکن معلوم ہوتی ہے کہ تطبیق کے طور پر آپ نے یہ فرمایا ہو۔ یعنی جب دوستوں کی طرف سے مذکورہ سوال کیا گیا ہو تو آپ نے اسی آیت سے استفادہ کرتے ہوئے انہیں جواب دیا ہو۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں گذشتہ آیات میں مذکور گفتگو کی تکمیل کے طور پر فرمایا گیا ہے؛ یہ بھی کہہ دے کہ مجھے یہ تو بتاؤ کہ اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار بیٹھو، حالانکہ نبی اسرائیل میں ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے دے اور ایمان بھی لے آئے اور تم تکبر کرتے ہوئے اس کے آگے نہ جھکے تو تم سے بڑھ کر اور کون شخص گمراہ ہوگا؟ یقینی بات ہے کہ خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا رقل اور یتیمان کان من عند اللہ وکفرتم بہم وشهد شاهد من بنی اسرائیل علیٰ مشلہ فامن واستکبرتم ان اللہ لایہدی القوم الظالمین)۔ لہ

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ وہ گواہ کون تھا جس نے قرآن کی حقانیت اور صداقت پر گواہی دی؟

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد جناب موسیٰ بن عمران علیہ السلام ہیں جنہوں نے اپنے زمانے میں پیغمبر اسلام کے ظہور کی خبر دی اور اس کی علامات بتائیں۔

لیکن یہ احتمال ”فامن واستکبرتم“ کے جملے سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے یہ شاہد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آیا جبکہ مشرکین نے تکبر کا مظاہرہ کیا، کیونکہ

لہ جہ شرطیہ ”ان کان من عند اللہ“ کی جزا معدوم ہے۔ جو تقدیری طور پر ”من اضل منکم“ ہے۔

مجھے کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گواہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھا اور آنحضرت پر ایمان بھی لایا تھا، جبٹ کہ دوسرے لوگ تاجر کی راہوں پر گامزن رہے۔

کئی اور مفسر کہتے ہیں کہ یہ شخص اہل کتاب کے علماء میں سے تھا اور مکہ میں رہتا تھا اگرچہ یہود اور نصاریٰ کے مذہب کے پیروکار مکہ میں بہت کم تھے، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وہاں ان میں سے کوئی ایک بھی نہ رہتا ہو۔ لیکن پھر یہ معلوم نہیں کہ بنی اسرائیل کا یہ عالم کون تھا اور اس کا کیا نام تھا؟

اس بات کے پیش نظر کہ اہل کتاب کا کوئی مشہور و معروف عالم ظہور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت موجود نہیں تھا اور نہ ہی کسی تاریخ نے اس کا نام ذکر کیا ہے، یہ تفسیر بھی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ یہ تفسیر اور گذشتہ تفسیر اس بات کی مظہر ضرور ہیں کہ سورہ احقاف سکتی ہے۔ تیسری تفسیر جو اکثر مفسرین کے لیے بھی قابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ یہ گواہ یہود کا مشہور عالم عبداللہ بن سلام تھا جو مدینہ میں اسلام لایا اور مسلمان کی صف میں شامل ہو گیا۔

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ میں یہودیوں کی کسی عید کے موقع پر ان کے کنیسہ (عبادت گاہ) میں گئے۔ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہاں آنے پر خوش نہیں تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”اے یہود! تم اپنے میں سے بارہ شخص میرے سامنے لاؤ تاکہ وہ خدا کی وحدانیت اور محمدؐ کی نبوت کی گواہی دیں، اس طرح سے اللہ تعالیٰ تمام دنیا کے یہودیوں سے اپنا غضب اٹھا لے گا۔“

وہ سب خاموش رہے اور کسی نے بھی جواب نہیں دیا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جملے کو تین بار دہرایا، لیکن تینوں مرتبہ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر آپ نے فرمایا:

”تم نے بیان حق سے انکار کیا ہے، لیکن خدا کی قسم ”حاسن“ اور ”عاقب“ (تورات میں پیغمبر اسلام کے القاب) میں ہوں، خواہ تم ایمان لے آؤ یا میری تکذیب کرو۔“

یہ کہہ کر آنحضرتؐ پلٹنے لگے۔ لیکن ابھی ایک قدم باہر نہیں نکالا تھا کہ ایک شخص پیچھے سے آیا اور آواز دی ”اے محمدؐ! ٹھہر جاؤ! پیغمبر اکرمؐ تک گئے اس نے یہودیوں کی طرف منہ کر کے کہا: ”مجھے کیسا آدمی پاتے ہو؟“ انہوں نے کہا: ”خدا کی قسم ہمارے درمیان تم سے زیادہ عالم کوئی اور شخص نہیں ہے اور تمہارے باپ دادا سے بڑھ کر ہماری آسمانی کتابوں کا کوئی اور عالم نہیں ہے۔“

اس نے کہا: ”یہ خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ یہ وہی پیغمبر ہے جس کا ذکر تورات اور انجیل میں آچکا ہے۔“

جب یہودیوں نے یہ دیکھا تو کہا: تم جھوٹ کہتے ہو! یہ کہہ کر اسے غُوب جی بھر کے گالیاں دیں۔
رسول پاکؐ نے فرمایا:

”تم سب جھوٹ بولتے ہو، اقرار کے بعد تمہارا انکار ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔“

یہ شخص عبداللہ بن سلام کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اور اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ قُلْ اَرۡءَیۡتُمْ اِنۡ كُنَّا نُرۡسِلُکُمۡ بِالۡحَدِیۡثِ الْاَوَّلٰیؕ اِنۡ كُنَّا لَمُرۡسِلِیۡنَ ؕ... اس تفسیر کے مطابق یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ ہر چند کہ یہ سُورت مکی ہے، اور یہ بات اسی آیت میں منحصر نہیں ہے، قرآن مجید کی دوسری سُورتوں میں بھی بعض مقامات پر ہم مکی آیتوں کو مدنی سُورتوں میں یا مکی سُورتوں میں مدنی آیتوں کو ملا ہوا پاتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات پیغمبر اسلامؐ کے حکم سے کسی آیت کو جو سُورت کے مفہوم سے ہم آہنگ ہوتی تھی اس کی تاریخ نزول سے قطع نظر اسے اس سُورت میں ملا دیا جاتا تھا۔
یہ تفسیر کئی لحاظ سے مناسب تر معلوم ہوتی ہے۔

- ۱۱- وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا
إِلَيْهِ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَذَا أَفْكَ قَدِيمٌ ۝
- ۱۲- وَمَنْ قَبْلِهِ كَتَبَ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۗ وَهَذَا كِتَابٌ
مُّصَدِّقٌ لِّسَانِ عَرَبِيًّا لِيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۗ وَبُشْرَىٰ
لِلْمُحْسِنِينَ ۝
- ۱۳- إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝
- ۱۴- أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

- ۱۱- اور کافر لوگ مومنوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر (دین اسلام) بہتر چیز ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت حاصل نہ کر جاتے اور جب خود وہ اس کے ذریعے سے ہدایت نہیں پاتے تو کہتے ہیں کہ یہ تو ایک پُرانا جھوٹ ہے۔
- ۱۲- اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی (اس نے اس کی نشانیوں کو بیان کیا ہے) اور یہ وہ کتاب ہے جو تورات کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہے فصیح اور واضح عربی زبان میں ہے تاکہ ظالموں کو ڈرائے اور نیکو کاروں کو

خوش خبری دے۔

۱۳۔ بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۱۴۔ وہی تو اہل جنت ہیں کہ جو اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ انجام دیتے رہے۔

شان نزول

مفسرین نے زیر تفسیر آیات میں سے پہلی آیت کی متعدد شان نزول بیان کی ہیں۔

① یہ آیت ابوذر غفاری کے بارے میں ہے، جو مکہ میں اسلام لائے اور ان کا قبیلہ نبی غفار بھی ان کے بعد اسلام لے آیا چونکہ نبی غفار ایک بادہ نشین اور غریب قبیلہ تھا، لہذا کفار قریش کے دولت مند اور شہری لوگوں نے کہا کہ اگر اسلام بہتر چیز ہوتا تو یہ بے وقعت اور حقیر لوگ ہم سے سبقت حاصل نہ کرتے۔ اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

② ایک رومی کنیز مکہ میں رہتی تھی۔ اس کا نام ”ذی النیرۃ“ تھا، اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے رد عمل میں بڑے بڑے قریشی کہنے لگے ”جو چیز محمدؐ لے کر آیا ہے اگر وہ اچھی اور بہتر ہوتی تو ”ذی النیرۃ“ جیسے لوگ ہم پر سبقت نہ لے جاتے۔

③ مکہ کے بادہ نشین قبائل کے کچھ افراد شہر کے لوگوں سے پہلے اسلام لے آئے۔ مکہ کے رؤساء کہنے لگے کہ اگر اسلام کوئی اچھی چیز ہوتا تو یہ شتر بان اور چرواہے ہم پر سبقت نہ لے جاتے۔

④ کچھ نیک دل لیکن غریب اور تہی دست افراد مثلاً صیبؓ، بلالؓ اور عمارؓ نے کھلے دل کے ساتھ اسلام کو قبول کیا تو مکہ کے رؤساء کہنے لگے: ”آیا یہ بات ممکن ہے کہ محمدؐ کا دین کوئی اچھی چیز ہو اور وہ ہم پر سبقت لے جائیں؟“

⑤ جب عبداللہ بن سلام اور ان کے کچھ دوست ایمان لے آئے تو مغرور یہودی کہنے لگے: ”اگر اسلام اچھی

چیز ہوتا تو وہ ہم سے پیش قدم نہ ہوتے۔" لہ

شانِ نزول کی پہلی چار قسموں کو صرف ایک جملے میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام کی دعوتِ غربار، فقراء اور بادیہ نشین لوگوں میں بہت مقبول ہو گئی اور ان لوگوں نے بڑی تیزی سے اس کا کھلے دل سے استقبال کیا کیونکہ ایک تو ان کے ناجائز مفادات نہیں تھے، جن کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا۔ دوسرے ان کے دماغ میں تکبر اور غرور کی ہوا نہیں تھی اور تیسرے خوشحال، عیاش اور ہوس پرست طبقے کی نسبت ان کا دل زیادہ پاک اور صاف تھا۔

ایسے غریب غربار کی طرف سے اسلام کا اس قدر گرم جوشی کے ساتھ استقبال اس دین الہی کے طاقت ور ہونے کا ایک واضح ثبوت تھا، جسے مغرور اور متکبر لوگوں نے اس کی بہت بڑی کمزوری پر محمول کیا اور کہنے لگے کہ یہ کیسا دین ہے، جس کے پیروں کا مسٹی بھر بادیہ نشین، غریب غربار، فقیر فقرا اور کمینہ و غلام ہیں، اگر یہ کوئی معقول مکتب فکر ہوتا تو اسے سخی سطح کے لوگ اور معاشرے کے بہت افراد ہرگز نہ اپناتے اور ہم جو کہ بالائی سطح کے افراد اور معاشرے کے چشم و چراغ ہیں کبھی پیچھے نہ رہتے۔

لائق توجہ بات یہ ہے کہ یہ غلط طرزِ تفکر آج بھی مغرور دولت مندوں اور خوش حال ہوس پرستوں میں مذہب کے بارے میں پایا جاتا ہے اور بڑی حد تک رائج ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ مذہب تو صرف فقراء و مساکین کے ہی کام کا ہے اور یہ دونوں (غریب اور مذہب) ایک دوسرے کے کام کے ہیں اور ہم تو بالاسطح کے لوگ ہیں۔ لیکن قرآن پاک نے زیر تفسیر آیات میں اس طرزِ تفکر کا کفایت کنندہ جواب دیا ہے۔

رہی پانچویں شانِ نزول کے بارے میں جو سطور بالا میں بیان ہوئی ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں اگرچہ طبری نے مجمع البیان میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر قرطبی میں بھی اکثر مفسرین اس شانِ نزول کو نقل کیا ہے لیکن یہ دو لحاظ سے بعید معلوم ہوتی ہے۔

ایک تو یہ کہ "الذین کفروا" کا مجملہ مطلق صورت میں عام طور پر مشرکین کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ اہل کتاب یہود اور نصاریٰ کے لیے۔

دوسرے یہ کہ یہودیوں میں "عبداللہ بن سلام" کا مقام و مرتبہ اور عزت و حیثیت کوئی معمولی نہیں تھی کہ وہ ان کے بارے میں یہ کہتے کہ اگر اسلام اچھا دین ہوتا تو وہ اور اس کے ساتھی ہم پر سبقت نہ لے جاتے۔

تفسیر کامیابی کی دو شرطیں

یہ آیات بھی حسب سابق کفار کے اعمال و گفتار اور ان گمراہی کو زیر بحث لاکر ان کی نیکو ہمش کر رہی ہیں۔ پہلے تو ان کی غرور آمیز اور کسی منطقی سے عاری گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور کافر لوگوں نے جو بول کے بارے میں کہتا ہے کہ اگر ایمان اور اسلام کوئی اچھی چیز ہوتے تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے ہرگز سبقت حاصل نہ کرتے (وقال الذین کفروا للذین آمنوا لو کان خیرا مما سبقونا لآئد)۔ لہٰذا یہ مٹھی بھر لوگ یا تو فقیر و بے بضاعت ہیں یا پھر دیہاتی، غلام اور اُجڑ اور یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ وہ حق کو سمجھ جائیں اور اس کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ہم جو کہ اس معاشرے کے چشم و چراغ ہیں اس بات سے غافل اور بے خبر رہ جائیں۔

لیکن وہ اس بات سے غافل تھے کہ عیب تو دراصل خود انہیں میں پایا جاتا ہے نہ کہ دین اسلام میں۔ اگر ان کے دلوں پر تکبر اور غرور کے پردے نہ پڑے ہوتے، اگر وہ مال و دولت، جاہ و منزلت، مقام و منصب اور شہوات و خواہشات میں مست اور مگن نہ ہوتے، اگر خود پسندی اور خود نمائی انہیں تحقیق حق کی اجازت دیتی اور غریبوں کی طرح وہ بھی صاف دل حق خواہ حق طلب ہوتے تو یقیناً وہ بھی بہت جلد اسلام کے حلقہ بردار مان ہو جاتے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں اس لطیف پیرائے میں انہیں جواب دیا گیا ہے: چونکہ وہ خود قرآن کے ذریعے ہدایت نہیں پاتے تو بڑی جلدی کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ایک پرانا جھوٹ ہے (واذلم یعتدوا ما بہ فسیقولون ہذا افک قدیم)۔ لہٰذا

لہ "الذین آمنوا" میں "لام" کا کیا معنی ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ لیکن سب سے مناسب یہی قول ہے کہ "لام" یہاں "فی" کے معنی میں ہے۔ اسی لیے آیت کے اس جملے کا معنی یوں ہوگا: "کفار نے مومنین کے بارے میں یوں کہا: اور "سبقونا" میں فعل کے غائب ہونے کی وجہ سے بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، جبکہ بعض نے اسے "لام تعلیل" سمجھا ہے اور بعض کے نزدیک "الذین آمنوا" یہاں پر مخاطب ہیں اور "سبقونا" کا جملہ "سبقتمون" کے معنی میں ہے۔

لہ اس آیت میں "اذ" ظرفیت کے لیے ہے اور بعض مفسرین اسے "فسیقولون" سے متعلق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "فا" وجود مانع نہیں ہے، جبکہ بعض دیگر مفسرین جیسے زبیری، تفسیر کشاف میں اس بات کے مستند ہیں کہ اس کے بعد کا فعل ماضی ہے اور "فسیقولون" فعل مضارع ہے۔ لہٰذا یہ اس کا متعلق نہیں بن سکتا، بلکہ کسی مزدت سے متعلق ہے، جس کی تقدیر یوں ہے:

(لغیہ حاشیہ صفحہ آئینہ)

یعنی انہوں نے خود قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کی ورنہ قرآن میں تو ہدایت کی قسم کی کمی نہیں ہے۔
 "افلک قدیم" کی تعبیر اس تہمت کے مانند ہے جو ان کی زبانی قرآنی آیات میں نقل ہوئی ہے کہ وہ کہتے تھے "اساطیر
 الاقلین" (گزشتہ لوگوں کے افسانے)۔ (فرقان ۵)

نیز "سیقولون" کی تعبیر فعل مضارع کی صورت میں، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ یہ تہمت قرآن پر لگاتے رہتے
 تھے اور اس تہمت کو اپنے ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ قرار دیتے تھے۔
 پھر ایک اور دلیل کو بیان کیا جا رہا ہے جو قرآن کی حقانیت کے ثبوت اور مشرکین کی اس تہمت کی نفی کے لیے ہے، جو وہ کہتے
 تھے کہ یہ ایک قدیمی جھوٹ ہے، ارشاد ہوتا ہے: اس عظیم کتاب کی صداقت کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے موسیٰ کی وہ کتاب
 خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو لوگوں کی پیشوا اور رحمت تھی اور اس نے اپنے بعد کے انبیاء کی اوصاف کو بیان کیا ہے، اور
 یہ قرآن بھی ایسی کتاب ہے جو تورات میں مذکور نشانیوں سے ہم آہنگ ہے۔ (ومن قبلہ کتاب موسیٰ امامًا
 ورحمۃ وھذا کتاب مصدق)۔

تو پھر تم یہ کیسے کہتے ہو کہ یہ ایک قدیمی جھوٹ ہے؟
 قرآن میں کئی بار اس بات کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے کہ قرآن تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔ یعنی ان نشانیوں سے
 ہم آہنگ ہے جو ان درآسمانی کتابوں میں پیغمبر اسلام اور ان کی آسمانی کتاب کے بارے میں بیان ہوئی ہیں اور یہ نشانیاں اس حد تک
 اپنے معیار پر پوری اتری ہیں کہ قرآن نے بھی (البقرہ / ۱۳۶ میں) ارشاد فرمایا ہے۔

"الذین اتیناھم الكتاب یحرفونہ کما یحرفون ابناءھم۔"

"اہل کتاب اسے اس حد تک بخوبی پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔"

زیر تفسیر آیت سے ملتی جلتی ایک اور آیت ہے جو سورہ ہود میں ہے۔

"افمن کان علیٰ بیئۃ من ربہ ویتلوہ شاھد منہ ومن قبلہ کتاب

موسیٰ امامًا ورحمۃ اولئک یؤمنون بہ۔"

"ایسا جو شخص اپنے پروردگار کی واضح دلیل رکھتا ہو اور اس کے پیچھے پیچھے اس کی طرف سے ایک

گواہ بھی آئے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب جو پیشوا اور رحمت ہے، اس پر گواہی دے رہی

ہو وہ ایسے شخص کے مانند ہو سکتا ہے جو اس طرح کانہ ہو؟

(ہود/۱۴)

(بقیہ حاشیہ ۳۳ کا)

وَاذَلِمَ یَہتدوا بَد ظہر عنادہم؟

لیکن پیلا احتمال آیت کے معنی سے بہت ہم آہنگ ہے۔

”امنا اور حمد“ کی تعبیر ممکن ہے اس لیے ہو کہ امام اور پیشوا کے ذکر کے بعد کبھی کبھار ذہن میں فرض کی بجائے آدمی کا مسئلہ تکلیف دہ اور مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن ”رحمت“ کا ذکر اس تصور کی اصلاح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس امام کی امامت کے ساتھ رحمت بھی ہے، حتیٰ کہ اگر اس امام نے کسی فریضے کی بجائے آدمی کا حکم بھی دیا ہے تو بھی رحمت ہے اور نفوس کی تربیت سے بڑھ کر اور کیا رحمت ہو سکتی ہے؟

اس کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے ”یہ اس حالت میں ہے کہ یہ آسمانی کتاب فصیح اور واضح عربی زبان میں ہے“ جس سے تمام لوگ بہرہ درہوتے ہیں۔ (لساناً عربیاً)۔

آیت کے آخر میں نزول قرآن کے آخری مقصد کو دو مختصر سے جملوں میں اس طرح واضح کرتا ہے: مقصد یہ ہے کہ ظالموں کو ڈرائے اور نیکو کاروں کو خوشخبری دے (لینذرا الذین ظلموا ولبشری للمحسنین)۔

چونکہ ”ینذر“ فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، لہذا اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ قرآن کا ڈرانا بھی اسکی بشارت و خوشخبری کے مانند دائمی اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ تاریخ کے ہر دور اسے میں ظالموں اور ستم کاروں کو ڈرانا چسلا آ رہا ہے اور نیک لوگوں کو خوشخبری سناتا آ رہا ہے۔

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ”ظالموں“ کے مقابل ”نیکو کاروں“ کو قرار دیا ہے، کیونکہ یہاں ”ظلم“ کے وسیع معنی مراد ہیں جو ہر قسم کی بُرائی اور خلاف کاری پر محیط ہیں اور ظاہر ہے کہ دوسروں پر ظلم اور اپنے نفس پر ظلم اس میں داخل ہیں۔ بعد کی آیت ”حسین“ (نیکو کاروں) کی تفسیر ہے جو گزشتہ آیت میں مذکور ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم ہے تو نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (ان الذین قالوا ربنا اللہ شتم استقاموا فلا خوف علیہم ولا هم یحزنون)۔

درحقیقت ایمان کے تمام مراتب اور ہر قسم کے اعمال صالحہ ان دو جملوں میں یکجا بیان ہوئے ہیں کیونکہ ”توحید“ تمام صحیح عقائد کی بنیاد ہے تمام اصول عقائد کا مرجع توحید ہے۔ اور ”استقامت“ و صبر و شکیبائی تمام اعمال صالح کی بنیاد ہے، کیونکہ تمام اعمال کا خلاصہ ان تین قسم کے صبر میں ہے: اطاعت پر صبر، معصیت پر صبر اور مصیبت پر صبر۔

بنابری ”حسین“ وہ لوگ ہیں جو اعتقادی لحاظ سے ”توحید“ کے راستے پر اور عملی لحاظ سے ”صبر و استقامت“ کی بنیادوں پر قائم ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے افراد کو نہ تو آئندہ کے حوادث کا ڈر ہے اور نہ ہی وہ گزشتہ سے خائف ہیں۔

اس سے ملتا جلتا مفہوم سورہ حم سجدہ کی ۳۰ ویں آیت میں زیادہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ وہ یوں کہ:

”ان الذین قالوا ربنا اللہ شتم استقاموا متزل علیہم الملائکة الاتخافوا ولا تحزنوا والبشروا بالجنة الستی کنتم توعدون“

لہ ”الذین قالوا ربنا اللہ“ بتکرار ہے اور ”لا خوف علیہم“ اس کی تفسیر ”البتہ“ ”فا“ خبر پر نہیں آتی سوائے ان مواقع کے کہ جہاں شرط کا مفہوم پایا جاتا ہے، جیسا کہ اسی آیت میں ہے۔

اس آیت میں دو اصنافی چیزوں کا تذکرہ ہے: ایک تو یہ کہ انہیں فرشتوں کی طرف سے یہ خوشخبری دی جاتی ہے کہ ان پر نہ تو کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی حُزن، جبکہ زیر تفسیر آیت اس بارے میں خاموش ہے اور دوسرے یہ کہ خوف و حزن کی نفی کے ساتھ ساتھ انہیں بہشت موعود کی بھی خوشخبری دی گئی ہے، جبکہ زیر تفسیر آیت میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں، بلکہ اس کے بعد کی آیت میں اس قسم کا اشارہ ملتا ہے۔

بہر صورت یہ دونوں آیات ایک ہی مطلب کو بیان کر رہی ہیں ایک میں اجمال ہے اور دوسری میں تفصیل۔
 علی بن ابراہیم کی تفسیر میں "ان الذین قالوا ربنا اللہ شہداستقاموا" کے جملہ کی تفسیر میں یوں کہا گیا ہے کہ استقاموا علی ولایۃ علی امیر المؤمنین یعنی استقامت سے مراد علیؑ ابن ابی طالب کی ولایت پر استقامت ہے۔
 اس کی وجہ یہ ہے کہ علم و عمل اور عدالت و تقویٰ اپنانے میں امیر المؤمنین علیؑ سلام کی پیروی خاص کرتا ایک اور ظلماتی دور میں نہایت ہی مشکل کام ہوتا ہے جو استقامت و پابنداری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اسی لیے یہ زیر تفسیر آیت میں اس کے روشن مصداقوں میں سے ایک ہے نہ یہ کہ آیت کا مفہوم منحصر اسی میں ہے۔ جہاد اور اطاعت پروردگار میں صبر نیز خواہشات نفسانی اور شیطان کی چالوں کے مقابلے میں ہر طرح کی پابنداری اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

"استقامت" کے سلسلے میں سورہ طہ سجدہ کی تیسویں آیت کی تفسیر میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

(ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۲۰)

اسی سلسلے کی آخری آیت میں توحید پرست نیکو کاروں کو اہم ترین بشارت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: وہی تو اول جنّت ہیں کہ جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (اولئک اصحاب الجنۃ خالدین فیہا)۔
 یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ انجام دیتے رہے (جزاء بما کانوا یعملون)۔
 جیسا کہ بعض مفسرین نے نتیجہ نکالا ہے کہ آیت کا ظاہری معنی حصہ کا مفہوم بتا رہا ہے یعنی صرف اول بہشت ہیں جو توحید اور استقامت کی راہوں پر گامزن ہیں۔ فطری امر ہے کہ دوسرے لوگ جو گناہوں سے آلودہ ہیں اگرچہ اپنے ایمان کی بدولت انجام کار بہشت میں جائیں گے، لیکن ابتدائی طور پر اصحاب الجنۃ نہیں ہیں۔

"اصحاب" (ساتھی) کی تعبیر بہشتی نعمتوں سے ان کی ہمیشہ کی ہم نشینی کی طرف اشارہ ہے۔
 "جزاء بما کانوا یعملون" کی تعبیر ایک طرف تو اس بات کی دلیل ہے کہ بہشت قیمت کے بدلے میں ملتی ہے، جیلوں پہانوں سے نہیں اور دوسری طرف اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصولی طور پر انسان آزاد اور خود مختار ہے۔

۱۵- وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ○

۱۶- أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعَدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ○

ترجمہ

۱۵- اور ہم نے انسان کو نصیحت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں تکلیف کی حالت میں اسے پیٹ میں رکھتی ہے اور تکلیف ہی سے اسے جنم دیتی ہے، اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کی دودھ بڑھانی کی مدت تیس مہینے ہوتے ہیں یہاں تک کہ جب اپنی پوری جوانی کو اور کمال قدرت کو پہنچتا ہے اور چالیس برس کے سن میں داخل ہوتا ہے تو کہتا ہے خداوند! تو مجھے توفیق عطا فرما کہ تو نے جو احسانات مجھ

پر اور میرے والدین پر کیے ہیں ان کا شکر بجا لاؤں اور ایسا نیک کام کروں جسے تو پسند کرے اور میری اولاد کو صالح بنا، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں اور میں یقیناً فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

۱۶۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کے بہترین اعمال ہم قبول کرتے ہیں اور ان کے گناہوں سے درگزر کرتے ہیں اور ان کا مقام اہل بہشت میں ہے۔ اُن سے کیا جانے والا یہ وعدہ سچا ہے۔

تفسیر

اے انسان اپنے والدین سے نیکی کر:

یہ اور بعد کی آیات درحقیقت وہ وضاحت ہے جس کا گزشتہ آیات میں ”ظالموں“ اور ”محسنین“ کے بارے میں اجمالاً طور پر تذکرہ ہو چکا ہے۔

سب سے پہلے نیکو کاروں کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے اور ان کی زحمات کا شکریہ ادا کرنے سے بات شروع کی گئی ہے جو شکر پروردگار کا مقدمہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ سے نیکی کرے۔ (ووصینا الانسان بوالدیه احساناً)۔ لہٰذا

”وصیت“ اور ”توصیہ“ مطلق سفارش کے معنی میں ہے اور اس کا مفہوم مرنے کے بعد کے امور میں منحصر نہیں ہے لہٰذا کچھ لوگوں نے بیان پر اس کی اہمیت اور فرمان کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

لہٰذا توصیہ، عام طور پر درمغولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ البتہ درمغول یا تو ”بأ“ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے یا ”الی“ کے ساتھ، ناربریں مندرجہ بالا عبارت میں ”احساناً“ کا کلمہ درمغول واقع نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ کہ ”وصینا کو“ الزمنا کے معنی میں لیا جائے، جو درمغولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور حرف جارہ کو بھی نہیں چاہتا۔ یا پھر آیت کے لیے کوئی مندرجہ نامیں، اور کہیں کہ اصل میں یوں ہے۔ ”وصینا الانسان بان یحسن بوالدیه احساناً“ تو ایسی صورت میں ”احساناً“ فعل مندرجہ کا مغول مطلق ہے۔

پھر ماں کے حقوق کی اولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس کی ماں تکلیف کی حالت میں اسے پیٹ میں رکھتی ہے اور تکلیف ہی سے اسے جنم دیتی ہے اور اس کا پیٹ میں رہنا اور اس کی دودھ بڑھانی کی مدت تیس مہینے ہے۔ (حملتہ امہ کرہا ووضعتہ کرہا و حملہ و فصالہ مثلثون شہرا)۔

اس تیس مہینے کی مدت میں ماں اپنے بچے کے بارے میں بہت بڑی فداکاری اور ایثار کا مظاہرہ کرتی ہے۔ انعقاد نطفہ کے پہلے ہی دن ماں کی حالت تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے اور اس کے لیے مسلسل تکلیف کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اروسے کی حالت (WAITING OF PREGNANCY) جو ماں کے سخت ترین حالات میں سے ایک ہے ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے اس حالت کے بارے میں ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ: یہ حالت ماں کے جسم میں اس غذائی قلت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو وہ اپنے بچے کے لیے ایثار کرتی ہے۔

جین پیٹ میں موجود بچہ جس قدر نشوونما پاتا رہتا ہے اسی قدر زیادہ سے زیادہ ماں کے جسم سے مواد حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ یہ مواد اُس کی ہڈیوں اور اعصاب پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ بسا اوقات یہ بچہ ماں کی نیند، خوراک اور آرام و آسائش تک کو سلب کر لیتا ہے اور حمل کے آخری دنوں میں تو ماں کے لیے قدم اٹھانا، اور نشست برخواست بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ماں کا جگر ہوتا ہے کہ وہ ان تمام مصائب و مشکلات کو بڑے حوصلے اور اس محبت اور امید کے ساتھ برداشت کرتی ہے کہ بہت جلد اس کا بچہ دنیا میں آٹھ کھولے گا اور اس کے سامنے مسکرائے گا۔

وضع حمل — جو ماں کی زندگی کے سخت ترین لمحات میں ایک ہے، گزرا نہ سہرا پر آ جاتا ہے اور یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ بعض اوقات اولاد کے لیے ماں کو اپنی جان کی بازی لگانا پڑتی ہے۔

بہر حال ایک سنگین زمانہ تو گزر جاتا ہے اور ایک دوسرا سنگین دورانیہ شروع ہو جاتا ہے: بچہ کی رات دن کی دیکھ بھال کا دورانیہ کہ جس میں ایسے بچے کی تمام ضروریات پوری کرنا ہوتی ہیں جو اپنی ضروریات کو بیان کرنے کی بھی قدرت نہیں رکھتا۔

اگر اسے کوئی درد ہوتا ہے تو وہ اس کی جگہ تک نہیں بنا سکتا، اگر اسے بھوک یا پیاس اور سردی یا گرمی کی کوئی تکلیف ہوتی ہے تو وہ اسے بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، سوائے اس کے کہ وہ رونا شروع کر دے اور ماں کو صحیح اندازہ کر کے صبر اور حوصلے کے ساتھ اس کی ایک ایک ضرورت کا مداوا کرنا پڑتا ہے۔

بچے کی صحت و صفائی اس دوران ایک طاقت فرسا مشکل ہوتی ہے، اسے غذا دینا بھی بہت بڑا ایثار ہے جو ماں ہی کے جسم سے حاصل ہوتی ہے۔

اس دوران بچے کو جو مختلف بیماریاں لاحق ہوتی ہیں وہ ایک اور مشکل ہیں جن کا مقابلہ ماں بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ کرتی ہے۔

قرآن مجید نے یہاں صرف ماں کی مشکلات کو بیان کیا ہے اور باپ کا تذکرہ نہیں کیا، اس لیے نہیں کہ باپ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی، کیونکہ ان میں سے بہت سی مشکلات میں باپ بھی ماں کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ماں کا حصہ زیادہ ہوتا ہے لہذا ماں کے تذکرے کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورہ یقرہ کی ۲۳۲ ویں آیت میں رضاعت (دودھ پلانے) کی مدت پورے دو سال ذکر کی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

”ولوالات یرضعن اولادھنّ حولین کاملین لمن اراد ان یتّم الرضاعة“

”مائیں اپنے بچوں کو دو سال مکمل دودھ پلاتی ہیں جو دودھ پلانے کے عرصے کو مکمل کرنا چاہیں“

جب کہ زیر تفسیر آیت میں ”حمل اور رضاعت“ کی مجموعی مدت صرف تیس ماہ بیان ہوئی ہے، تو کیا حمل کا دوران چھ ماہ ہو سکتا ہے؟

فقہاء اور مفسرین نے اسلامی روایات کی روشنی میں جواب دیا ہے کہ: جی ہاں! حمل کی کم از کم مدت ۶ ماہ اور مفید رضاعت کا زیادہ سے زیادہ عرصہ ۲۴ ماہ ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ ”جالینوس“ اور ابن سینا جیسے قدیم اطباء سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ چیز دیکھی ہے کہ بچہ چھ ماہ کی مدت حمل کے بعد بھی پیدا ہوا ہے۔

حتیٰ طور پر قرآنی تعبیر سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ حمل کی مدت سے جس قدر عرصہ کم کیا جائے گا بچے کی رضاعت میں اسی قدر اس کا اضافہ کیا جائے گا تاکہ دونوں عرصہ مل کر تیس ماہ بن جائیں۔ ابن عباس سے بھی یہی بات نقل کی گئی ہے کہ اگر عورت کے حمل کی مدت نو ماہ ہو تو اسے اپنے بچے کو اکیس ماہ دودھ پلانا چاہیے اور اگر چھ ماہ ہو تو چوبیس مہینے۔

تانون فطرت بھی اسی بات کا متقاضی ہے۔ کیونکہ دوران حمل کی کمی کی تلافی رضاعت کی مدت کے دوران کی جانا چاہیے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے: انسانی زندگی اسی طرح جاری اور ساری رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ زمانہ پہنچ جاتا ہے جس میں وہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس برس کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے (حتیٰ اذا بلغ اشده و بلغ اربعین سنۃ)۔ لہ

لہ ”حتیٰ“ یہاں پر ایک مفرد جملے کے لیے غایت کے طور پر ہے جس کی تقدیر صورت یوں ہے۔

وعاش الانسان واستمرت حیاتہ حتیٰ اذا بلغ اشده“

بعض مفسرین اسے ”وصینا“ کی غایت یا ”ماں باپ کی اپنے بچے کی نگرانی“ کی غایت سمجھتے ہیں اور یہ دونوں احتمالات بعید معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ

مذراں باپ کے ساتھ نیکی کے بارے میں حکم الہی چالیس سال تک ختم ہو جاتا ہے اور نہ ہی بچے کے لیے والدین کی دیکھ بھال چالیس سال تک قائم رہتی ہے۔

بعض مفسرین "بلوغ اشد" (انتہائی مرحلے تک پہنچ جانے) کو چالیس سال کے عرصے تک پہنچ جانے سے ہم آہنگ اور اس کی تاکید سمجھتے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ "بلوغ اشد" اشارہ ہے جسمانی طور پر بالغ ہونے کی طرف اور "بلوغ اربعین سنہ" (چالیس سال تک پہنچ جانا، فکری اور عقلی طور پر بلوغ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ مشہور ہے کہ انسان عام طور پر چالیس سال کے سن میں عقل کے کامل ہونے کے مرحلے کو پہنچ جاتا ہے اور یہی کہا گیا ہے کہ اکثر و بیشتر انبیاء چالیس برس کے سن میں نبوت پر مجتوب ہوئے۔

منمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ جسمانی لحاظ سے قدرت و طاقت تک پہنچنے کا سن بلوغ کونسا ہے؟ اس بارے میں بھی مفسرین کی مختلف آرا ہیں۔ بعض لوگ تو بلوغ کا وہی مشہور سن جانتے ہیں جو سورہ بنی اسرائیل کی ۲۴ ویں آیت میں مذکور ہوا ہے۔ تیمیوں کے بارے میں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جب کہ بعض روایات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ یہ سن اٹھارہ سال کا ہے۔

البتہ اس بارے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ تعبیر مختلف مقامات پر مختلف معانی دے جو قرینے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ:

"ان الشيطان يجريده على وجه من زاد على الاربعين ولم يتب، و يقول يابى وجه لا يفلح"

شیطان اپنا ہاتھ ان لوگوں کے چہرے پر پھیرتا ہے جو چالیس سال کی عمر کو تو پہنچ جاتے ہیں لیکن گناہوں سے توبہ نہیں کرتے اور کہتا ہے میرا باپ قربان جائے اس چہرے پر جو کبھی کامیاب نہیں ہوگا (اور اس انسان کی پیشانی پر کامیابی کا نور نہیں چمک رہا۔)

ابن عباس سے منقول ہے:

"من اتى عليه الاربعون سنة فلم يغلب خيره وشده فليتهجز الى النار"

"جس شخص پر چالیس سال گزر جائیں اور اس کی نیکی اس کی بُرائی پر غالب نہ آئے اسے جہنم کے لیے آمادہ ہونا چاہیے"

بہر حال قرآن مجید سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ جب یہ لائق اور باایمان شخص چالیس سال کے سن کو پہنچتا ہے تو خدا سے تین چیزوں کی درخواست کرتا ہے: سب سے پہلے تو کہتا ہے۔

خدا وذا! مجھے ہدایت عطا فرما اور توفیق دے کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں۔ (قال رب اوزعنى ان اشكر نعمتك التى انعمت على وعلى والدى)۔

اسن سے پتہ چلتا ہے کہ باایمان شخص ایسے سن و سال میں ایک تو خدا کی عطا کردہ نعمتوں کی گہرائی اور گہرائی سے

آگاہ ہو جاتا ہے اور دوسرے اپنے والدین کی ان خدمات سے اچھی طرح باخبر ہو جاتا ہے جو وہ اس عرصے تک بجالاتے ہیں اور وہ اس عمر کو پہنچا ہے، کیونکہ ایسے سن و سال میں انسان عام طور پر خود بھی صاحب اولاد ہو جاتا ہے اور اپنے والدین کی طاقت فرسا تکالیف اور ایثار پر مبنی خدمات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور بے اختیار انہیں یاد کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ اپنی دوسری درخواست میں رب العزت کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے۔ "خداوند! مجھے توفیق عطا فرما کہ نیک اعمال بجالاتا رہوں ایسے اعمال جن سے تورا ضی ہو" (وان عمل صالحات رضاه)۔

آخر میں تیسری درخواست ان الفاظ میں پیش کرتا ہے: خداوند! میری اولاد اور میرے خاندان کو اصلاح کے راستے پر دوام عطا فرما۔ (واصلح لی فی ذریعتی)۔

"لی" (میرے لیے) کی تعبیر ضمنی طور پر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میری اولاد کی نیکی اور بہتری اس انداز میں ہو کہ اس کے نتائج مجھے بھی ملیں۔

"فی ذریعتی" (میری اولاد میں) کی تعبیر مطلق صورت میں بیان ہوتی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نیکی اور بہتری کی پہنچگی اس کے تمام خاندان میں ہو۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلی دعائیں والدین کو شریک کرتا ہے، تیسری میں اولاد کو، لیکن دوسری دعائیں اپنے آپ کو اور صالح انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے کہ اگر ایک آنکھ کے ساتھ خود کو دیکھتا ہے تو دوسری کے ساتھ ان لوگوں کو دیکھتا ہے جو اس پر حق رکھتے ہیں۔

اور آیت کے آخر میں ان دو مطالب کو بیان کر رہا ہے جو ایک دوسرے کے لیے مؤخر اور عملی امور ہیں۔ کہتا ہے: پروردگارا! میں اس عمر میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ (افی تبت الیك)۔

میں ایسے مرحلہ پر پہنچ چکا ہوں کہ جس میں میری زندگی کے خطوط کو متعین ہونا چاہیے اور آخر العمر تک مجھے اسی طرح برقرار رہنا چاہیے جی ہاں! میں پالیس سال تک پہنچ چکا ہوں اور میرے جیسے بندے کے لیے کتنی بُری بات ہے کہ تیری طرف رجوع نہ کروں اور اب توبہ سے اپنے تئیں گناہوں سے پاک نہ کروں۔

اور یہ بھی کہتا ہے کہ: میں یقیناً فرما نبرداریوں میں ہوں (وانی من المسلمین)۔ درحقیقت یہ دونوں جملے ان تین دعاؤں کی پشت پناہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ملا کر ان سب کا مفہوم یوں بنتا ہے کہ: جب میں نے توبہ کر لی ہے اور تیرے حکم کے سامنے غیر مشروط طور پر جھک گیا ہوں تو تو بھی بزرگواری فرما اور ان نعمتوں سے مجھے سرفراز فرما۔

بعد کی آیت میں اس مومن، شکر گزار، صالح العمل اور توبہ کرنے والے گروہ کے اجر اور جزا کا واضح ذکر ہے۔ اس میں تین اہم جزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: یہی تو وہ لوگ ہیں، جن کے بہترین اعمال ہم قبول فرمائیں گے (اولئک الذین نقبل عنہم احسن ما عملوا)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا خوش خبری ہو سکتی ہے کہ خداوند بزرگ وقادر و منان ایک کمزور اور ناچیز بندے کے اعمال قبول فرمائے جو دوسرے اعزازات کے علاوہ بذات خود ایک عظیم اعزاز اور بلند مرتبہ اور روحانی نعمت ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خداوند عالم تمام نیک اعمال کو قبول فرماتا ہے تو پھر کیوں کہتا ہے کہ "ان کے بہترین اعمال قبول کریں گے"۔

اس سوال کا جواب کچھ مفسرین نے یوں دیا ہے کہ بہترین اعمال سے مراد واجبات اور مستحبات ہیں جو مباحات کے مقابلے میں ہیں اگرچہ وہ نیک اعمال تو ہیں لیکن ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ مقبول بھی قرار پائیں اور ان کے ساتھ اجر اور ثواب کا تعلق ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ خداوند عالم ان کے بہترین اعمال کو قبولیت کا معیار قرار دیتا ہے حتیٰ کہ دوسرے دے اور کم اہمیت کے اعمال کو بھی اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم سے پہلے درجے کے اعمال میں شمار کرتا ہے اور یہ بالکل ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی خریدار بیچنے والے کی طرف سے مختلف اجناس کو اپنے فضل و کرم سے اعلیٰ جنس کے حساب سے خریدے اور خداوند عالم کے فضل اور اس کے لطف و کرم کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جاتے عجیب نہیں ہے۔

خدا کی دوسری مہربانی ان کے گناہوں سے صرف نظر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: ہم ان کے گناہوں سے درگزر کریں گے۔ (۱) و سبحان و عن سینانہم۔

جبکہ ان کا مقام اہل بہشت میں ہے (فی اصحاب الجنة)۔
خدا کی تیسری مہربانی ان کے ساتھ یہ ہوگی کہ باوجود ان کی لغزشوں کے اللہ تعالیٰ انہیں پاک و صاف کر کے نیک اور پاک لوگوں میں نہیں جکڑے گا، جو مقربان بارگاہ رب العزت ہوں گے۔

ضمنی طور پر یہاں اس تعبیر سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ "اصحاب الجنة" سے یہاں مراد وہ مقربان بارگاہ ایزدی ہیں جن کے پاکیزہ دامن گناہ و مصیبت کے غبار سے کبھی آلودہ نہیں ہوتے اور تو بکرنے والے یہ ممکن مغفرت الہی کے بعد ان کے ساتھ ان کے زیر سایہ مقام پائیں گے۔

آیت کے آخر میں مذکورہ نعمتوں کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: یہ وہ سچا وعدہ ہے جو ان سے کیا جاتا ہے (وعد الصدق الذی کانوا یوعدون)۔

۱۔ مفسرین نے مجمع البیان میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور دوسرے مفسرین نے اسی آیت کے ذیل میں اسی طرح لکھا ہے۔

۲۔ "فی اصحاب الجنة" ایسے مزروف سے متعلق ہے جو "ہم" ضمیر کا حال واقع ہو رہا ہے اور اس کی تقدیری صورت یوں ہے "حال کونہم موجودین فی اصحاب الجنة"۔

۳۔ "وعد الصدق" ایک نفل مزروف کا مقول مطلق ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے۔ (بقیہ حاشیہ ص ۲۹۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

سچا وعدہ کیوں نہ ہو؟ جب کہ وعدہ غلامی یا تو کسی پشتیانی اور زادانی کی وجہ سے ہوتی ہے یا پھر کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے اور خداوند عالم ان سب سے منزہ و مبرا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ بہشتی انسان کی صفات: یہ آیات ایک ایسے بہشتی مؤمن کی تصویر کشی کر رہی ہیں جو پہلے تو اپنے جسمانی نشوونما پھر عقلی کمال کے مرحلے کو طے کرنے کے بعد پروردگار عالم کی نعمتوں کے شکرانے اور والدین کی طاقت فرسا تکالیف کا شکر یہ ادا کرنے کے مقابلے میں اپنی لغزشوں سے بر محل توبہ کرتا ہے، اولاد کی تربیت سمیت نیک اعمال کی بجا آوری کا اہتمام کرتا ہے اور آخر کار فرمان الہی کی تعمیل کے لیے اس کے آگے سر تسلیم خم کر کے دنیا و آخرت کی سربلندی حاصل کر لیتا ہے۔ یہی چیز اس بات کا باعث بن جاتی ہے کہ وہ خداوند عالم کی گونا گوں نعمتوں اور اس کی رحمت و مغفرت کے دریا میں ہمیشہ مستغرق رہے۔ ایک بہشتی انسان کو اپنی صفات سے پہچانا جا سکتا ہے۔

۲۔ ”وصینا الانسان“: ہم نے انسان کو حکم دیا کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی انسانی اصولوں میں سے ایک اصول ہے یہاں تک کہ جو لوگ کسی دین و مذہب کے بھی پابند نہیں ہیں وہ بھی فطری ہدایت کے ذریعے اسی اصول کی پابندی کرتے ہیں۔ بنا بریں جو لوگ اس عظیم فریضے کو ٹھوکر مارتے ہیں وہ نہ صرف صحیح معنوں میں مسلمان نہیں، بلکہ انہیں انسان کہنا بھی مناسب نہیں ہے۔

۳۔ ”احساناً“ کی تعبیر: اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس قسم کے مقامات پر نیکوہ کا استعمال کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حکم الہی کے تحت ماں باپ کی خدات کے بدلے میں عظیم اور جہتہ نیکی انجام دینی چاہیے۔

۴۔ اولاد کی پرورش میں ماں کی تکالیف کا تفصیلی ذکر ایک تو اس وجہ سے ہے کہ وہ تکالیف نہایت واضح اور نمایاں ہوتی ہیں اور دوسرے اس لیے کہ ماں کی تکالیف، باپ کی نسبت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی لیے اسلامی روایات میں بھی ماں کے بارے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت حاضر ہو کر عرض کی،

”من ابّ؟ قال املك! قال شمر من؟ قال املك! قال شمر من؟ قال املك!“

”قال شمر من؟ قال ابك!“

”یا رسول اللہ! کس شخص کے ساتھ نیکی کروں؟“

آپ نے ارشاد فرمایا:
اپنی ماں کے ساتھ!
پوچھا: پھر کس کے ساتھ؟
فرمایا:

ماں کے ساتھ!
پوچھا: پھر کس کے ساتھ؟
آپ نے فرمایا:
ماں کے ساتھ!

جب اس نے چوتھی بار سوال کیا تو آپ نے فرمایا:
اپنے باپ کے ساتھ۔ لہ

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص نے اپنی بوڑھی ماں کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے خانہ کعبہ کا طواف کروایا اور اسی اثنا میں رسالت مآب کی خدمت میں پہنچ کر آپ سے عرض کی۔

”هل ادیت حقها“

”حضور! کیا اس طرح سے میں نے اپنی والدہ کا حق ادا کر دیا ہے؟“

آپ نے ارشاد فرمایا۔

”لا، ولا بنفرة واحدة“

”ہرگز نہیں، تم نے تو ابھی ایک سانس کا حق بھی ادا نہیں کیا۔ لہ

۵۔ قرآنی آیات میں خاندانی رشتے، والدین کے احترام و اکرام اور اولاد کی تربیت کو زبردست اہمیت دی گئی ہے اور مذکورہ بالا آیات میں ان سب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ عظیم انسانی معاشرہ خاندان کی مختلف اور چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے تشکیل پاتا ہے، جس طرح ایک عظیم عمارت کئی چھوٹے بڑے کمروں سے اور کمرے مختلف پتھروں اور اینٹوں سے وجود میں آتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ ان چھوٹی اکائیوں میں باہمی وحدت اور استحکام جتنا زیادہ ہوگا اسی قدر معاشرے کی بنیادیں مستحکم تر ہوں گی۔ ہمارے صنعتی دور کے معاشرے کی تباہی کے اسباب میں سے ایک سبب خاندانی نظام کا بگاڑ ہے کیونکہ نہ تو اولاد اپنے والدین کا احترام کرتی ہے، نہ ہی والدین کو اپنی اولاد سے شفقت کا احساس ہے اور نہ ہی میاں بیوی کے مابین مہر و محبت کا حقیقی رابطہ ہے۔

آج کے صنعتی معاشرے میں بڑے بوڑھوں کے لیے جلاگانہ آرام گاہیں، جن میں ضعیف اور کمزور والدین قیام پذیر ہوتے ہیں، نہایت ہی دردناک مناظر پیش کرتی ہیں کیوں کہ ان قیام گاہوں میں ایسے لوگ اقامت گزیر ہوتے ہیں جو کسی کام کے نہیں رہتے اور خاندان والے انہیں وہیں چھوڑ آتے ہیں۔

وہ زن و مرد جو ایک طویل عرصہ معاشرے کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں اور اپنی اولاد کو معاشرے کی خدمت کے لیے وقف کر چکے ہوتے ہیں جب انہیں اپنی اولاد کی مہر و محبت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی امداد کے محتاج ہوتے ہیں تو انہیں بُری طرح دھتکار دیا جاتا ہے اور وہ وہیں پر موت کے انتظار میں اپنی زندگی کے باقی دن پُورے کرتے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ دروازے پر لگی رہتی ہیں کہ شاید کوئی واقف کاریاں پر آجاتے اور ایسا اتفاق سال بھر میں شاید ایک یا دو مرتبہ ہی ہوتا ہے کہ کوئی دوست یا واقف شخص بھولے سے وہاں چلا جاتا ہے۔

سچ سچ جب انسان اس قسم کی زندگی کا تصور کرتا ہے تو اسی وقت جینا اس کے لیے دو بھر ہو جاتا ہے اور صرف مادی اور ایمان و مذہب سے عاری "مذہب" دنیا کے راہ و رسم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

۶۔ "ان اعمل صالحا ترضالا" کا مفہوم: یہ جملہ اس حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ نیک اعمال ایسی چیز ہوتے ہیں جو خداوند عالم کی رضا اور خوشنودی کا موجب ہوتے اور "احسن ما عملوا" (بہترین کام جو انجام دیتے ہیں) کی تعبیر قرآن مجید کی متعدد آیات میں آچھی ہے اور یہ اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ خداوند عالم کا بے حساب فضل و کرم، بندوں کے اجر و ثواب کے موقع پر ان کے بہترین اعمال کو معیار قرار دیتا ہے اور سب اعمال اسی حساب سے قبول کرتا ہے۔

- ۱۷- وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ إِفِّ لَكُمْمَا اتَّعَدْنِيَّ أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِيَّ وَهُمَا يَسْتَكْبِرُونَ اللَّهُ وَيَلِكُ أَمِنٌ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَيَقُولُ مَا هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ○
- ۱۸- أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنَّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَسِرِينَ ○
- ۱۹- وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ مِمَّا عَمِلُوا وَلِيُوفيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○

ترجمہ

۱۷- اور جو شخص اپنے ماں باپ سے کہتا ہے کہ تم پر اُف! کیا تم مجھے وعدہ دیتے ہو کہ میں قیامت کے دن اٹھایا جاؤں گا؟ حالانکہ بہت سے لوگ مجھ سے پہلے گزر چکے اور ہرگز نہیں اٹھائے گئے، اور وہ دونوں ہمیشہ فریاد کرتے اور خدا سے مدد طلب کرتے رہتے ہیں کہ تجھ پر وائے ہو ایمان لے آ۔ کیونکہ خدا کا وعدہ ضرور سچا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ یہ تو بس اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

۱۸- یہ لوگ بھی جنوں اور انسانوں کی انہی (کافر) امتوں میں شامل ہیں جو ان سے پہلے گذر چکی ہیں اور جن کے بارے میں عذاب کا وعدہ پایا یہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے، کیونکہ یہ سب لوگ گھانا اٹھانے والے تھے۔

۱۹۔ اور لوگوں نے جیسے کام کیے ہوں گے انہی کے مطابق سب کے درجے ہوں گے تاکہ خدا انہیں ان کے اعمال بے کم و کاست سپرد کر دے اور ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر

والدین کے حقوق پائمال کرنے والے

گذشتہ آیات میں ان مومن لوگوں کا تذکرہ تھا جو ایمان، عمل صالح، حق کی نعمتوں کے شکرانے اور والدین اور اولاد کے حقوق کی ادائیگی کے ذریعے تقرب الہی کی راہوں پر گامزن ہوئے ہیں اور اس کے خاص لطف و کرم سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ لیکن زیر تفسیر آیات میں ان لوگوں کے باسے میں گفتگو ہو رہی ہے جو بالکل ان کے برعکس ہیں یعنی بے ایمان، حق ناشناس اور ماں باپ کے نافرمان لوگ۔ ارشاد ہوتا ہے:

اور جو شخص اپنے ماں باپ سے کہتا ہے: تم پر اُف! کیا تم مجھے وعید دیتے ہو کہ میں قیامت کے دن اُٹھایا جاؤں گا حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سے لوگ گزر چکے ہیں جو مر گئے، لیکن دوبارہ ہرگز نہیں اُٹھائے گئے۔ (والذی قال لوالدیہ اَف لکما اتعدا نئی ان اخرج وقد خلت القرون من قبلی)۔ لہ

لیکن والدین ایسے سر پھرے بیٹے کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ اور وہ دونوں ہمیشہ فریاد کرتے ہیں اور خدا سے مدد طلب کرتے ہیں کہ اسے بیٹا! تجھ پر افسوس ہے، ایمان لے آ، کیونکہ خدا کا وعدہ ضرور سچا ہے! (وہما یستخیان اللہ ویلک آمن ان وعد اللہ حق)۔

مگر وہ ہے کہ اسی طرح اپنی ہسٹ دھرمی پر قائم رہتا ہے اور اپنی سرکشی پر ڈٹا رہتا ہے۔ وہ تکبر اور بڑی بے پرواہی

لہ "والذی قال بتنا ہے اور بہت سے مفسرین کے مطابق "اولئک الذین اس کی خبر ہے جو بعد کی آیت میں آئی ہے۔ "مبتدا" کے مفرد اور "اولئک" کے جمع ہونے میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، کیونکہ اس سے جنس مراد ہے۔ لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اس کی خبر محذوف ہو، جس کی تقدیری صورت یوں ہو:

"وفی مقابل الذین مضی وصفہم الذی قال لوالدیہ"

تو ایسی صورت میں بعد کی آیت متقل ہے جس طرح کہ "اولئک الذین من قبل عنہم" مستقل ہے۔

سے کہتا ہے، یہ تو بس اگلے لوگوں کے افسانے ہیں، (فیقول ماہذا الا اساطیر الاولین)۔
یہ جو تم کہتے ہو کہ معاد و قیامت ہوگی اور حساب و کتاب ہوگا یہ سب خرافات ہیں اور گئے لوگوں کے قصے کہانیاں
ہیں، میں ان کے سامنے کبھی سر نہیں جھکاؤں گا۔

اس آیت میں اس گروہ کے بارے میں جو اوصاف معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں :
والدین کے حق میں بے احترامی اور بے ادبی، کیونکہ ”اُف“ ہر غلیظ اور آلودہ چیز کو کہتے ہیں اور توہین اور حقارت
کے اظہار کے موقع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہ

نیز بعض ارباب لغت کے نزدیک ”اُف“ کا معنی وہ گندگی اور میل کچیل ہے جو ناخن کے نیچے اکٹھی ہو جاتی ہے جو گندی
بھی ہوتی ہے اور حقیر بھی۔ لہ

دوسری یہ کہ وہ معاد اور روز قیامت پر ہی ایمان نہیں رکھتے، بلکہ اس کا مذاق بھی اڑاتے ہیں اور اسے افسانہ اور خرافاتی باتیں
سمجھتے ہیں۔

ان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ان کے پاس سننے والے کان نہیں ہیں۔ وہ حق کے سامنے سر نہیں جھکاتے بلکہ ان کی رُوح
غرور، جہالت اور خود غرضی سے لمٹ چکی ہوئی ہے۔

یقیناً دل سوز ماں باپ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے جہالت و نادانی کے گرداب سے نکال کر نجات کی راہوں
لگا دیں تاکہ یہ فرزند دل بند خدا کے دردناک عذاب میں گرفتار نہ ہو، لیکن وہ ہر سلسل اپنے کفر پر ڈٹا ہوا ہے اور اسی پر ٹھہرے
آخر کار ناچار وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں۔

جس طرح گزشتہ آیات میں صالح الاعمال توہین کی جزا کا تذکرہ تھا، اسی طرح یہاں پر گستاخ اور عقل کے اندھے کافروں
کا انجام مذکور ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، یہ لوگ جنوں اور انسانوں کی دوسری کافر امتیں جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں، ان ہی میں شامل
ہیں۔ ان پر بھی عذاب کا وعدہ پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے اور یہ بھی دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے اور یہ بھی جہنمی ہیں؛ (اولئک
الذین حق علیہم القول فی امم قد خلت من قبلہم من الجن والانس) ایہ
کیونکہ وہ سب لوگ گھانا اٹھانے والے تھے (انہم کانوا خاسرین)۔

لہ مفردات راعب۔

لہ ”اُف“ کے بارے میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۲۳ کے ذیل میں ایک اور بحث بھی موجود ہے۔ (دیکھئے تفسیر نمونہ جلد ۱۲)
لہ ”حق علیہم القول“ کا جملہ اس گفتگو کی طرف اشارہ ہے، جو خدا نے کافروں اور گناہگاروں کی نسا کے بارے میں فرمائی ہے اور

تقدیری طور پر یوں ہے۔

”حق علیہم القول بانہم اهل النار....“

اور ”فی امم حال واقع ہو رہا ہے۔“

اس سے بدتر گھانا اور کیا ہوگا کہ اپنا تمام سرمایہ حیات ضائع کر کے خدا کے غیظ و غضب کو خرید چکے ہیں۔
 ان دونوں بہشتی اور جہنمی گروہوں کے تقابل کی صورت میں، ان آیات سے ہمیں مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔
 ○ بہشتی افراد اپنی ہدایت اور ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہیں جبکہ اہل جہنم اپنا تمام سرمایہ لٹا کر خلدہ اٹھاتے ہیں۔
 ○ وہ حق شناس اور شکر گزار ہیں حتیٰ کہ اپنے والدین کے بھی، لیکن یہ حق ناشناس، گستاخ اور بے ادب ہیں حتیٰ کہ اپنے والدین کے بھی۔

○ وہ بہشت میں "مقرین الہی" کے ساتھ ہیں اور یہ دوزخ میں بے ایمان لوگوں کے زمرے میں گویا۔

○ وہ جب کسی لغزش کا شکار ہوتے ہیں تو فوراً توبہ کر کے حق کے آگے جھک جاتے ہیں لیکن یہ مغرور و سرکش اور خود بخود مست کبر ہوتے ہیں۔

○ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم ٹولہ اپنی بے راہ روی کو گزشتہ اقوام کی کیفیت کا آئینہ دار قرار دیتا ہے۔
 لہذا دوزخ میں بھی انہی کے ساتھ مشور ہوگا۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں پہلے تو ان دونوں گروہوں کے مختلف درجات اور مراتب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ان لوگوں نے جیسے کام کیے ہوں گے۔ انہی کے مطابق سب کے دبے ہوں گے۔ (ولکل درجات مما عملوا)۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ بہشتی یا جہنمی سب ایک ہی دبے پر فائز ہوں، بلکہ وہ بھی اپنے اعمال کے تفاوت، خلوص نیت کے تناسب اور معرفت کے میزان کے لحاظ سے مختلف مقام رکھتے ہیں اور صحیح معنوں میں عدالت ہمیں پر حکم فرما ہے۔

"درجات" "درجہ" کی جمع ہے جو عام طور پر اس زینے کو کہا جاتا ہے جس سے اُپر چڑھا جاتا ہے اور "درکات" "درک" (بروزن "مرگ") کی جمع ہے جو ان سیرٹیوں کو کہا جاتا ہے جن سے نیچے اترا جاتا ہے۔ لہذا بہشتیوں کے لیے "درجات" اور جہنمیوں کے لیے "درکات" کے کلمات استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن زیر تفسیر آیت میں دونوں کا یکجا تذکرہ ہوا ہے اور اہل بہشت کے مقام کی اہمیت کے پیش نظر دونوں کے لیے "درجات" کا لفظ آیا ہے اور اصطلاحی طور پر "غلبہ" کے باب سے ہے۔
 پھر فرمایا گیا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے "تاکہ خدا انہیں ان کے اعمال بے کم و کاست دے دے" (ولیسوفیہم اعمالہم)۔

لے "مما عملوا" میں "من" "نشویہ" ہے یا پھر تعلیل کے معنی میں ہے یعنی "من اجل ما عملوا"

لے "درک" (را کے سکون کے ساتھ) اور "درک" (را پر زبر کے ساتھ) انتہائی گہرائی کے معنی کے لیے آتے ہیں اور کبھی "درک" (زبر کے ساتھ) تقصان کے معنی میں اور "درک" (سکون کے ساتھ) چیز کے سمیٹنے اور ادراک کرنے کے معنی میں بھی آتے ہیں (درک

کسی چیز کی حقیقت اور گہرائی کی مناسبت سے)

یہ تعبیر ”تجسم اعمال“ کے مسئلے کی طرف ایک اور اشارہ ہے کہ وہاں پر انسان کے اعمال خود اسی کے ساتھ ہوں گے۔ اس کے نیک اعمال اس کے لیے رحمت اور اطمینان کا موجب بنیں گے اور بُرے عمل بلا، اضطراب، رنج اور غذاب کا سبب۔ آخر میں تاکید ہی طور پر فرمایا گیا ہے: اور ان پر کچھ ظلم نہیں کیا جائے گا (وہم لا یظلمون)۔ کیونکہ وہ اپنے ہی اعمال کو پالیں گے تو پھر ظلم و ستم کا تصور کیسا؟ اس کے علاوہ ان کے ”درجات“ اور ”درکات“ بھی اچھی طرح مقرر کیے جا چکے ہیں اور ان کا چھوٹے سے چھوٹا نیک یا بد عمل بھی ان کی سرنوشت کے لیے مؤثر ہوگا۔ تو پھر ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ آیت نبی امیہ کی طرف کیسے تحریف کی گئی؟

ایک روایت میں ہے کہ معاویہ نے اپنے مدینہ کے گورنر مروان کو خط لکھا کہ لوگوں سے اس کے بیٹے یزید کے لیے بیعت لے۔ عبدالرحمن بن ابی بکر بھی اسی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا ”معاویہ یہ کام ہر قتل اور کسری (دروم و ایران کے بادشاہوں) کے مانند انجام دینا چاہتا ہے کہ وہ بھی اپنے بیٹوں کو (خواہ وہ کتنا ہی نااہل اور بدکار بھتے) اپنا جانشین مقرر کرتے تھے۔

مروان نے منبر سے چلا کر کہا: خاموش رہو! تم تو وہی ہو جس کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔ ”والذی قال لوآلذیہ اذ لکما“

حضرت عائشہ بھی وہیں پر موجود تھیں۔ مروان کی طرف منہ کر کے بولیں: ”تم جھوٹ بکتے ہو، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اگر کہو تو تمہیں اس کے نام و نسب سے بھی آگاہ کر دوں! البتہ رسول اللہ نے تمہارے باپ پر اس وقت لعنت کی ہے جب تم ابھی اس کی پشت میں تھے، اس لیے تم رسول خدا کی لعنت کا نتیجہ ہو“ لے

جی ہاں! عبدالرحمن کا گناہ ایک تو یہ تھا کہ وہ امیر المومنین علیہ السلام سے محبت کیا کرتے تھے، جو بنی امیہ کے لیے سخت ناگوار بات تھی۔ دوسرے وہ خلافت کو موروثی بنانے اور اسے ملوکیت میں تبدیل کرنے کے سخت مخالف تھے اور یزید کے لیے بیعت طلبی کو قیصر و کسری کی پالیسی کا نام دیتے تھے۔ اسی لیے اسلام کے قسم خوردہ دشمنوں یعنی بنی امیہ کی طرف سے ان پر اس قسم کے شدید حملے کیے گئے اور ان کے بارے میں آیات قرآنی کے معانی کی تحریف کی گئی۔

لے ملاحظہ ہو تفسیر روح البیان ابوالفتح رازی جلد ۱۰ ص ۱۵۹۔ نیز قرطبی نے بھی اس روایت کو کچھ فرق کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

حضرت عائشہ نے مروان کو کیا خوب جواب دیا کہ "خدا نے تم پر اس وقت لعنت کی ہے جب تم ابھی پشت پدر میں تھے" اور یہ اشارہ ہے سورۃ نبی اسرائیل کی ۶۰ ویں آیت کی طرف جس میں کہا گیا ہے "والشجرة الملعونة فی القرآن" لہ

۲۰۔ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَدُّهُمُ طَيْبَتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ۝

ترجمہ

۲۰۔ جس دن کافر لوگ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا، تم تو اپنی دنیاوی زندگی میں مزے لوٹ چکے ہو اور اس سے بہرہ مند ہو چکے ہو، تو آج تمہیں ذلت بار عذاب سے سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم زمین میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔

تفسیر

زہد اور آخرت کا ذخیرہ :

کفار و مجرمین کی سزا کے بارے میں یہ آیت بھی گزشتہ آیات کے مانند اسی سلسلے کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کر رہی ہے اور ان کے جہانی اور روحانی عذاب کے چند گوشوں کو اجاگر کر رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

جس دن کافر لوگ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنی دنیاوی زندگی میں مزے لوٹ چکے ہو اور اس سے بہرہ مند ہو چکے ہو، تو آج تم کو ذلت بار عذاب سے سزا دی جائے گی اس لیے کہ تم زمین میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ (ویوم یعرض الذین

كفروا على النار اذ هبتم طيباتكم في حياتكم الدنيا واستمتعتم بها فاليوم تجزون عذاب الهون بما كنتم تستكبرون في الارض بغير الحق وبما كنتم تفسقون۔ لہ

جی ہاں! تم لذتوں میں غرق تھے اور اس دُنیا کی مادی نعمتوں سے بہرہ برداری کے علاوہ تم اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور مادر پدر آزادی کی بنا پر تم معاد کا انکار کرتے تھے تاکہ تمہارے ہاتھ بالکل کھلے رہیں اور دُنیاوی نعمتوں کے حصول میں تم دوسروں پر ہر طرح کا ظلم و ستم روا رکھتے تھے لہذا آج تم ان تمام ہوسرا نیوں، خواہشات پرستیوں، ظلم و تکبر اور فسق و فجور کی سزا پاؤ۔

چند اہم نکات

۱۔ کفار کا جہنم کو پیش کیا جانا؛ یہ آیت کہتی ہے کہ قیامت کے دن کفار جہنم کو پیش کیے جائیں گے اور اسی سے ملتی جلتی سورہ نمون کی ۴۶ ویں آیت ہے جو فرعون کے ساتھیوں کے بارے میں کہتی ہے:

”التار يعرضون عليهم غدواً وعشياً“

”ہر صبح و شام وہ جہنم کو پیش کیے جاتے ہیں۔“

جب کہ قرآن پاک کی بعض دوسری آیات میں ہے کہ جہنم ”کفار کو پیش کی جائے گی، جیسا کہ سورہ کہف کی آیت ۱۰۰ میں ہے:

”وعرضنا جهنم يومئذ للكافرين عرضاً“

”اس دن ہم جہنم کو کافروں کیلئے پیش کریں گے۔“

لہذا بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ پیشی دو طرح کی ہے ایک تو حساب و کتاب پہلے پیشی اس وقت جہنم کو کفار کے سامنے لایا جائے گا تاکہ اس طرح سے خوف ہراس ان کے تمام وجود میں سا جائے (جو بجاتے خود ایک رُو عانی عذاب ہے) اور دوسری حساب و کتاب اور انہیں جہنم کی طرف بھیجنے کے بعد کی پیشی تو اس وقت وہ خود عذاب جہنم کو پیش کیے جائیں گے۔ لہ

بعض مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ عبارت میں ایک طرح کا ”قلب“ پایا جاتا ہے اور کفار کو جہنم کے لیے پیش کرنے سے مراد وہی جہنم کو کفار کے لیے پیش کرنا ہے، کیونکہ آگ میں عقل و شعور تو پایا نہیں جاتا کہ اسے کفار کے لیے پیش کیا جائے

لہ ”یوم“ ظرف ہے اور ایک مخدوف نفل سے متعلق ہے جو بعد کے جملے سے سمجھا جاتا ہے اور تقدیری طور پر ٹول ہے:

”ويوم يعرض الذين كفروا على النار ليقال لهم اذ هبتم طيباتكم.....“

لہ تفسیر امیزان جلد ۱۸ ص ۲۲۳ انہی آیات کے ذیل میں۔

اور پیشی کا اطلاق ایسی صورت میں ہوتا ہے جب رد مقابل میں شعور پایا جاتا ہو۔
لیکن اس نظر سے یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ قرآن کی کچھ آیات میں جہنم کے لیے ایک طرح کے ادراک اور شعور کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کے اس سے باتیں کرنے کا ثبوت بھی پایا جاتا ہے۔

چنانچہ خدا اس سے پوچھے گا کہ :

”هل امتلأت“

”کیا تو بھر گئی ہے“

تو وہ جواب دے گی :

”هل من مزيد“

”آیا اور بھی کچھ ہے؟“

(ملاحظہ ہو سورہ ف/ ۲۰)

حق یہ ہے کہ پیش کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان موجود رکاوٹوں کو اس حد تک دور کیا جائے کہ ایک چیز دوسری چیز کے اختیار میں آجائے۔ کفار اور دوزخ کے بارے میں بھی یہی صورت حال ہے کہ ان دونوں کے درمیان موجود رکاوٹیں ہٹادی جائیں گی۔ لہذا ایسی صورت میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہیں آگ کے سامنے لایا جائے گا اور آگ کو ان کے سامنے لایا جائے گا۔ اور دونوں تعبیریں صحیح ہیں۔

اس صورت میں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ پیش کیے جانے کو جہنم میں داخل ہونے کے معنی میں لایا جائے جیسا کہ طبری نے مجمع البیان میں ذکر کیا ہے، بلکہ یہ پیشی بھی بذات خود دردناک اور ہولناک عذاب کی طرح ہے جو کہ جہنم میں داخل ہونے سے قبل اہل جہنم اس کے تمام حصوں کو باہر سے بچشم خود دیکھ لیں گے اور اپنے منحوس انجام کا مشاہدہ کر لیں گے اور دل ہی دل میں رنج اٹھائیں گے۔

۲۔ ”اذہبتم طیباتکم“ کا مفہوم : یہ جملہ دنیاوی لذتوں کے استفادے کے معنی میں ہے اور ”اذہبتم“ تم لے گئے کی تعبیر اس لیے ہے کہ یہ لذتیں اور نعمتیں استعمال کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔

یقیناً اس دنیا میں خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا کوئی بڑی بات نہیں ہے جو بات بڑی ہے وہ یہ ہے کہ انسان ان مادی لذتوں میں مگن ہو کر خدا اور قیامت کو فراموش کر دے یا گناہ آلود اور بے ہمار ہو کر ان لذتوں سے برہ برداری کی جائے اور دوسروں کے حقوق غضب کیے جائیں یہ سب کچھ اسی زمرے میں آجاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ تعبیر قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں دکھائی دیتی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی انسان دنیاوی لذتوں سے چشم پوشی کر لیتا ہے یا خدائی فرائض کی بجا آوری کے لیے توانائی حاصل کرنے کی حد تک ہی ان سے استفادہ کرتا ہے تو ایسی صورت میں گویا وہ ان ”طیبات“ کو اپنی آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیتا ہے۔

لیکن عام طور پر ہوتا ہے کہ چوپاؤں کے مانند بے ہمار ہو کر ان سے استفادہ کرتا ہے اور سب کو اسی دنیا ہی

میں ختم کر کے آخرت کی راہ لیتا ہے اور آخرت کے لیے کچھ بھی ذخیرہ نہیں کرتا بلکہ اُلٹا گناہوں کا بوجھ اپنے لیے فراہم کرتا ہے تو اس صورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی آیت کا اطلاق یوں ہوگا کہ ”اذہبت طیباتکم فی حیاتکم الدنیا“ لغت کی بعض کتابوں میں منقول ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے۔

”انفقت طیبات ما رزقتہ فی شہواتکم و فی ملاذ الدنیا ولم

تتفقوہا فی مرضات اللہ“

”تمہیں جو پاکیزہ و زرق عطا کیا گیا اسے تم نے اپنی خواہشات نفسانی کی راہوں میں خرچ کر ڈالا اور خدا

کی خوشنودی کے لیے اسے خرچ نہیں کیا۔“ (مجمع البحرین مادہ ”ذہب“)

۳۔ ”طیبات“ کا وسیع مفہوم: اس کا معنی وسیع ہے اور تمام دنیاوی نعمتوں پر محیط ہے۔ ہر چیز کہ بعض مفسرین نے اسے صرف جوانی کی توانائیوں کے معنی میں تفسیر کیا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ جوانی اس کا صرف ایک مصداق ہو سکتا ہے۔

۴۔ ”عذاب الہون“ (حقارت و توہین آمیز عذاب) رد عمل ہے ان کے زمین پر تنجیر کرنے کا، کیونکہ خدائی سزا گناہ کی نوعیت سے بالکل ہم آہنگ ہوتی ہے، جن لوگوں نے اللہ کی مخلوق ایسا تک کہ اس کے انبیاء کے سامنے عزور و تکبر کا مظاہرہ کیا اور کسی قانون کے سامنے نہ جھکے انہیں ایسا تحقیر آمیز اور رسوا کن عذاب دکھانا ہی چاہیے۔

۵۔ اہل جہنم کے دو گناہوں کا تذکرہ: آیت میں ان کے دو گناہوں کا ذکر ہے۔ ایک تو ”زمین میں غرور“ اور دوسرے ”فسق“ ممکن ہے کہ پہلا ان کے آیات الہی، بعثت انبیاء اور قیامت پر ایمان نہ لانے کی طرف اشارہ ہو اور دوسرا مختلف گناہوں کی طرف تو گویا ایک اصول دین کے ترک کرنے اور دوسرا فروع دین کے پائمال کرنے کی بات ہے۔

۶۔ ”غیر الحق“ کی تعبیر: یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ استکبار کی دو قسمیں ہیں ایک ”حق“ اور دوسری ”ناحق“ بلکہ اس قسم کی تعبیر عام طور پر تاکید کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اس کی مثالیں عام ہیں۔

۷۔ عظیم پیشواؤں کا زہد: حدیث اور تفسیر کے مختلف ذرائع میں اسلام کی عظیم ہستیوں کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں، جن کے ذریعے اسی آیت کے بارے میں استناد کیا گیا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ مشربہ ام ابراہیم (مدینہ کے نزدیک ایک مقام) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آنحضرتؐ کھجور کی ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور بدن مبارک کچھ حصہ زمین پر ہے اور کھجور کے بتوں کا ایک تکیہ سر کے نیچے ہے۔ یہ دیکھ کر آپؐ پر سلام کیا اور بیٹھ گئے عرض کرنے لگے:

”آپ اللہ کے رسول اور اس کی بہترین مخلوق ہیں قیصر و کسری تو غلامی تختوں اور لیشی بستروں پر سوئیں

اور آپ کی یہ حالت ہو؟

آنحضرتؐ نے فرمایا:

”اولئک قوم اجلت طیباتہم وہی وشیکۃ الانقطاع وانما آخرت

لنا طیباتنا“

”وہ ایسے لوگ ہیں کہ جن کے طیبات اسی دنیا میں دے دیئے گئے ہیں جو جلد ختم ہو جائیں گے۔

جبکہ ہمارے طیبات کو آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیا گیا ہے۔ لہ

ایک اور روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک دن خاص قسم کا طلوہ آنجناب کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے اسے نوش فرمانے سے انکار کر دیا۔ پوچھا گیا ”آیا آپ اسے حرام جانتے ہیں؟“ فرمایا نہیں۔

”ولکنی احتشی ان یتوق الیہ نفسی فاطلبہ، ثم تلا هذه الآية: اذہبتم

طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بہا“

”مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ میرا نفس اس کا مشتاق ہو جائے اور میں ہمیشہ اس

کی طلب میں لگ جاؤں۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اذہبتم طیباتکم..... لہ

ایک اور روایت میں ہے کہ:

ان امیر المؤمنین علیہ السلام اشتہی کبدًا مشویۃ علی خبز لینہ

فاقام حولاً لیشتهيها، ذکر ذلک للحسن وهو صائم یوماً من

الایام فضنعها لہ فلما اراد ان یفطر قربها الیہ، فوقف سائل

بالباب فقال: یا بنی! حملها الیہ لا تقرأ صحیفتنا عنداً اذہبتم

طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بہا“

”امیر المؤمنین علی علیہ السلام کا بھنی ہوئی کلجی کو نرم روٹی کے ساتھ کھانے کو جی چاہا اور اس خواہش

کو ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن امام حسین علیہ السلام سے اس خواہش کی تکمیل کا اظہار

فرمایا اور اس دن حضرت امیر روزے سے تھے۔ جب مذکورہ کھانا انظار کے وقت تیار

ہو گیا تو سائل نے آکر دروازے پر دستک دی، امیر المؤمنین نے حکم دیا یہ کھانا سائل کو دے

دیا جائے مبادا کل بروز قیامت جب ہمارا نامہ اعمال پڑھا جائے تو ہم سے کہیں ”اذہبتم

طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بہا۔ تم تو اپنی طیبات سے دنیا میں

بہرہ ور ہو چکے ہو اور ان سے لذت اٹھا چکے ہو۔ لہ

لہ صحیح البیان جلد ۹ صفحہ ۵۵۔

لہ تفسیر برہان جلد ۵ صفحہ ۵۵ اسی آیت کے ذیل میں۔

لہ سفینۃ البحار جلد ۲ مادہ ”کبد“

- ۲۱۔ وَادْكُرَّا خَاعًا إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَّتِ التُّدُرُ
مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمَنْ خَلْفَهُ إِلَّا نَعْبُدُ إِلَّا اللَّهَ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ○
- ۲۲۔ قَالُوا اجْمَعْنَا لِنُفِكَكَ عَنْ إِلٰهِنَا فَأَتَيْنَا بِمَا تَعَدْنَا إِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○
- ۲۳۔ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَأُبَلِّغُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَكِنِّي أَرِكُمْ
قَوْمًا تَجْهَلُونَ ○
- ۲۴۔ فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَّتِهِمْ قَالَُوا هَذَا عَارِضٌ
مُّمَطِّرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ
أَلِيمٌ ○
- ۲۵۔ تَدْمِرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسٰكِنُهُمْ
كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○

ترجمہ

۲۱۔ قوم عاد کے بھائی (ہود کی داستان) انہیں یاد دلا جب انہوں نے اپنی قوم کو سزیمین
احقاف میں ڈرایا، جبکہ ان سے پہلے بہت سے ڈرانے والے انبیاء ماضی قریب

اور لعین میں گزر چکے تھے (ہوؤ نے قوم سے کہا) خدائے واحد کے سوا کسی کو عبادت نہ کرو، میں تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۲۲۔ وہ بولے، کیا تو اس لیے آیا ہے کہ (جھوٹ اور فریب کے ذریعے) ہمیں ہمارے معبودوں سے پھیر دے۔ اگر تو سچ کہتا ہے تو جس عذاب کی ہمیں دھمکی دیتا ہے اُسے آ۔

۲۳۔ (ہوؤ نے) کہا: علم تو بس خدا کے پاس ہے (اور وہی جانتا ہے کہ کب تمہیں سزا دیدیے) اور میں جو احکام دے کر بھیجا گیا ہوں وہ تمہیں پہنچاتے دیتا ہوں۔ (میرا کام صرف یہی ہے) لیکن میں تمہیں ہمیشہ جنالت میں پڑھی رہنے والی قوم دیکھتا ہوں۔

۲۴۔ جب انہوں نے اسے بادل کی صورت میں دیکھا کہ ان کے دروں اور ندی نالوں کی طرف اُٹا آ رہا ہے (تو خوشی خوشی) کہنے لگے یہ تو بارش برسائے والا بادل ہے (لیکن ان سے کہا گیا) یہ وہی چیز ہے جس کے آنے کی تم جلدی مچا رہے تھے۔ (یہ) وحشت ناک آندھی ہے جو دردناک عذاب کی حامل ہے۔

۲۵۔ جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تباہ و برباد کر دے گی۔ تو صبح ہوئی تو ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ہم گناہگار لوگوں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں۔

تفسیر

قوم عاد اور تباہ کن آندھی

قرآن مجید کئی حقائق کو بیان کرنے کے بعد ان کے قابل ذکر مصداق بیان کرتا ہے تاکہ وہ کئی حقائق سامنے آجائیں۔ لہذا یہاں پر بھی سرکش متکبرین اور ہوس پرست متکبرین کے احوال کی وضاحت قوم عاد کی مثال سے کی گئی ہے جو ایک واضح نمونہ ہے، ارشاد ہوتا ہے: مکہ کے ان مشرکین کو قوم عاد کے بھائی (ہود) کی سرگزشت یاد دلا (واذکر اخا عاد)۔

”اخ“ (بھائی) کی تعبیر اس عظیم پیغمبر کی اپنی قوم کے ساتھ نہایت ہی دل سوزی اور اس کے ساتھ نہایت ہی محبت کو بیان کر رہی ہے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ تعبیر بہت سے عظیم انبیاء کے بارے میں قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہے۔ وہ اپنی قوم کے لیے دل سوز اور مہربان بھائی تھے اور انہوں نے ان کے لیے کسی ایثار سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ ممکن ہے یہ تعبیر ضمنی طور پر ان کی اپنی قوموں سے رشتہ داری کی طرف بھی اشارہ ہو۔

پھر فرمایا گیا ہے: جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ڈرایا، جب کہ ان سے پہلے ارضی قریب اور بعید میں بہت سے انبیاء گزر چکے تھے، جنہوں نے اپنی قوم کو ڈرایا تھا (اذا نذر قومہ بالاحقاف وقد اخلت النذر من بین یدیدہ ومن خلفہ)۔

”احقاف“ کے متعلق ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ اس کا معنی وہ اُڑنے والی ریت ہے جو ہواؤں کے ذریعے جنگلوں اور بیابانوں میں مستطیل اور کج صورت میں ڈھیروں کی صورت میں جمع ہوتی رہتی ہے اور اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ قوم عاد کا علاقہ ایک بہت بڑا ریگستان تھا۔

بعض لوگ اس کا محل وقوع جزیرہ نمائے عرب کے دل یعنی ”نجد“، ”احساء“، ”مصر موت“ اور ”عمان“ کے درمیان کا علاقہ قرار دیتے ہیں۔ لہ

لیکن یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے، کیونکہ دوسری قرآنی آیات (مثلاً سورہ شعراء) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد ایسی جگہ رہتی تھی جہاں پانی کی فراوانی تھی اور خوبصورت درخت موجود تھے اور جزیرہ نمائے عرب میں ایسی چیز بہت بعید ہے۔

بعض دوسرے مفسرین نے اسے جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں بتایا ہے جو یمن کے اطراف میں یا بحیرہ

عرب کے ساحلوں پر تھی۔

بعض حضرات کا خیال یہ بھی ہے کہ ”احقاف“ سرزمین عراق میں کلاہ اور بابل کے علاقوں میں سے ایک علاقہ ہے۔
 ”طبری“ کہتے ہیں کہ شام میں ”احقاف“ نامی ایک پہاڑ ہے۔
 لیکن ”احقاف“ کے لغوی معنی کی مناسبت اور اس چیز کے پیش نظر کہ ان کی سرزمین چلنے والی ریت سے غیر محفوظ ہونے کے باوجود پانی کی دولت سے مالا مال اور درختوں سے سرسبز تھی ان لوگوں کے قول کو زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے کہ یہ سرزمین جزیرہ نمائے عرب کے جنوب اور یمن کے نزدیک تھی۔

”وقد خلت النذر من بین ید یدہ ومن خلفہ“ (ڈرانے والے انبیاء جو ہود علیہ السلام کے آگے پیچھے آچکے تھے) یہ ان انبیاء کی طرف اشارہ ہے جو ان سے پہلے مبعوث ہو چکے تھے، کچھ تو بہت کم مدت کے فاصلے سے آئے تھے، جن کے بارے میں قرآن نے ”من بین ید یدہ“ کہا ہے اور کچھ بہت زیادہ مدت کے فاصلے سے کہ جنہیں ”من خلفہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن بعض حضرات نے جو یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس جملے سے مراد وہ انبیاء ہیں جو ہود سے پہلے گزر چکے تھے یا ہود کے بعد آئے تھے، بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے اور ”قد خلت“ سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے جو زمانہ ماضی کا معنی دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عظیم پیغمبر کی نبوت کن امور پر مبنی تھی؟ قرآن کہتا ہے:

(ہود نے اُن سے کہا) خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ (الانعبد والالہ)۔

پھر انہیں متنبہ کرتے ہوئے مزید کہا: میں تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں
 (اقی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم)۔

اگرچہ ”یوم عظیم“ کے الفاظ عام طور پر قیامت کے دن کے معنی میں آئے ہیں، لیکن قرآنی آیات میں کبھی ان وحشت ناک اور سخت ایام پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا ہے جو امتوں پر گزر چکے ہیں۔ اور یہاں پر بھی یہی معنی مراد ہیں، کیونکہ ہم انہی آیات میں آگے چل کر پڑھیں گے کہ آخر کار قوم عاد ایک سخت اور وحشت ناک روزِ خدائی عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو گئی۔

لیکن اس ہٹ دھرم اور سرکش قوم نے خدا کی اس دعوت کے مقابلے کی ٹھان لی اور حضرت ہودؑ سے اس قوم کے افراد بولے: ”کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں جھوٹ اور فریب کے ذریعے ہمارے خداؤں سے پھیر

لہ ”فی ظلال القرآن“ انہی آیات کے ذیل میں۔

۱۔ مرحوم شعرانی نے تفسیر ابوالفتوح رازی کے ماحیہ پر نقل کیا ہے ملاحظہ ہو جلد ۱۰ ص ۱۹۵۔

۲۔ مرحوم شعرانی نے تفسیر ابوالفتوح رازی کے ماحیہ پر نقل کیا ہے ملاحظہ ہو جلد ۱۰ ص ۱۹۵۔

دئے (قالوا اجئتنا لتأفكنا عن الهدى)۔
 تو اگر سچ کہتا ہے، تو جس عذاب کی ہمیں دمکی دیتا ہے اسے لے آ (فأتنا بما تعدنا ان كنت من
 الصادقین)۔

یہ دونوں جملے اس سرکش قوم کی بے راہ روی اور ہٹ دھرمی کو بخوبی واضح کر رہے ہیں کیونکہ پہلے جملے میں وہ کہہ
 رہے ہیں کہ تیری یہ دعوت ان معبودوں کے برخلاف ہے جن کے ہم خوگر ہو چکے ہیں اور جو ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے ورثے
 میں پائے ہیں۔ لہذا یہ سب کچھ جھوٹ اور فریب ہے۔

دوسرے جملے میں وہ عذاب کا تقاضا کرتے ہیں، ایسا عذاب کہ اگر نازل ہو جائے تو پھر اس سے خلاصی کی راہیں
 مسدود ہو جائیں۔ اس قسم کے عذاب کی کون عقل مند شخص تنہا کر سکتا ہے ہر چند کہ اس پر یقین نہ بھی رکھتا ہو؟
 لیکن ہُو د علیہ السلام نے اس احقمانہ تقاضے کے جواب میں اُن سے کہا: ”علم تو صرف خدا کے پاس ہے“ (قال
 اتما العلم عند اللہ)۔

وہی بہتر جانتا ہے کہ کب اور کن حالات میں وہ تباہ کن عذاب کو نازل کرے۔ اس سے نہ تو تمہارے تقاضوں کا
 تعلق ہے اور نہ ہی میرے ارادے اور اختیار کو اس میں کچھ دخل ہے، صرف اتمامِ حجت کا مقصد پورا ہو جائے کیونکہ اس
 کی حکمت کا یہی تقاضا ہے

پھر فرماتے ہیں: میرا کام تو صرف یہ ہے کہ میں جو احکام دے کر بھیجا گیا ہوں وہ تم تک پہنچائے دیتا ہوں“ (و
 ابلفکم ما ارسلت بہ)۔

میرا اصل فریضہ اور ذمہ داری یہی ہے اور اطاعتِ الہی کے لیے ارادہ کرنا تمہارا کام ہے اور عذاب کا ارادہ اور
 مشیتِ خدا کا کام ہے۔

لیکن میں تمہیں دیکھ رہا ہے کہ تم ہمیشہ جہالت اور نادانی میں پڑی رہنے والی قوم ہو، (ولکئی ازکم
 قومًا تجهلون)۔

تمہاری بد بختی کا اصل سرچشمہ بھی یہی جہالت ہے اور جہالت بھی ایسی جس میں ہٹ دھرمی، تکبر اور غرور پایا جاتا ہے
 اور وہ تمہیں خدا کے بھیجے ہوئے بندوں کی دعوت کا مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ایسی جہالت جو تمہیں عذاب
 الہی کے نزول اور تمہاری نابودی پر اگساری ہے۔ اگر تمہیں کچھ علم ہوتا اور ذرہ بھر سوچ بوجھ ہوتی تو کم از کم اتنا تو ضرور سوچ
 لیتے کہ تمام منہی احتمالات کے مقابلے میں کم از کم ایک مثبت احتمال بھی تو موجود ہے کہ اگر مستحق ہو جائے تو تمہارا کچھ نہیں
 رہے گا۔

سراجِ نامِ ہُو د علیہ السلام کی تمام نصیحتیں اور برادرانہ شفقت اور رہبری ان سنگدلوں پر کچھ اثر نہ کر سکی اور وہ حتیٰ کہ قبول

کرنے کے بجائے اپنے باطل عقیدے پر بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ ڈٹے رہے، حتیٰ کہ نوح علیہ السلام کی بھی لوگ ان الفاظ کے ساتھ تکذیب کرتے تھے کہ ”اگر سچ کہتے ہو تو جس عذاب کا وعدہ کیا ہے وہ کیا ہوگا؟“

اب جب کہ کافی اتمامِ حجت ہو چکی اور انہوں نے زندہ رہنے کی عدم اہلیت کا ثبوت فراہم کر دیا تو حکمتِ الہی بھی اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ ان پر ”استیصالِ عذاب“ یعنی تباہ کن عذاب نازل کرے۔

انہوں نے اچانک دیکھا تو افاق پر ایک ابر ظاہر ہوا اور بہت جلد پورے آسمان پر پھیل گیا۔

جب انہوں نے اسے بادل کی صورت میں دیکھا کہ ان کے دروں اور ندی نالوں کی طرف اٹھا آ رہا ہے تو خوشی خوشی کہنے لگے یہ تو بارش برسانے والا بادل ہے (فلما رأوا عارضاً مستقبلاً و دیتہم قالوا ہذا عارض ممطرنا)۔

مفسرین کہتے ہیں کہ ایک عرصے تک قوم عاد کے علاقے میں بارش نہیں برسی تھی۔ موسم بہت گرم اور خشک تھا یہاں تک کہ دم گھٹنے لگ گیا تھا۔ جب قوم عاد کی نگاہ کھٹکھور گھٹا پر بڑی جودور کی افاق سے ان کے آسمان کی جانب رواں دواں تھی تو وہ لوگ اسے دیکھ کر بہت مسرور ہو گئے اور بارش کے استقبال میں اسی جانب چل پڑے اور دروں اور پہاڑی نالوں کے راستوں کے کنارے پہنچ گئے تاکہ بابرکت بارش کے برسنے کے منظر سے لطف اندوز ہوں۔

لیکن بہت جلد انہیں بتا دیا گیا کہ یہ بارش برسانے والے بادل نہیں ہیں۔ ”یہ تو وہی وحشت ناک عذاب ہے جس کے آنے کی تم جلدی مچا رہے تھے“ (بل ہوما استعجلتم بہ)۔

”یہ وہ وحشت ناک آندھی ہے جو دردناک عذاب کی حامل ہے“ (ریح فیہا عذاب الیم)۔

بظاہر یہ بات کہنے والا خود خداوند بزرگ و برتر ہے یا پھر حضرت ہود علیہ السلام ہیں۔ جب ان کی خوشی کے نعرے سنے تو ان سے یہ کہا گیا۔

جی ہاں یہ تباہ کن آندھی ہے ”جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر چیز کو تباہ و برباد کر دے گی“ (تدمر کل شئ بما سردتہا)۔

بعض مفسرین کے بقول ”ہر چیز“ سے مراد انسان، چوپائے اور ان کے اموال ہیں، کیونکہ بعد کے جملے میں فرمایا گیا ہے ”تو ایسے عالم میں ان کی صبح ہوئی کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا (فصبحوا لایذی الامساکنہم)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے گھر تو صحیح سالم تھے لیکن وہ خود ہلاک ہو گئے اور ان کے اجسام اور اموال بھی تیز و تند آندھی کے ذریعے دروازے جنگلوں، بیابانوں یا پھر سمندر میں پھینک دیئے گئے۔

”عارض“ ”عارض“ کے مادہ سے ہے اور یہاں پر اس بادل کے معنی میں ہے جو آسمان پر پھیل جاتا ہے اور شاید یہ بارش برسانے والے بادلوں کی ایک علامت ہے، جو اسی افاق پر پھیل کر اوپر بڑھتا جاتا ہے ”اودیۃ“ ”وادی“ کی معنی ہے، جس کا معنی درہ اور پانی بہنے کی جگہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ جب وہ پہلی بار متوجہ ہوئے کہ یہ سیاہ بادل تو گرد و غبار سے اٹی آندھی کے ہیں اور یہ وہ وقت تھا جب یہ بادل ان کے علاقے کے بالکل نزدیک پہنچ گئے اور ان کے جانوروں اور چرواہوں کو جوارِ گرد کے بیابانوں میں تھے زمین سے اٹھا اٹھا کر پٹھنے لگے اور خیموں کو اکھاڑ کر اس قدر اوپر لے جانے لگے کہ وہ ایک ٹڈی کے مانند نظر آرہے تھے۔ انہوں نے جب یہ منظر دیکھا تو دڑے دڑے اپنے گھروں میں جا گئے اور دروازے بند کر لیے، لیکن ہوانے ان کے دروازوں کو بھی اکھاڑ کر زمین پر دے مارا یا پھر اوپر پھینک دیا، اور "احقاف" یعنی اڑنے والی ریت کو ان کے جسموں پر ڈال دیا۔

سورہ حاقہ کی ساتوں آیت میں ہے کہ "یہ آندھی سات راتیں اور آٹھ دن تک مسلسل چلتی رہی" وہ مسلسل ریت کے ٹیلوں کے نیچے سے پیچ دپکا کر رہے تھے، پھر آندھی نے ریت کو ان کے اوپر سے ہٹا دیا اور ان کے بدن ظاہر ہو گئے پھر ان اجسام کو اپنے ساتھ لے جا کر سمندر میں پھینک دیا۔ لہ

آخر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ انجام اس گمراہ قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہم گناہگار لوگوں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں: (كذالك نجزي القوم المجرمين)۔

یہ ایک تشبیہ ہے کہ تمام مجرموں، گناہگاروں، کافروں، ہٹ دھرم لوگوں اور خود غرض افراد کے لیے کہ اگر تم بھی اس راہ پر چلو گے تو تمہارا انجام بھی ان لوگوں سے قطعاً بہتر نہیں ہوگا۔

کبھی ان ہواؤں کو جو قرآن کے بقول "مبشرات بین یدی رحمتہ" اس کی بارانِ رحمت کے پیش قدم ہوتی ہیں، اور ان کا کام مردہ زمینوں کو زندہ کرنا ہوتا ہے، ہلاکت کا حکم ملتا ہے۔

کبھی وہ زمین جو انسان کے آرام و سکون کا گہوارہ ہوتی ہے ایک زبردست جھٹکے سے قبرستان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

کبھی وہ بارش جو تمام موجودات کا سرمایہ حیات ہوتی ہے، سیلاب میں بدل جاتی ہے اور ہر چیز غرق کر دیتی ہے۔

جی ہاں! انسان کی زندگی پر مامور چیزوں کو اس کی موت کا عامل بنا دیا جاتا ہے اور کس قدر دردناک ہے ایسی موت جو زندگی کے عامل سے جنم لے۔ خاص کر جب قوم ہود جیسے افراد کے لیے کہ اول تو فرحت اور سرور پیدا کئے پھر عذاب میں مبتلا کر دے تاکہ یہ عذاب زیادہ دردناک ہو۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے، یہ ہوا، ہوا کی یہ لطیف موجیں ہی تھیں جنہوں نے پروردگار کے حکم سے تمام چیزوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ لہ

۱۔ تفسیر فخر رازی جلد ۲۸ صفحہ ۲۸۰ انہی آیات کے ذیل میں اور تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۲۲۶ میں بھی یہی معنی ذکر کیا گیا ہے۔
 ۲۔ "تدھر" "تدھیو" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہلاک اور ریت نالود کرنا ہے

۲۶۔ وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِنْ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا
 وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً ۖ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ
 وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ
 بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝

۲۷۔ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقُرَىٰ وَصَرَفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ
 يَرْجِعُونَ ۝

۲۸۔ فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً ۗ
 بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ وَذَلِكِ إِفْكَهُمُ وَمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝

ترجمہ

۲۶۔ اور ہم نے ان (قوم عاد کے افراد) کو وہ قدرت دی جو تمہیں نہیں دی اور ان کے لیے
 کان اور آنکھ اور دل بنائے (لیکن نزول عذاب کے وقت) انہیں ان کی آنکھوں
 کانوں، اور عقلوں نے کچھ فائدہ دیا، کیونکہ وہ خدائی آیات کا انکار کرتے تھے آخر کار
 جس چیز کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔

۲۷۔ اور ہم نے تمہارے ارد گرد کی قوموں کو ہلاک کر دیا اور اپنی نشانیوں کو مختلف
 صورتوں میں ان کے سامنے بیان کیا تاکہ یہ لوگ باز آجائیں۔

۲۸۔ تو خدا کے سوا جنہیں ان لوگوں نے تقرب خدا کے لیے معبود بنا رکھا تھا

انہوں نے ان کی کیوں نہ مدد کی؟ بلکہ وہ تو ان سے کم ہو گئے، یہ تھا ان کے جھوٹ اور افتراء پر دازلیوں کا نتیجہ۔

تفسیر

تم قوم عاد سے زیادہ طاقتور نہیں ہو:

یہ آیات درحقیقت گذشتہ آیات کا نتیجہ بیان کر رہی ہیں، جن میں قوم عاد کی دردناک سزا کی گفتگو کی گئی تھی۔ مشرکین مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے قوم عاد کو وہ طاقت دی تھی جو تم کو نہیں دی (ولقد مکتاہم فیما ان مکتا کم فیہ)۔
وہ جہانی لحاظ سے بھی تم سے زیادہ طاقتور تھے اور مال و دولت اور مادی وسائل کے لحاظ سے بھی۔ اگر جہانی طاقت اور دولت اور مادی وسائل ہی لوگوں کو عذاب الہی سے نجات دلا سکتے تو قوم عاد کے افراد، آندھیوں میں خس و خاشاک کے مانند فضا میں نہ اڑتے پھرتے کہ چند ٹوٹے پھوٹے گھروں کے سوا ان کی اور کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی۔
یہ آیت درحقیقت سورہ فجر کی ان آیات کے مانند ہے جو اسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہیں کہ:

”الم ترکیف فعل ربک بعاد ارم ذات العمامۃ لئلا یخلق مثلہا

فی البلاد“

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟ وہ بلند قامت قوم جن کی اونچی اونچی عمارتیں تھیں، وہ ایسی قوم تھی کہ شہروں میں جس کی مثل پیدا نہیں کی گئی۔“
(فجر / ۶ تا ۸)

یا سورہ ق کی ۲۶ ویں آیت کے مانند ہے، جس میں کہا گیا ہے:

”و کم اهلکنا قبلہم من قرن ہم اشد منهم بطشاً“

”اور کس قدر ایسی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر ڈالا جو ان لوگوں سے طاقت کے لحاظ سے بھی زیادہ تھیں اور افرادی قوت کے لحاظ سے بھی۔“

لے ”ان مکتا کم فیہ“ کے جملہ میں ”ان“ نافیہ ہے۔ قرآنی آیات سے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں جو تمہیں یہ بیان ہوئے ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے اس ”ان“ کو یا شرطیہ مانا ہے یا زائدہ، جو فیصیح معلوم نہیں ہوتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ جو لوگ تم سے طاقت میں کئی گنا زیادہ تھے وہ خدا کی سزا کے طوفان کے سامنے نہ ٹھہر سکے، تم جس باغ کی مولیٰ ہو؟

پھر فرمایا گیا ہے: ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھ اور دل بنائے (وجعلنا لهم سمعًا والبصائرًا وافئدةً)۔
وہ حقائق کے ادراک، نگاہ اور پہچان کے لحاظ سے بھی قوی اور طاقت ور تھے۔
لیکن نزول عذاب کے وقت انہیں ان کی آنکھوں، کانوں اور عقلوں نے کچھ فائدہ نہ دیا، کیونکہ وہ خدائی آیات کا انکار کرتے تھے (فما اغنى عنهم سمعهم ولا ابصارهم ولا افئدتهم من شيء اذ كانوا يجحدون بايات الله)۔ لہ

آخر کار جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا! (وحاق بهم ما كانوا به يستهزءون)۔

جی ہاں وہ مادی وسائل سے بھی لیس تھے اور حقائق کے ادراک کے ذرائع سے بھی۔ لیکن چونکہ خدائی آیات سے ہٹ دھرمی اور تکبر کے ساتھ پیش آتے تھے اور انبیاء کی باتوں کا مذاق اڑاتے تھے، لہذا نور حق ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور غرور و تکبر اور حتی دشمنی اس بات کا سبب بن گئے کہ وہ آنکھ کان اور عقل جیسے ہدایت و معرفت کے آلات و وسائل سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور نجات کے راستوں کو تلاش نہ کر سکے۔ آخر کار ایسے انجام سے دوچار ہوئے، جس کا تذکرہ گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔

جہاں پر اس قدر قدرت اور وسائل کے باوجود ان کا کچھ بس نہ چل سکا اور ان کے بے جان ڈھانچے آندھیوں کی ہو چکی ہیں جس و خاشاک کے مانند بڑی رسوائی سے ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے، تم تو ان سے کہیں کمزور اور ناتواں ہو۔

خدا کے لیے یہ بات مشکل نہیں ہے کہ تمہیں تمہارے اعمال کے جرم میں سخت سے سخت عذاب میں مبتلا کر دے اور تمہاری زندگی کے عوامل کو تمہاری موت اور تباہی کے لیے مامور کر دے، یہ خطاب مکہ کے مشرکین کے لیے بھی ہے اور ہر دور کے مغرور، ظالم اور ہٹ دھرم لوگوں کے لیے بھی۔

یقیناً، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے، ہم پہلے انسان نہیں ہیں جنہوں نے رُوحے زمین پر قدم رکھا ہے ہم سے پہلے بھی بہت سی قومیں گزر چکی ہیں جن کے پاس وسائل بھی تھے اور طاقت بھی، کیا ہی اچھا ہو کہ ان کی تاریخ کو ہم آئینہ عبرت بنائیں اور اس میں اپنے مستقبل اور انجام کو دیکھیں۔

لہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ "ابصار" (آنکھیں)، اور "افئدة" (دل اور عقل) جمع کی صورت میں بیان ہوئے ہیں، جب کہ "سمع" مفرد کی صورت میں ہے لیکن ہے کہ یہ فرق اس لیے ہو کہ "سمع" مصدری معنی کا حامل ہے اور مصدر ہمیشہ مفرد کی صورت میں استعمال ہوتا ہے یا اسلئے کہ دیکھی جانے والی اور ادراک کی جانے والی چیزوں کے مقابلے میں مسمرات (سنی جانے والی چیزیں) ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

پھر بات کو زیادہ زور دے کر بیان کیا گیا ہے اور نصیحت آمیز انداز میں مشرکین مکہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف قوم عاد بلکہ ”ہم نے تمہارے ارد گرد کی سرکش قوموں کو بھی ہلاک کر ڈالا“ (ولقد اهلكنا ما حولكم من القرى)۔ جن قوموں کے علاقے تم سے زیادہ دُور نہیں تقریباً جزیرہ نمائے عرب کے ارد گرد ہی وہ آباد تھے، اگر قوم عاد ”احقاف“ میں اس جزیرہ نما کے جنوب میں رہتی تھی تو قوم ثمود اس کے شمال میں ”حجر“ نامی سرزمین میں رہتی تھی۔ قوم سبا، جو درناک انجام سے دوچار ہوئی، یمن کی سرزمین میں رہتی تھی۔ قوم شیب تو تمہارے شام جانے کے راستے میں سرزمین مدین میں زندگی بسر کرتی تھی۔ اسی طرح قوم لوط بھی اسی علاقے میں رہائش پذیر تھی اور یہ سب کی سب قومیں گناہوں، نافرمانیوں اور کفر کی وجہ سے مختلف عذابوں میں گرفتار ہوئیں۔

ان میں ہر قوم کا انجام عبرت کا آئینہ ہے اور ہر ایک ناطق گواہ کہ کیونکر وہ سب راہ کرنے والے اس قدر وسائل و ذرائع کے باوجود بھی بیدار نہ ہوئیں؟

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اور ہم نے اپنی نشانیوں کو مختلف صورتوں میں ان سے بیان کیا تاکہ یہ لوگ باز آجائیں (و صرفنا الایات لعلہم یرجعون)۔

کبھی تو ہم نے انہیں معجزے دکھائے، کبھی نعمت عطا کی، کبھی بلاؤں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا، کبھی نیک لوگوں کی تعریف کی، کبھی بُرے لوگوں کی نکو ہش کی اور کبھی دوسروں کو آئینے والے ہولناک عذاب کے تذکرہ سے انہیں نصیحت کی لیکن تکبر، غرور، خودخواہی اور ہٹ دھرمی نے انہیں ہدایت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں نہیں سرزنش کرتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ ان پر تنقید کی گئی ہے: تو خدا کے سوا جن کو ان لوگوں نے تقرب خدا کے لیے معبود بنا رکھا تھا انہوں نے ان سخت اور حساس لمحات میں ان کی کیوں مدد نہ کی؟ (فلو لانصرہم الذین اتخذوا من دون اللہ قرباناً الہة)۔ لہ

سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ برحق معبود ہوتے تو اپنے پیروکاروں کی ایسے سخت اور حساس لمحات میں مدد کرتے اور ہولناک عذاب کے جنگل سے انہیں چھٹکارا دلاتے یہی چیز ان کے عقیدہ کے باطل ہونے کی ایک محکم دلیل ہے جو ان بناوٹی معبودوں کو اپنے مصیبت کے دنوں کے لیے اپنی پناہ گاہ سمجھتے تھے۔

پھر فرمایا گیا ہے: نہ صرف ان کی امداد نہیں کی بلکہ ان سے گم بھی ہو گئے (بل ضلوا عنہم)۔

اس طرح کی بے حیثیت اور بے قیمت مخلوق جو نہ تو کسی کام کا مہلار ہے اور نہ ہی کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتی ہے اور

لہ ”اتخذوا“ کا پہلا مفعول محدود ہے اور دوسرا مفعول ”الہة“ ہے اور ”قرباناً“ حال ہے اور پورا جملہ تقدیری صورت میں یوں ہے ”اتخذوا الہة من دون اللہ حال کونہم متقرباً بہم“ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ”قرباناً“ مفعول لہ ہے۔ البتہ آیت کی ترکیب کے سلسلے میں اور بھی کئی احتمال پائے جاتے ہیں جو زیادہ قابل توجہ نہیں ہیں۔

ہر طرح کے حادثے اور سانحے کے وقت غائب اور گم ہو جاتی ہے وہ کیونکر عبادت کے لائق ہو سکتی ہے؟
آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ تھا ان کے جھوٹ اور افتراء پر دازلیوں کا نتیجہ (وَذَا لِكَ افكهم وما
كانوا یفترون)۔
یہ ہلاکت اور بد بختی، یہ دردناک عذاب اور مصیبت کے موقع پر محبوبوں کا گم ہو جانا ان کے جھوٹ اور افتراء
پر دازلیوں ہی کا تو نتیجہ ہیں۔ لہ

لہ بنا بریں آیت میں ایک مخدوف ہے اور اس کی تقدیری صورت یوں ہے «وَذَا لِكَ نتیجۃ افكهم» اور یہ احتمال بھی
ہے کہ آیت میں مخدوف ماننے کی ضرورت ہی نہ ہو تو اس صورت میں اس کا معنی یوں ہوگا کہ یہ تھا ان کا جھوٹ اور افتراء پر دازلیوں کا
نتیجہ لہٰذا یہ لوم ہوتا ہے۔

۲۹- وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِبِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ
فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ
مُنذِرِينَ ۝

۳۰- قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِنۢ بَعْدِ مُوسَىٰ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقِ
مُسْتَقِيمٍ ۝

۳۱- يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ، يَعْفِرْ لَكُمْ مِّن ذُنُوبِكُمْ
وَيُجِرْكُمْ مِّن عَذَابِ إِلِيمٍ ۝
۳۲- وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ
مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءُ ۝ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

ترجمہ

۲۹- اور اس وقت کو یاد کر جب ہم نے جنوں میں سے ایک گروہ کو تیری طرف
متوجہ کیا کہ قرآن سنیں، پھر جب وہ حاضر ہوئے تو ایک دوسرے سے کہنے
لگے خاموش ہو کر سنتے رہو۔ جب تمام ہوا تو اپنی قوم کی طرف واپس گئے اور
اُسے جا کر ڈرایا۔

۳۰۔ انہوں نے کہا: اے قوم! ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اپنے سے پہلے کی کتابوں کی نشانیوں سے ہم آہنگی کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے۔

۳۱۔ اے ہماری قوم! خدا کی طرف بلانے والے کی بات مانو اور اس پر ایمان لے آؤ تاکہ تمہارے گناہوں کو بخش دے اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے۔

۳۲۔ اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات نہیں مانے گا وہ ہرگز خدا کے عذاب سے زمین میں فرار نہیں کر سکتا اور خدا کے علاوہ اس کا کوئی سرپرست اور مددگار نہیں ہوگا، اور ایسے لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

شان نزول

ان آیات کی شان نزول میں مختلف روایات ذکر ہوئی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے: حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے طائف کے بازار عکاظ میں تشریف لے گئے۔ زید بن حارثہ بھی آنحضرت کے ہمراہ تھے۔ اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جائے، لیکن کسی نے بھی آپ کی دعوت قبول نہ کی۔ ناچار مکہ کی طرف واپس آئے، دوران سفر ایسی جگہ پہنچے جسے ”وادی جن“ کہا جاتا تھا۔ رات کے دوران آپ نے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ وہاں سے کچھ جنات کا گزر ہوا۔ جب تلاوت کلام اللہ کی آواز ان کے کانوں میں پہنچی تو اسے غور سے سننے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے ”خاموش رہو! جب آپ نے تلاوت مکمل کر لی تو وہ مسلمان ہو گئے اور مبلغ کی حیثیت سے اپنی قوم کی طرف لوٹ آئے اور اسے اسلام لانے کی دعوت دی۔ ان میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے اور مبلغین کے ہمراہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے انہیں اسلام کی تعلیمات یاد کروائیں۔ اسی موقع پر مندرجہ بالا آیات اور سورہ جن نازل ہوئی۔

کچھ اور لوگوں نے ایک اور شان نزول ابن عباس سے نقل کی ہے جو گزشتہ شان نزول سے ملتی جلتی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ اس کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور نماز کے دوران قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنات کے ایک گروہ کا وہاں سے گزر ہوا، جو تحقیق اور جستجو کر رہے تھے اور آسمان سے خبروں کے منقطع ہو جانے نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ جب انہوں نے پیغمبر اکرم کے قرآن پڑھنے کی آواز سنی تو کہنے لگے کہ ہم سے آسمانی خبروں کے انقطاع کا سبب بھی یہی چیز ہے، یہیں سے وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے اور جا کر اسے اسلام کی دعوت دی۔

مرحوم طبری نے تفسیر مجمع البیان میں ایک تیسری شان نزول بیان کی ہے جس کی داستان آنحضرت کے سفر طائف سے مربوط ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد پیغمبر اکرم کے لیے سخت مشکلات کا دور شروع ہو گیا اور آپ نے طائف کا سفر اختیار کیا کہ شاید وہاں پر کوئی دوست مددگار مل جائے۔ لیکن طائف کے سرداروں نے آپ کی زبردست تکذیب کی اور آپ کو اس قدر پتھر مارے کہ آپ کے پاؤں مبارک سے خون بہنے لگا۔ آپ تھک کر اور زخموں سے چوڑا ایک باغ کے پاس پہنچے اور وہاں ایک کھجور کے درخت کے سایے کے نیچے بیٹھ گئے۔ خون آپ کے پاؤں سے جاری تھا۔ یہ عقبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا باغ تھا جو قریش کے دو دو متمند افراد تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب انہیں دیکھا تو سخت پریشان ہو گئے کیونکہ آپ ان کی دشمنی سے پہلے ہی باخبر تھے۔

ان دونوں نے انھوں کو ایک تھال بھر کر اپنے عیسائی غلام "عداس" کے ذریعے آپ کی خدمت میں بھیج دیا۔ آنحضرت نے اس سے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا: "نینواکا۔"

فرمایا: خدا کے صالح بندے یونس کے شہر کے۔

عداس نے پوچھا: آپ یونس کو کہاں سے پہچانتے ہیں؟

آنحضرت نے فرمایا: میں خدا کا رسول ہوں اور خدا ہی نے مجھے بتایا ہے۔

یہ سن کر عداس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کو تسلیم کر لیا۔ خدا کے حضور سجدہ کیا اور آپ کے قدموں کے بوسے لیے۔

جب وہ واپس لوٹ گیا تو عقبہ اور شیبہ نے اسے زبردست سرزنش کی کہ تم نے یہ کام کیوں کیا؟

اس نے کہا: یہ تو خدا کے صالح بندے ہیں، انہوں نے مجھے اس پر دلہیں اور اجنبی ماحول میں ہمارے پیغمبر یونس کے بارے میں بتایا ہے۔

۱۔ یہ روایت ہم نے خلاصہ کے ساتھ بیان کی ہے اور صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن امام احمد میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

وہ یسین کر ہنسنے لگے اور کہنے لگے: کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں وہ تمہارے دین عیسائیت کے بارے میں دھوکا دے، کیونکہ وہ تو ایک دھوکا باز انسان ہے۔ (نعوذ باللہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کی جانب واپس آ گئے، اس سفر کا ماہِ صفر ایک مومن شخص تھا، راستے میں نصف شب کے قریب کھجور کے ایک درخت کے نزدیک پہنچے اور نماز پڑھنا شروع کر دی۔ وہیں سے ”نصیبین“ یا ”مین“ کے جنات کے ایک ٹوٹے کا گزر ہوا۔ آپ نماز صبح پڑھ رہے تھے، انہوں نے نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کی آواز پر کان لگا اور ایمان لے آئے۔

تفسیر ”جنات“ ایمان لاتے ہیں؛

ان آیات میں، جیسا کہ شانِ نزول میں اشارہ ہو چکا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آسمانی کتاب پر جنات کے ایمان لانے کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے تاکہ مشرکین مکہ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ جنات کا ایک بظاہر دور افتادہ ٹولہ اس پیغمبر پر جو انسان ہے اور تمہارے درمیان رہتا ہے، کس طرح ایمان لے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے ہو اور اس کی مخالفت پر ہمیشہ کمر بستہ رہتے ہو۔

”جنات نامی مخلوق اور ان کی خصوصیات کے بارے میں انشاء اللہ سورہ جن کی تفسیر میں بحث ہوگی، یہاں پر صرف زیر تفسیر آیات کے بارے میں گفتگو ہوگی۔

”قوم ہود کی داستان درحقیقت مشرکین مکہ کے لیے ایک زبردست تنبیہ کی حیثیت رکھتی تھی، اور قوم جن کے ایمان لانے کی داستان ایک اور تنبیہ تھی۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کر جب ہم نے جنوں میں سے ایک گروہ کو تیری طرف متوجہ کیا کہ دل لگا کر قرآن سنیں۔ (واذ صرفنا الیک نفرًا من الجنّ یستمعون القرآن)۔

”صرفنا“ صرف کے مادہ سے ہے، جس کا معنی کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کرنا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ جنوں کا ٹولہ پہلے ”اسراق سمع“ (خبریں چرانے) کے ذریعے آسمانوں کی خبروں کو سنا کرتا تھا، لیکن جب آنحضرت کا ظہور رسالت ہوا تو وہ اس سے روک ڈیٹے گئے اور قرآن کی جانب متوجہ ہوئے۔

لے مجمع البیان جلد ۵ ص ۹۲۔ اس داستان کو ابن ہشام نے اپنی کتاب ”السیرۃ النبویہ“ میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ تحریر

کیا ہے۔ (جلد ۲ ص ۶۳، ص ۶۳)

”نفر“ کے بارے میں راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ یہ لوگوں کے ایسے گروہ کو کہتے ہیں جو مل کر سفر کر سکتے ہوں۔ اور ارباب لغت کے درمیان مشہور یہ ہے کہ ”نفر“ تین سے دس تک شمل جماعت کو کہتے ہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک تین سے چالیس افراد پر مشتمل جماعت کو کہتے ہیں۔ (مہرچند کہ فارسی زبان میں ایک فرد کو بھی ”نفر“ کہتے ہیں)۔ پھر فرمایا گیا ہے: جب وہ قرآن کے سامنے حاضر ہوئے اور اس کی روح پر در آیات کو سنا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے خاموش ہو کر سنتے رہو (فلما حضر وہ قالوا انصتوا)۔

یہ اس وقت تھا جب پیغمبر اکرمؐ نصف شب میں یا نماز صبح کے دوران قرآنی آیات کی تلاوت کر رہے تھے۔ ”انصتوا“ انصتات کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے خاموش ہو کر اور دل لگا کر پوری توجہ سے سنا۔ آخر لا مرحبہ نور ایمان ان کے دل میں چمک اٹھا تو انہوں نے آیات قرآنی کی حقانیت کو اپنے اندر محسوس کر لیا۔ لہذا جب قرآن پڑھنا تمام ہوا تو وہ مبلغین کے مانند اپنی قوم کی طرف واپس آگئے اور اسے جا کر ڈرایا اور جو حقیقت ان پر نمایاں ہو گئی تھی اس سے قوم کو آگاہ کیا (فلما قضیٰ ولوا الیٰ قومہم منذرین)۔

ایمان کے طلب کار افراد کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایمان کی تلاش میں رہتے ہیں اور جن حقائق سے خود آگاہ ہوتے ہیں ان سے دوسروں کو بھی آگاہ کرتے ہیں اور ایمان کے منبع سے انہیں بھی مطلع کرتے ہیں۔

بعد کی آیت قوم کی طرف پلٹ جانے کے بعد ان جنوں کی دعوت و تبلیغ کی کیفیت بیان کر رہی ہے، ایسی دعوت جو جامع، جچی تلی، مختصر اور با معنی ہے: انہوں نے کہا اے قوم! ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے (قالوا یا قومنا اتا سمعنا کتابا انزل من بعد موسیٰ)۔

اس کتاب کی کچھ مخصوص صفات ہیں پہلی صفت تو یہ ہے کہ اپنے سے پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس کے مضامین ان کے مضامین سے ہم آہنگ ہیں اور سابقہ کتابوں میں جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں وہ اس میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں۔ (مصدقاً لما بین ید یدہ)۔

اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ سب کو حق کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ (یہدی الی الحق)۔

دہ یوں کہ جو شخص بھی اپنی عقل اور فطرت سے کام لے، اُسے اس میں حقانیت کی علامتیں بخوبی نظر آئیں گی۔

اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ”سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے“ (والی طریق مستقیم)۔

حق کی طرف دعوت اور صراطِ مستقیم کی طرف دعوت میں بھی بظاہر فرق یہ ہے کہ پہلا (حق) صحیح اعتقادات کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا صراطِ مستقیم صحیح اور سیدھے عملی نظام کی طرف۔

”انزل من بعد موسیٰ“ اور ”مصدقاً لما بین ید یدہ“ کے جملے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ جنات کا یہ گروہ گزشتہ آسمانی کتابوں خصوصاً حضرت موسیٰ کی کتاب پر ایمان رکھتا تھا اور حق کی تلاش میں تھا اور اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ

کی کتاب کا تذکرہ نہیں ہے۔ حالانکہ وہ موسیٰ کی کتاب کے بعد نازل ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ بقول ابن عباس جنات عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے نزول سے مطلقاً بے خبر تھے۔ کیونکہ جنات تو آسمانی خبروں سے بھی باخبر تھے وہ زمین کی خبروں سے کس طرح غافل رہ سکتے ہیں؟

بلکہ اس لیے ہے کیونکہ "تورات" بنیادی کتاب تھی، حتیٰ کہ عیسائی حضرات بھی اپنے شرعی احکام اسی سے ماہل کرتے تھے اور کرتے ہیں۔

انہوں نے پھر کہا "اے ہماری قوم! خدا کی طرف بلائے والے کی بات مانو اور اس پر ایمان لے آؤ یا قومنا۔ اجیبوا داعی اللہ وامنوا بہ۔"

کہ وہ تمہیں عظیم اجر عطا فرمائے گا۔ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ میں رکھے گا۔ (یفخر لکم من ذنوبکم ویجركم من عذاب الیم)۔ لہ

"داعی اللہ" (خدا کا دعوت کرنے والا) سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، کہ جو انہیں "اللہ" کی طرف رہنمائی کرتے تھے اور چونکہ زیادہ تر خوف گناہوں اور قیامت کے دردناک عذاب سے ہوتا ہے، لہذا انہوں نے ان دونوں چیزوں سے بچاؤ کی بات کی ہے تاکہ قوم کی زیادہ توجہ اپنی طرف مبذول کر دیا سکیں۔

کئی مفسرین نے "من ذنوبکم" میں "من" کے کلمہ کو "زائدہ" سمجھا ہے، جو اس بات کی تاکید ہے کہ تمام گناہوں کی بخشش کا ایمان پر دار و مدار ہے۔

لیکن بعض اور مفسرین نے اسے "تبعضیہ" اور ان گناہوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ وہ معاف کیے جائیں گے جو انہوں نے ایمان لانے سے پہلے انجام دیتے ہیں یا ان گناہوں کی طرف جن میں "حق اللہ" کا پلو ہے نہ کہ "حق الناس" کا۔

لیکن زیادہ مناسب معنی وہی من کے زائدہ ہونے والا ہے جو تاکید ہے اور آیت مجیدہ تمام گناہوں کے بارے میں ہے۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں جن مبلغین کی آخری گفتگو کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اور جو شخص خدا کی طرف بلائے والے کی بات نہیں مانے گا وہ ہرگز خدا کے عذاب سے زمین میں قرار نہیں کر سکتا۔ (ومن لا یجب داعی اللہ فلیس بمعجز فی الارض)۔

اور خدا کے علاوہ اس کا کوئی یار و مددگار اور سرپرست نہیں ہوگا۔ (ولیس لہ من دونہ اولیاء)۔

اور لہذا "یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں" (اولئک فی ضلال مبین)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا بدترین اور واضح ترین گمراہی ہوگی کہ انسان حق اور پیغمبر خدا حتیٰ کہ خود خدا کے مقابلے پر کمر بستہ

ہو جائے کہ جس کے بغیر پوری کائنات میں نہ تو کوئی پناہ گاہ ہے اور نہ ہی اس کے ملک سے فرار کر کے کہیں اور جاسکتا ہے۔ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ لفظ "معجز" (اپنی تمام مشقتات سمیت) ایسے مقامات پر سزا اور تعاقب سے عاجز کرنے کے معنی میں آتا ہے، بالفاظ دیگر سزا کے چنگل سے فرار کرنے کے معنی ہیں۔

"نی الارض" (زمین میں)، کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین کے کسی خطے میں چلے جائیے، خدا ہی کی حکومت ہوگی اور کچھ بھی اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں ہے اور اگر آسمان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جنات ہوں یا انسان سب کا ٹھکانا بہر حال زمین ہی ہے۔

چند نکات

۱۔ موثر تبلیغ: جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جنات، ان کے زندگی کے انداز اور ان سے متعلق دوسرے امور کے بارے میں تو ہم انشاء اللہ سورہ جن کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے، لیکن زیر تفسیر آیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ صاحب عقل و شعور مخلوق ہیں اور ان پر فرائض کی بجا آوری ضروری قرار دی گئی ہے۔ ان کے دو فریقے ہیں ایک مومن اور دوسرا کافر، اور وہ خدا کی دعوت سے کافی آشنا ہیں۔

زیر نظر آیات میں جو چیز زیادہ قابل توجہ ہے وہ ان کی قوم میں اسلامی تبلیغ کا طریقہ کار ہے جو انہوں نے اپنایا۔ انہوں نے پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہونے، قرآنی آیات سننے اور ان کے مطالب سمجھنے کے بعد فوراً ہی اپنی قوم کی اصلاح کی ٹھان لی اور سیدھے اس کے پاس پہنچے اور تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

انہوں نے سب سے پہلے قرآن کی حقانیت اور صداقت کی بات کی اور اسے تین دلائل کے ساتھ ثابت بھی کیا۔ پھر اسے شوق دلایا، اس آسمانی کتاب پر ایمان کے زیر سایہ اسے آخرت کے عذاب سے نجات کی خوشخبری سنائی، جس سے ایک طرف تو معاد کے مسئلے پر تاکید کرنا تھی اور دوسری طرف ناپائیدار دنیاوی اقدار کے مقابلے میں آخرت کے پائیدار اور اصل اقدار کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

تیسرے مرحلے پر انہوں نے ترک ایمان کے خطرات سے بھی قوم کو آگاہ کیا اور استدلال اور دل سوزی کے طے طے انداز میں اسے متنبہ بھی کر دیا اور اس راستے سے انحراف کے انجام جو "ضلال مبین" یا کھلی گمراہی ہے سے بھی اسے خبردار کیا۔

تبلیغ کا یہ انداز ہر شخص اور جماعت کے لیے موثر ہے۔

۲۔ عظمت قرآن کی بہترین دلیل: مندرجہ بالا آیات، اسی طرح سورہ جن کی آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جنوں کا یہ گروہ قرآنی آیات سنتے ہی اس کا فریفتہ ہو گیا اور اس بات کی کوئی علامت نہیں ملتی کہ انہوں نے پیغمبر اسلام سے کسی اور معجزے کا تقاضا کیا ہو۔

انہوں نے صرف ان امور پر اکتفا کیا کہ:

۱- قرآن مجید سابقہ آسمانی کتابوں کی نشانیوں سے ہم آہنگ ہے۔

۲- حق کی طرف بلاتا ہے۔

۳- اس کی منصوبہ بندی سیدھی راہ پر چلنے کے لیے کی گئی ہے۔

ان تینوں چیزوں کے پیش نظر انہوں نے قرآن کی حقانیت کا یقین کر لیا۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قرآنی مضامین اور مطالب میں غور و فکر ہمیں دوسرے تمام دلائل سے بے نیاز کر دیتا ہے۔
ایسی کتاب جو ایک ایسی شخصیت کی طرف سے پیش کی گئی ہو جس نے دنیا میں کسی سے کوئی درس نہیں پڑھا، اس میں اس قدر عظیم مطالب، پاک معارف، عقاید، خالص توحید، محکم قوانین، طاقت ور دلائل، پختہ اور تعمیری لائحہ عمل، واضح اور اعلیٰ وعظ و نصیحتیں ہوں اور وہ بھی ایسے جاذب اور زیب انداز میں تو یہ یقیناً اس آسمانی کتاب کی حقانیت و صداقت کی بذات خود بہترین دلیل ہے۔ کیونکہ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ ۱۷

۳۳۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْزِمْ بِخَلْقِهِنَّ بِقَدْرِ عَلٰى اَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتٰى بَلٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

۳۴۔ وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلٰی النَّارِ اَلِیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا قَالْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝

۳۵۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُو الْعِزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَہُمْ مَا کَانَتْہُمْ یَوْمِ یَرُوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّہَارٍ بَلٰغٌ فَاَلَمْ یَہْلُکْ اِلَّا الْقَوْمَ الْفٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۳۔ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس خدا نے سارے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے ذرا بھی عاجز نہیں ہوا وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۴۔ اس دن کا سوچ کہ جس دن کفار آگ کے سامنے پیش کیے جائیں گے (تو ان سے کہا جائے گا) کیا یہ برحق نہیں ہے؟ تو وہ لوگ کہیں گے بالکل، ہمارے پروردگار کی قسم (کہ برحق ہے، تو اس وقت) فرمائے گا تو لو اب اپنے انکار و کفر کے بدلے عذاب

کامزہ چکھو۔

۳۵۔ بنا بریں جس طرح اولوالعزم پیغمبر صبر کرتے رہے تو بھی اس طرح صبر کر اور ان کے (عذاب کے) لئے تعجیل نہ کر، جس دن وہ ان وعدوں کو دیکھیں گے جو ان سے کیے گئے تھے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ گویا ایک دن میں گھڑی بھر دنیا میں رہے ہیں، یہ ابلاغ ہے سب لوگوں کے لیے، تو کیا فاسق لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟

تفسیر

اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر کریں:

یہ آیات جو سورۃ احقاف کی آخری آیتیں ہیں "معاد" کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔ کیونکہ ایک تو گزشتہ آخری آیات میں جنوں کے مبتلیں کی زبانی معاد کی بات ہوئی تھی اور دوسرے سورۃ احقاف کے ابتدائی حصوں میں تو حید عظمت قرآن مجید اور پیغمبر اسلام کی نبوت کے اثبات کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے اور اس سورت کے آخری حصے میں معاد کے مسئلے کو پیش کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سے تینوں اعتقادی اصولوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جس خدا نے سارے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے ذرا بھی ٹھکا نہیں اور نہ ہی عاجز ہوا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے، یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے (اولمیروا ان اللہ الذی خلق السماوات والارض ولم یعی بخلقہن بقادر علی ان یحیی الموتی بلی انہ علی کل شیء قدير)۔

آسمانوں اور زمین کو رنگارنگ اور مختلف مخلوق سمیت خلق کرنا ہر چیز پر اس کی قدرت کی علامت ہے کیونکہ جو چیز بھی تصور میں آجائے اسے خدا ہی نے اس دنیا میں خلق فرمایا ہے۔ تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ انسانوں کو دوبارہ زندگی عطا کرنے سے عاجز ہو؟ یہ امکان معاد پر ایک نہایت دندان شکن دلیل ہے۔

اصولی طور پر ہر چیز کے امکان کی دلیل اس کا خود اپنا وقوع پذیر ہونا ہے۔ ہم جو اس قدر جاندار چیزوں کو بے جان چیزوں سے معرض وجود میں آتا دیکھ رہے ہیں، تو معاد کے مسئلے میں اس کی قدرت مطلقہ کے بارے میں کس طرح شک کر سکتے ہیں؟

یہ معاد کے متعدد دلائل میں سے ایک ہے جو خداوند عالم نے قرآن مجید کی مختلف آیات میں بیان فرمائے ہیں، مہملہ ان کے سورہ یس کی آیت ۸۱ میں بھی ملے۔

بعد کی آیت میں گناہگاروں اور معاد کے منکروں کے دردناک سزا کے منظر کو مجسم کر کے فرمایا گیا ہے:

اِس دِنِ كَا سُوْجٍ كَمِ حَسْبِ دِنِ كَقَارِاٰگ کے سامنے پیش کیے جائیں گے (و یوم یعرض الذین کفروا علی النار)۔ جی ہاں! کبھی تو دوزخ کو کافروں اور گناہگاروں کے سامنے لایا جائے گا اور کبھی گناہگاروں اور کافروں کو دوزخ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور ہر ایک کا اپنا خاص مقصد ہوگا جن کے بارے میں چند آیات پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ جب کفار کو جہنم کے سامنے پیش کیا جائے گا اور وہ جہنم کے مہلسا دینے والے کوہ بیکر اور وحشت ناک شعلوں کو دیکھیں گے تو ان سے کہا جائے گا: کیا یہ برحق نہیں (الیس ہذا بالحق)۔

آیا آج بھی قیامت، خدا کی عدالت اور اس کی سزا و جزا کا انکار کر سکتے تھو؟ اب بتاؤ کہ کیا یہ گذشتہ لوگوں کے خرافات پر مبنی قصے کہانیاں ہیں؟

انہیں اعتراف کے سوا کوئی اور صورت نظر نہیں آئے گی لہذا: کہیں گے بالکل ہمارے پروردگار کی قسم (برحق ہے اس میں کسی قسم کا شک شبہ نہیں، ہم خود گمراہ تھے کہ اسے ناحق سمجھتے تھے) قالوا بلی وربنا۔

تو اس وقت خداوند تعالیٰ یا اس کے فرشتے کہیں گے: تو لو اب انکار اور کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو (قال فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون)۔

تو اس طرح سے وہ تمام حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور اعتراف کریں گے، اعتراف اور اقرار بھی ایسا کہ جو انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا اور سوائے روحانی اور وجدانی تکلیف و حسرت و اندوہ کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں جو درحقیقت سورہ احقاف کی بھی آخری آیت ہے، اللہ تعالیٰ گزشتہ آیات میں معاد کے اثبات اور کفار کی سزا کے پیش نظر اپنے رسول کو حکم دیتا ہے: ”بنابریں! جس طرح اولوا العزم پیغمبر صبر کرتے رہے تو بھی صبر کرو (فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل)۔

صرف آپ ہی کو اس قوم کی عداوت اور مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تمام اولوا العزم پیغمبروں کو بھی یہی مشکلات درپیش تھیں اور انہوں نے استقامت اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ عظیم پیغمبر نوحؑ نے ۹۵۰ سال تک تبلیغ دین کی لیکن تھوڑے سے لوگوں کے سوا ان پر کوئی ایمان نہ لایا بلکہ ان کو مسلسل تکلیفیں دیتے رہے اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔

ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا، موسیٰؑ کو جان سے مار دینے کی دہائی گئی، ان کا دل قوم کی نافرمانیوں اور خلاف ورزیوں کی وجہ سے خون ہو گیا اور عیسیٰؑ کو زبردست تکلیفیں پہنچائی گئیں، انہیں بھی جاہل سے مار دینے کے منصوبے بنائے گئے، لیکن

خدا نے ہمیں سپایا، غرض جب سے دُنیا قائم ہے یہی کچھ ہوتا آ رہا ہے اور صبر و استقلال کی طاقت کے بغیر ان مشکلات پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔

اولوالعزم پیغمبر کون تھے؟

اولوالعزم پیغمبر کون تھے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آرا ہیں اور اس سلسلے میں تحقیق کرنے سے پہلے ”عزم“ کے معنی کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ”اولوالعزم“ کا معنی ”صاحبان عزم“ ہے۔

”عزم“ محکم اور پختہ ارادے کو کہتے ہیں۔ راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں:

”عزم القلب علی امضاء الامر“

”کسی کام کو گزرنے کے بارے میں پختہ ارادہ کر لینا“

قرآن پاک میں ”عزم“ کبھی تو ”صبر“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسے:

”ولمن صبر و غضرات ذلک لمن عزم الامور“

”جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ چیز عزم امور میں سے ہے۔ (شوریٰ / ۴۲)

اور کبھی ”ایفائے عہد“ کے معنی میں، جیسے:

”ولقد عھدنا الی آدم من قبل فنیس ولم نجد له عزمًا“

”ہم نے پہلے سے آدم کے ساتھ عہد کر لیا، لیکن وہ فراموش کر گئے اور اپنے عہد پر باقی نہ رہے“

(طلہ / ۱۱۵)

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ جو انبیاء نئی شریعت اور جدید دین لے کر آئے تھے انہیں دوسروں سے زیادہ مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان کا مقابلہ انہوں نے بڑے محکم عزم اور ارادے سے کیا لہذا ایسے انبیاء کو ”اولوالعزم“ کہا جاتا ہے اور زیر تفسیر آیت بھی بظاہر اسی چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ضمنی طور پر یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انہی رسولوں میں سے ہیں کیونکہ قرآن کہتا ہے: تو بھی اسی طرح صبر کر جس طرح اولوالعزم رسول صبر کرتے رہے۔

یہ جو بعض مفسرین نے ”عزم“ اور ”عزمیت“ کی ”حکم اور شریعت“ کے معنی سے تفسیر کی ہے تو یہ اس کے معنی کی مناسبت سے ہے، وگرنہ لغت میں ”عزم“ بمعنی ”شریعت“ نہیں آیا۔

بہر حال اس معنی کے لحاظ سے ”من الرسل“ میں ”من“ ”تبعیضتہ“ اور بزرگ انبیاء کے ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ ہے جو صاحبان شریعت تھے، جیسا کہ سورہ احزاب کی ساتویں آیت میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

”واذ اخذنا من النبیین میثاقہم ومنک ومن نوح و ابراہیم و

موسىٰ و عيسىٰ بن مريم و اخذنا منهم ميثاقًا غليظًا
 ” اس وقت کو یاد کر جب ہم نے انبیاء سے پیمان لیا اور تجھ سے اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ
 بن مریم سے بھی۔ ہم نے ان سب سے محکم اور پختہ پیمان لیا۔ (احزاب، ۷)
 یہاں پر تمام انبیاء کا جمع کی صورت میں ذکر کرنے کے بعد ان پانچ عظیم پیغمبروں کا نام لیا گیا ہے جو ان کی خصوصیت کی
 دلیل ہے۔

سُورۃ شوریٰ کی تیسری آیت میں بھی انہی کا ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:
 ” شرع لکم من الدین ما وصیٰ بہ نوحًا واذیٰ او حینا الیک وما
 وصینا بہ ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ۔“
 ” اس نے تمہارے لیے اس دین کو مقرر کر دیا ہے جس کی نوح کو سفارش کی اور جس کی ہم نے تیری
 طرف وحی کی اور ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی اس کی سفارش کی۔“
 شیعہ اور سنی کتب میں اس بارے میں بہت سی روایات ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اولوا العزم پیغمبر ہی پانچ ہیں
 جیسا کہ حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے ایک روایت ہے:
 ” منهم خمسة، اولهم نوح ثم ابراهیم ثم موسیٰ ثم عیسیٰ
 ثم محمدؐ، لہ
 ایک اور روایت میں جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے:
 ” منهم خمسة اولوا العزم من المرسلین، نوح و ابراہیم و موسیٰ و
 عیسیٰ و محمدؐ۔“

راوی نے پوچھا:

” لیسوا اولوا العزم؟“

” انہیں اولوا العزم کیوں کہا جاتا ہے؟“

تو امام نے فرمایا:

” لانہم بعثوا الی شرقها و غربها و جنہا و انسہا۔“

” کیونکہ وہ شرق و غرب اور جن و انس کی طرف مبعوث ہوئے۔“ لہ

ایک اور حدیث میں بھی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”سادة النبيين والمرسلين خمسة وهم اولوا العزم من الرسل و

عليهم داراة الرحي نوح و ابراهيم وموسى و عيسى و محمد“

انبیاء و مرسلین کے سردار پانچ ہیں اور وہی اولوا العزم رسول ہیں نبوت و رسالت کی چچی ان کے

گردگھومتی ہے اور وہ ہیں حضرات نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام۔ لہ

تفسیر ”درمنثور“ میں ابن عباس سے بھی یہی چیز منقول ہے کہ اولوا العزم رسول پانچ ہیں۔ لہ

البتہ بعض مفسرین اولوا العزم رسولوں سے وہ رسول مراد لیتے ہیں جنہیں دشمنوں سے لڑنے کا حکم ملا۔

بعض مفسرین نے ان کی تعداد تین سو تیرہ بتاتے ہیں۔ لہ

جبکہ بعض دوسرے مفسرین تمام پیغمبروں کو اولوا العزم (قوی ارادے کا مالک) سمجھتے ہیں۔ لہ

اور اس قول کے مطابق ”من الرسل“ میں ”من“ بیانہ سے تہیضیہ نہیں ہے۔

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ صحیح ہے اور اسلامی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔

ان سب باتوں کے بعد قرآن فرماتا ہے: اور ان کفار کے بارے میں عذاب کی تعجیل نہ کر۔ (ولا تستعجل لہم)۔

کیونکہ قیامت جلد آنے والی ہے اور جس چیز کے بارے میں خود ان کو جلدی ہے وہ اسے بہت جلد اپنی آنکھوں سے

دیکھ لیں گے۔ اس دن انہیں سخت سزا دی جائے گی پھر انہیں اپنی غلطیوں کا پتہ چلے گا۔

دُنیا کی عمر آخرت کے مقابلے میں اس قدر کوتاہ ہے کہ ”جس دن وہ ان وعدوں کو دیکھیں گے جو ان سے کیے گئے

تھے تو انہیں معلوم ہوگا کہ گویا دن کی صرف ایک گھڑی وہ اس دُنیا میں ٹھہرے ہیں (کانہم یوم یرون ما یوعدون

لہم یلبثوا الا ساعة من نهار)۔

آخرت کے مقابلے میں دنیاوی عمر کی کمی کا احساس یا تو اس لیے ہوگا کہ واقعا یہ زندگی اس حیات جاوید کے مقابلے

میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے، یا پھر اس لیے کہ یہ دنیا اس قدر تیزی سے گزر رہی ہے کہ گویا ایک گھڑی سے زیادہ

نہیں ہے یا اس لیے کہ انہوں نے اپنی پوری دنیا سے کما حقہ فائدہ اٹھایا، لہذا اس کا ثمرہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔

اب حسرت ان کے دلوں پر چھائی ہوگی، لیکن اس کا کیا فائدہ؟ کیونکہ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہوں گی۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ:

”کم مابین الدنیا والآخرۃ؟“

”دُنیا اور آخرت کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟“

تو آپ نے فرمایا:

« غمضة عين »

« صرف پلک چھپکنے کا »

پھر فرمایا خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے :

« کانہم یوم یرون ما یوعدون لم یلبثوا الا ساعة من نهار ^{لہ} »

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ « ساعة » کی تعبیر عام گھنٹے یا گھڑی کی مقدار کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ زمانے کے مختصر اور کم ہونے کی طرف اشارہ ہے :

پھر تمام لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : یہ ابلاغ ہے، سب لوگوں کے لیے (بلاغ)۔
ان سب لوگوں کے لیے جو پروردگار کی عبودیت کی راہ سے ہٹ گئے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو دنیا کی زد و گداز زندگی اور اس کی خواہشات میں مگن ہو چکے ہیں۔ المختصر اس ناپائیدار دنیا میں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے ابلاغ ہے۔
آخری جملے میں بامعنی اور تمہیداً آمیز سوال کے طور پر فرمایا گیا ہے : تو کیا فاسق لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک ہوگا؟
فہل یرہلک الا القوم الفاسقون۔

آنحضرت صبر و استقامت کا مجسم نمونہ تھے

خدا کے عظیم پیغمبروں خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کی زندگی سخت مصائب، زبردست طوفانوں اور طاقت فرسا مشکلات کے مقابلے میں انتہائی صبر و استقامت کی آئینہ دار تھی۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے راہ حق میں اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، راہ حق کے راہیوں کو اس سے سبق لینا چاہیے۔

ہم عام طور پر تاریخ اسلام کے روشن نقطے سے اس کے ابتدائی تاریک ایام کو دیکھنے کے عادی ہیں، اور مستقبل کے جھروکوں سے ماضی کو دیکھنے کا یہ انداز حقائق و واقعات کو اور طرح سے پیش کرتا ہے۔ لیکن ہمیں ان ایام کو تصور میں لانا چاہیے جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنہا تھے اور افق زندگی میں کامیابی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔
ہٹ دھرم دشمن ان کی نابودی پر کمر بستہ تھے، حتیٰ کہ ابولہب جیسے نزدیک ترین رشتہ دار بھی صف اول کے دشمنوں میں شامل تھے۔

آپ مسلسل قبائل عرب کے پاس جاتے تھے، انہیں اسلام کی دعوت دیتے تھے، لیکن کوئی بھی شخص مثبت جواب

لے روزتہ الوا عظیمین منقول از نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۵۔

لہ « بلاغ » بتائے محذوف کی خبر ہے، جس کی تقریری صورت یہ ہے۔ « هذا القرآن بلاغ » یا « هذا الوعظ والانتذار بلاغ »

نہیں دیتا تھا۔

آپؐ پر اس قدر پتھر برساتے کہ بدن مبارک سے خون بہنے لگ جاتا، لیکن آپؐ اپنے مشن پر ڈٹے رہے۔ ان کا سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی بائیکاٹ اس حد تک سخت کر دیا گیا تھا کہ ہر طرف کی راہیں آپؐ پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر مسدود ہو گئی تھیں، کچھ تو بھوک کی وجہ سے اور کچھ بیماری کی وجہ سے راہی ملک بچا ہو گئے۔ آپؐ کے ساتھیوں کو اس قدر ایذا ایسی پہنچائی گئیں اور شکنجوں میں جکڑا گیا کہ ان کے دل و جان پر اس کا اثر ہوا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمؐ پر ایسے سخت دن بھی گزرے ہیں کہ جن کے ذکر سے زبان و قلم دونوں عاجز ہیں۔ جب آپؐ لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے طائف تشریف لے گئے تو اہل طائف نے نہ صرف آپؐ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا بلکہ اس قدر پتھر مائے کہ پاؤں مبارک سے خون جاری ہو گیا۔

بے سمجھ لوگوں کو اکسایا کہ آپؐ پر آوازے کسیں اور بدکلامی کریں، آپؐ کو مجبوراً ایک باغ میں پناہ لینا پڑی اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر اپنے خدا سے یوں راز و نیاز کرنے لگے۔

”اللھم الیک اشکو ضعف قوتی، وقلة حیلتی، وهوانی علی الناس
یا ارحم الراحمین! انت رب المستضعفین، وانت ربی، الی من یتکلی؟
الی بعید یتجھمنی؟ امر الی عد و ملکته امری؟ ان لم یکن یدک
علی غضب فلا ابالی۔۔۔۔۔“

”خداوند! میں اپنی کمزوری، ناتوانی، مجبوری کی اور لوگوں کی مجھ سے بے استراحتی کی تجھ سے شکایت کرتا ہوں۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے تو مستضعفین کا پروردگار ہے، تو میرا پروردگار ہے، تو مجھے کس کے حوالے کرے گا؟ کیا در دراز کے ان لوگوں کے جو مجھے غصے سے بھرے درپیش آئے ہیں یا ان دشمنوں کے جو میرے امر کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے؟ پروردگار! اگر تو مجھ سے راضی ہو جائے تو میرے لیے یہی کافی ہے۔۔۔۔۔“

کبھی وہ لوگ آپؐ کو جاوگر کہتے تھے اور کبھی دیوانہ کہہ کر ہلاتے تھے۔ کبھی آپؐ کے سر پر گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا اور کبھی آپؐ کو شہید کرنے پر ایجا کر لیتے اور آپؐ کے گھر کا تلواروں سے محاصرہ کر لیتے۔

لیکن ان تمام مصائب و مشکلات کے باوجود آپؐ نے صبر و شکیبائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور آخر کار اس کا شیریں پھل بھی پالیا۔ آپؐ کا دین نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں بلکہ مشرق سے غرب تک پھیل گیا۔ اور آج ہر صبح و شام چار گوشہ بہان سے اور دنیا کے پانچوں براعظموں میں اذان سنائی دیتی ہے جو آپؐ کی فتح اور کامرانی

کی آواز ہے۔ اور یہی ہے معنی ”فاصبر كما صبر اولو العزم من الرسل“ کا۔
 اور یہ ہے شیاطین اور اہریمینوں کے ساتھ نبرد آزمائی کا طریقہ، ان پر کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ کار اور
 خدا کے عظیم اہداف و مقاصد تک رسائی کا انداز۔
 تو پھر آج آرام طلب لوگ صبر و شکیبائی اور رنج و غم اٹھانے بغیر کیونکر اپنے عظیم مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں؟
 آج کے مسلمان اس قدر دشمنوں کے مقابلے میں جوان کی نابودی پر تلے ہوئے ہیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ
 وسلم کے صحیح اور اصلی مکتب سے ہدایت اور سبق حاصل کئے بغیر کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں؟
 مسلمان رہنا اور لیڈر تو خاص طور پر یہ طرز عمل اپنانے کے پابند ہیں۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام
 فرماتے ہیں:

”ان الصبر علی ولاة الامر مفروض لقول الله عز وجل لنبيه،
 فاصبر كما صبر اولو العزم من الرسل، وایجابہ
 مثل ذالك علی اولیائہ واهل طاعته بقوله، لقد
 كان لکم فی رسول الله اسوة حسنة“

”رہبروں اور زمام داروں پر صبر و استقامت فرض ہے کیونکہ خدا نے اپنے پیغمبر صلی
 اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا ہے۔ ”فاصبر كما صبر اولو العزم من الرسل
 اور اسی چیز کو اپنے دوستوں اور اطاعت گزاروں پر بھی فرض قرار دیا ہے کیونکہ
 اس کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ کی ذات تمہارے لیے ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ تم سب
 کو ان کی پیروی کرنی چاہیے۔“

خداوند! یہ عظیم نعمت، یہ آسمانی عطیہ اور مصائب و مشکلات کے مقابلے میں یہ صبر و شکیبائی اور استقامت
 ہمیں بھی عنایت فرما۔

پروردگار! ہدایت کا یہ چراغ جسے تیرے اولو العزم رسولوں خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
 نے طاقت فرما تکلیفیں اٹھا کر بشریت کے راستے میں روشن رکھا ہے، ہمیں تو فیق عطا فرما کہ ہم اسے
 روشن ہی رکھیں اور پوری لیاقت کے ساتھ اس کی حفاظت کرتے رہیں۔

بار الہا! ہم جانتے ہیں کہ حق کے تمام دشمن متفق اور متحد ہو چکے ہیں اور کسی بھی جرم کے ارتکاب
 سے دریغ نہیں کرتے تو ان کی کوششوں سے زیادہ ہمیں صبر و شکیبائی کی تو فیق عطا فرما تاکہ ان بے
 حد و حساب مشکلات کے سامنے ہم ہرگز نہ جھکنے پائیں اور طوفانی موجوں سے کامیابی سے گزر جائیں

ادریتیری امداد اور شریکے بے انتہا لطف و کرم کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔ ا۔
اَمْسِیْنَ یَا سَرِیْبَ الْعَالَمِیْنَ

سُورَةُ اِحْقَافِ

کی

تفسیر ختم ہوئی

جمعہ ۳ رمضان ۱۴۰۵ھ

سُورَةُ مُحَمَّدٍ

یہ سورت مدینہ میں نازل ہوئی

اور
اس کی ۳۸ آیتیں ہیں

تایخ اعجاز
۲ شجوان جمعتہ المبارک ۱۴۰۵ھ

سورہ محمد کے مضامین

اس سورت کی دوسری آیت میں چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام مذکور ہوا ہے اس لیے اس کا نام ”محمد“ رکھا گیا ہے اور اس کا دوسرا نام قتال بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دشمنان اسلام کے ساتھ جنگ اور جہاد جو نہایت اہم موضوع ہے اس سورت پر سایہ فگن ہے جب کہ اس سورت کی دوسری بہت سی آیات میں کفار اور مومنین کے حالات اور صفات خصوصیات کا تقابل کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے اخروی انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ کلی طور پر اس سورت کے ذیل کے مضامین کو چند حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- ① ایمان اور کفر کا مسئلہ اور اس دنیا میں اور اس جہان میں مومنین اور کفار کے حالات کا تقابل۔
- ② دشمنوں کے ساتھ جنگ اور جہاد کے مسئلے پر واضح اور تفصیلی بحث اور جنگی قیدیوں کے متعلق حکم۔
- ③ اس کا ایک بڑا حصہ منافقین کے حالات کی تشریح کرتا ہے، جو ان آیات کے نزول کے وقت مدینہ میں تخریبی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔
- ④ ایک اور حصے میں ”زمین کی سیر“ اور گزشتہ اقوام کے انجام کے سلسلے میں تحقیق کی بات کی گئی ہے اور ان کے انجام سے درس عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔
- ⑤ کچھ آیات میں جنگ کے مسئلے کی مناسبت سے الہی امتحان کا تذکرہ ہے۔
- ⑥ ایک اور حصے میں ”نفاق“ (راہ خدا میں خرچ کرنے) کی بات کی گئی ہے جو بذات خود جہاد کی ایک قسم ہے اور اس کا نقطہ مقابل ”خیل“ ہے۔ اس کے بارے میں بھی گفتگو کی گئی ہے۔
- ⑦ سورت کی بعض آیات میں اسی مناسبت سے کفار کے ساتھ صلح (جو شکست اور ذلت کا موجب بنے) کی بات کی گئی ہے اور اس قسم کی صلح سے روکا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اس سورت میں جس اصل مسئلے پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ جنگ کا مسئلہ ہے اور باقی مسائل اسی محور کے گرد گھومتے ہیں، کیونکہ یہ سورہ مدینہ میں اس وقت نازل ہوئی جب کافروں کی دشمنان اسلام کے ساتھ جنگ زور پڑتی اور بعض مفسرین کے بقول جنگ اُحد کے دوران یا اس کے بہت تھوڑے عرصے بعد نازل ہوئی۔ ایسی جنگ جو تقدیر ساز اور مومنین کو کفار اور منافقین کی صفوف سے جدا کر دینے والی ہو، ایسی جنگ جو اسلام کی بنیادوں کو

حکم کر دے اور ان دشمنانِ اسلام کو سبق سیکھائے جو اسلام اور مسلمانوں کی نابودی کا ارادہ رکھتے ہوں۔

سورہ محمد کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

”من قرأ سورة محمد كان حقاً على الله ان يسقيه من انهار الجنة“
”جو شخص سورہ محمد کی تلاوت کرے گا، خدا پر حق بن جاتا ہے کہ اسے بہشت کی نہروں سے سیراب کرے۔“

کتاب ”ثواب الاعمال“ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی ایک حدیث نقل کی گئی جس میں آپ نے فرمایا ہے:

”من قرأ سورة آلذین کفروا (سورہ محمد) لم یرتب ابداً، ولم یدخله شک فی دینہ ابداً، ولم یبتله الله بفقر ابداً، ولا خوف سلطان ابداً، ولم یزل محفوظاً من الشرک والكفر ابداً حتی یموت، فناذامات وکله الله به فی قبره الف ملة یصلون فی قبره ویکون ثواب صلاتهم له ویشیعونه حتی یوقفوه موقوف الامن عند الله عز وجل ویکون فی امان الله وامن محمد“

”جو شخص سورہ محمد کی تلاوت کرے، کبھی بھی شک و شبہ اس کے دین میں داخل نہیں ہوگا اور خدا اسے کبھی دین کے فقر میں مبتلا نہیں کرے گا اور اسے ہرگز بادشاہ کا خوف لاحق نہیں ہوگا اور آخر تک شرک و کفر سے محفوظ اور امان میں ہوگا اور جب مے گا تو خدا ایک ہزار فرشتے کو حکم دے گا کہ اس کی قبر میں جا کر نماز ادا کریں اور اس نماز کا ثواب اس مرنے والے کو ملے گا اور یہ ہزار فرشتے محشر تک اس کے ساتھ رہیں گے اور عرصہ محشر میں اسے امن و امان کے مقام پر لے جا کر کھڑا کریں گے اور وہ ہمیشہ اللہ اور محمد کی امان میں رہے گا۔“

ظاہر سی بات ہے کہ جو لوگ ان آیات کے مندرجات کو اپنی ذات پر نافذ کریں گے اور سخت، بے رحم اور بے منطق دشمن کے ساتھ برسرِ پیکار ہوں گے تو ان کے دل میں نہ تو کسی قسم کا شک و شبہ پیدا ہوگا اور نہ ہی ارادہ میں لغزش یا ایک تو ان کے دین کی بنیادیں مستحکم ہوں گی اور دوسرے خوف، ذلت اور تنگ دستی کا خاتمہ ہوگا اور ساتھ ہی قیامت میں رحمت

۱۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۹، سورہ محمد کا آغاز۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۲۵۲ بحوالہ ثواب الاعمال۔

الہی کے جواریں نعمتوں سے بہرہ درہوں گے۔

ایک اور حدیث میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

”من اراد ان یعرف حالنا و حال اعدائنا فلیقرء سورۃ محمد فانہ یراها

ایۃ فینا و ایۃ فیہم“

”جو ہمارے اور ہمارے دشمنوں کے حال کو دیکھنا چاہے اسے سورۃ محمد کی تلاوت کرنا چاہیے

کیونکہ اس کی ایک آیت ہمارے حق میں اور ایک آیت ہمارے دشمنوں کے بارے میں ہے۔“

اس حدیث کو ”اہل سنت کے مفسر آکوسمی نے رُوح المعانی میں اور سیوطی نے در مشور میں بھی نقل کیا ہے۔

یہ حدیث اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ ایمان کا کامل نمونہ اہل بیت پیغمبر علیہم السلام اور کفر و نفاق کا مجسم نمونہ بنی امیہ

ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سورۃ میں اہل بیت کے نام سے تصریح نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی بنی امیہ کا نام لیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ مومن

اور منافق گروہوں کے بارے میں اور ان کی خصوصیات کے سلسلے میں بحث کی گئی ہے، لہذا سب سے پہلے ان دو واضح مصداقوں

کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ البتہ تمام مومنین اور تمام منافقین پر اس کے صادق آنے میں کوئی مانع نہیں ہے۔

- بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
- ۱۔ الَّذِیْنَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝
 - ۲۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوا بِمَا نَزَّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ لَآ كَفَرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَاَصْدَحَ بِالْهَمِّ ۝
 - ۳۔ ذٰلِكَ بَآئِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا وَاَتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَبِّهِمْ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور لوگوں کو خدا کے راستے سے روکا وہ ان کے اعمال کو اکارت کر دیتا ہے۔
- ۲۔ اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے اور جو کچھ محمدؐ پر نازل ہوا اور سب برحق ہے اور پروردگار کی جانب سے ہے، اس پر بھی ایمان لے آئے تو خدا ان کے گناہوں کو بھی بخش دے گا اور ان کی حالت سنوار دے گا۔
- ۳۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی اور مومنوں نے اس حق کی جو ان کے پروردگار کی طرف سے تھا۔ اللہ اس طرح لوگوں کے لیے ان کی زندگی کو بیان کرتا ہے۔

تفسیر

مؤمن حق کی اور کافر باطل کی اتباع کرتے ہیں:

یہ تین آیات درحقیقت مقدمہ ہیں ایک اہم جنگی حکم کا جو چوتھی آیت میں دیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں کفار اور دوسری میں مومنین کا حال بیان کرنے کے بعد تیسری آیت میں ان کا آپس میں تقابل کیا گیا ہے تاکہ جب دونوں خطوط اور راستے واضح ہو جائیں تو ظالم اور بے رحم دشمن کے ساتھ عقیدے پر مبنی جنگ کے لیے پوری آمادگی حاصل ہو جائے۔ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور لوگوں کو خدا کے راستے سے روکا اللہ ان کے اعمال اکارت کر دیتا ہے (الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ اضل اعمالہم)۔

یہ کفار کے سرخٹوں اور مکہ کے مشرکین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکائی تھی۔ وہ خود ہی کافر نہیں تھے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی مختلف حیلوں اور بہانوں سے خدا کے راستے سے روکتے تھے۔ اگرچہ بعض مفسرین مثلاً کثاف میں زرخشری کے مانند یہاں پر ”صد“ کی ایمان سے ”روگردانی“ کے معنی کی تفسیر کی گئی ہے بعد کی آیات کے مقابل میں جن میں ایمان کی بات کی گئی ہے، لیکن اس کلمے کے قرآن مجید میں استعمال کے مواقع کے پیش نظر اس کے اصلی معنی کو ہی لیا جائے گا جو ”روکنے اور منع کرنے“ کے ہیں۔

”اضل اعمالہم“ سے مراد یہ ہے کہ ان کے اعمال اکارت کر دے گا، کیونکہ گم کرنا، کنایہ ہے کسی چیز کے بے سرپرست ہونے کے لیے کہ جس کے نتیجے میں وہ چیز ختم ہو جاتی ہے۔

بہر حال بعض مفسرین نے اس جملے کو ان لوگوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جنہوں نے جنگ بدر کے دن اونٹ سخر کر کے لوگوں میں تقسیم کیے۔ البوجل نے دس اونٹ، صفوان نے دس اونٹ، اور سہل بن عمرو نے بھی دس اونٹ اپنے فوجیوں کے لیے سخر کیے تھے۔ لے لیکن چونکہ یہ کام شیطانی مقاصد اور شرک کے لیے تھے لہذا سب ضبط ہو گئے۔

لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اسی معنی میں محدود نہیں ہے، بلکہ انہوں نے محتاجوں یا مہمانوں کی امداد وغیرہ کے لیے جو بھی ظاہری اعمال انجام دئے ہیں ان کے خدا پر ایمان نہ ہونے کے سبب سب کے سب اکارت جائیں گے۔

علاوہ ازیں انہوں نے اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے جو کام بھی کیے ہیں خدا تعالیٰ نے ان سب کو بھی فنا اور ناسرمد بنا دیا اور انہیں مقصد تک پہنچنے سے روک دیا۔

بعد کی آیت مؤمنین کی کیفیت بیان کر رہی ہے جو کفار کے مد مقابل ہیں اور ان کفار کی کیفیت گزشتہ آیت میں مذکور ہو چکی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے اور جو کچھ محمدؐ پر نازل ہوا اور سب برحق ہے اور پروردگار کی جانب سے ہے، اس پر بھی ایمان لے آئے تو خدا ان گناہوں کو بھی بخش دے گا اور ان کی دنیا اور آخرت میں حالت سنوار دے گا۔ (والذین آمنوا و عملوا الصالحات و امنوا بما نزل علی محمد و هو الحق

من ربہم کفر عنہم سیئاتہم و اصلح بالہم)۔ لہ

مطلق ایمان کا ذکر کرنے کے بعد جو کچھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اُس پر ایمان کا تذکرہ رسول اعظم کے تمام امور پر ایمان لانے کا تاکید ہی بیان ہے گویا یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے اور اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کردہ چیزوں پر ایمان نہ لایا جائے اس وقت تک خدا پر ایمان کی تکمیل ناممکن ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ شاید یہ پہلا جملہ خدا پر ایمان کی طرف اشارہ ہو جو اعتقادی پہلو کا حامل ہے اور یہ جملہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور اسلام کے پیش کردہ نظام اور احکامات پر ایمان کی طرف اشارہ ہو جو عملی پہلو کا حامل ہے۔ بالفاظ دیگر صرف خدا پر ایمان لانا کافی نہیں ہے۔ "ما نزل علیہ" پر ایمان بھی ضروری ہے، قرآن پر ایمان، جہاد پر ایمان، نماز روزے پر ایمان اور ان اخلاقی اقدار پر ایمان جو آپ پر نازل ہوئیں۔

ایسا ایمان جس سے اعمال صالحہ کی بجآوری کے لیے محرک پیدا ہو۔
یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس جملے کے بعد فرمایا گیا ہے:

"وہو الحق من ربہم۔"

حالانکہ وہ برحق اور خدا کی طرف سے ہے۔

یعنی ان کا ایمان نہ تو کسی حساب و کتاب کے بغیر ہوتا ہے اور نہ ہی بغیر کسی دلیل و استدلال کے ہے، کیونکہ انہوں نے حق کو پہچانا ہے، لہذا اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

اور "من ربہم" (ان کے پروردگار کی طرف سے) اس حقیقت کی تاکید ہے کہ حق ہمیشہ پروردگار کی طرف سے ہوتا ہے، اسی سے معرض وجود میں آتا ہے اور اسی کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

یہ بات بھی شایان توجہ ہے کہ جس طرح راہ حق سے روکنے والے کفار کے لیے دو سزائیں بیان ہوئی ہیں اسی طرح صالح العمل مؤمنین کے لیے بھی جزائیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے ایک تو لغزشوں کی معافی اور خطاؤں کی بخشش ہے جن کے ارتکاب سے کوئی بھی غیر معصوم محفوظ نہیں ہے اور دوسرے حالات کی: "الح اور امور کا سنوارنا جسے "اصلاح بال" کہا گیا ہے۔ "بال" کے مختلف معانی مذکور ہوئے ہیں مثلاً حال، کام اور بدل لیکن مفردت میں راغب کے بقول "زبردست اہمیت کے حامل حالات" کے معنی میں ہے۔ بنا بریں "اصلاح بال" کا معنی تمام زندگی کے مکمل امور کو سنوارنا اور سدھارنا ہے جو

لے کچھ مفسرین نے "وہو الحق من ربہم" کے جملہ کو جملہ مترادف سمجھا ہے۔

فطری طور پر دنیا اور آخرت کی کامیابی پر مشتمل ہوتے ہیں کفار کے انجام کے بالکل برعکس کہ "اصنل اعمالہم" کے پیش نظر جن کی تمام نگہ دہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتی اور سوائے شکست کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ گناہوں کی معافی ان کے ایمان کا نتیجہ ہوتی ہے اور اصلاح بال ان کے اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مؤمنین کو ایک تو ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے اور دوسرے انہیں عملی پروگراموں میں کامیابی حاصل ہوتی ہے جو وسیع پیمانے پر اصلاح امور کی صورت ہوتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے کہ انسان کو روحانی سکون اور قلبی اطمینان کے حصول کے علاوہ مفید اور تعمیری پروگراموں پر عمل پیرا ہونا نصیب ہو۔ اس سلسلے کی آخری آیت میں مؤمنین کی کامیابی اور کفار کی شکست کا اصل نکتہ ایک مختصر لیکن واضح تقابل کی صورت میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ اس وجہ سے ہے کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی اور توہمنوں نے اس حق کی جو ان کے پروردگار کی طرف سے تھا۔ (ذالک بان الذین کفروا اتبعوا الباطل وان الذین امنوا اتبعوا الحق من ربہم۔)

تمام مطالب کی جان ہی ایک نکتہ ہے جس سے "ایمان" اور "کفر" کے دو خطوط بالترتیب "حق" اور "باطل" سے حاصل ہوتے ہیں۔ "حق" یعنی عینی حقیقتیں جن میں سرفہرست پروردگار عالم کی ذات پاک ہے اور اس کے بعد وہ حقائق ہیں جن کا انسانی زندگی سے تعلق ہوتا ہے اور وہ قوانین ہیں جو بندے اور خدا کے درمیان نیز خود بندوں کے درمیان باہمی رابطے کا کام دیتے ہیں۔

"باطل" یعنی اٹکل پچو، خیالات، نیرنگیاں، خرافاتی افسانے اور بے ہودہ اور بے مقصد کام، غرض عالم ہستی پر حکم فرما ہر قسم کے گمراہ کن قوانین۔

جی ہاں! مؤمنین حق کی اس معنی کے ساتھ جو بیان ہوا ہے پیروی کرتے ہیں اور کفار، باطل کی۔ یہی وجہ ہے کہ مؤمنین کو کامیابی اور کفار کو ناکامی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"وما خلقنا السماء والارض وما بینہما باطلاً"

"ہم نے تمام آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔" (ص ۲۷)

بعض مفسرین نے "باطل" کو شیطان کے اور بعض نے "بیہودہ اور بے مقصد" کے معانی سے تفسیر کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں "باطل" کو سین معنی میں استعمال ہوا ہے جو ان معنی اور دوسرے معانی پر بھی محیط ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا لوگوں کے لیے ان کی زندگی یوں بیان فرماتا ہے (کذالک یضرب

اللہ للناس امثالہم۔)

یعنی جس طرح اللہ نے مؤمنین اور کفار کی زندگی کے خطوط، ان کے عقائد اور عملی پروگرام اور نتائج کو ان آیات میں بیان

فرمایا ہے اسی طرح وہ ان کی زندگی کے انجام اور عاقبت الامر کو بھی واضح فرماتا ہے۔
 راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں کہ ”مثل“ کسی چیز کے بارے میں ایسی گفتگو کو کہتے ہیں جیسی اس مطلب کے
 مشابہ کے بارے میں کی گئی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے کو واضح کریں۔
 راغب کی دوسری گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلمہ کبھی تو ”مشابہت“ کے معنی میں اور کبھی ”توصیف“ کے معنی
 میں استعمال ہوتا ہے۔
 زیر تفسیر آیت میں لفظ ہر دوسرا معنی مراد ہے، یعنی خدا اس طرح لوگوں کے حالات بیان کرتا ہے جیسا کہ سورہ مجرّموں
 کی پندرھویں آیت میں ہے:

”مثل الجنة التي وعد المتقون“

”بہشت والوں کی صفت کہ جس بہشت کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا کچھ یوں ہے....“

بہر حال اس آیت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ہم حق کے قبلاً نزدیک ہوں گے اسی قدر ایمان کے نزدیک ہوں گے۔
 اور ہمارا ایمان و عمل جس قدر باطل کے نزدیک ہوگا اسی قدر ہم ایمان سے دور ہوں گے، کیوں کہ ایمان و کفر کے خطوط ہی تو حق
 و باطل کے خطوط ہوتے ہیں۔

۴۔ فَاِذَا لَقِيتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى اِذَا اَخَذْتُمُوْهُمْ
فَشُدُّوْا الْوَتَاْقَ فَاِمَامًاۢ بَعْدَ وَاِمًاۢ فِدَاۗءٍ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ
اَوْزَارَهَاۗ ذٰلِكَ ظُ وَاَلَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوْا
بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ وَالَّذِيْنَ قَتَلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ
اَعْمَالَهُمْ

۵۔ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بِاللّٰهِمْ

۶۔ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَفَهَاۗ لِيُصْلِحُ

ترجمہ

۴۔ جب تم میدان جنگ میں کافروں کے آمنے سامنے آ جاؤ تو ان کی گردنیں مار دو، اور اس کام کو برابر جاری رکھو، یہاں تک کہ کافی حد تک دشمن کا ستیاناس کر دو، ایسے میں قیدیوں کو خوب باندھ لو، پھر اس کے بعد یا ان پر احسان کرو (اور انہیں چھوڑ دو) یا رہائی کے بدلے میں ان سے فدیہ لو اور یہ صورت حال اسی طرح جاری رہے، یہاں تک کہ جنگ اپنا سنگین بوجھ زمین پر رکھ دے۔ طریقہ کاری یہی ہے، اگر خدا چاہتا تو ان سے کئی اور طریقے سے انتقام لے لیتا، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمہاری آزمائش ایک دوسرے سے کرے، اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے

- گئے ہیں، خدا ان کے اعمال ہرگز اکارت نہیں کرے گا۔
- ۵۔ عنقریب ان کی ہدایت کرے گا اور ان کا کام اسنوار دے گا۔
- ۶۔ اور انھیں (اپنی جاودانی) بہشت میں داخل کرے گا، جس کے اوصاف اس نے ان سے بیان کر رکھے ہیں۔

تفسیر

میدان جنگ میں ارادے کی پختگی ضروری ہے

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں گذشتہ آیات مسلمانوں کو ایک اہم جنگی حکم کے لیے آمادہ کرنے کے لیے مقدمہ تھیں، جس کے بارے میں زیر تفسیر آیات میں تفصیل سے گفتگو کی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب میدان جنگ میں کافروں کے آمنے سامنے آجاؤ تو پوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ کرو اور ان کی گردنیں مار دو (فانذا لقیتم الذین کفروا فاضرب الرقاب)۔ لہ

ظاہر سی بات ہے کہ ”گردن مار دینا“ قتل کے لیے کنایہ ہے، لہذا اس کی ضرورت نہیں ہے کہ مجاہدین اس بات کی کوشش کریں کہ وہ ان کی صرف گردنیں اڑائیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ دشمن کا صفایا کر دیں، لیکن چونکہ گردن اڑانا قتل کا روشن ترین مصداق ہے لہذا اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

اور ہر حالت میں یہ حکم میدان جنگ کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ ”لقیتم“ جو ”لقاء“ کے مادہ سے ہے اس لیے مواقع پر ”جنگ“ کے معنی میں آتا ہے، متعدد قرینے بھی خود آیت میں اسی معنی پر گواہ ہیں، جیسے ”قید یوں کی اسارت“، ”عرب“ (جنگ) کا لفظ اور ”راہ خدا میں مارا جانا“ وغیرہ۔

قصہ مختصر یہ کہ ”لقاء“ کبھی تو ہر قسم کی ملاقات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی میدان جنگ میں دشمن سے دھڑکھڑ کے لیے اور قرآن مجید میں بھی دونوں معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور زیر نظر آیات میں دوسرے معنی کے لیے

لہ ”ضرب“ مصدر ہے اور ایک فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے، جس کی تقدیر یوں ہے ”اضربوا ضرب الرقاب“ جیسا کہ سورہ انفال آیت

۱۲ میں اس کی تصریح کی گئی ہے کہ ”فاضربوا ففوق الاعناق“۔

استعمال ہوا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی غرض سے آیت کا دوسرے انداز میں معنی کرتے ہیں کہ اسلام کہتا ہے ”جب تم کسی کافر کے آمنے سامنے آ جاؤ تو اس کی گردن اڑا دو“ بدینتی اور توغرضی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جبکہ یہی آیت صراحت کے ساتھ میدان جنگ میں مڈبھیڑ ہونے کی بات کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان میدان جنگ میں کسی نحو خوار کا سامنا کرتا ہے تو اگر پورے عزم اور دو لوگ انداز میں دشمن پر سخت اور تباہ توڑ حملے نہ کرے اور اس پر کاری ضروری نہ لگائے تو خود فنا ہو جائے اور یہ ایک صحیح اور بالکل منطقی حکم ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے: یہ کاری ضروری ان پر برابر جاری رکھو یہاں تک کہ دشمن کا ستیا ناس کر دو اور ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دو۔ ایسے میں قیدیوں کی گرفتاری کا کام کرو اور انھیں خوب باندھ لو۔ (حتیٰ اذا اشختموه و فشدوا الوثاق)۔

”اشختموه“ ”شخن“ (بروزن شخن) ٹھوس اور سخت ہونے کو کہتے ہیں۔ اسی لیے اس کا اطلاق دشمن پر مکمل فتح و کامرانی، واضح غلبہ اور مکمل تسلط حاصل کر لینے پر ہوتا ہے۔

اگرچہ اکثر مفسرین نے اس کو ”دشمن کو کثرت اور شدت کے ساتھ قتل کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتا چکے ہیں یہ اس کا لغوی معنی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک دشمن کو زبردست اور وسیع پیمانے پر قتل نہ کر دیا جائے اس وقت تک خطرہ ٹلتا نہیں ہے۔

لہذا ان حالات میں قتل کرنا اس کا ایک مصداق تو ہو سکتا ہے اس کا اصل مفہوم نہیں ہے۔ لہٰذا بہر حال مندرجہ بالا آیت ایک نہایت حساب شدہ جنگی حکمت عملی بیان کر رہی ہے کہ جب تک دشمن کا زور پوری طرح ٹوٹ نہ جائے اس وقت تک جنگی قیدی بنانے کا اقدام نہ کیا جائے، کیونکہ اس اقدام سے بعض اوقات مسلمانوں کے میدان جنگ میں پاؤں اکھڑ جانے کا احتمال ہوتا ہے اور جنگی قیدیوں کی گرفتاری اور انہیں محاذ سے پیچھے منتقل کرنے کی وجہ سے اصل فریق کی ادائیگی سے رہ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

”فشد و الوثاق“ کی تعبیر اس بات کے پیش نظر کہ ”وثاق“ رسی یا ہراس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو باندھا جائے، جنگی قیدیوں کو اچھی طرح باندھنے کی طرف اشارہ ہے مبادا کوئی قیدی موقع ملنے پر اپنے آپ کو چھڑا لے اور کوئی زبردست نقصان پہنچا دے۔

بعد کے جملے میں جنگی قیدیوں کے بارے میں حکم بیان کیا جا رہا ہے کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، ارشاد فرمایا گیا ہے: یا تو ان پر احسان کرو اور کسی معاوضے کے بغیر انہیں چھوڑ دو یا پھر ان سے فدیہ اور معاوضہ لے کر رہا کر دو۔ (فما مآء بعد و امانا ء)۔

لہٰذا لسان العرب میں ”ابن اعرابی“ سے نقل کیا گیا ہے کہ ”اشخن اذا غلب و قهر“ قہر و غلبہ کے معنی میں ہے۔

اس طرح سے جنگی قیدیوں کو جنگ کے خاتمہ کے بعد قتل نہ کرو۔ بلکہ اسلامی رہنما مصلحت کے پیش نظر یا تو ان سے معاوضہ لے کر انہیں چھوڑ دے یا معاوضہ لینے بغیر انہیں رہا کر دے اور یہ معاوضہ درحقیقت ایک قسم کا جنگی تادان ہے جو دشمن کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

البتہ اس سلسلے میں اسلام کا ایک تیسرا حکم بھی ہے وہ یہ کہ ان قیدیوں کو غلام بنا لیا جائے۔ لیکن یہ ایک لازمی حکم نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے سربراہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ خاص حالات اور زمان و مکان کی مصلحت کے پیش نظر اس حکم پر عمل درآمد ضروری سمجھتا ہو۔ شاید اسی لیے قرآنی متن میں اس کا صراحت کے ساتھ حکم نہیں آیا، صرف اسلامی روایات میں ذکر کیا گیا ہے۔

ہمارے مشہور فقیہ "فاصل مقداد" کنز العرفان میں فرماتے ہیں:

"اگر جنگ کے خاتمے پر کوئی قیدی پکڑا جائے تو مسلمانوں کے امام کو ان تین امور میں سے کسی

ایک کو اختیار کرنے کی اجازت ہے:

۱- غیر مشروط طور پر اسے چھوڑ دے۔

۲- فدیہ اور معاوضہ لے کر اسے رہا کر دے۔

۳- اسے غلام بنا لیا جائے اور کسی بھی صورت میں اسے قتل کرنا جائز نہیں۔"

اور ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

غلام بنانے کا مسئلہ روایات سے تو ثابت ہے، لیکن قرآن کی کس آیت سے ثابت

نہیں ہے۔

یہ مسئلہ دوسری فقہی کتابوں میں بھی درج ہے۔

"غلامی" کی بحث کے سلسلے میں انہی آیات کے ضمن میں ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

اسی آیت کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہے اور دشمنوں پر اس وقت تک کاری ضربیں لگاتے رہو اور کچھ لوگوں کو جنگی قیدی بنا لو، یہاں تک کہ جنگ اپنا سنگین بوجھ زمین پر رکھ دے (حتیٰ توضع الحرب اوزارہا)۔

جنگ سے صرف اس وقت ہاتھ اٹھاؤ جب دشمن کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں اور جنگ کی آگ بجھ جائے۔

"اوزار" "وزر" کی جمع ہے جس کا معنی "سنگین بوجھ" ہے، اور بعض اوقات اس کا اطلاق "گناہوں" پر بھی ہوتا

ہے، کیونکہ وہ بھی تو گناہگاروں کے کندھے کے بوجھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں اس سنگین بوجھ کی نسبت جنگ کی طرف دی گئی ہے۔

فرمایا گیا ہے: جنگ اپنا سنگین بوجھ زمین پر رکھ دے۔ یہ سنگین بوجھ مختلف ”اسلمہ جات“ اور ”مشکلات“ کے لیے کنا یہ ہے، جسے مجاہدین اپنے کندھے پر لیے ہوتے ہیں یا ان کا انہیں سامنا ہوتا ہے اور جب تک جنگ کا فاتحہ نہ ہو جائے اس وقت تک یہ سنگین بوجھ ان کے کندھوں پر رہتا ہے۔

لیکن اسلام اور کفر کے درمیان جنگ کب ختم ہوگی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کے بارے میں مفسرین نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ ابن عباس اور بعض دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک روئے زمین پر ایک بھی بت پرست باقی اور شرک موجود ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اسلام اور کفر کے درمیان جنگ اس وقت تک جاری ہے جب تک مسلمان ”دجال“ پر غلبہ حاصل نہ کر لیں۔ انہوں نے اس نظریے کا استدلال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے کیا ہے:

”والجہاد ما ض مذ بعثنی اللہ الی یقاتل احرار متی الدجال“

جب سے خدا نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس وقت سے لے کر تب تک جہاد جاری رہے گا

جب تک میری امت کا آخری شخص دجال سے لڑتا رہے گا۔

دجال کے بارے میں ایک لمبی چوڑی بحث ہے، لیکن اس حد تک ضرور معلوم ہے کہ دجال ایک یا کئی حکمران انسان ہیں جو آخری زمانے میں لوگوں کو اصول توحید اور حق و عدالت کی راہوں سے ہٹانے میں سرگرم عمل ہوں گے اور حضرت امام مہدی علیہ السلام اپنی عظیم طاقت کے ذریعے انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے۔

اس طرح جب تک دجال روئے زمین پر موجود ہیں، حق اور باطل کی معرکہ آرائی جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی کفر کے ساتھ دو طرح کی معرکہ آرائی جاری ہے، ایک محدود اور قلیل المعیاد جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات جو آپ نے اپنے دشمنوں سے کئے اور ہر جنگ کے بعد تلواریں نیاموں میں چلی جاتیں اور دوسری مسلسل اور طویل المعیاد جو شرک، کفر، ظلم، برائی اور فتنہ و فساد کے خلاف ہے اور یہ سلسلہ حضرت امام مہدیؑ کے ذریعے عالمی سطح پر عدل و انصاف کی حکومت کے قائم ہونے تک جاری رہے گا۔

پھر فرمایا گیا ہے: تمہاری صورت حال یہی ہونی چاہیے (ذالک)۔

اور اگر خدا چاہتا تو ان سے کئی اور طریقے سے انتقام لے لیتا، (ولویشاء اللہ لانتصر منہم)۔

آسمانی جلیوں، زلزلوں، آندھیوں اور دوسری آفات کے ذریعے سے، تاہم اس صورت میں آزمائش و امتحان کی بات ختم ہو جاتی، ”لیکن خدا چاہتا ہے کہ تمہاری ایک دوسرے کے ذریعہ آزمائش کرے“ (ولکن لیسئلوا بعضکم ببعض)۔ جنگ کا حقیقی فلسفہ اور حق و باطل کی محرکہ آرائی کا اصل نکتہ یہی ہے، جنگوں میں حقیقی مومنین کی صفیں غیر حقیقی مومنین سے جدا ہو جاتی ہیں اور کردار کے غازی گفتار کے غازیوں سے جدا ہو جاتے ہیں۔ صلاحیتیں پر دان چڑھتی ہیں، استقامت اور پامردی کا احیا ہوتا ہے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کا اصل مقصد حاصل ہوتا ہے، یعنی قوتِ ایمان کو پرورش ہوتی ہے اور انسانی اقدار کا صحیح معنوں میں احیا ہوتا ہے۔

اگر مومنین ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنے معمول کی زندگی بسر کرنے میں لگ جاتے اور حیب بھی مشرکین اور ظالموں کا کوئی لشکر مسلمانوں پر حملہ کرتا اور خدا غیب کی راہوں اور معجزے کے ذریعے انہیں تباہ و برباد کر دیتا تو معاشرے کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی، معاشرے میں پھراؤ، سستی، کمزوری اور کاہلی وجود میں آجاتے اور اسلام و ایمان صرف نام کی حد تک ہوتے۔

خلاصۃ الکلام یہ کہ اللہ کو اپنے مقدس دین کے استقلال کے لیے ہماری جنگ جلال کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہم خود، دشمن کے مقابلے میں تربیت پاتے ہیں اور ہمیں اس مقدس جنگ کی ضرورت ہے۔

یہی قرآن مجید کی دوسری آیات میں دیگر صورتوں میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً:

” ارحبتم ان تدخلوا الجنة ولما يعلم الله الذين جاهدوا منكم ويعلم الصابرين “

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم صرف ایمان کے خالی دعووں سے بہشت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک خدا نے تم میں سے مجاہدین اور صابریں کو معین نہیں کیا ہے۔“

(ال عمران / ۱۴۲)

اس سے پہلی آیت میں ہے ولیمحص الله الذين امنوا ويمحق الكافرين“ مقصد یہ ہے کہ خدا (ان جنگوں کے سایے میں) مومنین کو خالص کرے اور کفار کو نیست و نابود کرے۔

زیر تفسیر آیت کے آخری جملہ میں ان شہیدوں کا تذکرہ ہے جو ایسی جنگوں میں اپنی شیریں زندگی کو قربان کرتے ہیں اور اسلامی معاشرے پر ان کا بہت بڑا حق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ہیں خدا ان کے اعمال کو ہرگز اکارت نہیں کرے گا (والذین قتلوا فی سبیل اللہ فلن یصل اعمالہم)۔

ان کی زمتمیں، تکلیفیں اور ایثار و فداکاریاں ضائع نہیں ہوں گی، سب خدا کی بارگاہ میں محفوظ ہیں۔ اس دنیا میں بھی ان کی فدا کاریوں کے آثار باقی رہ جاتے ہیں، لا الہ الا اللہ کی جو بھی صدا سنائی دیتی ہے انہی کی تکلیفوں کا ثمرہ ہے۔ جو مسلمان بھی اللہ کی بارگاہ میں سر بسجود ہوتا ہے تو ان کی فدا کاریوں کی برکت سے ہے، غلامی کی زنجیریں ان کے مصائب پھیلنے سے ٹوٹی ہیں اور مسلمانوں کی عزت و آبرو بھی انہی کی مرہونِ مرثت ہے۔

شہدار پر خدا کی یہ ایک عنایت ہے۔

تین اور عنایتوں کا تذکرہ بعد کی آیات میں ہوتا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اللہ انہیں ہدایت کرے گا (سیدھا یہم)۔

بلند مرتبہ مقامات، عظیم کامیابی اور رضوان الہی کی طرف ہدایت۔

دوسری عنایت یہ کہ "ان کے حالات سنو اور دے گا" (و یصلح بالہم)۔

اللہ انہیں تسکین، اطمینان خاطر اور روحانی سرور عطا فرماتا ہے۔ فرشتوں کے ہم آہنگ صفائے باطن اور روحانی

مدارج سے نوازتا ہے جو ان کے ہمدم ہوتے ہیں۔

اور اپنی رحمت کے جوار میں انہیں اپنی ضیافت میں بلاتا ہے۔

آخری عنایت یہ ہے کہ "انہیں اپنی جاودانی بہشت میں داخل کرے گا جس کے اوصاف انہیں پہلے بتا رکھے

ہیں (و یدخلہم الجنتۃ عترفھا لہم)۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ انہیں بہشت بریں اور مقام رضوان کے صرف کلی اوصاف ہی سے آگاہ نہیں کرتا، بلکہ بہشت کے

محلات کی علامتوں اور نشانیوں سے بھی مکمل طور پر آگاہ کر دیتا ہے، اس حد تک کہ جب بھی وہ بہشت میں داخل ہوں گے

سیدھے اپنے اپنے محلات میں چلے جائیں گے۔

بعض مفسرین نے "عترفھا" کی "عرف" (بردوزن "فکر" عطر اور خوشبو، کے معنی سے تفسیر کی ہے۔ یعنی خدا انہیں ایسی

بہشت میں پہنچائے گا جو جہانوں کے لیے سراسر مہلک ہوگی۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر ان آیات کو "ولاتحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً" (ایل

عمران/۱۶۹) کے ساتھ ملا دیں تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ "اصلاح بال" سے مراد وہی جاودانی زندگی ہے، جس کے سائے

میں شہداء راہِ خدا پر دے اور جہالت ہٹ جانے کے بعد اپنے رب کے حضور شرف یابی کے لیے تیار ہوں گے۔

چند نکات

۱۔ شہدار کا بلند مقام؛ اقوام کی تاریخ میں ایسے دن بھی آجاتے ہیں جن میں بے حد ایثار و قربانی اور

ذکاوری و جانفشانی کے بغیر خطرات نہیں ٹل سکتے اور عظیم اور مقدس مقاصد نہیں بچ سکتے۔ ایسے مواقع پر مؤمن

اور فدا کار لوگوں کو آگے آنا چاہیے اور اپنے خون کی قربانی دے کر آئین حق کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اسلامی منطق کی رو سے ایسے افراد کو ”شہید“ کہا جاتا ہے۔

”شہید“ ”شہود“ کے مادہ سے ہے اور اس کا ان پر اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ:

- ۱۔ کیونکہ وہ دشمنان حق کے مقابلے میں میدان میں حاضر ہوتے ہیں یا
- ۲۔ بوقت شہادت، رحمت کے فرشتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں یا
- ۳۔ خدا کی جو عظیم نعمتیں ان کے لیے فراہم کی جا چکی ہے ان کا مشاہدہ کرتے ہیں یا
- ۴۔ بارگاہ رب العزت میں پہنچ کر حاضری دیتے ہیں جیسا کہ آیت مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

”ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتاً بل احياء عند ربهم

يرزقون“ (آل عمران / ۱۶۹)

اسلام میں بہت کم لوگ شہداء کے مرتبے کے برابر ہیں، وہی شہدار جو سوچ سمجھ کر اور خلوص قلب کے ساتھ معرکہ حق و باطل میں قدم رکھتے ہیں اور اپنے پاکیزہ خون کے آخری قطرات تک نچھاور کر دیتے ہیں۔

شہدار کے مقام اور مرتبے کے بارے میں اسلامی مآخذ میں بہت سی حیرت انگیز روایات ملتی ہیں جن سے شہداء کے کارناموں کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

”ان فوق كل بربراً حتى يقتل الرجل شهيداً في سبيل الله“

”ہر نیکی سے بڑھ کر ایک نیکی ہوتی ہے جب تک انسان راہ خدا میں شہید نہ کر دیا جائے۔

جب اسے شہادت مل جاتی ہے تو پھر اس سے بڑھ کر کوئی اور نیکی نہیں ہے۔ لہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

”المجاهدون في الله قواد اهل الجنة“

”مجاہدین راہ خدا بہشت والوں کے قائد ہوں گے۔“ لہ

ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

”ما من قطرة احب الى الله من قطرة دم في سبيل الله،

او قطرة من دموع عين في سواد الليل من خشية الله، وما من قدم

احب الى الله من خطوة الى ذي رحم، او خطوة يتم بها زحفاً في

سبيل الله“

”کوئی قطرہ خدا کو خون کے اس قطرے سے زیادہ محبوب نہیں ہے جو راہِ خدا میں بہ جاتا ہے یا آنسو کے اس قطرے سے جو رات کی تاریکی میں خوفِ خدا سے جاری ہوتا ہے۔ اور کوئی قدم خدا کو اس قدم سے زیادہ محبوب نہیں ہے جو صلہٴ رحمی کے لیے اٹھایا جائے یا اس قدم سے جو راہِ خدا میں جنگ کے لیے آگے بڑھتا ہے، جس سے جنگ اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔“

اگر تاریخِ اسلام کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ شہداء راہِ خدا نے ہی اسلام کے بہت سے حصے کو اعزاز بخشا ہے اور اس طرح سے انہوں نے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

نہ صرف ماضی میں بلکہ آج بھی شہادت ایک تقدیر ساز کلمہ ہے، جس سے دشمنوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور انہیں اسلام کے قلعوں میں رخنہ ڈالنے سے مایوس کر دیتا ہے اور شہادت کا کلمہ مسلمانوں کے لیے کس قدر مبارک اور دشمنانِ اسلام کے لیے کس قدر خطرناک ہے؟

لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ شہادت کوئی مقصد نہیں بلکہ اصل مقصد دشمن پر کامیابی اور آئینِ حق کی حفاظت اور پاسداری ہوتا ہے۔ لیکن یہ محافظین اپنے آپ کو اس حد تک تیار رکھیں کہ اگر اس راہ میں انہیں خون کی قربانی بھی دینا پڑے تو اس سے دریغ نہ کریں اور یہی ہے امتِ شہید پروردگار کا معنی یہ کہ شہادت کو ایک مقصد سمجھ لیا جائے۔

اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مفصل حدیث کے آخر میں ہم پڑھتے ہیں جو آپ سے حضرت علی علیہ السلام نے روایت کی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قسم اٹھا کر فرماتے ہیں:

”والذی نفسی بیدہ لو کان الانبیاء فی طریقہم لترجلوا
لہم لما یرون من بہائمہ ویشفع الزبیل منهم سبعین الفاً
من اہل بیتہ وجیرتہ“

”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، جب شہداء عرصہٴ محشر میں وارد ہوں گے، اگر انبیاء بھی ان کے راستے میں سوار ہوں گے تو ان کے نور اور شان و شوکت کی وجہ سے سواروں سے اتر پڑیں گے اور ان میں سے ہر ایک شخص اپنے خاندان اور ہمسایوں میں سے ستر ہزار لوگوں کی شفاعت کرے گا۔“

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں شہادت کے دو مختلف معانی ہیں ایک خاص اور دوسرا عام۔ شہادت کا خاص معنی تو یہ ہے کہ انسان راہِ خدا میں میدانِ جنگ میں مارا جائے اور اس کے اسلامی فقہ میں کچھ مخصوص احکام ہیں، مثلاً اسے غسل و کفن کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اسی خون آلودہ لباس میں ہی اسے دفن کیا جائے گا۔

جب کہ شہادت کا وسیع اور عام معنی یہ ہے کہ انسان خدائی فریضے کی انجام دہی میں مارا جائے یا مر جائے اور جو شخص بھی اس قسم کے فریضے کی ادائیگی کرتا ہو کسی حالت میں بھی دُنیا سے اُٹھ جائے وہ ”شہید“ ہے۔

اسی لیے اسلامی روایات میں وارد ہوا ہے کہ چند قسم کے لوگ اس دُنیا سے ”شہید“ ہو کر جاتے ہیں۔
(۱) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ:

”اذ جاء الموت طالب العلم وهو على هذا الحال مات شهيداً“

”جو شخص حصول علم کے راستے میں مر جائے وہ شہید ہو کر مرتا ہے۔“

(۲) امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

”من مات منكم على فراشه وهو على معرفة حق ربه وحق

رسوله واهل بيته مات شهيداً“

”جس شخص کو موت آجائے لیکن وہ حق معرفت پروردگار اور حق معرفت رسول و

اہل بیت رکھتا ہو تو وہ شہید ہو کر مرتا ہے۔“

(۳) ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ”من تددون ماله فهو شهيد“

اسی طرح کئی اور لوگ ہیں جو راہ حق میں مار دیئے جاتے ہیں یا اپنی طبعی موت متے ہیں اور بیس سے اس اسلامی ثقافت

اور اس کی ہمہ گیریت کا پتہ چلتا ہے۔

(۴) اس بحث کو حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچاتے

ہیں۔ امام نے اپنے آباؤ اجداد کے ذریعے رسول اللہ سے یوں روایت کی ہے۔

”اول من يدخل الجنة الشهيد“

”سب سے پہلے شہید ہی بہشت میں جائے گا۔“

۲۔ اسلام میں جنگ کے مقاصد؛ اسلام میں جنگ کو کبھی بھی اقدار کی حیثیت حاصل نہیں رہی۔ بلکہ انسانوں

کی تباہی و بربادی اور ذرائع و وسائل کی نابودی کی وجہ سے اسے ”خلاف اقدار“ شمار کیا گیا ہے۔ اسی لیے قرآن کی بعض

آیات میں اسے عذاب الہی کے زمرے میں ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ سورۃ النعام کی ۶۵ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

”قل هو القادر على ان يبعث عليكم عذاباً من فوقكم او من تحت

ارجلكم او يلبسكم شيئا ويذيق بعضكم بأس بعض“

لہ سفینۃ البحار جلد ۱ مادہ ”شہید“

لہ بیج البلاغ، خطبہ نمبر ۱۱ (آخری خطبہ)۔

لہ بحار الانوار جلد ۱، ص ۲۶۲

”کہہ دے کہ خدا اس بات پر قادر ہے کہ تم پر بجلیوں کے مانند تمہارے اوپر سے یا زلزلوں کے مانند تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیج دے یا تمہیں ٹولہوں کی صورت میں متفرق کر دے، یا تمہیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ اور خون ریزی کا مزہ چکھائے۔“

اس آیت میں جنگ کو ”صاعقہ“ اور ”زلزلہ“ جیسی ارضی و سماوی آفات کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی لیے اسلام میں تا حد امکان جنگ سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

لیکن جب کسی قوم کے وجود کو خطرہ لاحق ہو، یا اس کے مقدس اور اعلیٰ مقاصد کو تباہی کا اندیشہ ہو تو اس وقت جنگ کو ”قدر“ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور جنگ ”جہاد فی سبیل اللہ“ کا مقام حاصل کر لیتی ہے۔

اسی وجہ سے اسلام میں جہاد کی کئی قسمیں بتائی گئی ہیں:

① آزادی خواہی پر مبنی ابتدائی جہاد۔

② دفاعی جہاد۔

③ فتنہ و فساد، اور شرک و بت پرستی کی آگ بجھانے کا جہاد۔

اس کی تفصیل ہم کسی اور جگہ بیان کر چکے ہیں۔ لہ

بنا بریں اسلامی جہاد (جیسا کہ اسلام کے زبردست مخالفین پر دیکھنا آگرتے ہیں) عقیدہ مسلط کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اصولی طور پر مسلط کردہ عقیدے کی اسلام میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، بلکہ جہاد ایسے وقت ہوتا ہے جب دشمن جنگ کو اسلامی اُمت پر مسلط کر دیں یا ان سے خدا داد آزادی چھیننا چاہیں، یا اس کے حقوق ہمال کرنا چاہیں یا ظالم مظلوم کا گلا دبانا چاہیں تو اس وقت تمام مسلمانوں پر فرض بن جاتا ہے کہ وہ مظلوم کی امداد کریں خواہ انھیں ظالم قوم سے لڑنا پڑے۔

گذشتہ آیات میں ایک مختصر اور لطیف جملے میں یہی بات بیان ہوئی ہے، جہاں فرمایا گیا ہے کہ کفار تو باطل کی پیروی کرتے ہیں اور مومنین حق کی اتباع کرتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے وہ جنگ ”حق اور باطل کے درمیان جنگ“ بھی جانتے گی، نہ کہ کشور کشائی، وسعت طلبی، دوسروں کے سرمائے کی لوٹ مار اور قدرت نمائی اور طاقت منوانے کے لیے۔

اسی وجہ سے ہم گذشتہ آیات کی تفسیر میں ایک روایت میں پڑھ چکے ہیں کہ انسانی معاشرے میں جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ جالوں کے وجود کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اور زمین ان کے نجس وجود سے پاک نہیں ہو جاتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام میں دوسرے آسمانی ادیان کے پیروکاروں کے ساتھ پُر امن بقائے باہمی پر بہت زور دیا گیا ہے اور اس کی زبردست تاکید کی گئی ہے۔ قرآنی آیات، اسلامی روایات اور فقہ اسلامی میں

اس بارے میں "اہل ذمہ کے احکام" کے عنوان سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اگر اسلام عقائد مسلط کرنے اور اپنی طاقت بزرگ شمشیر منوانے کا حامی ہوتا تو پھر اسے پُر امن بقائے باہمی اور اہل ذمہ کے متعلق قوانین بنانے کی کیا ضرورت تھی؟

۳۔ جنگی قیدیوں کے احکام: ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ میدان جنگ میں دشمن کی مکمل شکست سے پہلے مسلمانوں کو کسی بھی صورت میں جنگی قیدی بنانے کا اقدام نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے ہر حالت میں سنگین خطرات کا احتمال ہے لیکن زیر تفسیر آیات کے لب و لہجہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دشمن پر کامیابی کے بعد انہیں قتل کرنے کے بجائے قیدی بنا لیا جائے اسی لیے قرآن فرماتا ہے: جب تم دشمن کا سامنا کرو تو اس پر کاری ضروری لگاؤ۔

پھر فرمایا گیا ہے: یہ کاری ضروری ان پر برابر جاری رکھو، یہاں تک کہ دشمن کا ستیاناس کر دو اور انہیں گھٹے ٹیکنے پر مجبور کر دو، ایسے میں قیدیوں کی گرفتاری کے لیے اقدام کرو اور انہیں خوب باندھ لو (فَاِذَا لَقِيتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضْرِبُوْا الرِّقَابَ حَتّٰى اِذَا خَنْتَهُمْ فَسُدّوْا وَاَلْوَتَاقَ)

لہذا دشمن پر قابو پانے کے بعد انہیں قتل کرنے کے بجائے اسیر بنا لیا جائے اور یہ ایسا کام ہے جس سے گریز ناممکن ہے، کیونکہ اگر دشمن کو چھوڑ دیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ دوبارہ سنبھل کر پھر حملہ کرے۔

لیکن قیدی بنانے کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں اور اسیر تمام جرائم کے باوجود مسلمانوں کے ہاتھ میں خدا کی ایک امانت کی صورت میں آ جاتا ہے جس کے بہت سے حقوق کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی زبردست تعریف کی ہے، جنہوں نے ایثار سے کام لیا اور اپنا کھانا اسیر کو دے دیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

”وَيَطْعَمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حَبْدٍ مَّسْكِيْنًَا وَيَتِيْمًا وَّاسِيْرًا“
 ”خدا کے نیک بندے کھانے کی خواہش رکھنے کے باوجود اپنا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیتے ہیں“ (دھر۔ ۸)

مشہور روایت کے مطابق یہ آیت حضرت علی، جناب فاطمہ زہرا اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اپنے انظار کا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیا۔ حتیٰ کہ بعض استثنائی حالات میں مثلاً ان کے خطرناک ہونے یا خاص قسم کے جرائم کے ارتکاب کی وجہ سے جن قیدیوں کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے، ان کے بارے میں بھی حکم یہی ہے کہ سزا پر عمل درآمد سے پہلے تک ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

”اطعام را لاسیر والاحسان الیہ حق واجب وان قتلته من الغد“
 ”اسیر کو کھانا کھلانا اور اس سے حسن سلوک کرنا ایک واجب حق ہے۔ ہر چند کہ میرے پاچھا

ہو کہ مل اسے سزائے موت دی جائے گی۔ ۱۰

اس بارے میں اور بھی بہت سی احادیث موجود ہیں۔ ۱۱

ایک حدیث میں حضرت امام علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

”اذا اخذت اسیراً فحجز عن المشی ولیس معک محمل فارسلہ ، ولا تقتلہ ، فانک لاتدری ما حکم الامام فیہ“

”جب تم کسی کو اسیر بنا لو اور اپنے ساتھ لے آؤ، لیکن وہ چلنے سے عاجز ہو اور تمہارے پاس

اس کے لیے سواری بھی نہ ہو تو اسے چھوڑ دو اور قتل نہ کرو، کیونکہ تم یہ نہیں جانتے کہ جب

اسے امام کے پاس لے جاؤ تو وہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرے۔ ۱۲

حتیٰ کہ تاریخ میں رہبران اسلام کے حالات میں ملتا ہے کہ جو کھانا وہ خود کھاتے تھے، اسیروں کو بھی وہی کھلاتے تھے۔

لیکن اسیروں کے بارے میں حکم جیسا کہ ہم آیات کی تفسیر میں بتا چکے ہیں، جنگ کے خاتمے کے بعد ان تینوں چیزوں

میں سے ایک ہے: یا تو انہیں غیر مشروط طور پر چھوڑ دیا جائے یا فدیہ (تاوان) لے کر انہیں آزاد کر دیا جائے یا پھر

انہیں غلام بنا لیا جائے۔ البتہ مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب امام مسلمین اور پیشوائے اسلام کی مرضی

پر موقوف ہے اور وہ بھی اُسرا کے حالات، داخلی اور خارجی لحاظ سے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کو پیش نظر

رکھتے ہوئے جو بات بھی اسے زیادہ مناسب نظر آئے گی اختیار کرے گا اور اس پر عمل درآمد کا حکم دے گا۔

بنا بریں نہ تو تاوان لینا ضروری ہے اور نہ ہی غلام بنانا بلکہ یہ سب کچھ امام المسلمین کی صوابدید پر منحصر ہے کہ اگر

مصلحت اس بات میں ہے کہ تاوان لے کر چھوڑ دیا جائے تو وہ ایسا ہی کرے گا اور اگر مصلحت غلام بنانے میں ہے

تو غلام بنائے گا اور اگر مصلحت اس بات میں ہو کہ غیر مشروط طور پر چھوڑ دے تو ایسا ہی کرے گا۔

فدیہ اور تاوان کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۴، سورہ انفال کی ۱۰، ویں آیت کی تفسیر میں تفصیل سے گفتگو

کر چکے ہیں۔

۴۔ اسلام اور غلامی: اگرچہ قرآن مجید میں جنگی قیدیوں کے ”استرقاق“ (غلام بنانے) کا مسئلہ ایک حتمی حکم کے

عنوان سے بیان نہیں ہوا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ قرآن پاک میں غلاموں کے احکام بھی بیان ہوئے ہیں جن سے

ثابت ہوتا ہے کہ صدر اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں بھی غلام تھے، جیسے غلام کے ساتھ ازدواج، مجرم

۱۰ وسائل الشیعہ جلد ۱۱ ص ۶۹۔

۱۱ فروع کافی جلد ۵ ص ۲۵۰ باب الرقی بالاسیر واطعامہ۔

۱۲ فروع کافی جلد ۵ ص ۲۵۰ باب الرقی بالاسیر واطعامہ۔

ہونے یا "مکاتبت" (غلاموں کی آزادی کے لیے عہد و پیمان) کے احکام وغیرہ، جو قرآن مجید کی متعدد آیات میں بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً سورہ نساء، سورہ نحل، سورہ مؤمنون، سورہ نور، سورہ روم اور سورہ احزاب کی آیات۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے اپنی تمام اعلیٰ تعلیمات اور انسانی اقدار کو بلند کرنے کے باوجود غلامی کے مسئلے پر بطور کلی خطہ تینخ کیوں نہیں کھینچا اور ایک دو ٹوک اور عمومی حکم کے ذریعے تمام غلاموں کی آزادی کا اعلان کیوں نہیں کیا؟

یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے غلاموں کے بارے میں بڑی سفارش کی ہے، لیکن سب سے اہم بات ان کی غیر مشروط آزادی ہے۔ آخر ایک انسان دوسرے انسان کا مملوک اور بندہ کیوں ہو اور آزادی جو خدا کی بہترین نعمت اور قدرت کا بہترین عطیہ ہے اس سے وہ کیوں ہیرو مند نہ ہو؟

ایک مختصر جملے میں اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے ایک جچا تلا اور ایک شیڈول پر مبنی پروگرام دیا ہے کہ جس کے مطابق وہ آہستہ آہستہ آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو جاتے ہیں اور اسی طرح کی آزادی سے معاشرے پر بھی کوئی ناخوش گوار اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اس اسلامی منصوبے کی تشریح اور تفصیل سے پہلے ہم مقدمے کے طور پر یہاں پر قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

(۱) اسلام غلامی کا موجد ہرگز نہیں ہے؛

یہ بات مسلم ہے کہ غلامی کی ایجاد اسلام نے نہیں کی، بلکہ وہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب ساری دنیا میں غلامی کا دور دورہ تھا اور غلامی انسانی معاشرے میں رچ بس چکی تھی، سچی کہ اسلام کے بعد تک بھی غلامی کا رواج جاری رہا اور آج سے تقریباً ایک صدی قبل اس وقت تک تھا جب غلاموں کی آزادی کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی، کیونکہ انسانی زندگی کے نظام کی تبدیلی سے غلام بنانے کی پرانی روش اب قابل قبول نہیں رہی تھی۔

غلامی کے خلاف جدوجہد سب سے پہلے یورپ سے شروع ہوئی، پھر اس کا دائرہ امریکی اور ایشیائی ملکوں تک بھی پھیل گیا۔

انگلستان میں ۱۸۳۰ء تک، فرانس میں ۱۸۴۸ء تک، ہالینڈ میں ۱۸۶۳ء تک اور امریکہ میں ۱۸۶۵ء تک غلامی کا سلسلہ جاری رہا، آخر کار برسلیز میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ایک مشترکہ اعلیٰ سے کے ذریعے ساری دنیا میں غلامی کے سلسلے کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا گیا اور یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے (یعنی تقریباً سو سال سے بھی کم عرصہ گزارا ہے) (۱۱) اس دور میں غلامی کے انداز بدل گئے ہیں؛

یہ ٹھیک ہے کہ اہل یورپ غلامی کے خاتمے کے لیے پیش قدم ثابت ہوئے، لیکن جب اس مسئلے پر ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ غلامی کا نہ صرف خاتمہ ہی نہیں ہوا، بلکہ پہلے سے زیادہ خطرناک اور وحشت ناک صورت میں ظاہر ہوئی ہے، یعنی قوموں کے استعمار اور ملکوں پر سامراجیت کی صورت میں، وہ اس طرح سے

کہ انفرادی غلامی جتنا جتنا کمزور ہوتی گئی اجتماعی غلامی اور سامراجیت اسی قدر افزوں تر اور قوی تر ہوتی گئی، برطانیوی شہنشاہیت اگر انفرادی غلامی کے خاتمے کے لیے پیش قدم ہے تو استعمار اور سامراجیت کے لیے بھی پیش کام کھانی دیتی ہے۔

مغربی سامراجیوں نے اپنے سامراجی تسلط کے دوران جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے وہ نہ صرف غلامی کے دورانیے کے جرائم سے کم نہیں بلکہ وسعت اور شدت کے لحاظ سے اس سے چار قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ سامراج کے جنگل سے آزاد ہونے والے ملکوں میں قوموں کی غلامی کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ غلامی سے یہ آزادی ایک نام نہاد سیاسی آزادی تھی، جب کہ آج بھی سامراج کے جنگل سے آزاد ہونے والے ملکوں اور دوسرے کئی ملکوں میں بھی اقتصادی اور ثقافتی غلامی اور استعمار کی حکمرانی ہے۔

یہ صورت حال کیونست ملکوں میں تو خصوصیت کے ساتھ جاری ہے، آزادی کا دم بھرتے اور غلامی کے خاتمہ کے لیے دوسروں سے زیادہ شور مچاتے ہیں حالانکہ وہ خود ایک شرمناک قسم کی بردہ داری میں گرفتار ہیں۔

جو لوگ ان ملکوں میں رہتے ہیں وہ غلاموں کے مانند بالکل بے اختیار ہیں اور ان ملکوں کے باشندوں کے تمام اختیار کیونست پارٹی کے لیڈروں کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر کوئی شخص اختلاف رائے کا اظہار کرتا ہے تو اسے یا تو جبری کام کے مراکز میں بھیج دیا جاتا ہے یا پھر زندان کی کال کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے اور اگر اس کا شمار دانشوروں میں ہو تو ایسے نفساتی مریض قرار دے کر بالکل خانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ غلامی نام کے تابع نہیں ہے، جو چیز ناپسندیدہ اور بری ہے وہ ہے اصل غلامی اور اس کا حقیقی مفہم اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ مفہم سامراجی تسلط میں موجود اور کیونست ممالک میں بدترین صورت میں موجود اور معمول ہے۔ خلاصہ الکلام یہ کہ آج کی دنیا میں غلامی کے خاتمے کی ایک ظاہری صورت تھی جس نے حقیقت میں ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے۔

(iii) ماضی میں غلاموں کا دردناک انجام :

تاریخی لحاظ سے غلاموں کی ایک نہایت دردناک تاریخ ہے اور وہ ساری زندگی اندوہناک انجام سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر (Sparta) کے غلاموں کی تاریخ کو لے لیجئے جو کہ بزم خود ایک متمکن قوم تھی، کتاب ”روح القوانین“ کے مصنف کے بقول (Sparta) کے غلام اس قدر مصیبت زدہ تھے کہ ان میں سے کوئی بھی غلام کسی فرد واحد کا غلام نہیں ہوتا تھا بلکہ تمام معاشرے کا غلام ہوتا تھا اور شخص کسی بھی قانونی خوف کے بغیر اپنے یا کسی دوسرے کے غلام کو جتنا چاہتا دکھ اور ایذا میں پہنچاتا۔ درحقیقت اس معاشرے کے غلاموں کی زندگی حیوانات سے بھی بدتر تھی۔

جب کسی لپیمانہ ملک سے غلاموں کا شکار کیا جاتا تھا، شکار کے وقت سے لے کر منڈیوں تک لانے کے عرصے میں بہت سے غلام مر جایا کرتے تھے، جو بچ جاتے تھے وہ لالچی بردہ فروشوں کی کھانی کا ذریعہ بنتے تھے، انہیں

کھانے کو صرف اس ٹھیک دیا جاتا کہ جس سے وہ جسم اور روح کا رشتہ بحال رکھ سکتے اور کام بجالاتے تھے۔ جب وہ بوڑھے ہو جاتے یا کسی جان لیوا بیماری کا شکار ہو جاتے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے۔ لہذا تاریخی طور پر غلامی کا نام اپنے ساتھ ہولناک جرائم کی ایک تفصیلی داستان رکھتا ہے۔ یہ چند موٹے موٹے نکات اجمالی طور پر بیان کرنے کے بعد ہم اسلام کے غلاموں کو بالترتیب آزاد کرنے کے منصوبے پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱۷) غلاموں کی آزادی کے لیے اسلام کا منصوبہ:

جس چیز پر عام طور سے زیادہ توجہ نہیں دی جاتی وہ یہ ہے کہ اگر کوئی غلط نظام کسی معاشرے میں رواج پا جائے تو اسے ختم کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے اور اس سلسلے میں کوئی بھی اقدام جو سوچے سمجھے منصوبے کے بغیر کیا جائے اس کا نتیجہ اٹا سکتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے کوئی شخص کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو جائے اور اس کی یہ بیماری اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہو، یا جیسے کوئی شخص کسی بڑی عادت کا شکار ہو جائے اور اس کی یہ عادت سالہا سال سے اس میں راسخ ہو چکی ہو تو ایسے حالات میں ایک تدریجی شیڈول کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے تحت اس کا علاج کیا جاتا ہے تب کہیں جا کر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہیں کہ اگر اسلام ایک عمومی حکم کے ذریعہ اس زمانے کے تمام غلاموں کی آزادی کا حکم دے دیتا ہے تو قومی امکان تھا کہ ان میں سے اکثر و بیشتر غلام تباہی و بربادی کا شکار ہو جاتے، کیونکہ بعض مقامات پر تو نصف سے زیادہ آبادی غلاموں کی تھی، جن کا نہ تو کوئی مستقل ذریعہ معاش تھا، نہ سر چھپانے کے لیے اپنا گھر اور نہ ہی پیٹ پالنے اور زندہ رہنے کے لیے کوئی اور ذریعہ۔

اگر ایک مقررہ دن اور مقررہ وقت پر وہ سب آزاد ہو جاتے تو معاشرے کا ایک بہت بڑا حصہ بے کار اور بے روزگار ہو جاتا، جس سے ایک تو ان کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ جاتی اور دوسرے ممکن تھا کہ معاشرے کے نظم و نسق میں خلل پڑ جاتا اور جب ہر طرف سے انہیں مایوسیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑتا تو وہ ہر ایک پر حملہ آور ہوتے جس سے خانہ جنگی اور نحل ریزی کا زبردست اندیشہ تھا۔

اسی لیے ضروری معلوم ہوا ہے کہ غلاموں کو تدریجی طور پر آزاد کیا جائے تاکہ وہ ماحول اور معاشرے میں رچ بس جائیں جس سے نہ تو انہیں خود کو کسی قسم کا خطرہ ہو اور نہ ہی معاشرے کے لیے امن و امان کا مسئلہ کھڑا ہو۔ لہذا اسلام نے بھی ٹھیک اسی سوچے سمجھے منصوبے کو اپنایا ہے۔

اس قسم کے منصوبے کو کئی طرح سے عملی جامہ پہنانے کا حکم دیا گیا ہے، جس کے اہم پہلوؤں کو ہم دفتات کی صورت میں فہرست دار بیان کرتے ہیں۔ البتہ اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

دفعہ "غلامی کی بیخ کنی": تاریخی لحاظ سے غلامی کے کئی مختلف اسباب ملتے ہیں۔ صرف جنگ ہی میں گرفتار ہونے

و اسے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا، بلکہ جو مقروض اپنا قرض ادا نہیں کر سکتے تھے انہیں بھی غلام بنا لیا جاتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زور، غلبہ اور طاقت بھی غلام بنانے کے اسباب تھے۔ طاقت در ملک مختلف اسلحہ سے مسلح کر کے اپنے افراد افریقیہ اور اس جیسے دوسرے پسماندہ نکلوں میں بھیجتے تھے اور وہ وہاں پر جا کر ٹولیوں اور گروہوں کی صورت میں انسانوں کا شکار کرتے تھے اور انہیں قیدی بنا کر کشتیوں کے ذریعے ایشیائی اور یورپی ممالک کی منڈیوں میں جا کر بیچ ڈالتے تھے۔

اسلام نے ان تمام مسائل کی روک تھام کی ہے اور صرف ایک موقع پر غلام بنانے کی اجازت دی ہے اور وہ ہے، جنگی قیدیوں کے بارے میں اور وہ بھی ضروری طور پر نہیں بلکہ جیسا کہ ہم مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں بتا چکے ہیں، اس بات کی اجازت بھی دے دی تھی کہ یا تو انہیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔

اس زمانے میں قید خانے نہیں ہوتے تھے کہ جنگی قیدیوں کو ان کا انجام واضح ہونے تک قید خانوں میں رکھا جاتا۔ لہذا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ انہیں مختلف کنبوں میں تقسیم کر کے، غلاموں کی صورت میں ان کی نگہداشت کی جاتی۔ ظاہر ہے کہ جب مذکورہ صورت تبدیل ہو جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسیروں کے بارے میں امام المسلمین غلامی کا حکم صادر کرے وہ ”من“ اور ”فداء“ کے ذریعے سے انہیں آزاد کر سکتا ہے، کیونکہ اسلام نے مسلمانوں کو اس بارے میں اجازت دے رکھی ہے کہ وہ مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذکورہ صورتوں میں سے کوئی ایک اپنائیں۔ اس طرح اسلام میں غلامی کا راستہ تقریباً بند ہو جاتا ہے۔

دفعہ ۲ ”آزادی کی راہیں“: اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کا ایسا وسیع منصوبہ تشکیل دیا ہے کہ اگر مسلمان اس پر عمل کرتے تو سب کے سب غلام تدریجاً اور نہایت ہی قلیل مدت میں آزاد ہو جاتے اور اسلامی معاشرے میں گھل مل کر اس کا جزو بن جاتے۔ اس منصوبے کے چیدہ چیدہ اصول یہ ہیں:-

(ا) اسلام میں زکوٰۃ کے آٹھ مصرف ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کر دیا جائے۔ (ملاحظہ ہو سورہ توبہ/۶۰)

اس طرح سے اسلامی بیت المال میں ایک مستقل اور دائمی حصہ مقرر کیا گیا ہے تاکہ غلاموں کی مکمل آزادی کا سلسلہ جاری رہے۔

(ب) اس مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسلام میں کچھ قوانین وضع کیے گئے ہیں جن کی رو سے غلام اپنے آقا سے ایک طرح کا مجبور کرتا ہے اور عہد و پیمان باندھتا ہے جس کی رو سے وہ اپنی محنت و مشقت سے حاصل کی ہوئی رقم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں اسلامی فقہ میں ”مکاتبۃ“ کے عنوان سے ایک مستقل فصل موجود ہے۔

(ج) اسلام میں غلاموں کی آزادی کو بہترین جادات میں سے اور عمل خیر قرار دیا گیا ہے اور اس بارے میں پیشوایان اسلام پیش نظر آتے ہیں جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کے حالات میں مورخین نے لکھا ہے کہ:

لہ ”مکاتبۃ“ کے بارے میں اور اس کے دلچسپ احکام کے متعلق ہم نے تفسیر نمونہ چودھویں جلد میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

«اعتق القامن كديدة»

”آپ نے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے“ لہ
(۵)۔ اسلام کے عظیم رہبر اور آئمہ اطہار علیہم السلام بہانے بہانے سے غلاموں کو آزاد کر دیا کرتے تھے تاکہ اس
طرح وہ غلاموں کی آزادی کے لیے دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ قرار پائیں۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے ایک
غلام نے ایک معمولی سا اچھا کام انجام دیا تو امامؑ نے اسے فرمایا:

«اذھب فانك حرفانی اكره ان استخذ مرءلاً من اهل الجنة»
”جاؤ! تم آزاد ہو، کیونکہ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ اہل بہشت میں سے کسی سے خدمت
لوں“ لہ

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے حالات میں قلم ہے کہ:
”آپ کا غلام آپ کے سر پر پانی ڈال رہا تھا کہ پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے گرا جس سے
آپ مجروح ہو گئے۔ امام نے اپنا سرا درپڑھا یا تو اس نے یہ قرآنی آیت پڑھی ”والکافین
الغیظ“ حضرت نے فرمایا ”میں نے اپنا غصہ پی لیا“ اس نے کہا ”والعافین عن
التاس“ امام نے فرمایا میں نے تجھے معاف کیا، خدا بھی تجھے معاف کرے“ اس نے
فورا کہا ”واللہ یحب المحسنین“ تو امامؑ نے فرمایا ”جاؤ! راہِ خدا میں تم آزاد
ہو“ لہ

(۵) بعض اسلامی روایات میں ہے کہ سات سال کے بعد غلام خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت امام
جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”من كان مؤمناً فقد عتق بعد سبع سنين، اعتقه صاحبه امر لم
يقتله ولا يحل خدمته من كان مؤمناً بعد سبعة سنين“
”مومن غلام سات سال کے بعد خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، خواہ اس کا مالک اسے آزاد
کرے یا نہ کرے اور سات سال کے بعد مومن غلام سے خدمت لینا جائز اور حلال
نہیں ہے۔ لہ

لہ بحار الانوار جلد ۱ ص ۳۴۔

لہ وسائل الشیخہ جلد ۱۶ ص ۳۳۔

لہ تفسیر نور الثقلین جلد ۱ ص ۳۹۔

لہ وسائل الشیخہ جلد ۱۶ ص ۳۶۔

اسی باب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بھی درج کی گئی ہے، آپ فرماتے ہیں:

”ما زال حبرئیل یوصین بالمملوک حتی ظننت انہ سیضرب لہ
اجلا یعتق فیہ“

”مجھے غلاموں کے بارے میں جبرائیل بار بار سفارش کرتے رہے ہیں، جس سے میں یہ
سمجھنے لگا کہ بہت جلد ان کی آزادی کی تاریخ مقرر کر دیں گے کہ جس میں وہ آزاد کر دیئے
جائیں گے۔“

(و)۔ جو شخص کسی مشترک غلام کو اپنے حصے کی نسبت آزاد کر دے، اس پر فرض بن جاتا ہے کہ بقیہ حصے کی خریداری
کر کے اسے آزاد کرے۔ لہ
جو شخص اپنے تمام غلام کے کچھ حصے کو آزاد کر دے تو یہ آزادی اس کے تمام حصوں میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ خود
بخود مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ لہ

(ز)۔ جو شخص اپنے والد یا والدہ یا نانا یا نانی یا دادا یا دادی یا اولاد یا چچا یا پھوپھی، ماموں یا خالہ یا بھائی یا
بہن یا بھتیجے یا بھانجے یا بھتیجی یا بھانجی کا مالک بن جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتے ہیں۔
(ح)۔ جب آقا کی اپنی کینز سے کوئی اولاد ہو جائے تو اس کینز کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے اور اپنی اولاد کے حصے
سے وہ فوراً آزاد کر دی جائے۔

یہ صورت حال بہت سی کینزوں کی آزادی کا سبب بن جاتی تھی کیونکہ وہ اپنے آقاؤں کی بیوی کی حیثیت سے
ہوتی تھیں اور ان سے صاحب اولاد ہو جاتی تھیں۔

(ط)۔ اسلام میں بہت سی خلاف ورزیوں کا کفارہ غلاموں کی آزادی مقرر کیا گیا ہے (مثال کے طور پر قتل خطا،
روزے کو جان بوجھ کر نہ رکھنا اور قسم وغیرہ کے کفارے)۔

(ی)۔ کئی ایسی سخت سزائیں ہیں کہ اگر آقا اپنے غلام کو وہ سزائیں دے تو غلام خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ لہ
دفعہ ”غلاموں کی شخصیت کا احیاء“ اسلام نے اس درمیانی مدت کے لیے غلاموں کے حقوق کے احیاء کے لیے
وسیع اقدامات کیے ہیں جو وہ اسلامی منصوبے کے تحت آزادی کے لیے طے کر رہے ہوتے ہیں ایسے اقدامات کے
تحت جہاں ان کے حقوق کا احیاء مقصود ہوتا ہے وہاں ان کی انسانی شخصیت کے احیاء کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ص ۳۳۔

۲۔ شرح الاسلام کتاب العلق۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ص ۲۱۔

۳۔ شرح الاسلام کتاب العلق۔

۴۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ص ۲۱۔

انسانی شخصیت کے لحاظ سے آزاد اور غلام کا فرق مٹ جائے۔ اسی لیے اسلام نے انسانی شخصیت کا معیار ”تقویٰ“ قرار دیا ہے، اسی لیے غلاموں کو بھی اجازت دی گئی کہ ہر قسم کے اہم معاشرتی مناصب حتیٰ کہ قاضی جیسے نہایت اہم عہدے پر بھی فائز ہو سکتے ہیں۔ لہ

عصر رسالت مآب میں لشکر کی سپہ سالاری سے لے کر دوسرے اہم ترین اور حساس ترین عہدوں پر غلام یا آزاد کردہ غلام فائز ہوئے ہیں۔

رسول اعظم کے بہت دوست اور صحابی یا تو غلام تھے یا آزاد غلام تھے اور ان میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو بزرگان اسلام کے معاون و مددگار کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور اس بارے میں سلمان فارسیؓ، عمار یا سرؓ اور قنبرؓ جیسے صحابیوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔

”غزوہ بنی مصلح“ کے بعد رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قبیلے کی ایک آزاد شدہ کینز سے ازدواج فرمایا اور یہ بات اس قبیلے کے تمام گرفتار شدہ قیدیوں کی آزادی کا بہانہ بن گئی۔

دفعہ ”غلاموں سے انسانی سلوک“ اسلام میں غلاموں کے ساتھ نرمی بریتنے اور ان کے ساتھ مدارت اور حسن سلوک کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، حتیٰ کہ انہیں اپنے آقاؤں کے ساتھ زندگی میں حصے دار بھی بنایا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ فرماتے ہیں:

”جس شخص کا بھائی اس کے زیر دست ہے، اسے چاہیے کہ جو کچھ وہ خود کھاتا ہے ویسا ہی اسے کھلائے، جو خود پہنتا ہے اسے بھی ویسا پہنائے اور اس کی طاقت سے زیادہ اس سے کام لے۔ لہ

حضرت علی علیہ السلام اپنے غلام قنبر سے فرمایا کرتے تھے:

”بھئی خدا سے شرم آتی ہے کہ میں تجھ سے اچھا لباس پہنوں کیونکہ رسول خدا فرمایا کرتے تھے جو کچھ تم خود پہنتے ہو ویسا ہی انہیں پہناؤ اور جو تم خود کھاتے ہو، ویسا ہی انہیں کھلاؤ۔“ لہ

امام جعفر صادق علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:-

”میرے والد جب کسی غلام کو کسی کام کے بجالانے کا حکم دیتے تو اگر وہ کام مشکل ہوتا تو پہلے خود بسم اللہ کہہ کر اسے انجام دیتے اور اس کی امداد کیا کرتے تھے۔ لہ

لہ شرائع الاسلام ”کتاب القضاء۔

لہ بحار الانوار جلد ۴، ص ۱۴۱ (حدیث ۱۱)

لہ بحار الانوار جلد ۴، ص ۱۴۱ (حدیث ۱۹)

لہ بحار الانوار جلد ۴، ص ۱۴۲ (حدیث ۱۳)

اس تدریجی اور عبوری عرصے کے دوران غلاموں کے بارے میں اسلام کے حسن سلوک کا حکم اس حد تک ہے کہ اسلام سے اجنبی افراد بھی اس سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے اور اس کی تعریف کی ہے۔
مثال کے طور پر جرجی زیدان (عیسائی مورخ) اپنی کتاب تاریخ تمدن میں لکھتے ہیں:

”اسلام، غلاموں کے ساتھ حد سے زیادہ مہربان ہے، پیغمبر اسلام نے غلاموں کے بارے میں بڑی تاکید کی ہے، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام کا کہنا ہے: جن کاموں کی بجا آوری غلاموں کے بس کی بات ہے، میں وہ ان کے ذمے نہ لگائے جائیں، جو کچھ تم کھاتے ہو دلیا ہی غلاموں کو کھلاؤ“
ایک اور موقع پر فرماتے ہیں: اپنے غلاموں کو کینیز یا غلام نہ کہو، بلکہ انہیں میرا بیٹا اور میری بیٹی کہہ کر بلایا کرو۔“

قرآن نے بھی غلاموں کے بارے میں بڑی عمدہ سفارشات پیش کی ہیں، چنانچہ کہتا ہے:
”خدا کی عبادت کرو، اس کا شریک مت ٹھہراؤ، ماں باپ، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، بے نواؤں، نزدیک اور دور کے ہمسایوں، دوستوں، بے خانمان لوگوں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو، خدا خود پسند لوگوں سے بیزار ہے“ ۱

دفعہ ۱۰۰۰ آدم فروشی کو بدترین فعل بتایا گیا ہے: ”اصولی طور پر اسلام میں غلاموں کی خرید و فروخت کو بدترین اور سب سے زیادہ قابل نفرت کاروبار قرار دیا گیا ہے، حتیٰ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ:
”سئرا الناس من باع الناس“ ۲

”بدترین لوگ وہ ہیں جو غلاموں کو بیچتے ہیں“ ۳

غلاموں کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لیے یہی بات کافی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی منصوبوں کا رخ کس طرف کو ہے۔

اس سے بڑھ کر دلچسپ اور جاذب توجہ یہ امر ہے کہ اسلام میں جو گناہ ناقابل معافی شمار کیے گئے ہیں ان میں سے ایک گناہ یہ بھی ہے کہ انسان کی آزادی اور حریت کو سلب کر لیا جائے اور اسے ایک سودے کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے۔ جیسا کہ آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے:

”ان الله تعالى عاف كل ذنب الا من جحد مهرا، او اغتصب

اجيرا احبرة، او باع رجلا حرا“

”خدا تین گناہوں کے علاوہ دوسرے سب گناہ معاف کر دے گا، جو شخص اپنی زوجہ کے

۱۔ تاریخ تمدن اسلام جلد ۲ ص ۵۴۔

۲۔ مستدرک الوسائل جلد ۲ کتاب التجارة باب ۱۰ حدیث ۱۔

مہر کا انکار کر دے۔ مزدور کی مزدوری غضب کر لے۔ کسی انسان کو بیچ ڈالے۔
اس حدیث کی رو سے عورتوں کے حقوق کا غضب کرنا، مزدور کی مزدوری کا غضب کرنا اور انسانی آزادی کا چھین لینا
تین ناقابل معافی گناہ ہیں۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام نے صرف ایک موقع پر غلام بنانے کی اجازت دی ہے اور وہ بھی جنگی قیدیوں کو اور وہ بھی اگر
لازمی نہیں ہے، جبکہ ظہور اسلام کے زمانے میں اور اس کے کئی صدیاں بعد تک طاقت کے ذریعے
اور سیاہ نام لوگوں کے ملکوں پر حملہ کر کے آزاد انسانوں کو گرفتار کر کے انہیں غلام بنانے کا طریقہ کار عام تھا اور بعض اوقات تو
وحشت ناک تعداد میں اس قسم کے غلاموں کا سودا کیا جاتا تھا۔ تک کہ ۱۸ ویں صدی عیسوی کے آخر میں حکومت برطانیہ سالانہ
دو لاکھ انسانوں کو غلاموں کی صورت میں فروخت کیا کرتی تھی اور ہر سال ایک لاکھ انسانوں کو افریقہ سے پکڑ کر غلاموں کی صورت
میں انہیں امریکہ لے جایا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ جو لوگ غلاموں کے بارے میں اسلام کی حکمت عملی پر اعتراض کرتے ہیں انہوں نے دُور ہی سے اس بابے
میں کچھ سُن رکھا ہے اور اس پر دو گرام کے اصولوں اور اسلام کے ہدف سے قطعاً نا آشنا رہیں، کیونکہ اسلام کا اصولی پروگرام
غلاموں کی تلفی کے بغیر تدریجی آزادی ہے۔ یا وہ لوگ پھر ان مفاد پرستوں کی باتوں میں آکر ایسی باتیں کرتے ہیں جنہوں
نے اپنے خیال میں اسے اسلام کا زبردست کمزور نقطہ سمجھ لیا ہے اور اسی چیز کو لے کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈے میں
مصروف ہیں۔

- ۷۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ○
- ۸۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعَسَّأَلَهُمْ وَاضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ○
- ۹۔ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ○
- ۱۰۔ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا ○
- ۱۱۔ ذَلِكَ بَانَ اللَّهُ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكُفْرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ ○

ترجمہ

- ۷۔ اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔
- ۸۔ اور جو لوگ کافر ہیں وہ مرجائیں اور ان کے اعمال اکارت ہوں۔
- ۹۔ یہ اس لیے کہ خدا نے جو چیزیں نازل فرمائی انہوں نے اسے ناپسند کیا تو خدا نے ان کے اعمال کو جھٹ کر دیا۔
- ۱۰۔ تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں تاکہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیا ہوا؟ خدا نے انہیں ہلاک کر دیا اور کافروں کے لیے اسی طرح کی سزا ہوگی۔

۱۱۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ خدا ایمان داروں کا مولا اور سرپرست ہے، لیکن کافروں کا کوئی سرپرست نہیں۔

تفسیر

تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کریگا

یہ آیات مثل سابق مومنین کو دشمنان حق کے خلاف قیام کی ترغیب دے رہی ہیں اور دلکش تعبیر کے ساتھ انہیں جہاد پر آمادہ کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ”اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کریگا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔ (یا ایہا الذین امنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم)۔“ ایمان کے مسئلے پر تاکید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچے دل سے ایمان کی ایک علامت دشمنان دین کے ساتھ جنگ ہے۔

خدا کی مدد کرنے کا مطلب واضح ہے کہ اس کے دین کی مدد کی جائے، اس کے پیغمبر کی نصرت کی جائے، پیغمبر کی شہادت اور تعلیمات کی نصرت کی جائے۔ اسی لیے قرآن مجید کی دوسری آیات میں خدا اور رسول کی نصرت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ مذکور ہوئی ہیں، جیسا کہ سورہ حشر کی آٹھویں آیت میں ہے:

”وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ہم الصادقون۔“

باوجودیکہ خدا کی قدرت بے انتہا ہے اور مخلوق کی قدرت اس کے مقابلے میں بالکل ہی ناچیز ہے، لیکن پھر بھی ”خدا کی مدد“ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں تاکہ جہاد اور آئین حق کے دفاع کی اہمیت واضح کی جائے اور اس سے بڑھ کر اس موضوع کے لیے کوئی اور با عظمت تعبیر نہیں مل سکتی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا نے اپنے دین کے دفاع کے بدلے جو وعدہ مجاہدین سے کیا ہے وہ کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے: ”خدا تمہاری مدد کرے گا“ لیکن کس طریقے سے؟ بہت سے طریقے ہیں! تمہارے دل میں نور ایمان، تمہاری روح میں تقویٰ، تمہارے ارادوں میں قوت اور تمہارے انکام میں اطمینان ڈال کر۔

پھر یہ بھی کہ فرشتے تمہاری امداد کے لیے بھیجتا ہے، حالات کا دھارا تمہارے حق میں موڑ دیتا ہے، لوگوں کے دلوں کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے، تمہاری باتوں میں تاثیر بخشتا ہے، تمہاری سرگرمیوں کو مفید اور نتیجہ خیز بناتا ہے، غرض خدا کی مدد تمہارے جسم و جان اور تمہارے ظاہر و باطن پر چھا جاتی ہے۔

لیکن امداد کی مذکورہ تمام صورتوں میں ”ثبات قدم“ کے مسئلے پر زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ دشمن کے مقابلے میں

استقامت اور پارسوی میں کامیابی کا سب سے زیادہ اور اہم راز پو شیدہ ہے اور میدان جنگ میں انہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے جو ثبات قدم اور استقامت کا زیادہ ثبوت پیش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے عظیم سپہ سالار حضرت طالوت کی ایک ستم گار، خونخوار اور طاقت ور بادشاہ جالوت کے ساتھ جنگ کے واقعے میں ہے کہ جب مؤمنین کی مختصر سی تعداد جو طالوت کے ساتھ تھی، طاقتور دشمن کے مقابلے میں کئی تو کہا:

” رَبَّنَا افْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ “
 ” خداوند! تو ہمارے لیے صبر و استقامت کی فراوانی کر دے اور ہمارے قدموں میں ثبات عطا فرما اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما “ (بقرہ - ۲۵۰)

چنانچہ اس کے بعد کی آیت میں ہے:

” فَهَزَمُوهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ “

” طالوت کے ساتھیوں نے جالوت کے طاقت ور لشکر کو حکم الہی سے شکست دے دی “
 یقیناً! ثبات قدم کا نتیجہ دشمن پر مکمل فتح اور کامرانی ہوتا ہے۔

چونکہ بعض اوقات دشمن کا جم غفیر اور ان کی افرادی قوت اور مختلف قسم کے اسلحہ جات مجاہدین راہ حق کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں، لہذا بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ کافر ہیں وہ ہلاک ہوں اور ان کے اعمال برباد ہوں
 وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَسَاءَلُهُمْ وَاَصْلُ اَعْمَالِهِمْ سَاءٌ

” تعس “ (بروزن ” تعس “) کا معنی ڈگمگانا اور منہ کے بل گرنا ہے، بعض لوگوں نے اس کا معنی ہلاکت، انحطاط اور پستی بیان کیا ہے۔ انہوں نے درحقیقت اس کے نتیجے کو بیان کیا ہے۔

بہر صورت ان دونوں گروہوں کے درمیان تقابلی بڑی حد تک با معنی ہے۔ سچے مؤمنین کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ” انہیں ثبات قدم رکھے گا، لیکن کافروں کے متعلق فرمایا گیا ہے: ” انہیں سقوط و لغزش نصیب ہو “ اور وہ بھی نفوس کی صورت میں کہ جس کی گہرائی اور گیرائی واضح ہے۔

جی ہاں! جب بے ایمان لوگ لغزش کرتے ہیں تو کوئی بھی انہیں سہارا نہیں دے سکتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ شکست کھا جاتے ہیں، لیکن مؤمنین کی امداد کے لیے فرشتے موجود ہوتے ہیں جو انہیں بڑھ کر تھام لیتے ہیں اور انہیں لغزش اور ڈگمگاہٹ سے فوراً بچا لیتے ہیں۔ جیسا کہ ایک اور جگہ پر خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

” تَعْسًا “ ایک فعل مقرر کا مفعول مطلق ہے جس کی تفسیر یوں ہے ” تَعْسًا تَعْسًا “ اور ” اَصْلُ اَعْمَالِهِمْ “ کا جملہ اسی فعل مقرر پر عطف ہے اور دونوں جملے نقرین کی صورت میں ہیں، جیسے ” قَاتِلْهُمْ اللّٰهُ “ اور ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے نقرین اس کے وقوع پذیر ہونے کے معنی میں ہے

”ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا تنزل عليهم الملائكة“

(حج سجدہ: ۳۰)

مؤمنین کے اعمال میں برکت ہوتی ہے، لیکن کفار کے اعمال برکت سے خالی ہوتے ہیں جو بہت جلد نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

بعد کی آیت ان کے سقوط اور ان کے اعمال کی بربادی کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے: یہ اس لیے کہ خدا نے جو چیز نازل فرمائی انہوں نے اسے ناپسند کیا تو خدا نے بھی ان اعمال کو اکارت کر دیا۔ (ذالک بانہم کرہوا ما انزل اللہ فاحبط اعمالہم)۔

خدا نے ہر چیز سے پہلے آئین توحید کو نازل فرمایا، لیکن انہوں نے اس سے منہ موڑ لیا اور شرک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ خدا نے حق و عدالت اور طہارت و تقویٰ کا حکم دیا، لیکن انہوں نے اس کی طرف بھی پیچھ کر لی اور ظلم و فساد کو اپنالیا، حتیٰ کہ جب ان کے سامنے خداوند وحدہ لا شریک کا نام لیا جاتا تو وہ اس سے بھی اظہار نفرت کرتے، جیسا کہ سورہ زمر کی ۲۵ ویں آیت میں ہے۔

”واذا ذکر اللہ وحمدہ اشمازت قلوب الذین لایؤمنون بالآخرۃ“

جی ہاں! جب یہ لوگ ان چیزوں سے متنفر ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس راہ میں قدم بھی نہیں اٹھاتے بلکہ ان کی تمام سعی و کوشش باطل کی راہوں پر گامزن ہونے میں صرف ہوتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال اکارت ہو جاتے ہیں۔

ایک روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

”کرہوا ما انزل اللہ فی حق علی“

”ان لوگوں نے ہر اس چیز کو ناپسند کیا جو خدا نے علی علیہ السلام کے حق میں نازل کی۔“

البتہ ”ما انزل اللہ“ کی تعبیر ایک وسیع معنی کی حامل ہے، جس کا ایک روشن اور واضح مصداق امیر المؤمنین علیہ السلام کی ولایت کا مسئلہ بھی ہے نہ یہ کہ مفہوم اسی میں منحصر ہے۔

قرآن مجید بہت سے مقامات پر ظالموں کو ”حسیٰ نمونے“ دکھاتا ہے لہذا یہاں پر بھی انہیں گذشتہ اقوام کے حالات کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، تاکہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا کیا انجام ہوا، وہی جنہوں نے کفر و سرکشی کی راہیں اختیار کیں اور خدا نے انہیں ہلاک کر دیا (افلہم یسروا فی الارض فی نظر و کیف کان عاقبة الذین من قبلہم دمر اللہ علیہم)۔

وہ یہ گمان نہ کریں کہ اس قسم کا دردناک انجام گذشتہ اقوام کے سرکش لوگوں کے لیے مخصوص تھا اور وہ بچ جائیں گے، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے "مشرکین اور کفار کے لیے بھی اس قسم کی سزا ہوگی" (وللکافرین امثالها)۔ لہٰذا وہ اس بات کی توقع ہرگز نہ رکھیں کہ ان جیسے کردار کا مظاہرہ بھی کریں گے اور ان جیسے انجام سے دوچار بھی نہیں ہوں گے، انہیں چاہیے کہ گذشتہ لوگوں کے آثار بھی دیکھیں اور اپنے مستقبل اور انجام کا بھی ان کی زندگی کے آئینے میں مشاہدہ کریں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ "دمر" "تدمیر" کے مادہ سے ہے، جس کا اصل معنی "ہلاک کرنا" ہے، لیکن جب "علیٰ" کے ساتھ مذکور ہو تو اس کا معنی ہر چیز کو حتیٰ کہ انسان کا اپنی اولاد، خاندان اور مخصوص اموال کو ملیا میٹ اور نیست و نابود کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح سے یہ تعبیر ایک بہت بڑی دردناک مصیبت کی نشاندہی کر رہی ہے اور خاص کر جب لفظ "علیٰ" پر توجہ مرکوز کی جائے کہ جو کسی کام پر تسلط اور غلبہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، تو آب پورے جھلے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے ان اقوام پر ان کے اموال پر اور ان کی تمام پسندیدہ چیزوں پر ہلاکت اور تباہی و بربادی کو گرا دیا۔

"زمین میں چلنے پھرنے" کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۲ (سورہ آل عمران کی ۱۴۷ آیت) کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اسی طرح سولہویں جلد میں اس ضمن میں بات کی گئی ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں خدا نے مؤمنین کو اپنی مکمل حمایت کی یقین دہانی کرواتے ہوئے سرکش کفار کی نابودی کی خبر دی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ خدا ایمان داروں کا مولا اور سرپرست ہے، لیکن کافروں کا کوئی مولا نہیں ہے۔

(ذالک بان اللہ مولیٰ الذین آمنوا وان الکافرین لامولیٰ لہم)۔ لہٰذا

"مولیٰ" بمعنی "ولی"، سرپرست، دوست اور مددگار ہے۔ تو اس لحاظ سے خدا نے مؤمنین کی ولایت، سرپرستی اور امداد کو اپنے ذمہ لے لیا ہے اور کافروں کو اس اپنی ولایت کے دائرے سے نکال دیا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو لوگ اس کی ذات پاک کی ولایت کے زیر سایہ ہوتے ہیں، خدا ان کے ہر اڑے وقت میں مدد فرماتا ہے اور ثبات قدمی عطا فرماتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے گمراہی کو پالیتے ہیں، لیکن جو لوگ اس دائرے سے خارج ہوتے ہیں ان کے اعمال کو اکارت کر دیتا ہے اور انجام کار وہ ہلاکت سے دوچار ہوتے ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیر تفسیر آیت میں اللہ کو صرف "مؤمنین کا مولا" کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے جبکہ دوسری بعض آیات میں کافروں کا مولا بھی بتایا گیا ہے، مثلاً سورہ یونس کی تیسویں آیت میں ہے۔

"وسدوا الی اللہ مولا ہم الحق وذل عنہم ما کانوا یفترون۔"

لہٰذا "امثالها" کی ضمیر "عاقبتہ" کی طرف لوٹ رہی ہے، جو پہلے جھلے سے سمجھی جاتی ہے۔

لہٰذا تفسیر روح المعانی، تفسیر روح البیان اور تفسیر فخر الرازی۔

لہٰذا "ذالک" کا مشابہ ایسے مؤمنین کا ایک انجام اور کفار کا بڑا انجام جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے۔

” وہ اپنے حقیقی مولا خدا کی طرف لوٹائے جائیں گے اور جن بتوں کو وہ جھوٹ سے خدا کا شریک گردانتے تھے وہ غائب اور نابود ہو جائیں گے۔“

اگر ایک نکتے کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ایک بات واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی ”ولایت عامہ“ یعنی خالق اور مدبّر ہونا سب کے لیے ہے، لیکن اس کی ”ولایت خاصہ“ کہ جس میں اس کی طرف سے حمایت بھی شامل ہے، صرف مومنین کے شامل حال ہوتی ہے۔ لہ

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت قرآن کی تمام دوسری آیات سے زیادہ امید بخش ہے یعنی ”ارجی ایۃ فی القرآن“ ہے۔ کیونکہ یہ تمام مومنین ہیں، خواہ وہ عالم ہیں یا جاہل، زاہد ہیں یا راعب، چھوٹے ہیں یا بڑے، مرد ہیں یا عورت اور بوڑھے ہیں یا جوان، یہ آیت ان سب مومنین کے لیے پروردگار عالم کی خاص عنایت اور حمایت کی نشاندہی کرتی ہے، حتیٰ کہ گناہگار مومنوں کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کرتی۔ خدا سخت سخت حوادث اور جانکاہ مصائب میں اپنی حمایت کے نمونے دکھا چکا ہے اور ہر شخص اپنی زندگی میں اس چیز کو ضرور محسوس کرتا ہے اور تاریخ میں بھی اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی جنگ سے واپسی پر ایک درخت کے نیچے اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک مشرک نے تلوار نیا م سے نکال کر آپ پر تان کر کہا:

” من یخلصک منی“

”اب تباؤ کہ تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟“

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برجستہ فرمایا: اللہ! یہ سن کر اس مشرک کے پاؤں ڈگمگائے۔ وہ زمین پر گر پڑا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

رسول اللہ نے وہ تلوار اٹھا کر فرمایا: ”اب تم تباؤ کہ تمہیں میرے ہاتھوں سے کون چھڑا سکتا ہے؟“ تو اس نے کہا، کوئی نہیں! یہ کہا اور ایمان لے آیا۔ لہ

جی ہاں! خدا تمام مومنین کا مولا ہے اور کفار کا نہ تو کوئی مولا ہے اور نہ ہی کوئی پناہ گاہ۔

لہ بعض مفسرین مثلاً آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں زیر نظر آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ”مولا“ کا معنی نامزد اور سورۃ یونس کی آیت جیسی آیت میں مولا کا معنی ”مالک“ لکھا ہے۔

لہ تفسیر روح البیان جلد ۷ صفحہ ۷۷۔

- ۱۲۔ اِنَّ اللّٰهَ يَدْخُلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا
تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالتّٰرِمْثُ وَاَشْوٰى لَهِمْ ۝
- ۱۳۔ وَكَآئِنٌ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْ اَخْرَجْتُكَ
اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝
- ۱۴۔ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ نُرِيَ لَهُ سُوْءَ عَمَلِهٖ
وَاتَّبَعُوْا اَهْوَاؤَهُمْ ۝

ترجمہ

- ۱۲۔ خدا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے، بہشت کے ان باغات میں پہنچا دے گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جو کافر ہیں وہ دنیا کی جلد ختم ہونے والی متاع سے استفادہ کرتے ہیں اور چوپالیوں کے مانند کھاتے ہیں اور آخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔
- ۱۳۔ اور جس شہر نے تجھے نکال دیا، کتنے شہر تھے جو اس سے زیادہ طاقت درتھے کہ جنہیں ہم نے تباہ و برباد کر دیا اور کوئی ان کا مددگار بھی نہیں تھا۔
- ۱۴۔ تو کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل رکھتا ہو اس شخص کے برابر ہو

سکتا ہے، جس کی بد اعمالیاں اسے بھلی کر کے دکھائی گئی ہوں اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتا ہو؟۔

تفسیر

مؤمنین اور کفار کا انجام:

گذشتہ آیات میں حق و باطل اور ایمان و کفر کی مسلسل آدیزش کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ اب ان آیات میں ایک واضح تقابل کے ذریعے مؤمنین اور کفار کا انجام بیان کیا جا رہا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ دونوں گروہ دنیا ہی کی زندگی میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں، بلکہ آخرت میں بھی ان کی زندگی میں زبردست فرق ہوگا ارشاد ہوتا ہے: خدا ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کرتے رہے بہشت کے ان باغات میں پہنچا دیگا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (ان اللہ یدخل الذین امنوا وعملوا الصالحات جنات تجری من تحتها الأنهار)۔

جبکہ کافر لوگ دنیا کی زود گور متاع سے استفادہ کرتے ہیں اور چوپایوں کے مانند کھاتے ہیں اور آفران کا ٹھکانا جہنم ہے (والذین کفروا یتمتعون ویأکلون کما تأکل الانعام والنار مشوی لہم)۔ یہ ٹھیک ہے کہ دونوں قسم کے لوگ اسی دنیا میں رہ رہے ہیں اس کی نعمتوں سے بہرہ مند بھی ہو رہے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ مؤمنین کی زندگی کا مقصد ایسے اعمال صالح کی بجا آوری ہے جو مفید، تعمیری اور رضائے الہی کے حصول کا سبب ہوتے ہیں، جبکہ کفار کی زندگی کا اصل مقصد صرف کھانا پینا اور سونا اور دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہوتا ہے۔ مؤمنین کا ہر ایک اقدام معرفت پر مبنی ہوتا ہے، جب کہ کفار بے مقصد زندگی گزارتے ہیں اور بے مقصد موت کو اختیار کرتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے چوپائے ہوتے ہیں۔

مؤمنین نے دنیاوی زندگی میں اپنے لیے بہت سی شرائط اور حدیں عائد کر رکھی ہیں۔ وہ دنیاوی امور کے جواز، حصول اور مصرف کی کیفیت کے سلسلے میں بڑی سوچ و پچار سے کام لیتے ہیں، لیکن کفار چوپایوں کے مانند ہوتے ہیں جنہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ یہ چارہ ان کے مالک کا ہے یا غصبی؟ کسی یتیم اور بیوہ کا اس میں حق ہے یا

لہ "کما یاکل..." ایک مقدر مفعول مطلق کے مقام نصب پر ہے، اصل میں یوں ہے "یاکلون اکلا کما یاکل الانعام"۔

یا نہیں۔

مؤمنین جب کسی دنیاوی نعمت سے استفادہ کرتے ہیں تو اس کے عطا کرنے والے کے بارے میں سوچتے ہیں اس نعمت میں اُس کی آیات کو دیکھتے ہیں اور منعم حقیقی کا شکر بجالاتے ہیں۔ جب کہ کفار کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اور کسی چیز کے بارے میں سوچے بغیر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ہمیشہ اپنے ظلم و گناہ کے بوجھ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، خود کو ہلاکت کے نزدیک کرتے رہتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے کوئی موٹی تازہ بکری جتنا زیادہ کھاتی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ موٹی ہوتی جاتی ہے اور ذبح ہونے کے زیادہ قریب ہوتی جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے ان دونوں گروہوں کا باہمی فرق ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

”ان المؤمن لا یخلوا اکلہ عن ثلاث: الورع عند الطلب، واستعمال
الادب، والاکل للسبب، والكافر یطلب للنہمة، ویأکل للشہوة
وعیشہ فی غفلة“

”مؤمن کا کھانا تین صورتوں سے خالی نہیں ہوتا، کھانے کے حصول میں پرہیزگاری، ادب کو کام میں لانا اور صرف میں مقصد کو پیش نظر رکھنا، جب کہ کافر کی طلب روزی غیر مشروط، اس کا کھانا شہوت کے لیے اور اس کی تمام زندگی غفلت میں گزرتی ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مؤمنین کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ”خدا انہیں بہشت کے باغوں میں پہنچا دیکھا“ لیکن کفار کے متعلق فرمایا گیا ہے ”ان کا ٹھکانا جہنم ہے“ پہلی تعبیر اہل ایمان کے احترام اور ان کی طرف توجہ کی غماز ہے جب کہ دوسری تعبیر کفار کی تحقیر اور ان سے بے اعتنائی کی آئینہ دار ہے کیونکہ وہ خدا کی ولایت کے دائرے سے نکل چکے ہیں۔

بعض مفسرین نے ”والشار مشوی لہم“ (جہنم کی آگ ان کا ٹھکانا ہے) کے جملے سے یہ سمجھا ہے کہ وہ اس وقت بھی جہنم میں ہیں۔ ان کے بقول کیونکہ یہ جملہ فعل مضارع اور مستقبل کی صورت میں نہیں ہے بلکہ حال کی خبر ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ ان کے اپنے کردار اور کثرت ہی آگ ہیں جس میں وہ گرفتار ہیں اور وہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے ہر چند کہ یہ حیران صفت لوگ اس چیز سے غافل اور بے خبر ہیں چنانچہ ہم سورہ توبہ کی آیت ۴۹ میں پڑھتے ہیں:

”وان جہنم لمحیطۃ بالکافرین“

”جہنم نے کافروں کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے۔“

قرآن مجید کی کچھ اور آیات میں بھی ان جہنمیوں کو چو پالیوں سے تشبیہ دی گئی ہے، بلکہ انہیں ان سے بھی بدتر گردانا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

”اولئک کالانعام بل ہم اضل اولئک ہم الغافلون“ (اعراف/۱۴۹)

”یہ لوگ چو پالیوں کے مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر یہ غافل لوگ ہیں۔“

اس کی مفصل تشریح ہم تفسیر نمونہ کی ساتویں جلد کے ابتدائی حصے میں پیش کر چکے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے بعد کی آیت میں مشرکین مکہ اور سابقہ دور کے بت پرستوں کے درمیان ایک تقابلی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے اور واضح لفظوں میں انہیں سخت تنبیہ کی جا رہی ہے اور ضمنی طور پر ان کے ان بعض جرائم کو بیان کیا جا رہا ہے جو جنگ کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، ”اور جس شہر سے لوگوں نے تجھے نکال دیا ہے اس سے زیادہ قوی بہت سے شہر تھے، جن کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا، جبکہ کوئی ان کا مددگار نہیں تھا (و کاین من قریۃ ہی اشد قوۃ من قریۃ الٰہی اخرجتک اهلکناہم فلا ناصر لہم)۔“

وہ یہ گمان نہ کریں کہ چند روزہ دنیا ان کے کچھ کام آئے گی، اس لیے وہ اس قدر جسور اور جری ہو چکے ہیں کہ خدا کے عظیم رسول کو مقدس ترین شہر سے نکال دیا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ صورت حال ہمیشہ یونہی رہے گی، نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے یہ لوگ قوم عاد و ثمود، فراعنہ مصر اور ابرہہ کے لشکر کے مقابلے میں تو بہت ہی کمزور اور ناتوان ہیں، خدا نے تو ان کو بھی نابود کر دیا تھا، اور انھیں تمہیں ذہن کر دیا تھا، ان کی سرکوبی تو معمولی بات ہے۔

ابن عباس سے ایک روایت منقول ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے غارتور کی طرف جا رہے تھے تو آپ نے مکہ کی طرف منہ کر کے کہا:

”انت احب البلاد الی اللہ وانت احب البلاد الی ولولا المشرکون اهلك

اخرجونی لما خرجت منك“

تو خدا کے نزدیک بھی محبوب ترین شہر ہے اور میرے نزدیک بھی محبوب ترین شہر ہے اگر

تیرے رہنے والے مشرک لوگ مجھے نہ نکالتے تو میں اپنی مرضی سے کبھی نہ نکلتا“

اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی (جس میں پیغمبر کو نصرت الہی کی خوشخبری دی گئی ہے اور مشرکین کو سزا کے لیے

متنبہ کیا گیا ہے)۔

اس شان نزول کے مطابق یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ شان نزول سورہ قصص کی ۲۵ ویں آیت سے متعلق ہے اور بہت سے مفسرین نے اسے وہیں پر ذکر کیا ہے اور اس کی زیادہ مناسبت بھی اسی آیت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

”ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد“

”جس خدا نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہی تجھے تیری (ولادت کی) جگہ لوٹائے گا۔“

یہاں پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آنحضرتؐ کو باہر نکال دینے کی نسبت شہر مکہ کی طرف دی گئی ہے جبکہ

نکلنے والے اہالیان شہر تھے۔ یہ ایک لطیف کنایہ ہے، جو اس شہر پر ایک خاص گروہ کے تسلط کو بیان کرتا ہے۔ اس طرح کے کنایے قرآن مجید کی اور بھی آیات میں ذکر ہوئے ہیں۔

صنعتی طور پر ہم پھر یہ بتاتے چلیں کہ لفظ ”قوسیۃ“ شہر اور آبادی کے لیے بولا جاتا ہے نہ کہ ”گاؤں“ کے معنی میں ہے اور اس بات کو ہم پہلے بھی کئی مقامات پر بیان کر چکے ہیں۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں مؤمنین اور کفار کے درمیان ایک اور تقابل کو پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا آپس میں ہر چیز میں فرق ہے۔ ایک گروہ ایمان پر قائم اور اعمال صالح پر کار بند ہے، جب کہ دوسرا گروہ پورے طور پر حیوانی زندگی گزار رہا ہے۔ ایک پروردگار کی ولایت کے زیر سایہ رہ رہا ہے اور دوسرا بے مولا اور بے سرپرست ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تو کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہو اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے، جس کی بد اعمالیاں اسے جلی کر کے دکھائی گئی ہوں اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتا ہو۔ رافضی من ربنا علیٰ بیتنا من ربنا۔

پہلے گروہ نے اپنے راستے کو پایا ہے اور وہ صحیح معرفت، یقین، دلیل، اور قطعی برہان کے ساتھ اس پر گامزن ہے اپنے راستے اور مقصد کو واضح طور پر دیکھ رہا ہے اور اس کی طرف رواں دواں ہے، جبکہ دوسرا گروہ غلط پہچان اور حقائق کے عدم اور اک کا شکار ہے اور اندھیروں میں ٹامک ٹوٹیاں مار رہا ہے، راہ سے بھٹک کر منزل مقصود سے کوسوں دور ہے، اس بھٹکنے کا اصل سبب سرکش نفس کی خواہشات کی اتباع ہے کیونکہ خواہشات نفسانی انسان کی عقل و فکر پر پردے ڈال دیتی ہیں۔ اچھائیوں کو برائیاں اور برائیوں کو اچھائیاں بنا کر پیش کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات سرکش نفس کا تابع انسان اپنے ناپاک اور شرم آور کردار پر فخر و مباہات کرنے لگتا ہے، جیسا کہ سورہ کہف کی ۲، ۱۰۵ آیات میں ہے:

”قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَبِيلَهُمْ فِي

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ

كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاءِ فَجَّطِ أَعْمَالِهِمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ

يَوْمَ الْقِيَامَةِ وِزْنَاً“

”کہہ دے: کیا تم تمہیں ایسے لوگوں کے بارے میں بتائیں کہ جو سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں؟ یہ وہی لوگ تو ہیں کہ دنیاوی زندگی کے لیے جن کی سعی و کوشش کا کچھ حاصل نہیں اور پھر بھی وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام انجام دے رہے ہیں، وہی تو ہیں جو اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کے منکر ہیں، اسی لیے تو ان کے اعمال اکارت جائیں گے اور قیامت کے دن ہم ان کے لیے میزان اور ترازو قائم نہیں کریں گے۔ (کیونکہ ان کے اعمال میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔)

”بیتنا“ آشکار اور روشن دلیل کے معنی میں ہے اور یہاں پر قرآن مجید پیغمبر اکرم کے معجزات اور دوسرے عقلی دلائل

کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ”افمن کان....“ میں استفہام ”استفہام انکاری“ ہے یعنی یہ دونوں گروہ آپس میں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان نفس پرستوں کے بُرے اعمال کو کون بھلا بنا کر پیش کرتا ہے؟ خود وہ آپ یا خدا، یا شیاطین؟ تو جواب یہ ہے کہ سب کے سب! کیونکہ قرآنی آیات میں ان تینوں کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ سورہ نمل کی چوتھی آیت میں فرمایا گیا ہے:

”ان الذین لایؤمنون بالآخرة ذینا لہما اعمالہم“

”جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر دیتے ہیں“
دوسری متعدد آیات بشمول سورہ عنکبوت کی ۴۸ ویں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ شیطان نے ان کے اعمال کو بنا سنا کر پیش کیا ہے۔

”وزین لہم الشیطان اعمالہم“

اور زیر تفسیر آیت میں ”واتبعوا ہوائہم“ کے جملے کے پیش نظر یہ زینت ان کی خواہشات نفسانی کی اتباع کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہ بات مکمل طور پر قابل فہم ہے کہ خواہشات نفسانی کی اتباع انسان سے ادراک اور تشخیص کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے۔

البتہ اس کی شیطان کی طرف نسبت بھی صحیح ہے کیونکہ وہ نفسانی خواہشات کو بھڑکاتا اور انسان کو ہمیشہ دوسروں میں ڈالتا رہتا ہے۔

ادراگ اس کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے تو اس لیے کہ وہ ”مسبب الاسباب“ ہے اور ہر سبب کا جواثر ہوتا ہے وہ اسی کی جانب سے ہے۔ اسی نے آگ کو تپش عطا کی ہے اور خواہشات نفسانی کو حقائق پر پردہ ڈالنے کی تاثیر بھی نیز وہ اس تاثیر کے بارے میں بتا بھی چکا ہے۔ تو اس طرح سے ساری ذمہ داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے۔
بعض مفسرین نے ”افمن کان علی بینة من ربہ“ کو پیغمبر کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعد کے جملے کو کفار مکہ کی طرف۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت کا وسیع معنی ہے اور یہ مفہا ہم اس کے مصداق ہیں۔

۱۵۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَّاءٍ غَيْرِ
 أَسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ
 لَذَّةٍ لِلشَّرْبِ بَيْنَهُ وَأَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ
 كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ
 وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ۝

ترجمہ

۱۵۔ جس بہشت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں
 صاف و شفاف پانی کی نہریں ہیں کہ جن میں بدلہ نہیں ہے اور دودھ کی نہریں ہیں
 جن کا مزہ آٹنک سیس بدلا اور شراب (ظہور) کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے
 لذت ہی لذت ہیں، اور صاف و شفاف شہد کی نہریں ہیں اور وہاں ان کے لیے
 ہر قسم کے پھل ہیں اور (ان سب سے بڑھ کر) ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش
 ہے۔ بھلا یہ لوگ ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے اور
 انہیں کھولتا ہوا پانی پلا یا جائے گا تو وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے
 کر ڈالے گا۔

تفسیر

بہشت کی ایک اور صفت:

یہ آیت گذشتہ آیات کے مانند کا فر اور مومن دونوں گروہوں کے اوصاف بیان کر رہی ہے۔ ایک گروہ کے شرم ناک اور بُرے اعمال ہیں جو ان کی نظر میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور دوسرے کے نیک اور صالح۔ اس آیت میں اہل بہشت کی چھ قسم کی نعمتوں اور اہل دوزخ کے دو قسم کے سخت اور دردناک عذاب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے انجام کو واضح کیا گیا ہے۔

اہل بہشت کی نعمتوں میں چار نہروں کا نام لیا گیا ہے، جن میں سے ہر ایک ایک خاص چیز کی ہے اور ہر ایک کا اپنا مزہ ہے، پھر بہشت کے پھلوں کا ذکر ہے اور آخر میں روحانی نعمتوں کا تذکرہ ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: جس بہشت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں صاف و شفاف پانی کی نہریں ہیں جن میں بدلہ نہیں ہے (مثل الجنة التي وعد المتقون فيها انهار من ماء غير آسن)۔ لہذا "ماء غير آسن" کا معنی ہوگا، وہ پانی جو مدتوں رہنے کے باوجود بدلہ دار نہیں ہوتا۔ یہ بہشت کی نہروں کی وہ پہلی قسم ہے جس کا پانی صاف و شفاف، خوشبودار اور خوش ذائقہ ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ تک نہیں بدلا (وانهار من لبن لم يتغير طعمه)۔ اصولی طور پر بہشت ایک ایسا مقام ہے، جہاں پر نہ تو کسی چیز کے جگڑنے کا اندیشہ ہے نہ ہی خراب ہونے کا۔ یہ تو اس مادی دنیا کا خاصہ ہے جس میں مختلف قسم کے جراثیم ہوتے ہیں جو غذا کو خراب کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد بہشت کی تیسری قسم کی نہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور شراب (طہور) کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذت ہی لذت ہیں (وانهار من خمر لذة للمشربین)۔

آخر میں بہشت کی چوتھی قسم کی نہر کا حال اس صورت میں بیان فرمایا گیا ہے: اور صاف و شفاف شہد کی نہریں

لہذا اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ملتے ہیں۔ سب سے مناسب قول یہ ہے کہ "مثل الجنة التي وعد المتقون جنة فيها انهار" درحقیقت یہ آیت سورہ رعد کی ۲۵ ویں آیت سے ملتی جلتی ہے، جس میں کہا گیا ہے:

"مثل الجنة التي وعد المتقون تجري من تحتها الانهار"

ہیں (واٹھار من عسل مصفیٰ)۔

ان گونا گوں نہروں جن میں سے ہر ایک علیحدہ مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے کے علاوہ پانچویں نعمت کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور وہ ہے بہشت کے مختلف النوع پھل ارشاد فرمایا گیا ہے: اور وہاں ان کے لیے ہر قسم کے پھل ہیں (ولہم فیہا من کل الثمرات)۔ ۱۵

طرح طرح کے پھل مختلف ذائقے اور مختلف خوشبو کے ساتھ، جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں یا ہمارے تصور سے باہر ہیں سب کے سب بہشت والوں کو عطا ہوں گے۔

آخریں خدا کی چھٹی نعمت کا تذکرہ ہے جو گذشتہ مادی نعمتوں سے ہٹ کر ہے اور روحانی حیثیت کی حامل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان کے لیے ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے (ومغفرة من ربہم)۔

ایک عظیم اور وسیع رحمت جو ان کی تمام لغزشوں کو چھپا رہی ہوگی اور انہیں روحانی تسکین عطا کر رہی ہوگی، اور بارگاہ رب العزت کا محبوب بنا رہی ہوگی اور "رضی اللہ عنہم ورضوا عند ذالک الفوز العظیم (خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے راضی) اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (مائدہ ۱۱۹) کا مصداق بنا رہی ہیں۔

تو اس طرح سے پاک باز اور صالح العمل مؤمنین بہشت بریں میں خدا کی ہر طرح کی مادی اور روحانی نعمتوں سے اس کے ہوا میں رہ کر بہرہ مند ہوں گے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کا مقابلہ کر وہ کس انجام سے دوچار ہوگا؟ تو اسی آیت میں اسے بھی بیان فرمایا گیا ہے: ارشاد ہوتا ہے: جیسا کہ ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے اور انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، تو وہ انکی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا (کمن هو خالد فی النار وسقوا ماءً حمیمًا فقطع امعاءہم)۔ ۱۶

"امعاء" جمع ہے "معی" (بروزن "سعی") کی، اور "معا" (بروزن "غنا") کا معنی آنت ہے اور کبھی اس کا اطلاق شکم کے اندر موجود تمام چیزوں پر بھی ہوتا ہے اور ان کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہنم کا یہ وحشت ناک مشروب اس قدر گرم ہوگا کہ پیٹ میں موجود تمام چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

۱۵ اس جملے کا ایک محذوف ہے جو تقدیری صورت میں یوں ہے۔

"لہم فیہا انواع من کل الثمرات"

۱۶ اس آیت کی تفسیر میں بھی مختلف اقوال ملتے ہیں اور ان سب میں مناسب تری یہ ہے کہ کہا جائے کہ اس آیت میں ایک مقدار ہے جس کی اٹلی

اور تقدیری صورت یوں ہے۔

"افمن هو خالد الجنة التي هذه صفاته کمن هو خالد فی النار"

چند نکات

۱۔ بہشت کی چار نہریں: قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ بہشت میں مختلف قسم کی نہریں اور چشمتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا اپنا فائدہ اور اپنا لطف و مزہ ہے، جن میں سے چار کا نمونہ تو مندرجہ بالا آیت میں پیش کیا گیا ہے اور باقی کے نمونے انشا اللہ سورہ دہر کی تفسیر میں بیان ہوں گے۔

ان چار قسم کی نہروں کو ”انہار“ کے لفظ سے یاد کیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نہر نہیں بلکہ کئی کئی نہریں ہونگی۔ ہم پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ بہشت کی نعمتیں ایسی ہیں جنہیں روزمرہ کی دنیاوی زندگی کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، الفاظ ان نعمتوں کی کما حقہ تصویر کشی سے قاصر اور عاجز ہیں، بلکہ صرف ان کا ایک ہلکا اور معمولی سا خاکہ پیش کر سکتے ہیں۔ زیر تفسیر آیت میں بہشت کی چار پانی، دودھ، شرابِ طہور، اور شہد کی نہروں کا ذکر کیا گیا ہے، ممکن ہے پہلی نہر پیاس دور کرنے کے لیے، دوسری خوراک کے حصول کے لیے، تیسری نشا ط اور فرحت بخشنے کے لیے اور چوتھی لذت و قوت پیدا کرنے کے لیے ہو۔

یہ بات بھی جاذب توجہ ہے کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اہل بہشت ان تمام نہروں سے سیراب نہیں ہوں گے، بلکہ مراتب اور منصب کے لحاظ سے ان سے بہرہ ور ہوں گے۔ جیسا کہ سورہ مطفقین کی ۲۸ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

”عیناً يشرب بها المقربون“

”ایسا چشمہ ہے جس سے مقربین بارگاہ الہی پانی پیتے گے۔“

۲۔ شرابِ طہور: واضح سی بات ہے کہ بہشت کی شراب کا اس دنیا کی غلیظ اور نجس شراب سے کسی قسم کا کوئی رابطہ اور واسطہ نہیں ہے، جیسا کہ قرآن مجید ایک اور مقام پر اس شرابِ بہشت کی یوں تعریف کرتا ہے۔

”لا فیہا عنول ولا ہم عنہا یزنون۔“

”وہ شراب ایسی ہے، جس سے نہ تو عقل خراب ہوتی ہے اور نہ مستی کا سبب بنتی ہے۔“

(صافات / ۴۴)

۳۔ خراب نہ ہونے والے مشروبات: بہشت کی نہروں کی ایک مرتبہ تو غیبا سن (اس کی بو نہیں بدلی) کے ساتھ اور دوسری مرتبہ ”لحم تغیر طعمہ“ (اس کا ذائقہ نہیں بدلا) کے ساتھ تعریف و توصیف کی گئی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ بہشت کے مشروبات اور غذائیں ہمیشہ تروتازہ رہیں گی۔ پہلے دن کی سی تازگی آخر ایسا کیوں نہ ہو، جب کہ خوراک کا تغیر اور اس میں خرابی جراثیم کی وجہ سے عمل میں آتی ہے، اگر یہ دنیا میں نہ ہوتے تو کسی چیز میں کوئی خرابی پیدا نہ ہوتی اور ہر چیز اپنی اصلی حالت پر باقی رہتی، لیکن چونکہ بہشت خرابی پیدا کرنے والوں کی جگہ نہیں ہے، لہذا وہاں ہر چیز پاک، صاف، صحیح و سالم اور تروتازہ رہے گی۔

۴۔ پھل کیوں؟ اس آیت میں بھی اور قرآن کی دوسری آیات میں بھی بہشت کی غذاؤں کے تذکرے میں پھلوں کا ذکر لازمی طور پر ہوا ہے، مختلف الانواع پھل جو تمام ذائقوں کا باب ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پھل بہشت کی نہایت اہم غذا ہیں۔ حتیٰ کہ اس دنیا میں بھی انسانی غذاؤں میں سب سے زیادہ صحیح و سالم اور بہترین غذا پھل ہی ہیں۔

۵۔ ”سقوا“: (انہیں پلایا جائے گا) کی تعبیر پھلوں کے ساتھ کی گئی ہے جو اس حقیقت کی غماز ہے کہ ان (جہنمیوں) کو کھولتا اور جلتا پانی زبردستی پلایا جائے گا وہ اپنی خوشی سے نہیں پیئیں گے اور جہنم کی اس آگ میں ان کے سیراب ہونے کے بجائے، ان کی آنتوں کے ٹھوٹے ٹھوٹے ہو جائیں گے اور دوزخ کے معمول کے مطابق پھر وہ اپنی اصلی حالت میں جائیں گے، کیونکہ وہاں موت نہیں ہے۔

- ۱۶۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ
 قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنفًا ۗ وَلِلَّذِينَ طَبَعَ
 اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۖ
 ۱۷۔ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًىٰ وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ۖ
 ۱۸۔ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۖ فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا فَأَنَّىٰ
 لَهُمْ إِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرُهُمْ ۚ
 ۱۹۔ فَأَعْلَمَ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرُ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ
 وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثُوكُمْ ۗ

ترجمہ

۱۶۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو تیری طرف کان لگائے رہتے ہیں، لیکن جب
 تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو جن لوگوں کو خدا نے علم و دانش عطا کی ہے، ان سے
 (بطور مذاق) کہتے ہیں، ابھی اس شخص نے کیا کہا تھا؟ یہ وہی لوگ ہیں جن کے
 دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہیں
 (لہذا کچھ نہیں سمجھتے)۔

۱۷۔ جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں ان کو خدا مزید ہدایت کرتا ہے اور انہیں پرہیزگاری کی

روح عنایت فرماتا ہے۔

۱۸۔ تو کیا یہ لوگ بس قیامت کے انتظار میں ہیں کہ ان پر ناگہان آجائے (تو اس وقت وہ ایمان لائیں گے) حالانکہ اس کی نشانیاں تو آچکی ہیں، لیکن جس وقت وہ اپنے بچنے کی تو اس وقت ان کی توجہ اور ایمان انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔

۱۹۔ پس جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ پر اور ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں کے لیے استغفار کر اور خداوند تعالیٰ تمہارے چلنے پھرنے اور ٹھہرنے کی جگہ کو جانتا ہے۔

تفسیر

قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں :

یہ آیات وحی الہی، آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے بارے میں منافقین کی کیفیت کی تصویر کشی اور دشمنان اسلام کے ساتھ جنگ و جہاد کے مسئلے کو بیان کر رہی ہیں۔
مدنی سورتوں میں منافقین کا بہت تذکرہ ملتا ہے جب کہ مکی سورتوں میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ منافقت اور نفاق کا مسئلہ اسلام کی کامیابی اور اس کے مکمل طور پر مسلط ہوجانے کے بعد پیدا ہوا، کیونکہ مخالفین کی طاقت کمزور ہو گئی تھی اور وہ کھلم کھلا طور پر اسلام کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا وہ بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کے دائرے میں آئے تاکہ اس طرح سے وہ مسلمانوں کے غیظ و غضب سے بچے رہیں، لیکن باطنی طور پر مختلف سازشوں میں مصروف رہے۔ مدینہ کے یہودی جو فرجی اور اقتصادی لحاظ سے بہت طاقت ور تھے وہ بھی منافقین کے پشت پناہ ثابت ہوئے۔

بہر حال، وہ سچے مومنین کی صفوں میں گھس آئے، نماز جمعہ اور دیگر اجتماعات میں رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے، لیکن قرآنی آیات کے مقابلے میں ان کا رد عمل ان کے دلوں کی بیماری کا آئینہ دار ہوتا۔
اس لیے زیر تفسیر آیات میں سے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ان میں سے کچھ لوگ تیرے پاس آتے ہیں،

تیری باتوں کو کان لگا کر سنتے بھی ہیں، لیکن جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو جن لوگوں کو خدا نے علم و دانش عطا کی ہے ان سے تحقیق اور تمسخر کے انداز میں کہتے ہیں، ابھی اس شخص نے کیا کہا تھا (ومنہم من یستمع الیک حتی اذا خرجوا من عندک قالوا للذین اوتوا العلم ماذا قال انفاء)۔

”اس شخص“ سے ان کی مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تھی۔

ان لوگوں کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی گوہر بارگفتگو کے بارے میں رد عمل، اس قدر تحقیق آمیز، غلط اور ناروا تھا، جس سے صاف سمجھا جاتا تھا کہ وہ آسمانی وحی پر بالکل ایمان نہیں رکھتے۔

”انف“ ”انف“ کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے ”ناک“ اور ناک چونکہ انسان کے چہرے پر خاص طور سے ایک نمایاں چیز ہے، لہذا یہ کلمہ کسی قوم کے شریف اور معزز افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور زمانے کے لحاظ سے اس کا اطلاق زمانہ حال پر ہوتا ہے، جیسا کہ اسی آیت میں ذکر ہوا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ ”للذین اوتوا العلم“ کی تعبیر اس بات کی نشاں دہی کر رہی ہے کہ مومنین کی علامت ان کا کافی حد تک علم کا حامل ہونا بھی ہے، کیونکہ علم ہی ایمان کا سرچشمہ ہوتا ہے اور ایمان ہی کی وجہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔

لیکن آیت کے آخر میں قرآن مجید ان (کفار) کو دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے: رسول کی باتوں میں نہ تو کسی قسم کی پیچیدگی ہوتی ہے اور نہ ہی بے معنی ہوتی ہیں، بلکہ یہ لوگ خود ایسے ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دیا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، لہذا انھیں کچھ سمجھ نہیں آتا (اولئک الذین طبع اللہ علی قلوبہم واتبعوا اہواءہم)۔

درحقیقت دوسرا جملہ پہلے جملے کی علت ہے۔ یعنی خواہشات نفسانی کی پیروی انسان سے حقائق کے ادراک کی طاقت اور تشخیص کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے اور اس کے دل پر پردہ ڈال دیتی ہے، گویا خواہش پرستوں کے دل اس ظرف کے مانند ہو جاتے ہیں، جس کا منہ بند کر دیا جائے اور اسے سر بھر کر دیا جائے، نہ تو اس میں کوئی چیز رکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس سے نکالی جا سکتی ہے۔

ان کے برعکس سچے مومنین ہیں، جن کے بارے میں بعد کی آیت میں گفتگو ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں انہیں مزید ہدایت کرتا ہے اور انہیں تقویٰ اور پرہیزگاری کی رُوح عطا فرماتا ہے۔ (والذین اہتدوا زادہم ہدًی و اتاہم تقواہم)۔

جی ہاں! انہوں نے ہدایت کیلئے پہلے از خود اقدام کیا، اپنی عقل و خرد اور فطرت صحیح معنوں میں کام لیا پھر خدا بھی حسب وعدہ اپنی راہ پر چلنے والے مجاہدوں کی زیادہ سے زیادہ ہدایت اور رہنمائی کرتا ہے، ان کے دلوں میں نور ایمان ڈال دیتا ہے اور شرح صدر اور روشن بینی سے انہیں بہرہ مند کرتا ہے۔ یہ تو ہوتا ہے ایمان اور اعتقاد کے لحاظ سے، لیکن عملی لحاظ سے بھی ان میں تقویٰ کی رُوح کو اس حد تک زندہ کرتا ہے کہ انہیں گناہوں سے نفرت ہونے

لگتی ہے اور اطاعت دینی سے جنون کی حد تک محبت کرنے لگتے ہیں۔

بعد کی آیت میں مذاق اڑانے والے اس بے ایمان ٹولے کو زبردست تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، تو کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے انتظار میں ہیں کہ ان پر ناگہاں آجائے (تو اس وقت وہ ایمان لائیں گے) حالانکہ اس کی نشانیاں تو آ ہی چکی ہیں۔ لیکن جس وقت قیامت ان کے سر پر آپینچے گی تو اس وقت ان کے لیے بیداری، توجہ اور ایمان مفید واقع نہیں ہوں گے (فہل ينظرون الا الساعة ان تأتيهم بغتة فقد جاء اشراطها فاني لهم اذا جاءتهم ذكراهم)۔

جی ہاں! جس وقت ان لوگوں کو ایمان لانا چاہیے اور وہ ایمان ان کے لیے مفید بھی ہو اس وقت تو ہسٹ دھری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور حق کے آگے تسلیم خم نہیں کرتے بلکہ تمسخر اڑاتے اور ٹھٹھا مذاق کرتے ہیں، لیکن جب ہولناک حوادث اور قیامت کا آغاز دنیا کو لرزہ برانداز کر دے گا تو اس قسم کے لوگ وحشت زدہ ہو کر خضوع و خشوع اور ایمان کا اظہار کریں گے، لیکن اس وقت انھیں اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

اس کی مثال یوں سمجھئے، جیسے ہم کسی کو کہیں کہ آیاتم اس انتظار میں ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اور تمہارا مریض موت کے دہانے تک پہنچ جائے، پھر ڈاکٹر اور دوا کا بندوبست کرو؟ لہذا بہتر یہی ہے کہ موقع ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے کوئی مفید اور موثر قدم اٹھاؤ۔

”اشراط“ ”شرط“ (بروزن ”شرف“) کی جمع ہے جس کا معنی علامت ہے بنا بریں ”اشراط الساعة“ سے مراد قیامت کے قریب ہونے کی علامتیں ہیں۔

یہاں پر قیامت کے قریب ہونے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں تفصیلی بحث کی ہے، حتیٰ کہ اس سلسلے میں بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔

لیکن بہت سے لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ زیر تفسیر آیت میں ”اشراط الساعة“ سے مراد خود پیغمبر اسلام کا قیام ہے اور اس کی گواہ خود آپ کی یہ حدیث ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

”بعثت انا والساعة كهاتين و ضم السبابة والوسطى“

”میری بعثت اور قیامت ان دو کے مانند ہیں اور پھر آپ نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر

اشارہ کیا ایک درمیانی انگلی اور دوسری انگشت شہادت“ لہ

بعض مفسرین نے ”شق القمر“ کے مسئلے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں رونما ہونے والے

بعض دوسرے واقعات کو بھی ”اشراط الساعة“ میں شمار کیا ہے۔

اس بارے میں بہت سی حدیثیں بھی وارد ہوئی ہیں، خصوصاً بہت سے گناہوں کا عوام الناس میں عام ہو جانا بھی

قیامت کے قریب ہونے کی علامات میں شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ شیخ مفید علیہ الرحمہ نے پیغمبر اسلام کی ایک حدیث "روضۃ
الواعظین" میں درج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من اشراط الساعة ان يرفع العلم، ويظهر الجهل، ويشرب الخمر و
يفسد الزنا"

"قیامت کی علامتوں میں سے ہے، علم کا اٹھایا جانا، جہالت کا آشکار ہو جانا، شراب کا
پیا جانا اور زنا کی کثرت۔" لہ

حقیقی کہ اہم اور موثر واقعات کو بھی "اشراط الساعة" میں شمار کیا گیا ہے جیسے امام مہدی (ارواحنا فداه) کا
قیام ہے۔

لیکن یہ بحث بھی قابل توجہ ہے کہ ہم کبھی تو "اشراط الساعة" کے بارے میں بطور مطلق بحث کرتے ہیں کہ قیامت کے
نزدیک ہونے کی کیا علامتیں ہیں اور کبھی صرف اور خاص طور پر آیت کے بارے میں۔

آیت کے بارے میں مطلب وہی ہے جو ہم بتا چکے ہیں، لیکن مطلق طور پر قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں کے بارے
میں بڑی حد تک بحث کی گئی ہے اور اس بارے میں بہت سی روایات مشہور اسلامی کتابوں میں درج ہیں اور ہم بھی نکات کی بحث میں اس طرف اشارہ کریں گے۔

کیا پیغمبر اسلام کی بعثت قیامت کے قریب ہونے کی علامت ہے؟

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کو کیونکر قرب قیامت کی علامت قرار دیا
گیا ہے، جب کہ چودہ سو سال پہلے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر اب تک قیامت کا کچھ پتہ نہیں؟
اس سوال کا جواب ایک نئے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ باقی ماندہ دُنیا کو اس کے گزشتہ
حصے کے تناظر میں دیکھنا چاہیے اور آئندہ کو گزشتہ سے تقابل کر کے دیکھا جانا چاہیے اور اس تقابل میں دُنیا کا جو حصہ باقی
رہ گیا ہے وہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک دن آنحضرت نے عصر کے بعد
اور غروب آفتاب سے کچھ پہلے اپنے اصحاب سے خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا:

"والذی نفس محمد بیدہ مثل ما مضی من الدنیا فیما بقی منها الا مثل
ما مضی من یومکم ہذا فیہا بقی منہ، وما بقی منہ الا الیسیر"

لہ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۳۰

۳۰ جو کچھ ہم بتا چکے ہیں اگر اس کو تہ نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا "فقد جاء اشراطها" کے جملے سے یہ مراد نہیں ہے کہ قیامت
کی تمام علامات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیں ظاہر ہو چکی ہیں، بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ ان میں سے بعض علامتیں ظاہر ہو چکی ہیں، جو
قیامت کے قریب ہونے کی خبر دیتی ہیں ہر چند کہ کچھ اور علامتیں ابھی بعد میں ظاہر ہوں گی۔

”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے، جو مدت دنیا کی گزر چکی ہے اس حصے کی نسبت جو کچھ باقی رہ گیا ہے اس مقدار کے مانند ہے جو تمہارے آج کے دن کا حصہ گزر چکا ہے اس حصے کی نسبت جو کچھ باقی رہ گیا ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ اس دن کا حصہ تھوڑی سی مقدار سے زیادہ باقی نہیں ہے۔“

اس سلسلے کی آخری آیت ایمان و کفر اور مومنین و کفار کے انجام کے متعلق تمام گفتگو کے نتیجے کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پس جان لو کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے (فاعلم انه لا اله الا الله)۔ یعنی توحید کی راہ پر قائم رہو کیونکہ شفا عطا کرنے کی دوا اور نجات کا بہترین وسیلہ ہی توحید ہے کہ جس کی علامات اس سے پہلے کی آیات میں بیان ہو چکی ہیں۔

بنابریں اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توحید سے بے خبر تھے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس راہ پر برقرار رہیں اور ثابت قدم۔ بالکل دیسے ہی جیسے سورہ حمد کی یہ آیت ہے ”اهدنا الصراط المستقیم“ مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم ہدایت پر نہیں، لہذا صراط مستقیم کی ہدایت فرما، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیں ہدایت کی راہ پر ثابت قدم رکھ۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ امر توحید میں زیادہ غور و فکر سے کام لیا جائے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات کی طرف ارتقار کی کوشش کی جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا امر ہے کہ جس میں جتنا زیادہ سوچ بچار اور غور و فکر سے کام لیا جائے اور خدا کی آیات کا جتنا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے اتنا ہی اعلیٰ سے اعلیٰ مراحل کی طرف ترقی ہوتی جاتی ہے اور گزشتہ آیات میں ایمان اور کفر کے متعلق جو کچھ بتایا جا چکا ہے اس کے بارے میں تحقیق و جستجو بھی ایمان و کفر کے اضافے کا بذات خود ایک عامل ہے۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد توحید کا عملی پہلو ہے۔ یعنی آپ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ پوری کائنات میں صرف خدا ہی کی ذات ہے جو پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہے، لہذا اس کی پناہ میں آجائے اور مشکل کا حل بھی اسی کے پاس ہے لہذا اسی سے حل مشکلات کی دعا کیجئے اور دشمن کی افرادی قوت سے ہرگز نہ گھبرائیے۔

ان تینوں تفسیروں کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور ممکن ہے کہ تینوں آیت کے مفہوم میں جمع ہوں۔ عقیدے پر مبنی اس مسئلے کے بیان کے بعد ایک بار پھر تقوٰا سے اور گناہوں سے پاک ہونے کی بات کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور اپنے لیے اور ایمان دار مردوں اور ایمان دار عورتوں کے گناہوں پر استغفار کرتے رہو (واستغفرو لذنبکم وللمؤمنین والمؤمنات)۔

ظاہری بات ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصمت کی بنا پر ہرگز کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے اور اس قسم کی تعبیر

یا تو ”خوب تر“ کو چھوڑ کر ”خوب“ کو اپنانے اور ”حسنات الابوار سیئات المقربین“ کی طرف اشارہ ہے، یا پھر مسلمانوں کے لیے تنبیہ اور نوبت عمل ہے (جب معصوم نبی کو استغفار کا حکم ہے، تم گناہگار تو بطریق اولیٰ استغفار کرنے کے لیے مامور ہیں)۔ ایک روایت میں ہے کہ ”حذیفہ یمانی“ کہتے ہیں ”میں ایک تند زبان شخص تھا اور اپنے گھر والوں سے سخت کلامی سے پیش آتا تھا، رسول اللہ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ زبان کی یہ تندی مجھے جہنم میں نہ لے جائے! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”فأنت انت من الاستغفار؟ انی لا استغفر الله فی الیوم مائة مرة۔“
 ”تم استغفار سے کیوں غافل ہو؟ سستی کہ خود میں بھی روزانہ سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔“ (اور بعض روایات میں ہے ستر مرتبہ)۔ لہ

اگر دوسرے لوگ اپنے گناہوں اور معاصی پر استغفار کرتے ہیں تو پیغمبر اکرمؐ جس لمحے یا وقت پر کہتے، یا ”خوب تر“ کے بجائے ”خوب“ کو انجام دیتے تھے تو استغفار کرتے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہاں پر خدا نے مومنین اور مومنات کے لیے شفاعت کی سفارش کی اور اپنے پیغمبر کو ان کیلئے استغفار کا حکم دیا ہے تاکہ اپنی رحمت ان کے شامل حال کرے۔ چنانچہ اس سے دنیا و آخرت میں مسئلہ ”شفاعت“ کی گہرائی اور مسئلہ ”توسل“ کی اہمیت بھی واضح اور آشکار ہو جاتی ہے۔

اس آیت کے ذیل میں علت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، خدا تمہارے چلنے پھرنے اور ٹھہرنے کی جگہ کو جانتا ہے (والله یعلم متقلبکم و مشاؤکم)۔

وہ تمہارے ظاہر و باطن، اندر ن و بیرون اور اشارے کنائے کو اچھی طرح جانتا ہے، حتیٰ کہ تمہارے افکار، نیتوں اور حرکات و سکنات سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔ اسی لیے تمہیں چاہیے کہ تم اس کی طرف توجہ کرو اور اس کی بارگاہ سے طلب مغفرت کرو۔

”منقلب“ کا معنی آمد و رفت کی جگہ اور ”مشاؤی“ کا معنی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ لہ

ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں کلمات کا مفہوم وسیع اور عام ہے، جس میں انسان کی تمام حرکات و سکنات آجاتی ہیں خواہ وہ دنیا میں ہوں یا آخرت میں، شکم مادر میں ہوں یا قبر کے پیٹ میں، اگرچہ بہت سے مفسرین نے ان کے محدود معانی بتائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے انسان کی دن کو حرکات اور رات کو سکون مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے دنیا

لہ جمع البیان جلد ۹ صفحہ ۱۱۱ (انہی آیات کے ذیل میں)۔

لہ بنا بریں ”منقلب“ اسم مفعول ہے جو یہاں پر اسم مکان کے منہ میں ہے، لیکن کچھ اور مفسرین اسے ”مصدر“ ”میشی“ سمجھتے ہیں، جس کا معنی ایک مال سے دوسرے مال کی طرف منتقل ہونا ہے۔ لیکن ”مشاؤی“ کے قرینے کے پیش نظر جو کہ مسلم طور پر اسم مکان ہے، پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

میں چلنے پھرنے کی اور آخرت میں انسان کے ٹھہرنے کی جگہ مراد ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے انسان کا بپوں کی پشت اور اڈوں کے رحم میں منتقل ہونا اور قبر میں ثبات و قرار مراد ہے اور بعض کہتے ہیں اس سے انسان کا سفر میں حرکت کرنا اور حضر میں آرام کرنا مراد ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں آیت کا مفہوم وسیع اور عام ہے جو مذکورہ تمام تفاسیر کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

”اشراط الساعۃ“ کیا ہیں؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ”اشراط“ شرط کی صحیح جس کا معنی ”علامت“ ہے اور ”اشراط الساعۃ“ قرب قیامت کی علامتوں کو کہتے ہیں، شیعوہ سنی کتابوں میں اس بارے میں بہت سی روایات درج ہیں جب کہ قرآن مجید میں صرف اسی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس بارے میں سب سے زیادہ مفصل اور جامع وہ حدیث ہے جو ابن عباس کے بقول حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد کی ہے۔ جس میں بہت سے مسائل ہمارے لیے درس آموز ہیں اور بہت سے نکات کی حامل ہے۔ اسی لیے ہم یہاں پر مکمل حدیث کو نقل کیے دیتے ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ ہم حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت کے ہمراہ تھے (حجۃ الوداع، اس حج کو کہتے ہیں جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری عمر میں ادا کیا تھا) پیغمبر خدا نے خانہ کعبہ کے دروازے کی زنجیر کو پکڑ کر ہماری طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا:

”آیا تمہیں ”اشراط الساعۃ“ سے آگاہ کروں؟“

حضرت سلمان نے جو اس وقت آنحضرت کے سب سے زیادہ نزدیک تھے، عرض کی: ضرور ارشاد فرمائیے یا رسول اللہ!

آپ نے ارشاد فرمایا: قیامت کی نشانیوں میں سے ہے نماز کو ضائع کر دینا، شہوتوں کی پیروی کرنا، خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہونا، دولت مندوں کی عزت کرنا، دین کو دنیا کے بدلے بیچ ڈالنا، ایسے موقع پر مومن کا دل یوں گھلتا رہے گا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے، کیونکہ وہ ان برائیوں کو دیکھے گا، لیکن ان کا ازالہ اور تبدیلی اس کے بس سے باہر ہوگی۔

سلمان نے عرض کی: یا رسول اللہ! ایسا بھی ہوگا؟

فرمایا: ہاں اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، سلمان! اس زمانے میں حکام ظالم، وزراء فاسق، پیشہ و ظالم اور امانت میں خیانت کرنے والے لوگوں پر حکومت کریں گے۔

سلمان: ”یا رسول اللہ! ایسا بھی ہوگا۔“

فرمایا: ”سلمان! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت اچھائیاں برائیاں اور برائیاں

اچھایاں سمجھی جائیں گی، امانت خاتونوں کے سپرد کی جائے گی، امین خائن بن جائیں گے، جھوٹوں کی تصدیق اور سچوں کی تکذیب کی جائے گی۔

سلمان: تو کیا ایسا بھی ہوگا؟ اے اللہ کے رسول!

فرمایا: ہاں! خدا کی قسم اے سلمان! اس وقت حکومت عورتوں کے ہاتھ میں ہوگی، غلاموں سے مشورہ کیا جائے گا، لڑکے منبروں پر بٹھائیں گے، جھوٹ دل لگی کے طور پر بولا جائے گا، زکوٰۃ کو تادان سمجھا جائے گا اور بیت المال کو غنیمت سمجھ کر لوٹا جائے گا۔

”لوگ اپنے والدین سے برائی اور دوستوں سے اچھائی کریں گے، آسمان پر دم دار ستارہ ظاہر ہوگا۔“
سلمان: ”یا رسول اللہ! کیا ایسا بھی ہوگا؟“

فرمایا: ہاں سلمان! اُس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت عورت اپنے شوہر کے ساتھ تجارت میں شریک ہوگی (اور دونوں کی سرگرمیاں گھر سے باہر کے ماحول سے متعلق ہوں گی اور دونوں کی توجہ دولت سیٹھنے پر مرکوز ہوگی) بارشیں کم ہوں گی، سخی لوگ بخیل ہو جائیں گے اور غریبوں کو حقیر سمجھا جائے گا، اس وقت بازار ایک دوسرے کے نزدیک ہو جائیں گے ایک (دکاندار) کہے گا، میں نے کچھ نہیں بیچا، دوسرا کہے گا مجھے منافع حاصل نہیں ہوا، غرض سب اپنے رب کی شکایت اور مذمت کرتے ہوں گے۔

سلمان! اللہ کے رسول! ایسا بھی ہوگا؟

فرمایا: ”ہاں سلمان! اُس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس وقت ایسی قومیں حکومت کریں گی کہ اگر کوئی شخص بات کرے گا تو وہ لوگ اسے مار ڈالیں گے اور اگر خاموشی اختیار کرے گا تو اس کا سب کچھ مباح سمجھ کر لوٹ لیا جائے گا، اس کی عزت و احترام کو پامال کر کے اس کا خون بہایا جائے گا، دلوں کو خوف و وحشت اور دشمنی سے بھر دیا جائے گا اس وقت سب لوگوں پر خوف و وحشت طاری ہوگی۔“

سلمان: ”یا رسول اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟“

فرمایا: ہاں سلمان! اِس کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اس وقت کچھ مشرق سے لے آئیں گے اور کچھ مغرب سے لے آئیں گے (کچھ قانون مشرق سے اور کچھ قانون مغرب سے لے آئیں گے) اور میری اُمت مختلف رنگ اختیار کرے گی۔ اس وقت کی امت کے کمزور اور پراسوس ہے نہ تو جھوٹوں پر رحم کریں گے نہ ہی بڑوں کا احترام کریں گے اور نہ ہی کسی گناہ کار کو بخشیں گے۔ ان کے جسم . . . نالوں جیسے ہوں گے لیکن دل شیاطین کے سے۔“

سلمان: ”یا رسول اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟“

فرمایا: ”ہاں! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اے سلمان! اس زمانے میں مرد، مردوں پر قناعت کریں گے اور عورتیں عورتوں پر اور لڑکوں پر اسی طرح رقابت کریں گے جس طرح لڑکیوں پر ان کے

خانہ ناول میں کی جاتی ہے، عورتیں خود کو مردوں کے مشابہ بنائیں گی اور مرد عورتوں کے اور عورتیں زین سواری کریں گے اور خود نمازی کریں گی، خدا کی ان پر لعنت ہو۔

سلمان! ”اللہ کے رسول! آیا ایسا بھی ہوگا؟“

فرمایا: ”ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اس زمانے میں مسجدوں کو یوں سبایا جائے گا جس طرح یہود و نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں کو سجاتے ہیں، قرآنوں کو مزین کریں گے (اس کے مضامین پر عمل نہیں کریں گے) مسجدوں کے مینار اونچے اونچے ہوں گے اور نمازیوں کی صفیں بڑی تعبد میں ہوں گی، لیکن ان کے دل ایک دوسرے کے دشمن اور زبانیں مختلف ہوں گی۔“

سلمان: ”یا رسول اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟“

فرمایا: ”ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس زمانے میں میری امت کے رطلے سونے کے ساتھ زینت کریں گے، حریر و دیبا پہنیں گے اور چھتے کی کھال سے اپنا لباس تیار کر کے پہنیں گے۔“

سلمان: ”یا رسول اللہ! آیا ایسا بھی ہوگا؟“

فرمایا: ”ہاں سلمان! اس کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس وقت زنا عام ہو جائے گا، کام نیت اور رشوت سے انجام پائیں گے، دین کو پامال کریں گے اور دنیا کو سر پر رکھیں گے۔“

سلمان! ”یا رسول اللہ! آیا یوں بھی ہوگا؟“

فرمایا: ”ہاں! سلمان! اس کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس وقت طلاق کی ہتھات ہو جائے گی خدا کی کسی حد کا اجر نہیں کیا جائے گا لیکن یہ بات خدا کو نقصان میں پہنچائے گی (بلکہ وہ لوگ خود نقصان اٹھائیں گے)۔“

سلمان: ”آیا ایسا بھی ہوگا یا رسول اللہ!“

فرمایا: ”ہاں سلمان! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم اس زمانہ میں عورتیں گانا گائیں گی، لہو و لعب اور گانے بجانے کے آلات کھلم کھلا ہوں گے اور میری امت کے شیران کے پیچھے پھریں گے۔“

سلمان: ”یا رسول اللہ! ایسا بھی ہوگا؟“

فرمایا: ”ہاں سلمان! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم، اس وقت میری امت کے مالدار لوگ تفریح کی غرض سے متوسط طبقہ تجارت کے قصد سے اور غریب لوگ ریاکاری کے لیے حج پر جائیں گے۔ اس وقت ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو غیر خدا کے لیے تھامیں گے اور اس کے ساتھ لہو و لعب کے آلات کا سا سلوک کریں گے اور ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو غیر خدا کے لیے علم دین حاصل کریں گے، زنا کی اولاد کثرت سے ہوگی، قرآن کو راگ کی طرز میں پڑھا جائے گا اور دنیا کے لیے ایک دوسرے پر سبقت سے جائیں گے۔“

سلمان: ایسا بھی ہوگا یا رسول اللہ!؟“

فرمایا: ”ہاں سلمان! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم یہ اس وقت ہوگا، جب حرمت کے پردے

چاک ہو جائیں گے، گناہ کثرت سے رونما ہوں گے، بدکار لوگ نیک لوگوں پر مسلط ہو جائیں گے، جھوٹ عام ہو جائے گا، ہٹ دھرمی زیادہ ہو جائے گی اور فقر و فاقہ کی کثرت ہو جائے گی۔ لوگ مختلف لباسوں کی وجہ سے ایک دوسرے پر فخر کریں گے، بارشیں بے موقع ہوں گی، جوا اور آلات موسیقی کو اچھا اور اسر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو برا سمجھیں گے۔

”حالات اس حد تک بگڑ جائیں گے کہ اس وقت مومن تمام لوگوں سے زیادہ ذلیل ہوگا، قرآن کے قاری اور عبادت گزار لوگ ایک دوسرے کی بدگوئی کریں گے اور انہیں ملکوت اعلیٰ میں بخش اور پلید لوگوں کے نام سے پکارا جائے گا“

سلمان: ”یا رسول اللہ! کیا ایسا بھی ہوگا؟“

فرمایا: ”ہاں سلمان! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم اس وقت مالدار لوگ غریبوں پر کوئی رحم نہیں کریں گے، سچی کہ کوئی ضرورت مند لوگوں میں کھڑا ہو کر اپنی حاجت کا اظہار کرے گا تو کوئی اسے کچھ نہیں دے گا“

سلمان: ایسا بھی ہوگا یا رسول اللہ!

فرمایا: ”ہاں سلمان! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس کی قسم، اس وقت ”رومیضہ“ بھی بات کرے گا۔“

سلمان: ”یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں، ”رومیضہ“ کیا ہے؟“

فرمایا: ”جس نے کبھی کوئی بات نہیں کی ہوگی وہ بھی مظلوم و محروم انسان کے حق میں بات کرے گا۔“ (وہ شخص بھی بولے گا جسے بولنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہوگا)۔

”تو اس وقت زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ زمین سے اس انداز میں چیخ بلند ہوگی کہ ہر گردہ یہ سمجھے گا کہ یہ آواز اسی کے علاقے سے اٹھ رہی ہے۔“

پھر ایک عرصے تک جب تک خدا چاہے گا لوگ اسی حال پر باقی رہیں گے، پھر اسی دوران میں پتھر زمین میں شکاف کریں گے اور زمین اپنے دل کے ٹھٹھے باہر نکال پھینکے گی، یعنی سونا اور چاندی۔“

پھر آپ نے ہاتھ سے ستون مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ”ان کے مانند“ اور اس روز سونا اور چاندی کسی کام کے نہیں رہیں گے (حکم الہی پہنچ جائے گا، یہ ہے معنی خدا کے اس فرمان کا ”فقد جاء اشراطها) ۱۰

- ۲۰۔ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نَزَّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مَّحْكَمَةٌ
وَذَكَرَ فِيهَا الْقِتَالَ لَسَرَّيْتِ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُنظُرُونَ
إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأُولَىٰ لَهُمْ
طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرَ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ
لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۗ
- ۲۱۔ قَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقْطِعُوا
أَرْحَامَكُمْ ۗ
- ۲۲۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعَمَّىٰ أَبْصَارَهُمْ ۗ
- ۲۳۔ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۗ

ترجمہ

- ۲۰۔ اور مومنین کہتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی؟
لیکن جب کوئی محکم سورت نازل ہوتی ہے کہ جس میں جہاد کا ذکر ہو تو تو بیمار دل منافقوں
کو دیکھے گا کہ تیری طرف اس طرح دیکھیں گے جس طرح کسی کو موت آنے لگے۔
پس موت اور تباہی ان کے لیے بہتر ہے۔
- ۲۱۔ لیکن اگر وہ اطاعت کریں اور سنجیدہ اور شائستہ بات کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے
پھر جب جہاد کا حتمی حکم آجائے تو اگر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں (اور صدق و صفا

- کاراستہ اختیار کریں، تو ان کے حق میں بہتر ہے۔
- ۲۲۔ لیکن اگر تم روگردانی اختیار کرو تو تم سے سوائے زمین میں فساد اور قطع رحمی کے اور کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔
- ۲۳۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے، ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔
- ۲۴۔ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا پھر کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

تفسیر

وہ جہاد کے نام سے بھی ڈرتے ہیں:

ان آیات میں جہاد کے متعلق مومنین اور منافقین کا رد عمل بیان کیا جا رہا ہے، گزشتہ آیات میں ان دونوں گروہوں کے متعلق گفتگو کے سلسلے میں یہ آیات تتمہ کی حیثیت رکھتی ہیں، چنانچہ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے، مومنین ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ کوئی سُورت کیوں نازل نہیں ہوتی (و یقول الذین امنوا لولا نزلت سورۃ)۔ ایسی سُورت کہ جس میں جہاد کا حکم ہو اور سنگدل، خونخوار اور بے منطق دشمن کے مقابلے میں ہمیں ہمارے فرائض سے آگاہ کرے۔ ایسی سُورت کہ جس کی آیات ہمارے دلوں کے لیے نور ہدایت ہوں اور ہماری رُوح کو اپنے فروغ سے روشن کریں۔

یہ تو ہے حقیقی مومنین کی کیفیت۔

لیکن منافقوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی محکم سُورت نازل ہوتی ہے جس میں جنگ اور جہاد کا ذکر ہو تو تو بیمار دل کر دیکھتا ہے اور جس کی آنکھوں کے ڈھیلے حرکت کرنے سے رُک جاتے (فاذا انزلت سورۃ محکمۃ و ذکر فیہا القتال رأیت الذین فی قلوبہم مرض ینظرون الیک نظرا المغشی علیہ

من الموت۔

جنگ کا نام سننے سے وحشت و اضطراب انہیں سر تا پا یوں گھیر لیتے ہیں جیسے قریب ہے کہ دل ان کے سینے سے باہر آجائیں ان کی عقلیں ماؤف ہو جائیں، آنکھیں پھٹا جائیں جس طرح موت کے قریب انسان کی آنکھیں بے حس و حرکت اور کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور یہ ٹرپوک اور زردل منافقین کی کیفیت کی ایک واضح اور مکمل تصویر ہے۔

آخر جہاد کے بارے میں مومنین اور منافقین کا مختلف رد عمل کیوں نہ ہو، جبکہ پہلا گروہ اپنے محکم ایمان کی وجہ سے ایک تو اپنے پروردگار کے لطف و کرم اور امداد کا امیدوار ہوتا ہے اور دوسرے اس کی راہ میں شہادت سے بھی نہیں گھبراتا۔

ان کے لیے میدان جہاد، محبوب سے اظہارِ عشق کا مقام، شرافت اور فضیلت کا میدان، استعداد اور صلاحیت کے پروان چڑھنے کی جگہ اور استقامت و فتح و کامرانی کا میدان ہوتا ہے۔ اس طرح کے میدان سے خوف کے کیا معنی۔

جبکہ منافقین کے لیے موت، تباہی اور بربادی کا مقام، شکست اور نیا دی لذتوں کو خیر آباد کہنے کی جگہ ظلمتوں اور تاریکیوں بھرا میدان اور ایسا میدان ہوتا ہے جس کا مستقبل وحشت ناک اور نامعلوم ہوتا ہے۔

بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق ”سورۃ محکمہ“ سے مراد وہ سورتیں ہیں جن میں جہاد کے مسائل بیان کیے گئے ہیں لیکن اس تفسیر کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ بلکہ اس کی بظاہر تفسیر یہ ہے کہ ”محکم“ یہاں پر مستحکم، پائدار، دو ٹوک اور ہر قسم کے ابہام سے خالی کے معنی میں ہے۔ جو بعض اوقات ”متشابہ“ کے مقابل میں ذکر ہوتا ہے، البتہ چونکہ آیات جہاد میں عام طور پر واضح اور دو ٹوک حکم ہوتا ہے لہذا اس مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، لیکن اس میں منحصر نہیں ہے۔

”الذین فی قلوبہم مرض“ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے، کی تعبیر قرآنی زبان میں عام طور پر ”منافقین“ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بعض مفسرین اس سے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد ”ضعیف الایمان“ لوگ ہیں تو ان کا نظریہ نہ تو قرآن کی دوسری آیات سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی زیر تفسیر آیت سے قبل و بعد کی آیات سے جو سب کی سب منافقین کے متعلق گفتگو کر رہی ہیں۔

بہر حال آیت کے آخر میں مختصراً فرمایا گیا ہے: ان پرافسوس ہے کہ موت اور تباہی ان کے لیے ان کی زندگی سے بہتر ہے۔ (فاو لی لہم)۔

”اولی لہم“ کا جملہ عربی ادب میں عام طور پر کسی کو دھمکی دینے کسی پر لعنت بھیجنے، کسی سے اظہارِ نفرت کرنے اور کسی کے لیے بدبختی اور پریشانی کی آرزو کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی ”الموت اولی لہم“ (موت ان کے لیے بہتر ہے) کے معنی سے تفسیر کی ہے۔

لے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ جملے کا معنی یوں ہوں گا: ”سیلید مکروہ“ اور اسے ”ویل لہم“ کے ہم معنی سمجھا ہے۔

اور اگر ان دونوں معانی کو آپس میں ملا دیا جائے جس طرح ہم نے آیت کی تفسیر میں کیا ہے تو کوئی مانع موجود نہیں ہے۔ بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: لیکن اگر وہ اطاعت کریں اور فرمان جہاد سے منہ نہ موڑیں، نیک، سنجیدہ اور اچھی باتیں کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے (طاعة وقبول معروف)۔ لہ

ممکن ہے "قول معروف" کی تعبیر منافقین کی جہاد کے بارے میں ان ناموزوں اور غیر مناسب باتوں کے مقابلے میں ہو جو وہ جہاد کی آیات نازل ہونے کے بعد کیا کرتے تھے، کبھی تو کہتے تھے کہ:

"لا تنفروا في الحر"

"اس قدر شدید گرمی میں میدان جہاد کی طرف مت نکلو" (توبہ ۸۱)

اور کبھی کہتے:

"واذ يقول المنافقون والذين في قلوبهم مرض ما وعدنا الله و

رسوله الا غرورا"

"خدا اور اس کے رسول نے ہمیں کامیابی کے جھوٹے وعدے کے سوا اور کچھ نہیں دیا"

(احزاب ۱۲)

کبھی مؤمنین کو ناامید کرنے اور انہیں میدان جنگ سے روکنے کے لیے کہتے:

"هلم الينا"

"ہماری طرف آؤ اور خوش رہو" (احزاب ۱۸)

وہ لوگوں کو نہ صرف جہاد کی ترغیب نہیں دیتے تھے بلکہ ان کے حوصلے پست کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا کرتے۔

مزید فرمایا گیا ہے: پھر جب لڑائی ٹھن جائے اور حکم جہاد قطعی ہو جائے تو اگر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں اور صدق و صفا کی راہ اختیار کریں تو ان کے حق میں بہتر ہے (فاذا عزم الامر فلو صدقوا الله لكان خيرا لهم)۔ یہ بات دنیا میں بھی ان کی سرفرازی کا باعث ہے اور آخرت میں بھی وہ ثواب عظیم اور بہت بڑی کامیابی حاصل کریں گے۔

"عزم الامر" دراصل کسی کام کے پختہ اور محکم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن قبل و بعد کی آیات کے قرینے کی وجہ سے اس سے مراد "جہاد" ہے۔

لہ "طاعة" بتا ہے اور اس کی خبر معروف ہے جو تقدیری طور پر یوں ہوگی "طاعة وقبول معروف" امثل لهم، بعض اسے بتا سمعروف کی خبر سمجھتے ہیں جو تقدیری طور پر یوں ہوں گی "امرنا طاعة" لیکن بلا معنی نیا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بعد کی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: لیکن اگر مخالفت کا راستہ اختیار کرو اور فرزان الہی اور اس کی کتاب پر عمل کرنے سے روگردانی کرو تو تم سے سوائے روئے زمین پر فساد برپا کرنے اور کیا توقع رکھی جاسکتی ہے (فہل عسیتم ان تولیتہم ان تفسدوا فی الارض و تقطعوا ارحامکم)۔

کیونکہ اگر تم قرآن اور توحید سے روگردان ہو جاؤ تو یقیناً جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ گے اور جاہلیت کا طریقہ کار تو بس "فساد فی الارض" قتل و غارت اور خون ریزی اور قریبی عزیزوں اور بیٹیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب "تولیتہم" کو "تولی" یعنی روگردانی کے مادہ سے لیا جائے، لیکن بہت سے مفسرین نے اسے "ولایت" (حکومت) کے مادہ سے لیا ہے جس کا معنی یہ ہوگا کہ اگر حکومت کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ آجائے تو تم سے سب سے زیادہ خون ریزی اور قطع رحمی کے علاوہ اور کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔

گویا کچھ منافقین نے میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کر لینے کے یہ پہانہ گھڑ لیا تھا کہ ہم میدان جنگ میں کیوں قدم رکھیں اور کیوں وہاں پر خون ریزی کا ارتکاب کریں اور اپنے قریبیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر "فساد فی الارض" بنیں۔

قرآن مجید ان کے اس بہانے کے جواب میں کہتا ہے: تو کیا جب حکومت تمہارے پاس تھی، اس وقت تم "فساد فی الارض" قتل و غارت اور خون ریزی اور قطع رحمی کے علاوہ اور کیا کیا کرتے تھے؟ یہ سب بہانے ہیں۔ اسلام میں جنگ کا مقصد فتنہ کی آگ کو بجھانا ہے نہ کہ فتنہ و فساد کو ہوا دینا اور ظلم و ستم کی بساط کو الٹنا ہے نہ کہ قطع رحمی۔ اہل بیت اطہار علیہم السلام سے منقول بعض روایات میں ہے کہ "یہ آیت بنی امیہ کے بارے میں ہے کہ جب انہوں نے زمام حکومت سنبھالی تو نہ تو کسی چھوٹے پر رحم کیا اور نہ ہی کسی بڑے پر رشتی کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی موت کے گھاٹ اتارنے سے نہیں چڑھے"۔

ظاہر ہے کہ ابوسفیان سے لے کر اس کے پوتوں پڑپوتوں تک تمام بنی امیہ اس آیت کا روشن مصداق تھے اور روایت کی مراد بھی یہی ہے، لیکن آیت کا مفہوم عام اور وسیع ہے جس میں تمام ظالم اور فسادناہک منافقین شامل ہیں۔ بعد کی آیت اس منافق اور پہانہ جو مفسد گروہ کے حتمی انجام کو ان لفظوں میں بیان کرتی ہے: "یہ وہی لوگ ہیں جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے دور رکھا، ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ نہ تو وہ کسی

۱۔ اگرچہ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بہت کم بحث کی ہے، لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ "ان تولیتہم" کا جملہ جو "علی" کے اسم اور خبر کے درمیان واقع ہوا ہے جملہ تشریحی ہے اور اس کی جواز "فہل عسیتم ان تفسدوا فی الارض" کا مجموعی جملہ ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے "ان تولیتہم عن کتاب اللہ فہل یترب منکم الا الفساد فی الارض"۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ صفحہ ۱۰۰۔

حقیقت کو سن سکتے ہیں اور نہ ہی اسے دیکھ سکتے ہیں (اولئذ الذین لعنہم اللہ فاصمہم واعمی البصارہم)۔ وہ اسلامی جہاد کو، جو حق و عدالت پر مبنی ہوتا ہے قطع رحمی اور فساد فی الارض سے تعبیر کرتے ہیں لیکن دور جاہلیت میں انہوں نے خود جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے، اپنی حکومت کے دوران بے گناہوں کا جو خون بہایا ہے اور محصوم نو مولود بچوں کو اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کیا ہے، کیا وہ سب حق بھی تھا اور عدالت پر مبنی بھی؟ خدا کی لعنت ہو ان پر جن کے پاس نہ تو حق سننے کے لیے کان ہیں اور نہ ہی حقیقت کو دیکھنے کے لیے آنکھیں۔

حضرت امام علی بن حسینؑ سے روایت ہے کہ آپ نے اپنے فرزند امام محمد باقر علیہ السلام سے فرمایا:

«ایاک ومصاحبة القاطع لرحمہ، فانی وجدته ملعوناً فی کتاب اللہ عزوجل فی ثلاث مواضع، قال اللہ عزوجل «فہل عسیتم...» میرے بیٹے! ان لوگوں کی دوستی سے پرہیز کرو جو قطع رحمی کرتے ہیں، کیونکہ میں نے انھیں قرآن میں تین مقام پر ملعون پایا ہے اور پھر آپ نے آیت «فہل عسیتم...» کی تلاوت فرمائی:»

”رحم“ دراصل شکم مادر میں جنین کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں، بعد ازاں اس تعبیر کا تمام رشتہ داروں پر اطلاق ہونے لگا، اس لیے کہ ان سب کا ایک ہی ”رحم“ سے تعلق ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

«ثلاثة لا یدخلون الجنة مدمن خمر و مدمن سحر و قاطع رحم»

تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جو بہشت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے، شرابی، جادوگر اور قطع رحمی کرنے والے۔

ظاہری بات ہے کہ ایسے لوگوں پر خدا کی لعنت اور رحمت خدا سے دوری اسی طرح ان سے حقائق کے ادراک کی قوت کا سلب ہو جانا، ہرگز جبر پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ یہ خود ان کے اپنے اعمال کی سزا اور ان کے کردار و گفتار کا رد عمل ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں اس بد بخت گروہ کے انحراف اور گمراہی کے سبب کو یوں بیان فرمایا گیا ہے: تو کیا یہ لوگ قرآنی آیات میں غور نہیں کرتے (تاکہ حقائق ادراک کر کے اپنے فرائض کو انجام دیں) یا پھر کیا ان کے دلوں پر تانے پڑے ہوئے ہیں (افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقلعنا)۔

۱۔ اصول کافی طبع باب من تکرمہ جالستہ حدیث، لیکن دوسری دو آیتیں جو حدیث کے ضمن میں بیان ہوئی ہیں ایک تو سورہ رعد کی ۲۵ ویں آیت ہے اور دوسری سورہ بقرہ کی ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳

جی ہاں! ان کی مصیبت کا سبب ان دو چیزوں میں سے ایک ہے یا تو وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے جو قرآن ہدایت الہی کا حامل اور شفا عطا کرنے کا مکمل نسخہ ہے یا اگر غور تو کرتے ہیں، لیکن خواہشات نفسانی کی اتباع اور پہلے سے انجام دیئے ہوئے کروتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر ایسے قفل پڑ چکے ہیں کہ کوئی بھی حقیقت ان کے دلوں تک نہیں پہنچ پاتی۔

دوسرے لفظوں میں اگر کوئی شخص تاریکیوں میں اپنا راستہ کھو بیٹھے اور اس کے ہاتھ میں کوئی چراغ بھی نہ ہو یا اگر چراغ تو ہو لیکن اس کی آنکھیں ناہینا ہوں تو وہ راستے سے بھٹک جائے گا، لیکن اگر ہاتھ میں چراغ بھی ہو اور آنکھیں بھی صحیح و سالم ہوں تو راستہ واضح ہوتا ہے۔

”اقفال“ قفل کی جمع ہے، جو اصل میں ”قفل“ (دالیں لوٹ جانا) کے مادہ سے ہے یا ”قفیل“ (بمعنی خشک چیز) کے مادہ سے، چونکہ جس وقت دروازے کو بند کر کے اسے تالا لگا دیا جاتا ہے تو جو شخص بھی آتا ہے وہاں سے دالیں پلٹ جاتا ہے اور خشک اور ٹھوس چیز کے مانند کوئی چیز بھی اس میں داخل نہیں ہو سکتی لہذا یہ کلمہ اس مخصوص اوزار پر استعمال ہونے لگا۔

چند نکات

۱۔ قرآن فکرو عمل کی کتاب ہے؛ قرآن کی مختلف آیات اس حقیقت کو واضح گفان الفاظ میں بیان کر رہی ہیں کہ یہ عظیم آسمانی کتاب صرف تلاوت کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اس کا نہتہائے مقصود ”ذکر“ (یاد دہانی) ”تدبر“ (تأمل پر غور و خوض) ”انذار“ (لوگوں کو ظلمات سے نکال کر نور تک پہنچانا) اور ”شفا، رحمت اور ہدایت“ ہے۔

”وہذا ذکر مبارک انزلنا“

”یہ بابرکت یاد دہانی ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ (انبیاء/۵۰)

”کتاب انزلنا الیک مبارک لیدتبروا آیاتہ“

”یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے تاکہ تو اس کی آیات میں غور کرے“

(ص ۲۹۱)

سورہ النعام کی ۱۹ ویں آیت میں ہے:

”واوحی الی ہذا القرآن لاندركم به ومن بلغ“

”یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا، تاکہ اس کے ذریعے سے تمہیں اور ان لوگوں کو ڈراؤں جن تک پہنچنا پہنچے۔“

سورہ ابراہیم کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

”کتاب انزلنا الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور“

یہ ایک کتاب ہے، جسے ہم نے تجھ پر نازل کیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تو لوگوں کو تاریکیوں

سے نکال کر فوراً نک پھینچائے۔

سورہ بنی اسرائیل کی ۸۲ ویں آیت میں ہے:

”وَنَزَّلْنَا مِنَ الْقُرْآنِ مَاهُ شِفَاءً وَرَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ“

”ہم قرآن کی ایسی آیتیں بھی نازل کرتے ہیں جو مؤمنین کے لیے شفا اور رحمت کا سبب ہیں۔“

اس طرح قرآن مجید کو مسلمانوں کی زندگی کے لیے راہنما کی حیثیت سے اختیار کیا جانا چاہیے اور اسے اپنے لیے اسوہ اور نمونہ عمل قرار دینا چاہیے، اس کے احکام پر پورے طور پر عمل کرنا چاہیے اور اس سے سرفراخ و منحرف نہیں کرنا چاہیے اور زندگی کے تمام خطوط کو اس سے ہم آہنگ کرنا چاہیے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا سلوک اس سے نہایت ہی نارسا ہے اور اسے صرف بے معنی ورد و وظیفہ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ صرف سرسری تلاوت پر اکتفا کیا جاتا ہے زیادہ سے زیادہ تجویز خوش الحانی اور اچھی آواز سے پڑھنے کو اہمیت دیتے ہیں، مسلمانوں کی بہت بڑی بدبختی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کو اپنی زندگی کے پروگراموں سے نکال کر بس اس کے الفاظ پر گزارہ کر رکھا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان زیر تفسیر آیات میں بڑی صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ دل کے مریض ان منافق لوگوں نے قرآن میں تدبیر نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں یہ سیاہ اور تاریک دن دیکھنے نصیب ہوئے۔

”تدبیر“ ”دبیر“ (بروزن ”اب“) کے ماننے ہیں جس کا معنی ہے، کسی چیز کے نتائج اور انجام پر غور کرنا۔ یہ ”تفکر“ کے برعکس ہے، جس کا زیادہ تر اطلاق کسی چیز کے اسباب اور وجوہات پر غور کرنے پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ان دونوں کلموں کا استعمال نہایت ہی معنی خیز ہے۔

نیز اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قرآن مجید سے استفادہ کے لیے ایک قسم کی خود سازی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن مجید خود بھی اس قسم کی خود سازی کے لیے معاون ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اگر دلوں پر ہوا دھوس نہ بھر اور غرور، ہٹ دھرمی اور تعصب کے تالے لگے ہوئے ہوں تو یہ رکاوٹیں نوزح کو ان میں داخل ہونے سے روک تھام ہیں اور زیر تفسیر آیات میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کیا ہی زیبا فرمان ہے امیر المؤمنین علی علیہ السلام کا جو ایک خطبے کے ضمن میں تقین کے بارے میں ہے:

”اما اللیل فصافنون اقدامہم، تالین لاجزاء القرآن، یرتلونہا ترتیلًا

یحزنون بہ النفسہم، ویستثیرون بہ دواءہا، فاذا مروا بآیة

فیہا تشویق رکنوا الیہا طمعا، وتطلعت نفوسہم الیہا شوقًا، وظنوا انہا

نضب اعینہم، واذا مروا بآیة فیہا تخویف اصغوا الیہا مسامع قلوبہم؛

وظنوا ان زفر جہنم وشہیقہا فی اصول اذانہم؛

وہ رات کے وقت قیام کرتے ہیں، قرآن کی ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سمجھ کر تلاوت کرتے ہیں۔

اپنے آپ کو اس کے ذریعے پرستوز کرتے ہیں، اپنے درد کی دوا اس میں تلاش کرتے ہیں، جب کسی ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں شوق دلایا گیا ہے تو وہ بڑے اشتیاق کے ساتھ اس کی طرف مائل ہوتے ہیں، دل کی آنکھیں بڑے شوق کے ساتھ اور خوب عذر سے اسے دیکھتی ہیں اور ہمیشہ اسے اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں اور اگر کسی آیت پر پہنچتے ہیں جس میں ڈرایا گیا ہے تو دل کے کان کھول کر اسے سنتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جلا ڈالنے والی دوزخ کی آگ کی چیخ و پکار اور اس کے شعلوں کی لپیٹوں کی آوازاں کے دل کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ لہ

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام " امر علی قلوب اقطالہا کے جملہ کی تفسیر میں یوں فرماتے ہیں:

" ان لك قلبًا ومسامع وان الله اذا اراد ان يهدى عبداً ففتح مسامع قلبه، واذا اراد به غير ذلك ختم مسامع قلبه، فلا يصلح ابداً وهو قول الله عز وجل: امر علی قلوب اقطالہا۔"

تمہارے لیے دل بھی ہے اور کان بھی (جن میں داخل ہونے کے رستے ہیں) اور جب خدا کسی بندے کو (اس کے تقوے کی وجہ سے) ہدایت کرنا چاہے تو اس کے دل کے کانوں کو کھول دیتا ہے اور جب اس کے علاوہ اور برعکس چاہتا ہے تو اس کے دل کے کانوں پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی اور یہی ہے معنی خدا کے اس قول " امر علی قلوب اقطالہا" کا۔

- ۲۵۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَرْتُمْ عَلٰى اَدْبَارِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى
الشَّيْطٰنِ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمَلٰى لَهُمْ ۝
- ۲۶۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِّلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيعُكُمْ فِىْ بَعْضِ
الْاَمْرِ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَسْرَارَهُمْ ۝
- ۲۷۔ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّيْتَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهُهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۝
- ۲۸۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اتَّبَعُوْا مَا اسَّخَطَ اللّٰهُ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ
اَعْمَالَهُمْ ۝

ترجمہ

- ۲۵۔ جو لوگ حق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی اُلٹے پاؤں پھر گئے ہیں شیطان نے ان کے بُرے اعمال کو ان کی نگاہوں میں بنا سجا کر پیش کیا ہے اور انہیں لمبی آرزوؤں پر فریفتہ کیا ہے۔
- ۲۶۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ (منافقین) ان لوگوں سے کہتے ہیں جو (پیغمبرؐ) پر جو نازل وحی کو ناپسند کرتے ہیں کہا کہ بعض کاموں میں ہم تمہاری پیروی کریں گے، جب کہ خدا ان کے رازوں سے آگاہ ہے،
- ۲۷۔ اس وقت ان کا کیا حال ہو گا جب (موت کے) فرشتے ان کے چہروں اور ان کی پشت پر مارتے ہوں گے (اور ان کی رُوح قبض کریں گے)۔
- ۲۸۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ جس چیز سے خدا ناخوش ہے، اس کی تو یہ لوگ پیروی

کرتے ہیں اور جس میں خدا کی خوشی ہے اس سے بیزاریں۔ لہذا خدا نے ان کے سب اعمال اکارت کر دیئے۔

تفسیر ولا قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے؟

یہ آیات بھی منافقین کے بارے میں ہیں اور ان کے مختلف اعتراضات بیان کر رہی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: بیشک جو لوگ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی اُلٹے پاؤں پھر گئے ہیں، شیطان نے ان کے بُرے اعمال کو ان کی نگاہوں میں بنا سجا کر پیش کیا ہے اور انہیں لمبی آرزوؤں پر فریفتہ کر دیا ہے (ان الذین ارتدوا علیٰ اذبارہم من بعد ما تبیین لهم الهدی الشیطان سؤل لهم واملی لهم)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیت ان بعض اہل کتاب کا فزوں کے متعلق گفتگو کر رہی ہے جو پیغمبر اسلام کی بعثت سے پہلے اپنی آسمانی کتابوں سے آنحضرتؐ کی نشانیاں بیان کیا کرتے تھے اور آپؐ کے ظہور کے شدید منتظر تھے لیکن جب آپؐ تشریف لے آئے اور وہ نشانیاں بھی ظاہر ہو گئیں تو اُلٹے پاؤں پھر گئے اور خواہشات نفسانی اور مادی فوائد ان کے ایمان کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔

لیکن گذشتہ اور آئندہ آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی منافقین کی بات کر رہی ہے، جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نزدیک سے دیکھا آپؐ کی حقانیت کے دلائل کا بخوبی مشاہدہ کیا اور سنا، لیکن نفسانی خواہشات اور شیطانی پھندوں میں آکر پیٹھ پھیر دی۔

”سؤل“ ”سؤل“ (بروزن ”قفل“) کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ایسی حاجت ہے جس کے پورا ہونے کے لیے نفس انسانی حریص ہوتا ہے۔ ”تسویل“ کا معنی ان امور کی بابت رغبت اور شوق دلانا ہے جن کی انسان کو حرص ہوتی ہے۔ اس امر کی شیطان کی طرف نسبت ان وسوسوں کی وجہ سے ہے جو وہ انسان کے دل میں ڈالتا ہے اور اس کی ہدایت کے آگے رکاوٹ بنتا ہے۔

”املی لهم“ ”املأ“ سے ہے جس کا معنی لمبی چوڑی اور دُور دراز کی امیدیں اور آرزوئیں باندھنا ہے جو انسان

لہ لہذا بعض مفسرین نے اس کی ”امید اور آرزو“ کے معنی میں تفسیر کی ہے جیسا کہ سورہ طہ کی ۳۶ ویں آیت میں ہے۔ ”قداوتیت

سؤلک یا مویلی“

کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور حق سے باز رکھتی ہیں۔

بعد کی آیت ان شیطانی تسویلات اور سجاوٹوں کی اس طرح تشریح کرتی ہے: یہ اس لیے کہ وہ ان لوگوں سے کہتے ہیں جو پیغمبر اسلام پر نزول وحی کو ناپسند کرتے ہیں، ہم بعض کاموں میں تمہاری بات مانیں گے (ذالک بانہم قالوا للذین کرہوا ما نزل اللہ سنطیعکم فی بعض الامر)۔

منافقین کا کام یہی ہوتا ہے کہ وہ غلط کار اور مخالف لوگوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور اگر تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ان میں مشترک قدریں نہ پائی جاتی ہوں تو جس حد تک بھی ان کی قدریں آپس میں مشترک ہوتی ہیں ان سے تعاون بلکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

منافقین مدینہ بھی نبی نصیر اور نبی قرظیہ کے یہودیوں کے پاس آئے جو آنحضرت کی بعثت سے قبل اسلام کے مبلغ تھے۔ لیکن جب آنحضرت کی بعثت ہو گئی تو حسد، تکبر اور مفادات خطرے میں پڑ جانے کی وجہ سے ظہور اسلام کو ناپسند کرنے لگے اور چونکہ پیغمبر اسلام کی مخالفت اور آپ کے خلاف سازشیں منافقین اور یہود کے درمیان قدر مشترک تھیں لہذا ان سے باہمی تعاون کا وعدہ کر لیا۔

”فی بعض الامر“ کی تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم صرف اس حد تک تمہارے ساتھ تعاون کریں گے۔ لیکن تم چونکہ بت پرستی کے مخالف اور روز قیامت کے معتقد ہو لہذا ہم ان امور میں تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔

یہ بات سورہ شکر کی آیت سے ملتی جلتی ہے جس میں کہا گیا ہے:

”الم ترالی الذین نافقوا یقولون لاخوانہم الذین کفرو امن اهل الكتاب لہن اخرجتم لنتخرجن معکم ولا نطیع فیکم احدًا ابداً وان قوتلتم لنتمصرنکم“

”کیا تم نے منافقین کو نہیں دیکھا جو اپنے اہل کتاب کا فریبائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم ان شہروں سے کوچ کرو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ آئیں گے اور تمہاری مخالفت میں کسی بھی شخص کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر وہ تمہارے ساتھ لڑیں گے تو ہم تمہاری مدد کریں گے“

آیت کے آخر میں انہیں مختصر سی عبارت کے ساتھ تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا ان کی مخفی باتوں اور رازوں سے آگاہ ہے (واللہ یعلم اسرارہم)۔

ان کے باطنی کفر اور نفاق سے بھی آگاہ ہے اور یہودیوں کے تعاون سے یہ جو سازشیں تیار کرتے ہیں ان سے بھی آگاہ ہے اور وقت آنے پر انہیں سزا دے گا۔

لہذا اس آیت کی تفسیر میں کئی اور احتمالات کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو گذشتہ اور آئندہ آیات سے ہم آہنگ نہیں ہیں لہذا انہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

نیز یہ بھی کہ یہودی مخفی دشمنی و عناد اور حسد سے بھی آگاہ ہے، وہ اپنی کتاب کی گواہی کے پیش نظر پیغمبر اسلام کی نشانیوں سے اس قدر آگاہ تھے کہ انہیں ویسے پہچانتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے تھے اور یہ نشانیوں کے ظہور سے پہلے لوگوں کو کھلے بندوں بتاتے تھے۔ لیکن آپ کے ظہور کے بعد انہوں نے ان سب کو چھپا دیا ہے، خدا اس مخفی کام سے آگاہ ہے۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ "کہرہو ما نزل اللہ" سے مراد "بنی امیہ" ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کے بارے میں فرمان الہی کے نزول کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ ظاہری بات ہے کہ یہ تطابق اور بیان مصداق ہے کہ آیت کا مفہوم اسی میں منحصر ہے۔

بعد کی آیت اس تہدید کی وضاحت ہے جس میں کہا گیا ہے: اس وقت ان کا کیا حال ہوگا جب موت کے فرشتے ان کے چہروں اور پشت پر ماریں گے اور ان کی رُوح قبض کریں گے (فکیف اذا توفتهم الملائكة يضربون وجوههم وادبارهم)۔

جی ہاں یہ فرشتے مامور ہیں کہ موت کے آغاز ہی میں انہیں سزا دینا شروع کر دیں تاکہ وہ کفر و نفاق اور ہٹ دھرمی و عناد کا مزہ چکھیں، ان کے چہروں پر اس لیے ماریں گے کہ انہوں نے دشمنانِ خدا کی طرف منہ کیا ہوگا اور پشت پر اس لیے کہ خدا کی آیات اور پیغمبر کی طرف پشت کی ہوگی۔

یہ بات سورۃ الفال کی ۵۰ ویں آیت سے ملتی جلتی ہے جو کفار و منافقین کے بارے میں ہے، اسی میں ہے۔

"ولسوتراہی اذیتوقی الذین کفروا الملائکة یضربون وجوهہم وادبارہم وذوقوا عذاب الحریق"۔

"اور اگر تو کافروں کو اس وقت دیکھے کہ جب موت کے فرشتے ان کی رُوح قبض کرتے ہیں اور ان کے چہروں اور پشت پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلا ڈالنے والے عذاب کا مزہ چکھو"۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں بھی بوقت وفات ان پر عذاب الہی کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ عذاب اور سزا اس لیے ہے کہ جس چیز سے خدا ناخوش ہے اس کی تو یہ لوگ پیروی کرتے ہیں اور جس میں خدا کی خوشی ہے اس سے بیزاریں، لہذا خدا نے ان کے سب اعمال کو اکارت کر دیا ہے (ذالک بانہما اتبعوا ما اسخط اللہ وکروا رضوانہ فأحبط اعمالہم)۔

کیونکہ تمام اعمال کی قبولیت اور ہر قسم کی سعی و کوشش منظور ہونے کی شرط اولین خدا کی رضا ہے، بنا بریں فطری بات ہے کہ جو لوگ خدا کو ناراض کرنے پر تلے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی رضا مندی کی مخالفت کرتے ہیں ان کے

اعمال اکارت جائیں گے اور وہ گناہوں کا بوجھ کا ندھوں پر اٹھائے اس عالم سے اس عالم کو سدھاریں گے۔ ان لوگوں کا حال مومنین کے حالات کے بالکل برعکس ہے کیونکہ موت کے فرشتے بوقت وفات ان کے استقبال کو آتے ہیں اور خندہ پیشانی کے ساتھ انہیں کہتے ہیں: تم پر سلام ہو، اب تم اپنے انجام دیئے ہوئے اعمال کی وجہ سے بہشت میں چلے جاؤ۔ قرآن کے الفاظ میں:

”الذین تتوفاهم الملائکة طیبین یقولون سلام علیکم ادخلوا الجنة

بماکنتم تعملون“ (نحل/۲۳)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خدا کی ناراضی کے بارے میں جملہ فعلیہ ”ما اسخط الله“ آیا ہے اور اس کی رضامندی کے بارے میں جملہ اسمیہ ”رضوانہ“ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ تعبیر کے اس فرق میں عجیب قسم کا لطف ہے اور وہ یہ کہ خدا کی ناراضی کبھی کبھی ہوتی ہے اور اس کی رضا و رحمت دائمی اور ہمیشہ ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ خدا کے بارے میں ناراضی، غضب اور غصے کا ذکر نفسانی تاثرات کے معنی میں نہیں، جیسا کہ اس کی رضامندی روحانی خوشی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

”غضب الله عقابہ ورضاہ ثوابہ“

”خدا کا غضب اس کا عذاب ہے اور اس کی رضا اس کا ثواب ہے“ لہ

۲۹۔ اَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ اَنْ لَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ اَضْغَانَهُمْ ۝

۳۰۔ وَلَوْ نَشَاءُ لَارِيُنْكُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمِهِمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۝

۳۱۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجْهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِيْنَ وَلَا نَبْلُوَنَّ اَخْبَارَكُمْ ۝

ترجمہ

۲۹۔ کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، ان کا یہ خیال ہے کہ خدا ان کے کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا؟

۳۰۔ اگر ہم چاہیں تو انہیں تجھ کو دکھادیں تاکہ تو انہیں ان کے چہرے مہرے سے پہچان لے اگرچہ تو انہیں ان کے انداز گفتگو سے پہچان سکتا ہے اور خدا تمہارے اعمال سے واقف ہے۔

۳۱۔ اور ہم تم لوگوں کو ضرور آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے تم لوگوں میں صحیح معنوں میں مجاہد اور صابر کون ہیں؟ اور ہم تمہاری خبروں کو بھی آزمائیں گے۔

تفسیر

منافقین اندازِ گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں :

ان آیات میں بھی ایک اور بحث کے حوالے سے منافقین کی صفات اور علامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور اس بات پر خاص تاکید کی گئی ہے کہ یہ لوگ یہ تصور نہ کریں کہ ہمیشہ اپنے نفاق کو رسول خدا اور مومنین سے چھپائے رکھیں گے اور اپنے آپ کو بہت بڑائی رسوائی سے بچاتے رہیں گے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے انہیں یہ خیال ہے کہ خدا ان کے شدید کیوں کو ظاہر نہیں کرے گا (ام حسب الذین فی قلوبہم مرض ان لن یخرج اللہ اضغانہم)۔ یہ "اضغان" "ضغن" (بروزن "حرص" اور بروزن "عقد") سخت اور شدید کینے کے معنی میں ہے۔

ان کے دل میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے بارے میں زبردست کینہ تھا اور ہر وقت اس بات کی انتظار میں تھے کہ کوئی موقع ملے اور ان پر کاری ضرور لگائیں، قرآن پاک انہیں متنبہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ یہ تصور نہ کریں کہ وہ ہمیشہ اپنے حقیقی چہرے کو چھپائے رکھیں گے۔

لہذا بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: اگر ہم چاہیں تو انہیں تجھ کو دکھا بھی دیں تاکہ تو ان کو ان کے چہرے مہرے سے پہچان لے (ولو نشاء لآرینا کھم فلتعرفنہم بسیمامہم)۔

ہم اُنکے چہروں پر ایسا نشان لگائیں گے جسے دیکھ کر آپ ان کے نفاق سے آگاہ ہو جائیں گے اور "رأی العین" سے انہیں دیکھیں گے۔

پھر فرمایا گیا ہے: اگر چہ تو اب بھی انہیں ان کے اندازِ گفتگو سے پہچان سکتا ہے۔ (ولتعرفنہم فی لحن القول)۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ "لحن" کا معنی یہ ہے کہ لفظ کو اپنے قواعد اور اصل طریقہ کار سے پھیر دیا جائے یا اصل اعراب کی جگہ کوئی دوسرا اعراب دیا جائے یا صراحت سے اشارے اور کنائے کی طرف لے جایا جائے۔ زیر تفسیر آیت میں اس سے تیسرا معنی مراد ہے، یعنی دل کے سرلیض منافقوں کو اس طرح پہچانا جاسکتا ہے کہ وہ ایک صریح اور واضح معنی کو کنائے تکلیف دہ تعبیر اور دل دکھانے کے انداز میں استعمال کرتے ہیں۔

۱۔ بعض مفسرین نے مترجماً بالا آیت میں "امر" کو "استقبامیر" سمجھا ہے اور بعض دوسرے مفسرین نے اسے "منقطعہ" بمعنی "بل"

سمجھا ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جہاں پر جہاد کی بات ہوتی ہے، وہاں پر وہ کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کے ارادے کمزور اور ان کے حوصلے پست کر دیں۔ جہاں پر حق اور عدالت کی بات ہوتی ہے وہاں پر وہ اسے دوسرے لفظوں میں پھیرے جاتے ہیں اور جہاں پر نیک اور پاکیزہ اور اسلام کے پیش قدم لوگوں کا تذکرہ آتا ہے تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں عیب دار اور کم حیثیت بنا کر پیش کریں۔

لہذا ابو سعید خدری سے مروی ایک مشہور روایت میں ہے:

”لحن القول بغضہم علی بن ابی طالب، وکنا نعرف المنافقین علی عهد رسول اللہ بغضہم علی بن ابی طالب“

”لحن القول“ سے مراد علی بن ابی طالب کے ساتھ بغض ہے اور پیغمبر خدا کے زمانے میں منافق لوگوں کو ہم علی بن ابی طالب کے ساتھ دشمنی سے پہچانا کرتے تھے۔

جی ہاں منافقوں کی ایک واضح علامت یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں میں سے مومن اول اور اولین جانا برا اسلام سے دشمنی کیا کرتے تھے۔

اصولی طور پر یہ بات ممکن نہیں ہے کہ انسان کسی چیز کو دل میں چھپائے رہے اور اسے ایک طویل عرصے تک اس قدر مخفی رکھے کہ اشارات و کنایات اور ”لحن القول“ میں بھی اسے ظاہر نہ کر پائے۔ اسی لیے تو حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

”ما اضمر احد شیئاً الا ظهر فی فلتات لسانہ و صفحات وجہہ“

”کوئی شخص کسی چیز کو اپنے دل میں مخفی نہیں کھتا مگر یہ کہ باتوں باتوں میں اس کے منہ سے غیر شعوری طور پر نکل جاتی ہے اور اس کے چہرے پر آشکار ہو جاتی ہے۔“

قرآن مجید کی دوسری آیات میں منافقین کی تکلیف دہ باتوں کو بیان کیا گیا ہے جو اسی ”لحن القول“ کا مصداق ہیں، یا پھر ان کی مشکوک حرکتوں کو نقل کیا گیا ہے، شاید اسی وجہ سے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زیر تفسیر آیت کے نزول

لہ تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس روایت کو اہل سنت کے بہت سے بزرگوں نے بھی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، جن میں سے چند ایک علماء اور ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔ احمد نے کتاب ”فضائل“ میں، ابن عبد البر نے ”استیعاب“ میں ذہبی نے ”تاریخ اول الاسلام“ میں، ابن اثیر نے ”جامع الاصول“ میں، علامہ گنجی نے ”کفایۃ الطالب“ میں، محمد الدین طبری نے ”ریاض النضرہ“ میں سیوطی نے ”در منثور“ میں، آلوسی نے ”روح المعانی“ میں اور دوسرے بہت سے علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں اسے درج کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی مسلمہ روایات میں ہے کہ جو پیغمبر اسلام سے منقول ہوئی ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ”حقائق الحق“ جلد سوم ص ۱۱۰ ملاحظہ فرمائیے)۔

کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کو ان کی علامتوں سے بخوبی پہچان لیا کرتے تھے۔ اس بات کی واضح دلیل یہ چیز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ:

”ولا تصل علی احد منہم مات ابداً ولا تقم علی قبرہ“

”جب ان میں سے کوئی مر جائے تو اس پر نماز نہ پڑھیں اور اس کی بخشش کے لیے دعا کرنے کی خاطر کھڑے نہ ہوں۔“ (توہب/۸۲)

جن موقعوں پر خاص طور پر منافقین اپنے حقیقی چہرے ظاہر کیا کرتے تھے ایک جہاد کا موقع بھی تھا، جنگ سے قبل امداد کی جمع آوری کے وقت، میدان جنگ میں دشمن کے شدید حملوں کے موقع پر اور جنگ کے بعد تقسیم غنائم کے وقت۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں خاص کر سورہ توبہ اور سورہ احزاب کی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک عام مسلمان تک بھی انہیں ایسے موقع پر پہچان لیا کرتا تھا۔

آج کے دور میں بھی ”لحن القول“ کے ذریعے اور ان کے اہم اجتماعی مسائل خصوصاً بحرانوں اور جنگوں میں رد عمل کی وجہ سے منافقین کی پہچان مشکل بات نہیں ہے اور ذرا سا غور و فکر کرنے سے انہیں ان کی رفتار اور گفتار سے پہچانا جاسکتا ہے کیا ہی بہتر ہو کہ مسلمان بیدار ہوں اور اس آیت سے ہدایت لیتے ہوئے اس خطرناک اور کینہ پرور گروہ کو پہچانیں اور اسے الم نشرح کریں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا تم سب کے اعمال کو جانتا ہے (واللہ یعلم اعمالکم)۔ بعد کی آیت میں مومنین اور منافقین میں تمیز اور پہچان کے ذرائع پر زیادہ سے زیادہ تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: اور ہم تم لوگوں کو ضرور آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم لوگوں میں صحیح معنوں میں مجاہد اور صابر کون ہیں اور مجاہدوں کی شکل کے تحت عناصر منافق کون ہیں؟ (ولنبلونکم حتی نعلم المجاہدین منکم والصابرین)۔

اگرچہ اس آزمائش کا میدان وسیع اور عام ہے اور تمام فرائض کی ادائیگی کے موقع پر صبر و شکیبائی بھی اس میں شامل ہے، لیکن ”مجاہدین“ کے لفظ اور اقل و آخر کی آیات کی مناسبت سے زیادہ تر میدان جہاد و جنگ میں آزمائش مراد ہے اور یہ ہے بھی حقیقت کہ میدان جہاد ایک عظیم اور سخت آزمائش کا مقام ہوتا ہے اور وہاں پر بہت کم ہی کوئی شخص اپنے حقیقی چہرے کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپا سکتا ہے۔

نیز اسی آیت کے ذیل میں فرمایا گیا ہے: تمہاری آزمائش کے علاوہ ”ہم تمہاری خبروں کو بھی آزمائیں گے“ (روبلوا اخبارکم)۔

بہت سے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر ”اخبار“ سے مراد انسانوں کے اعمال ہیں کیونکہ جب کوئی عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے تو وہ ”خبر“ کے مانند لوگوں میں نشر ہو جاتا ہے۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہاں پر ”اخبار“ سے مراد انسان کے اندرونی راز ہیں، کیونکہ لوگوں کے اعمال ان اسرار کی خبر دیتے ہیں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہاں پر ”اخبار“ ان خبروں کے معنی میں ہو کہ جو لوگ اپنی کیفیت یا معاہدات کے

متعلق دیتے ہیں مثلاً منافقین نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کیا ہوا تھا کہ میدان جنگ سے پیٹھ نہیں پھیریں گے۔ اور پھر انہوں نے اپنے اس معاہدے کو توڑ ڈالا۔ چنانچہ سورۃ احزاب کی ۱۵ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

«ولقد کانوا عاہداً واللہ من قبل لا یؤتون الا دباراً»

نیز ان میں سے کچھ پیغمبر اسلام سے میدان جہاد سے پلٹ جانے کی اجازت مانگا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں جب کہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، ان کا اصل مقصد میدان سے فرار کرنا ہوتا تھا، قرآنی الفاظ میں:

«وکیستأذن فریق منهم النجی یقولون ان بیوتنا عورة وما ہی لعورة ان

یریدون الافراداً» (احزاب: ۳)

تو اس طرح سے خدا تعالیٰ انسانوں کے اعمال کو بھی آزمانا ہے اور ان کی گفتار اور خبروں کو بھی۔ اس تفسیر کے مطابق زیر تفسیر آیت کے دونوں جملوں کے دو مختلف معانی ہیں جب کہ پہلی تفسیر کے مطابق یہ دونوں جملے ایک دوسرے کی تاکید کرتے ہیں۔

بہر حال یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ خداوند عالم لوگوں کو علی الاعلان فرما رہا ہو کہ ہم تمہیں آزمائیں گے تاکہ تمہاری صفیں ایک دوسرے سے نمایاں اور ممیز ہو جائیں اور حقیقی مومنین کو ضعیف الاعتقاد اور منافقین سے علیحدہ پہچانا جاسکے۔ قرآن کی بہت سی آیات میں آزمائش و امتحان کے مسئلے کو بیان کیا گیا ہے۔

ہم نے بھی پہلی جلد سورہ بقرہ کی آیت ۵۵ کے ذیل میں خدا کی آزمائش کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے اسی طرح سورہ عنکبوت کے آغاز میں بھی (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۹ اور جلد ۹ متعلقہ حصے)۔

ساتھ ہی یہ بتاتے چلیں کہ "حتی نعلم الجاہدین منکم" (تاکہ تم میں سے مجاہدین کی شناخت ہو جائے) کا جملہ اس معنی میں نہیں ہے کہ خدا ان لوگوں سے واقف نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد خدا کے علم کا خارج میں ظہور اور ایسے افراد کو نمایاں کرنا ہے یعنی اس طرح سے خارج میں بھی خدا کا علم حقیقت کی صورت اختیار کرے اور حقیقی مجاہدین کی صفیں بھی دوسرے نامہاد مجاہدین سے علیحدہ ہو جائیں گی۔

۳۲۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَقْبُوا الرَّسُوْلَ
مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى لَنْ يَضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا وَّ
سَيُحِبُّ اَعْمَالَهُمْ ۝

۳۳۔ يَآٰيَهٰۤا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطَلُوْا
اَعْمَالَكُمْ ۝

۳۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرًا
فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۝

ترجمہ

۳۲۔ بے شک جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا، اور حق کے ظاہر ہوجانے کے بعد رسول خدا کی مخالفت کی تو وہ خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ بہت جلد ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا۔

۳۳۔ اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول خدا کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

۳۴۔ جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا پھر کافر ہی مر گئے تو خدا ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

تفسیر

کفر کی حالت میں مردے والے نہیں بخشے جائیں گے:

گذشتہ آیات میں منافقین کے بارے میں مختلف زاویوں سے گفتگو کی گئی تھی اب ان آیات میں کفار کے ایک اور ٹولے کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: بے شک جو لوگ کافر ہو گئے انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا اور حق ظاہر ہو جانے کے بعد رسول خدا کی مخالفت کی تو وہ خدا کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ بہت جلد ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا (ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ و شاقوا الرسول من بعد ما تبین لهم الهدیٰ لن یضروا اللہ شیئاً و سیحبط اعمالهم)۔

ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ وہی مشرکین مکہ ہوں یا مدینہ کے کافر یہودی ہوں یا دونوں قسم کے لوگ ہوں، کیونکہ ”کفر“ اور ”صد عن سبیل اللہ“ (لوگوں کو راہ خدا سے روکنا) کی تعبیر قرآنی آیات میں دونوں قسم کے لوگوں کے بارے میں آئی ہے۔ ”تبیین ہدایت“ مشرکین مکہ کے بارے میں معجزات کے ذریعے تھی اور اہل کتاب کافروں کے بارے میں ان کی آسمانی کتاب کے ذریعے سے۔

ان کے اعمال کا اکارت جانا یا تو ان کے ان نیک اعمال کی طرف اشارہ ہے جو وہ کبھی کبھار انجام دیا کرتے تھے، جیسے سمان نوازی، مسافرنی کی امداد اور انھیں کھلانا پلانا وغیرہ یا پھر ان کے اسلام کے خلاف منصوبوں کی ناکامی کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال ان لوگوں میں تین قسم کی صفات پائی جاتی تھیں ایک کفر، دوسری ”صد عن سبیل اللہ“ اور تیسری رسول پاک سے دشمنی۔ پہلی صفت تو خدا کے ساتھ مخالفت پر مبنی تھی، دوسری اس کے بندوں کے ساتھ مخالفت پر اور تیسری رسول اللہ کے ساتھ مخالفت پر۔

بعد کی آیت میں روئے سخن مومنین کی طرف ہے اور کفار و منافقین کے طرز عمل کو واضح کرنے کے بعد ان کے راستے کی ان الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے: اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو! خدا کی اطاعت کرو رسول خدا کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال باطل نہ کرو (یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم)۔

حقیقت یہ ہے کہ مومنین کی تمام زندگی کفار و منافقین کی زندگی کے بالکل برعکس ہے کیونکہ کفار و منافقین فرمان الہی کی مخالفت کرتے ہیں اور مومنین اطاعت کرتے ہیں وہ رسول خدا سے دشمنی کرتے ہیں اور یہ آپ کی فرمانبرداری ان کے اعمال کفر، ریاکاری اور احسان جتانے کے ذریعے اکارت ہو جاتے ہیں جبکہ مومنین کے اعمال ان چیزوں سے خالی ہوتے ہیں اور ان کی جزا خدا کے پاس محفوظ ہے۔

بہر حال آیت کا انداز بتا رہا ہے کہ اس زمانے میں کچھ ایسے مومنین بھی تھے جو خدا اور رسول کی اطاعت اور اپنے

اعمال کی حفاظت کے معاملے میں کوتاہی کیا کرتے تھے، جنہیں خداوند عالم نے ان آیات کے ذریعے خبردار کیا ہے۔ بعض فقہانے ”ولا تبطلوا اعمالکم“ کے ذریعے نماز کو توڑنے کی حرمت پر استدلال قائم کیا ہے لیکن جیسا کہ گذشتہ اور آئندہ آیات اسی طرح خود یہی آیت گواہی دے رہی ہیں کہ اس کا اس معنی سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ شرک و کفر، ریا کاری اور احسان جتانے وغیرہ کے ذریعے اپنے اعمال کو باطل نہ کرنا ہے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت، گزشتہ آیات میں کفار کے متعلق جو کچھ بیان ہو چکا ہے، ان کی وضاحت اور تاکید کے طور پر ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کو توبہ اور بازگشت کے رستے بتا رہی ہے جو توبہ کرنے کے لیے مائل ہوں، ارشاد ہوتا ہے: بے شک جو لوگ کافر ہو گئے اور انہوں نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا، پھر کافر ہی مر گئے تو خدا ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ (ان الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ نشتہ ماتوا وھم کفار فلن یغفر اللہ لھم۔)

کیونکہ موت کے ساتھ ہی توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے کفر اور دوسروں کی گمراہی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس دنیا سے سدھاریں گے، تو پھر انہیں کیسے معاف کیا جا سکتا ہے؟ تو اس طرح ان آیات میں مجموعی طور پر تین قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہوا ہے، منافقین کا، کفار کا اور مومنین کا اور ان میں سے ہر ایک کی صفات اور انجام کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

ثواب ضائع ہونے کے اسباب:

قرآن کی مختلف آیات بشمول زیر تفسیر آیت میں جن حساس نکتوں کی طرف زیادہ توجہ دلائی گئی ہے اور خبردار کیا گیا ہے ان میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ مومنین ہوشیار رہیں کہ ان کے اعمال بھی کفار کے اعمال کی طرح اکارت نہ چلے جائیں۔ بالفاظ دیگر خود عمل ایک علیحدہ بات ہے اور اس کی حفاظت ایک اور بات۔ اگرچہ عمل بھی اہم چیز ہے لیکن عمل کی حفاظت اس سے اہم تر ہے۔ ایک پاک و پاکیزہ، صحیح و سالم اور مفید عمل وہی ہوتا ہے جو آغاز سے ہی صحیح و سالم اور بے عیب ہو اور آخری عمر تک اس کی حفاظت کی جائے۔ جو اسباب و عوامل انسان کے اعمال کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں یا انہیں نیست و نابود کر دیتے ہیں، بہت ہیں جن میں چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ احسان جتنا اور تکلیف پہنچانا۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

”یا ایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمنّ والاذی کالذی

ینفق مالہ رءاء الناس ولا یؤمن باللہ والیوم الآخر۔

”اے ایمان دارو! اپنے مال کے راہ خدا میں خرچ کو احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے کے ذریعے ضائع مت کرو، اس شخص کے مانند جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ (بقرہ/ ۲۶۴)

یہاں پچھلے ضائع ہونے کے دو حوالے بتائے گئے ہیں۔ ایک منت جتاناً اور تکلیف پہنچانا اور دوسرے ریاکاری اور کفر ہیں، پہلا عامل عمل کی انجام دہی کے بعد درپیش آتا ہے اور دوسرا اس کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ اور نیک اعمال کو آگ میں ڈال دیتا ہے۔

۲۔ عجب اور خود پسندی ایک اور عامل ہے جو آثار عمل کو مٹا دیتا ہے۔ لہذا حدیث میں ہے،
 ”العجب يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب“

خود پسندی نیکیوں کو یوں ختم کر دیتی ہے، جس طرح آگ ایندھن کو۔ ۱۷
 ۳۔ حسد بھی نیکیوں کے ضائع ہونے کا ایک سبب ہے اور اس کے بارے میں بھی حدیث میں تقریباً وہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو عجب و خود پسندی کے بارے میں ہیں۔

چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:
 ”اياكم والحسد فان الحسد يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب“

اصولی طور پر جس طرح اچھائیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں

”ان الحسنات يذهبن السيئات“

اسی طرح کبھی کبھی برائیاں بھی اچھائیوں کو بالکل بے اثر بنا دیتی ہیں۔
 ۴۔ مرتے دم تک ایمان پر قائم رہنا بقائے عمل کی اہم ترین شرط ہے، کیونکہ قرآن مجید صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ جو لوگ بے ایمان ہو کر مرتے ہیں ان کے سارے اعمال نیکے عمل اکارت جاتے ہیں۔ ۱۸
 اسی سے ہم اعمال کی حفاظت کے مسئلے کی اہمیت اور مشکلات کا اندازہ لگاتے ہیں، لہذا ایک حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

”الابقاء على العمل اشد من العمل، قال وما الا بقاء على العمل؟ قال
 يصل الرجل بصلته وينفق نفقة لله وحده ولا شريك له، فتكتب
 له سئراً، ثم يذکرها فتعجب له علانية، ثم يذکرها
 فتعجب وتكتب له رياء“

”اعمال کی حفاظت خود اعمال کی بجا آوری سے زیادہ سخت ہے۔ راوی نے عرض کیا، اعمال

کی حفاظت سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: انسان کبھی بخشش کرتا ہے یا راہِ خدا میں چھپ کر خرچ کرتا ہے تو اس کے نامہ اعمال میں ایک منحنی عمل لکھا جاتا ہے۔ پھر کسی جگہ پر اس کا تذکرہ کرتا ہے تو منحنی نیکی کے بجائے ظاہری نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ پھر ایک اور جگہ پر اسے بیان کرتا ہے تو نیکی کو مٹا کر ریا کاری لکھ دی جاتی ہے۔^{۱۶}

زیر تفسیر آیت مذکورہ تمام امور کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہے:

”ولا تبطلوا اعمالکم“^{۱۷}

^{۱۶} کافی جلد ۲ باب ریا، حدیث ۱۶۔

^{۱۷} اعمال کے ضائع ہونے کے بارے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ جلد دوم سورہ بقرہ کی ۲۱۷ ویں آیت کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں

۳۵۔ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ
وَلَنْ يَتْرُكَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ۝

ترجمہ

۳۵۔ تم کبھی ہمت نہ ہارو اور دشمن کو (رسوا کن) صلح کی دعوت نہ دو تم تو غالب ہو اور خدا تمہارے
ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کے ثواب میں ہرگز کمی نہ کرے گا۔

تفسیر

بے جا اور رسوا کن صلح؛

گذشتہ آیات جہاد کے سلسلہ میں تھیں اور یہ آیت بھی جہاد ہی کے بارے میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کر رہی
ہے اور وہ یہ کہ سست اور ضعیف الایمان افراد جہاد کی سختیوں اور میدان جنگ کی مشکلات سے جان چھڑانے کے
لیے عام طور پر ”صلح“ کا پرچار کرنے لگتے ہیں۔ یقیناً صلح ایک بہت اچھی چیز ہے، لیکن اپنے مقام پر۔ ایسی صلح جو اسلام کے
اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کرے اور مسلمانوں کی عزت و عظمت اور شرافت کی حفاظت کرے، نہ کہ وہ صلح جو مسلمانوں کی ذلت
اور خواری کا باعث بن جائے۔

اسی لیے ارشاد فرمایا گیا ہے: اب جب کہ گذشتہ احکام کو تم نے سن لیا تو اب تم ہمت نہ ہارو اور دشمن کو
صلح کی دعوت نہ دو تم برتر ہو۔ (فلا تهنوا وتدعوا إلى السلم وانتم الاعلون)۔
یعنی اب جبکہ تمہاری فتح و برتری کی علامت ظاہر ہو چکی ہے تو تم ایسی صلح کی پیش کش کر کے اپنی کامیابی کو ملیا

۱۔ ”تدعوا“ مجزوم ہے اور ”لا تهنوا“ پراس کا عطف ہے، جس کا معنی یہ ہے۔

”لا تهنوا ولا تدعوا إلى السلم“

کر رہے ہو جس صلح کا معنی پیچھے ہٹنا اور شکست تسلیم کرنا ہے۔ یہ تو سستی اور کمزوری کی وجہ سے ہے، یہ ایک طرح کی بڑی آرام طلبی ہے جس کے نتائج نہایت ہی دردناک اور خطرناک ہوتے ہیں۔

اسی آیت کے ضمن میں مسلم مجاہدین کے حوصلے بلند کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: اور خدا تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے اعمال کے ثواب کو کم نہ کرے گا (واللہ معکم ولن یترکم اعمالکم)۔

جس کے ساتھ خدا ہے کامیابی کے تمام اسباب بھی اسی کے پاس ہیں وہ اپنے آپ کو کبھی اکیلا نہیں سمجھتا، نہ تو کبھی سستی کا اظہار کرتا ہے اور نہ ناتوانی کا، صلح کے نام پر دشمن کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتا، شہداء کے خون سے حاصل ہونے والے نتائج کو بردبار نہیں کرتا۔

”لن یترکم“ ”وتو“ (بروزن سطر) کے مادہ سے ہے، جس کا معنی ہے ”اکیلا“ اسی لیے ان لوگوں کو ”وتر“ (بروزن نکر) کہتے ہیں جن کے قریبی رشتہ دار میدان جنگ میں مارے جاتے ہیں اور وہ اکیلے رہ جاتے ہیں۔ نقص اور کمی کو بھی ”تر“ کہتے ہیں اور زیر تفسیر آیت میں اسی چیز کو لطیف کنایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ خدا تمہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا اور تمہارے اعمال کے اجر و ثواب کو تمہارے ہمراہ کر دے گا۔

خاص کر یہ توجہ تم جانتے ہو کہ جہاد کی راہ میں تم جو بھی قدم اٹھاتے ہو وہ لکھ لے جاتے ہیں اس سے صرف یہ نہیں کہ تمہارے اجر و ثواب میں سے کچھ کمی نہیں کرتا، بلکہ اپنے فضل و کرم سے اس میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ ہمارے ان تمام بیانات کا جو صلح کے بارے میں سورہ انفال کی ۶۱ ویں آیت سے کوئی تضاد نہیں ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

» وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ انه هو السميع العليم
اگر وہ صلح پر مائل ہو جائیں تو تجھے بھی صلح کر لینی چاہیے اور خدا پر بھروسہ رکھ، کیونکہ وہ سُننے اور جاننے والا ہے۔

ان میں سے کسی آیت کو دوسری کا نسخ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ ان دونوں کا اپنا اپنا خاص موقع ہے ایک معقول صلح کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا ”بے صلح“ کی طرف ایک وہ صلح ہے جس میں مسلمانوں کے ہر قسم کے مفادات کا تحفظ کیا جاتا ہے اور دوسری وہ ہے جو فتح اور کامرانی کے نزدیک وقت ضعیف اور سست ایمان مسلمانوں کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، اسی لیے سورہ انفال والی آیت کے بعد کے حصے میں فرمایا گیا ہے:

» وان یریدوا ان یخذ عولک فان حسبک اللہ ۛ

اور اگر وہ صلح کی بات کرے تمہیں دھوکا دینا چاہیں اور اس کے پردے میں کوئی فریب کاری کا رفرما ہو تو ان کی باتوں میں ہرگز نہ آؤرنہ ہی گھبرا، کیونکہ خدا تیرا پشت پناہ ہے۔
امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام مالک اشتر کے نام اپنے ایک فرمان میں ان دونوں قسم کی صلح کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

”ولا تدفن صلحا دعائك اليه عدوك والله فيه رضا“

”جب دشمن تمہیں ایسی صلح کی دعوت دیں جس میں خدا کی رضا مندی ہو تو اس پیش کش کو مت ٹھکراؤ۔“

دشمن کی طرف سے صلح کی دعوت ایک طرف سے اور خدا کی رضا کا اس میں شامل ہونا دوسری طرف سے۔ تو اس طرح صلح دو حصوں میں تقسیم ہوگی جن کی طرف ہم اور پر اشارہ کر چکے ہیں۔

بہر حال مسلمان سربراہوں کو صلح و جنگ کے موقع کی پہچان کرنی چاہیے، کیونکہ یہ ایک نہایت ہی باریک ترین اور پیچیدہ ترین مسئلہ ہے، جس میں نہایت ہی دقت اور ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس بارے میں ذرا سی حسابی غلطی کا ہولناک اور مہیب انجام ہوتا ہے۔

۳۶۔ اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهُوَ وَاِنْ تُوْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ
 اٰجُوْرًا كُمْ وَلَا يَسْئَلُكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝
 ۳۷۔ اِنْ يَسْئَلْكُمْ مَّا فِيْكُمْ تَبَخَّلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ۝
 ۳۸۔ هٰنَتُمْ هٰؤُلَاءِ تَدْعُوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَنْ
 يَّبْخُلُ وَّمَنْ يَّبْخُلْ فَاِنَّ مَا يَبْخُلُ عَنْ نَفْسِهِ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ
 وَاَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا
 يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ ۝

ترجمہ

۳۶۔ دنیاوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے، اگر تم ایمان رکھو اور تقوی اختیار کرو تو وہ تم کو پورا اجر دے گا اور اس کے عوض میں تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔
 ۳۷۔ کیونکہ اگر وہ تم سے مال طلب کرے بلکہ تم سے اصرار کر کے مانگے بھی تو تم بخل کرتے ہو اور وہ تمہارے غصے اور کینے کو ظاہر کرے گا۔
 ۳۸۔ جی ہاں! تم تو وہی لوگ ہو جو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو تو بعض تم میں سے ایسے ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ اپنے ہی سے بخل کرتا ہے اور خدا تو بے نیاز ہے اور تم سب محتاج ہو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے

تو خدا تمہاری جگہ پر دوسرے لوگوں کو لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔

تفسیر

اگر تم روگردانی کرو گے تو دوسرے لوگ آجائیں گے:

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ سورہ "محمد" سورہ جہاد ہے جو جہاد کے مسئلے سے شروع ہوتی ہے اور جہاد ہی کے مسئلے پر ختم ہوتی ہے۔

زیر تفسیر آیات جو اس سورت کی آخری آیات ہیں، اسی سلسلے میں انسانی زندگی کے ایک اور مسئلے کو بیان کر رہی ہیں اور مسلمانوں کو اطاعت الہی کے لیے عموماً اور مسئلہ جہاد کے لیے خصوصاً پہلے سے زیادہ شوق دلارہی ہیں اور انہیں زیادہ سے زیادہ متحرک کر رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ دنیاوی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، کیونکہ جہاد سے باز رکھنے کا ایک اہم عامل دنیاوی زندگی سے مانوس ہونا اور مادی دنیا سے دل لگانا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: دنیاوی زندگی تو بے کھیل تماشائے۔ (انما الحیوة الدنیا لعب ولہو)۔

"لعب" (کھیل) ایسے کام کو کہا جاتا ہے جس میں ایک طرح کا خیالی نظم و نسق پایا جائے، جس کے ذریعے ایک خیالی مقصد تک پہنچا جاسکے اور "لہو" (فضول مشغولیت و تماشائے) ہر اس کام کو کہا جاتا ہے جو انسان کو اپنی طرف مشغول رکھے اور اصولی مسائل سے اس کی توجہ ہٹا دے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیاوی زندگی ایک "کھیل" تماشائے اور مہل مشغولیت ہے۔ نہ تو جس سے کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی حال۔ نہ اس کو کوئی دوام حاصل ہے اور نہ ہی بقا، یہ تو چند گزرنے والے لمحات اور ناپائیدار لذتوں پر مشتمل ہے، جس کے ساتھ کئی طرح کا سرور بھی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ اختیار کرو، تو وہ تم کو پورا اجر دے گا اور اس کے عوض میں تم سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔ (وان تؤمنوا وتتقوا یؤتکم اجرکم ولا یسئلكم اموالکم)۔ لہذا ہدایت و راہنمائی اور دنیا و آخرت میں اس قدر جزا و ثواب کے بدلے میں نہ تو خدا تم سے کسی مال کا مطالبہ کرتا ہے اور نہ ہی اس کا رسول، اصولی طور پر خدا کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور پیغمبر کی ساری ضرورتیں خود خدا پوری کرتا ہے۔

اگر تمہارے مال میں سے کچھ مستحق ساجدہ زکوٰۃ اور شرعی حقوق کے نام سے تم سے لیا جاتا ہے تو وہ بھی خود تم پر ہی

خرچ ہوتا ہے، تمہارے تیسوں، حاجت مندوں اور مسافروں کی ضرورت یا محکماًشت کے لیے اور تمہارے ملک کا امن و بحال رکھنے اور استقلال اور آزادی کی حفاظت، ملک کا نظم و نسق چلانے، ملکی ضروریات کو پورا کرنے اور شہر و قصبیات کو آباد رکھنے کے لیے ہے۔

بنابریں یہ مقدار بھی خود تمہارے لیے ہے، کیونکہ خدا اور رسول تم سب لوگوں سے بے نیاز ہیں۔ تو اس طرح سے آیت کے مفہوم اور صدقات و زکوٰۃ اور راہِ فریض خراج کرنے کا حکم دینے والی دوسری آیات کے مفہوم کے درمیان کوئی تناقض نہیں۔ ”ولایسئلکم أموالکم“ کے جملے کی تفسیر اور احتمال تناقض دور کرنے کے لیے اور بھی کئی احتمالات ذکر کیے گئے ہیں چنانچہ:

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہدایت اور ثواب کے بدلے میں تمہارے مال سے کچھ نہیں مانگتا۔
بعض کہتے ہیں تمہارا مال تم سے نہیں مانگتا، بلکہ اس کا ایک تھوڑا سا حصہ مانگتا ہے۔
بعض دوسرے کہتے ہیں: یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب مال خدا کے ہیں اگرچہ: ”ع
چند روزے ایں امانت نزدماست“

لیکن سب سے زیادہ مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔

بہر حال یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جہاد کا ایک حصہ ”جہاد بالمال“ بھی ہے اور اصولی طور پر دشمن کے ساتھ ہر قسم کی جنگ کے لیے اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے جسے باایمان اور متقی مسلمانوں اور ان لوگوں سے جمع کیا جانا چاہیے جو دنیا سے وابستہ اور دل بستہ نہیں ہیں، زیر نظر آیات درحقیقت اسی چیز کے لیے فکری اور علمی رستہ ہموار کر رہی ہیں۔ بعد کی آیت اکثر لوگوں کی مال و دولت سے محبت اور دلچسپی کی حد بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: اگر وہ تم سے مال کا مطالبہ کرے بلکہ اصرار بھی کرے پھر بھی تم بخل کرو گے، بلکہ اس سے بڑھ کر تمہارے کینے اور غصے کو آشکار کرے گا۔ ان ایسٹلکم وھا فیحکم تبخلوا ویخرج اضغانکم۔

”یحفکم“، ”احفاء“ کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ”مطالبے اور سوال میں اصرار کرنا۔“ اور ”احفاء“ دراصل ”حفا“ سے ہے، جس کا معنی ہے ننگے پاؤں چلنا۔ یہ تعبیر ایسے کاموں کے لیے کنایہ ہے جنہیں انجام دینے کے لیے انسان آخری حد تک کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے ”احفاء شارب“ کا معنی مونچھوں کو آخری حد تک منڈوانا ہے۔

”اضغان“ ”ضغن“ کی جمع ہے، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اس کا معنی ہے ”سخت کینہ“

خلاصہ الکلام یہ کہ یہ آیت بہت سے لوگوں کی مال اور مالی امور کے ساتھ سخت محبت اور دلچسپی کو ترک کرنے کی ترغیب بھی دے رہی ہے کہ چھوڑو ایسی محبت کو کہ اگر خدا بھی تم سے مال طلب کرے تو تمہیں غصہ آجاتا ہے اور کینے کا اظہار کرنے لگتے ہو۔

تو اس طرح اس تا زیادہ ملامت کے ذریعے انسان کی خفتہ رُوح کو بیدار کیا جا رہا ہے تاکہ وہ مال کی غلامی کا جزا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں اور اپنے آپ کو اس حد تک تبدیل کریں کہ سب کچھ دوست کی راہ میں خرچ کر دیں اور سب کچھ اس

کے لیے تازہ کر دیں، جس کے بدلے میں اس کے تقوے، رضا اور خوشنودی کو حاصل کر لیا۔

زیر تفسیر آیات میں سے آخری آیت جو سورہ محمد کی بھی آخری آیت ہے اور گذشتہ آیات میں مذکور مادی مسائل اور لوگوں کی دُنیا سے دلچسپی اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کے بارے میں ایک اور تاکید ہے: ارشاد ہوتا ہے: جان لو کہ تم وہی لوگ ہو جو راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے بلائے جاتے ہو تو تم میں سے بعض لوگ تو اس فرمانِ الہی کی اطاعت کرتے ہیں جب کہ بعض اور لوگ بخل کرتے ہیں (ہا انتم حلو لاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فمنکم من ینخل)۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے پہلی آیات میں تو کہا جا چکا ہے کہ خداتم سے مال کا طلبہ نہیں کرتا تو پھر اس آیت میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا حکم کیونکر دیا جا رہا ہے؟ آیت کا دوسرا حصہ خود ہی اس سوال کا جواب دیتا ہے اور پہلے کہتا ہے: جو شخص خرچ کرنے سے بخل کرتا ہے تو وہ خود اپنے ہی لیے بخل کرتا ہے (ومن ینخل فانما ینخل عن نفسه)۔ لہ

کیونکہ اس خرچ کا نتیجہ دُنیا میں بھی تمہارے حق میں ہے اور تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ کیونکہ طبقاتی فاصلے کم ہو جائیں گے، معاشرے میں امن و امان قائم ہوگا اور عداوت اور کینے کے بجائے پیار و محبت اور صدق و صفا کا دور دورہ ہوگا، یہ ہے تمہارا دنیاوی ثواب اور فائدہ۔

اور آخرت میں بھی وہ تمہیں درہم و دینار کے بدلے میں ایسی نعمتیں عطا فرمائے گا، جس کا انسانی ذہن میں تصور محال ہے اسی لیے تم جس قدر بخل کرو گے، خود اپنے ہی ساتھ بخل کرو گے۔

دوسرے لفظوں میں یہاں پر انفاق کا ذکر زیادہ تر جہاد کے بارے میں انفاق کے لیے ہے اور فی سبیل اللہ کی تفسیر بھی اسی معنی سے مناسبت رکھتی ہے اور واضح سی بات ہے کہ جس قدر بھی جہاد کے امور میں زیادہ امداد کی جائے گی اسی قدر معاشرے کی عزت، استقلال اور وجود کی زیادہ حفاظت کی جاسکے گی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ: خدا غنی اور بے نیاز ہے اور تم سب اس کے محتاج ہو (واللہ الغنی وامتہ الفقراء)۔ وہ تمہارے خرچ کرنے سے بھی بے نیاز ہے اور تمہاری اطاعت سے بھی۔ یہ تم ہو کہ دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے لطف و کرم، رحمت و عنایت اور اس کے اجر و ثواب کے محتاج ہو۔

اصولی طور پر تمام ممکن الوجود اور سوائے ذاتِ خدا کے کل کائنات مجسم ضرورت، فقر اور احتیاج ہے اور غنی بالذات صرف اور صرف خدا ہے۔ باقی سب اپنے اصل وجود میں بھی ہمیشہ اسی کے محتاج ہیں اور لمحہ بہ لمحہ اس کے فیض و وجود کے لایزال منبع سے مدد حاصل کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اپنے فیض کو روک لے تو تمام کائنات

لہ "بخل" کا لفظ کبھی تو "عن" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور کبھی "علیٰ" کے ساتھ پہلی صورت میں منع اور روکنے کے معنی میں ہوگا اور دوسری صورت میں لقبان پہنچانے کے معنی میں۔

تفسیر نمونه جلد ۱۲

۳۱۳

تفسیر نمونه جلد ۱۲

لتناولہ رجال من فارس“

”یہ اور اس کی قوم مراد ہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر ایمان ثریا کی بلنریوں پر بھی ہو تو فارس کے رہنے والے کچھ لوگ اسے وہاں سے بھی حاصل کر لیں گے۔“

اس حدیث کو اور اس سے ملتی جلتی دوسری احادیث کو اہل سنت کے مشہور محدثین نے بھی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے جیسے محدث بیہقی اور محدث ترمذی وغیرہ بشیخہ سننی مشہور مفسرین کو بھی اس سے اتفاق ہے، جیسے مفسر قرطبی، مفسر روح البیان، مفسر مجمع البیان، فخر رازی، مراغی اور ابوالفتوح رازی وغیرہ۔

تفسیر درمنثور کے مفسر نے بھی اس آیت کے ذیل میں اس بارے میں کئی حدیثیں نقل کی ہیں۔ یہ ایک اور حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے جو مندرجہ بالا حدیث رسول کے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ امام فرماتے ہیں:

”واللہ ابدل بہم خیرًا منہم، الموالی“

”خدا کی قسم خدا نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا ہے اور غیر عرب کو جو ان سے کئی گنا بہتر ہیں ان کا جانشین قرار دیا ہے“۔

اگر پورے غور و فکر اور ہر قسم کے تعصب سے ہٹ کر تاریخ اسلام اور اسلامی علوم کا مطالعہ کریں اور عجیبوں خصوصاً ایرانیوں کے میدان جنگ و جہاد اور علوم اسلامی کی چھان بین اور ترتیب و تدوین کے حصے کو دیکھیں تو اس حدیث کی حقیقت کا اچھی طرح پتہ چل جائے گا۔ اس بارے میں تفصیل کے ساتھ کہنے کی بہت سی باتیں ہیں۔

خداوند! اپنے پاک دین کی راہ میں جہاد، ایثار اور فداکاری کے لیے ثابت قدم رکھ۔
بارالہا! یہ عظیم اعزاز جو تو نے ہمیں بخشا ہے کہ تیرے دین پاک کے داعی ہوں ہم سے واپس نہ لے۔
پروورد گادا! اس وقت جب مشرق و مغرب کے شدید طوفان تیرے پاک دین کے آثار مٹانے کے لیے
اٹھ کھڑے ہوئے، ہمیں زیادہ سے زیادہ قوت، محکم ایمان، زیادہ ایثار اور زیادہ سے زیادہ خلوص کی دولت
سے مالا مال فرما۔

امین یارب العالمین



جمعۃ المبارک ۷، اررمضان (روز فتح بدر) ۱۴۰۵ھ کو ”سورۃ محمد“ اور
تفسیر نمونہ کی اکیسویں جلد اپنے اختتام کو پہنچی۔



اس جلد کا اردو ترجمہ بتاریخ ۷، اررجب المرجب ۱۴۰۶ھ مطابق ۸، ارالرج ۱۹۸۶ء
بروز بُدھ بوقت ساڑھے سات بجے صبح برمکان سیٹھ نواز ش علی صاحب
۸، ارمی ماڈل ٹاؤن لاہور اختتام پذیر ہوا۔
الحمد لله اولاً و آخراً و صلی اللہ علی محمد و آلہ ابداً سرمداً۔

سید صفدر حسین نجفی

سُورَةُ فَتْحٍ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۲۹ آیات ہیں

تاریخ شروع

۱۴ رمضان ۱۲۰۵ھ

۱۴/۳/۱۳۶۴ھ شمس

اثر نگارش
اہلِ تسلیم کی ایک جماعت

زیرِ نظر
استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد ۱۲ - ۱

ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی حیدرآبادی

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ



پیشکش: حوزہ علمیہ جامعہ المنتظر لاہور
جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب _____ تفسیر نمونہ
جلد _____ ۱۲
زیر نظر _____ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم _____ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
ناشر _____ مصباح القرآن ٹرسٹ، ارگنکارام بلڈنگ
شاہراہ قائد اعظم، لاہور
مطبع _____ معراج دین پرنٹرز، لاہور
تاریخ اشاعت _____ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
ہدیہ _____ 200/-

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴، الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۷۱۲۲۲۲۳-۷۳۱۲۳۱۱

سورہ فتح کے مطالب

یہ سورت جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے فتح و کامیابی کا پیغام لانے والی ہے، دشمنان اسلام پر کامیابی، قطعی اور نظر آنے والی کامیابی، (خواہ وہ کامیابی فتح مکہ کے ساتھ مربوط ہو یا صلح حدیبیہ کے ساتھ یا فتح خیبر سے، یا مطلق طور سے کامیابی)

اس سورہ کے مطالب کو معلوم کرنے کے لیے، ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ یہ سورہ حدیبیہ کے واقعہ کے بعد ہجرت کے چھٹے سال نازل ہوئی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: پیغمبر اسلام نے ہجرت کے چھٹے سال مہاجرین و انصار اور باقی مسلمانوں کو ساتھ لے کر مکہ "عمرہ" کے عہد سے مکہ کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ کیا، اور اس سے پہلے وہ مسلمانوں کو بتا چکے تھے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے اصحاب انصار کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہوا ہوں اور مناسک عمرہ ادا کرنے میں مشغول ہوں۔

مسلمانوں نے "ذی الحلیفہ" میں مدینہ کے قریب احرام باندھا، اور بہت زیادہ اونٹ قربانی کے لیے لے کر چلے۔ پیغمبر کے چلنے کی کیفیت سے اس بات کی اچھی طرح نشاندہی ہو رہی تھی کہ اس عظیم عبادت کو انجام دینے کے علاوہ آپ کا اور کوئی مقصد نہیں ہے، یہاں تک کہ پیغمبر سرزمین "حدیبیہ" میں وارد ہوئے، (حدیبیہ مکہ کے قریب ایک ایسی بستی تھی جو مکہ سے ۴۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر تھی)

لیکن یہاں قریش کو پتہ چل گیا اور انہوں نے پیغمبر کا راستہ روکا اور وہ ان کے مکہ میں وارد ہونے سے مانع ہوئے، اور حقیقت میں انہوں نے ان تمام سنتوں کو جو وہ ماہ حرام میں زائرین خانہ خدا کے امن و امان کے سلسلہ میں ادا کرتے تھے پاؤں تلے روند ڈالا۔ کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حرمت والے مہینوں میں (مجملاً ماہ ذی قعدہ جس میں پیغمبر عمرہ کا ارادہ رکھتے تھے، خصوصاً حالت احرام میں کسی شخص سے مانع نہیں ہونا چاہیے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی ان دنوں اور ان مراسم میں دیکھ لیتا تو ہرگز اس سے متعرض نہ ہوتا۔

یہاں ایک اہم واقعہ پیش آیا جو پیغمبر اور مشرکین مکہ کے درمیان "صلح حدیبیہ" کے نام سے ایک صلح کی قرارداد کی صورت میں منتهی ہوا، جس کو ہم بعد میں بیان کریں گے، لیکن بہر صورت انہوں نے اس سال پیغمبر کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا، مجبوراً پیغمبر نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ اپنے اونٹوں کی اسی جگہ قربانی کریں اور اپنے ہر منڈ و امین اور احرام سے باہر نکل آئیں، اور مدینہ کی طرف

لوٹ جائیں۔

یہ سال غم و اندوہ کے ایک طوفان نے مسلمانوں کو گھیر لیا، اور ضعیف الایمان لوگوں پر شک و تردید غالب آگیا۔ جس وقت پیغمبرِ حدیبیہ سے مدینہ کی طرف آ رہے تھے۔ تو آپ کی سواری بوجھل ہو گئی اور چلنے سے رک گئی، اور اسی حالت میں آپ کا چہرہ مبارک کسی بظاہر وجہ کے بغیر سرور و شادمانی میں ڈوب گیا، اور فرمایا:

بس ابھی ابھی سورہ فتح کی آیات مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ لہ

اور یہاں سے اس سورہ پر چٹائی ہوئی ایک خاص فضا کا مل طور پر نمایاں ہو جاتی ہے، ایک اجمالی مطالعہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سورہ کے سات جتھے ہیں۔

- ① یہ سورت، فتح کی بشارت سے شروع ہوتی ہے، اور اس کے اختتام کی آیات بھی اسی مسئلہ سے مربوط ہیں اور پیغمبر کے مکہ میں وارد ہونے اور اس میں مناسکِ عمرہ انجام دینے کے خواب کے پورا ہونے کی تاکید ہے۔
- ② اس سورت کا دوسرا حصہ "صلح حدیبیہ" و "نزول سکینہ" اور مومنین کے دلوں کے لیے تسلی سے مربوط واقعات اور بیعت رضوان کے مسئلہ کو بیان کرتا ہے۔

- ③ ایک اور حصہ میں پیغمبر کے مرتبہ اور ان کے بلند و بالا مقصد کو بیان کیا گیا ہے۔
- ④ ایک دوسرے حصہ میں منافقوں کی کارشکنیوں، اور میدانِ جہاد میں ان کے شرکت نہ کرنے کے بے ہودہ غرور سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

- ⑤ ایک اور حصہ میں منافقین کے کچھ نامناسب تقاضوں کا بیان ہے۔
 - ⑥ اس کے بعد یہ سورہ ان لوگوں کا تعارف کرتا ہے جو میدانِ جہاد میں شرکت کرنے سے معذور ہیں،
 - ⑦ آخری حصہ میں پیغمبرِ اسلام کے دین کی راہ کے پیروکاروں کی خصوصیات اور مخصوص صفات کا بیان ہے۔
- اس سورہ کی آیات، مجموعی طور پر حد سے زیادہ حساس، و مقدر ساز ہیں اور خاص طور سے ان گونا گوں حوادث کے مقابلہ میں، جن میں اسلامی معاشرہ الجھا ہوا ہے، آج کے مسلمانوں کے لیے الہام آفرین ہیں۔

سورہ فتح کی تلاوت کی فضیلت

منابعِ اسلامی میں اس سورہ کے بارے میں کچھ عجیب روایات نظر آتی ہیں، ایک حدیث انس سے مروی ہے، وہ کہتا ہے، "جب ہم حدیبیہ" سے واپس آ رہے تھے، درحالیکہ مشرکین نے نہ تو ہمیں مکہ میں داخل ہونے دیا تھا اور نہ ہی عمرہ کرنے دیا تھا، تو ہم انتہائی غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے تھے، کہ اچانک خدا نے آیہ

”اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا“ نازل فرمائی۔

پیغمبر اکرم نے فرمایا۔ ”لقد انزلت علی ایتہی احب الی من الدنیا کتھا“ مجھ پر ایک آیت نازل ہوئی ہے، جو مجھے تمام دنیا سے زیادہ محبوب ہے“ (بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک سورہ مجھ پر نازل ہوا ہے...)، ”عبداللہ بن مسعود“ کہتا ہے: ”حدیثیکہ واپسی کے موقع پر جب پیغمبر پر ”اِنَّا فَتَحْنَا...“ نازل ہوئی تو آپ اس قدر خوش ہوئے کہ خدا ہی جانتا ہے۔“

ایک دوسری حدیث میں پیغمبر سے منقول ہوا ہے۔

من قرأھا فکانھا شہد مع محمد من فتح مکہ، وفي رواية اخرى

فکانما کان مع من بايع محمدًا تحت الشجرة“

”جو شخص اس سورہ کو پڑھے وہ اس شخص کے مانند ہے جو فتح مکہ کے موقع پر پیغمبر کے ساتھ ادران کے

شکر میں تھا، اور دوسری روایت میں یہ آیا ہے، کہ وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے اس درخت کے نیچے جو حدیبیہ میں تھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔“

اور آخر میں ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے یہ منقول ہے۔

حسبوا اموالکم ونساءکم وما ملککم ایمانکم من التلف

بقراءة ”اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ“ فبانه اذا کان ممن ید من قرائتها نادى

مناد یوم القیامة حتى یسمع الخلائق، انت من عبادى المخلصین

الحقوه بالصالحین من عبادى، وادخلوه جنات النعیم

واسقوه من ریحق مختوم بمزاج الکافور!“

”اپنے مالوں، عورتوں، اور جو کچھ تمہاری ملک میں ہے، اُسے اِنَّا فَتَحْنَا کی قرأت سے محفوظ کر

لو، جو شخص مسلسل اس کی تلاوت کرے تو قیامت کے دن ایک منادی اس طرح ندا کرے گا کہ اُسے تمام

مخلوق سنے گی؛ یہ میرے مخلص بندوں میں سے ہے، اسے میرے صالح بندوں کے ساتھ ملا دو، اور بہشت

کے نعمتوں بھرے باغات میں اسے داخل کر دو اور بہشتوں کے مخصوص مشروب سے اُسے سیراب

کر دو۔“

۱۸ ”مجمع البیان“ جلد ۹ صفحہ ۱۸

۱۹ ”مجمع البیان“ جلد ۹ صفحہ ۱۹

۲۰ ”مجمع البیان“ جلد ۹ صفحہ ۱۸

۲۱ نور الثقلین جلد ۹ صفحہ ۴۶ بحوالہ ثواب الاعمال۔

یہ بات کہے بغیر ظاہر ہے کہ یہ سب فضیلت و افتخار، غرور و فخر اور عمل سے خالی تلاوت سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ تلاوت کا اصل مقصد اپنے عادات و اخلاق و اعمال کو ان آیات کے مفاد کے مطابق ڈھالنا ہے۔

سُورَةُ فَتْحٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
۱- اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱- ہم نے تیرے لیے واضح کامیابی فراہم کر دی ہے۔

تفسیر

فتح المبین

اس سورہ کی پہلی آیت میں پیغمبرؐ کو ایک عظیم بشارت دی گئی ہے، ایسی بشارت جو بعض روایات کے مطابق پیغمبر کے نزدیک تمام دنیا سے زیادہ محبوب تھی۔ فرماتا ہے: ”ہم نے تجھے آشکار اور نمایاں فتح دی“ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا۔

ایسی نمایاں کامیابی، جس کے آثار اسلام کی پیش رفت، اور مسلمانوں کی زندگی میں، مختصر سے عرصہ میں ظاہر ہو گئے اور طویل مدت تک ظاہر ہوتے رہیں گے، ایسی فتح جو طول تاریخ اسلام میں کم مثال یا بے نظیر تھی۔
یہاں مفسرین کے درمیان ایک عظیم بحث ہوئی ہے کہ اس فتح سے مراد کونسی فتح ہے؟
اکثر مفسرین اس کو اس عظیم کامیابی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو ”صلح حدیبیہ“ سے مسلمانوں کو نصیب

ہوئی۔

ایک جماعت نے اسے "فتح مکہ" کے مسئلہ کی طرف بھی اشارہ سمجھا ہے۔ اور بعض دوسروں نے اس سے "فتح خیبر" مراد لی ہے۔

اور بعض نے قدرت منطوق، دلائل کی برتری اور آشکار معجزات کے طریقہ سے تمام دشمنوں پر اسلام کی کامیابی سمجھا ہے۔ آخر میں بعض اس کو پیغمبر کے لیے اسرار علوم کے کھلنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس بہت زیادہ قرائن موجود ہیں جو صلح حدیبیہ کے مسئلہ کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن ان آیات کی تفسیر کے واضح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر چیز سے پہلے یہاں مختصر ا حدیبیہ کی داستان پیش کریں، جو ان کی شان نزول ہے۔

داستان صلح حدیبیہ

چھٹی ہجری کے ماہ ذی قعدہ میں پیغمبر اکرمؐ عمرہ کے قصد سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے، اور تمام مسلمانوں کو اس سفر میں شرکت کا شوق دلایا، اگرچہ ایک گروہ کنارہ کش ہو گیا، مگر مہاجرین و انصار اور بادینہ شین اعراب کی ایک کثیر جماعت آپ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ یہ جمعیت جو تقریباً ایک ہزار چار سو افراد پر مشتمل تھی، سب کے سب نے لباس احرام پہنا ہوا تھا، اور تلوار کے علاوہ جو مسافروں کا اسلحہ شمار ہوتی تھی، کوئی جنگی ہتھیار اپنے ساتھ نہ لیا تھا۔

جب پیغمبر مکہ کے نزدیکی مقام "عسفان" پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ قریش نے بیخستہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے، یہاں تک کہ پیغمبر "حدیبیہ" میں پہنچ گئے (حدیبیہ مکہ سے بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بستی ہے، جو ایک کنویں یا درخت کی مناسبت سے اس نام سے موسوم تھی) حضرت نے فرمایا کہ تم سب اسی جگہ ٹک جاؤ، لوگوں نے عرض کیا کہ یہاں تو کوئی پانی نہیں ہے، پیغمبر نے معجزانہ طور پر اس کنویں سے جو وہاں تھا، اپنے اصحاب کے لیے پانی فراہم کیا۔

اسی مقام پر قریش اور پیغمبر کے درمیان سفراء آتے جاتے رہے تاکہ کسی طرح سے مشکل حل ہو جائے، آخر کار "عردہ بن مسعود ثقفی" جو ایک ہوشیار آدمی تھا، قریش کی طرف سے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا، پیغمبر نے فرمایا میں جنگ کے ارادہ سے نہیں آیا اور میرا مقصد صرف خانہ خدا کی زیارت ہے، ضمناً عوہ نے اس ملاقات میں پیغمبر کے وضو کرنے کا منظر بھی دیکھا، کہ صحابہ آپ کے وضو کے پانی کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے، جب وہ واپس لوٹا تو اس نے قریش سے کہا: میں قیصر و کسری اور نجاشی کے دربار میں گیا ہوں۔ میں نے کسی سربراہ مملکت کو اس کی قوم کے درمیان اتنا با عظمت نہیں دیکھا، بتنا محمدؐ کی عظمت کو ان کے اصحاب میں دیکھا ہے۔ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ محمدؐ کو چھوڑ جائیں گے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوگی، دیکھ لو تمہارا مقابلہ ایسے ایشاکر نے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ تمہارے لیے

سے یہ تفسیر ابوالفتح رازی نے، اور آلوسی نے روح المعانی میں، علامہ طیبانی نے المیزان میں، فی ظلال کے مؤلف نے اپنی تفسیر میں، اور فیض کاشانی نے صافی میں افیاء کی ہے، جبکہ تفسیر تبسیان، کشاف، فخر رازی اور بعض دوسرے علماء نے دوسری تفسیر دفع مکہ کو ترجیح دی ہے، مرحوم طبری نے مجمع البیان میں دونوں قول دوسرے اقوال کے ساتھ شمار کیے ہیں، لیکن فتح مکہ کو پہلا قول ذکر کیا ہے، جس کی ترجیح ان کی نظر میں ہے۔

غور و فکر کا مقام ہے۔

اسی دوران پیغمبر نے عمر سے فرمایا کہ وہ مکہ جائیں، اور اشراف قریش کو اس سفر کے مقصد سے آگاہ کریں، عمر نے کہا کہ قریش مجھ سے شدید دشمنی رکھتے ہیں، لہذا مجھ ان سے خطرہ ہے، بہتر یہ ہے کہ عثمان کو اس کام کے لیے بھیجا جائے، عثمان مکہ کی طرف آئے، تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ مسلمانوں کے درمیان یہ افواہ پھیل گئی کہ ان کو قتل کر دیا ہے۔ اس موقع پر پیغمبر نے شدت عمل کا ارادہ کیا اور ایک درخت کے نیچے جو وہاں پر موجود تھا، اپنے اصحاب سے بیعت لی، جو ”بیعت رضوان“ کے نام سے مشہور ہوئی، اور ان کے ساتھ عہد و پیمانہ کیا کہ آخری سال تک ڈٹیں گے، لیکن تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ عثمان صحیح و سالم واپس لوٹ آئے اور ان کے پیچھے پیچھے قریش نے ”سیل بن عمر“ کو مصالحت کے لیے پیغمبر کی خدمت میں بھیجا، لیکن تاکید کی کہ اس سال کسی طرح بھی آپ کا مکہ میں ورود ممکن نہیں ہے۔

بہت زیادہ بحث و گفتگو کے بعد صلح کا عہد و پیمانہ ہوا، جس کی ایک شق یہ تھی کہ مسلمان اس سال عمرہ سے باز رہیں اور اور آئندہ سال مکہ میں آئیں، اس شرط کے ساتھ کہ تین دن سے زیادہ مکہ میں نہ رہیں، اور مسافرت کے عام ہتھیار کے علاوہ اور کوئی اسلحہ اپنے ساتھ نہ لائیں، اور دوسرے متعدد مواد جن کا دار و مدار ان مسلمانوں کی جان و مال کی امانیت پر تھا، جو مدینہ سے مکہ میں وارد ہوں اور اسی طرح مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دس سال جنگ نہ کرنے اور مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے مذہبی فرائض کی انجام دہی بھی اس میں شامل کی گئی تھی۔

یہ پیمانہ حقیقت میں ہر جہت سے ایک عدم تعرض کا عہد و پیمانہ تھا، جس نے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مسلسل اور بار بار کی جنگوں کو وقتی طور پر ختم کر دیا۔

”صلح کے عہد و پیمانہ کا متن“ اس طرح تھا کہ پیغمبر نے علیؑ کو حکم دیا کہ لکھو:

”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“: سیل بن عمرو نے، جو مشرکین کا نمائندہ تھا، کہا: میں اس قسم کے جملے سے

آشنا نہیں ہوں، لہذا، بِسْمِکَ اللّٰہِ لکھو!

پیغمبر نے فرمایا: لکھو: بِسْمِکَ اللّٰہِ“

اس کے بعد فرمایا: لکھو! یہ وہ چیز ہے جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیل بن عمرو سے مصالحت کی ”سہل“ نے کہا: ہم اگر آپ کو رسول اللہ سمجھتے تو آپ سے جنگ نہ کرتے، صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھیے، پیغمبر نے فرمایا کوئی حرج نہیں لکھو، یہ وہ چیز ہے جس پر محمد بن عبد اللہ نے سہل بن عمرو سے صلح کی، کہ دس سال تک دونوں طرف سے جنگ متروک ہے گی تاکہ لوگوں کو امن و امان کی صورت دوبارہ میسر آئے۔

علاوہ ازیں جو شخص قریش میں سے اپنے دلی کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے اور مسلمان ہو جائے، اسے واپس کر دیں اور جو شخص ان افراد میں سے جو محمدؐ کے پاس ہیں، قریش کی طرف پلٹ جائے تو اس کو واپس لوٹانا ضروری نہیں ہے۔

تمام لوگ آزاد ہیں جو چاہے محمدؐ کے عہد و پیمانہ میں داخل ہو اور جو چاہے قریش کے عہد و پیمانہ میں داخل ہو، طرفین اس بات کے پابند ہیں کہ ایک دوسرے سے خیانت نہ کریں اور ایک دوسرے کی جان و مال کو محترم

شمار کریں۔

اس کے علاوہ محمد اس سال واپس چلے جائیں اور مکہ میں داخل نہ ہوں، لیکن آئینہ سال ہم تین دن کے لیے مکہ سے باہر چلے جائیں گے اور ان کے اصحاب آجائیں، لیکن تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں، (اور مراسم عمرہ کو انجام دے کر واپس چلے جائیں) اس شرط کے ساتھ کہ سوائے مسافر کے ہتھیار یعنی تلوار کے۔ وہ بھی خلاف میں۔ کوئی اور ہتھیار ساتھ نہ لائیں۔ اس پیمان پر مسلمانوں اور مشرکین کے ایک گروہ نے گواہی دی اور اس عہد نامہ کے کاتب علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے یہ

مرحوم "علاء مجلسی" نے بحار الانوار میں کچھ اور امور بھی نقل کیے ہیں، مگر ان کے یہ کہ:

"اسلام مکہ میں آشکارا ہوگا اور کسی کو کسی مذہب کے انتخاب کرنے پر مجبور نہیں کریں گے، اور مسلمانوں کو اذیت و آزار نہیں پہنچائیں گے"۔

اس موقع پر پیغمبر نے حکم دیا کہ قربانی کے وہ اونٹ جو وہ اپنے ہمراہ لاتے تھے، اسی جگہ قربان کر دیں، اور اپنے سروں کو منڈوائیں اور احرام سے باہر نکل آئیں، لیکن یہ بات کچھ مسلمانوں کو سخت ناگوار معلوم ہوئی، کیونکہ عمرہ کے مناسک کی انجام دہی کے بغیر ان کی نظر میں احرام سے باہر نکل آنا ممکن نہیں تھا، لیکن پیغمبر نے ذاتی طور پر خود پیش قدمی کی اور قربانی کے اونٹوں کو کھرا اور احرام اتارنے سے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ یہ احرام و قربانی کے قانون میں ایک استثناء ہے جو خدا کی طرف سے قرار دیا گیا ہے۔

مسلمانوں نے جب یہ دیکھا تو تسلیم خم کر دیا، اور پیغمبر کا حکم کامل طور سے مان لیا، اور وہیں سے مدینہ کی راہ لی، لیکن غم و اندوہ کا ایک پہاڑ ان کے دلوں پر بوجھ ڈال رہا تھا، کیونکہ ظاہر میں یہ سارے کا سارا سفر ایک ناکامی اور شکست تھی، لیکن انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ صلح حدیبیہ کی داستان کے پیچھے مسلمانوں اور اسلام کے لیے کتنی کامیابیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اسی وقت سورہ فتح نازل ہوئی اور پیغمبر گرامی اسلام کو فتح عظیم کی بشارت ملی، اے

صلح حدیبیہ کے سیاسی اجتماعی اور مذہبی نتائج

ہجرت کے چھٹے سال صلح حدیبیہ کے وقت، مسلمانوں کی حالت میں اور دو سال بعد کی حالت میں فرق نمایاں تھا جب وہ دس ہزار کے مسلح لشکر کے ساتھ فتح مکہ کے لیے چلے تاکہ مشرکین کو پیمان شکنی کا داندان شکن جواب دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے فوجوں کی معمولی سی جھڑپ کے بغیر ہی مکہ کو فتح کر لیا، اس وقت قریش اپنے اندر مقابلہ کرنے کی معمولی

۱۔ تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۸۱ (کچھ تخفیف کے ساتھ) بحار الانوار جلد ۲۰ ص ۳۵۲۔

۲۔ سیرۃ ابن ہشام: ج ۳ ص ۳۲۱-۳۲۲، "تفسیر مجمع البیان"، "تفسیر فی ظلال" کا ل ابن اثیر جلد ۲ اور دوسرے مرتب بہت زیادہ تخفیف کے ساتھ۔

سی قدرت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک اجمالی موازنہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ "صلح حدیبیہ" کا عکس العمل کس قدر وسیع تھا۔

خلاصہ کے طور پر مسلمانوں نے اس صلح سے چند امتیاز اور اہم کامیابیاں حاصل کیں، جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

① عملی طور پر مکہ کے فریب خوردہ لوگوں کو یہ بتا دیا کہ وہ جنگ و جدال کا ارادہ نہیں رکھتے، اور مکہ کے مقدس شہر اور خانہ خدا کے لیے بہت زیادہ احترام کے قائل ہیں، یہی بات ایک کثیر جماعت کے دلوں کے لیے اسلام کی طرف کشش کا سبب بن گئی۔

② قریش نے پہلے مرتبہ اسلام اور مسلمانوں کو رسمی طور پر تسلیم کیا، یہی وہ چیز تھی جو جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی حیثیت کو ثابت کرنے کی دلیل بنی۔

③ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان بحون و اطمینان کے ساتھ ہر جگہ آجاسکتے تھے اور ان کا جان و مال محفوظ ہو گیا تھا، اور عملی طور پر مشرکین کے ساتھ قریبی تعلق اور میل جول پیدا ہوا، ایسے تعلقات جس کے نتیجے میں مشرکین کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ پہچان کے ساتھ ان کی توجہ اسلام کی طرف مائل ہوئی۔

④ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے سارے جزیرۃ العرب میں راستہ کھل گیا، اور پیغمبر کی صلح طلبی کی شہرت نے مختلف اقوام کو جو پیغمبر کی ذات اور اسلام کے متعلق غلط نظریہ رکھتے تھے۔ تجدید نظر پر آمادہ کیا، اور تبلیغاتی نقطہ نظر سے بہت سے وسیع امکانات و وسائل مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

⑤ صلح حدیبیہ نے خیبر کو فتح کرنے اور یہودیوں کے اس سرطانی غزہ کو نکال پھینکنے کے لیے، جو بالفعل اور بالقوتہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک اہم خطرہ تھا۔ راستہ ہموار کر دیا۔

⑥ اصولی طور پر پیغمبر کی ایک ہزار چار سو افراد کی فوج سے ٹکرائے سے قریش کی وحشت۔ جن کے پاس کسی قسم کے اہم جنگی ہتھیار بھی نہیں تھے۔ اور شرائط صلح کو قبول کر لینا، اسلام کے طرفداروں کے دلوں کی تقویت، اور مخالفین کی شکست کے لیے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو ستایا تھا خود ایک اہم عامل تھا۔

⑦ واقعہ حدیبیہ کے بعد پیغمبر نے بڑے بڑے ملکوں، ایران و روم و حبشہ کے سربراہوں، اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو متعدد خطوط لکھے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دی اور یہ چیز اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صلح حدیبیہ نے مسلمانوں میں کس قدر خود اعتمادی پیدا کر دی تھی، کہ نہ صرف جزیرہ عرب میں، بلکہ اس زمانہ کی بڑی دنیا میں ان کی راہ کو کھول دیا۔

اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بخوبی معلوم کیا جاسکتا ہے، کہ وائد ا صلح حدیبیہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم فتح اور کامیابی تھی، اور یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ قرآن مجید سے فتح مبین کے عنوان سے یاد کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے قرائن ہمارے پاس ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

① "فتحنا" کا جملہ فعل ماضی کی صورت میں ہے، یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ امر ان آیات کے نزول کے وقت پورا ہو چکا تھا، جبکہ اس وقت صلح حدیبیہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوئی تھی۔

(۲) ان آیات کے نزول کا زمانہ جس کی طرف اور اشارہ ہو چکا ہے، اور اس سورہ کی دوسری آیات، صلیح حدیبیہ کے سلسلہ میں مومنین کی مدح اور منافقین و مشرکین کی مذمت کر رہی ہیں، اس مطلب کے لیے ایک دوسری تائید ہے۔

اس سورہ کی آیت ۲۴ جو پیغمبر کے رؤیائے صادقہ سے خواب کی تائید کر رہی ہے، وہ یہ کہتی ہے: "یقیناً تم عنقریب مسجد الحرام میں انتہائی امن و سکون کے ساتھ داخل ہو گے اور آخر تک عمرہ بجالاؤ گے" یہ اس بات کی ایک شاہد ہے کہ یہ سورہ اور اس کا مضمون حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے کا تھا۔

(۳) بہت سی روایات میں "صلح حدیبیہ" کا فتح "ببین" کے عنوان سے تعارف ہوا ہے، منجملہ ان کے یہ ہے: تفسیر "جوامع الجوامع" میں آیا ہے کہ جس وقت پیغمبر حدیبیہ سے واپس لوٹے (اور سورہ فتح نازل ہوئی) تو ایک صحابی نے عرض کیا:

"ما هذا الفتح لقد صدنا عن البيت وصد هدينا"

"یہ کیا فتح ہے کہ ہمیں خانہ خدا کی زیارت سے بھی روک دیا ہے اور ہماری قربانی میں بھی رکاوٹ

ڈال دی؟"

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بئس الکلام هذا، بل هو اعظم الفتوح، قد رضی المشرکون ان یدفوکم عن بلادهم بالراع، ویسئلوکم القضیة، وریغبوا الیکم فی الامان وقد رأوا منکم ما کرهوا!"

"تو نے بہت بُری بات کہی ہے، بلکہ یہ تو ہماری عظیم ترین فتح ہے کہ مشرکین اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ تمہیں خشونت آمیز طریقہ سے ٹکریے بغیر اپنی سرزمین سے دُور کریں، اور تمہارے سامنے صلح کی پیش کش کریں اور ان تمام تکالیف اور رنج و غم کے باوجود جو تمہاری طرف سے انہوں نے اٹھائے ہیں، ترک تعرض کے لیے تمہاری طرف مائل ہوئے ہیں"۔

اس کے بعد پیغمبر نے وہ تکالیف جو انہوں نے بدر و احزاب میں جھیلی تھیں انہیں یاد دلایں، تو مسلمانوں نے تصدیق کی یہ سب سے بڑی فتح تھی اور انہوں نے لاعلمی کی بنا پر یہ فیصلہ کیا تھا۔

"زہری" جو ایک مشہور تابعی ہے، کہتا ہے: کوئی بھی فتح "صلح حدیبیہ" سے زیادہ عظیم نہیں تھی، کیونکہ مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ انتہا اور تعلق پیدا کیا، اور اسلام ان کے دلوں میں جا لگزیں ہوا، اور تین ہی سال کے عرصہ میں ایک عظیم گروہ اسلام لے آیا اور مسلمانوں میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا۔

۱۔ جوامع الجوامع (ذرا تعلیل جلد ۵ صفحہ ۴۸۰۔ حدیث ۹ کے مطابق)

۲۔ "تفسیر ذرا المنثور" جلد ۲ صفحہ ۶۸۔

۳۔ "مذکورہ درک صفحہ ۱۰۹۔"

ان احادیث میں، ان امتیازات کے ایک گوشہ کی طرف، جو صلح حدیبیہ کی برکت سے مسلمانوں کو نصیب ہوئے اثناء ہوا ہے۔

صرف ایک ہی حدیث میں امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ سے آیا ہے کہ "اتنا فتحنا" "فتح مکہ" کے بعد نازل ہوئی۔ لہٰذا لیکن چونکہ "صلح حدیبیہ" دو سال بعد مکہ کی فتح کے لیے ایک مقدمہ اور تہیہ تھی لہٰذا اس حدیث کی توجیہ میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔

یاد دہرے لفظوں میں صلح حدیبیہ مختصر سی مدت میں فتح خیبر کا سبب بنی جو ہجرت کے ساتویں سال ہوئی، اور اس سے تھوڑا سا آگے فتح مکہ کا سبب بنی، اور دنیا کے تمام علاقوں میں لوگوں کے دلوں میں نفوذ کرنے کے لحاظ سے اسلام کی کامیابی کا سبب ہوئی۔ گویا اس طرح سے چاروں تفاسیر کو جمع کیا جاسکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ ان سب کا محور اصلی "صلح حدیبیہ" ہی کو قرار دیا جائے۔

۲۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ
وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا
مُسْتَقِيمًا ۝

۳۔ وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝

ترجمہ

- ۲۔ مقصد یہ تھا کہ خدا تیرے گزشتہ اور آئندہ کے وہ گناہ جن کی وہ تیری طرف نسبت دیتے تھے، بخش دے، اور تجھ پر اپنی نعمت کو تمام کر دے، اور تجھے راہ راست کی طرف ہدایت کرے۔
- ۳۔ اور شکست ناپذیر کامیابی کو تیرے نصیب کرے۔

تفسیر فتح مبین کے عظیم نتائج

ان دو آیات میں "فتح مبین" (صلح حدیبیہ) جو گذشتہ آیت میں بیان ہوئی تھی، کے پُر برکت نتائج کے ایک حصہ کی تشریح ہوئی ہے، فرماتا ہے: مقصد یہ تھا کہ خدا تیرے پہلے اور بعد کے گناہ بخش دے۔ اور اپنی نعمت کو تجھ پر تمام کر دے اور تجھے راہ راست کی ہدایت کرے: "لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا)۔"

"اور تجھے شکست ناپذیر فتح تک پہنچائے: (وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا)

اور اس طرح سے خدا نے اپنے پیغمبر کو فتح مبین کے سائے میں چار عظیم نعمتیں عطا فرمائیں: مغفرت، تکمیل نعمت، ہدایت و نصرت۔

چند نکات

① چند اہم سوالات کے جواب

یہاں بہت سے سوالات پیش ہوئے ہیں اور قدیم ترین زمانہ سے لے کر اب تک مفسرین ان سوالات کے جواب دے رہے ہیں۔
خصوصاً پہلی خدائی نعمت "یعنی گذشتہ اور آئندہ کے گناہوں کی مغفرت" کے بارے میں ذیل کے تین سوال پیش ہوئے ہیں۔

① جب کہ پیغمبر مقام عصمت کی بنا پر ہر گناہ سے پاک ہیں تو پھر اس جملہ سے کیا مراد ہے؟
② بالفرض اگر ہم اس اعتراض سے صرف نظر بھی کر لیں تو "فتح حدیبیہ" اور گناہوں کی آمرزش کے درمیان کون سا ربط ہے۔

③ اگر "مات آخراً" سے مراد آئندہ کے گناہ ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو گناہ ابھی واقع ہی نہیں ہوئے معاف کیا جائے؟ کیا یہ آئندہ کے لیے ارتکاب گناہ کی اجازت نہیں ہے؟
مفسرین میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی صورت میں ان اعتراضات کا جواب دیا ہے، لیکن جامع ترین جواب اور ان آیات کی دقیق تفسیر کی تک پہنچنے کے لیے ایک بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔
اور وہ اہم بات یہ ہے کہ ہم "فتح حدیبیہ" کا آمرزش گناہ، کے مسئلہ کے ساتھ ربط معلوم کریں، کیونکہ اوپر کے تینوں سوالات کے اصل جواب کی چابی اسی میں چھپی ہوئی ہے۔

تاریخی واقعات اور حوادث پر غور و فکر کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ، جس وقت کوئی سچا مذہب یا مکتب خیال ظاہر ہوتا ہے، اور وہ قائم ہونے کی کوشش کرتا ہے، تو بے ہودہ رسم و رواج کے دنا دار۔ جو اپنے وجود کو خطے میں پاتے ہیں۔ ہر قسم کی تہمت اور ناروا نسبت اس کے سر تھوپتے ہیں، انواہیں پھیلاتے ہیں، جھوٹی باتیں کرتے ہیں اس کے مختلف نقص گنواتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ دیکھیں اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

اگر یہ مکتب اپنی پیش رفت کی راہ میں شکت سے دوچار ہو جائے، تو مخالفین کے ہاتھ میں ناروا نسبتوں کی ایک حکم دستاویز آجاتی ہے، اور وہ چینی چلانے لگتے ہیں۔ ہم نے کہا نہیں تھا کہ اس طرح ہے، ہم کہتے نہیں تھے کہ یہ بات ہے؟ لیکن جب وہ کامیابی سے ہم کنار ہو جائے، اور اپنے پروگراموں کو کٹھن آزمائشوں سے گزرتے ہوئے پورا کر لے، تو تمام ناروا نسبتیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور تمام اس طرح کے فقرے "ہم نے نہیں کہا تھا؟" افسوس و ندامت میں بدل جاتے

ہیں، اور اس کی جگہ ”ہم نہیں جانتے تھے، ہمیں معلوم نہیں تھا۔“ جیسے فقرے آجاتے ہیں۔
 خصوصاً پیغمبر اسلام کے بارے میں یہ ناراضگیاں اور خیالی گناہ بہت زیادہ تھے، آپ کو جنگ طلب، آگ بھڑکانے والا، سچے رسم و رواج کی پرواہ نہ کرنے والا، انہام و تفہیم کے ناقابل، اور اسی قسم کی دوسری باتوں کا مرتکب سمجھتے تھے۔
 صلح حدیبیہ نے اچھی طرح سے نشاندہی کر دی کہ آپ کا دین۔ دشمنوں کے خیال کے برخلاف۔ ایک ترقی کرنے والا اور خدائی دین ہے، اور آپ کے قرآن کی آیات انسانوں کے نفوس کی تربیت کی ضامن، اور ظلم و ستم اور جنگ و خونریزی کو ختم کرنے والی ہیں۔

وہ خائف خدا کا احترام کرتے ہیں، بلا و سبکی قوم و قبیلہ پر حملہ نہیں کرتے، دلیل کے ساتھ چچی تلی بات کرتے ہیں، ان کے پیروکار ان کے عاشق ہیں، وہ واقفانہ تمام انسانوں کو ان کے محبوب اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اگر اس کے دشمن جنگ کو اس کے اوپر سوار ہی نہ کر دیں، تو وہ صلح اور امن و سلامتی کے طالب ہیں۔

اس طرح سے صلح حدیبیہ نے، وہ تمام الزام جن کی ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد زیادہ تہمتیں جن کی اس ماجرے سے پہلے یہاں تک کہ وہ گناہ بھی جن کے آپ کی طرف آیتہ نسبت دینے کا امکان تھا، ان سب کو دھو دیا۔ اور چونکہ خدا نے پیغمبر کو یہ کامیابی نصیب فرمائی، لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا نے ان سب کو دھو دیا۔
 نتیجہ اس کا یہ ہے کہ یہ الزامات واقعی الزام نہیں تھے، بلکہ ایسے الزام تھے جو خیالی لوگوں کے افکار میں تھے، جنہیں انھوں نے باور کر لیا تھا، جیسا کہ سورہ شعراء کی آیت ۴۲ میں موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں بیان ہوا ہے کہ موسیٰ نے بارگاہ خدا میں عرض کیا۔

ولہم علی ذنب فاخاف ان یقتلون: فرعونوں کا میسر اور پراہیک گناہ ہے، میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے اس گناہ کے جرم میں قتل کر دیں گے ”حالانکہ آپ کا گناہ نبی اسرائیل کے ایک مظلوم آدمی کی مدد کرنے اور فرعونوں میں سے ایک ستمگر کی سرکوبی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔“

یہ بات واضح ہے کہ یہ نہ صرف گناہ نہیں تھا، بلکہ مظلوم کی حمایت تھی، لیکن فرعونوں کی نظر میں وہ گناہ شمار ہوتا تھا۔
 دوسرے لفظوں میں ”ذنب“ لغت میں کسی کام کے بڑے آثار اور اس کے نتیجے آنے والے نتائج کے معنی میں ہے،
 ظہور اسلام نے آغاز میں مشرکین کی زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ لیکن بعد کی کامیابیاں اس بات کا سبب بن گئیں کہ وہ نتائج فراموشی کے سپرد کر دیئے جائیں۔

اگر لوگ ہمارے پرانے اور فرسودہ گھر کو جو اس وقت ہماری پناہ گاہ کا کام دیتا ہے اور ہم اس سے دل بستگی رکھتے ہیں خراب کر دیں، تو ممکن ہے کہ ہم اس کام کو ان کی خطا اور غلطی کہیں اور اسے ان کا ایک گناہ سمجھیں، لیکن جب ایک محکم اور آراستہ عمارت اس کی جگہ بنا دی جاسے اور ہماری تمام پریشانیوں دور کر دی جائیں، تو پھر ہمارا فیصلہ کلی طور پر بدل جائے گا۔

مشرکین مکہ ہجرت سے پہلے بھی اور ہجرت کے بعد بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں غلط قسم کے خیالات و

تصویرات رکھتے تھے، بعد والی کامیابیوں نے ان سب پر خط بطلان کھینچ دیا۔

ہاں! اگر ہم ان گناہوں کی آزمائش کا فتح حدیبیہ کے ساتھ تعلق نظر میں رکھیں تو مطلب مکمل طور پر واضح ہو جائے گا۔ وہ رابطہ جو "لیغضرتک اللہ" کی "لام" سے معلوم ہوتا ہے اور آیت کے معنی کھولنے کے لیے کلید رمز ہے۔

لیکن جنہوں نے اس نکتہ کی طرف توجہ نہیں کی وہ یہاں پیغمبر کے مقام عصمت کو زیر سوال لے آتے ہیں۔ اور آپ کے لیے (غور باللہ) گناہوں کے قائل ہوئے ہیں۔ جنہیں خدا نے فتح حدیبیہ کے سائے میں بخش دیا ہے یا پھر آیت کا ظاہر کے برخلاف معنی کیا ہے۔

ان میں سے بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد گناہ ہی ہیں۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہیں جن کے لوگ پیغمبر کے بائے میں مرتکب ہوئے تھے، مثلاً اذیت اور تکلیفیں جو صلح حدیبیہ کے بعد ختم ہو گئیں (اس صورت میں ذنب کی مفعول کی طرف اضافت ہوئی نہ کہ فاعل کی طرف) اور یا اُسے ترک اولیٰ کے معنی میں لیا ہے۔

یا فرضی گناہوں کے معنی سے تفسیر کیا ہے کہ فرض کر دیا کہ تو آئینہ یا گذشتہ زمانے میں گناہ کا مرتکب ہوا ہوتا تو ہم اُسے بخش دیتے۔

لیکن واضح ہے کہ یہ تکلفات ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم انبیاء کی عصمت کو مخدوش کر دیں تو ان کا فلسفہ وجود ہی ختم ہو جائے گا، کیونکہ پیغمبر کو ہر چیز میں نمونہ ہونا چاہیے، ایک گناہگار شخص اس مثال کو کیسے پورا کر سکتا ہے۔

علاوہ ازیں وہ خود ایک رہبر و رہنما کا محتاج ہوگا جو اُسے ہدایت کرے۔

اور بہت سی دوسری تفسیریں بھی ہیں، جو ظاہر کے خلاف ہیں، اور ان میں اہم اشکال یہ ہیں، کہ وہ آزمائش گناہ کا ارتباب صلح حدیبیہ کے مسئلہ سے منقطع کر دیتی ہیں،

بہترین تفسیر وہی ہے جس کی طرف اُدرا اشارہ ہوا ہے، جو تینوں سوالات کا یکجا جواب دیتی ہے۔ اور آیت کے جملوں کے ارتباب کو مشخص کرتی ہے۔

یہ سب بحث تو ان چاروں نعمتوں میں سے پہلی نعمت کے بائے میں ہے، جو خدا نے "صلح حدیبیہ" کے سائے میں پیغمبر کو دی تھیں۔

اب باقی رہ گیا پروردگار کی نعمت کی تکمیل، صاف اور مستقیم راستے کی طرف ہدایت، اور شکست ناپذیر خدائی نصرت، تو حدیبیہ کی کامیابی کے بعد یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو کسی پر مغنی رہی ہو، اسلام نے تیزی کے ساتھ وسعت پیدا کی، آمادہ دلوں کو تسخیر کیا، اس کی تعلیمات کی عظمت سب پر آشکار ہوئی، زہریلے پردے پر سپی گندوں کو ناکارہ کر دیا اور خدا کی نعمت کو کامل کر دیا، اور عظیم کامیابیوں کی طرف راہ مستقیم کو اس طرح سے ہموار کیا، کہ فتح مکہ کے واقعہ میں شکر اسلام نے بغیر کسی مذاحمت کے دشمن کا اہم ترین قلعہ فتح کر لیا۔

۲) "ما تقدم" اور "ما تأخر" سے کیا مراد ہے؟

زیر بحث آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ خدا فرماتا ہے: فتح مبین کے سایے میں تیسرے پہلے گناہ بھی اور آئینہ کے گناہ بھی بخش دیئے ہیں، اس بارے میں کہ مقدم اور متأخر (پہلے اور آئینہ کے) سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے "ما تقدم" کو آدم و حوا کے عصیان اور ترکِ ادلیٰ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور "ما تأخر" کو امت کے گناہوں کی طرف۔

بعض دوسروں نے "ما تقدم" کو نبوت سے قبل کے مسائل سے مراد لیا ہے اور "ما تأخر" کو نبوت سے بعد کے ساتھ مربوط سمجھا ہے بعض نے "ما تقدم" کو ان گناہوں سے جو صلح حدیبیہ سے پہلے ہوئے تھے، اور "ما تأخر" کو ان سے جو صلح کے بعد ہوئے، مربوط سمجھا ہے۔ لیکن اس تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جوہم نے آیت کے اصل معنی کے بارے میں خاص طور پر صلح حدیبیہ کے مسئلہ کے ربط میں بیان کی ہے، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام ناروا نسبتیں اور گناہ ہیں جو وہ اپنے گمان کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف گزشتہ زمانے میں منسوب کرتے رہے تھے یا آئینہ کرتے، اور اگر عظیم کامیابی نصیب نہ ہوئی ہوتی تو وہ ان تمام گناہوں کو قطعی و یقینی خیال کر لیتے، لیکن اس کامیابی کے حصول کے ساتھ گزشتہ ناروا نسبتیں بھی ختم ہو گئیں، اور وہ بھی جن کے بارے میں ممکن تھا کہ آئینہ نسبت دیتے۔

اس تفسیر کا ایک دوسرا شاہد وہ روایت ہے، جو امام علی ابن موسی الرضا سے منقول ہوئی ہے کہ مامون نے جس وقت اس آیت کے متعلق سوال کیا تو امام نے جواب میں فرمایا:

"مشرکین مکہ کے نزدیک کسی شخص کا گناہ رسول اللہ سے زیادہ سنگین نہیں تھا، کیونکہ وہ ۳۰ ہتوں کی پرستش کیا کرتے تھے جس وقت پیغمبر نے انھیں توحید کی طرف دعوت دی تو ان پر ہیبت گراں گزرا، اور انھوں نے کہا: کیا اس نے ہمارے سب خداؤں کو ایک خدا میں تبدیل کر دیا ہے؟ یہ تو ایک عجیب بات ہے۔۔۔۔۔ ہم نے ہرگز اس قسم کی کوئی بات اپنے آباؤ اجداد سے نہیں سنی، یہ تو ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔"

لیکن جس وقت خدا نے صلح حدیبیہ کے بعد، اپنے پیغمبر کے لیے مکہ فتح کر دیا، تو خدا نے فرمایا، اے محمد! تم نے تیرے لیے فتح میں فراہم کی ہے تاکہ توحید کی طرف دعوت دینے کی بنا پر مشرکین عرب کے نزدیک جتنے گناہ تو نے پہلے کیے تھے یا آئینہ کر کے ان سب کو بخش دیا، کیونکہ بعض مشرکین مکہ تو اس دن ایمان لا چکے تھے، اور بعض مکہ سے باہر نکل گئے تھے۔ اور ایمان نہیں لائے تھے، لیکن ان میں اب توحید کا انکار کرنے کی جرأت باقی نہیں رہی تھی، لہذا پیغمبر کا گناہ ان کی نظر میں بھی کامیابی کی بنا پر بخش گیا، جس وقت مامون نے یہ سنا تو کہا بارک اللہ، اے ابوالحسن!

۴- هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزِدُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ ۗ وَبِاللَّهِ جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝

ترجمہ

۴- وہی تو ہے جس نے مؤمنین کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل کیا، تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ ہو، اور آسمانوں اور زمین کے لشکر خدا ہی کے لیے ہیں اور خدا دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

مؤمنین کے دلوں پر نزول سکینہ

گذشتہ آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اتنی عظیم نعمتیں تھیں جو خدا نے فتح میں صلح حدیبیہ کے سایے میں پیغمبر کو عطا فرمائی تھیں، لیکن زیر بحث آیت میں اس عظیم نعمت کے بارے میں بحث کر رہا ہے جو اس نے تمام مؤمنین کو مرحمت فرمائی ہے، فرماتا ہے: وہی تو ہے، جس نے مؤمنین کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل کیا، تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کا اضافہ کرے۔

(هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزِدُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ)۔

اور سکون و اطمینان ان کے دلوں پر نازل کیوں نہ ہو۔ ”در آنجا لیکہ آسمانوں اور زمین کے لشکر خدا کے لیے ہیں۔ اور خدا دانا و حکیم ہے۔“

وَلِلّٰهِ جَنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۡ-

یہ کیسے کیا ہوتا؟

ضروری ہے کہ ہم پھر ”صلح حدیبیہ“ کی داستان کی طرف لوٹیں اور اپنے آپ کو ”صلح حدیبیہ“ کی فضا میں اور اس فضا میں جو صلح کے بعد پیدا ہوئی، تصور کریں تاکہ آیت کے مفہوم کی گہرائی سے آشنا ہو سکیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ”ایک رؤیا تے الہی ورحمٰنی“ کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور اس کے بعد خانہ خدا کی زیارت کے عزم کے ساتھ چل پڑے زیادہ تر صحابہ ہی خیال کرتے تھے کہ اس خواب اور رؤیائے صالحہ کی تعبیر اسی سفر میں واقع ہوگی، حالانکہ مقدر میں ایک دوسری چیز تھی یہ بات تو ایک ہوئی۔

دوسری طرف مسلمانوں نے احرام باندھا ہوا تھا، اور وہ قربانی کے جانور اپنے ساتھ لائے تھے، لیکن ان کی توقع کے برخلاف خانہ خدا کی زیارت کی سعادت تک نصیب نہ ہوئی، اور پیغمبر نے حکم دے دیا کہ مقام حدیبیہ میں ہی قربانی کے اونٹوں کو خنجر کر دیں۔ کیونکہ ان کے آداب و سنن کا بھی اور اسلامی احکام و دستور کا بھی یہی تقاضا تھا کہ جب تک مناسک عسره کو انجام نہ دے لیں احرام سے باہر نہ نکلیں۔

تیسری طرف حدیبیہ کے صلح نامہ میں کچھ ایسے امور تھے جن کے مطالب کو قبول کرنا بہت ہی دشوار تھا، منجملہ ان کے یہ کہ اگر قریش میں سے کوئی شخص مسلمان ہو جائے اور مدینہ میں پناہ لے لے تو مسلمان اُسے اس کے گھر والوں کے سپرد کر دیں گے، لیکن اس کے برعکس لازم نہیں تھا۔

چوتھی طرف صلح نامہ کی تحریر کے موقع پر قریش اس بات پر تیار نہ ہوئے کہ لفظ ”رسول اللہ“ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ لکھا جائے، اور قریش کے نمائندے ”سہیل“ نے اصرار کر کے اسے حذف کرایا، یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے لکھنے کی بھی موافقت نہ کی، اور وہ یہی اصرار کرتا رہا کہ اس کے بجائے ”بسمک اللہم“ لکھا جائے، جو اہل مکہ کی عادت اور طریقہ کے مطابق تھا، واضح رہے کہ ان امور میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک ناگوار امر تھا، سچے جانیکہ وہ سب کے سب مجموعی طو سے۔ اسی لیے ضعیف الایمان لوگوں کے دل ڈگمگائے، یہاں تک کہ جب سورہ فتح نازل ہوئی تو بعض نے تعجب کے ساتھ پوچھا:

کوئی فتح؟!

یہی وہ موقع ہے جب نصرت الہی کو مسلمانوں کے شامل حال ہونا چاہیے تھا، اور سکون و اطمینان ان کے دلوں میں داخل ہوتا تھا۔ نہ کہ کوئی فتور اور کمزوری ان میں پیدا ہوتی تھی، بلکہ ”لیزدادوا ایماناً مع ایمانہم“ کے مصداق ان کی قدرت الہیانی میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ اور والی آیت ایسے حالات میں نازل ہوئی۔

”سکینہ“ اصل میں ”سکون“ کے مادہ سے دلی آرام و اطمینان کے معنی میں ہے، جو ہر قسم کے شک و تردد اور وحشت کو

انسان سے نازل کر دیتا ہے، اور اس کو طوفانِ حوادث میں ثابت قدم رکھتا ہے۔

ممکن ہے اس سکون میں اعتقادی پہلو ہو۔ اور وہ اعتقاد میں ڈگمگانے سے بچائے، یا اس میں عملی پہلو ہو اس طرح سے کہ وہ انسان کو ثبات قدم، مقامت اور صبر و شکیبائی بخشنے۔ البتہ گذشتہ مباحث کی مناسبت سے اور خود آیت کی تعبیر یا یہاں زیادہ تر پہلے معنی کی طرف نظر جاتی ہے، جبکہ سورہ بقرہ کی آیہ ۲۴۸ داستان "طالوت" و "جالوت" میں زیادہ تر عملی پہلوؤں پر تکیہ کرتی ہے۔

مفسرین کی ایک جماعت نے "سکینہ" کے لیے کچھ اور معنی بھی ذکر کیے ہیں۔ جن کی بازگشت آخر کار اسی تفسیر کی طرف ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں "سکینہ" کی "ایمان" کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے اور بعض دوسری روایات میں نسیمِ جنت سے جو ایک خاص صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور مومنین کو سکون و آرام بخشتی ہے۔ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے، یہ بھی ان کے لیے ایک تائید ہے، کیونکہ "سکینہ" ایمان کی پیداوار ہے اور نسیمِ بہشتی کی طرح آرام بخش ہوتی ہے۔

یہ بحث بھی قابلِ توجہ ہے، کہ "سکینہ" کے بارے میں "انزال" (نازل کرنے) کی تعبیر ہوئی، اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ یہ تعبیر قرآن مجید میں بعض اوقات، ایجاد، و خلقت اور بخشش کے معنی میں آتی ہے اور چونکہ ایک عالی مقام سے ایک پست مقام کی طرف اس لیے اس تعبیر کی خوبی واضح ہے۔

چند نکات

① بے مثال آرام و سکون

اگر ایمان کا ثمر اور نتیجہ اسی سکون و آرام کے مسئلہ کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، تو یہی کافی تھا کہ انسان اپنے یورے وجود کے ساتھ اس کا استقبال کرے، جبکہ اس میں دوسرے ثمرات و برکات بھی موجود ہیں۔ مؤمنین اور بے ایمان لوگوں کی حالت کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے، کہ دوسرا گروہ ایک دائمی اضطراب اور پریشانی کی حالت میں بسر کرتا ہے، جب کہ پہلا گروہ بے مثال اطمینانِ قلب سے بہرہ مند ہے، اور اس کے سامنے میں ہے۔

ہرگز خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا: "وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ"

(احزاب - ۳۹)

ان کے اسمی ارادے میں اس کی اور اُس کی ملامت و سرزنش ہرگز اثر انداز نہیں ہوتی، وَلَا يَخْشَوْنَ لِمَا كُنْتُمْ لَا تُمْرُونَ: (مائدہ - ۵۴)

جو کچھ ہاتھ سے چلا جائے اس پر ہرگز ننگیں نہیں ہوتے اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اس سے زیادہ دل بستگی نہیں رکھتے، اور یہ دونوں اصول اس بات کا سبب بننے ہیں کہ گذشتہ اور آئندہ کے لحاظ سے ان کا روحی سکون متزلزل نہ ہو، "لَكَيْلًا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ"

(حدید - ۲۳)

اور بالآخر سخت اور شدید حوادث کے مقابلہ میں ہرگز بھی سست اور کمزور نہیں ہوتے، اور کسی غم کو اپنے پاس بھٹکنے نہیں دیتے۔

گویا مومنین ہمیشہ اپنے دشمن سے برتر رہتے ہیں: "وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ"

(آل عمران - ۱۳۹)

مومن میدان حوادث میں خود کو تنہا نہیں سمجھتا، خدا کے لطف و حمایت کے ہاتھ کو ہمیشہ اپنے سر پر محسوس کرتا ہے اور فرشتوں کی مدد و نصرت کو اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے۔ جب کہ بے ایمان لوگوں پر چھائی ہوئی بے چینی اور اضطراب ان کی گفتار و رفتار سے خصوصاً جب حوادث کے طوفان چل رہے ہوں۔ پورے طور پر محسوس ہوتا ہے۔

④ مراتب ایمان کا سلسلہ

ایمان چاہے علم و آگاہی اور معرفت کے معنی میں ہو، اور چاہے حق کے سامنے تسلیم و قبولیت کی روح کے معنی میں، کئی درجے اور سلسلہ مراتب رکھتا ہے، کیونکہ علم کے کئی درجے ہوتے ہیں اور قبول کرنے اور تسلیم نم کرنے کے بھی مختلف مراتب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ عشق کے لگاؤ اور ایمان سے تو اُم محبت میں بھی فرق ہوتا ہے زیر بحث آیت جو یہ کہتی ہے کہ: "لِيَزِدَنَّ اللَّهُ إِيْمَانًا مَعَ إِيْمَانِهِمْ؟" بھی اسی حقیقت پر ایک تاکید ہے، اسی بنا پر ایک مومن آدمی کو ایمان کے کسی ایک مرحلہ پر ہرگز رکنا نہیں چاہیے، وہ ہمیشہ خود گری کرتے ہوئے علم اور عمل کے ذریعہ بالاتر درجات کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"ان الایمان عشر درجات بمنزلة السلم يصعد منه مرقاة"

بعد مرقاة۔

”ایمان کے دس درجے ہیں، مثل سیڑھی کے، جس کے ایک ایک درجہ پر اس سے اُپر جاتے ہیں“ لہ

ایک دوسری حدیث میں آپ ہی سے منقول ہے:

خدا نے ایمان کو سات حصوں پر تقسیم کیا ہے، نیکی، صدق، یقین، رضا، وفا، علم اور حلم۔ پھر اسے لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا، جو شخص ان تمام ساتوں حصوں کا حامل ہے، وہ کامل و معتد مؤمن ہے۔ لوگوں میں سے بعض تو ایک حصہ رکھتے ہیں، بعض دو اور بعض تین، یہاں تک کہ بعض سات تک پہنچ جاتے ہیں“ اس کے بعد امامؑ نے مزید فرمایا:

جو وظیفہ اور ذمہ داری و حصولِ مالے کی ہے۔ اسے ایک حصہ مالے کے کنڈھے پر نہ رکھو، اور جو بات تین حصوں مالے سے منقطع ہے اسے دو حصوں مالے کے دوش پر نہ ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا بار زیادہ ہو جائے اور رحمت میں جا پڑیں“ لہ

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ چیز جو بعض سے نقل کی گئی ہے کہ ایمان میں کمی و زیادتی نہیں ہے، بہت ہی بے بنیاد سی بات ہے کیونکہ نہ تو وہ علمی واقعات کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی اسلامی روایات کے ساتھ، لگا کھاتی ہے۔

۳۱ کون کے دو اہم وسیلے

زیر بحث آیت کے ذیل میں ہم نے دو جملے پڑھے ہیں، جن میں سے ہر ایک ”سکینہ“ اور ”ثومنین“ کے آرام و اطمینان کے عوامل کو بیان کرتا ہے، پہلا تو ”وَلِلّٰهِ جَنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ دآسمانوں اور زمین کا شکر خدا کے لیے ہے اور اس کے حکم کے ماتحت ہے) کا جملہ ہے۔ اور اس کے بعد دوسرا ”وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا“ (خدا علیم و حکیم ہے) کا جملہ ہے۔

پہلا جملہ انسان سے کہتا ہے کہ اگر تو خدا کے ساتھ ہو تو زمین و آسمان کی ساری قوتیں تیرے ساتھ ہیں، اور دوسرا جملہ اس سے یہ کہتا ہے کہ خدا تیرے احتیاجات، مشکلات اور مصیبتوں کو بھی جانتا ہے اور عیسیٰ جد و جہد تیری کوششوں اور اطاعت و بندگی سے بھی باخبر ہے اور ان دونوں اصولوں کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن ہے کہ انسان کو سکون قلب اور اطمینان خاطر حاصل نہ ہو۔

۵۔ لِيَدْخُلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَيُكَفَّرُ عَنْهُمْ
سَيِّئَاتِهِمْ وَكَانَ ذَلِكَ عِنْدَ اللَّهِ فَوْزًا
عَظِيمًا ۝

۶۔ وَيُعَذِّبُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ
وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّالِمِينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ
دَائِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ
جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝

۷۔ وَاللَّهُ جُنُودُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا
حَكِيمًا ۝

ترجمہ

۵۔ (اس فتح میں سے ایک اور) مقصد یہ تھا کہ صاحب ایمان مردوں اور صاحب ایمان عورتوں کو (بہشت کے) باغوں میں داخل کرے، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور ان کے گناہوں کو بخش دے اور یہ خدا کے نزدیک بہت بڑی

کامیابی ہے۔

۴۔ اور (اس کے علاوہ) منافق مردوں اور منافق عورتوں، اور مشرک مردوں، اور مشرک عورتوں کو جو خدا کے بارے میں بُرے بُرے گمان رکھتے ہیں عذاب کرے، اور وہ بُرے حادثات، (جن کے وہ مومنین پر نازل ہونے کے منتظر ہیں) صرف انہی پر نازل ہوں گے، خدا نے ان پر غضب کیا ہے اور انہیں اپنی رحمت سے دُور رکھا ہے، اور جب ہم ان کے لیے آمادہ و تیار ہے، اور یہ کتنا بُرا انجام ہے۔

۷۔ آسمانوں اور زمین کے شکر صرف خدا کے لیے ہیں، اور خدا شکست ناپذیر اور حکیم ہے۔

تفسیر

فتح مبین کا ایک اور نتیجہ

شیعہ اور اہل سنت مفسرین کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے، کہ جس وقت اس سُورہ کی ابتدا کی آیات میں پیغمبر اسلام کو فتح مبین، اتمام نعمت، ہدایت اور نصرت کی بشارت دی گئی، تو بعض مسلمانوں نے جو حوادث ”حدیبیہ“ سے دل تنگ اور پریشان تھے، عرض کیا،

”ہینا لک یا رسول اللہ! لقد بین اللہ لک ماذا یفعل بک،

فماذا یفعل بنا؟

فنزلت: ”لیدخل المؤمنین والمؤمنات....“

”اے خدا کے رسول یہ تمام خدائی نعمتیں آپ کو مبارک، خدا نے جو کچھ آپ کو دیا

ہے یاد دے گا اُسے تو اس نے بیان کر دیا ہے، ہمیں وہ کیا دے گا؟ اس موقع پر پہلی زیر بحث آیت نازل ہوئی، اور مومنین کو بشارت دی کہ ان کے لیے بھی بڑا ثواب اور اجر عظیم ہے۔

پھر مال یہ آیات اسی طرح صلح "حدیبیہ" سے مربوط لوگوں کے انکار میں مختلف عمل، اور اس کے وزنی نتائج کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں، اور ہر گروہ کی سرنوشت کو اس عظیم آزمائش کی بھٹی میں مشخص کرتی ہیں۔ پہلے فرماتا ہے کہ "اس عظیم فتح کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کو جنت میں داخل کرے، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔" (لیدخل المؤمنین والمؤمنات جنات تجري من تحتها الانهار)۔

"وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، اور یہ عظیم نعمت ہرگز ان سے چھینی نہیں جائے گی" (خالدین فیہا)۔ "اس کے علاوہ یہ مقصد بھی تھا کہ "ان کے بُرے اعمال پر پردہ ڈال دے"۔ اور انھیں معاف کر دے" (ویکفر

عنہم سیئاتہم)۔

اور یہ خدا کے نزدیک ایک عظیم کامیابی ہے، (وكان خالداً عند الله فوزاً عظيماً)۔ اس طرح سے خدا نے ان چار نعمتوں کے مقابلہ میں، جو فتح مہین میں اپنے پیغمبر کو دیں۔ دو عظیم نعمتیں مومنین پر بھی ارزانی فرمائیں، بہشت جاودانی اپنی تمام نعمتوں کے ساتھ، اور عفو و درگزر ان کی لغزشوں سے، یہ اس روحانی اطمینان اور سکون کے علاوہ، جو انہیں اس دنیا میں عطا فرمایا ہے، اور ان تینوں نعمتوں کا مجموعہ ایک فوز عظیم یعنی بہت بڑی کامیابی ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس امتحان کی کٹھالی سے صحیح و سالم باہر نکل آئے۔

لفظ "فوز" جس کا قرآن مجید میں عام طور پر "عظیم" کی صفت کے ساتھ ذکر ہوا ہے، اور بعض اوقات "مبین" اور "کبیر" کے ساتھ بھی آیا ہے، مفردات میں راعب کے قول کے مطابق کامیابی اور خیرات کا سلامتی کے ساتھ حصول ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہے کہ اس میں آخرت کی نجات بھی ہو، اگرچہ مادی دنیا کی نعمتوں کے کھو بیٹھنے کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔

ایک مشہور روایت کے مطابق حبیب امیر المؤمنین علی علیہ السلام کا فریق مبارک محراب عبادت میں

۱۔ تفسیر "مرآئی" جلد ۲۶ ص ۸۵ و تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۰ ص ۲۶ و تفسیر روح المعانی جلد ۲۶ ص ۸۵۔

۲۔ اس بیان کے مطابق "لیدخل" اور اسی طرح "یغذی" کا مجملہ جو بعد والی آیت میں آئے گا "لیغفر" کے مجملہ پر عطف ہے۔ مفسرین کے ایک گروہ نے مجملہ شیخ طوسی نے "تبیان" میں اور "طبری" نے "معجم البیان" میں اور ابوالفتوح رازی نے اپنی تفسیر میں اسی معنی کو انتخاب کیا ہے، جبکہ ایک دوسرے گروہ نے "لیسدادوا ایماگانا" پر عطف سمجھا ہے، حالانکہ نہ وہ اور اسے شان نزول سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی کفار کی سزا اور مجازات کے ساتھ۔

خطا کار زمانہ "عبدالرحمن بن ملجم کی شمشیر سے شکافت ہوا تو آپ نے باواز بلند فرمایا:

"فزت ورب الکعبۃ"

"کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہوا"

(اور میرے سعادت نامہ پر میرے خون سے دستخط ہو گئے ہیں)

ہاں بعض اوقات پروردگار کے امتحانات ایسے سخت اور طاقت فرسا ہوتے ہیں جو کمزور ایمان والوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیتے ہیں اور ان کے دلوں کو الٹ دیتے ہیں۔ صرف سچے مومنین ہی جو سیکندہ اور اطمینان کی نعمت سے بہرہ مند ہوتے ہیں مقابلہ میں ڈٹتے ہیں، اور وہ قیامت میں اس کے ثمرات و نتائج سے بھی بہرہ مند ہوں گے، اور واقعاً یہ ایک فوز عظیم ہے۔

لیکن اس گروہ کے مقابلہ میں بے ایمان منافقین و مشرکین کا ایک گروہ تھا، جن کی سرنوشت کی بعد والی آیت میں اس طرح تصویر کشی ہوئی ہے، "دوسرا مقصد یہ ہے کہ خدا منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے؛ (و یعذب المنافقین و المنافقات و المشرکین و المشرکات)۔

"وہی کہ جو خدا کے متعلق بُرا لگان کرتے تھے"؛ (الظانین باللہ ظن السوء)۔

ہاں! پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کی مدینہ سے روانگی کے وقت یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ گروہ ہرگز صحیح و سالم مدینہ پلٹ کر نہیں آئے گا، جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۱۲ میں بیان ہوا ہے۔

"بل ظننتم ان لن ینقلب الترسول و المؤمنون الی اہلہم

ابدًا"

اور مشرکین بھی یہی گمان رکھتے تھے کہ محمد اس تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ، اور کافی اطمینان رکھنے کی وجہ سے صحیح و سالم مدینہ کی طرف نہیں لوٹیں گے، اور اسلام کا ستارہ بہت جلد غروب ہو جائے گا۔

اس کے بعد ان عذاب اور سزا کی وضاحت کرتے ہوئے چار عنوانوں کے تحت اس کی تشریح کرتا ہے۔

فرماتا ہے، "حوادث اور بُرے اثرات و نتائج صرف اسی گروہ پر نازل ہونگے؛" (علیہم داثرۃ

السوء)۔

"داثرۃ" لغت میں حوادث اور ان رویہ رادوں کے معنی میں ہے جو انسان کو پیش آتی ہیں، چاہے وہ اچھی

ہوں یا بُری، لیکن یہاں لفظ "سوء" کے ذکر کرنے کی وجہ سے نامطلوب حوادث ہی مراد ہیں۔

"دوسرے یہ کہ خدا نے ان پر غضب کیا ہے؛" (و غضب اللہ۔۔۔)

"اور انھیں خدا نے اپنی رحمت سے بھی دور کر دیا ہے؛" (و لخصہم۔۔۔)

لہ "سوء" بر وزن "فوع" صحاح اللغۃ کے قول کے مطابق مصدری معنی رکھتا ہے، اور "سوء" بر وزن "کور" اہم مصدر کے معنی میں ہے۔ لیکن

بقول کثاف دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

” اور آخر میں ان کے لیے ابھی سے جہنم فراہم کر رکھی ہے۔ اور وہ کیا ہی بُرا انجام ہے۔“ (وعدلہم جہنم و ساءت مصیراً)۔ لہ

قابل توجہ بات یہ ہے کہ میدان ” حدیبیہ “ میں زیادہ تر مسلمان مرد تھے، اور ان کے مقابل میں بھی منافق و مشرک مرد تھے، لیکن اوپر والی آیات میں قرآن نے اس فوجِ عظیم اور اس عذابِ الیم میں عورتوں اور مردوں کو مشترک شمار کیا ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ با ایمان مرد جو میدانِ جنگ میں حاضر ہوتے ہیں، صاحبِ ایمان عورتوں کی پشتیبانی کے بغیر اور اسی طرح منافق مرد منافق عورتوں کی ہمدردی کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اصولی طور پر اسلام مردوں ہی کا دین نہیں ہے، کہ عورتوں کی شخصیت کو نظر انداز کر دے، لہذا ہر اس مقام پر جہاں عورتوں کے نام کا نہ ہونا کلام میں انحصاری مفہوم پیدا کرتا ہو وہاں عورتوں کا ذکر صراحت کے ساتھ پیش کرتا ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں ایک مرتبہ پھر خدا کی قدرت کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ” آسمانوں و زمین کے لشکر اور فوجیں خدا ہی کے لیے ہیں۔ اور خدا عزیز و حکیم ہے۔“ (و لہ حینود السموات والارض و کان اللہ عزیزاً حکیمًا)۔

یہ بات ایک مرتبہ اہل ایمان کے مقامات اور نعمتوں کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے، اور ایک مرتبہ یہاں منافقین اور مشرکین کے عذاب اور سزاؤں کے ذیل میں آئی ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ خدا جس کے زیر فرمان آسمانوں اور زمین کے سارے لشکر ہیں وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے اور اس پر بھی اسے توانائی حاصل ہے۔ جس وقت اس کا دیراے رحمت موجزن ہوتا ہے تو جن میں یاقوت و شائستگی ہوتی ہے، وہ جہاں کہیں بھی ہوں ان کے شامل ما ہوتا ہے، اور جس وقت اس کے قہر و غضب کی آگ شعلہ زن ہو تو پھر کسی مجرم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ فرار کر سکے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مومنین کے ذکر کے وقت خدا کی ” علم و حکمت “ کے ساتھ توصیف ہوتی ہے، جو مقامِ حمت کے ساتھ مناسب ہے، لیکن منافق و مشرک لوگوں کے لیے خدا کی ” قدرت و حکمت “ کے ساتھ توصیف ہوتی ہے، جو مقامِ عذاب کے ساتھ مناسب ہے۔

” آسمانوں اور زمین کے لشکروں “ سے کیا مراد ہے؟

یہ لفظ ایک وسیع معنی رکھتا ہے، جو خدا کے فرشتوں کے لشکروں کو بھی شامل ہے، اور ” صاعقہ “ ” زلزلوں “ ” طوفانوں “ ” سیلابوں “ ” امواج “ اور دوسری غیر مرئی طاقتوں کے لشکروں کو بھی، جن سے ہم آگاہی نہیں رکھتے، کیونکہ یہ سب اللہ کے لشکر ہیں اور ان کے سامنے تسلیمِ خم کرتے ہیں۔

ایک نکتہ

خدا کے بارے میں سوؤظن کون لوگ رکھتے ہیں؟

”سوؤظن“ کی کبھی تو اپنی طرف نسبت ہوتی ہے، اور کبھی دوسروں کی طرف اور کبھی خدا کی طرف ”جیسا کہ حسن عین“ بھی تین ہی حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

اپنے متعلق جو سوؤظن ہوتا ہے اگر وہ انفرادی حد تک نہ پہنچے تو وہ تکامل و ارتقار کی سیڑھی ہے اور وہ اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کی نسبت سخت گیر اور بال کی کھال نکالنے والا بن جائے، اور نیک اعمال سے پیدا ہونے والے عجب و غرور کو روک دے۔

اسی بنا پر علی علیہ السلام مشہور خطاب ”ہمام“ میں پرہیزگاروں کی تعریف و توصیف میں فرماتے ہیں۔

”فہم لانفسہم متہمون، ومن اعمالہم مشفقون، اذا ذکی احد منهم خاف مما یقال لہ، فیقول: انا علم بنفسی من غیرئ وربی اعلم بی منئ بنفسی، اللہم لا تؤاخذنی بما یقولون، واجعلنی افضل مما یظنون، واغفر لی ما لا یعلمون“

”وہ اپنے آپ کو متہم کرتے ہیں، اور اپنے اعمال سے ڈرتے ہیں، جس وقت ان میں سے کسی ایک کا ترکیب و تعریف کی جائے، تو جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے، اُس سے ڈرتا ہے اور کہتا ہے: میں اپنے بارے میں دوسروں کی نسبت زیادہ آگاہ ہوں اور میرا پروردگار میرے اعمال کو مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہے، خداوند! جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر میرا مؤاخذہ نہ کرنا اور مجھے اس چیز سے، جو وہ میرے بارے میں خیال کرتے ہیں، برتر قرار دے، اور میری جن باتوں کا انھیں علم نہیں ہے وہ مجھے بخش دے“

لیکن اگر یہ ”سوؤظن“ لوگوں کے بارے میں ہو تو ممنوع ہے، مگر ایسے مواقع پر جب کہ فساد اور غرابی معاشرے پر غلبہ کرے، تو پھر خوش نہیں ٹھیک نہیں ہے، (النار، اللہ اس کی تشریح و تفسیر سورہ حجرات کی آیت ۱۲ کے ذیل میں آئے گی)

باقی رہا خدا کے بارے میں ”سوؤظن“ یعنی اس کے وعدہ کے بارے میں، اس کی بے پایاں رحمت و کرم کے بارے میں، تو وہ بہت ہی بُرا اور تباہ کر دینے والا ہے، اور ایمان کی کمزوری کی نشانی، بلکہ بعض اوقات تو ایمان کے نہ ہونے کی علامت ہے۔

قرآن بے ایمان افراد یا ضعیف الایمان لوگوں کے سوزن کو خصوصاً اجتماعی سخت قسم کے حوادث اور آزمائش کے طوفانوں کے ظہور کے موقع پر۔ بار بار ذکر کرتا ہے، کہ مومنین ایسے مواقع پر کس طرح پورے حسن ظن کے ساتھ، اور پروردگار کے لطف پر اطمینان کی وجہ سے ثابت قدم رہتے ہیں، لیکن ضعیف اور ناتواں افراد شکایت کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ فتح "حدیبیہ" کی داستان میں منافقین اور ان کے ہم خیال لوگوں نے بھی سوزن کیا اور کہا، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے یار و انصار اس سفر میں جاتے ہی ہیں لیکن وہ اس سے واپس نہیں لوٹیں گے۔ گویا انہوں نے خدا کے وعدوں کو فراموش کر دیا، یا اُس کے بارے میں بدگمان تھے۔

اس کا ایک واضح نمونہ خصوصیت کے ساتھ جنگِ احزاب میں۔ جب کہ مسلمان سخت وباؤ کی حالت میں تھے۔ ظاہر ہوا، خدا نے ایک گروہ کے بڑے گمانوں کی سخت ندمت کی،

"اذ جاءوكم من فوقكم ومن اسفل منكم واذا زاغتم الابصار
وبلغت القلوب الحناجر وتظنون بالله الظنونا هنالك استلى المؤمنون
وزلزلوا زلزلاً شديداً،

"وہ وقت یاد کرو جب لشکرِ احزاب اُپر کی طرف سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی شہر میں داخل ہو گیا (اور مدینہ کا محاصرہ کر لیا) اور اس وقت کو (یاد کرو) جب شدت و وحشت سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اور جانیں لبوں تک آگئی تھیں، اور تم خدا کے بارے میں بڑے بڑے گمان کر رہے تھے، اس موقع پر مومنین کی آزمائش ہو گئی اور وہ ہل کر رہ گئے۔"

(احزاب: آیت ۱۰-۱۱)

یہاں تک کہ سورہ آل عمران کی آیت ۵۴ میں ایسے گمانوں کو "ظن الجاہلیۃ" (زمانہ جاہلیت کے گمان) کہا ہے۔

بہر حال خدا سے اور اس کے رحمت و کرم اور لطف و عنایت کے وعدہ کے متعلق حسن ظن ایمان کی اہم نشانی اور نجات و سعادت کے موثر وسائل میں سے ہے۔

یہاں تک کہ رسول خدا سے ایک حدیث میں آیا ہے۔

"لیس من عبد یظن بالله خیراً الا کان عند ظنہ بہ !
" کوئی بندہ خدا کے بارے میں حسن ظن نہیں رکھتا مگر یہ کہ خدا اس کے گمان کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں امام علی ابن موسی الرضا سے آیا ہے۔

” احسن بالله الظن ، فان الله عزوجل يقول انا عند ظن عبدي

المؤمن بي ، ان خير فخير ، وان شرف شر : ”

” خدا کے ساتھ اپنے ظن و گمان کو اچھا رکھو کیونکہ خداوند عزوجل فرماتا ہے ، میں اپنے بندہ / مومن کے ظن و گمان کے پاس ہوتا ہوں ، اگر وہ میرے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو تو میں اس سے اچھا سلوک کرتا ہوں اور اگر وہ بُرا گمان رکھتا ہو ، تو بُرا سلوک ہوگا ، لے

” آخر میں ایک دوسری حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے ۔ ”

” ان حسن الظن بالله عزوجل ثمن الجنة : ”

” خدا کے ساتھ حسن ظن رکھنا جنت کی قیمت ہے ۔ ”

اس سے زیادہ سہل اور آسان قیمت اور کیا ہوگی ؟ اور اس سے زیادہ قیمتی مال و مستاع اور کونسا ہوگا ؟

۸- اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝
 ۹- لَتَتُوبُنَّ لِرَبِّكَ يَا بَنِي آدَمَ وَتَتَّقُوهُ وَتُحْسِنُوا الصَّالٰتِ لِيَسْمَعَنَّ اَصْوٰتُكُمْ يُخْبَرُ اُولٰٓئِكَ لِيَعْلَمَ اُولٰٓئِكَ اَلَّذِي خَلَقَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوهُ ۝
 بُكْرَةً وَّ اٰصِيْلًا ۝

۱۰- اِنَّ الَّذِيْنَ يَبٰیعُوْنَكَ اِنَّمَا يَبٰیعُوْنَ اللّٰهَ ط يَدُ اللّٰهِ
 فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى
 نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰ بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهِ اللّٰهُ فَاَسٰوَتْ يَدُ
 اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ

۸- ہم نے تجھے ایک گواہ، بشارت دینے والے اور ڈرانے والے کے
 عنوان سے بھیجا ہے۔

۹- تاکہ تم لوگ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور اس کا دفاع
 کرو اور اس کا احترام کرو، اور صبح و شام خدا کی تسبیح کرو۔

۱۰- جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں وہ حقیقت میں خدا ہی کی بیعت کرتے ہیں
 خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے، پس جو شخص بھی پیمان شکنی کرے گا،
 وہ اپنے ہی نقصان میں پیمان شکنی کرے گا اور جو شخص اس عہد کے لیے جو اس
 نے خدا سے باندھا ہے، وفا کرے گا تو وہ اسے بہت بڑا ایک عظیم اجر عطا کرے گا۔

تفسیر

پیغمبر کی حیثیت کا استحکام اور لوگوں کی اس کے بارے میں ذمہ داریاں

ہم بیان کر چکے ہیں کہ صلح حدیبیہ پر بعض نادانوں نے سخت تنقید کی، یہاں تک کہ پیغمبر کے بارے میں ان کے سامنے ایسی باتیں کی گئیں، جن سے آپ کی بے حرمتی ہوتی تھی، ان باتوں کا مجموعی طور پر تقاضا یہی تھا کہ پیغمبر کی عظمت و مقام اور مرتبہ و حیثیت کے بارے میں دوبارہ تاکید کی جائے۔

لہذا پہلی زیر بحث آیت میں پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے: "ہم نے تجھے ایک گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے" (اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا)۔ یہ تین عظیم اوصاف اور تین عمدہ مقامات پیغمبر کے اہم ترین مراتب اور مقامات میں سے ہیں، "گواہ ہونا" بشیر ہونا" اور نذیر ہونا" گواہ تمام اُمت مسلمہ پر، بلکہ ایک معنی کے لحاظ سے تمام امتوں پر گواہ، جیسا کہ سورہ نسا کی آیت ام میں آیا ہے، فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا: "اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ان کے اعمال پر گواہ لائیں گے، اور تجھے ان سب گواہوں پر گواہ بنائیں گے"

اور سورہ توبہ کی آیت ۱۰۵ میں فرماتا ہے: وَقُلْ اَعْمَلُوا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عَمَلِكُمْ وَرَسُولِهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ: "کہہ دے کہ تم عمل کرو، خدا اور اس کا رسول اور مومنین (ائمہ معصوم) تمہارے عمل کو دیکھتے ہیں" اصولی طور پر ہر انسان بہت سے گواہ رکھتا ہے۔

سب سے پہلے تو خداوند عالم ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے، وہ ہمارے تمام اعمال اور ہماری نیتوں تک کو دیکھ رہا ہے۔

اس کے بعد وہ فرشتے ہیں جو انسان کے اعمال کو کھنہ پر مامور ہیں، جیسا کہ سورہ ق کی آیت ۲۱ میں اشارہ ہوا ہے وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ:

اس کے بعد انسانی جسم کے اعضاء و جوارح ہیں، یہاں تک کہ اس کے بدن کی جلد بھی گواہی دے گی:

”یوم تشهد علیہم السنہم وایدیہم وارجلہم بماکانوا یعملون“
 ”اس دن ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔“

(نور-۲۲)

”وقالوا لجلودہم لم شہدتہم علینا قالوا انطقنا اللہ الذی
 انطق کل شیء“

”وہ اپنے بدن کی جلد سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی، تو وہ کہیں گے،
 وہ خدا جس نے ہر موجود کو قوت گویائی عطا کی ہے، اُسی نے ہمیں بھی گویائی دی ہے، تاکہ ہم گواہی
 دیں۔“

(حکم مجدہ-۲۱)

”زمین“ بھی گواہوں میں سے ایک گواہ ہے جیسا کہ سورۃ زلزال میں آیا ہے:

”یومئذ تحدث اخبارها“

بعض روایات کے مطابق ”زمانہ“ بھی اس دن گواہوں کی صف میں ہوگا۔ ایک روایت میں علی علیہ السلام
 سے منقول ہے۔

”ما من یوم یر علی بنی آدم إلا قال لہ ذلک الیوم انا یوم

جدید وانا علیک شہید، فافعل فی خیرا، واعمل فی خیرا،

اشہد لک بہ یوم القیامۃ، فانک لن ترانی بعد هذا ابدًا“

”کوئی دن آدم کے بیٹے پر نہیں گزرتا مگر یہ کہ وہ اس سے کہتا ہے: میں نیا دن ہوں،

میں تیرے بارے میں گواہی دوں گا، تو مجھ میں نیک کام کر اور عمل خیر بجالا، تاکہ میں قیامت

کے دن تیرے فائدے میں گواہی دوں، کیونکہ تو اس کے بعد مجھے کبھی بھی نہیں دیکھے گا۔“

بلاشک خدا کی تنہا گواہی ہی کافی ہے، لیکن گواہوں کا متعدد ہونا مزید اتمام حجت کا باعث بھی ہے

اور انسانوں میں زیادہ قوی تربیتی اثر بھی رکھتا ہے۔

بہر حال قرآن مجید نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امور کو جو کہ مسئلہ شہادت و بشارت و نذارت ہیں۔

تین عمدہ اوصاف کے عنوانوں کے ساتھ بیان کیا ہے، تاکہ یہ ان وظائف اور ذمہ داریوں کے لیے ایک

مقدمہ اور تمہید ہو، جو بعد والی آیت میں بیان ہوئی ہیں۔

بعد والی آیت میں پیغمبر کے گذشتہ بیان کردہ اوصاف کے ایک مقصد اور نتیجہ کے عنوان سے پانچ

اہم احکام بیان ہوئے ہیں، جن سے دو محم تو خدا کی اطاعت اور اس کی تسبیح و تشریح میں ہیں، اور تین احکام مقام پیغمبر کی تعظیم، اور ان کی اطاعت و دفاع کے بارے میں ہیں، فرماتا ہے: "مقصد یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور دشمنوں کے مقابلہ میں اس کا دفاع کرو، اور اس کی عزت و احترام و تحکیم کرو اور صبح و شام خدا کی تسبیح و تقدیس کرو" (لتؤمنوا بالله ورسوله وتعزروه وتوقروه وتسبحوه بكرة واصیلاً)۔

"تعزروه" "تعزیر" کے مادہ سے دراصل "منع" کے معنی میں ہے، اس کے بعد دشمن کے مقابلہ میں ہر قسم کے دفاع اور نصرت و مدد کرنے کرنے پر اطلاق ہونے لگا، بعض سزاؤں کو بھی، جو گناہ سے روکتی ہیں، تعزیر کہا جاتا ہے۔

"توقروه" "توقیر" کے مادہ سے جس کی اصل "وقر" ہے سنگینی کے معنی میں ہے، اس بنا پر یہاں "توقیر" تعظیم و تحکیم کے معنی میں ہے۔

اس تفسیر کے مطابق وہ ضمیریں جو "تعزروه" اور "توقروه" میں آئی ہیں وہ پیغمبر کی ذات کی طرف لوٹتی ہیں۔ اور اس کا مقصد دشمن کے مقابلہ میں آپ کی حمایت اور دفاع کرنا اور آپ کی تعظیم و تحکیم کرنا ہے، (اس تفسیر کو شیخ طوسی نے "تبیان" میں اور طبرسی نے "مجمع البیان" میں اور بعض دوسرے علماء نے اختیار کیا ہے۔ لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے کا نظریہ یہ ہے، کہ آیت کی تمام ضمیریں خدا کی طرف لوٹتی ہیں، اور تعزیر و توقیر سے مراد یہاں خدا کے دین کی نصرت و مدد کرنا ہے اور اس کی اور اس کے دین کی تعظیم و تحکیم کرنا ہے، اس تفسیر کے اختیار کرنے میں ان کی دلیل آیت میں موجود تمام ضمیروں کا ہم آہنگ ہونا ہے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اولاً: "تعزیر" کا اصلی معنی دشمن کے مقابلہ میں دفاع کرنا اور اسے روکنا ہے، جو خدا کے بارے میں مجازی صورت کے علاوہ صحیح نہیں ہے، اور اس سے زیادہ اہم آیت کا شان نزول ہے، جو حدیبیہ کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی ہے، جبکہ بعض لوگوں نے پیغمبر کے اعلیٰ مقام اور مرتبہ کے سلسلے میں بے حرمتی کی تھی، اور آیت پیغمبر کے سامنے مسلمانوں کو ان کے وظائف اور ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔

علاوہ ازیں اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ آیت گذشتہ آیت کے ایک نتیجہ کے عنوان سے ہے، جو پیغمبر کی "شاہد" "دبشیر" و "مدلیر" کے عنوان سے تعریف و توصیف کرتی ہے، اور یہ امر ان احکام کے لیے جو بعد والی آیت میں بیان ہوئے ہیں۔ زمین ہموار کرتی ہے گویا تہید کے طور پر ہے۔

لے "زمنشری" نے "کشاف" میں "آلوسی" نے "روح المعانی" میں "فیض کاشانی" نے "مانی" میں اور علامہ طباطبائی نے "المیزان" میں اس تفسیر کو قبول کیا ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں ”بیعت رضوان“ کے مسئلہ کی طرف ایک مختصر اشارہ ہے، جو اسی سورہ کی آیت نمبر ۱۸ میں زیادہ تفصیل کے طور پر آیا ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مشورتاً رنجوں کے مطابق آپ اس خواب کے بعد جو آپ نے دیکھا تھا ۱۲۰۰ افراد کے ساتھ عمرہ انجام دینے کے ارادہ سے مدینہ سے نکلے، لیکن مکہ کے قریب مشرکین نے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کا مصمم ارادہ کر لیا، پیغمبر اور آپ کے اصحاب سرزمین ”حدیبیہ“ میں ٹھہر گئے اور آپ کے اور قریش کے درمیان سفروں کا آنا جانا ہوا یہاں تک کہ صلح حدیبیہ کی قرارداد انجام پائی۔

ان امور میں ایک مرتبہ عثمان مامور ہوئے کہ وہ اہل مکہ تک یہ پیغام پہنچائیں کہ آپ جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے اور آپ کا ارادہ صرف خانہ خدا کی زیارت ہے، لیکن مشرکین نے وقتی طور پر عثمان کو روک لیا، اور اسی سبب سے مسلمانوں کے درمیان قتل عثمان کی خبر پھیل گئی، اور اگر اس طرح کی بات صحیح ہوتی تو یہ قریش کی طرف سے اعلان جنگ کی دلیل ہوتی، لہذا پیغمبر نے فرمایا کہ جب تک ہم اس قوم سے ٹٹ نہ لیں ہم یہاں سے نہیں جائیں گے، اور اس اہم امر پر تاکید کے لیے لوگوں کو دعوت دی کہ آپ سے تجدید بیعت کریں، مسلمان وہاں پر موجود ایک درخت کے نیچے جمع ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی، کہ ہرگز میدان سے نہیں بھاگیں گے، اور جس حد تک ان میں تاب و توان ہے، دشمن کے قلع قمع کرنے میں کوششیں کریں گے۔

اس بات کی خبر مشرکین مکہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے ان کے دلوں میں ایک رعب اور وحشت پیدا کر دی اور اسی سبب سے وہ اس ناپسندیدہ صلح کے لیے تیار ہو گئے۔
اس بیعت کو اس بنا پر ”بیعت رضوان“ کہا جاتا ہے۔
کیونکہ اسی سورہ کی آیت ۱۸ میں آیا ہے:

”لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرة۔“

”خدا مؤمنین سے۔ جب وہ اس درخت کے نیچے تیری بیعت کر رہے تھے۔ راضی ہو گیا۔“

پھر حال قرآن مجید زیر بحث آیت میں کہتا ہے:

”جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں حقیقت میں وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں، اور خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ

کے اوپر ہے۔“

(ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیہم۔)

”بیعت“ کسی شخص کی فرمانبرداری اور اطاعت کے لیے عہد و پیمانہ باندھنے کے معنی میں ہے، اور یہ رسم چلی آرہی تھی کہ جو شخص اطاعت کا عہد و پیمانہ باندھتا تھا تو وہ اپنا ہاتھ پیشوا اور رہبر کے ہاتھ میں دے دیتا تھا، اور وفاداری کے عہد و پیمانہ کا اس طریقہ سے اظہار کیا کرتا تھا۔

اور چونکہ ”معاملہ اور بیع“ کے وقت بھی ہاتھ میں ہاتھ دینے تھے، اور معاملہ کی قرارداد باندھتے تھے، اس لیے

”ان في التار لمدينة يقال لها الحصينة، افلا تسلونني
ما فيها؟ فقل له: ما فيها يا امير المؤمنين؟ قال فيها ايدي
الساكنين!“

”جہنم میں ”حصینہ“ نامی ایک شہر ہے، کیا تم مجھ سے نہیں پوچھو گے کہ اس شہر میں کیا ہے؟
کسی نے عرض کیا، اے امیر المؤمنین اس شہر میں کیا ہے؟ فرمایا، پیمان شکنی کرنے والوں اور عہد توڑنے والوں
کے ہاتھ ہیں۔“

اسی سے واضح ہے کہ عہد شکنی و نقض بیعت اسلام میں کس قدر قبیح ہے۔

اسلام میں بیعت کا موضوع یہاں تک کہ قبل از اسلام اس کا وجود اس کی کیفیت اور اس کے بارے میں شرعی احکام ایک
طویل بحث چاہتے ہیں جو انشاء اللہ اسی سورہ کی آیت ۸ میں آئے گی۔

۱۱۔ سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَا
 أَمْوَالُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا يَقُولُونَ بِالسِّنْتِهِمْ
 مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ط قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ
 شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ
 بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ○

۱۲۔ بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَى
 أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزَيِّنَ ذَلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ
 وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ○

۱۳۔ وَمَنْ لَمْ يُؤْمَرْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ
 سَعِيرًا ○

۱۴۔ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ
 مَنْ يَشَاءُ ط وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ○

ترجمہ

۱۱۔ عتق قریب بادپوشن اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والے (عذر تراشی کرتے
 ہوئے) کہیں گے کہ ہمارے اموال اور گھر والوں کی حفاظت نے ہمیں
 اپنی طرف مشغول رکھا، (اور ہم سفر حدیبیہ میں آپ کے ہمراہ نہ جاسکے) پس

آپ ہمارے لیے طلب مغفرت کیجیے، یہ اپنی زبان سے وہ بات کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے، کہہ دے: کون ایسا ہے جو خدا سے تمہیں بچا سکے اگر وہ تمہارے لیے نقصان کا ارادہ کرے، یا کون ہے جو اس نفع کو روک سکے جسے پہنچانے کا وہ ارادہ کرے، اور خدا ان تمام اعمال سے جو تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔

۱۲۔ بلکہ تم نے یہ گمان کر لیا تھا کہ پیغمبر اور مومنین ہرگز اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ غلط خیال تھا جسے دلوں میں زینیت پا گیا تھا اور تم نے بدگمانی سے کام لیا اور آخر کار تم ہلاک ہوئے۔

۱۳۔ اور وہ شخص جو خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا (اس کی سر نوشت ”ذبح“ ہے) کیونکہ ہم نے کافروں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

۱۴۔ آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خدا ہی کے لیے ہے جسے وہ چاہتا ہے (اور شائستہ دیکھتا ہے) بخش دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے عذاب کرتا ہے، اور خدا غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

پیچھے رہ جانے والوں کی عذر تراشی

گذشتہ آیات کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبر ایک ہزار چار سو سالوں کے ساتھ مدینہ سے عمرہ کے

ارادہ سے محکمہ کی طرف روانہ ہوئے۔

پیغمبر کی طرف سے بادیہ نشین قبائل میں اعلان ہوا کہ وہ بھی سب کے سب اس سفر میں آپ کے ساتھ چلیں لیکن ضعیف الایمان لوگوں کے ایک گروہ نے اس حکم سے روگردانی کی، اور ان کا تجزیہ یہ تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان اس سفر سے صحیح و سالم بچ کر نکل آئیں، حالانکہ کفار قریش پہلے ہی ہیجان داشتہ تھے، اور انہوں نے اُحد و احزاب کی جنگیں مدینہ کے قریب ممانوں پر قہر پ دی تھیں، اب جبکہ یہ چھوٹا سا گروہ بغیر ہتھیاروں کے اپنے پاؤں سے چل کر محکمہ کی طرف جا رہا ہے، گویا بھڑوں کے پھتہ کے پاس خود پہنچ رہا ہے، تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے گھروں کی طرف واپس لوٹ آئیں گے؟!

لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان کامیابی کے ساتھ اور قابل ملاحظہ امتیازات کے ہمراہ جو انہوں نے صلح حدیبیہ کے عہد و پیمان سے حاصل کیے تھے، صحیح و سالم مدینہ کی طرف پلٹ آئے ہیں۔ اور کسی کے ٹھیکہ پر بھی نہیں چھوٹی، تو انہوں نے اپنی عظیم غلطی کا احساس کیا اور پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ کسی طرح کی عذر خواہی کر کے اپنے فعل کی توجیہ کریں، اور پیغمبر سے استغفار کا تقاضا کریں۔

لیکن اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور ان کے اعمال سے پردہ اٹھا دیا اور انہیں رسوا کیا۔

اس طرح سے پہلی آیات میں منافقین اور مشرکین کی سرنوشٹ کا ذکر کرنے کے بعد، یہاں پیچھے رہ جانے والے ضعیف الایمان لوگوں کی کیفیت کا بیان ہو رہا ہے، تاکہ اس بحث کی کڑیاں مکمل ہو جائیں۔

فرمایا ہے: عنقریب بادیہ نشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والے عذر تراشی کرتے ہوئے کہیں گے: ہمارے مال و متاع اور بال بچوں کی حفاظت نے ہمیں اپنی طرف مائل رکھا، اور ہم اس پر برکت سفر میں آپ کی خدمت میں نہ رہ سکے، اب ہمارے عذر کو قبول کرتے ہوئے ہمارے لیے طلب بخش کیجیے۔ (سَبِقُولُ لَدَّ الْمَغْلُفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْهُمُ أَمْوَالُهُمْ وَأَهْلُوهُمْ فَاسْتَغْفَرُوا)۔

”وہ اپنی زبان سے ایسی چیز کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے“ (يَقُولُونَ بِالْأَسْنَتِهِمْ مَا لَيْسَ

فِي قُلُوبِهِمْ)

وہ تو اپنی توبہ تک میں بھی مخلص نہیں ہیں۔

لیکن ان سے کہہ دے، خدا کے مقابلہ میں۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ وہ تمہارا دفاع کر سکے، اور اگر وہ تمہیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو کس میں طاقت ہے، کہ اُسے روک سکے: (قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا)

خدا کے لیے یہ بات کسی طرح بھی مشکل نہیں ہے، کہ تمہیں تمہارے امن و امان کے گھروں میں، بیوی بچوں اور مال و متاع کے پاس، انواع و اقسام کی بلاؤں اور مصائب میں گرفتار کرنے، اور اس کے لیے یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ دشمنوں کے مرکز میں اور مخالفین کے گڑھ میں تمہیں ہر قسم کے گزند سے محفوظ رکھے، یہ تمہاری قدرت خدا کے بارے میں

جمالت اور بے خبری ہے جو تمہاری نظریں اس قسم کے افکار کو جگمگاتی ہے۔

ہاں! ”خدا ان تمام اعمال سے جنہیں تم انجام دیتے ہو باخبر اور آگاہ ہے“ (بل كان الله بما تعملون خبيراً)۔

بلکہ وہ تو تمہارے سینوں کے اندر کے اسرار اور تمہاری نیتوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ عذر اور بہانے واقعت اور حقیقت نہیں رکھتے اور جو اصل حقیقت اور واقعت ہے، وہ تمہارا شک و تردد، خوف و خطر اور ضعف ایان ہے، اور یہ عذر تراشیاں خدا سے مخفی نہیں رہتیں، اور یہ ہرگز تمہاری سزا کو نہیں روکیں گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیات کے لب و لہجہ سے بھی اور تواریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات پنمیر کی مدینہ کی طرف بازگشت کے دوران نازل ہوئیں، یعنی اس سے پہلے کہ پیچھے رہ جانے والے آئیں اور عذر تراشی کریں، ان کے کام سے پردہ اٹھا دیا گیا اور انہیں رسوا کر دیا۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے مکمل طور پر پردے ہٹا کر مزید کہتا ہے، بلکہ تم نے تو یہ گمان کر لیا تھا کہ پنمیر اور مومنین ہرگز اپنے گھروالوں کی طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے“ (بل ظننتم ان لن ينقلب الزسول والمؤمنون الى اهلهم ابداً)۔

ہاں! اس تاریخی سفر میں تمہارے شریک نہ ہونے کا سبب، اموال اور بیوی بچوں کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اس کا اصلی عامل وہ سونہلن تھا جو تم خدا کے بارے میں رکھتے تھے، اور اپنے غلط اندازوں کی وجہ سے یہ سوچتے تھے کہ یہ سفر پنمیر اور مومنین کے ختم ہونے کا سفر ہے اور اس سے کنارہ کشی کرنی چاہیے۔

ہاں! ”یہ غلط خیال اور شیطانی دوسے تمہارے دلوں میں زینت پانچکے تھے“ (و زين ذالك في قلوبكم)۔

”اور تم نے بڑا گمان کیا“ (وظننتم ظن السوء)۔

کیونکہ تم یہ سوچ رہے تھے کہ خدا نے پنمیر کو اس سفر میں بھیج کر انہیں دشمن کے جنگل میں ڈے دیا ہے، اور ان کی حمایت نہیں کرے گا۔!

”اور انجام کار تم ہلاک ہو گئے“ (وكنتم قومًا بورًا)۔

اس سے بدتر ہلاکت اور کیا ہوگی کہ تم اس تاریخی سفر میں شرکت، بیعت رضوان، اور دوسرے افتخارات و اعزازات سے محروم رہ گئے، اور اس کے پیچھے عظیم رسوائی تھی اور آٹنہ کے لیے آخرت کا دردناک عذاب ہے، ہاں تمہارے دل مردہ تھے اس لیے تم اس قسم کی صورت احوال میں گرفتار ہوئے۔

چونکہ یہ ضعیف الایمان یا منافق ایسے ڈرپوک، آرام طلب اور طبعاً جنگ اور ہر قسم کے مقابلہ سے بھاگنے والے آدمی

ہیں لہذا وہ حوادث کے بارے میں جو بھی تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں وہ کسی طرح بھی واقعیت کے مطابق نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود وہ ان کی نظروں میں بہت کبکبش رکھتی ہے۔

اور اس طرح سے خوف اور عافیت طلبی، اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے فرار، بڑے گناہوں کو ان کی نظر میں حقیقت و واقعیت کے طور پر جگہ دیتے ہیں، وہ تمام چیزوں کے بارے میں بدین ہیں یہاں تک کہ پینیر خدا اور خدا کے بارے میں بھی۔

ہنج البلانہ میں "مالک اشتر" کے نام حکم میں یہ آیا ہے،
 "ان البخل والجبین والحرص غرائز شتی یجمعھا سور الظن باللہ:
 "بخل، بزدلی، اور حرص ایسی مختلف قسم کی مذموم صفات ہیں جو سب کی سب خدا کے بارے میں سوئچن میں جمع ہیں۔"

روداد حدیبیہ اور زیر بحث آیات اسی معنی کا ظہور عینی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ پروردگار کے بارے میں سوئچن، کس طرح سے بخل و حرص اور خوف جیسے بڑے صفات کو حاصل کر لیتا ہے۔

چونکہ اس قسم کی غلط صفات کا سرچشمہ بعض اوقات عدم ایمان ہوتا ہے لہذا بعد والی آیت میں کہتا ہے: "جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا اس کی تقدیر جہنم کی آگ ہے، کیونکہ ہم نے کافروں کے لیے مہبط تھی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے" (ومن لم یؤمن باللہ ورسولہ فانا امتدنا للکافرین سعیرا)۔

انجام کار آخری زیر بحث آیت میں کفار اور منافقین پر خدا کے عذاب دینے کی قدرت کے اثبات کے لیے فرماتا ہے: "آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حاکمیت خدا کے لیے ہے، جسے چاہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہے عذاب کرتا ہے اور خدا غفور رحیم ہے" (و اللہ ملک السموات والارض ینفر لمن یشاء ویعذب من یشاء وکان اللہ غفوراً رحیماً)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں مغفرت اور بخشش کے مسئلہ کو عذاب کے مسئلہ پر مقدم رکھا ہے، اور آیت کے آخر میں پھر دوبارہ عفران اور رحمت الہی پر تاکید کی گئی ہے، کیونکہ ان تمام دھمکیوں اور ڈراووں کا مقصد تربیت ہے اور مسئلہ تربیت کا تقاضا یہ ہے کہ گناہگاروں اور کافروں تک کے لیے سزا گشت کی راہ کھلی ہے، خاص طور پر جبکہ ان معنی اعتراضات اور تنقیدوں میں سے زیادہ کا سرچشمہ جمالت اور بے خبری ہے اور ان قسم کے افراد کے سامنے بخشش کی امید میں اضافہ کرنا

۱۔ ہنج البلانہ خطبہ نمبر ۵۳۔

۲۔ آیت کے الفاظ کی روانی کا تقاضا یہ ہے کہ "انا اعتدنا لہم سعیرا" کہا جائے لیکن خاص طور پر پیغمبر کو بلکہ اس کی بجائے اہم ظاہر یعنی "الکافرین"

کہا گیا ہے تاکہ اس خرابی کو بیان کیا جائے جو کہ کفر ہے۔

چاہیے کہ شاید وہ راہ راست پر آجائیں۔

ایک منکحت

گناہ کی توجیہ کرنا ایک عام بیماری ہے

گناہ چاہے جتنا بھی سنگین ہو وہ توجیہ گناہ جتنی سنگینی نہیں رکھتا، کیونکہ وہ گنہگار جو گناہ کا معترف ہو وہ اکثر توبہ کی طرف مائل ہوتا ہے، لیکن مصیبت اس وقت شروع ہوتی ہے جب گنہگار اس کی توجیہ کرنے لگ جاتا ہے جو نہ صرف انسان کے سامنے توبہ کے راستے کو بند کر دیتا ہے بلکہ اُسے ہر گناہ کرنے میں اور بھی زیادہ راسخ اور زیادہ جبری بنا دیتا ہے۔ یہ توجیہیں بعض اوقات عزت و آبرو کی حفاظت اور لوگوں کے سامنے رسوائی سے بچنے کے لیے ہوتی ہیں۔ لیکن اس سے بھی بدتر اس وقت ہوتی ہیں جب وجدان کو دھوکہ دینے کے لیے کی جائیں۔

یہ توجیہیں کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے، اس کے مختلف نمونے بشر کی پوری تاریخ میں دیکھے جاسکتے ہیں، کہ تاریخ کے بڑے بڑے بدکار اپنے آپ کو یاد دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے کس طرح سے مضحکہ خیز توجیہات پیش کیا کرتے تھے جس سے ہر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

قرآن مجید نے جو ترمیم اور انسان سازی کا ایک عظیم درس ہے اس بارے میں بہت سے مباحث پیش کیے ہیں جس کا ایک نمونہ تو ہم اوپر والی آیات میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔

اس بحث کی تکمیل کے لیے دوسرے نمونے بھی غور و مطالعہ کے لیے پیش کر دیئے جائیں تو مناسب ہوگا۔

① مشرکین عرب بعض اوقات اپنے شرک کی توجیہ کے لیے اپنے بڑوں کی رسم سے متوسل ہوتے تھے اور کہتے تھے: انا وجدنا اباؤنا علیٰ امتنا وانا علیٰ اثارہم مقتدون یعنی ہم نے اپنے باپ و داداؤں کو ایک طریقے پر پایا اور ہم نے ان کے آثار کو اپنا ہوا ہے اور ہم انہیں کے آثار کی پیروی کر رہے ہیں۔

” انا وجدنا اباؤنا علیٰ امتنا وانا علیٰ اثارہم مقتدون ”

ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک دین پر پایا ہے اور ہم انہیں کے آثار کی پیروی کر رہے ہیں۔

(زخرف - ۲۳)

اور بعض اوقات جبر کی ایک قسم کے ساتھ متوسل ہوتے ہوئے کہتے تھے:

” لوسواء اللہ ما اشركنا ولا اباؤنا ”

” اگر خدا چاہتا تو نہ تو ہم ہی شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد شرک ہوتے ”

(الغافر: ۱۳۸)

۲) اور کبھی کمزور ایمان والے مسلمان جنگ سے فرار کرنے کے لیے پیغمبر کی خدمت میں آتے تھے، اور اس عنوان سے میدان کو خالی چھوڑ جاتے تھے کہ ہمارے گھروں کے در و دیوار ٹھیک طرح کے نہیں ہیں لہذا ہمیں نقصان کا خطرہ ہے: ”و یستأذن فریق منهم النبی یقولون ان بیوتنا عورة وماھن بعورة ان یریدون الا فرارا“ (احزاب - ۱۳) ان میں سے ایک گروہ پیغمبر سے اجازت طلب کرتا اور کہتا ہمارے گھر آسیب پذیر ہیں، حالانکہ وہ آسیب پذیر نہیں تھے، وہ تو صرف فرار کرتا چاہتے تھے۔

۳) اور کبھی اس بہانہ سے کہ اگر ہم رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے جائیں تو ممکن ہے کہ خوبصورت رومی عورتیں ہمیں فریفتہ کر لیں اور ہم حرام میں مبتلا ہو جائیں، لہذا پیغمبر سے جنگ میں شرکت نہ کرنے کی اجازت مانگتے،: ”ومنہم من یقول ان الذن لی ولا تفتنی (توبہ - ۲۹)“ ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو رہنے ہی دیں اور گناہ میں نہ ڈالیں۔“

۴) اور کبھی اس عنوان سے کہ ہمارے اموال اور بیوی بچوں کے خیال نے ہمیں روکے رکھا۔ پیغمبر کے فرمان کی اطاعت سے فرار کرنے جیسے عظیم گناہ کی توجیہ کرتے (آیات زیر بحث)

۵) شیطان نے بھی ایک غلط قیاس کے ذریعے اپنی صریح نافرمانی کی خدا کے سامنے توجیہ کی اور کہا: ”تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے، اور آدم کو مٹی سے! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک زیادہ شریف موجود ایک پست تر موجود کو سجدہ کرے!“: انا خیر منه خلقتی من نار و خلقتہ من طین۔ (اعراف - ۱۲)

۶) زمانہ جاہلیت میں بھی ”ذختر کشی“ جیسے عظیم جرم کی توجیہ کے لیے یہ کیا کرتے تھے کہ ہم اس چیز سے ڈرتے ہیں کہ جنگوں میں ہماری بیٹیاں دشمنوں کے ہاتھ لگ جائیں گی، لہذا ہماری غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم نئی پیدا ہونے والی لڑکیوں کو ”زندہ“ زمین میں دفن کر دیں، اور کبھی یہ کہتے کہ اگر ہماری اولاد زندہ رہ جائے تو ہم ان کی زندگی کی تائین پر قادر نہیں ہیں! (اسرار - ۳۱)

بیاں تک کہ بعض آیات قرآنی سے پتہ چلتا ہے کہ گنہگار اپنے گناہوں کی توجیہ کے لیے قیامت میں بھی ان امور سے تمسک کریں گے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہم نے ”وہ قوم کے بزرگوں کی پیروی کی تھی اور وہی لوگ تھے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، اور ہماری ماہنمائی کا ذمہ لے لیا تھا۔“

”ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیل“ (احزاب - ۶۷)

خلاصہ یہ ہے کہ توجیہ کرنے کی بلا ایک ایسی مصیبت ہے، جو ہمہ گیر ہے، جس نے لوگوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو، خواہ وہ عام ہوں یا خواص، اپنے گھرے میں لے لیا ہے، اور اس کا عظیم خطرہ یہ ہے کہ یہ گنہگاروں کے سامنے اصلاح کی راہیں بند کر دیتی ہے اور بعض اوقات حقیقتوں اور واقعیتوں کو خود انسان کی نظریں دگرگوں کر کے دکھانا اس کے

بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے "خوف اور بزدلی" کی "احتیاط" سے اور "حرص" کی "مستقبل کی تائین" سے اور "ہمتور" کی "قاہلیت" سے اور "ضعف نفس" کی "حیا و شرم" سے اور "بد حالی" کی "زہد" سے اور "ارتکابِ حرام" کی "کلاہ شرعی" سے اور "ذمہ داری" کے زیر بار جانے سے فرار کی "موضع کے ثابت نہ ہونے" سے اور اپنی "کمزوریوں اور کوتاہیوں" کی تصادق سے توجیہ کرتے ہیں۔ اور کس قدر دردناک ہے یہ امر کہ انسان اپنے ہاتھ سے راہِ نجات کو اپنے سامنے بند کر دے۔ اگرچہ یہ مغایہ ہمہ گیر کیا اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ لیکن اعتراض کی بات یہ ہے کہ وہ اس کو تحریف کر کے الٹا نتیجہ نکالتے ہیں، انسانی معاشروں، خاندانوں اور افراد کو اس رہ گزر سے کتنے عظیم نقصانات پہنچے ہیں؟

خداوند عالم ہم سب کو اس عظیم اور گھروں کو تباہ کرنے والی بلا اور مصیبت سے محفوظ رکھے! (آمین)

۱۵۔ سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَانِمَ
لِتَأْخُذُوا هَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا
كَلِمَةَ اللَّهِ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ
فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ
إِلَّا قَلِيلًا ۝

۱۶۔ قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعُونَ إِلَى
قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ
فَإِنْ تَطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا
كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا
أَلِيمًا ۝

۱۷۔ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرْجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرْجٌ وَلَا
عَلَى الْمَرِيضِ حَرْجٌ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَنْ يَتَوَلَّ يَُعَذِّبْهُ
عَذَابًا أَلِيمًا ۝

ترجمہ

۱۵۔ جب تم آئندہ چل کر مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو گے تو

پیچھے رہ جانے والے کہیں گے، ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دیں (تاکہ اس جہاد میں شرکت کریں) وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں، کہہ دو، تمہیں ہرگز ہمارے ساتھ چلنے کی اجازت نہیں ہے، خدا نے پہلے ہی سے یہ کہہ دیا ہے، لیکن عنقریب وہ یہ کہیں گے: تم ہمارے بارے میں حسد کر رہے ہو، لیکن وہ اس بات کو سمجھتے ہی نہیں مگر تھوڑا۔

۱۶۔ اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والوں کو کہہ دے: تمہیں عنقریب ایک جنگجو قوم کی طرف جانے کی دعوت دی جائے گی تاکہ تم ان سے جنگ کرو یا وہ اسلام لے آئیں، اگر تم نے اطاعت کی تو خدا تمہیں اچھی جزا دے گا، اور اگر تم نے اسی طرح سے رُوگردانی کی جیسے کہ پہلے بھی رُوگردانی کر چکے ہو تو وہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔

۱۷۔ ”نابینا“ ”لنگڑے“ اور ”بیمار“ (اگر وہ میدان جہاد میں شرکت نہ کریں) کوئی گناہ نہیں ہے، اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، خدا اُسے (بہشت) کے باغات میں داخل کرے گا، جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جو شخص رُوگردانی کرے گا تو اُسے دردناک عذاب میں گرفتار کرے گا۔

تفسیر

پچھے رہ جانے والے آمادہ طلب!

اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیات فتح خیبر کے بارے میں ہیں، جو صلح حدیبیہ کے بعد اور ہجرت کے ساتویں سال کے شروع میں واقع ہوئی۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: روایات کے مطابق جس وقت پیغمبر "حدیبیہ" سے پلٹ رہے تھے تو حکم خدا سے آپ نے حدیبیہ میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو فتح خیبر کی بشارت دی، اور تصریح فرمائی کہ اس جنگ میں صرف وہی شرکت کریں گے، اور جنگ میں حاصل شدہ مال غنیمت بھی انہیں کے ساتھ مخصوص ہوگا۔ مختلف کرنے والوں کو ان غنائم میں سے کچھ نہ ملے گا۔

لیکن جو نبی ان ڈرپوک دنیا پرستوں نے قرآن سے یہ سمجھ لیا کہ پیغمبر اس جنگ میں جو انہیں درپیش ہے یقینی طور پر کامیاب ہوں گے اور سپاہ اسلام کو بہت سا مال غنیمت ہاتھ آئے گا، تو وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میدانِ خیبر میں شرکت کی اجازت چاہی اور شاید اس عذر کو بھی ساتھ لیا کہ ہم گذشتہ غلطی کی تلافی کرنے، اپنی ذمہ داری کے بوجھ کو ہلکا کرنے، گناہ سے توبہ کرنے اور اسلام و قرآن کی مخلصانہ خدمت کرنے کے لیے یہ چاہتے ہیں کہ ہم میدانِ جہاد میں آپ کے ساتھ شرکت کریں! وہ اس بات سے غافل تھے کہ قرآنی آیات پہلے ہی نازل ہو چکی تھیں اور ان کے راز کو فاش کر چکی تھیں، جیسا کہ پہلی زیر بحث آیت میں بیان ہوا ہے۔

"جس وقت تم کچھ غنیمت حاصل کرنے کے لیے چلو گے تو اس وقت پیچھے رہ جانے والے کہیں گے، ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیں اور اس جہاد میں شرکت کرنے کا شرف بخشیں! (سیقول المخلفون اذا انطلقتم الى مغانم لتأخذوا وهاذرونا متبعكم)۔"

نہ صرف اسی موقع پر بلکہ دوسرے موقعوں پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ: یہ تن پرور، لالچی، کم تکلیف اٹھانے والے، ترلقموں کے پیچھے تو جاتے، لیکن سخت خطرناک اور دوز دراز کے میدانوں سے گریز کرتے تھے، جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت ۲۲ میں بیان ہوا ہے، "جس وقت کوئی غنیمت نزدیک اور سفر سہل اور آسان ہو تو اس وقت تو یہ تیری پیروی کرتے ہیں، لیکن (اب جبکہ میدان تنوک کے لیے) راستہ دُور اور پُر مشقت ہے تو روگردانی کر رہے ہیں اور عنقریب وہ قسم کھا کر کہیں گے: کہ اگر ہم میں تاب نہ لائے ہوتی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے: "لو كان عرضا قريبا وسفرا قاصدا لاتبعوك ولكن بعدت عليهم الشقة وسيقولون بالله لو استطعنا لخرجنا معكم"

بہر حال قرآن زیر بحث آیات میں اس منفعت جو اور فرصت طلب گروہ کے جواب میں کہتا ہے "وہ یہ

چاہتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل دیں“ (یریدون ان یبدلوا کلام اللہ)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ان سے کہہ دے: ”تم ہرگز ہمارے پیچھے نہ آنا“ تمہیں اس میدان میں شرکت کرنے کا حق نہیں ہے: (قل لن تتبعونا)۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ ”یہ تو وہ بات ہے جو خدا نے پہلے سے ہی کہہ دی ہے“ اور ہمیں تمہارے مستقبل کے بارے میں (باخبر کر دیا ہے،: (كذالك قال الله من قبل)۔

خدا نے حکم دیا ہے کہ ”غنائم خیر“ اہل حدیبیہ کے لیے مخصوص ہیں، اور اس چیز میں کوئی بھی ان کے ساتھ شرکت نہ کرے، لیکن یہ بے شرم اور پُر ادا عیبیچھے رہ جانے والے پھر بھی میدان سے نہیں ہٹتے اور تمہیں حسد کے ساتھ ہم کرتے ہیں، اور عنقریب وہ یہ کہیں گے: کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ تم ہم سے حسد کر رہے ہو“ (فسیقولون بل تعدونا)۔

اور اس طرح سے وہ ضمنی طور پر پیغمبر کی بھی تکذیب کرتے ہیں اور ”جنگ خیر“ میں انہیں شرکت سے منع کرنے کی اصل حسد کو شمار کرتے ہیں۔

قرآن آخری جملہ میں کہتا ہے: ”لیکن وہ کچھ بھی تو نہیں سمجھتے مگر تھوڑا“ (بل کانوا لایفقهون الا قلیلاً)۔

ہاں! ان کی تمام بدبختیوں کی اصل، جہالت، نادانی اور بے خبری ہے، جو ہمیشہ ان کے دامن گیر رہی ہے، خدا کے بارے میں جہالت، اور مقام پیغمبر کی عدم معرفت، اور انسانوں کی سرنوشت سے بے خبری اور دنیا کی دولت و ثروت کے ناپائیدار ہونے کی طرف سے عدم توجہ۔

یہ درست ہے کہ وہ مالی مسائل اور شخصی منافع کے سلسلے میں باہوش، دقیق اور باریک بین تھے، لیکن اس سے بڑھ کر جہالت اور کیا ہوگی کہ انسان تھوڑی سی دولت کے لیے اپنی تمام چیزوں کو بدلے میں دے ڈالے؟ آخر کار پیغمبر نے۔ تواریخ کی نقل کے مطابق۔ غنائم خیر صرف اہل حدیبیہ پر تقسیم کیے، یہاں تک کہ ان لوگوں کے لیے بھی جو حدیبیہ میں موجود تھے اور کسی وجہ سے جنگ خیر میں شریک نہ ہو سکے ان کے لیے بھی ایک حصہ قرار دیا، البتہ الیٰ آدمی صرف ایک ہی تھا، اور وہ ”جابر بن عبد اللہ“ تھا۔

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے ”حدیبیہ“ میں پیچھے رہ جانے والوں سے گفتگو میں، بعد والی آیت میں ایک پیش نہاد کرتا ہے اور ان کے سامنے بازگشت کی راہ کو اس طرح سے کھلی رکھتے ہوئے فرماتا ہے: ”بادینشین اعراب میں سے پیچھے رہ جانے والوں سے کہہ دو: عنقریب تمہیں ایک جنگجو اور طاقتور قوم سے

مقابلہ کے لیے نکلنے اور ان سے جگ کرنے کی دعوت دی جائے گی یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لیں " (قل للمخلفین من الأعراب ستدعون الی قوم اولی باس شدید تقاتلوہم اولسلمون)۔
 "اگر تم اطاعت کر دو گے تو خدا تمہیں نیک اجر دے گا، اور اگر تم نے روگردانی کی، جس طرح سے پہلے تم نے روگردانی کی تھی، تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا"؛ (فان تطیعوا یؤتکم اللہ اجرًا حسنًا وان تتولوا یماتہم من قبل یعذبکم عذابًا الیمًا)۔

اگر تم واقعتاً اپنے پہلے عمل سے پشیمان ہو گئے ہو اور راحت طلبی اور دنیا پرستی سے ہاتھ اٹھالیا ہے تو پھر اپنی صداقت کا امتحان ایک دوسرے سخت اور خوفناک میدان میں دو، ورنہ سخت میدانوں سے اجتناب کرنا، اور راحت و آرام اور صرف غنیمت کے لیے لڑائی کے میدانوں میں شرکت کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اور یہ چیز تمہارے نفاق، ضعف ایمان، بزدلی، اور خوف پر ایک دلیل ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے ان آیات میں بار بار پیچھے رہ جانے والوں (مخلفین) کا تذکرہ کیا ہے اور اصطلاح کے مطابق "غیر" کے بجائے "اہم ظاہر" کو استعمال کرتا ہے۔

یہ تعبیر خصوصیت کے ساتھ صیغہ ام مفعول کی صورت میں آئی ہے یعنی پیچھے چھوڑے ہوئے "یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس وقت صاحب ایمان مسلمانوں نے اس گروہ کی سستی اور بہانہ جو بیوں کا مشاہدہ کیا تو انہیں پیچھے چھوڑتے ہوئے اور ان کی حالت و کیفیت کی پرواہ کیے بغیر میدان جہاد کی طرف چل پڑے۔

لیکن اس بار سے میں کہ یہ جو جگ جو اور طاقت و رقوم جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے، کونسی جمعیت تھی؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

"تقاتلوہم اولسلمون" (ان سے جگ کرو یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں) کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اہل کتاب نہیں تھے، کیونکہ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے، بلکہ انہیں اس بات کا اختیار دیا جاتا ہے کہ یا تو وہ اسلام لے آئیں یا اہل ذمہ کی شرائط قبول کرتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ صحیح طریقہ سے زندگی گزاریں اور جزیہ دیتے رہیں، صرف مشرکین اور بت پرست ہی ہیں جن سے سوائے اسلام کے کوئی چیز قابل قبول نہیں۔ کیونکہ اسلام بت پرستی کو ایک دین کے طور پر قبول نہیں کرتا اور بت پرستی ترک کرنے کے لیے مجبور کرنا جائز ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زمانہ پیغمبر میں واقعہ "حدیبیہ" اور فتح خیبر کے بعد مشرکین کے ساتھ اہم جنگ سوائے "فتح مکہ" اور "جنگ حنین" کے اور کوئی نہیں تھی۔

لہذا اور پر والی آیت انہیں کی طرف اشارہ ہو سکتی ہے، خصوصاً جنگ حنین جس میں قبیلہ "ہوازن" اور "بنی سعد" کے سخت لاکش اور جگ جو قوم کے لوگ شریک تھے۔

لیکن بعض نے جو یہ احتمال دیا ہے کہ "یہ غزوہ موتہ" کی طرف اشارہ ہے جو رومیوں کے ساتھ انجام پائی تھی، تو بربات

بعید نظر آتی ہے کیونکہ وہ تو اہل کتاب تھے۔

اور یہ احتمال کہ اس سے پیغمبر کے بعد کی جنگیں مراد ہیں، جن میں سے "اہل فارس" و "یامہ" کی جنگیں ہیں، تو یہ بات بہت ہی زیادہ بعید ہے، کیونکہ آیات کالب و لہجہ یہ بتاتا ہے کہ یہ مسئلہ زمانہ پیغمبر کے ساتھ مربوط ہے، اور ہمارے لیے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اسے زمانہ پیغمبر سے بعد کی جنگوں پر منطبق کریں۔

ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کی فکر و نظریں کچھ سیاسی اسباب تھے جن کی وجہ سے انھوں نے اس مسئلہ پر زور دیا ہے۔

یہ حکمت بھی قابل توجہ ہے کہ پیغمبران سے وعدہ نہیں کرتے کہ تمہاری آئندہ کی جنگوں میں تمہیں کچھ مال غنیمت ملے گا، کیونکہ جہاد کا مقصد غنیمت کا حصول نہیں ہے، بلکہ وہ صرف یہ بتانا ہی کافی سمجھتا ہے کہ خدا تمہیں اچھا اجر دے گا اور عام طور پر یہ تعبیر آخرت کے اجر کے بارے میں ہے۔

یہاں پر ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سورہ توبہ کی آیہ ۸۳ میں ان نامحرموں کو کلی طور پر رد کرتے ہوئے کہتا ہے:

”فقل لن تخرجوا معی ابداً ولن تقاتلوا معی عدواً انکم رصیتم

بالقعود اول مرة فناقعد و امع الخالفین“ ”تم ہرگز کسی جنگ میں بھی میرے ساتھ باہر نہیں نکلو گے اور تم میرے ساتھ رہ کر دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کے مجاز نہیں ہو، کیونکہ تم پہلی مرتبہ بھی جنگ سے کنارہ کشی پر راضی ہو گئے تھے، اب بھی تم پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو۔

در حالیکہ زیر بحث آیت انھیں ایک اور سخت اور خطرناک میدان میں جنگ کی دعوت دے رہی ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ سورہ توبہ کی آیت تو جنگ تہوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ

مربوط ہے، کہ پیغمبران سے قطع امید کر چکے تھے اور زیر بحث آیت حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے کہ ابھی تک ان کی طرف سے امید منقطع نہیں ہوئی تھی۔ اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے:

اور چونکہ پیچھے رہ جانے والوں کے درمیان ایسے افراد بھی تھے جو کسی عضو کے ناقص ہونے کی وجہ سے یا بیماری

کی بنا پر واقعاً جہاد میں شرکت کی قدرت نہیں رکھتے تھے، لہذا ان کا حق یہاں نظر انداز نہیں ہونا چاہیے، اس لیے آخری زیر بحث آیت میں ان کے معذور ہونے کو واضح کرتا ہے۔

خاص طور پر یہ بات جو بعض مفسرین نے نقل کی ہے کہ گذشتہ آیت کے نزول اور پیچھے رہ جانے والوں کو عذاب

الہیم کی دھمکی دینے کے بعد معذوروں اور بیماروں کی ایک جماعت پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے خدا کے

رسول اس حالت میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، اور ان کے لیے اس طرح حکم بیان کیا:

”نابینا، لنگرے اور بیمار پر کوئی گناہ نہیں ہے، اگر وہ میدان جہاد میں شرکت نہ کریں“ (ولیس علی الاعلیٰ حرج

ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج)۔

صرف جہاد ہی نہیں ہے کہ جو قدرت و توانائی کے ساتھ مشروط ہے بلکہ تمام شرعی ذمہ داریاں عمومی شرائط کے ایک

سلسلہ کے ساتھ مشروط ہیں، جن میں سے ایک توانائی اور قدرت ہے اور آیات قرآن میں بارہا اس معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے، سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۶ میں ایک ٹکڑی کی صورت میں اس طرح بیان ہوا ہے: لا یكلف الله نفساً الا وسعها؛ خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ نہیں دیتا۔
یہ شرط منقولہ دلیلوں سے بھی ثابت ہے اور عقلی دلیلوں سے بھی۔

لیکن یہ گردہ اگرچہ میدان جہاد میں شرکت سے معاف رکھا گیا ہے، مگر انہیں بھی اپنے مقدر در بھر قوائے اسلام کو طاقت پہنچانے اور اہل اہل کو آگے بڑھانے کے لیے کوشش کرنی چاہیے، جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت ۹۱ میں بیان ہوا ہے: لیس علی المضعفاء ولا علی السراضی ولا علی الذین لا یجدون ما ینفقون حرج اذا نصحوا للہ ورسولہ: کمزوروں، بیماروں اور ان لوگوں پر جو (جہاد کے لیے) کچھ خرچ کرنے کا بھی ذریعہ نہیں رکھتے، کوئی گناہ نہیں ہے، (کہ وہ میدان میں حاضر نہ ہوں) مگر شرط یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول سے خیر خواہی کریں۔

یعنی اگر وہ ہاتھ سے کوئی کام انجام دینے پر قادر نہیں ہیں، تو حسب مقدر زبان سے تو گریز نہ کریں، اور یہ ایک عمدہ تعبیر ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ جو شخص جہنمی توانائی رکھتا ہے اتنی فروگذاشت نہ کرے، دوسروں لفظوں میں اگر کوئی معاذ جگ میں شرکت نہیں کر سکتا تو کم از کم معاذ کی پشت کو بھی مضبوط کرے۔

اور شاید زیر بحث آیت کا آخری جملہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو، جس میں فرماتا ہے: جو شخص خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اس کو بہشت کے اُن باغات میں داخل کرے گا، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، اور جو شخص روگردانی کرے گا اُسے دردناک عذاب میں گرفتار کرے گا۔ (ومن یطع الله ورسوله یدخلہ جنتاً تجری من تحتھا الانهار ومن یتول یدبذ عذاباً الیماً)

یہ احتمال بھی ہے کہ جن مواقع پر کسی حکم میں کوئی استثناء ہوتا ہے تو کچھ لوگ غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو معذوروں کی صف میں کھڑا کر لیتے ہیں، تو قرآن انہیں خبردار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر واقعاً وہ معذور نہ ہوئے تو وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ معذور ہونے، نابینا، سنگڑے اور سخت بیماروں کا مسئلہ "جبار" ہی کے لیے مخصوص ہے لیکن "دفاع" کے مسئلہ میں ہر شخص کو معذور بھر کیاں اسلام، وطن اسلامی اور جان کا دفاع کرنا چاہیے اور اس سلسلہ میں کوئی استثناء نہیں ہے۔

۱۸- لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَايَعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ
فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ
فَتْحًا قَرِيبًا ۝

۱۹- وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا
حَكِيمًا ۝

ترجمہ

۱۸- خدا ان مومنین سے جنہوں نے درخت کے نیچے تیری بیعت
کی راضی اور خوش ہوا، خدا اس کو جو (صداقت و ایمان) ان کے
دلوں میں چھپا ہوا تھا جانتا تھا، لہذا اس نے ان کے دل پر سکون و
اطمینان نازل کیا، اور اجر و پاداش کے عنوان سے ایک نزدیکی فتح انہیں
نصیب فرمائی۔

۱۹- اور بہت سے غنائم جنہیں وہی حاصل کریں گے اور خدا عزیز و حکیم ہے۔

تفسیر

بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں سے خدا کی خوشنودی

ہم بیان کر چکے ہیں کہ واقعہ حدیبیہ میں ”پیغمبر“ اور ”قریش“ کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہوا تھا، ان میں

سے پیغمبر نے "عثمان بن عفان" کو (جو اوس سفیان کے عزیزوں میں سے تھا، اور یہ رابطہ ظاہر اس کے انتخاب میں اثر رکھتا تھا) نمائندے کے طور پر مشرکین مکہ اور اشراف قریش کے پاس بھیجا تھا تاکہ وہ انہیں اس حقیقت سے آگاہ کرے کہ مسلمان جنگ کے ارادے سے نہیں آئے، بلکہ ان کا ہدف مقصد خانہ خدا کی زیارت اور کعبہ کا احترام ہے، لیکن قریش نے وقتی طور پر عثمان کو روک لیا، اور اس کے بعد مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ عثمان مارا گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا جب تک اس گروہ سے جگت کر دوں۔

اس کے بعد آپ اُس درخت کے نیچے تشریف لائے جو وہاں پر موجود تھا، اور لوگوں کے ساتھ تجدید بیعت کی اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے، اور کوئی شخص میدان جہاد سے فرائض نہیں کرے گا۔ اس بیعت کی شہرت مکہ میں پھیل گئی اور قریش سخت وحشت زدہ ہو گئے اور انہوں نے عثمان کو آزاد کر دیا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ بیعت "بیعت رضوان" (خوشنودی خدا کی بیعت) کے عنوان سے مشہور ہوئی اور مشرکین کو لڑنے پر اندام کر دیا اور یہ تاریخ اسلام میں ایک نقطہ عطف تھا۔

زیر بحث آیات اسی ماجرے کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "خدا ان مومنین سے جنہوں نے درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کی راضی اور خوشنود ہوؤا" (القد

رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرة)۔

اس بیعت کا مقصد تو انابیوں کو زیادہ سے زیادہ منظم کرنا، روحانی تقویت، جنگی آمادگی کی تجدید، انکار کی آزمائش اور

وفادار دوستوں کی فداکاری کے وزن کو آزمانا تھا۔

اس بیعت نے مسلمانوں کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی، چونکہ انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ

میں ہاتھ دے دیا تھا۔ اور صمیم قلب کے ساتھ وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔

خدا نے ان فداکار اور ایثار پیشہ مومنین کو جنہوں نے اس حساس لمحہ میں پیغمبر سے بیعت کی تھی چار عظیم اجر عطا فرمائے۔

جن میں سب سے زیادہ اہم اس کی رضا و خوشنودی تھی، جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت ۲۷ میں بیان ہوا ہے: ورضوان من

اللہ اکبر: "اور خدا کی رضا اور خوشنودی بہشت کی سب نعمتوں سے برتر ہے"

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا اس عہد و پیمان کے بارے میں ان کی وفاداری پر آمادگی اور ان کے دلوں میں چھپے

ہوئے ایمان اور صداقت کو جانتا تھا، اس لیے ان پر سکون و آرام نازل کیا" (فعلم ما فی قلوبہم

فانزل السکینۃ علیہم)۔

ایسا سکون و اطمینان کہ: دشمنوں کے انہوہ کے درمیان، اپنے وطن اور شہر و دیار سے دور دراز مقام پر، ان کے

آبادہ و تیار ہتھیاروں کے درمیان، کافی اسلحہ پاس نہ ہونے کے باوجود (چونکہ زیارت کے لیے آئے تھے نہ کہ جنگ

کے لیے کسی قسم کا خوف اور گھبراہٹ محسوس نہ کی، اور مضبوط پہاڑ کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے رہے اور یہ ان کے لیے خدا کی دوسری نعمت تھی۔

اصولی طور پر الطاف خاص اور خدائی امدادیں ایسے اشخاص کے شامل حال ہوتی ہیں جو خلوص نیت اور باطنی صدق و صفا کے حامل ہوں۔

لہذا ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

” ان العبد المؤمن الفقير ليقول يارب ارزقني حتى افعل كذا وكذا من البر ووجوه الخير فاذا علم الله عز وجل ذلك منه يصدق نيته كتب الله له من الاجر مثل ما يكتب له لو عمله، ان الله واسع كريم“

” فقیر بندہ مومن جب کبھی یہ کہتا ہے: خداوند مجھے توفیق عطا فرما کہ میں ایسے ایسے اچھے اور نیک کام کروں، جب خدا اس کی صدق نیت کو جان لیتا ہے تو وہ اس کے لیے وہی اجر و صلہ لکھ دیتا ہے جو اسے عمل کرنے کی صورت میں عطا کرتا، کیونکہ خدا وسیع رحمت والا کریم ہے۔“ لہ

آیت کے آخر میں تیسری نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اور انہیں اجر کے طور پر قریب کی فتح نصیب کی: (واتابهم فتحاً قریباً)۔

ہاں! یہ فتح جو اکثر مفسرین کے قول کے مطابق فتح خیبر تھی (اگرچہ بعض نے اسے فتح مکہ شمار کیا ہے) ایتار پیشہ مومنین کے لیے خدا کی تیسری نعمت تھی۔

” قریباً“ کی تعبیر اس چیز کی ایک تائید ہے کہ اس سے مراد ”فتح خیبر“ ہے، کیونکہ یہ فتح ہجرت کے ساتویں سال کی ابتداء میں، حدیبیہ کے واقعہ سے چند ماہ کے فاصلہ پر حاصل ہوئی۔

چوتھی نعمت جو بیعت رضوان کے بعد مسلمانوں کو نصیب ہوئی فراواں مادی غنائم تھے، جیسا کہ بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”اور دوسرا اجر وہ بجز غنائم ہیں جو ان کے ہاتھ آئیں گے“ (ومغانم كثيرة يأخذونها)۔

ان غنائم میں سے ایک وہی خیبر کے غنائم تھے جو مسلمانوں کو ایک مختصر عرصہ میں نصیب ہوئے، اور خیبر کے یہودیوں کی بے حساب ثروت کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ غنائم حد سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔

لیکن غنائم کو خیبر کے غنائم میں محدود کرنے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔

لہذا باقی اسلامی جنگوں کے غنائم بھی جو فتح حدیبیہ کے بعد حاصل ہوئے اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اور چونکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس وعدہ الہی پر مکمل اطمینان رکھیں، آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”خدا

شکست ناپذیر اور حکیم ہے“ (وكان الله عزيزاً حكيماً)۔
اگر تھیں یہ حکم دیا ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر صلح کر لو، تو وہ حکمت کی اساس پر تھا، وہ حکمت کہ وقت کے گزرنے
نے اس کے اسرار سے پردہ اٹھا دیا ہے، اور اگر وہ تھیں فتح قریب اور غنائم کثیرہ کا وعدہ دیتا ہے تو وہ اس بات پر قادر
ہے کہ اپنے وعدوں کو عملی جامہ پہنائے۔

اس طرح سے صاحب ایمان اور ایثار پیشہ مسلمانوں نے بیعت رضوان کے سایہ میں، اور ان حساس لمحات میں پیغمبر
سے وفاداری کا اعلان کر کے دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کر لی، جب کہ بے خبر اور ضعیف الایمان ڈر پوک منافق حسرت کی
آگ میں جلتے رہے۔

ہم اس گفتگو کو امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی گفتگو پر ختم کرتے ہیں۔ جبکہ آپ صدر اول کے مسلمانوں کی پاسروی اور دشمن
سے بے نظیر جہاد کے بارے میں بات کرتے ہیں، اور ست و کمزور عنصر مخاطبین کی خدمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

”فلما رأى الله صدقنا انزل بعد ونا الحکبت، وانزل علينا النصر حتى
استقر الاسلام ملتياً جراناً، ومتبوعاً اوطاناً، ولعمري لو كنا نأتى
ما اتيتم، ما قام لدين عمود، ولا اخضر للايمان عمود، وایم الله
لتحتلبنها دماً، لتتبعنھا ندماً!“

”جس وقت خدا نے ہمارے صدق و غلوص کو دیکھا تو ذلت و خواری کو دشمن پر اور کامیابی و نصرت
کو ہم پر نازل فرمایا، یہاں تک کہ اسلام صفحہ زمین پر پھیل گیا، اور وسیع علاقے اپنے لیے چن لیے، مجھے میری
جان کی قسم ہے کہ اگر ہم مبارزہ میں تمہاری طرح ہوتے تو ہرگز دین کا ستون قائم نہ ہوتا، اور ایمان کے درخت کی
شاخ سرسبز نہ ہوتی، اور خدا کی قسم تم دو دھکے بے خون دوہر گے اور پشیمان ہوں گے۔“

ایک نکتہ

بیعت اور اس کی خصوصیات

بیعت ”بیع“ کے مادہ سے اصل قرار داد معاملہ کے وقت ہاتھ میں دینے کے معنی میں ہے، اس کے بعد اطاعت
کے عہد و پیمان کے لیے ہاتھ میں ہاتھ دینے پر اس کا اطلاق ہونے لگا، اور وہ اس طرح ہوتا تھا کہ جب کوئی کسی
سے وفاداری کا اعلان کرنا چاہتا تھا اور اسے رسمی طور پر قبول کرنا اور اس کے فرمان کی اطاعت کرنا چاہتا تھا، تو اس

سے بیعت کیا کرتا تھا، اور شاید اس لفظ کا اطلاق اس معنی میں اس وجہ سے ہوتا تھا، کہ دونوں طرف سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ ایک عہد کرتا تھا جو دو معاملہ کرنے والوں کے عہد و پیمان کے مانند ہوتا تھا، بیعت کرنے والا بعض اوقات جان کی حد تک اور کبھی مال و اولاد کی حد تک اس کی اطاعت کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کرتا تھا، اور بیعت لینے والا بھی اس کی حمایت اور اس کے دفاع کو اپنے ذمہ لیتا تھا۔

ابن خلدون اپنی تاریخ کے مقدمہ میں کہتا ہے: "كانوا اذا بايع الامير جعل ايديهم في يده تأكيدا فاشبه ذلك فعل المبايع والمشتري: جب لوگ کسی امیر سے بیعت کرتے تھے۔ تو تاکید کے لیے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے تھے، اور یہ کام بیچنے اور خریدنے والے کے کام کے مشابہ تھا" لہٰذا قرآن بتلاتے ہیں کہ بیعت مسلمانوں کی ایبادات میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام سے پہلے عربوں میں ایک رسم کے طور پر رائج تھی، اسی بنا پر آغاز اسلام میں جب قبیلہ "ادس" اور "خزرج" حج کے موقع پر مدینہ سے مکہ آئے تو انہوں نے عقبہ میں پیغمبر اسلام کی بیعت کی تھی، مسند بیعت کے سلسلہ میں ان کا یہ عمل ایک جانے بچانے کا عمل تھا، اس کے بعد پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پر مسلمانوں سے تجدید بیعت کی، کہ ان میں سے ایک موقع یہی حدیبیہ میں "بیعت رضوان" کا تھا اور اس سے زیادہ وسیع وہ بیعت تھی جو فتح مکہ کے بعد انجام پائی، جس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ ممتحنہ کی تفسیر میں بیان ہوگی۔

باقی رہی "بیعت" کی کیفیت تو وہ کلی طور پر اس طرح سے تھی کہ بیعت کرنے والا اپنا ہاتھ بیعت لینے والے کے ہاتھ پر رکھتا، اور زبان حال یا زبان مقال کے ساتھ اطاعت و وفاداری کا اعلان کرتا، اور بعض اوقات بیعت کے ضمن میں اس کے لیے شرائط و حدود کا قائل ہوتا تھا، مثلاً مال کی حد تک، بیعت یا جان کی حد تک یا ہر چیز کی حد تک، یہاں تک کہ بیوی بچے تک قربان کر دینے کی حد تک،

اور بعض اوقات فرار نہ کرنے کی حد تک اور کبھی موت کی حد تک بیعت ہوتی تھی، (اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں معنی بیعت رضوان کے سلسلے میں تواریخ میں بیان ہوئے ہیں)

پیغمبر اسلام عورتوں کی بیعت کو بھی قبول کرتے تھے، لیکن وہ ہاتھ میں ہاتھ دینے کے طریقہ سے نہیں ہوتی تھی، بلکہ جیسا کہ تواریخ میں آیا ہے۔ آپ پانی کا ایک بڑا برتن لانے کا حکم فرماتے تھے اور اپنا ہاتھ برتن کی ایک طرف ڈبو دیتے تھے، اور بیعت کرنے والی عورتیں اپنے ہاتھ دوسری طرف ڈبو دیا کرتی تھیں۔

کبھی "بیعت" کے ضمن میں کسی کام کو انجام دینے یا کچھ کاموں کو ترک کرنے کی شرط کرتے تھے، جیسا کہ پیغمبر نے فتح مکہ کے بعد عورتوں سے بیعت لینے وقت شرط کی کہ "وہ شرک نہ کریں، اور بے عفتی سے آلودہ نہ ہوں، اور چوری نہ کریں اور اپنے بچوں کو قتل نہ کریں اور دیگر امور" (سورہ ممتحنہ آیہ ۱۲)

① بیعت کی ماہیت

یہ ایک طرف سے بیعت کرنے والے کی جانب سے اور دوسری طرف بیعت لینے والے کی جانب سے، ایک قسم کی قرارداد اور معاہدہ ہے، اور اس کا مضمون و مطلب بیعت لینے والے کی اطاعت و پیروی اور دفاع و حمایت ہے اور ان شرائط کے مطابق جو اس میں بیان کیے جاتے ہیں، بیعت کے مختلف حصے ہوتے ہیں۔

آیات قرآنی اور احادیث کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت، بیعت کرنے والے کی طرف سے ایک ضروری اور لازمی عہد ہوتا ہے، جس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے، اور اس بنا پر یہ ”اوفوا بالعقود“ کے قانون کا کلی طور پر مشمول ہے۔ (مائدہ - ۱)

اس بنا پر بیعت کرنے والا فسخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، لیکن بیعت لینے والا اگر مصلحت دیکھے تو اپنی بیعت اٹھا سکتا ہے اور اسے فسخ کر سکتا ہے، اور اس صورت میں بیعت کرنے والا اپنے فرض اور عہد سے آزاد ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ بیعت کو ”انتخابات“ کے مشابہ یا اس کی ایک نوع سمجھتے ہیں، حالانکہ ”انتخابات“ کا مسئلہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔ یعنی اس کی ماہیت منتخب ہونے والے کے لیے ایک قسم کی مسؤلیت و عہد و ذمہ داری اور مرتبہ و مقام کا عطا کرنا ہے، یا دوسرے لفظوں میں کسی کام کے انجام دینے میں وکیل بنانا ہے، اگرچہ اس انتخاب میں انتخاب کرنے والوں کے لیے بھی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں، (تمام نکاتوں کی طرح) جب کہ بیعت ایسی چیز نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں، انتخابات مقام کی عطائگی ہے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ وکالت کے مشابہ ہے، جبکہ بیعت ”اطاعت کا عہد“ ہے۔

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں بعض باتوں میں ایک دوسرے سے مشابہت پیدا کر لیں، لیکن یہ شبہات ہرگز ان کے مفہوم و ماہیت کی وحدت کے معنی میں نہیں ہے، اسی لیے بیعت کے سلسلے میں بیعت کرنے والا فسخ کرنے کا حق اور اختیار نہیں رکھتا، جب کہ انتخابات میں بہت سے مواقع پر انتخاب کرنے والے فسخ کرنے کا حق رکھتے ہیں، کہ انتخاب ہونے والے شخص کو سب مل کر اس کے مقام سے معزول کر دیں۔ (غور کیجیے)

پیغمبر اور ائمہ معصومین کے لیے۔ جو خدا کی طرف سے منسوب ہوتے ہیں۔ کسی قسم کی بیعت کی ضرورت نہیں ہوتی، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور امام معصوم اور ان کے نائب سے نصب شدہ فرد کی اطاعت واجب ہے،

لہذا واقعہ کر بلا میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے شب عاشور خطبہ پڑھا اور اپنے اصحاب کی تدرانی کے اظہار کے ضمن میں اپنی بیعت ان سے اٹھالی، تاکہ وہ جہاں ان کا دل چاہے چلے جائیں (سیکن وہ اسی طرح سے وفادار رہے)، اور فرمایا، فانطلقوا

فی حل لیس علیکم منی زمام:

(کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۵۵)

خواہ کسی نے بیعت کی ہو یا کسی نے بیعت نہ کی ہو۔

دوسرے لفظوں میں نبوت و امامت کا مقام ہی وجوب اطاعت کو لازم و ضروری قرار دیتا ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم: (نساء- ۵۹)

لیکن یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر پیغمبر نے بارہا اپنے صحابہ سے اور تازہ مسلمانوں سے بیعت کیوں لی، جس کے دونوں نے صراحت کے ساتھ قرآن میں آئے ہیں، (بیعت رضوان تو اسی سورہ میں ہے اور اہل مکہ سے جو بیعت لی اس کی طرف سورہ ممتحنہ میں اشارہ ہوا ہے)

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ہلاک و ششم یہ بیعتیں وفاداری پر ایک قسم کی تاکید تھیں، جو خاص خاص موقعوں پر انجام پائی تھیں، خاص طور پر سخت قسم کے بحرانی اور حوادث کے مقابلہ کے لیے ان سے استفادہ کیا گیا ہے، تاکہ اس کے سایہ میں لوگوں کے جموں میں تازہ روح پھونکی جائے، جیسا کہ ہم گذشتہ بحثوں میں بیعت رضوان کے عجیب و غریب اثرات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

لیکن وہ بیعتیں جو خلفاء کے لیے لیتے تھے وہ ان کے مقام خلافت کو قبول کرنے کے طور پر ہوتی تھیں، اگرچہ ہمارے عقیدہ کے مطابق پیغمبر کی خلافت کوئی ایسی چیز نہیں جو لوگوں کی بیعت کے طریقہ سے انجام پائے، بلکہ وہ صرف خدا کی طرف سے اور خود پیغمبر یا سابق امام کے ذریعہ منعقد ہوتی ہے۔

اور اسی بنا پر وہ بیعت جو مسلمانوں نے علی یا امام حسن یا امام حسین کی، کی تھی وہ بھی وفاداری پر تاکید ہی پہلو رکھتی تھی، اور پیغمبر کی بیعتوں کے ساتھ مشابہت رکھتی تھی۔

﴿۴﴾ کیا موجودہ حالات میں بھی بیعت ایک اسلامی اصل کے طور پر قابل قبول ہے؟ دوسرے لفظوں میں، کیا آج بھی بیعت کو خام کیا جا سکتا ہے، مثلاً کوئی قوم کسی لائق اور حامل شرائط شرعی فرد کو انتخاب کرے (اور لشکر کے کمانڈر انچیف رئیس قوم یا رئیس حکومت کے عنوان سے)، اس کی بیعت کر لیں؟ تو کیا اس قسم کی بیعتیں احکام شرعی کی مشمول بیعت ہو سکتی ہے؟ کیونکہ اصطلاح کے مطابق بیعت کے بارے میں قرآن و سنت سے کوئی ”عموم“ اور ”اطلاق“ ہمارے پاس نہیں ہے، لہذا اس مسئلہ کو عمومیت دینا مشکل نظر آتا ہے۔ اگرچہ ”اوفوا بالعقود“ والی آیت کے عموم سے استدلال کرنا چندالبعید نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو ابہام بیعت سے مربوط مسائل میں پایا جاتا ہے اس بات سے انحراف ہے کہ ہم قطعی اور یقینی طور پر ”اوفوا بالعقود“ پر تکیہ کریں، خاص طور پر جبکہ ہماری فقہ میں بیعت کے لیے پیغمبر اور امام معصوم کے علاوہ کوئی مقتدا نظر نہیں آتا۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ ولی فقہ کی نیابت کا مقام ہماری نظر میں ایک ایسا مقام ہے جو ائمہ معصومین کی طرف سے معین ہوا ہے، اور اس کے لیے کسی قسم کی بیعت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ لوگوں کا ولی فقہ کی اطاعت و پیروی کرنا اس کے اس مقام سے استفادہ کا امکان اور اصطلاح کے مطابق ”بسطیہ دینا ہے۔“

لیکن یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اس کا مقام لوگوں کے اتباع اور پیروی کا مرہون ہو، اور پھر لوگوں کے پیروی کرنے

کا مسئلہ بیعت کے مسئلہ سے کوئی ربط نہیں رکھتا، بلکہ ولایت فقیہ کے بارے میں حکم الہی پر عمل کرنا ہے، (غور کیجئے)

۵) بہر حال "بیعت" مسائل اجرائی سے مربوط ہے، اور اس کا احکام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، یعنی کسی شخص کی بیعت کر لینا ہرگز اسے "تشریح اور قانون وضع کرنے کا حق نہیں دیتا، بلکہ قوانین کو کتاب سنت سے لینا چاہیے، اور پھر انہیں جاری کرنا چاہیے، اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

۶) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اور معصوم پیشوا کی بیعت خدا کے لیے ہونی چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں بیعت ایسے امور میں سے ہے جس میں قصد قربت ضروری ہے۔ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے آیا ہے۔

"ثلاثة لا يكلمهم الله عز وجل يوم القيامة ولا ينظر اليهم ولا يزيكهم ولهم عذاب اليم، رجل بايع اماما لا يباعد الله الدنيا ان اعطاه ما يريد وفي له، والاكف، ورجل بايع رجلا يسلطه بعد العصر مخلف بالله عز وجل لقد اعطى بها كذا وكذا فصدقه واخذها ولم يعط فيها ما قال، ورجل على فضل ماء بالفلات يمنع ابن السبيل"

"تین شخص ایسے ہیں جن سے خدا بات نہیں کرے گا، اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، ایک تو وہ شخص جو امام کی بیعت کرے اور اس سے اس کا مقصد دنیا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، کہ اگر وہ اس کی مطلوبہ چیز سے دے دے تو پھر تو وہ اپنی بیعت کو پورا کرے گا، ورنہ علیحدہ ہو جائے گا، اور ایک وہ شخص جو عصر کے وقت کے بعد جنس بیچتا ہے اور قسم کھا کر کہے کہ میں نے یہ جنس اتنی رقم دے کر خریدی ہے، اور مشتری سچ سمجھ کر اسے خرید لیتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا، تیسرا وہ شخص جس کے پاس بیابان میں فالتو پانی موجود ہے، لیکن وہ مسافر کو نہیں دیتا۔

عصر کی تعبیر یا تو اس وقت کی شرافت کی وجہ سے ہے اور یا اس بنا پر ہے کہ بہت سے جنس بیچنے والے اس موقع پر اپنی جنس کو جس قیمت پر خریدتے ہیں اسی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔

۷) بیعت توڑنا گناہان کبیرہ میں سے ہے ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر خلیفہ اسلام سے منقول ہے،

"ثلاثة موبقات، نكث الصفة وترك السنة وفساق الجماعة"

”تین گناہ ایسے ہیں جو انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں، (اور خدا کے شدید عذاب میں اُسے پھینک دیتے ہیں) بیعت توڑنا، سنت کو ترک کرنا، اور جماعت سے جدائی اور علیحدگی اختیار کرنا“ اے ترک سنت ظاہر ان قوانین کی طرف اشارہ ہے، جو پیغمبر اسلام لائے ہیں، اور جماعت سے جدائی کا معنی اس سے اعراض کرنا اور پشت پھیرنا ہے نہ کہ صرف جماعت میں شریک نہ ہونا۔

۸) ”بیعت“ علی علیہ السلام کے ارشادات میں

بئح البلاغہ کے خطبوں میں بارہا بیعت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی ہے۔ اور امام نے بارہا اس بیعت کا جو لوگوں نے آپ سے کی تھی، ذکر کیا ہے۔

ان میں سے ایک موقع پر فرماتے ہیں: اے لوگو! تمہارا مجھ پر ایک حق ہے، اور میرا تم پر ایک حق ہے۔ اب رہا تمہارا حق مجھ پر تو وہ یہ ہے کہ میں تمہارا مہر د اور خیر خواہ رہوں اور تمہارے بیعت المال کو تمہارے ہی لیے خرچ کروں، تمہیں تعلیم دوں تاکہ تم جمالت سے نجات پاؤ اور تمہیں تادیب کروں تاکہ تمہیں آگاہی حاصل ہو۔ اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

” واما حقى عليكم فالوفاء بالبيعة، والنصيحة في المشهد والمغيب،

والاجابة حين ادعوكم والطاعة حين امركم“

باقی رہا میرا حق تمہارے اوپر تو وہ یہ ہے کہ اپنی بیعت میں وفادار رہو، اور آشکار و پنهان خیر خواہی کرو جس وقت تمہیں پکاروں تو لبیک کہو، اور جس وقت تمہیں حکم دوں تو اطاعت کرو۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

”لم تكن يبعثكم اياي فلتة“

تمہاری بیعت مجھ سے بغیر سوچے سمجھے اور اچانک انجام نہیں پائی، تاکہ معمولی سے معمولی شک و تردید بھی میری اطاعت کے بارے میں اختیار کر دے۔

اور اس خطبہ میں جو جگہ ”جمل“ سے پہلے اور مدینہ سے بصرہ کی طرف جاتے وقت ارشاد فرمایا، لوگوں کو ان کی بیعت پر پائیداری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

” وبايعنى الناس غير مستكرهين، ولا مجبرين، بل طائعين مختيرين“

” لوگوں نے بغیر کسی جبر واکراہ کے اطاعت و اختیار کے ساتھ میری بیعت کی تھی “ لے
اور آخر میں معاویہ کے مقابلہ میں، جس نے امام کی بیعت سے سرتابی کی تھی اور کسی نہ کسی طرح سے اس پر نکتہ چینی کرنا چاہتا
تھا۔ فرمایا:

” بایعنی التورم الذین بایعوا ابا بکر و عمر و عثمان علی ما بایعوه علیہ،
فلم یکن للشاہدان یختار، ولا للعائب ان یرد “

” انہیں لوگوں نے جنہوں نے ابو بکر و عمر و عثمان کی بیعت کی تھی، میری انہیں شرائط اور کیفیت میں بیعت
کی ہے۔ اس بنا پر نہ تو کسی حاضر کو یہ اختیار ہے کہ بیعت کو فسخ کر دے اور نہ ہی کسی غائب کو رد کرنے کی اجازت
ہے “ لے

ہنج البلاغہ کی بعض عبارتوں سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ” بیعت “ ایک بار سے زیادہ نہیں ہوتی، اس میں تجدید نظر نہیں
ہو سکتی، اور نہ ہی اس میں فسخ کا اختیار ہوتا ہے اور جو شخص اس سے سرتابی کرے وہ طعنہ زن اور عیب جو شمار ہوتا ہے، اور جو شخص
اس کے قبول یا رد کرنے کے بارے میں غور و فکر کرے یا شک و تردد کرے وہ منافق ہے!
” انہایعۃ واحدۃ، لایثنی فیہا النظر، ولا یستأنف فیہا الخیار،

الخارج منها طاعن، والمروی فیہا مداہن! لے
ان تعبیرات کے مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ان لوگوں کے سامنے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے آپ کی
امانت منصوصہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور یہاں نہ جوئی کرتے تھے، بیعت کے مسئلہ کے ساتھ جو ان کے نزدیک مسلم تھا استدلال
کرتے تھے، تاکہ امام کی اطاعت سے روگردانی کی انہیں گنجائش نہ ہو، اور معاویہ اور اس کے مانند لوگوں کے گوش گزار فرماتے
تھے کہ جس طرح وہ خلفاء ثلاثہ کی خلافت کی مشروعیت کا قائل ہے۔ اسی طرح اسے امام کی خلافت کا بھی قائل ہونا چاہیے، اور ان
کے لیے تسلیم فرم کرنا چاہیے بلکہ آپ کی خلافت تو زیادہ مشروع ہے، چونکہ آپ کی بیعت زیادہ وسیع اور عام لوگوں کی رضا
و رغبت سے انجام پائی تھی،
اس بنا پر بیعت کے ساتھ استدلال کرنا، امام کے خلاف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ منسوب ہونے کے مسئلہ،
اور بیعت کے تاکید ہونے کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا۔

لے ہنج البلاغہ خط نمبر ۱۔

لے ہنج البلاغہ خط نمبر ۲۔

” توجہ کرنا چاہیے کہ گذشتہ خلفاء کی بیعت پر اس لیے تکیہ کیا گیا تھا، چونکہ معاویہ انہیں کی طرف منسوب ہوا تھا، اور ان کی

حمایت کا دم بھرتا تھا، لہذا جو کچھ شکستہ میں بیان ہوا ہے اس کے ساتھ منافات نہیں رکھتا۔

لے ہنج البلاغہ خط نمبر ۳۔

لہذا اسی پنج السلاغہ میں ایک موقع پر امام حدیث ثقلین کے ساتھ جو امامت کے نصوص میں سے ہے۔ اشارہ فرماتے ہیں۔

اور دوسری جگہ مسئلہ وصیت و وراثت کی طرف اشارہ کرتے ہیں یہ (غور کیجیے)
اور اپنی دوسری عبارتوں میں بیعت کے لیے وفاداری کے لازم و ضروری ہونے، اور اس کے دوام اور فتح و تجدید نظر کے عدم امکان اور تکرار کی احتیاج کے نہ ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کہ یہ بھی ایسے مسائل ہیں جو بیعت کے سلسلہ میں قابل قبول ہیں۔

صنفی طور پر ان سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر بیعت جبر و اکراہ کا پہلو رکھتی ہو یا لوگوں کو غفلت میں رکھنے کی صورت میں انجام پائے تو اسکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ وہی بیعت قابل قدر ہے جو ارادہ و فکرمندی و اختیارات اور مطالعہ کے بعد انجام پائے، (پھر بھی غور کیجیے)

۲۰- وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُ وَنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَذِهِ
 وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۖ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَ
 يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝

۲۱- وَأُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ
 عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝

ترجمہ

۲۰- خدا نے بہت سے غنائم کا تمہیں وعدہ دیا ہے، جو تم حاصل کرو گے، لیکن ان میں سے یہ ایک تمہارے لیے زیادہ جلدی فراہم کر دی ہے اور لوگوں، (دشمنوں) کے دستِ ظلم کو تم سے روک دیا تاکہ یہ مومنین کے لیے ایک نشانی ہو اور تمہیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرے۔

۲۱- علاوہ ازیں دوسرے غنائم و فتوحات جن پر تمہیں قدرت نہیں ہے۔ لیکن خدا کی قدرت ان پر احاطہ رکھتی ہے، تمہیں عطا کرے گا، اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

صلح حدیبیہ کی مزید برکات

یہ آیات اسی طرح سے "صلح حدیبیہ" سے مربوط مباحث اور اس کے بعد کے واقعات کو بیان کر رہی ہیں، اور

ان برکات و فوائد کی۔ جو اس رہ گزر سے مسلمانوں کو نصیب ہوئے۔ تشریح کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے ”خدا نے بہت سے غنائم کا تم سے وعدہ کیا ہے، جنہیں تم حاصل کرو گے، لیکن یہ ایک بہت جلدی تمہارے لیے فراہم کر دی ہے“ (وعدکم اللہ مغنائم کثیرة تأخذونها فاجل لکم ہذہ)۔ آیت کالب و لہج بتاتا ہے کہ یہاں غنائم کثیرہ سے مراد وہ تمام غنائم ہیں جو خدا نے مسلمانوں کو عطا کیے تھے، چاہے تھوڑی مدت میں اور چاہے طویل مدت میں، یہاں تک کہ مفسرین کی ایک جماعت کا نظریہ، یہ ہے کہ وہ غنائم جو دامن قیامت تک مسلمانوں کے ہاتھ آتے رہیں گے وہ بھی اس عبارت میں داخل ہیں۔

اور یہ جو وہ کہتا ہے ”ان میں سے یہ ایک بہت جلدی تمہارے لیے فراہم کی ہے، تو غالباً اسے ”غنائم خیبر“ کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو مختصر سے فاصلہ میں فتح حدیبیہ کے بعد فراہم ہوئی۔

لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ ”ہذہ“ فتح حدیبیہ کی طرف اشارہ ہے، جو عظیم ترین معنوی فتح تھی۔

اس کے بعد اس ماجرہ میں مسلمانوں کے لیے خدا کے الطاف میں سے ایک دوسرے لطف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: ”اور لوگوں کے دست تعدی کو تم سے روک دیا“ (و کف ایدی الناس عنکم)۔ یہ ایک بڑا لطف تھا کہ وہ افراد کی کمی اور کافی مقدار میں آلات جنگ کے نہ ہونے کے باوجود وہ بھی وطن سے دور دراز کے علاقہ میں اور دشمن کے عین گڑھ میں حملے سے بچے رہے، اور دشمن کے دل میں اس طرح کا رعب ڈالا کہ جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کا حملہ کرنے سے رُکے رہے۔

مفسرین کی ایک جماعت اس جملہ کو خیبر کے ماجرے کی طرف اشارہ سمجھتی ہے کہ ”بنی اسد“ اور ”بنی غطفان“ کے قبائل نے یہ مصمم ارادہ کیا ہوا تھا کہ مسلمانوں کے پیچھے مدینہ پر حملہ کر دیں اور مسلمانوں کے اموال کو لوٹ کرے جائیں اور ان کی خواتین کو قید کر لیں۔

یا ان دونوں قبیلوں کی ایک جماعت کے مصمم ارادہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ جن کا ارادہ یہ تھا کہ یہودیوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن خدا نے ان کے دلوں میں رعب اور وحشت ڈال دی اور وہ اپنے ارادہ سے باز آ گئے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے، چونکہ بعد کی چند آیات میں ہم اسی تعبیر کو مشاہدہ کرتے ہیں جو اہل مکہ کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور ایک تفصیل و تشریح کے مانند ہے، اس مطلب کے لیے جو زیر بحث آیت میں آیا ہے۔ اور قرآن کی روش کے ساتھ جو اجمال و تفصیل کی روش ہے سازگار ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ مشہور روایات کے مطابق ساری کی ساری سورہ فتح ماجرے حدیبیہ کے بعد اور پیغمبر کی مکہ سے مدینہ کی طرف بازگشت کی راہ میں نازل ہوئی ہے۔

اس کے بعد اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے خدا کی نعمتوں میں سے دو دوسری عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، مقصد یہ تھا کہ یہ واقعات مومنین کے لیے (تیری دعوت کی حقانیت پر) نشانی بنیں، اور خدا تمہیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرے“ (ولتکون آية للمؤمنين ويهديك صراطاً مستقيماً)۔

گ۔ جب بعض مفسرین "لنکون" کی ضمیر کو "غنائم موعود" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور بعض دوسرے مسلمانوں کو دشمنوں کے حملے سے محفوظ رکھنے کی طرف، لیکن مناسب یہ ہے کہ یہ ضمیر "حدیبیہ کے تمام حوادث اور اس کے بعد کے واقعات کی طرف لوٹے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک خدا کی آیتوں میں سے ایک آیت، اور پیغمبر کی صداقت پر ایک دلیل، اور لوگوں کے لیے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کا ایک وسیلہ تھا، اور ان کا ایک حصہ تو پیشین گوئی اور خبر غیبی کا پہلو رکھتا تھا اور ان میں سے بعض عام قسم کے حالات و اسباب کے ساتھ سازگار نہ تھے اور مجموعی طور سے یہ سب پیغمبر کے معجزات میں سے واضح معجزہ شمار ہوتے تھے۔

‡ ‡ ‡ ‡

بعد والی آیت میں مسلمانوں کو مزید بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے:
 "خدا نے تمہیں اور دوسری فتوحات اور غنیمتوں کا وعدہ دیا، جن پر تمہیں نہ پہلے قدرت تھی نہ اب ہے، لیکن خدا کی قدرت ان سب پر احاطہ کیے ہوئے ہے، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے؛ (واخری لم تقدر وواعیہا قد احاط اللہ بها وکان اللہ علی کل شیء قدیراً)۔"

اس بابے میں کہ یہ وعدہ کونسی غنیمت اور کونسی کامیابی کی طرف اشارہ ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض تو اسے فتح مکہ اور "جین" کی غنیمتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور بعض ان فتوحات اور غنیمتوں کی طرف، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت اسلامی کو نصیب ہوئیں۔ (مثل فتح ایران دروم و مصر) یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام ہی کی طرف اشارہ ہو۔ لہ

"لم تقدر وواعیہا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان اس سے پہلے ہرگز اس قسم کے فتوحات و غنائم کا خیال تک نہ دیتے تھے، لیکن اسلام کی برکت اور خدائی امدادوں کی بنا پر ان میں یہ قدرت پیدا ہو گئی۔

بعض نے اس جملہ سے یہ مطلب نکالا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان پہلے سے ان فتوحات کے بارے میں بحث چلی ہوئی تھی۔ لیکن وہ ان کو انجام دینے کے لیے خود کو ناتواں اور کمزور سمجھتے تھے، خصوصاً وہ حدیث جو جنگِ احزاب کے واقعہ میں منقول ہے اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ: اس دن جب کہ پیغمبر نے مسلمانوں کو ایران دروم و مین کی فتح کی بشارت دی تو منافقین نے اس کا مذاق اڑایا۔

"قد احاط اللہ بها" (خدا نے ان کا احاطہ فرمایا) کا جملہ ان غنائم یا فتوحات پر، پروردگار کی قدرت کے احاطہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن بعض نے اسے اس کے احاطہ عملی کی طرف اشارہ سمجھا ہے، لیکن پہلا معنی آیت کے دوسرے جملوں کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔ البتہ دونوں معانی کو جمع کرنے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔

اور آخر میں آیت کا آخری جملہ یعنی "وکان اللہ علی کل شیء قدیراً" درحقیقت پہلے جملہ کے لیے علت

لہ "اخری" "مغائم" کی صفت ہے جو مخدوف ہے، اور تقدیر میں "مغائم اخری" ہے، جو منصوب ہے۔ "مغائم کثیرہ" پر عطف کی بنا پر۔

کے بیان کے طور پر ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی ہر چیز پر قدرت کی بنا پر اس قسم کی فتوحات مسلمانوں کے لیے عجیب نہیں ہیں۔

پھر حال یہ آیت اخبار غیبی، اور قرآن مجید کی آئندہ کے بارے میں پیشین گوئیوں میں سے ہے، یہ کامیابیاں تھوڑی ہی مدت میں وقوع پذیر ہوئیں، اور ان آیات کی عظمت کو واضح کیا،

ایک نکتہ جنگِ خیبر کا ماجرا

جب پیغمبرِ حبیبیہ سے واپس لوٹے تو تمام ماہ ذی الحجہ اور ہجرت کے ساتویں سال کے محرم کا کچھ حصہ مدینہ میں توقف کیا، اس کے بعد اپنے اصحاب میں سے اُن ایک ہزار چار سو افراد کو جنہوں نے مدینہ میں شرکت کی تھی ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے، (جہاں اسلام کے برخلاف تحریکوں کا مرکز تھا، اور پیغمبرِ حبیبیہ کی مناسب فرصت کے لیے گن گن کر دن گزار رہے تھے کہ اس مرکز کو ختم کریں)

”غطفان“ کے قبیلہ نے شروع میں تو خیبر کے یہودیوں کی حمایت کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بعد میں ڈر گئے اور اس سے رُک گئے۔

پیغمبرِ حبیبیہ جس وقت ”خیبر“ کے قلعوں کے نزدیک پہنچے تو آپ نے اپنے صحابہ کو رُکنے کا حکم دیا، اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کیا اور یہ دُعا پڑھی۔

”اللهم رب السموات وما اظلن، ورب الارضين وما اقلن

... لنا لك خير هذه القريّة، وخير اهلها، ونعوذ بك من شرّها
وشرّ اهلها، وشرّ ما فيها“

”خدا وندا اے آسمانوں کے پروردگار اور جن پر انھوں نے سایہ ڈالا ہے، اور اے زمینوں کے پروردگار اور جن چیزوں کو انھوں نے اُٹھا رکھا ہے، میں تجھ سے اس آبادی اور اس کے اہل میں جو خیبر ہے اس کا طلب گار ہوں، اور تجھ سے اس کے شر اور اس میں رہنے والوں کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔“

اس کے بعد فرمایا: ”بِسْمِ اللّٰهِ“ آگے بڑھو! اور اس طرح سے رات کے وقت ”خیبر“ کے پاس جا پہنچے، اور صبح کے وقت جب اہل ”خیبر“ اس ماجرے سے باخبر ہوئے تو خود کو لشکرِ اسلام کے محاصرہ میں دیکھا، اس کے بعد پیغمبر نے یکے بعد دیگرے ان قلعوں کو فتح کیا، یہاں تک کہ آخری قلعہ تک، جو سب سے زیادہ مضبوط اور طاقتمور

تھا، اور مشہور یہودی کمانڈر "مرحب" اس میں رہتا تھا، پہنچ گئے۔

انہیں دنوں میں ایک سخت قسم کا درد سر، جو کبھی کبھی پیغمبر کو عارض ہوا کرتا تھا، آپ کو عارض ہو گیا، اس طرح سے کہ ایک دو دن آپ اپنے خیمہ سے باہر نہ آسکے تو اس موقع پر (مشہور اسلامی تواریخ کے مطابق) حضرت ابوبکر نے علم سنبھالا اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر یہودیوں کے لشکر پر حملہ آور ہوئے، لیکن کوئی نتیجہ حاصل کیے بغیر واپس پلٹ آئے دوسری دفعہ "حضرت عمر" نے علم اٹھایا، اور مسلمان پہلے دن کی نسبت زیادہ شدت سے لڑے، لیکن بغیر کسی نتیجہ کے واپس پلٹ آئے۔

یہ خبر رسول کے کانوں تک پہنچی تو آپ نے فرمایا:

« اما والله لا عطينها غداً رجلاً يحب الله ورسوله، ويحب الله ورسوله »

ياخذها عنوة :

"خدا کی قسم کل یہ علم ایسے مرد کو دوں گا جو خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے، اور خدا اور پیغمبر

اس کو دوست رکھتے ہیں، اور وہ اس قلعہ کو طاقت کے زور سے فتح کر لے گا"

ہر طرف سے گردنیں اٹھنے لگیں کہ اس سے مراد کون شخص ہے؟ کچھ لوگوں کا اندازہ تھا کہ پیغمبر کی مراد علی ہیں، لیکن علی ابھی وہاں موجود نہیں تھے، کیونکہ شدید آشوب چشم انہیں شکر میں حاضر ہونے سے مانع تھا، لیکن صبح کے وقت علی اونٹ پر سوار ہو کر وارد ہوئے، اور پیغمبر کے خیمہ کے پاس اترے در حالیکہ آپ کی آنکھیں شدت کے ساتھ درد کر رہی تھیں۔

پیغمبر نے فرمایا: میرے نزدیک آؤ! آپ قریب گئے تو آپ نے اپنے دہن مبارک کا لعاب علی کی آنکھوں پر ملا اور اس معجزہ کی برکت سے آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو گئیں اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم ان کے ہاتھ میں دیا۔

علی علیہ السلام شکر اسلام کو ساتھ لے کر خیمہ کے سب سے بڑے قلعہ کی طرف بڑھے تو یہودیوں میں سے ایک شخص نے قلعہ کے اُپر سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: "میں علی بن ابی طالب ہوں۔ اس یہودی نے پکار کر کہا۔

اے یہودیو! اب تمہاری شکست کا وقت آن پہنچا ہے! اس وقت اس قلعہ کا کمانڈر "مرحب" یہودی، علی علیہ السلام سے مقابلہ کے لیے نکلا، اور کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک ہی کاری ضرب سے زمین پر گر پڑا۔

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان شدید جنگ شروع ہو گئی، علی علیہ السلام قلعہ کے دروازے کے قریب آئے، اور ایک قوی اور پُر قدرت حرکت کے ساتھ دروازے کو اکھاڑا اور ایک طرف پھینک دیا، اور اس طرح سے قلعہ کھل گیا اور مسلمان اس میں داخل ہو گئے اور اُسے فتح کر لیا۔

یہودیوں نے اطاعت قبول کر لی، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ اس اطاعت کے عوض ان کی جان بخشی کی جائے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی درخواست کو قبول کر لیا، منقول غنائم اسلامی لشکر کے ہاتھ آئے اور وہاں کی زمینیں اور باغات آپ نے یہودیوں کو اس شرط کے ساتھ سپرد کر دیئے کہ اس کی آمدنی کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔

۲۲- وَلَوْ قَتَلْتُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا وَلَوْ أَدْبَارْتُمْ لَا يَجِدُونَ
وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ○

۲۳- سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ
اللَّهِ تَبْدِيلًا ○

۲۴- وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ
مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا
تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ○

۲۵- هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَالْهَدْيِ مَعَكُمْ فَاِنْ يَبْلُغْ مَحِلَّهُ وَلَوْ
لَا رِجَالٌ مُؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُؤْمِنَاتٌ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ
اَنْ تَطَّوُّوهُمْ فَتُصِيبَكُمْ مِنْهُمْ مَعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ
لِيَدْخُلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ لَوْ
تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا
أَلِيمًا ○

ترجمہ

۲۲- اگر کفار (مرزین حدیبیہ میں) تم سے جنگ کرتے تو بہت جلد بھاگ

کھڑے ہوتے ، اور پھر کوئی اپنا ولی اور یار و یاور نہ پاتے۔

۲۳۔ یہ سنت الہی ہے جو پہلے بھی یہی تھی ، اور تو کبھی بھی سنت الہی میں تغیر و تبدیلی نہ پائے گا۔

۲۴۔ وہ وہی تو ہے جس نے ان کا ہاتھ تم سے اور تمہارا ہاتھ ان سے مکہ میں روک لیا ، بعد اس کے کہ تمہیں ان پر فتح یاب کر دیا تھا ، اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

۲۵۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو کافر ہو گئے ہیں ، اور تمہیں مسجد الحرام (کی زیارت) سے روکا ہے ، اور تمہاری قبر بانوں کے قُربان گاہ کی جگہ تک پہنچنے سے مانع ہوئے ، اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ صاحب ایمان مرد اور عورتیں تمہاری بے خبری میں تمہارے پاؤں تلے لڑوند سے جائیں گے ، اور اس طرح سے ایک عار اور عیب لاشعوری طور پر تمہیں لگ جائے گا ، (تو خدا ہرگز اس جنگ سے مانع نہ ہوتا) مقصد یہ تھا کہ خدا جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے ، اور اگر مومنین اور کفار (مکہ میں) ایک دوسرے سے جدا اور الگ ہو جاتے ، تو ہمسام کافروں پر دردناک عذاب کرتے۔

تفسیر

اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی

یہ آیات اسی طرح سے "حدیبیہ" کے عظیم ماجرے کے کچھ دوسرے پہلوؤں کو بیان کر رہی ہیں ، اور اس

سلسلہ میں دو اہم نکتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ خیال نہ کرو سرزمین "حدیبیہ" میں تمہارے اور مشرکین محکمہ کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو مشرکین جنگ میں بازی لے جاتے، ایسا نہیں ہے، اکثر کفار تمہارے ساتھ وہاں جنگ کرتے تو بہت جلدی پٹھی پھیر کر بھاگ جاتے، اور پھر کوئی دلی ویاور نہ پاتے، "والوقت لکم الذین کفروا لولوا الادبار شقرا لاجدون ولیا ولا نصیرا)۔

اور یہ بات صرف تم تک ہی منحصر نہیں ہے، "یہ تو ایک سنت الہی ہے، جو پہلے بھی یہی تھی اور تم سنت الہی میں ہرگز تغیر و تبدیلی نہ پاؤ گے" (سنتہ اللہ التی قد عثت من قبل ولن تجد لسنة اللہ تبديلا)۔

یہ خدا کا ایک دائمی قانون ہے کہ اگر مومنین جہاد کے معاملہ میں کمزوری اور سستی نہ دکھائیں اور پاکیزہ دل اور خالص نیت کے ساتھ دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں، تو خدا انھیں کامیابی عطا کرتا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات اس امر میں امتحان کے طور پر یا دوسرے مقاصد کے ماتحت دیر یا جلدی ہو جائے، لیکن آخری کامیابی یقیناً انہیں کے لیے ہوگی۔

لیکن ایسے مواقع پر جیسا کہ میدان "احد" ہوا کہ ایک گروہ نے پیغمبر خدا کے حکم سے سرتابی کی، اور ایک گروہ نے اپنی نیت کو عشق دُنیا سے آلودہ کیا، اور غنائم جمع کرنے میں لگ گئے، انجام کار انھیں ایک تلخ شکست کا سامنا کرنا پڑا اور بعد میں بھی معاملہ ایسا ہی ہے۔

وہ اہم نکتہ جو یہ آیات خاص طور پر بیان کر رہی ہیں یہ ہے کہ کہیں قریش بیٹھ کر یہ نہ کہنے لگیں، کہ افسوس ہم نے جنگ کیوں نہ کی اور اس چھوٹے سے گروہ کی سرکوبی کیوں نہ کی، افسوس کہ شکار ہمارے گھر میں آیا، اور اس سے ہم نے غفلت برتی، افسوس، افسوس۔

ہرگز ایسا نہیں ہے اگرچہ مسلمان ان کی نسبت تھوڑے تھے، اور وطن اور امن کی جگہ سے بھی دور تھے، اسلحہ بھی ان کے پاس کافی مقدار میں نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اگر جنگ چھڑ جاتی تو پھر بھی قوت ایمانی اور نصرت الہی کی برکت سے کامیابی انھیں ہی حاصل ہوتی، کیا جنگ "بدر" اور احزاب" میں ان کی تعداد بہت کم اور دشمن کا ساز و سامان اور لشکر زیادہ نہ تھا؟ ان دونوں مواقع پر دشمن کو کیسے شکست ہو گئی۔

بہر حال اس حقیقت کا بیان مومنین کے دل کی تقویت اور دشمن کے دل کی کمزوری اور منافقین کے "اگر اور مگر" کے ختم ہونے کا سبب بن گئی اور اس نے اس بات کی نشاندہی کر دی کہ ظاہری طور پر حالات کے برابر نہ ہونے کے باوجود اگر جنگ چھڑ جائے تو کامیابی مخلص مومنین ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

دوسرا نکتہ جو ان آیات میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ فرماتا ہے ”وہی تو ہے جس نے کفار کے ہاتھ کو مکہ میں تم سے باز رکھا اور تمہارے ہاتھ کو ان سے، یہ اس وقت ہوا جبکہ تمہیں ان پر کامیابی حاصل ہو گئی تھی، اور خدا وہ سب کچھ جو تم انجام دے رہے ہو دیکھ رہا ہے“ (وہو الذی کف ایدیہم عنکم وایدیکم عنہم بطن مکہ من بعد ان اظفرکم علیہم وکان اللہ بما تقومون بصیروا)۔

واقعاً یہ ماجرا ”فتح المبین“ کا واضح مصداق تھا، وہی تعریف جو قرآن نے اس کے لیے انتخاب کی تھی، ایک متحد و جمعیت، کافی جنگی ساز سامان کے بغیر دشمن کی سرزمین میں داخل ہو جائے، ایسا دشمن جس نے کئی بار مدینہ پر لشکر کشی کی تھی اور انہیں درہم برہم کرنے کے لیے ایک عجیب کوشش میں لگا ہوا تھا، لیکن اب جبکہ اس نے ان کے شہر و دیار میں قدم رکھ دیا ہے تو اس طرح سے مرعوب ہوا کہ صلح کی پیش نہاد کرتا ہے، اس سے بڑھ کر اور کامیابی کیا ہوگی کہ بغیر اس کے کہ کسی کی نخبیر بھوٹے، دشمن پر اس قسم کی برتری حاصل ہو جائے؟

اس میں شک نہیں کہ ”صلح حدیبیہ“ کا ماجرا پورے جزیرہ عرب میں قریش کی شکست اور مسلمانوں کی فتح شمار ہوتا تھا، اور وہ اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ دشمن سے اس کا رعب و دبدبہ ختم کر دیں۔

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کے لیے ایک ”شان نزول“ بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

مشرکین مکہ نے ”حدیبیہ“ کے واقعہ میں چالیس افراد کو مسلمانوں پر ضرب لگانے کے لیے مخفی طور پر حملہ کے لیے تیار کیا، لیکن ان کی یہ سازش مسلمانوں کی ہوشیاری سے نقش بر آب ہو گئی، اور مسلمان ان سب کو گرفتار کر کے پیغمبرؐ کی خدمت میں لے آئے، اور پیغمبرؐ نے انہیں رہا کر دیا۔

بعض نے ان کی تعداد ۸۰ افراد لکھی ہے، جو تنعیم پہاڑ سے صبح کی نماز کے وقت تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں پر حملہ کریں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درخت کے سایے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تاکہ قریش کے نمائندہ کے ساتھ صلح کے معاہدہ کو ترتیب دیں، اور علیؑ لکھنے میں مصروف تھے، تو جو انان مکہ میں سے ۳۰ افراد اسلحہ کے ساتھ آپ پر حملہ آور ہوئے، اور معجزانہ طور پر ان کی یہ سازش بے کار ہو گئی اور وہ سب کے سب گرفتار ہو گئے اور حضرتؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔

اس شان نزول کے مطابق من بعد ان اظفرکم علیہم کا جملہ اس گروہ پر کامیابی کی طرف اشارہ ہے، جبکہ سابقہ تفسیر کے مطابق کل لشکر اسلام کی کل مشرکین پر کامیابی مراد ہے اور یہ آیت کے معانی کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔

۱۔ ”مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۱۲۲۔ اس شان نزول کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ ”قرطبی“ ابو الفتوح رازی ”آلوسی“ نے روح المعانی میں شیخ طوسی نے ”تبیان“ میں ”مراغی“ اور دوسروں نے منقول کیا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مکہ کے اندر نہ لڑنے پر توجیہ کرتا ہے، یہ تعبیر ممکن ہے دو محنتوں کی طرف اشارہ ہو: پہلا یہ کہ: ”مکہ“ دشمن کی قدرت کا مرکز تھا، اور قائدے کے مطابق انھیں اس مناسب موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا اور مسلمانوں پر حملہ کر دینا چاہیے تھا، اور اصطلاح کے مطابق وہ تو مسلمانوں کو آسمان میں ڈھونڈ رہے تھے، جبکہ انھوں نے انہیں اپنی ہی زمین میں پالیا تھا، تو انھیں آسانی کے ساتھ چھوڑنا نہیں چاہیے تھا، لیکن خدا نے ان کی قدرت چھین لی۔

دوسرا یہ کہ تھا اور امن کا حرم تھا، اگر اس میں جنگ اور خون ریزی واقع ہو جاتی تو ایک طرف تو حرم کا احترام مندوش ہو جاتا دوسری طرف مسلمانوں کے لیے عیب و عار کی بات تھی کہ انھوں نے اس مقدس سرزمین کے سنتی امن کو درہم برہم کر دیا، لہذا پیغمبر اور مسلمانوں پر خدا کی ایک عظیم نعمت یہ تھی کہ اس ماجرے کے دو سال بعد مکہ ”فتح“ ہو گیا، اور ہوا بھی کسی خون ریزی کے بغیر۔

آخری زیر بحث آیت میں صلح حدیبیہ کے مسئلہ اور اس کے فلسفہ سے مربوط ایک دوسرے نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وہ (تمہارے دشمن) ایسے لوگ ہیں جو کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے تمہیں مسجد حرام کی زیارت سے روک دیا ہے۔ اور تمہاری قربانیوں کی قربان گاہ کے مقام تک پہنچنے میں مانع ہوئے ہیں: (ہم الذین کفرنا و صدقنا

عن المسجد الحرام والهدی محکوفان يبلغ محلة)۔ لہ ان کا ایک گناہ تو ان کا کفر تھا اور دوسرا گناہ یہ کہ تمہیں انھوں نے مراسم عمرہ اور طواف خانہ خدا سے روک دیا، اور تمہیں قربانی کے اونٹوں کو ان کے محل یعنی مکہ میں قربانی کی اجازت نہ دی۔ (محل قربانی عمرہ کے لیے مکہ ہے اور حج کے لیے سرزمین منی) حالانکہ خانہ خدا کو تمام اہل ایمان کے لیے آزاد ہونا چاہیے اور اس سے روکنا بہت ہی بڑا گناہ ہے، جیسا کہ قرآن ایک دوسری جگہ پر کہتا ہے: ”ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکروا فیہا اسمہ“ (اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو لوگوں کو خدا کی مساجد میں خدا کا نام لینے سے باز رکھے“؟! (بقرہ - ۱۱۴)

ان گناہوں کا تقاضا یہ تھا کہ خدا انہیں تمہارے ہاتھ سے سزا دیتا اور سخت عذاب کرتا۔

لیکن ایسا کیوں نہ کیا؟ آیت کے متن نے اس کی دلیل کو واضح کر دیا، فرماتا ہے: ”اگر یہ وجہ نہ ہوتی کہ صاحب ایمان مرد اور عورتیں اسی دوران میں تمہاری لاعلمی اور بے خبری میں تمہارے رگڑے میں آکر ہلاک ہو جاتے، اور اس طریقہ سے بغیر اطلاع کے عیب عار تمہارے دامن گیر ہو جاتا، تو خداوند عالم ہرگز اسے جنگ سے مانع نہ ہوتا، اور تمہیں ان پر مسلط کر دیتا تاکہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائیں۔“

(ولولا رجال مؤمنون ونساء مؤمنات لم تعلموہم ان تطعموہم

فتیہہکم منہم معرۃ بغیر علم، لہ

یہ آیت مسلمان مردوں اور عورتوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے، جو اسلام تولے آیا تھا، لیکن کئی ایک علل و اسباب کی بنا پر وہ ہجرت کرنے پر قادر نہ ہوئے تھے، اور مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔

اگر مسلمان مکہ پر حملہ کرتے تو مسلمانوں کے اس کمزور گروہ کی جان مکہ میں خطرے میں پڑ جاتی اور مشرکین کی زبان کھل جاتی اور وہ یہ کہتے کہ لشکر اسلام نہ اپنے مخالفین پر رحم کرتا ہے اور نہ ہی اپنے پیروکاروں اور موافقت کرنے والوں پر، اور یہ ایک بہت بڑا عیب اور عار ہونا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس عیب سے مراد کفارہ اور قتلِ خطار کی دیت کا واجب و لازم ہوتا ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

”معرۃ“ ”عمر“ (بروزن بشر) کے مادہ سے اور ”عمر“ (بروزن حمر) اصل میں کھلی اور خارش کی بیماری کے معنی میں ہے جو ایک قسم کا جلد کا شدید عارضہ ہے، جو انسان یا حیوانات کو عارض ہوتا ہے اس کے بعد اس کو وسعت دے دی گئی، اور ہر قسم کے زیاں و ضرر پر، جو انسان کو پہنچتا ہے، اس کا اطلاق ہوا ہے۔

اس کے بعد اس بات کی تکمیل کے لیے مزید کہتا ہے، ”مقصد یہ تھا کہ خدا جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے“: (لیدخل اللہ فی رحمتہ من یشاء)۔

ہاں! خدا چاہتا تھا کہ ”مکہ“ کے کمزور ناطقوں مومنین کو اپنی رحمت کا شمول کرے اور انہیں کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ”صلح حدیبیہ“ سے ایک مقصد یہ تھا کہ مشرکین کا ایک گروہ جو ہدایت کے قابل تھا ان کی ہدایت ہو جائے اور وہ رحمتِ خدا میں داخل ہو جائے۔

”من یشاء“ (جسے چاہے) کی تعبیر ان لوگوں کے معنی میں ہے جو شائستگی اور بیاقت رکھتے ہیں، کیونکہ مشیتِ الہی کا سرچشمہ ہمیشہ اس کی حکمت ہوتی ہے اور حکیم بغیر دلیل کے ارادہ نہیں کرتا، اور بغیر حساب کے کوئی کام انجام نہیں دیتا۔

اور آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے ”اگر مومنین کی صفیں مکہ میں کفار سے جدا ہو جائیں، اور مکہ کے مومنین کے ختم ہو جانے کا خوف نہ ہوتا، تو ہم کفار کو دردناک عذاب کی سزا دیتے اور انہیں تمہارے ہاتھ سے سخت سزا دیتے“ (لو تزیلوا العذابنا الذین کفروا منہم عذابا الیما)۔

یہ ٹیک ہے کہ خدا معجزانہ طور پر اس گروہ کو دوسروں سے جدا کر سکتا تھا، لیکن پروردگار کی سنت، استثنائی موقعوں کے سوا، کاموں کو عادی اسباب سے انجام دینا ہے۔

لہ ”لولا“ کا جواب اور دالے جملہ میں محذوف ہے، اور تقدیر میں اس طرح تھا: لَمَا كَفَّ اَيْدِيكُمْ عَنْهُمْ - يَا - لَوْ طَمَعَتْ رِقَابُ الْمُشْرِكِينَ بِنَصْرِ نَابِيَاكُمْ، ہماری نصرت سے تم مشرکین کی گرزین مروڑ دیتے۔

”تذیبوا“ ”زوال“ کے مادہ سے میاں جدا اور متفرق ہونے کے معنی میں ہے۔

متعدد روایات سے جو شیخہ اور اہل سنت کے طرق سے اس آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ صاحب ایمان افراد تھے جو کفار کی صلب میں موجود تھے، خدا نے ان کی وجہ سے کفار کو عذاب نہیں کیا۔
بمخملہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے۔

کسی نے امامؑ سے سوال کیا، کیا علیؑ دین خدا میں قوی اور با قدرت نہ تھے؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں قوی تھے، اس نے عرض کیا: تو پھر ان (بے ایمان اور منافق، اقوام پر مسلط ہو جانے کے باوجود انھیں نابود کیوں نہ کیا؟ اس میں کون سی چیز مانع تھی؟

آپؑ نے فرمایا: قرآن مجید کی ایک آیت!

اس نے سوال کیا، کونسی آیت؟

آپؑ نے فرمایا یہ آیت جس میں خدا فرماتا ہے:

”لَوْ تَذَيَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا“

”اگر وہ جدا ہو جاتے تو ہم کافروں کو دردناک عذاب کرتے“

پھر آپؑ نے مزید فرمایا۔

”انہ كان الله عز وجل ودائع مؤمنون في اصلاب قوم

كافرين ومنافقين، ولم يكن على ذلك، ليقتل الابرار حتى تخرج الودائع!

..... وكذلك قائمنا اهل البيت لن يظهر ابداحتهم تظهر ودائع

الله عز وجل!

”خدا کی کچھ ایمان والی امانتیں کفار اور منافقین کے صلیبوں میں تھیں، اور علیؑ ان آبار کو قتل نہیں کرتے

تھے جب تک کہ یہ امانتیں ظاہر نہ ہو لیں..... اور اسی طرح ہم اہل بیت کے قائم ظاہر نہیں

ہوں گے جب تک کہ یہ امانتیں ظاہر نہ ہو جائیں۔“

یعنی خدا جانتا ہے کہ ان کی اولاد میں سے ایک گروہ اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان قبول کرے گا اور انہیں کی

وجہ سے ان کے باپ دادا کو جلدی کے عذاب سے معاف کیے ہوئے ہے۔

اس معنی کو ”قرطبی“ نے ایک دوسری عبارت کے ساتھ اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ اوپر والی آیت مومنین مکتہ کے کفار سے اختلاط کے معنی میں بھی ہو اور ان مومنین کے

بارے میں بھی ہو جو ان کی صلب میں موجود تھے۔

۲۲۔ اِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ
الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى
الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا
أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيمًا

ترجمہ

۲۲۔ اس وقت کو یاد کرو جب کافر اپنے دلوں میں جاہلیت کا غصہ اور نخوت رکھتے تھے، اور اس کے مقابل میں، خدا نے اپنے رسول اور مومنین پر قرار اور وقار نازل کیا، اور ان کے لیے تقویٰ کو لازم قرار دیا، کیونکہ وہ ہر شخص سے زیادہ شائستہ، لائق اور اس کے حق دار اور اہل تھے اور خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔

تفسیر

تعصب اور حمیت جاہلیت، کفار کے لیے بزرگ ترین سد راہ

ان آیات میں پھر "حدیبیہ کے ماجرے سے مربوط مسائل بیان کیے جا رہے ہیں اور اس عظیم ماجرے کے دوسرے مناظر کو مجسم کر رہا ہے۔

پیلے کفار کو خدا و پیغمبر پر ایمان لانے اور حق و عدالت کے سامنے تسلیم خم کرنے سے روکنے والے ایک اہم ترین عامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، "اس وقت کو یاد کرو جب کافر اپنے دلوں میں جاہلیت کا غصہ اور نخوت رکھتے تھے" (اذ جعل الذین کفروا فی قلوبہم الحمیة حمیة الجاہلیة) اور اس کی وجہ سے پیغمبر اور مومنین کے خانہ خدا میں داخل ہونے، اور عمرہ و قربانی کے مراسم کے انجام دینے سے مانع ہوئے، اور یہ کہا کہ اگر یہ لوگ جنہوں نے میدان جنگ میں ہمارے آباء و اجداد اور بھائیوں کو قتل کیا ہے۔ ہماری سرزمین اور ہمارے گھروں میں وارد ہوں اور صبح و سالم پلٹ جائیں تو عرب ہمارے بارے میں کیا کہیں گے اور ہماری کیا حیثیت اور اعتبار باقی رہ جائے گا؟

یہی کبر و غرور و تعصب اور خشم جاہلی، اس بات تک سے مانع ہوا کہ "حدیبیہ" کے صلح نامہ کی ترتیب و تنظیم کے وقت خدا کا نام "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کی صورت میں لکھا جانا قبول کریں، حالانکہ ان کے آداب و سنن کہتے تھے کہ خانہ خدا کی زیارت سب کے لیے جائز ہے اور سرزمین مکہ حرم امن ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو اس سرزمین میں یا حج و عمرہ کے مراسم میں دیکھتا تھا تو اس سے مزاحم نہ ہوتا تھا۔ انھوں نے اس عمل کے ذریعہ خانہ خدا اور اس کے حرم امن کے احترام کو بھی توڑا، اور اپنے سنن و آداب کو بھی زیر پا روندنا، اور اپنے اور حقیقت کے درمیان ایک ضخیم پردہ بھی کھینچ دیا، اور "جاہلیت کی حمیتوں کے مرگبار اثرات ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"حمیت" اصل میں "حمی" (بروزن حمد) کے مادہ سے، اُس حرارت کے معنی میں ہے، جو آگ یا سورج یا انسانی بدن اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی بنا پر "بخسار" کی حالت کو "حمی" (بروزن کبری) کہا جاتا ہے، اور غیض و غضب کی حالت کو، اسی طرح نخوت اور "خشم آلود تعصب" کو بھی "حمیت" کہتے ہیں۔ یہ ایسی حالت ہے جو جہالت، کوتاہی فکر اور علمی الخطاط کے زیر اثر خصوصیت کے ساتھ جاہل قوموں میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور ان کی بہت سی جنگوں اور خون ریزیوں کا سبب بنتی ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: اس کے مقابلہ میں "خدا نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنا الطمینان اور قرار نازل فرمایا" (فانزل اللہ سکینة علی رسولہ و علی المؤمنین)۔

اس آرام و سکون نے، جو خدا پر ایمان اور اعتقاد اور اس کے لطف سے پیدا ہوا تھا، انھیں ضبط اور نفس پر

لے "جعل" کبھی ایک مفعول لیتا ہے، اور یہ اس موقع پر ہوتا ہے جہاں ایجاد کے معنی میں ہو، جیسا کہ زیر بحث آیت میں کہ اس کا فاعل "الذین کفروا" ہے، اور اس کا مفعول "الحمیة" ہے، اور یہاں ایجاد سے مراد اس حالت کی حفاظت، اور اس کی پابندی اور لازم بنانا ہے، اور کبھی مد مفعول لیتا ہے، اور وہ اس جگہ ہوتا ہے جہاں ہونے کے معنی میں ہو،

تسلط کی دعوت دی اور ان کے غصہ کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا، یہاں تک کہ اپنے بزرگ مقاصد کی حفاظت کے لیے تیار ہو گئے۔ اور ”بِسْمِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے جملہ کو ہٹا کر جو کاموں کے شروع کرنے کے لیے اسلام کی نشانی تھا۔ اس کی جگہ ”بِسْمِکَ اللّٰہُمَّ“ جو عربوں کے اسی دور کی یادگار تھی۔ حدیثیہ کے صلح نامہ کے آغاز میں لکھنے پر آمادہ ہو گئے بیان تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محترم نامہ کے ہمراہ رسول اللہ کا لقب حذف کرنے پر بھی تیار ہو گئے اور اس عشق اور دلی تعلق کے بخلاف۔ جو وہ خانہ خدا کی زیارت اور مراسم عمرہ سے رکھتے تھے۔ اسی ”حدیثیہ“ سے مدینہ کی طرف لوٹ جانے پر آمادہ ہو گئے اور اپنے قربانی کے اونٹ حج و عمرہ کی منت کے بخلاف اسی جگہ قربان کرنے اور انجام مناسک کے بغیر ہی احرام سے باہر نکل آنے پر تیار ہو گئے۔

ہاں! وہ ضبط نفس کرنے، اور ان تمام ناخوشگوار اور خلاف طبیعت امور کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی اختیار کرنے، پر آمادہ و تیار ہو گئے، حالانکہ اگر ”حمیت جاہلیت“ ان پر غالب آجاتی، تو ان میں سے ہر ایک چیز، اس سرزمین میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے کافی تھی۔

ہاں! جاہلیت کا تمدن، ”حمیت“ و ”تعصب“ اور جاہلانہ غیض و غضب کی دعوت دیتا ہے، لیکن اسلام کا تمدن ”وتمدن“، ”قرآن“ و ”آرام“ اور ضبط نفس کی طرف بلاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”خدا نے ان کے لیے تقویٰ کو لازم و واجب قرار دے دیا، اور وہ ہر شخص سے زیادہ اس کے حقدار، لائق شائستہ اور اصل تھے“؛ وَالزَّمَمَ کَلِمَةَ التَّقْوٰی وَکَانَ نَوَاحِقَ بَهَا وَاهْلَهَا۔
 ”کلمۃ“ یہاں ”روح“ کے معنی میں ہے، یعنی خدا نے تقویٰ کی روح ان کے دلوں میں ڈال دی اور ان کے ہمراہ کر دی، جیسا کہ سورہ نسا کی آیہ ۱، میں عیسیٰ کے بارے میں آیا ہے: اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَکَلِمَتُهٗ اَنْزَلْنَاهُ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِنْ رَّبِّہٖ ۚ سُبْحٰنَ مَنْ یَّرْسُوْلُهٗ اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الذَّلٰلٰتِ (رسول) اس کا کلمہ اور اس کی طرف سے ایک روح ہے جسے مریم پر القا فرمایا ہے۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ”کلمہ تقویٰ“ سے مراد وہ دستور و فرقان ہے، جو خدا نے اس سلسلہ میں مومنین کو دیا ہے۔ لیکن مناسب وہی ”روح تقویٰ“ ہے جو ”تقوینی“ پہلو رکھتا ہے اور ایمان و قرار اور احکام خداوندی سے تعلق قلبی کی پیداوار ہے۔

لہذا بعض روایات میں جو پیغمبر گرامی اسلام سے نقل ہوتی ہیں، ”کلمہ تقویٰ“ کی ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ کے ساتھ ملے اور ایک روایت میں جو امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ ”ایمان“ کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ لہذا پیغمبر گرامی کے ایک خطبہ میں یہ آیا ہے:

”نحن کلمۃ التقویٰ وسبیل الہدی“؛

” ہم تقویٰ کا کلمہ اور ہدایت کی راہ ہیں “۔
اسی معنی کے مشابہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔
آپ نے فرمایا :

” نحن كلمة التقوى والعروة الوثقى “

” ہم کلمہ تقویٰ اور خدا کی مضبوط رسی ہیں۔ “

یہ بات واضح ہے کہ ” نبوت “ و ” ولایت “ پر ایمان لانا، اصل ” توحید “ اور معرفتِ خداوندی کی تکمیل کرتا ہے، کیونکہ وہ سب ہستیاں اللہ کی طرف دعوت دینے والی، اور توحید کی منادی کرنے والی ہیں۔
بہر حال مسلمان ان حساس لمحات میں، خشم و عصبانیت اور تعصب و نخوت میں گرفتار نہیں ہونے، اور وہ درخشاں سر نوشت جو خدا نے ماجرائے حدیبیہ میں ان کے لیے رقم کی تھی، اُسے اُنھوں نے جہالت اور غصہ کی آگ سے نہیں جلایا۔

کیونکہ وہ کہتا ہے ” مسلمان تقویٰ کے سب سے زیادہ سزاوار اور لائق تھے، اور اس کے اہل اور حق دار تھے۔ “
یہ بات ظاہر و واضح ہے کہ مُٹھی بھر بے ہودہ، نادان اور بت پرست جمعیت سے ” جاہلیت کی حمیت “ کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہیں تھی، لیکن ان موحد مسلمانوں سے جو ایک عرصہ سے مکتب قرآن میں تربیت پا چکے تھے، اس قسم کی عادت اور جاہلانہ خلق کی امید نہ تھی۔ ان سے جس چیز کی توقع تھی وہ وہی وقار و تقویٰ اور صبر و قرار تھا جس کا اُنھوں نے ” حدیبیہ “ میں اظہار کیا۔ اگرچہ قریب تھا کہ بعض بے صبرے تند مزاج، جو شاید گزشتہ زمانہ کی رسوم و عادات کے عادی تھے۔ اس سد کو توڑ دیں اور کوئی جھگڑا کھڑا کر دیں، لیکن پیغمبر کا اطمینان اور وقار پانی کی طرح اُس آگ پر پڑا، اور اُسے خاموش کر دیا۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ ” اور خدا ہر چیز سے آگاہ اور اس کا عالم تھا اور ہے “ : (وكان الله بكل شئ علیماً)۔

وہ کفار کی بُری نیتوں کو بھی جانتا ہے، اور سچے مومنین کے دلوں کی پاکیزگی کو بھی، یہاں پر تو وہ اطمینان و تقویٰ کو نازل کرتا ہے اور وہاں جاہلیت کی حمیت کو مسلط کر دیتا ہے کیونکہ خدا ہر قوم و ملت کو ان کی لیاقت و قابلیت کے مطابق ہی اپنے لطف و رحمت کا مشمول قرار دیتا ہے یا اپنے خشم و غضب کا۔

ایک نکتہ

حمیت جاہلیت کیا ہے؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ "حمیت" اصل میں "حمی" کے مادہ سے حرارت کے معنی میں ہے، اور اس کے بعد غضب کے معنی میں اور بھر بخوت و غضب کی آمیزش رکھنے والے تعصب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ کبھی تو اسی مذموم معنی میں (جاہلیت کی قید کے ساتھ یا اس کے بغیر) اور بعض اوقات مدح اور پسندیدہ معنی میں استعمال ہوتا ہے اور منطقی غیرت اور مثبت اور اصلاحی امور میں ڈٹ جانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ امیر المؤمنین علیؑ اپنے سست عنصر اور سرکش ساتھیوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مذت بمن لا یطیع اذا امرت ولا یجیب اذا دعوت اما دین یجمعکم ولا حمیة تحمکم؛

"میں ایسے لوگوں میں پھنس گیا ہوں، جنہیں اگر حکم دیتا ہوں تو وہ اطاعت نہیں کرتے، اور اگر دعوت دیتا ہوں تو قبول نہیں کرتے، کیا تم دین نہیں رکھتے ہو، جو تمہیں اکٹھا رکھے؟ یا ایسی غیرت جو تمہیں غصہ میں لے آئے (اور تمہیں اپنی ذمہ داری پورا کرنے پر آمادہ کر دے) لے لیکن یہ عام طور پر اسی مذموم معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ امیر المؤمنین علیؑ نے خطبہ "قاصعہ" میں بار بار اس معنی میں استعمال کیا ہے اور ابلیس کی مذمت میں جو تکبرین کا پیشوا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"صدقہ بہ ابناء الحمیة واخوان العصبیة وفرسان الکبر و الجاہلیة"

"اس کی نخوت و حمیت کے بیٹوں اور عصبیت کے بھائیوں اور کبر و جہالت کے مرکب کے سواروں نے تصدیق کی ہے" لے

اسی خطبہ میں ایک دوسری جگہ، جہاں آپ لوگوں کو جاہلیت کے تعصبات سے ڈرا رہے ہیں، فرماتے ہیں؛

"فاطفثوا ما کم من فقلوبکم من نیران العصبیة و احقاد

الجاهلیۃ، فانما تلك الحمیة تكون في المسلم من خطرات
الشیطان ونحواته ونزعاته ونفثاته؛

” تعصب کے وہ شرارے اور جاہلیت کے وہ کینے جو تمہارے دلوں میں ہیں انہیں بھادو، کیونکہ یہ نخوت
دھمیت اور ناروا تعصب مسلمانوں میں شیطان کی نخوت اور وسوسوں میں سے ہے۔“

بہر حال اس میں شک نہیں ہے کہ کسی فرد یا جماعت میں اس قسم کی حالت کا ہونا اُس معاشرے کی پسماندگی اور
گراڈٹ کا باعث ہے۔ یہ انسان کی عقل و فکر پسنگین پر ڈال دیتا ہے اور اُسے صحیح ادراک اور کامل سوجھ بوجھ
سے باز رکھتا ہے اور بعض اوقات اس کے تمام مصالح کو بادتنا کے سپرد کر دیتا ہے۔

اصولی طور پر ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف غلط رسومات اور طریقوں کا منتقل ہونا اسی طرفداری یا جاہلیت کے منحوس
سائے میں صورت پذیر ہوتا ہے، اور انبیاء اور خدائی رہبروں اور پیشواؤں کے مقابلہ میں منحرف اقوام کی مخالفت بھی
عام طور پر اسی راستے سے ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن الحسین علیہ السلام سے بیان ہوا ہے کہ جب آپ سے کسی نے ”عصبیت“ کے
بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

” العصبیۃ التي یأثم علیها صاحبها ان یرى الرجل
شرار قومہ خیرا عن خیار قومہ آخرین ولیس من
العصبیۃ ان یحب الرجل قومہ ولكن من العصبیۃ
ان یعین قومہ علی الظلم۔“

” وہ تعصب جو گناہ کا موجب ہے یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اپنی قوم کے بُرے افراد
کو دوسری قوم کے نیک اور اچھے انفرادے برتر سمجھے، لیکن اپنی قوم سے
محبت کرنا اور انہیں دوست رکھنا تعصب نہیں ہے۔ تعصب یہ ہے کہ ظلم و ستم میں
ان کی مدد کرے۔“

اس بُری عادت سے لڑنے، اور اس عظیم مہلکہ سے نجات حاصل کرنے کا بہترین راستہ،
ہر قوم اور ہر معاشرے کی فکر و ایمان، اور تہذیب و تمدن کی سطح کو اُوٹھنے کے لیے
کوشش کرنا ہے۔

درحقیقت قرآن مجید نے اس درد کی دوا اسی زیر بحث آیت میں بیان کی ہے، جہاں

وہ اس کے نقطہ مقابل میں مؤمنین کے بارے میں بحث کرتا ہے، کہ وہ اطمینان و وقار اور رُوحِ تقویٰ کے حامل ہیں اور اس بنا پر جہاں ایمان، اطمینان اور تقویٰ ہے، وہاں حمیت جاہلیت نہیں ہے، اور جہاں حمیت جاہلیت ہے، وہاں ایمان، اطمینان اور تقویٰ نہیں ہے۔

۲۶۔ لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ
 الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ
 رُءُوسَكُمْ وَ مُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ
 مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتْحًا
 قَرِيبًا ۝

ترجمہ

۲۶۔ خدا نے جو کچھ اپنے رسول کو خواب کے عالم میں دکھایا وہ سچ تھا،
 انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر، انتہائی امن و امان کے ساتھ،
 اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈواتے ہوئے ہوں گے یا اپنے ناخنوں
 کو کٹواتے ہوئے ہوں گے، مسجد الحرام میں داخل ہوں گے، اور کسی شخص سے
 تمہیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی، لیکن خدا کچھ ایسی چیزوں کو جانتا ہے جنہیں
 تم نہیں جانتے (اور اس تاخیر میں ایک حکمت تھی) اور اس سے پہلے اس
 نے (تمہارے لیے) ایک قریب کی فتح قرار دی۔

تفسیر

پیغمبر کا سچا خواب

یہ آیت بھی داستان "حدیبیہ" کے ایک اور گوشہ کی تصویر کشی کر رہی ہے۔ قصہ یہ تھا؛ پیغمبر نے مدینہ میں ایک خواب دیکھا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے لیے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اور اس خواب کو صحابہ کے سامنے بیان کر دیا، وہ سب کے سب شاد و خوش حال ہوئے، لیکن چونکہ ایک جماعت یہ خیال کرتی تھی کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال پوری ہوگی، تو جس وقت قریش نے مکہ میں ان کے داخل ہونے کا راستہ حدیبیہ میں ان کے آگے بند کر دیا تو وہ شک و تردید میں مبتلا ہو گئے، کہ کیا پیغمبر کا خواب غلط بھی ہو سکتا ہے، کیا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم خانہ خدا کی زیارت سے مشرف ہوں گے؟ پس اس وعدہ کا کیا ہوا؟ اور وہ رحمانی خواب کہاں چلا گیا؟

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں فرمایا، کیا میں نے تمہیں یہ کہا تھا کہ یہ خواب اسی سال پورا ہوگا؟

اد پر والی آیت اسی بارے میں مدینہ کی طرف بازگشت کی راہ میں نازل ہوئی، اور تاکید کی کہ یہ خواب سچا تھا، اور ایسا مسئلہ حتمی و قطعی اور انجام پا جائے والا ہے۔

فرماتا ہے، "خدا نے اپنے پیغمبر کو خواب میں جو کچھ دکھلایا تھا وہ سچ اور حق تھا" : (لقد صدق اللہ رسولہ التّوٰیٰا بالحق)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "النّار اللّٰہ تم سب کے سب قطعی طور پر، امتہانی امن و امان کے ساتھ، اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈوا کے ہوئے ہوں گے۔ یا اپنے ناخنوں کو کٹوائے ہوئے ہوں گے مسجد الحرام میں داخل ہوں گے۔ اور کسی شخص سے تمہیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی" (لپتد خلن المسجد الحرام ان شاء اللہ امنین معلقین رءوسکم و مقصرین لا تخافون)۔

"لیکن خدا اس چیز کو جانتا ہے جسے تم نہیں جانتے" : (فعلم ما لم تعلموا)۔

لہ "صدق" فعل ماضی ہے۔ جس کے بعض اوقات دو مفعول ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اد پر والی آیت میں "رسولہ" مفعول اول ہے، اور "رؤیا" مفعول دوم ہے، لیکن عام طور پر مفعول دوم "فی" کے واسطے ہوتا ہے مثلاً "صدقہ فی حدیثہ" میں نے اس کی گفتگو میں تصدیق کی۔

اس تاخیر میں ایک حکمت تھی " اس سے پہلے ایک قریب کی فتح قرار دے دی " (فجعل من دون ذالک فتحا قریباً)۔

اس آیت میں کچھ قابل توجہ نکات

① اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "لتد خلق" میں "لام" "قسم کلام ہے۔" اور اس کے آخر "دنون" تاکید کے لیے، یہ آئندہ کے بارے میں ایک قطعی و یقینی وعدہ ہے اور انتہائی امن و امان کے ساتھ مراسم عمرہ کے انجام دینے کے بارے میں ایک صریح معجزانہ پیشین گوئی ہے، اور جیسا کہ ہم بیان کریں گے، ٹھیک آئندہ سال اسی ماہ ذی القعدہ میں یہ پیشین گوئی پوری ہوگی، اور مالوں نے عمرہ کے مراسم اسی صورت میں انجام دیئے۔

② "ان شاء اللہ" کا جملہ یہاں ممکن ہے بندوں کے لیے ایک قسم کی تعلیم ہو، کہ وہ آئندہ کے بارے میں کچھ کہتے وقت خدا کی مشیت و ارادہ پر تکیہ کرنے کو فراموش نہ کریں اور اپنے آپ کو اپنے کاموں میں مستقل اور اس کے لطف سے بے نیاز نہ سمجھیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسے افراد کی طرف اشارہ ہو، جو خدا نے اس موافقت مستقبل قریب میں خانہ خدا کی زیارت کی توفیق کے لیے قرار دیتے ہیں، اور وہ توحید و اطمینان اور وقار و تقویٰ پر باقی رہنے کا طریقہ طریقہ ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ایسے افراد کی طرف اشارہ ہو، جن کی عمر کی مدت اس دوران میں ختم ہو جائے گی، اور وہ اس زیارت کے انجام دینے پر موقف نہیں ہوں گے اور ان معانی کے درمیان جمع کرنا پورے طور پر ممکن ہے۔

③ بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق "فتحا قریباً" کی تعبیر اسی "صلح حدیبیہ" کی طرف ہی اشارہ ہے، جس کو قرآن نے "فتح مبین" کہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہی فتح بعد اے سال میں مسجد احرام میں داخل ہونے کی تمہید تھی۔

جب کہ ایک دوسرا گروہ اسے "فتح خیبر" کی طرف اشارہ سمجھتا ہے۔ البتہ "قریباً" کا لفظ "فتح خیبر" کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ وہ اس خواب کے پورا ہونے میں بہت کم فاصلہ رکھتا تھا۔

اس کے علاوہ اسی سورہ کی آیت ۱۸ میں جس میں "بیعت رضوان" کا بیان ہے، یہ آیا ہے: "فانزل السکینۃ علیہم واثابہم فتحا قریباً"

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور اکثر مفسرین کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اس سے مراد "فتح خیبر" ہے، آیت

میں موجود قرآن بھی یہی بات حکایت کرتے ہیں، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زیر بحث آیت اس کے ہم آہنگ ہوگی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لہ

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ لہ

(۴) "مخلفن رءوسکم و مقصرین" (دراں حالیکہ سروں کو منڈوائے ہوئے اور ناخن کٹوائے ہوئے ہو گئے) کا جملہ مراسم عمرہ کے آداب میں سے ایک کی طرف اشارہ ہے، جسے "تقصیر" کہتے ہیں اور اس کے ذریعہ محرم، احرام سے باہر نکل آتا ہے اور بعض اس آیت کو سن کر تقصیر اور احرام سے باہر نکلنے میں "تخیر" کی دلیل سمجھتے ہیں، کیونکہ محرم سر بھی منڈوا سکتا ہے یا اپنے ناخن کٹوا سکتا ہے، ان دونوں کے درمیان جمع قطعاً اور یقیناً واجب نہیں ہے۔

(۵) "فعلم ما لم تعلموا" (خدا ان باتوں کو جانتا تھا، جو تمہیں معلوم نہیں تھیں) کا جملہ ان اہم اسرار کی طرف اشارہ ہے جو "صلح حدیبیہ" میں چھپے ہوئے تھے اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ آشکار ہوئے، اسلام کی بنیادیں مضبوط ہوئیں اور اسلام کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی، اور مسلمانوں پر جنگ کے طالب ہونے اور اسی طرح کی دوسری تہمتیں ختم ہو گئیں، اور مسلمان فارغ البالی کے ساتھ "غیر" کو فتح کرنے اپنے مبلغین "جزیرۃ العرب" کے اطراف میں بھیجے، اور پیغمبر اپنے تاریخی خطوط اس زمانہ کی دنیا کے بڑے بڑے صاحبان اقتدار کو ارسال کرنے پر قادر ہو گئے۔ یہ ایسے مطالب تھے جن سے عام لوگ آگاہ ہی نہیں رکھتے تھے اور صرف خدا ہی اس سے آگاہ تھا۔

(۶) ہمارا اس آیت میں سنہ "رؤیا" سے سامنا ہوتا ہے۔ پیغمبر کا وہی رویائے صادقہ جو وحی کی ایک شاخ ہے، اسی کے مشابہ جو ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ کے ذبح ہونے کے بارے میں آیا ہے۔ (صافات آیدہ ۱۱۲) رؤیا اور خواب دیکھنے کے بارے میں مزید تشریح جلد نہم میں یوسفؑ کی داستان میں صفحہ ۲۸۵ پر مطالعہ فرمائیں)

(۷) زیر بحث آیت قرآن کے غیبی اخبار میں سے ایک، اور اس کتاب کے آسمانی ہونے کے شواہد میں سے ہے، اور پیغمبر گرامی اسلام کے معجزات میں سے بھی ہے۔ جو اس قاطعیت اور تاکید کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہونے اور مستقبل قریب میں مراسم عمرہ بجالانے کی خبر دیتی ہے اور اس سے پہلے فتح قریب اور نزدیکی کامیابی کی خبر بھی دیتی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ دونوں پیشین گوئیاں پوری ہو گئیں، فتح خیبر کی داستان آپ پہلے سن چکے ہیں، اب "عمرة القضاء" کی داستان بھی سن لیں۔

لہ "من دون ذالک" کی تعبیر یا تو "قبل ذالک" کے معنی میں ہے۔ یعنی بعد والے سال میں عمرہ سے پہلے خدا مومنین کو ایک فتح قریب نصیب کرے گا۔ یا "غیر ذالک" کے معنی میں ہے۔ یعنی خاصہ خدا کی زیارت کی توفیق کے علاوہ ان کے لیے ایک فتح قریب بھی قرار دے گا۔

عمرة القضاء

”عمرة القضاء“ وہی عمرہ ہے جو پیغمبرؐ نے حدیبیہ سے ایک سال بعد یعنی ہجرت کے ساتویں سال کے ماہ ذی القعدہ میں (اس سے ٹھیک ایک سال بعد جب مشرکین نے آپؐ کو مسجد احرام میں داخل ہونے سے روکا تھا) اپنے اصحاب کے ساتھ انجام دیا، اور اس کا یہ نام اس وجہ سے ہے، چونکہ یہ حقیقت میں گزشتہ سال کی قضاء شمار ہوتا تھا۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: قرار داد حدیبیہ کی شقوں میں سے ایک شق کے مطابق پروگرام یہ تھا کہ مسلمان آٹھ ماہ سال مکہ عمرہ اور خانہ خدا کی زیارت آزادانہ طور پر انجام دیں لیکن تین دن سے زیادہ مکہ میں توقف نہ کریں اور اس مدت میں قریش کے سردار اور مشرکین کے جانے پہچانے افراد شہر سے باہر چلے جائیں گے (تا کہ ایک تو اختیالی ٹھکانے سے بچ جائیں۔ اور کتبہ پروری اور تعصب کی وجہ سے جو لوگ مسلمانوں کی عبادت توحیدی کے منظر کو دیکھنے کا یارا اور قدرت نہیں رکھتے، وہ بھی اُسے نہ دیکھیں)۔

بعض تواریخ میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے اپنے صحابہ کے ساتھ احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ لے کر چل پڑے اور ”ظہران“ کے قریب پہنچ گئے اس موقع پر پیغمبرؐ نے اپنے ایک صحابی کو جس کا نام ”محمد بن سلمہ“ تھا، عمدہ سواری کے گھوڑوں اور اسلحہ کے ساتھ اپنے آگے بھیج دیا، جب مشرکین نے اس پروگرام کو دیکھا تو وہ سخت خوف زدہ ہوئے اور انھوں نے یہ گمان کر لیا کہ حضرت ان سے جنگ کرنا اور اپنی دس سالہ صلح کی قرار داد کو ٹوٹنا چاہتے ہیں، لوگوں نے یہ خبر اہل مکہ تک پہنچا دی لیکن جب پیغمبرؐ کے قریب پہنچے تو آپؐ نے حکم دیا کہ تمام تیر اور نیزے اور دوسرے سائے ہتھیار اس سرزمین میں جس کا نام ”یانج“ ہے، منتقل کر دیں، اور آپؐ خود اور آپ کے صحابہ صرف نیام میں رکھی ہوئی تلواروں کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے ہیں۔

اہل مکہ نے جب یہ عمل دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ وعدہ پورا ہو گیا، (گو یا پیغمبرؐ کا یہ اقدام مشرکین کے لیے ایک تنبیہ تھا، کہ اگر وہ نقض عہد کرنا چاہیں اور مسلمانوں کے خلاف سازش کریں، تو وہ ان کے مقابلہ کی قدرت رکھتے ہیں)۔

رؤسائے مکہ، مکہ سے باہر چلے گئے، تاکہ ان مناظر کو جو ان کے لیے دل خراش تھے نہ دیکھیں، لیکن باقی اہل مکہ مرد، عورتیں اور بچے سب ہی راستوں میں، چھتوں کے اوپر، اور خانہ خدا کے اطراف میں جمع ہو گئے تھے، تاکہ مسلمانوں اور ان کے مراسم عمرہ کو دیکھیں۔

پیغمبرؐ ایک خاص رعب اور دب بے کے ساتھ مکہ میں وارد ہوئے اور قربانی کے بہت سے اونٹ آپؐ کے ساتھ تھے، اور آپؐ نے انتہائی محبت اور ادب کے ساتھ مکہ والوں سے سلوک کیا، اور یہ حکم دیا کہ مسلمان طواف کرتے وقت تیزی کے ساتھ چلیں، اور احرام کو ذرا جسم سے ہٹالیں تاکہ ان کے قومی اور طباقور اور موٹے ٹانے سے شانے آشکا

ہوں، اور بینظر مکہ کے لوگوں کی رُوح اور فک میں، مسلمانوں کی قدرت و طاقت کی زندہ دلیل کے طور پر اثر انداز ہوں۔
مجموعی طور سے ”عمرة القضاء“ عبادت بھی تھا اور قدرت کی نمائش بھی، یہ کہنا چاہیے کہ ”فتح مکہ“ جو بعد وائے سال
میں حاصل ہوئی، اس کا بیج انہیں دنوں میں بویا گیا، اور اسلام کے مقابلہ میں اہل مکہ کے تسلیم خم کرنے کے سلسلے میں مکہ
طور پر زمین ہموار کر دی۔

یہ وضع و کیفیت قریش کے سرداروں کے لیے اس قدر ناگوار تھی کہ تین دن گزرنے کے بعد کسی کو پیغمبرؐ کی خدمت میں بھیجا کہ
قرارداد کے مطابق جتنا جلدی ہو مکہ کو چھوڑ دیجیے۔

قابل توجہ بات یہ ہے، کہ پیغمبرؐ نے مکہ کی عورتوں میں سے ایک بیوہ عورت کو، جو قریش کے بعض سرداروں کی رشتہ دار تھی، اپنی
زوجیت میں لے لیا، تاکہ عربوں کی رسم کے مطابق، اپنے تعلق اور رشتے کو اُن سے مستحکم کر کے ان کی عداوت اور مخالفت میں کمی کریں۔
جس وقت پیغمبرؐ نے مکہ سے باہر نکل جانے کی تجویز سنی تو آپؐ نے فرمایا: میں اس ازدواج کے مراسم کے لیے کھانا کھانا چاہتا
ہوں اور تمہاری بھی دعوت کرنا چاہتا ہوں، یہ ایسا کام تھا کہ اگر یہ انجام پا جاتا، تو ان کے دلوں میں پیغمبرؐ کے ضمن میں ایک مؤثر نقش
چھوڑتا، لیکن انہوں نے قبول نہ کیا اور یہ دعوت رسمی طور پر رد کر دی گئی۔

۱۔ ”مجمع البیان طبری“ جلد ۹ صفحہ ۱۲۷

۲۔ ”فی ظلال القرآن“ جلد ۷ صفحہ ۵۱۱

۳۔ اور ”تاریخ طبری“ جلد ۲ صفحہ ۳۱۰

(اختصار اور خلاصے کے ساتھ)

۲۸- هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ
عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝

۲۹- مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ
رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرْتِبُهُمْ مَرْكَبًا سَجْدًا يَلْبَتُونَ فِضْلًا
مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ
السُّجُودِ ۗ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ ۗ وَمَثَلُهُمْ فِي
الْإِنْجِيلِ ۗ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ
فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سَوْقِهِ يَعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ
الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ۝

ترجمہ

۲۸- وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ
اُسے تمام دینوں پر غلبہ اور کامیابی دے۔ اور اس بات کے لیے خدا
کی گواہی کافی ہے۔

۲۹- محمد خدا کے رسول ہیں، اور جو لوگ اُس کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلہ میں سخت
اور آپس میں مہربان ہیں تو انہیں ہمیشہ رکوع اور سجدے میں دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ خدا

کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں، ان کی نشانی ان کے چہرے پہ سجدہ کے اثر سے نمایاں ہے، یہ تعریف و توصیف تو ان کی تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی توصیف یہ ہے کہ وہ ایسی زراعت کے مانند ہیں۔ جس نے اپنی کونپلیس نکالی ہیں۔ پھر وہ قوت حاصل کر کے مضبوط اور محکم ہو گئی اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی، اور اس قدر نشوونما کی کہ زراعت کرنے والوں کو حیران کر دیا۔ یہ اس بنا پر ہے کہ کافروں کو غصہ دلائے، خدا نے ان میں سے ایسے لوگوں سے جو ایمان اور عمل صالح بجا لانے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

تفسیر

دشمنوں کے مقابلہ میں سخت گیر اور دوستوں کے لیے مہربان

ان دو آیات میں جو سورہ فتح کی آخری آیات ہیں۔ "فتح المبین" یعنی صلح حدیبیہ سے مربوط دو دوسرے ہم مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے، جن میں سے ایک تو اسلام کے عالمگیر ہونے کے ساتھ مربوط ہے اور دوسرے میں پیغمبر اسلام کے اصحاب کے اوصاف اور ان کی خصوصیات، اور ان کے بارے میں خدائی وعدہ کو بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے "وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اُسے تمام دنیوں پر غالب کرے اور اس بات کے لیے خدا کی گواہی کافی ہے، (هو الذی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلدہ و کفی باللہ شہیداً)۔

یہ خداوند قادر متعال کی جانب سے صریح اور دو ٹوک وعدہ ہے۔ اسلام کے تمام دنیوں پر غالب ہونے کے بارے میں یعنی اگر خدا نے پیغمبر کے خواب کے ذریعہ تمہیں کامیابی اور فتح کی خبر دی ہے کہ تم انتہائی امن اور امان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہو گے اور مراسم عمرہ بجا لاؤ گے، اور کسی میں تم سے مزاحمت کرنے کی جرأت نہ ہوگی علاوہ انہیں اگر خدا تمہیں "فتح قریب" (خیبر کی کامیابی) کی خبر دے رہا ہے تو اس پر تعجب نہ کرو، یہ تو ابتلا ہے

انجام کار اسلام عالمگیر ہو جائے گا اور تمام ادیان پر کامیاب و کامران ہوگا۔
ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ رسول خدا کی دعوت کا مطلب ہدایت ہے: (ارسل رسولہ بالہدیٰ) اور اس کا دین حق ہے: (و دین الحق) اور ہر غیر جانب دار ناظر اس کی حقانیت کو، اس قرآن کی آیات میں اور اسلام کے انفرادی اجتماعی اور قضائی و سیاسی احکام اور سی طرح اس کی اخلاقی و انسانی تعلیمات میں دیکھ سکتا ہے، اور ان دقیق و صریح پیشین گوئیوں سے مستقبل کے بارے میں ہیں، اور بالکل ٹھیک واقع ہوئی ہیں۔ اس پیغمبر کے خدا سے ارتباط کو قطعی طور پر جان سکتا ہے۔

ہاں اسلام کی قوی منطق اور اس کے بار آور مطالب کا تقاضا یہی ہے کہ آخر کار وہ تمام شرک آلود مذاہب کا صفایا کر دے گا اور تحریف شدہ آسمانی دینوں کو اپنے سامنے جھکا دے گا۔ اور اپنی عمیق کشش کے ساتھ دلوں کو اس خالص دین کی طرف کھینچ لے گا۔

اس بارے میں کہ اس کامیابی سے "منطقی کامیابی" مراد ہے یا "فوجی و لشکری کامیابی" مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کامیابی صرف منطقی و استدلالی "کامیابی" ہے اور یہ امر حاصل ہو چکا ہے۔ کیونکہ اسلام منطق اور استدلال کی قدرت کے لحاظ سے تمام موجودہ ادیان پر برتری رکھتا ہے۔ جبکہ ایک دوسری جماعت "کامیابی کو" ظاہری غلبہ اور غلبہ اقتدار کے معنی میں سمجھتی ہے، اور اس لفظ "بیظلمہ" کا موقع استعمال بھی خارجی غلبہ کی دلیل ہے، اور اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے، کہ ان بہت سے وسیع علاقوں کے علاوہ جو دنیا کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں اسلام کی قلمرو میں داخل ہیں، اور اس وقت بھی ۴۰ سے زیادہ اسلامی ممالک میں مجموعی طور پر تقریباً ایک ارب افراد پرچم اسلام کے زیر سایہ سانس لے رہے ہیں۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ساری دنیا رسمی طور پر بھی اس پرچم کے نیچے آجائے گی، اور یہ امر قیام ہمدی (ارواحنا لله الفداء) کے ذریعہ تکمیل کو پہنچے گا۔

جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے منقول ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"لا یبقی علی ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام"

"پورے روئے زمین پر کوئی پتھر اور مٹی کا گھر یا اون در بالوں کا خیمہ باقی نہ رہے گا۔ مگر یہ کہ خدا اسلام کو اس میں داخل کر دے گا۔"

۱۔ تفسیر صحیح البیان جلد ۵ ص ۲۵، "قسطی" نے بھی اس روایت کو پیغمبر اسلام سے سورۃ نازک آیہ ۵۵ کے ذیل میں نقل کیا ہے

اس سلسلہ میں ہم سورہ توبہ کی آیہ ۳۳ میں جو اس آیت کے مشابہ ہے ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ لے
یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض نے "الہدیٰ" کی تعبیر کو "عقائد" اسلامی کے استحکام کی طرف اشارہ
سمجھا ہے، جبکہ "دین الحق" کو "فروع دین" سے متعلق جانا ہے، لیکن اس تقسیم بندی پر کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے
ویسے ظاہر یہ ہے کہ ہدایت و تقابلیت اصول میں بھی ہے اور فروع میں بھی۔

اس بارے میں کہ "لیظہرہ" کی ضمیر کا مرجع "اسلام" ہے یا "پغیب" مفسرین نے دو احتمال دیئے ہیں۔
لیکن قرآن اچھی طرح گواہی دے رہے ہیں کہ اس سے مراد وہی دین حق ہے، کیونکہ جملہ بندی کے لحاظ سے بھی ضمیر کے ساتھ
زیادہ نزدیک ہے اور دین کی دین پر کامیابی کے ساتھ بھی مناسبت رکھتا ہے نہ کہ شخص کی دین پر۔

آیت کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ "کفی باللہ شہیداً" کا جملہ اس واقعیت کی طرف اشارہ ہے
کہ اس پیشین گوئی کے لیے کسی شاہد اور گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا شاہد اور گواہ اللہ ہے اور رسول خدا کی رسالت
بھی کسی دوسرے گواہ کی محتاج نہیں ہے، کیونکہ اس کا گواہ بھی اللہ ہی ہے اور "ہیل بن عمرو" اور اس کے مانند دوسرے لوگ
اس بات پر تیار نہ ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" لکھا جائے تو وہ خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔
اور اس میں ہمارے لیے کوئی زحمت نہیں!

آخری آیت میں قرآن پغیب کے مخصوص اصحاب و انصار کی اور ان افراد کی جو آپ کے طریقہ پر تھے، تورات
و انجیل کسی زبان سے ایک بہت ہی واضح تصویر پیش کرتا ہے اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے "حدیبیہ" اور دوسرے
مراحل میں پامردی دکھائی ہے، ایک فخر اور مہابت کی بات بھی ہے، اور تمام قرون اعصار میں تمام مسلمانوں کے لیے
ایک سبق آموز درس بھی ہے۔

ابتداء میں فرماتا ہے: محمد خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے: (محمد رسول اللہ)۔

چاہتے ہیل بن عمرو جیسی چمکاڑیوں سے پسند کریں یا نہ کریں؟ اور خود کو اس آفتاب عالیشان سے پنہاں کر لیں یا
نہ کریں؟ خدا نے اس کی رسالت کی گواہی دی ہے اور تمام صاحبان علم و آگاہی بھی اس بات کے گواہ ہیں۔

اس کے بعد آپ کے اصحاب و انصار کی تعریف و توصیف کا آغاز کرتے ہوئے ان کے ظاہر و باطن اوصاف اور عواطف
و افکار و اعمال کو پانچ صفات کے ضمن میں بیان کرتا ہے۔ "وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کفار کے مقابلہ میں زیادہ سخت اور محکم
ہیں: (والتذین معہ اشداء علی الکفار)۔

اور دوسری صفت یہ بیان کرتا ہے: "لیکن آپس میں رحم دل اور مہربان ہیں" (رحماء بینہم)۔
ہاں وہ اپنے بھائیوں، دوستوں اور ہم مذہب افراد کے لیے تو عطف و محبت کا مرکز اور خزانہ ہیں اور دشمنوں

کے مقابلہ میں سخت اور جلانے والی آگ اور مضبوط فولادی دیوار ہیں۔

درحقیقت ان کے عواطف و رجحانات کا خلاصہ یہ ”مہسر“ اور ”قہسر“ ہی ہیں۔ لیکن ان دونوں کا ان کے وجود میں جمع ہونا کوئی تضاد نہیں رکھتا، اور دشمن کے مقابلہ میں ان کا قہسر، اور دوستوں کے لیے ان کا مہر و محبت اس بات کا سبب نہیں بنتا کہ وہ راہِ حق و عدالت سے قدم باہر رکھیں تیری صفت میں جو ان کے اعمال کے بلے میں ہے مزید کہتا ہے۔ تو انھیں ہمیشہ رکوع و سجود کی حالت میں دیکھے گا اور وہ ہر وقت عبادتِ خدا میں مشغول رہتے ہیں۔ (تراہد رکعاً سجداً)

یہ تعبیر خدا کی عبادت و بندگی کو جو اس کے دو اصلی ارکان ”رکوع“ و ”سجود“ کے ساتھ بیان ہوئی ہے، ان کی دائمی اور ہمیشہ کی حالت کے طور پر ذکر کرتی ہے، ایسی عبادت، جو حق تعالیٰ کے فرمان کے سامنے تسلیم خم کرنے، اور کبر و غرور اور خودخواہی کی ان کے وجود سے نفی کی رمز ہے۔

چوتھی توصیف و تعریف میں جو ان کی پاک اور خالص نیت سے بحث کرتی ہے، فرماتا ہے: ”وہ ہمیشہ خدا کے فضل اور اس کی رضا کو طلب کرتے ہیں“؛ (یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً)۔

نہ تو وہ دکھاوے اور ریاکاری کے لیے قدم اٹھاتے ہیں، اور نہ ہی مخلوق خدا سے اجر و پاداش کی توقع رکھتے ہیں۔ بلکہ ان کی نظر صرف اس کی رضا و فضل پر لگی ہوئی ہے، اور تمام زندگی میں ان کے عمل کا محرک صرف یہی امر ہے۔ اور بس۔ بیان تک ”فضل“ کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی کوتاہی کے معترف ہیں، اور اپنے اعمال کو کمتر سمجھتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں خدا کا اجر و پاداش طلب کریں، بلکہ وہ پوری سعی و کوشش کے باوجود پھر بھی یہ کہتے ہیں، خداوند! اگر تیرا فضل و کرم ہماری مدد و نصرت نہ کرے تو دوائے ہے ہم پر۔

پانچویں اور آخری توصیف میں ان کے آراستہ اور نورانی پیکرِ ظاہر کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”ان کی نشانی ان کے چہرے میں سجدہ کے اثر سے نمایاں ہے“؛ (سیماہم فی وجوہہم من اثر السجود)۔ یہ ”سیما“ اصل میں علامت و ہیئت کے معنی میں ہے۔ چاہے یہ علامت چہرے میں ہو یا بدن کی کسی دوسری جگہ، اگرچہ فارسی کے روزمرہ کے استعمال میں چہرے کی نشانیوں اور چہرہ کی ظاہری وضع و کیفیت کے لیے بولا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کا ”قیافہ“ اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ خدا، حق، قانون اور عدالت کے سامنے ایک خاضع انسان ہیں، نہ صرف ان کے چہرے میں ہی بلکہ ان کے سارے وجود اور زندگی میں یہ علامت منعکس ہوتی ہے۔

لہ ”سیماہم“ مبتدا اور ”فی وجوہہم“ اس کی خبر ہے اور ”من اثر السجود“ یا ”سیما“ کا بیان ہے یا ”سیما“ کے لیے حال ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ ”من“ کو نشوونما، جانیں اور جملہ کا معنی اس طرح ہوگا کہ ان کی علامت ان کے چہرے میں ہے اور یہ علامت سجود کے اثر سے ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے پیشانی پر سجدہ کے ظاہری اثر یا سجدہ گاہ کی جگہ پر مٹی کے اثر سے تفسیر کی ہے۔ لیکن ظاہراً آیت اس سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ان مردانِ خدا کے چہرہ کی مکمل طور پر تصویر کشی کرتی ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت قیامت میں ان کے سجدہ گاہ کی طرف اشارہ ہے، جو چودھویں کے چاند کی طرح چمکے گی۔

البتہ ممکن ہے کہ قیامت میں ان کی پیشانی اسی طرح ہو۔ لیکن یہاں آیت دنیادی زندگی میں ان کی ظاہری وضع و کیفیت کی خبر دے رہی ہے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے بھی آیا ہے کہ آپؑ نے اس جملہ کی تفسیر میں فرمایا،
 هو السهر في الصلوة؛ "اس سے مراد رات کو نماز پڑھنے کے لیے بیدار رہنا ہے" جس کے آثار دن کے وقت ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ لہ
 البتہ ان معانی کو جمع کرنا پورے طور پر ممکن ہے۔

پھر حال قرآن ان تمام اوصاف کو بیان کرنے کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ ان (اصحابِ محمدؐ) کی توصیف تواریت میں ہے"؛ (ذالک مثلہم فی التوراة)۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس کا بیان پہلے سے آچکا ہے، اور ایسی توصیف و تعریف ہے جو ایک عظیم آسمانی کتاب میں ہے، جو ایک ہزار سال سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ "والذین معہ" (اور وہ جو اس کے ساتھ ہیں) کی تعبیر ایسے افراد کے بارے میں گفتگو کرتی ہے، جو ہر چیز میں پیغمبر کے ساتھ تھے، فکر و نظر میں، عقیدہ و اخلاق میں اور عمل میں، نہ کہ صرف وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہم عصر اور ہم زمان تھے، چاہے ان کا طریقہ اور راستہ آپ سے جدا ہی کیوں نہ ہو؛

اس کے بعد ان کی ایک اور آسمانی عظیم کتاب یعنی "انجیل" میں، توصیف کو پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: ان کی توصیف انجیل میں اس زراعت کی طرح ہے، جس نے اپنی کونپلوں کو باہر نکالا ہو، پھر انہیں تقویت دی ہو۔ یہاں تک کہ وہ مضبوط اور مستحکم ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہے، اور اس قدر نشوونما کی ہے اور برکت ہوئی ہے۔ کہ زراعت کرنے والوں کو تعجب میں ڈال دیتی ہے۔ (ومثلہم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یحجب الزراع)۔ لہ

لہ "من لا یحضرہ الفقیہ" روضۃ الاعظین، مطابق نقل تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۷۸۔

لہ اس بارے میں کہ "ومثلہم فی الانجیل" ایک متقل جملہ ہے اور اصحابِ پیغمبر کی ایک الگ توصیف و تعریف کرتا ہے جو اس تعریف کے علاوہ ہے جو تورات میں آئی ہے یا یہ "ذالک مثلہم فی التوراة" کے جملہ پر عطف ہے اس طرح سے کہ دونوں اوصاف کی دونوں آسمانی کتابوں سے خبر دیتا ہے۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ لیکن آیت کا ظاہر یہ ہے کہ دونوں اوصاف الگ الگ جدا گانہ (بقیہ ماحیہ صفحہ برآینہ ۵)

”شطاً“ ہٹنی اور چڑھے کے معنی میں ہے۔ ایسی ٹہنیاں جو تنے کے نیچے اور جڑوں کے قریب سے باہر نکلتی ہیں۔
 ”ازر“ ”موازرکا“ کے مادہ سے معاونت کے معنی میں ہے۔

”استغلاظ“ ”غلظت“ کے مادہ سے سخت اور مستحکم ہونے کے معنی میں ہے۔

”استوی علی سوقہ“ کے مجملہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس قدر مستحکم ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہے، اس بات پر توجہ رکھیے کہ ”سوق“ ”ساق“ کی جمع ہے)

”يعجب الزراع“ کی تعبیر، یعنی وہ اتنی تیزی کے ساتھ اُگی اور اتنی زیادہ ٹہنیاں اور شاخیں نکلیں اور اس کی پیداوار اس حد کو پہنچی کہ خود کسانوں تک کو، جو ہمیشہ ان مسائل سے سروکار رکھتے ہیں، بہت زیادہ حیرت اور تعجب ہو رہا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ دوسری توصیف میں بھی، جو انجیل میں آئی ہے، مومنین اور محمد کے صحابہ کے پانچ عمدہ اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ (کوئل نکالنا، پرورش کے لیے مدد کرنا، محکم ہونا، اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا، حیرت انگیز دکھائی دینے والی نشوونما) حقیقت میں تورات میں جو اوصاف ان کے لیے بیان ہوئے ہیں وہ ایسے اوصاف ہیں، جو حالات، مقاصد، اعمال اور ظاہری صورت کے لحاظ سے ان کے وجود کے پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن وہ اوصاف جو انجیل میں بیان ہوئے ہیں وہ ان کے مختلف پہلوؤں میں ترقی اور نشوونما کو بیان کرتے ہیں (غور کیجیے)

ہاں! وہ ایسے بلند صفات ہیں جو ایک آن کے لیے بھی ”حکرت“ ”دعل سے نہیں رکتے، وہ ہمیشہ کونپلیں نکالتے رہتے ہیں، وہ کونپلیں پرورش پاتی ہیں۔ اور بار آور ہوتی ہیں۔
 وہ اپنے قول و عمل کے ذریعہ اسلام کو دُنیا میں پھیلاتے رہتے ہیں۔ اور روز بروز نئے دستوں کا اسلامی معاشرے میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

ہاں! وہ کبھی بھی بے کار ہو کر نہیں بیٹھتے، اور ہمیشہ آگے کی طرف بڑھتے رہتے ہیں، عابد ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہد ہیں اور جہاد کے ساتھ ساتھ عبادت کرتے ہیں، ان کا ظاہر آرامگاہ ہے اور باطن پیراستہ ہے، ان کے عواطف قوی اور نیتیں پاکیزہ ہیں۔ حق کے دشمنوں کے مقابلہ میں خدا کے غضب کے منظر ہیں، اور حق کے دوستوں کے ساتھ اس کے لطف و رحمت کو نمایاں کرتے ہیں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: ”بیر عالی اوصاف، یہ تیزی کے ساتھ بڑھنے والی نشوونما، اور یہ برکت حرکت و ترقی جتنی دوستوں میں شوق اور نشاط پیدا کرتی ہے، اتنا ہی کفار کے لیے غیظ و غضب کا سبب بنتی ہے: ”یہاں بنا پر ہے تاکہ کافروں کو غصہ دلائے“: (لیغیظ بہم الکفار)۔

(باقی ماحشیہ صفحہ ۴۱۱ کا) طور پر ان دو آسمانی کتابوں میں کلمے ہوئے موجود تھے، اسی لیے لفظ ”مثل“ کا تکرار ہوا ہے، درحالیہ کہ اگر یہ ایک دوسرے پر عطف ہوتے

تو نصوص کا تقاضا یہ تھا کہ لیں کہا جاتا: ”ذالک مثلہم فی الشوراء والانجیل“

یہ ”لیغیظ“ کے مجملہ میں جہلام ہے۔ بہت سے مفسرین اسے علت کلام سمجھتے ہیں، اس بنا پر اس مجملہ کا مفہوم: بقیہ ماحشیہ معززہ (صفحہ ۴۱۱)

اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے، : خدا نے ان میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں، اور ساتھ میں عمل صالح انجام دیئے ہیں، بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے“ : (وعد الله الذين امنوا وعملوا الصالحات منه مغفرة واجرا عظيماً)۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ اوصاف جو آیت کی ابتدا میں بیان کئے گئے ہیں، ان میں ایمان اور عمل صالح جمع تھا، اس بنا پر ان دو اوصاف کی تکرار ان کے دوام اور ہمیشہ برقرار رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی خدا نے یہ وعدہ صرف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے اس گروہ سے کیا ہے جو آپ کے راستہ اور طریقہ پر باقی رہیں گے، اور ایمان و عمل صالح کو دوام بخشیں گے، ورنہ وہ لوگ جو ایک دن تو اس کے دوستوں اور اصحاب انصار کے زمرہ میں شامل تھے۔ اور دوسرے دن آنحضرت سے جدا ہو گئے، اور ان کے برخلاف راستے پر چل پڑے، وہ اس قسم کے وعدہ میں ہرگز شامل نہیں ہیں۔

”منہم“ کی تعبیر۔ (اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ لفظ ”من“ ایسے مواقع پر ”تبعیض“ کے لیے ہوتا ہے اور آیت کا ظاہر بھی یہی معنی دیتا ہے)۔ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے صحابہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے: ایک گروہ ایمان اور عمل صالح کو جاری رکھے گا، اور حق تعالیٰ کی رحمت واسعہ اور اجر عظیم میں شامل ہوگا، لیکن ایک گروہ اس سے الگ ہو کر اس عظیم فیض و برکت سے محروم ہو جائے گا۔

معلوم نہیں معسرین کا ایک گروہ اس بات پر کیوں اصرار کرتا ہے۔ کہ اوپر والی آیت میں ”منہم“ کا ”من“ حتماً بیان ہے۔ حالانکہ بالفرض اگر ہم خلاف ظاہر کے مرتکب بھی ہوں اور ”من“ کو ”بیان“ کے لیے ہی لے لیں، تو ان قرآن عقلی کو جو یہاں موجود ہیں، انہیں کیسے ایک طرف کریں گے، کیونکہ کوئی شخص بھی اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ پیغمبر کے تمام صحابہ مخصوص تھے تو اس صورت میں راہ ایمان اور عمل صالح پر باقی نہ رہنے کا احتمال ان میں سے ہر ایک کے بارے میں جائے گا۔ تو ان حالات میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ بغیر کسی قید و شرط کے ان سب کو دے دے، عام اس سے کہ وہ ایمان و صلاح کی راہ طے کریں یا آدھی راہ سے پلٹ جائیں اور مخرف ہو جائیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ، : ”والذین معہ“ (وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں) کے مجملہ کا مفہوم آپ کے پاس بیٹھنا اور آپ سے جہانی مصاحبت نہیں ہے، کیونکہ ایسی مصاحبت تو منافقین بھی رکھتے تھے، بلکہ ”معہ“ سے مراد قطعی طور پر اصول ایمان اور تقویٰ کے لحاظ سے ہمراہ ہونا ہے۔

اس بنا پر ہم اوپر والی آیت سے پیغمبر کے تمام ہم نشینوں اور معاصرین کے لیے ہرگز ایک حکم کلی کا استفادہ نہیں کر سکتے۔

چند نکات

۱۔ تنزیہ صحابہ کی داستان : اہل سنت کے علماء اور دانشمندیوں میں مشہور یہ ہے کہ صحابہ رسول اُمت کے تمام دوسرے افراد سے ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں کہ وہ سب کے سب پاکیزہ ہیں، اور وہ آلودگیوں سے دور ہیں، اور ہمیں ان میں سے کسی پر تنقید و اعتراض کا حق نہیں ہے، اور انھیں بُرا بھلا کہنا مطلقاً ممنوع ہے، یہاں تک کہ بعض کے قول کے مطابق موجب کفر ہے، اور اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے قرآن مجید کی کچھ آیات سے استناد کیا ہے، مجملہ ان کے ایک زیر بحث آیت ہے جو یہ کہتی ہے کہ : خدا نے اُن میں سے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے " اور اسی طرح سورہ توبہ کی آیت ۱۰۰ جو مہاجرین و انصار کا ذکر کرنے کے بعد کہتی ہے :

"رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ"

"خدا ان سے خوش ہو گیا اور وہ خدا سے خوش ہو گئے"

لیکن اگر ہم اپنے آپ کو پہلے سے کئے ہوئے فیصلوں سے خالی کر لیں تو ایسے واضح قرائن ہمارے سامنے موجود ہیں جو اس مشہور عقیدہ اور نظریہ کو متزلزل کر دیتے ہیں۔

① سورہ توبہ میں "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کا جملہ صرف مہاجرین و انصار کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں مہاجرین و انصار کے ساتھ "الذین اتبعوہم باحسان" کا جملہ بھی موجود ہے، جس کا مفہوم تمام ان افراد کو شامل ہے، جو دامن قیامت تک نیکی میں ان کی پیروی کریں گے۔

جس طرح "تالبعین" اگر ایک دن خط ایمان و احسان میں ہوں اور دوسرے دن کفر و اسارہ (بدی کرنے) کے خط میں قرار پاتے ہیں تو وہ رضایت الہی کے چتر کے نیچے سے نکل جائیں گے، بعینہ ہی مطلب "صحابہ" کے بارے میں بھی ہوگا، کیونکہ انھیں بھی سورہ فتح کی آخری آیت میں ایمان و عمل صالح کے ساتھ مقید کیا ہے کہ اگر کسی دن یہ صفت اُن سے سلب ہو جائے تو وہ رضایت الہی کے دائرہ سے باہر نکل جائیں گے۔

دوسرے لفظوں میں "احسان" کی تعبیر "تالبعین" کے لیے بھی ہے، اور "متبوعین" کے بارے میں بھی اس بنا پر

ان دونوں میں سے جو کوئی بھی "خط احسان" کو چھوڑ دے گا وہ رضایت خدا میں شامل نہیں رہے گا۔

② روایات اسلامی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگرچہ آنحضرت کی مصاحبت کا اعزاز و امتیاز رکھتے تھے۔ لیکن وہ لوگ جو بعد کے زمانوں میں آئیں گے، اور ایمان راسخ اور عمل صالح سے متصف ہوں گے وہ ایک لحاظ سے صحابہ سے افضل ہیں۔

جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے بیان ہوا ہے، کہ صحابہ نے آپ سے عرض کیا:

”نحن اخوانك يا رسول الله! قال: لا انتم اصحابي، واخواني الذين يأتون بعدي، امنوا بي ولم يروني، وقال: للعامل منهم اجر خمسين منكم، قالوا بل منهم يا رسول الله؟ قال: بل منكم اريدوها مثلثا، ثم قال: لا انتم تجدون على الخير اعوانا!:

”یا رسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی ہیں؟ اور فرمایا انہیں! تم تو میرے اصحاب ہو، لیکن میرے بھائی تو وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے، اور مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا! اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا: ان میں سے وہ افراد جو عمل صالح کرنے والے ہوں گے وہ تم میں سے پچاس افراد کا اجر رکھتے ہیں، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا وہ اپنے میں سے پچاس افراد کا (اجر رکھیں گے) فرمایا نہیں: تم میں سے پچاس افراد کا، اور انھوں نے اس بات کو تین مرتبہ دہرایا، (اور پیغمبر نے تینوں مرتبہ یہی کہا) اس کے بعد آپ نے فرمایا، یہ اس بنا پر ہے کہ تمہارے پاس ایسے شرائط و حالات موجود ہیں جو تمہارا اچھے کاموں میں مدد کرتے ہیں“ ۱

صحیح مسلم میں بھی رسول خدا سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ ایک دن آپ نے فرمایا:

”وددت انا قدرأینا اخواننا۔“

”میں دوست رکھتا ہوں کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے۔“

”قالوا: اولسنا اخوانك يا رسول الله؟!:

انھوں نے کہا، یا رسول اللہ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟!

آپ نے فرمایا:

”انتم اصحابي واخواننا الذين لم يأتوا بعدي:

”تم تو میرے اصحاب ہو لیکن ہمارے بھائی ابھی تک نہیں آئے“ ۲

عقل و منطق بھی یہی کہتی ہے، کہ دوسرے لوگ جو شب و روز پیغمبر کی دائمی تعلیمات کے سایہ میں نہیں تھے لیکن اس کے باوجود وہ پیغمبر کے صحابہ کے مانند یا ان سے زیادہ ایمان و عمل صالح رکھتے تھے۔ وہ ان سے برتر و افضل ہیں۔ (۳) یہ بات تاریخی طور پر بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ بعض صحابہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے پیغمبر اکرم کے بعد یا خود پیغمبر کے زمانہ میں ہی غلط راستہ اختیار کر لیا تھا۔

۱ ”تفسیر روح البیان“ جلد ۹ صفحہ ۴۱

۲ ”صحیح مسلم“ جلد اول کتاب الطہارۃ حدیث ۳۹۔

ہم ان لوگوں کو جنہوں نے جنگِ جبل کی آگ بھڑکائی، اور اتنے سارے مسلمانوں کو قتل کرایا، اور پیغمبر کے برحق خلیفہ کے سامنے تلوار کھینچی، گناہ سے کیسے بری قرار دے سکتے ہیں؟

یا وہ لوگ جو ”صفین“ و ”نہروان“ میں اکٹھے ہونے اور پیغمبر کے وصی و جانشین اور مسلمانوں کے منتخب خلیفہ کے مقابلہ جنگ کھڑی کر دی، اور بے حساب خون بہائے، انھیں رضائے خدا کا مشمول جان لیں، اور یہ کہنے لگیں کہ گناہ و عصیان کا گرد و غبار بھی ان کے دامن پر نہیں بیٹھا۔

اور اس سے بھی عجیب تر ان لوگوں کا عذر ہے جو ان تمام مخالفتوں کو اس عنوان سے کہ وہ ”مجتہد“ تھے اور ”مجتہد“ معذور ہے توجیہ کرتے ہیں۔

اگر اس قسم کے عظیم گناہوں کی ”اجتہاد“ کے ذریعہ توجیہ کی جاسکتی ہو تو پھر کسی قاتل کو ملامت نہیں کی جاسکتی، یا عدوِ الہی کا اس میں اجراء نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس نے اجتہاد کیا ہو۔

دوسرے لفظوں میں میدانِ جبل یا صفین یا نہروان میں دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے ہیں، اور یقینی طور پر وہ دونوں کے دونوں حق پر نہیں تھے، کیونکہ ضدین کا جمع ہونا محال ہے۔ اس حالت میں دونوں کو رضائے خدا کا مشمول کیسے سمجھا جاسکتا ہے، جبکہ یہ مسئلہ کوئی مشکل اور ایسے پیچیدہ مسائل میں سے نہیں تھا، جس کی تشخیص ممکن نہ ہو؟ کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ علیؑ یا تو پیغمبر کی نص کے مطابق اور یا مسلمانوں کے انتخاب کے ذریعہ برحق خلیفہ تھے، اس کے باوجود ان کے خلاف تلوار کھینچی، اس کام کی اجتہاد کے طریقہ سے کیسے توجیہ کی جاسکتی ہے؟!

”اصحابِ ردہ“ کی شورش کو جو ابوجبر کے زمانہ میں ہوئی اس کی طریقِ اجتہاد سے توجیہ کیوں نہیں کرتے، اور انہیں رسمی و قانونی طور پر مرتد کیوں شمار کرتے ہیں، لیکن ”جبل“ ”صفین“ ”نہروان“ کے شورش کرنے والوں کو ہر قسم کے گناہ سے متبرک بھتے ہیں۔

بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنزیہ اصحاب کا مسئلہ مطلق طور پر ایک سیاسی مسئلہ تھا، ایک گروہ لے پیغمبر کے بعد اپنی حیثیت کی حفاظت کے لیے اس پر تکیہ کیا تاکہ اپنے آپ کو ہر قسم کی تنقید و اعتراض سے بچالے اور محفوظ کر لے۔ اور یہ ایک ایسا مطلب ہے جو نہ تو عقل کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی مسلمہ اسلامی تاریخوں کے ساتھ، اور یہ ایک ایسا شعر ہے جو ہمیں اپنے قافیہ میں گرفت کر لے گا۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ہم صحابہ رسولؐ خدا اور ان لوگوں کا جو ہمیشہ آپ کے طریقہ اور راستہ پر چلتے رہے، احترام کرنے کے باوجود ان کے بارے میں معیار حیات، ان کی زندگی میں آغاز سے لے کر انجام تک ان کے عقائد و اعمال کو اسی معیار سے سمجھیں جو معیار کہ ہمیں قرآن سے معلوم ہوا ہے، یعنی وہی معیار کہ جس کے ساتھ پیغمبر اپنے صحابہ کو پرکھتے تھے۔

۲۔ اسلامی باہمی محبت: اسلامی روایات میں جو آخری آیہ کی تفسیر میں منقول ہوئی ہیں، ”رحماء بینہم“ کی اصل پر بہت زیادہ تاکید نظر آتی ہے، منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے بیان ہوا ہے:

”المسلم اخو المسلم، لا يظلمه، ولا يتخذ له، ولا يخوفه، ويحق على المسلم الاجتهاد في التواصل، والتعاون على التعاطف، والمواساة لاهل الحاجة، وتعاطف بعضهم على بعض، حتى تكونوا كما امركم الله عز وجل: رحماء بينكم متراحمين، مغتمين لما غاب عنكم من امرهم، على ما مضى عليه معشر الانصار على عهد رسول الله (ص):

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس پر ظلم نہیں کرتا، اُسے تنہا نہیں چھوڑتا، اُسے ڈراتا دھمکاتا نہیں اور ضروری ہے کہ مسلمان حاجت مندوں سے ربط، تعلق، تعاون، محبت اور انسیت میں کوشش کرے اور ایک دوسرے کے ساتھ مہربان ہو۔ تاکہ ارشاد خداوندی ”رحماء بینہم“ کے مطابق ایک دوسرے سے محبت اور پیار کا سلوک رواج پائے، یہاں تک کہ ان کے پیٹھ پیچھے ان کے امور کے بارے میں دل سوزی سے کام لیں۔ جیسا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں انصار تھے۔ لہ

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اس آیت کی مؤثر رہنمائی اور ان خصوصیات سے، جو سچے مومنین اور رسول اللہ کے صحابہ کی مثال بنتی ہیں، دوری اختیار کر لی ہے۔ اور بعض اوقات تو اس طرح سے ایک دوسرے کے جان لیوا بن جاتے ہیں اور ایسی کینہ پروری اور خونریزی کرتے ہیں، کہ دشمنان اسلام کے لیے بھی کبھی ایسی نہ کی ہوگی۔

بعض اوقات کفار کے ساتھ دوستی کا ایسا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ جیسے کہ وہ ایک ہی اصل و نسب کے بھائی ہیں۔

نہ اس رکوع و سجود کا کوئی پرتہ ہے، نہ وہ پاکیزہ نیتیں اور ”ابتغاء فضل اللہ“ (اللہ کے فضل کا طالب ہونا)، اور نہ ہی چہرہ پر سجدوں کے وہ آثار نمایاں ہیں، نہ وہ نشوونما، نہ کونچلیں نکالنا، نہ قوی ہونا اور نہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم جتنا ان قرآنی اصولوں سے دور ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ در دوزخ اور ذلت و کجبت میں گرفتار ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی توجہ نہیں کرتے کہ ہمیں یہ ضرب کہاں سے پڑی ہے؟ پھر وہی ”ہاہلیت کی طرفداریاں عذوف کرنے بجدید نظر اور قرآن کی طرف لوٹنے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، خدایا ہمیں اس گہری اور خطرناک نیند سے بیدار کر دے۔

خداوند! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم پیغمبر کے سچے اصحاب و انصار کی اخلاقی خصوصیات کو جو ان آیات میں آئی ہیں۔ اپنے اندر زندہ کریں۔

بارالہا! ہمیں دشمنوں کے مقابلہ میں شدت، دوستوں کے ساتھ محبت، تیرے فرمان کے لیے تسلیم و رضا، تیری خاص عنایات کی طرف توجہ، اور اسلامی معاشرے کو بارور کرنے کے لیے سعی و کوشش اور اس کو ترقی دینے اور پھیلانے کی توفیق عنایت فرما۔

پروردگار! ہم تجھ سے فتح میں کے طلب گار ہیں، جس کے سائے میں ہمارا اسلامی معاشرہ حرکت میں آجائے، اور اس عصر اور زمانہ میں جس میں ہر دوسرے وقت سے زیادہ محنویت و روحانیت کی احتیاج و ضرورت ہے، ہم اس دین کی حیات بخش تعلیمات کو لوگوں کے سامنے پیش کریں اور ہر روز نئے دلوں کو اسلام کی تسخیر و اطاعت میں داخل کریں اور دلوں کے ممالک میں سے ایک نیا ملک فتح کریں، (آمین یا رب العالمین)

سورہ فتح کا اختتام

۶، شوال ۱۴۰۵ھ

۱۳۶۲ / ۴ / ۴

سُورَةُ حَجْرَات

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہوا

اور اس کی ۱۸ آیات ہیں

تاریخ شروع

۶ شوال ۴۰۵ھ

۱۳۶۳ / ۲ / ۲

سورہ حجرات کے مطالب

اس سورہ میں، جس میں اٹھارہ سے زیادہ آیات نہیں ہیں، پیغمبر سے مربوط اور اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے سے تعلق کے بارے میں بہت اہم مسائل بیان ہوئے ہیں، اور چونکہ اس میں بہت سے اہم اخلاقی مسائل کو عنوان بنایا گیا ہے لہذا اس سورہ کو "سورہ اخلاق و آداب" بھی کہا جاسکتا ہے۔
اس سورہ کے مختلف حصوں کا مجموعی طور سے کچھ اس طرح خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

پہلا حصہ

آغاز سورہ کی آیات ہیں، جو اسلام کے عظیم ترین پیشوا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے آداب اور ان اصولوں کو بیان کرتی ہیں جن کا مسلمانوں کو آپ کے حضور میں کاربند ہونا چاہیے:

دوسرا حصہ

اس سورہ کا "اجتماعی اور معاشرتی اخلاق" کے اہم اصول کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہے، جن کی پابندی سے اسلامی معاشرہ میں محبت و صفا و امنیت و اتحاد کی حفاظت ہوتی ہے اور ان کے برخلاف ان کو فراموش کر دینا بدینی، نفاق پر اگندگی اور بد امنی کا سبب بنتا ہے۔

تیسرا حصہ

ایسے احکام ہیں، جو اختلافات اور آپس میں لڑ پڑنے کے خلاف مبارزہ کرنے کی کیفیت سے مربوط ہیں، جو بعض اوقات مسلمانوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

چوتھا حصہ

انسان کی بارگاہ خدا میں قدر و قیمت اور مسئلہ تقویٰ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

پانچواں حصہ

اس مسئلہ کی تاکید کرتا ہے کہ ایمان صرف زبان سے اقرار کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اعتقاد قلبی کے علاوہ اس کے آثار انسانی اعمال اور اموال اور نفسوں کے ساتھ جہاد کرنے میں بھی آشکار ہونے چاہئیں۔

چھٹا حصہ

اس چیز سے بحث کرتا ہے کہ اسلام و ایمان، خدا کا مومنین کے لیے ایک عظیم ہدیہ ہے، لہذا بجائے اس کے کہ اس کو قبول کر کے احسان جتلائیں، انہیں تو حد سے زیادہ ممنون و مشکور ہونا چاہیے کہ وہ اس ہدیہ کے مشمول ہوئے۔

اور آخر میں:

ساتواں حصہ

جو اس سورہ کا آخری حصہ ہے، تمام عالم ہستی کے پوشیدہ اسرار، اور انسانوں کے اعمال سے خدا کے علم و آگاہی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، جو حقیقت میں ان تمام حصوں کے اجراء کے ضامن کے طور پر آیا ہے، جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔

اس سورہ کا نام سورہ ”حجرات“ اس سورہ کی چوتھی آیت کی مناسبت سے ہے، جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کی تفسیر عنقریب بیان ہوگی۔

اس سورہ کی تلاوت

کی

فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے سلسلہ میں یہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ منقول ہوا ہے:

” من قرأ سورة الحجرات اعطى من الاجر عشر حسنات بحد من اطاع الله ومن عصاه“

” جو شخص سورہ حجرات کو پڑھے گا اُسے ان تمام افراد کی تعداد کے برابر، جنہوں نے خدا کی اطاعت کی ہے، یا نافرمانی کی ہے، دس نیکیاں دی جائیں گی۔ ایک اور حدیث میں امام صادق سے آیا ہے۔

« من قرأ سورة الحجرات في كل ليلة، اوفى كل يوم، كان من

زوار محمد (ص) »

” جو شخص سورۃ حجرات کو ہر رات یا ہر روز پڑھے گا وہ زائرین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے

ہوگا۔“

یہ بات واضح ہے کہ یہ تمام حسنات اطاعت کرنے والوں اور معصیت کرنے والوں میں اس صورت میں نمود پذیر ہوں گے۔ جب انسان ان دونوں میں سے ہر ایک کے اعمال کو، جو اس سورہ میں منکس ہوئے ہیں، وقت کے ساتھ نظر میں رکھے، ان میں غور و فکر کرے اور اپنے راہ عمل کو اول پر منطبق اور دوسرے سے جدا کرے۔ علاوہ ازیں پیغمبر گرامیؐ کی زیارت سے مشرف ہونا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ جو آداب اس سورہ میں آنحضرتؐ کی شخصیت کے بارے میں آئے ہیں ان پر عمل کرے، کیونکہ تلامذت تو ہر مقام پر عمل کرنے کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

۱- یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ يَدِی اللّٰهِ

وَرَسُوْلِهِ وَاَتَّقُوا اللّٰهَ ۙ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝

۲- یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ

صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ

بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ

لَا تَشْعُرُوْنَ ۝

۳- اِنَّ الَّذِیْنَ یَغْضُوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ

اَوْ لَیْلِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُلُوْبُهُمْ لِلتَّقْوٰی لَهُمْ

مَغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝

۴- اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ

لَا یَعْقِلُوْنَ ۝

۵- وَلَوْ اَنَّهٗمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لّٰهُمَّ

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۱۔ اے ایمان لانے والو! خدا اور اس کے رسول سے کسی چیز میں آگے نہ بڑھا کرو، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، بیشک خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۲۔ اے ایمان لانے والو! تم اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کیا کرو، اور اس کے سامنے اونچے اونچے نہ بولا کرو۔ (اوپر چیخ و پکار نہ کرو) جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے (زور زور سے) باتیں کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے سب اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خیر تک نہ ہو۔

۳۔ وہ لوگ جو رسول خدا کے سامنے اپنی آوازیں نیچی رکھتے ہیں، ایسے لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے تقویٰ کے لیے خالص کر لیا ہے، ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔

۴۔ لیکن وہ لوگ جو تمہیں حجروں کے پیچھے سے بلند آواز کے ساتھ پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں۔

۵۔ اگر وہ لوگ اتنا صبر کرتے کہ تم خود نکل کر ان کے پاس آجاتے تو ان کے لیے بہتر تھا، اور خدا غفور و رحیم ہے۔

شان نزول

مفسرین نے پہلی آیت کے لیے توہبت سی انگ شان نزول بیان کی ہیں اور بعد والی آیات کے لیے دوسری شان نزول۔

ان میں سے پہلی آیت کے لیے جو شان نزول بیان کی ہیں۔ یہ ہے کہ پیغمبرؐ ”خبر“ کی طرف روانہ ہوتے وقت کسی کو ”مدینہ“ میں اپنی جگہ متعین کرنا چاہتے تھے، لیکن عمر نے کسی دوسرے آدمی کو متعین کرنے کی تجویز پیش کی اس پر اوپر

والی آیت نازل ہوئی اور یہ حکم دیا کہ تم خدا اور پیغمبر سے آگے نہ بڑھا کرو۔ لہ
بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ: مسلمانوں کی ایک جماعت کے لوگ کبھی کبھی یہ کیا کرتے تھے کہ اگر اس قسم کا معنی
ہمارے بارے میں نازل ہوتا تو بہتر تھا، اس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور کہا کہ تم خدا اور اس کے پیغمبر سے آگے
نہ بڑھا کرو۔ ۱۰

بعض دوسروں نے یہ کہا ہے: یہ آیت بعض مسلمانوں کے اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ جنہوں نے اپنی عبادات کے
مراجم میں سے بعض کو وقت سے پہلے انجام دے دیا تھا تو اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور انہیں اس قسم کے کاموں سے
منع کیا۔ ۱۱

باقی رہی دوسری آیت تو اس کے بارے میں یہ کہا ہے کہ قبیلہ بنی تمیم کا ایک گروہ اور ان کے اشراف مدینہ
میں وارد ہوئے اور جب مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو بلند آواز کے ساتھ، ان حجروں کے پیچھے سے، جو پیغمبر کی رہائش گاہ
تھے، پکار پکار کر کہا: یا محمد اخرج الینا: "اے محمد! باہر آ!"

اس صحیح پکار، اور غیر موڈ بانہ تعبیروں سے پیغمبر کو دکھ ہوا، جس وقت آپ باہر آئے تو انہوں نے کہا: ہم اس لیے
آئے ہیں تاکہ اپنا فخر تجھ پر ظاہر کریں، اجازت دے تاکہ، ہمارا "شاعر" اور خطیب "بنی تمیم کے افتخارات بیان کرے
پیغمبر نے اجازت دی۔

پہلے ان کا خطیب کھڑا ہوا، اور قبیلہ بنی تمیم کے خیالی فضائل کی بہت سی باتیں بیان کیں۔
پیغمبر نے ثابت بن قیس سے فرمایا: تم ان کا جواب دو، وہ کھڑے ہو گئے اور ان کے جواب میں ایک فصیح و بلیغ خطبہ
پیش کیا، جس نے ان کے خطبہ کے اثر کو ختم کر دیا۔

اس کے بعد ان کا "شاعر" کھڑا ہوا، اور اس نے اس قبیلہ کی مدح میں کچھ اشعار کہے، جن کا مشہور مسلمان شاعر
"حسان بن ثابت" نے کافی دشافی جواب دیا۔

اس وقت اس قبیلہ کے اشراف میں سے ایک نے جس کا نام "اقصر" تھا، کہا: اس شخص کا خطیب ہمارے
خطیب سے زیادہ توانا ہے اور اس کا شاعر ہمارے شاعر سے زیادہ لائق ہے۔ اور ان کی آواز کی طرز بھی ہم سے برتر و
بہتر ہے۔

۱۰ تفسیر قرطبی، جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱۔

۱۱ تفسیر قرطبی، جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱۔

۱۲ تفسیر قرطبی، جلد ۹ صفحہ ۶۱۲۱۔

۱۳ ثابت بن قیس جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و انصار کا مشترکہ خطیب تھا، جیسا کہ حسان حضرت کا خطیب تھا۔

اس موقع پر پیغمبر نے ان کے دلوں کو مائل کرنے کے لیے حکم دیا تو اچھے اچھے ہدیے انھیں دیئے گئے، ان تمام باتوں کا ان پر بہت اثر ہوا، اور انھوں نے پیغمبر کی بنوت کا اعتراف کر لیا۔
 زیر بحث آیات پیغمبر کے گھر کے پیچھے ایتھیں کی حیثیت پکار کے بارے میں ہیں۔
 ایک دوسری شان نزول بھی بیان کی گئی ہے جو پہلی آیت سے بھی مربوط ہے، اور بعد والی آیات سے بھی، اور وہ یہ ہے کہ:

ہجرت کے نوے سال جو "عام الوفود" تھا یعنی وہ سال جس میں قبائل کے قسم قسم کے وفد اسلام قبول کرنے یا عہد و پیمان کرنے کے لیے پیغمبر کی خدمت میں آئے۔ چنانچہ جس وقت "بنی تمیم" کے قبیلہ کے فائدے سے پیغمبر کی خدمت میں آئے تو ابو بکر نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تجویز پیش کی کہ "تعلقا" کو (جو ان کے انشرف میں سے ایک تھا) آپ کا امیر بنا دیا جائے اور عمر نے یہ تجویز پیش کی کہ "اقرع بن حابس" کو اسی قبیلہ کا ایک دوسرا آدمی، امیر بنایا جائے۔
 اس موقع پر ابو بکر نے عمر سے کہا، کیا تم میری مخالفت کرنا چاہتے ہو؟ عمر نے کہا، میرا ہرگز مخالفت کا ارادہ نہیں تھا۔ اس وقت دونوں نے پیغمبر کے سامنے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا جس پر بعد والی آیات نازل ہوئیں، یعنی نہ تو کاموں میں پیغمبر سے آگے بڑھو اور نہ ہی پیغمبر کے گھر کے سامنے چیخ پکار کر ویلے۔

تفسیر پیغمبر کی بارگاہ کے آداب

جیسا کہ ہم نے سورہ کے مضامین و مطالب کے بیان میں اشارہ کیا ہے اس سورہ میں اہم اخلاقی مباحث اور انضباطی احکام کا ایک سلسلہ نازل ہوا ہے جس نے اس کو "سورہ اخلاق" کہلانے کے لائق بنا دیا ہے، اور زیر بحث آیات میں جو اس سورہ کے آغاز میں بیان ہوئی ہیں، ان ہی احکام کے دو حصوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔
 پہلا خدا در رسول پر کسی چیز میں سبقت نہ کرنا۔

۱۔ "تفسیر قرطبی" جلد ۹ صفحہ ۹۱۳۱ و تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۷ صفحہ ۵۲۳، دسیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۰۶ سے آگے کچھ فسوق کے ساتھ اسے داستان نقل ہوئی ہے یہ حدیث صحیح بخاری میں بھی آئی ہے۔ صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۴۲، سورہ حجرات کی تفسیر میں۔

دوسرا پیغمبر کی بارگاہ میں شور و غوغا اور بیخ و بکار نہ کرنا۔

اس کے بعد فرماتا ہے: ”اے ایمان لانے والو! کسی چیز کو خدا و رسول سے مقدم نہ کرو، اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ خدا سننے والا اور جانتے والا ہے“؛ (یا ایہا الذین امنوا لا تقدوا بین یدی اللہ ورسولہ واتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم)۔

خدا اور پیغمبر کے سامنے کسی چیز کو مقدم نہ کرنے سے مراد، کاموں میں ان سے سبقت نہ کرنا ہے، اور خدا و رسول کے حکم کے مقابلہ میں عجلت اور تیزی اختیار نہ کرنا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے آیت کے مفہوم کو محدود کرنا چاہا ہے کہ اس کو وقت سے پہلے عبادت کو انجام دینے، یا پیغمبر کے گفتگو کرنے سے پہلے بات کرنے، اور اسی قسم کی دوسری چیزوں میں منحصر سمجھیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ آیت ایک وسیع اور کشادہ مفہوم رکھتی ہے اور ہر قسم کے پروگرام میں ہر قسم کی سبقت کرنا شامل ہے۔ لہ

”پیر و کاروں“ کی ”پیشواؤں اور رہبروں“ کے سامنے نظم و ضبط کی ذمہ داری، خصوصاً ایک عظیم رہبر الہی کے ضمن میں اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کسی کام میں اور کسی بات اور پروگرام میں ان پر سبقت اور پیش قدمی، اور عجلت اور تیزی نہ کریں۔

البتہ یہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اگر وہ کوئی تجویز سامنے لاتے ہوں یا مشورہ دینا چاہتے ہوں تو وہ بھی رہبر الہی کے سامنے پیش نہ کریں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس سے آگے چل پڑنا، مصمم ارادہ کر لینا۔ اور کسی کام کو ان کی تصویب سے پہلے انجام دینا۔

یہاں ہمک کہ مسائل کے بارے میں بھی ضرورت سے زیادہ سوال و گفتگو نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ بات رہبر پر چھوڑ دینی چاہیے کہ وہ اپنے موقع و محل پر مسائل کو پیش کرے۔ خصوصاً رہبر مصوم کی صورت میں جو کسی چیز سے غفلت نہیں کرتا، اور اگر کوئی اور شخص اس سے سوال کر رہا ہو تو دوسروں کو پیش قدمی اور سبقت کرتے ہوئے جلدی کر کے سوال کا جواب بھی نہیں دینا چاہیے۔ حقیقت میں یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں شامل ہیں۔



بعد والی آیت دوسرے حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے:

”اے ایمان لانے والو! تم اپنی آواز کو پیغمبر کی آواز سے بلند نہ کرو اور اس کے سامنے اونچی آواز کے ساتھ بات نہ کرو، اور داد و فریاد اور بیخ و بکار نہ کرو، جیسا کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو، کہ

لہ ”لا تقدوا“ فعل متعدی کی صورت میں ہے اور اس کا مفعول مخدوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے ”لا تقدوا“ امرؤابین یدی اللہ ورسولہ“ کسی کام میں اور اس کے رسول پر سبقت نہ کرو۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ فعل یہاں فعل لازم کے معنی میں آیا ہے اور اس کا مفہوم لا تقدوا بین یدی اللہ..... ہے اللہ کے سامنے ایک دوسرے پر تقدم نہ کرو، اگرچہ یہ دونوں تفسیر اصول ادب کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ لیکن معنی اور نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہیں۔ بہر حال مراد یہ ہے کہ کسی چیز میں خدا اور پیغمبر پر سبقت نہ کرو۔

مہارے اعمال ختم اور نابود ہو جائیں درآنحالیکہ تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ (یا ایتھا الذین امنوا لا ترفعوا
"اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجہروا لہ بالقول کجہر بعضکم
لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون۔"

پہلا جملہ (لا ترفعوا اصواتکم.....) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اپنی آواز کو پیغمبر کی آواز سے
ادنیٰ نہ کرو، کیونکہ یہ ان کے حضور میں ایک قسم کی بے ادبی ہے، پیغمبر کا تو مقام اہی بلند ہے، یہ کام تو ماں باپ، اور استاد و معلم کے
سامنے بھی ادب و احترام کے خلاف ہے۔

باقی رہا جملہ (لا تجہروا لہ بالقول.....) ممکن ہے یہ اُسی پہلے جملہ کے معنی کی ایک تاکید ہو، یا کسی
نئے مطلب کی طرف اشارہ ہو، اور وہ پیغمبر کو "یا محمد" کے جملہ کے ساتھ خطاب نہ کرنے اور اس کی بجائے "یا رسول
اللہ" کہتا ہو۔

البتہ مفسرین کی ایک جماعت نے ان دونوں جملوں کے درمیان فرق کے بارے میں اس طرح کہا ہے، پہلا جملہ تو اس
وقت کے بارے میں ہے جب لوگ پیغمبر سے بات کر رہے ہوں، تو ان کی آواز پیغمبر کی آواز سے ادنیٰ نہیں ہونی چاہیے اور دوسرے
جملہ کا تعلق اس موقع سے ہے جب پیغمبر خاموش ہوں اور لوگ آپ کی بارگاہ میں باتیں کر رہے ہوں، تو اس حالت میں بھی ادنیٰ
آواز زیادہ بلند نہیں ہونی چاہیے۔

اس معنی اور سابقہ معنی کو جمع کرنے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، اور آیت کے شان نزول کے ساتھ بھی سازگار ہے۔
بہر حال آیت کا ظاہر زیادہ ترمیمی ہے، کہ وہ دو مختلف مطالب کو بیان کر رہی ہے۔
یہ بات ظاہر اور واضح ہے کہ اگر اس قسم کے اعمال مقام شان نبوت کی توہین کے ارادہ سے ہوں تو موجب کفر ہیں، اور اس
کے بغیر ہوں تو ایذا دگانہ ہیں۔

پہلی صورت میں تو اعمال کے ضبط اور نابودی کی علت واضح ہے، کیونکہ کفر علت ضبط ایک عمل کے ثواب کے ختم
ہونے کا باعث ہے۔

اور دوسری صورت میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے، کہ اس قسم کا بُرا عمل بہت سے اعمال کے ثواب کی نابودی کا سبب
بن جائے، اور ہم پہلے بھی "حبط" کی بحث میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض اعمال کے ثواب کا بعض گناہوں کی وجہ سے نابود ہو جانے
میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ جیسا کہ اعمال صالح کی وجہ سے بعض گناہوں کے اثر کا نابود ہو جانا بھی قطعی و یقینی ہے، اور قرآنی آیات
اور اسلامی روایات میں اس معنی پر بہت سے دلائل موجود ہیں، اگرچہ یہ معنی ایک قانون کلی کی صورت میں تمام "حسنات" و
"سیئات" میں ثابت نہیں ہوا ہے۔ لیکن بعض اہم "حسنات" اور "سیئات" کے بارے میں بہت سی منقول و دلیل موجود ہیں، اور
عقلی طور پر بھی اس کے برخلاف کوئی دلیل نہیں ہے۔ لہ

ایک روایت میں آیا ہے کہ جس وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی، تو "ثابت بن قیس" نے (جو پیغمبر کے خطیب تھے اور بلند آواز تھے) کہا: وہ میں تھا جو اپنی آواز کو پیغمبر کی آواز سے ملت کیا کرتا تھا، اور آپ کے سامنے اور پچی آواز سے خطاب کیا کرتا تھا، پس میسر اعمال نابود ہو گئے ہیں، اور میں اہل دوزخ میں سے ہوں۔

یہ مطلب پیغمبر کے کانوں تک پہنچا تو آپ نے فرمایا: "ایسا نہیں ہے، وہ اہل بہشت میں سے ہے" (کیونکہ وہ یہ کام مومنین کے لیے خطاب کرتے وقت یا مخالفین کے مقابلہ میں ایک سلامی وظیفہ دوزم داری ادا کرنے کے لیے انجام دیا کرتا تھا) لہ

جیسا کہ عباس بن عبدالمطلب نے بھی جنگ "حنین" میں پیغمبر کے حکم سے بلند آواز میں بھاگنے والوں کو داپس لوٹنے کی دعوت دی تھی۔

بعد والی آیت میں، اس موضوع پر مزید تاکید کے لیے، ان لوگوں کے اجر و ثواب کو، جو خدا کے اس دستور پر عمل کرتے ہیں، اور پیغمبر کے سامنے انضباط و ادب کی رعایت کرتے ہیں، اس طرح بیان کرتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی آواز پیغمبر کے سامنے دھیمی رکھتے ہیں، ایسے لوگ ہیں، جن کے دلوں کو خدا نے تقویٰ کے لیے خالص اور کشادہ کر دیا ہے اور ان کے لیے مغفرت اور عظیم اجر ہے"؛ (ان الذین یغضون اصواتهم عند رسول اللہ اولئک الذین امتحن اللہ قلوبہم لتتقویٰ لہم مغفرة واجر عظیم) لہ

"یغضون" "غض" (بروزن حظ) کے مادہ سے نگاہ یا صدا کو کم کرنے اور کوتاہ کرنے کے معنی میں ہے، اور اس کے مقابلہ میں نگاہ کو خیرہ کرنا اور آواز کو بلند کرنا ہے۔

"امتحن" "امتحان" کے مادہ سے، اصل میں سونے کو کھیلانے اور غیر خالص کو الگ کرنے کے معنی میں ہے اور بعض اوقات چڑے کو پھیلانے کے معنی میں بھی آیا ہے، لیکن بعد میں آزمائش کے معنی میں استعمال ہونے لگا، جیسا کہ زیر بحث آیت میں ہے ایسی آزمائش جس کا نتیجہ دل کا خلوص اور تقویٰ قبول کرنے کے لیے اس میں سچت کا پیدا ہونا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں "نبی" کی تعبیر ہوئی ہے اور یہاں "رسول اللہ" کی تعبیر ہے، اور یہ

لہ "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۳۰۔ یہ حدیث مختصر سے فرق کے ساتھ بہت سے مفسرین و محدثین کے کلمات میں منجملہ ان کے نزرا الثقلین صحیح بخاری، تفسیر فی ظلال القرآن اور مراعی میں آئی ہے۔

لہ "للتقویٰ" میں "لامر" درحقیقت "لامر غایت" ہے نہ کہ "لامر علت" یعنی ان کے دلوں کو تقویٰ کو قبول کرنے کے لیے خالص اور آمادہ کرتا ہے، کیونکہ اگر دل خالص نہ ہو اور لوگوں سے پاک نہ ہو تو پھر حقیقی تقویٰ اس میں جاگزیں نہیں ہو سکتی۔

دونوں باتیں گویا اس نکتہ کی طرف اشارہ ہیں کہ پیغمبر اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھتا، وہ خدا کا بھیجا ہوا اور اس کا پیام لانے والا ہے، لہذا اس کے سامنے سوہ ادب خدا کے بارے میں سوہ ادب ہے اور اس کے لیے ادب کی رعایت کرنا خدا کیلئے ادب کی رعایت کرنا ہے۔
 ضمنی طور پر ”مغفرۃ“ کی تعبیر نکوہ کی صورت میں تعظیم و اہمیت کے لیے ہے، یعنی خدا انھیں کامل و عظیم مغفرت نصیب کرے گا۔ اور گناہ سے پاک ہونے کے بعد انھیں اجر عظیم عنایت فرمائے گا۔ کیونکہ پہلے تو گناہ سے پاک ہونا پڑتا ہے اس کے بعد خدا کا عظیم اجر حاصل ہوتا ہے۔

بعد والی آیت مزید تاکید کے لیے، ایسے لوگوں کی نادانی اور بے عقلی کی طرف اشارہ کرتی ہے جو اس حکم الہی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: ”جو لوگ تجھے حجروں کے پیچھے سے بلند آواز کے ساتھ پکارتے ہیں ان میں سے اکثر عقل و خرد سے کورے ہیں“ (الذین ینادونک من وراء الحجرات اکثرهم لا یعقلون)۔

یہ کونسی عقل خرد ہے کہ انسان خدا کے عظیم ترین سفیر کے سامنے ادب و آداب کی رعایت نہ کرے، اور ”نبی تمیم“ کے بد و بول کی طرح، بلند اور غیر مودبانہ آواز پیغمبر کے گھر کے پیچھے نکالے اور پکار پکار کر کہے: یا محمد! یا محمد! اخرج الینا، اور پروردگار کی اس مہر و عطوفت کے مرکز کو اس طرح سے ایذا اور آزار پہنچائے۔
 اصولی طور پر انسان کی عقل و خرد عینی ملبس ہوتی جاتی ہے اتنا ہی اس کے ادب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، کیونکہ ”وہ قدروں“ اور ”اقتدار کی ضد“ کو بہتر طور پر سمجھنے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بے ادبی ہمیشہ بے عقلی کی نشانی ہوتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں بے ادبی حیوان کا کام ہے اور ادب انسان کا۔

”اکثرهم لا یعقلون“ ان میں سے اکثر سمجھتے نہیں ہیں، کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ ”اکثر“ بعض اوقات لغت عرب میں ”کل اور سب“ کے معنی میں بولا جاتا ہے، لیکن احتیاط اور ادب کی رعایت کی بنا پر اس تعبیر کو استعمال کرتے ہیں، تاکہ اگر ایک شخص بھی مستثنیٰ ہوا ہو تو اس کا حق بھی ضائع نہ ہو، گویا خدا اس تعبیر کے ساتھ فرماتا ہے: میں جو تمھارا پروردگار ہوں، اور ہر چیز پر احاطہ علمی رکھتا ہوں، میں بات کرتے وقت آداب کی رعایت کرتا ہوں تو پھر تم کیوں رعایت نہیں کرتے؟

یابیکہ واقعاً ان کے درمیان کچھ عقلمند آدمی بھی تھے جو عدم توجہ یا ہمیشہ کی عادت کی بنا پر صد بلند کرتے تھے، قرآن اس طریقہ سے انہیں تنبیہ کر رہا ہے کہ وہ اپنی عقل و خرد کو کام میں لائیں اور ادب کو فراموش نہ کریں۔

”حجرات“ ”حجرو“ کی جمع ہے یہاں ان متعدد کمروں کی طرف اشارہ ہے جو مسجد نبوی کے پہلو میں آپ کی ازواج کے لیے تیار کئے گئے تھے، اور اصل میں ”حجر“ (بروزن اجر) کے مادہ سے منع کے معنی میں ہے۔ کیونکہ حجروں میں ہے چاہے جس طرف سے ہو، کیونکہ پیغمبر کے حجروں کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے، اور نادان و جلد باز

لوگ بعض اوقات حجرو کے دروازے کے سامنے آتے، اور ”یا محمد“ کہہ کر پکارتے، قرآن انھیں اس کام سے منسج کر رہا ہے۔



آخری زیر بحث آیت میں اس معنی کی تکمیل کے لیے مزید کہتا ہے:

”اگر وہ صبر سے کام لیتے اور اتنا صبر کرتے کہ تم خود نکل کر ان کے پاس آجاتے تو ان کے لیے بہتر تھا“ (ولو انھم صبروا حتی تنخرج الیہم لکان خیرا لھم)۔

یہ ٹھیک ہے کہ عجلت اور علبہ بازی سے بعض اوقات انسان اپنے مقصد تک جلد تر پہنچ جاتا ہے، لیکن ایسے مقام پر صبر و شکیبائی ہی مایہ رحمت و آمرزش اور اجر عظیم ہے، اور یقیناً یہ اس پر برتری رکھتا ہے۔

اور چونکہ کچھ افراد لاشعوری طور پر پہلے اس قسم کے کام کے مرتکب ہو چکے تھے۔ اور وہ اس خدائی حکم کے نزول کے ساتھ طبعاً و فطرۃ وحشت میں پڑ جاتے، لہذا قرآن انھیں یہ خوش خبری دیتا ہے۔ کہ اگر وہ توبہ کر لیں تو وہ بھی خدا کی رحمت میں شامل ہو جائیں گے۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے، ”اور خدا غفور و رحیم ہے“ (واللہ غفور رحیم)۔

چند نکات

۱۔ ادب افضل ترین سرمایہ ہے

اسلام میں ہر شخص اور ہر گروہ سے ملاقات میں احترام و ادب سے پیش آنے کی، اور رعایت آداب کے مسئلہ کی بہت زیادہ اہمیت بیان ہوئی ہے، یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الادب حلل مجددة؛ ”ادب کی رعایت زینت کے نئے فاخرہ لباس کی طرح ہے“ لہ

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں:

”الادب یعنی عن الحسب“ ”ادب انسان کو اپنے آباؤ اجداد اور بڑوں پر فخر کرنے سے بے نیاز

کرتی ہے“ لہ

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے:

”خمس من لم تکن فیہ لم یکن فیہ کثیر مستمتع
قیل وما هن یا ابن رسول اللہ؟“

قال: الدین والعقل والحیاء وحسن الخلق وحسن الادب:
”پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں نہ ہوں تو وہ قابل ملاحظہ صفات و امتیازات کا
حامل نہ ہوگا۔“

عرض کیا گیا: اے فرزند رسول اللہ وہ کیا ہیں؟
فرمایا: دین و عقل و حیا و حسن خلق و حسن ادب: لہ
اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں اسی امام سے منقول ہے۔ کہ آپؐ نے فرمایا:
”لا یطمعن ذوالکبر فی الشناء الحسن ولا الخبث فی کثرة الصدیق
ولا السیء الادب فی الشرف“

”متجبر کرنے والوں کو لوگوں سے ذکر خیر کی ہرگز توقع نہیں رکھنی چاہیے، اور نہ ہی دھوکہ باز اور مکار لوگوں
کو دوستوں کی کثرت کی امید رکھنی چاہیے، اور نہ ہی بے ادب لوگوں کو عزت و آبرو اور شرف و برتری کی توقع
کرنی چاہیے، نہ

اسی بنا پر جب ہم اسلام کے عظیم رہنماؤں کی زندگی میں غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ادب سے متعلق دقیق ترین نکات کی اپنے
سے چھوٹے افراد تک کے لیے بھی رعایت کرتے تھے۔

اصولی طور پر دین آداب کا ایک مجموعہ ہے، خدا کے لیے ادب پیغمبر کے سامنے ادب، ائمہ معصومین کے سامنے ادب،
استاد و معلم، ماں باپ اور عالم و دانش مند کے سامنے ادب۔

یہاں تک کہ قرآن مجید کی آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اپنے اس مقام عظمت کے باوجود، جب اپنے
بندوں سے بات کرتا ہے تو آداب کی پورے طور پر رعایت کرتا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو تو پھر خدا اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لوگوں کی ذمہ داری
واضح اور روشن ہے،

ایک حدیث میں منقول ہے:

”جس وقت سورہ مومنون کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، اور انھیں آداب اسلامی کے دستور
میں رکھا، جن میں سے ایک نماز میں خشوع کا مسئلہ تھا، تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پہلے

ناز کے وقت آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے، پھر کبھی سر نہیں اٹھایا اور پھر آپ ہمیشہ زمین ہی کی طرف نظر رکھتے تھے، لہ

پیغمبر خدا کے بارے میں بھی یہ موضوع اس حد تک اہم ہے کہ قرآن اور پر والی آیات میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ پیغمبر کی آواز سے آواز بلند کرنا، اور ان کے سامنے شور و غل مچانا حبط اعمال کا موجب اور ثواب کے ختم ہونے کا سبب ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ پیغمبر کے سامنے صرف اس نکتہ کی رعایت ہی کافی نہیں ہے، بلکہ دوسرے ایسے امور بھی جو سوء ادب کے لحاظ سے آواز بلند کرنے اور شور و غل مچانے کے مانند ہیں وہ بھی آپ کی بارگاہ میں ممنوع ہیں، اور فقہی اصطلاح میں یہاں "القاء خصوصیت" اور "تنقیح مناط" کرنی چاہیے۔ اور اس کے اشبہاء و نظائر یعنی ملتی جلتی باتوں کو بھی اس سے ملحق کرنا چاہئے۔

سورہ نور کی آیت ۶۳ میں بھی یہ بیان ہوا ہے: لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا، مفسرین کی ایک جماعت نے اس کی یوں تفسیر کی ہے: "جس وقت تم پیغمبر کو پکارتے ہو تو ایسے ادب و احترام کے ساتھ اُسے پکارو جو اس کے لائق ہے، نہ کہ اس طرح سے جیسے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔" قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اور آیات میں پیغمبر کے سامنے ادب کی رعایت کو دل کی پاکیزگی، تقویٰ کو قبول کرنے کی آمادگی کی نشانی، اور بخشش و آمرزش اور اجر عظیم کا سبب شمار کرتا ہے، جبکہ بے ادب لوگوں کو بے عقل چوپایوں کے مانند بتاتا ہے۔

یہاں تک کہ بعض مفسرین نے زیر بحث آیات کو وسعت دیتے ہوئے یہ تک کہا ہے کہ یہ بات نچلے مراحل و امراتب مثلاً علماء و دانش مندوں اور فکری و اخلاقی رہبروں پر بھی عائد ہوتی ہے اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کے سامنے بھی آداب کی رعایت کریں۔

البتہ ائمہ معصومین کے سامنے تو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ واضح ہے، یہاں تک کہ ان روایات میں جو اہل بیت کے طریقے سے ہم تک پہنچی ہیں یہ بیان ہوا ہے کہ: جب ایک صحابی جنابت کی حالت میں آپ کی خدمت میں آیا تو امام نے بغیر تمہید کے فرمایا:

"اما تعلم انه لا ینبغی للجنب ان یدخل بیوت الانبیاء؟"

"کیا تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ کسی جنابت والے کے لیے انبیاء کے گھر میں داخل ہونا مناسب

نہیں ہے؟" لہ

اور دوسری روایت میں "ان بیوت الانبیاء و اولاد الانبیاء لا یدخلھا الجنب" کی تعبیر ہوئی ہے "جو انبیاء کے گھروں کے لیے بھی ہے اور اولاد انبیاء کے گھروں کے لیے بھی"

لہ "تفسیر مجمع البیان" تفسیر فخر رازی "سورہ مؤمنون کی آیت ۲ کے ذیل میں۔

مختصر آئیہ ہے کہ چھوٹوں اور بڑوں کے سامنے ادب کی رعایت کا مسئلہ اسلامی احکام کے ایک اہم حصہ پر مشتمل ہے، اگر ہم ان سب پر بحث کرنا چاہیں تو تفسیر آیات کی حد سے باہر ہو جائیں گے، ہم یہاں اس بحث کو امام سجاد علی بن الحسینؑ کی ایک حدیث کے ساتھ، جو رسالہ حقوق میں استاد کے سامنے ادب کی رعایت کے بارے میں ہے، ختم کرتے ہیں آپ نے فرمایا:

”اس شخص کا حق جو تجھے تعلیم دیتا ہے اور تربیت کرتا ہے یہ ہے کہ تو اس کا احترام کرے، اس کی مجلس کو محترم شمار کرے اس کی باتیں کامل طور سے کان دھر کے سنے، اس کے رُوبرُو مؤدب ہو کر بیٹھے، اپنی آواز کو اس کی آواز سے بلند نہ کرے اور جب کوئی اس سے سوال کرے تو جواب دینے میں جلدی نہ کرے اس کے ہنٹور میں کسی سے باتیں نہ کرے اور اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرے، اگر اس کے پیچھے پیچھے کوئی اسے برا بھلا کہے تو اس کا دفاع کرے، اس کے عیوب کو چھپائے اور اس کے فضائل کو آشکار کرے، اس کے دشمنوں کے پاس نہ بیٹھے اور اس کے دوستوں کو دشمن نہ رکھے، جس وقت تو ایسا کرے گا تو خدا کے فرشتے گواہی دیں گے کہ تو اس کے پاس گیا ہے اور خدا کے لیے تو نے اُس سے علم حاصل کیا ہے نہ کہ مخلوق خدا کے لیے۔“

۲۔ پیغمبرؐ کی قبر کے پاس آواز بلند کرنا

علماء اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ زیر بحث آیات جس طرح پیغمبرؐ کی زندگی میں ان کے پاس آواز بلند کرنے سے منع کرتی ہیں اسی طرح ان کی وفات کے بعد کے زمانہ پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔^۱ اگر ان کی مراد آیت کی عبارتوں کا شمول ہے تو ظاہر آیت رسول اللہ کے زمانہ حیات کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ اپنی آواز کو آپ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور یہ اسی صورت میں ہو گا۔ جب پیغمبرؐ حیاتِ جہانی رکھتے ہوں اور یہ بات کر رہے ہوں۔

اور اگر اس سے مراد مناظروں و فلسفہ مجم ہو، جو اس قسم کے موقع پر ظاہر و واضح ہے، اور اہل عرفان کا خصوصیت کرتے ہوں، تو پھر تعمیم مذکور بعید نظر نہیں آتی کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے کہ یہاں ہدایت و مقصد پیغمبرؐ کی ساختِ قدس میں ادب و احترام کی رعایت ہے۔ اس بنا پر جب پیغمبرؐ کی قبر کے پاس آواز بلند کرنا ایک قسم کی بے احترازی اور ہتکِ حرمت ہو تو بلا شک و شبہ یہ بات جائز نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ افان نماز کی صورت میں ہو، یا تلاوتِ قرآن یا خطبہ اور اس کے مانند دوسرے بیانات ہوں تو اس قسم کے مواقع پر نہ تو پیغمبرؐ کی زندگی میں یہ بات ممنوع ہے اور نہ ہی وفات

۱۔ ”محبت البیضاء“ جلد ۳ ص ۲۵۰ (باب آداب الصحبۃ المعاشرہ)

۲۔ ”روح المعانی“ جلد ۲۶ ص ۱۲۵

کے بعد

اصول کافی میں ایک حدیث میں امام باقر سے اُس واقعہ کے بارے میں منقول ہے، جو وفات امام حسن مجتبیٰ کے موقع پر اس ممانعت کے سلسلہ میں، جو حضرت کے جوار پیغمبر میں دفن ہونے کے بارے میں "عائشہ" نے کی تھی، اور اس پر ایک پیچ پکارا لبت ہوئی تو امام حسینؑ نے "یا ایہا الذین امنوا لا ترفخوا اصواتکم فوق صوت النبی کی آیت سے استدلال کیا اور رسول خدا سے یہ جملہ نقل فرمایا: ان اللہ حرم من المؤمنین امواتاً ما حرم منهم احياء: "خدا نے مومنین کے لیے جو کچھ حال حیات میں حرام کیا ہے وہ ان کی موت کے بعد بھی حرام کیا ہے، لہ

یہ حدیث آیت کے مفہوم کی عمومیت کی ایک اور گواہ ہے۔

۳۔ ہر چیز میں اور ہر جگہ انضباط اسلامی

مسئلہ مدیریت و فرماندہی نظم و ضبط کی رعایت کے بغیر کبھی بھی درست نہیں۔ اگر وہ لوگ جو کسی مدیر و رہبر کے ماتحت ہوں خود سرانہ عمل کریں تو تمام کاموں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ چاہے رہبر کتنا ہی لائق و شائق تہ کیوں نہ ہو۔ بہت سی شکستیں اور نا کامیاں اور جو بہت سے گروہوں، جمعیتوں یا لشکروں کو دامن گیر ہوتی ہیں وہ سب اسی راہ گزر سے ہوئی ہیں اور مسلمانوں نے بھی اس دستور سے متخلف کا تلخ مزہ پیغمبر کے زمانہ میں اور اس کے بعد بارہا چکھا ہے جن میں سے سب سے زیادہ واضح جنگ "احد" کی شکست ہے جو ایک ہتھوڑے سے جنگجو گروہ کی بے قاعدگی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

قرآن مجید نے "اس حد سے زیادہ اہم مسئلہ کو، اوپر والی آیات میں مختصر سی عبارتوں میں جامع اور پرکشش صورت میں پیش کیا ہے: یا ایہا الذین امنوا لا تقد موا بین ید یر اللہ ورسولہ۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، آیت کے مفہوم کی وسعت اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ہر قسم کے "تقدم" و "تاخر" اور خود سرانہ گفتار و رفتار کو رہبری کے دستور سے خارج ہونا شامل ہے۔

ان حالات میں پیغمبر کی زندگی کی تاریخ میں زیادہ مواقع ایسے نظر آتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے آپ کے فرمان پر سبقت کی، یا پیچھے رہ گئے اور آپ کی اطاعت سے روگردانی کی، تو شدید ملامت و سرزنش کا محل قرار پائے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ:

① جس وقت پیغمبر فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے (تو اس وقت ہجرت کے آٹھویں سال کا) ماہ مبارک رمضان تھا

اور بہت زیادہ جمعیت آپ کے ہمراہ تھی، ایک گروہ سوار اور ایک پیادہ تھا، جس وقت آپ کراخ الغیبیہ کی منزل پر پہنچے تو آپ کے حکم سے پانی کا برتن لایا گیا، اور حضرت نے اپنا روزہ افطار کیا آپ کے ہمراہیوں نے بھی افطار کیا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک گروہ نے آپ سے بوقت کی اور افطار کرنے پر تیار نہ ہوا اور اپنے روزے پر قائم رہے، تو پیغمبر نے انھیں "عصاة" (یعنی گناہگاروں کا گروہ) نام دیا۔ ۱۷

(۲) دوسرا نمونہ "حجۃ الوداع" کی داستان میں ہجرت کے دسویں سال میں واقع ہوا۔ پیغمبر نے منادی کو یہ ندا کرنے کا حکم دیا کہ جو شخص قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہیں لایا وہ پہلے "عمرہ" بجالائے اور احرام سے خارج ہو جائے، اس کے بعد مراسم حج بجالائے، لیکن جو لوگ قربانی کا جانور ساتھ لائے ہیں (اور ان کا حج، حج افراد ہے) وہ اپنے احرام پر برقرار رہیں۔ اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا، اگر میں قربانی کے اونٹ ہمراہ نہ لایا ہوتا، تو میں عمرہ کی تکمیل کرتا اور احرام سے خارج ہو جاتا، لیکن ایک گروہ نے اس حکم کو انجام دینے سے روگردانی کی اور کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر تو اپنے احرام پر باقی رہے اور ہم احرام سے خارج ہو جائیں؟ کیا یہ بُری بات نہیں ہے کہ ہم مراسم حج کی طرف عمرہ بجالانے کے بعد جائیں۔ جبکہ غسل (جنابت) کے پانی کے قطرات ہم سے گر رہے ہوں۔

پیغمبر اس تحلف اور بے انضباطی سے سخت رنجیدہ ہوئے اور سختی کے ساتھ سرزنش کی ۱۸

(۳) پیغمبر کی وفات کے قریب لشکر "اسامہ" سے تحلف کی داستان مشہور ہے کہ آنحضرت نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ "اسامہ بن زید" کی کان میں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہوں اور بہاجرین و انصار کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ اس لشکر کے ساتھ جائیں۔

شاید آپ کا مفشار یہ تھا کہ آپ کی رحلت کے وقت وہ مسائل جو امر خلافت میں واقع ہوئے وہ نہ ہوں، یہاں تک کہ آپ نے لشکر اسامہ سے تحلف کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔ لیکن اس کے باوجود ایک گروہ نے جانے سے روگردانی کی اور بہانہ یہ کیا کہ ہم پیغمبر کو ایسے حالات میں تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ ۱۹

(۴) پیغمبر گرامی اسلام کی زندگی کے آخری لمحات میں "قلم و دوات" کی داستان بھی مشہور اور ہلادینے والی ہے، بہتر یہ ہے کہ ہم صحیح مسلم کی اصل عبارت کو یہاں نقل کر دیں۔

"لما حضر رسول الله ووقف البيت رجال فيهم عمر بن الخطاب

۱۷ اس حدیث کو بہت سے مؤرخین اور محدثین نے نقل کیا ہے۔ مجلہ وسائل کی جلد ۲۵، (ابواب من یصح منه الصوم) (مختصر ہی تصنیف کے ساتھ)

۱۸ "بجاء الوداع" جلد ۲۱ ص ۳۸۶ تصنیف کے ساتھ

۱۹ اس ماجرے کو بہت ہی کتب تواریخ اسلامی میں لکھا گیا ہے اور یہ تاریخ اسلام کے اہم حوادث میں سے ہے (مزید اطلاع کے لیے المراجعات کے مراجعہ ۹۰ کی طرف رجوع کریں۔)

فقال النبی (ص) ہلم اکتب لکم کتاباً لاتضلون بعدہ ، فقال عمر ان رسول اللہ (ص) قد غلب علیہ الوجع (وعندکم القرآن ، حسبت ان کتاب اللہ ، فاختلف اهل البیت ، فاختلفوا ، فمنہم من یقول قریبوا یکتب لکم رسول اللہ (ص) کتاباً لن تضلوا بعدہ ، ومنہم من یقول ما قال عمر فلما اکثروا اللغو والاختلاف عند رسول اللہ (ص) قال رسول اللہ قوما !

” جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس وقت ایک گروہ آپ کے پاس گھر میں موجود تھا جن میں عمر بن الخطاب بھی تھا ، پیغمبر نے فرمایا کہ کاغذ لے آؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی چیز لکھ جاؤں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے ، عمر نے کہا ، بیاری نے پیغمبر پر غلبہ کیا ہے۔

(العیاذ باللہ ناموزوں باتیں کر رہے ہیں) قرآن تمہارے پاس ہے اور یہی خدا کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے۔ تو اس وقت گھر میں موجود لوگوں میں اختلاف پڑ گیا۔ بعض نے کہا کہ لے آؤ تاکہ پیغمبر اپنی تحریر لکھ دیں تاکہ تم ہرگز گمراہ نہ ہو ، جبکہ بعض دوسرے عمر کی بات کا تکرار کر رہے تھے ، جس وقت ناموزوں باتیں اور اختلاف بڑھ گئے ، تو پیغمبر نے فرمایا : اٹھ جاؤ ، اور مجھ سے دُور ہو جاؤ۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعینہ ہی حدیث مختصر سے تفاوت اور فرق کے ساتھ بخاری نے بھی اپنی ”صحیح“ میں نقل کی ہے۔

یہ ماجرا تاریخ اسلام کے اہم حوادث میں سے ہے ، جس کے لیے بہت زیادہ تجزیہ اور تحلیل کی ضرورت ہے ، اور یہاں اس کی تشریح کا موقع نہیں ہے ، لیکن بہر حال یہ واقعہ پیغمبر کے حکم سے خلاف ورزی کے واضح ترین مواقع اور زیر بحث آیت یا ایھا الذین امنوا لاتقدموا بین یدئ اللہ ورسولہ کی مخالفت کے روشن ترین واقعات میں شمار ہوتا ہے ؛

اہم مسئلہ یہ ہے ، کہ اس اسلامی اور الہی نظم و ضبط کی رعایت کے لیے رہبر پر محکم ایمان رکھنے ، اور اس کی زندگی کے تمام حالات میں اس کی رہبری کو قبول کرنے اور رہبر کی اطاعت کرتے ہوئے کامل طور پر تسلیم و تمکین کرنے کی ضرورت ہے۔

۶- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا
 أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصِبُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ
 نُدْمِينَ ۝

۷- وَأَعْلَمُوا أَن فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ
 الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ
 فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ
 أُولَٰئِكَ هُمُ الرُّشِدُونَ ۝
 ۸- فَضَلَّامِنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۝ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

ترجمہ

۶- اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے
 تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی کی وجہ سے
 کسی گروہ کو نقصان پہنچا دو، اور پھر تم اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

۷- اور تم یہ جان لو کہ خدا کا رسول تمہارے درمیان یہ ہے اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری
 اطاعت کرے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، لیکن انہوں نے تمہارے لیے ایمان کو
 محبوب قرار دے دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت بخشی ہے، اور (اس کے برعکس)
 کفر و فسق و گناہ کو تمہارے لیے قابل نفرت قرار دے دیا ہے، جن لوگوں میں یہ

صفات ہوں) وہی تو ہدایت یافتہ ہیں۔
۸۔ خدا نے اپنی طرف سے تمہیں فضل اور نعمت عطا کی ہے، اور خدا علیم و حکیم ہے۔

شان نزول

پہلی زیر بحث آیت کی تفسیر میں دو شان نزول بیان کی گئی ہیں۔ بعض نے تو جیسے طبرسی نے مجمع البیان میں دونوں کا ذکر کیا ہے، اور بعض نے جیسے "قرطبی" و "نور الثقلین" و "فی ظلال القرآن" صرف ایک ہی پر اکتفا کیا ہے۔

پہلی شان نزول جسے اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ: آیہ یا ایہا الذین امنوا ان جاءکم..... "ولید بن عقبہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جسے پیغمبرؐ نے قبیلہ "بنی المصطلق" کی زکات جمع کرنے کے لیے بھیجا تھا، جس وقت اہل قبیلہ کو پتہ چلا کہ رسول اللہؐ کا ناسنہ آ رہا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کے استقبال کے لیے دوڑے، لیکن چونکہ ان کے اور ولید کے درمیان زمانہ جاہلیت میں سخت دشمنی تھی، تو اس نے خیال کیا کہ وہ اُسے قتل کرنے کے ارادہ سے آ رہے ہیں۔

وہ اپنے اس گمان کی تحقیق کیے بغیر ہی (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پلٹ آیا اور عرض کیا، کہ انہوں نے زکات ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ زکات ادا کرنے سے انکار حکومت اسلامی کے خلاف ایک طرح کی بغاوت سمجھی جاتی تھی، تو اس بنا پر وہ اس بات کا مدعی تھا کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں)۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پر سخت غصہ آیا اور ان سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تو اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ جس وقت کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو۔
بعض نے اس پر مزید کہا ہے کہ "ولید" کی طرف سے "قبیلہ بنی المصطلق" کے ارتداد کی خبر دینے کے بعد پیغمبرؐ نے "خالد بن ولید بن مغیرہ" کو قبیلہ "بنی المصطلق" کی طرف بھیجا اور یہ حکم دیا کہ جلد بازی میں کوئی کام نہ کر بیٹھنا۔ "خالد" راتوں رات قبیلہ کے قریب پہنچ گیا، اور اطلاع دینے والے مامورین کو تحقیق کے لیے بھیجا، انہوں نے اگر خبر دی کہ بنی المصطلق مکمل طور پر اسلام کے وفادار ہیں، اور ان کی اذان و نماز کی صدا انہوں نے اپنے کانوں سے سنی ہے، صبح کے وقت "خالد" خود ان کی طرف گیا اور خبر دینے والوں کی گفتار کی صداقت ملاحظہ کی وہ پیغمبرؐ کی ہمت

میں پلٹ آیا اور ماجرا بیان کیا تو اس وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی پیغمبر نے فرمایا: التائی من اللہ والعجلة من الشیطان: "تاخیر و تحقیق کرنا خدا کی طرف سے ہے اور جلد بازی سے کام لینا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ ۱۷

دوسری شان نزول جسے صرف بعض مفسرین نے نقل کیا ہے، یہ ہے کہ یہ آیت "مار یہ" زوجہ پیغمبر (والدہ البراءہ) کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ کچھ لوگوں نے پیغمبر کی خدمت میں یہ عرض کیا تھا کہ اس کا ایک چچا زاد بھائی ہے جو کبھی کبھی اس کے پاس آتا ہے (اور ان دونوں میں غیر مشروع تعلقات ہیں) پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو بلایا۔ اور فرمایا: اے میرے بھائی! یہ تلوار لو، اگر تم اس کو ماریہ کے پاس دیکھو تو اُسے قتل کر دو۔ امیر المؤمنین علیؑ نے عرض کیا، اے خدا کے رسول کیا میں "گرم کئے ہوئے سکرے کی طرح مامور ہوں کہ آپ کے حکم کو عملی جامہ پہناؤں (یا جو کچھ حاضر شخص دیکھتا ہے وہ غائب نہیں دیکھتا) مزید تحقیق کر کے ذمہ داری کو پورا کروں؟ فرمایا: نہیں! بلکہ اسی بنیاد پر کہ حاضر اس چیز کو دیکھتا ہے جسے غائب نہیں دیکھتا۔ عمل کرو۔ علیؑ نے سلام فرماتے ہیں کہ میں نے تلوار کمر سے باندھی اور اس کی طرف آیا، میں نے دیکھا کہ وہ ماریہ کے پاس ہے، میں نے تلوار کھینچی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا اور ایک کھجور کے درخت پر چڑھ گیا، اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو اس سے نیچے گرا دیا، اسی دوران اس کا پیراہن دکرتا، اُدپر کو اُٹھ گیا، تو معلوم ہوا، کہ وہ تو اصلاً جنسی عضو رکھتا ہی نہیں، میں پیغمبر کی خدمت میں جا ہوا اور ماجرے کی تفصیل بیان کی تو پیغمبر نے فرمایا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے بدی، اُلودگی اور اتہام کو ہمارے دامن سے دور کر دیا ہے۔ ۱۸

۱۷ تفسیر قرآنی "جلد ۹ ص ۶۱۳

۱۸ "سک" عربی زبان میں اس وسیلہ اور آلہ کے معنی میں ہے جس کے ذریعہ ہم ذہین اور وغیرہ پر نقش کرتے ہیں، اور اس مقصد کے لیے اُسے آگ میں گرم کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنا نقش مکمل طور پر درہم و دینار پر منتقل کر دے، اس تعبیر سے مراد یہ ہے کہ حکم کو بے چون و چرا اور کسی تحقیق کے بغیر اجرا کیا جائے۔

۱۹ "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۳۲، تفسیر نور الثقلین میں بھی یہ شان نزول اس سے زیادہ تفصیلی صورت میں بیان ہوئی ہے۔

تفسیر فاسقوں کی خبروں پر اعتنا نہ کرو

گذشتہ آیات میں مسلمانوں اور ان کے پیرو پیغمبر کے مقابلہ میں وظائف اور ذمہ داریوں کے بارے میں گفتگو تھی، اور اس میں دو اہم احکام بیان ہوئے تھے، ایک خدا اور پیغمبر پر کسی کام میں سبقت نہ کرنا اور دوسرا پیغمبر کی بارگاہ میں گفتگو کرنے اور آپ کو آواز دینے کے وقت ادب و احترام کی رعایت کرنا،

زیر بحث آیات اس عظیم رہبر کے سامنے امت کے وظائف اور ذمہ داریوں کو جاری رکھتے ہوئے کہتی ہیں، کہ جس وقت تم اس کی خدمت میں خبریں لے کر آؤ تو ان کی بنیاد تحقیق پر ہونی چاہیے اور اگر کوئی فاسق آدمی کسی چیز کی خبر دے، تو بغیر تحقیق کے اسے قبول نہ کریں، اور پیغمبر پر اسے قبول کرنے کے لیے دباؤ نہ ڈالیں۔

پہلے فرماتا ہے، "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق شخص تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کر لیا کرو" (یا ایہا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبیتنوا۔)

اس کے بعد اس کی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "کہیں ایسا نہ ہو کہ بغیر تحقیق عمل کرنے کی صورت میں کسی گروہ کو نادانی کی وجہ سے نقصان پہنچا دو، اور پھر اپنے کیے پر تھیں پشیمان ہونا پڑے" (ان تصیبوا قوما بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین)۔

جیسا کہ پیغمبر اگر ولید بن عقبہ کے کہنے پر عمل کر لیتے اور قبیلہ "بنی المصطلق" کے ساتھ ایک مرتد قوم کی حیثیت سے جنگ کرتے تو پھر دردناک فاجعہ اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ بعد والی آیت کے لب و لہجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ایک گروہ اس جنگ کرنے پر اصرار کر رہا تھا، قرآن کہتا ہے: یہ کا اٹھا ہے، یہ شالٹہ نہیں ہے یہ عین جہالت و نادانی ہے اور اس کا انجام ندامت و پشیمانی ہوگا۔

علماء علم اصول کے ایک گروہ نے خبر واحد کی حجیت پر اس آیت سے استدلال کیا ہے، کیونکہ آیت یہ کہتی ہے کہ "فاسق" کی خبر میں تحقیق و تلاش لازمی و ضروری ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ شخص "عادل" خبر دے تو اسے بغیر تحقیق کے قبول کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اس استدلال پر بہت سے اعتراضات ہوئے ہیں، جن میں سے دو زیادہ اہم ہیں، باقی کوئی خاص بہت نہیں رکھتے۔

پہلا یہ کہ، اوپر والا استدلال "وصف کے مفہوم کی حجیت" کو قبول کرنے پر موقوف ہے جبکہ مشہور یہ ہے کہ وصف کا مفہوم حجیت نہیں ہے۔

دوسرا یہ کہ جو علت آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے وہ اس قدر وسعت رکھتی ہے کہ "عادل" اور "فاسق" دونوں کی خبر کو شامل ہے، کیونکہ ظنی خبر پر عمل، چاہے وہ جو بھی ہو، پیشیامانی اور ندامت کا احتمال رکھتا ہے۔ لیکن یہ دونوں اعتراض قابل حل ہیں، کیونکہ مفہوم وصف اور ہر دوسری قید، ایسے موقعوں کے لیے جو اصطلاح کے مطابق، کسی مسئلہ کے قیود اور مقام استراز کو بیان کرنے کے لیے ہوں، حجت ہوتی ہے، اور اوپر والی آیت میں اس قید (قید فاسق) کا ذکر ظہور عرفی کے مطابق خبر عادل کی حجت کے بیان کے سوا اور کوئی قابل ملاحظہ فائدہ نہیں رکھتا۔ لیکن وہ علت جو آیت کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔ ہر قسم کی اذلہ "ظنیہ" کو شامل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسے مواقع کے لیے ہے کہ جہاں عمل جاہلانہ یا سفیمانہ اور احمقانہ ہو، کیونکہ آیت میں "جمالت" کے عنوان پر تکیہ ہوا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ زیادہ تر اذلہ جن پر تمام عقلاء عالم روزمرہ کی زندگی میں تکیہ کرتے ہیں ظنی دلائل ہی ہیں (ظواہر الفاظ، قول شاہد، قول اہل خبر، قول ذوالید وغیرہ کے قبیل سے)

معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بات جاہلانہ اور سفیمانہ شمار نہیں ہوتی، اور اگر وہ کبھی کبھار واقع کے مطابق نہ بھی ہو، تو پھر بھی اس میں ندامت کا کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا، کیونکہ یہ ایک عمومی راستہ ہے۔

بہر حال ہمارے نظریہ کے مطابق یہ آیت ان محکم آیات میں سے ہے، جو "خبر واحد کی حجیت" پر یہاں تک کہ "موضوعات" میں بھی دلالت کرتی ہے، اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ مباحث ہیں، جن کی تشریح و تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ موثق اخبار پر اعمتاد کے ذریعہ ہی بشر کی زندگی کی تاریخ کی بنیاد قائم ہے، اس طرح سے کہ اگر حجیت خبر عادل یا موثق کا مسئلہ انسانی معاشرے میں سے حذف ہو جائے تو بہت سے گذشتہ علمی موارد میں، اور انسانی معاشروں سے مربوط اطلاعات، یہاں تک کہ بہت سے ایسے مسائل جن کے ساتھ ہم آج اپنے معاشروں میں تعلق رکھتے ہیں، کلی طور پر حذف ہو جائیں گے، اور نہ صرف انسان پیچھے کی طرف پلٹ جائے گا، بلکہ اس کی موجودہ زندگی کی ترقی کی رفتار بھی رک جائے گی، لہذا تمام عقلاء کا اس کی حجیت پر اجماع ہے اور شارع مقدس نے بھی "قولاً" و "عملاً" اس کی تصدیق فرمائی ہے۔

لیکن جتنا نکتہ خبر واحد کی حجیت، زندگی کو سامان بخشتی ہے، اتنا ہی غیر موثق اخبار پر تکیہ کرنا، بہت خطرناک، اور معاشروں کے نظام کے بکھر جانے کا موجب ہے جو بہت سے مصائب کے پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے، لوگوں کے حقوق اور حیثیت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اور انسان کو بے راہ رومی اور انحراف کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور زیر بحث آیت میں قرآن کی عمدہ تعبیر کے مطابق، انجام کار ندامت کا سبب بنتا ہے۔

حاشیہ صفحہ گزشتہ

۱۔ بعض نے گمان کیا ہے کہ یہاں مفہوم شرط کے قبیل میں سے ہے، اور مفہوم شرط حجت ہے، حالانکہ یہ مفہوم شرط کے ساتھ کوئی ارتباط نہیں رکھتا، علاوہ ازیں یہاں خبر شرطیہ موضوع کو بیان کرنے کے لیے ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ اس قسم کے موقعوں پر "جملہ شرطیہ" بھی مفہوم نہیں رکھتا۔ (غور کیجئے گا)

یہ محنت بھی قابل توجہ ہے، کہ جھوٹی خبریں گھڑنا، اور غیر موثق اخبار پر تکیہ قدیمی جبار اور استعماری نظاموں کے حربوں میں سے ایک ہے، جس کے ذریعہ وہ ایک جھوٹی فضا پیدا کر کے بے خبر اور ناآگاہ لوگوں کو، فریب اور غفلت میں رکھ کر، انہیں گمراہ کرتے ہیں اور ان کے سرمایہ کو لوٹ لے جاتے ہیں۔

اگر مسلمان وقت کے ساتھ اس خدائی حکم پر جو اس آیت میں وارد ہوا ہے عمل کریں، اور فاسقوں کی خبروں کو بغیر تحقیق و تفتیش کے قبول نہ کریں تو ان عظیم بلاؤں سے بچ جائیں گے۔

یہ محنت بھی قابل توجہ ہے کہ اہم مسئلہ خود خبر پر وثوق و اعتماد کا ہے، البتہ کبھی تو یہ وثوق "خبر دینے والے کی ذات" پر اعتماد کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اور کبھی دوسرے خارجی قرائن کے ذریعہ اسی لیے کچھ موقعوں پر باوجود اس کے کہ خبر دینے والا فاسق ہوتا ہے ہم اس کی خبر پر اعتماد پیدا کر لیتے ہیں۔

اس بنا پر یہ وثوق و اعتماد جہاں کہیں سے حاصل ہو۔ چاہے بیان کرنے والے کی عدالت، تقویٰ اور صداقت سے حاصل ہو یا قرائن خارجی سے، وہ ہمارے لیے معتبر ہے، اور عقلاہ کی سیرت بھی، جو شریعت اسلامی کی تصدیق کرتی ہے، اسی بنیاد پر قائم ہے۔

اسی بنا پر ہم نفعِ اسلامی میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے اخبار جن کی سند ضعیف ہے، چونکہ وہ "عمل مشہود" قرار پا چکے ہیں، اور وہ مختلف قرائن کی بنا پر اس خبر کی صحت سے واقف ہوتے ہیں۔ لہذا یہی معیار عمل قرار پایا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔

اس کے برعکس بعض اوقات ایسے اخبار نقل ہوئے ہیں جن کا بیان کرنے والا معتبر شخص ہے، لیکن خارجی قرائن ہمیں اس خبر کی نسبت بدگمان کر دیتے ہیں، یہ وہ منزل ہے کہ ہمارے لیے اس خبر کو چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے، اگرچہ اس خبر کے بیان کرنے والا شخص عادل و معتبر ہے۔

اس بنا پر ہر جگہ معیار خود خبر، پر اعتماد ہے، اگرچہ عام طور پر راوی کی عدالت و صداقت اس اعتماد کا ایک وسیلہ و ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن یہ کوئی قانون کلی نہیں ہے (غور کیجیے)

بعد والی آیت میں ایک اہم مطلب کی تاکید کے لیے جو گذشتہ آیت میں بیان ہوا تھا، مزید کہتا ہے: "تم یہ جان لو کہ رسول تمہارے درمیان میں ہے، اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری اطاعت کرنے لگے، تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے" (واعلموا ان فیکم رسول اللہ لویطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم لعلکم تتقون)

لہ "لعنتم" عنبت کے مادہ سے، ایسے کام میں پڑنے کے معنی میں ہے کہ انسان جس کے عواقب سے ڈرتا ہے، یا ایسا کام ہے جس میں مشقت ہو، اور اسی بنا پر جب لڑائی ہوئی پڑی پر دباؤ پڑے اور اس سے درد و تکلیف پیدا ہو، تو اسے "عنبت" کہا جاتا ہے۔

یہ جملہ۔ جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ قبیلہ ”بنی المصطلق“ کے مرتد ہونے کے بارے میں ”ولید“ کی خبر دینے کے بعد، ظاہر بن اور سادہ دل مسلمانوں کا ایک گروہ، پیغمبر پر یہ دباؤ ڈال رہا تھا، کہ وہ قبیلہ مذکور کے برخلاف جنگ کا اقدام کریں۔

قرآن کہتا ہے، یہ تمہاری خوش بخشی ہے کہ خدا کا رسول تمہارے درمیان ہے۔ اور عالم وحی سے اس کا رابطہ برقرار ہے اور جس وقت انحرافی خطا اور راستے تمہارے درمیان پیدا ہو جائیں تو وہ اس طریق سے تمہیں آگاہ کر دیتا ہے۔ لیکن وہ رہبر و رہنما ہے، تمہیں یہ امید اور توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ تمہاری اطاعت کرے اور تم سے حکم احکام لے، وہ تمہارے لیے ہر شخص سے زیادہ مہربان ہے، اپنے انکار اس پر لادنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالو، کیونکہ یہ بات تمہارے ہی نقصان میں ہے۔

آیت کے آخر میں مومنین پر خدا کی ایک اور عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”لیکن خدا نے ایمان کو تمہارے لیے محبوب قرار دے دیا ہے اور اُسے تمہارے دلوں میں زینت بخشی ہے“: (ولکن اللہ حبیب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم)۔

”اور اس کے برعکس کفر و فسق و گناہ کو تمہارے لیے قابل نفرت قرار دے دیا ہے“ (وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان)۔

درحقیقت یہ تعبیرات قانون ”لطف“ وہ بھی ”لطف بخوشی“ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ: جس وقت کوئی حکم کسی کام کو انجام دینا چاہتا ہے تو وہ ہر لحاظ سے اس کے اسباب فراہم کرتا ہے یہ اصل انسانوں کی ہدایت میں بھی پورے طور پر صادق آتی ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ تمام انسان۔ کسی جبر کے پروگرام کے تحت قرار پائے بغیر۔ اپنے میل اور رغبت اور قصد و ارادہ سے راہِ حق کو طے کریں۔ اس لیے ایک طرف سے تو رسولوں کو بھیجتا ہے، اور انبیاء کو کتب آسمانی کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے اور دوسری طرف سے ایمان کو انسانوں کے لیے محبوب قرار دیتا ہے۔ حق جوئی اور حق طلبی کے عشق کی آگ ان کے دل و جان کے اندر شعلہ در کرتا ہے اور کفر و ظلم و نفاق و گناہ سے نفرت و بیزاری کا احساس ان کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

اور اس طرح ہر ایک انسان نظر سے ایمان و پاکیزگی و تقویٰ کا خواہاں ہے اور کفر و گناہ سے بیزار ہوتا ہے

لیکن یہ بات کامل طور سے ممکن ہے کہ بعد کے مرحلوں میں یہ صاف و شفاف پانی جو آسمان خلقت سے انسانوں کے وجود میں ڈالا گیا ہے، آلودہ ماحول میں رہنے کے باعث اپنی صفا کھو بیٹھے اور گناہ، کفر اور عصیان کی نفرت انہیں بدبو حاصل کر لے۔

یہ فطری نعمت آسمانوں کو رسول خدا کی پیروی اور آپ پر تقدم اور سبقت نہ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

اس سکتے کی یاد آوری بھی لازم و ضروری ہے کہ اس آیت کا مضمون "مشورت" کے مسئلہ کے ساتھ ہرگز منافی نہیں ہے، کیونکہ شوریٰ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے نظریہ کو بیان کرے، لیکن آخری فیصلہ اور نظریہ خود پیغمبر اکرم کا ہوگا، جیسا کہ شوریٰ والی آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں، شوریٰ ایک جداگانہ مطلب ہے اور اپنے فکر و عقیدہ کو لانا دوسرا مطلب ہے۔ زیر بحث آیت تحمیل فکر کی نفی کرتی ہے نہ کہ مشورت کی۔

اس بارے میں کہ اوپر والی آیت میں "فسوق" سے کیا مراد ہے؟ بعض نے اس کی تفسیر "کذب اور جھوٹ" کے ساتھ کی ہے لیکن اس کے مفہوم لغوی کی طرف توجہ کرتے ہوئے، اور آیت میں کسی قید کے نہ ہونے کی بنا پر ہر قسم کے گناہ اور اطاعت سے خارج ہونے کو شامل ہے، اس بنا پر اس کے بعد "عصیان" کی تعبیر تاکید کے عنوان سے ہے۔ جیسا کہ "زینہ فی قلوبکم" (اے تمہارے دلوں میں زینت دی ہے) کا جملہ "جب الیکم الایمان" (ایمان کو تمہارا محبوب قرار دیا ہے) کے جملہ پر ایک تاکید ہے۔

بعض "فسوق" کو "گناہان کبیرہ" کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جبکہ عصیان کو اس سے عام سمجھتے ہیں، لیکن اس فرق و اختلاف پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

بہر حال آیت کے آخر میں ایک کلی اور عمومی قاعدہ کے طور پر فرماتا ہے: "جن لوگوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں (ایمان ان کی نظر میں محبوب و مزین، اور کفر و فسق و عصیان ان کی نظر میں منفور ہے)۔ وہ ہدایت یافتہ ہیں" (اولئک ہم الزائدون) یعنی اگر تم اس موہبت الہی (ایمان سے عشق اور کفر و گناہ سے نفرت) کو محفوظ رکھو، اور اس پاکیزگی اور صفائے فطرت کو آلودہ نہ کرو، تو بلاشک و شبہ رشد و ہدایت تمہارے انتظار میں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلے کے تمام جملے تو مومنین سے خطاب کی صورت میں تھے، لیکن یہ جملہ انہیں غائب کی صورت میں یاد کرتا ہے، یہ تعبیر کا فرق ظاہراً اس بنا پر ہے تاکہ اس بات کی نشاندہی کرے کہ یہ حکم اصحاب پیغمبر کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ ایک ہمہ وقتی اور عمومی حکم ہے کہ جو بھی کوئی جس زمانہ میں بھی اپنی فطرت کی صفائی اور پاکیزگی کو محفوظ رکھے گا وہ اہل نجات و ہدایت ہے۔

آخری زیر بحث آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ یہ ایمان کی محبوبیت اور کفر و عصیان سے نفرت، نوع بشر پر خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، فرماتا ہے: "یہ خدا کی طرف سے ایک فضل ہے، اور وہ نعمت ہے جو اس نے تمہیں عطا کی ہے اور خدا انا وحکیم ہے" (فضلاً من اللہ ونعمۃ واللہ علیہ حکیم)۔

اس کے علم و حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ رشد و سعادت کے عوامل تم میں پیدا کرے، اور اُسے انبیاء کی دعوت کے ساتھ ہم آہنگ اور مکمل کرے اور انجام کار تمہیں منزل تک پہنچا دے۔

لہ "فضلاً ونعمۃ" یا تو "مفعول لاجدہ" ہے "جب الیکم الایمان..." کے لیے، اور یا یہ "مفعول مطلق" ہے فعل مقدر کے

لیے اور تقدیر میں اس طرح تھا، "افضل فضلاً وانعم نعمۃ"۔

ظاہر یہ ہے کہ ”فضل“ اور ”نعمت“ دونوں کا ایک ہی واقعیت کی طرف اشارہ ہے، اور وہ وہی نعمتیں ہیں جو خدا کی طرف سے بندوں کو عطا ہوتی ہیں، البتہ ”فضل“ کا تو اس لحاظ سے اس پر اطلاق ہوتا ہے، چونکہ خدا اس کا محتاج نہیں ہے، اور نعمت اس لحاظ سے ہے کہ بندے اس کے محتاج ہیں، اس بنا پر (فضل اور نعمت) ایک سکتے کے دو رخوں کی طرح ہے۔ بلاشبہ بندوں کی احتیاج کے بارے میں خدا کا علم اور مخلوقات کی پرورش اور ارتقاء کے سلسلہ میں اس کی حکمت اس بات کا تقاضا کرتے ہیں، کہ وہ انھیں یہ عظیم معنوی نعمتیں، یعنی ایمان کو محبوب رکھنا، اور کفر و عصیان سے نفرت کرنا، رست فرمائے۔

چند نکات

۱۔ خدا کی ہدایت اور ارادہ کی آزادی

اوپر والی آیات، اسلام کے نکتہ نظر سے ”جبر و اختیار“ اور ”ہدایت و اضلال“ کے بارے میں ایک واضح تصویر پیش کرتی ہیں، کیونکہ یہ اس نکتہ کو بخوبی واضح کرتی ہیں کہ خدا کا ارشاد و ہدایت کے اسباب کا فراہم کرنا ہے۔

ایک طرف تو ”رسول اللہ“ کو لوگوں کے درمیان قرار دیتا ہے، اور قرآن جو ہدایت و نور کا ایک پروگرام ہے نازل فرماتا رہتا ہے اور دوسری طرف سے ایمان سے عشق“ اور کفر و عصیان سے تنفر و بیزاری“ زمین تیار کرنے کے انداز میں دل و جان کے اندر ڈالتا ہے۔ لیکن انجام کار آزادی ارادہ و اختیار خود انھیں کے سپرد کرتے ہوئے، ان کی ذمہ داریوں کو اس سلسلہ میں شریعت کے ذریعہ نافذ کرتا ہے۔

اوپر والی آیات کے مطابق ایمان کے ساتھ عشق اور کفر سے نفرت، بغیر کسی استثناء کے، تمام انسانوں کے دل میں موجود ہے اور اگر کچھ لوگوں میں یہ سلسلہ موجود نہیں ہے تو وہ غلط قسم کی تربیتوں اور خود انھیں کے اعمال کی وجہ سے ہے۔ خدا کے کسی بھی شخص کے دل میں ”عصیان کی محبت“ اور ”ایمان سے نفص“ خلق نہیں کیا ہے۔

۲۔ رہبری اور اطاعت

یہ آیات ایک بار پھر اس بات کی تاکید کرتی ہیں کہ ”خدا کی رہبر“ کا وجود ایک جمعیت کی نشوونما اور رشد و ہدایت کے لئے لازمی و ضروری ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ”مطاع“ ہو نہ کہ اپنے پیروکاروں کا ”میطع“۔ اس کے فرمان کو سر آنکھوں سے لے کر، نہ یہ کہ اس پر اپنے محدود مقاصد و افکار کے لیے دباؤ ڈالیں۔

یہ بات نہ صرف خدائی رہبروں کے بارے میں ثابت ہے، بلکہ مسئلہ ”مدیریت“ اور ”فرماندہی“ میں ہر جگہ ہی امر کار فرما ہونا چاہیے۔
یہ حکم رہبروں کے استبداد کے معنی میں نہیں ہے اور نہ ہی ترک شوریٰ کے لیے ہے، جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہو چکا ہے۔

۳۔ ایمان ”عشق“ کی ایک نوع ہے نہ کہ صرف ادراک عقل

یہ آیات ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہیں، کہ ایمان ایک قسم کا شدید خدائی اور معنوی علاقہ اور لگاؤ ہے، اگرچہ اس کی بنیادیں عقلی استدلال سے قائم ہوتی ہیں۔ اسی لیے امام صادقؑ سے منقول ہے کہ لوگوں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ: کیا ”حب و بغض“ بھی ایمان میں سے ہیں؟ تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

”وہل الايمان الا الحب والبغض؟! شقلا هذه الآية: حبب

اليكم الايمان وزينه في قلوبكم وكره اليكم الكفر والفسوق

والعصيان اولئك هم الراشدون“

”کیا ایمان حب اور بغض کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، پھر امامؑ نے زیر بحث آیت سے

استدلال فرمایا جو یہ کہتی ہے کہ: خدا نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب قرار دے دیا ہے اور اُسے

تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے، اور کفر و فسق و عصیان کو تمہارے لیے قابل نفرت بنا دیا ہے، اور جو لوگ

ایسے ہوں وہی ہدایت یافتہ ہیں“

ایک دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے اس طرح آیا ہے:

”وہل الدین الا الحب؟!“

”کیا دین محبت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟!“

اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی چند آیات سے استدلال فرمایا: جن میں سے ایک زیر بحث آیت تھی، اور آخر

میں مزید فرمایا:

”الدین هو الحب والحب هو الدین“

”دین محبت ہے اور محبت دین ہے“

لیکن اس میں شک نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ اسے استدلالی اور منطقی اصولوں سے بھی سیراب و

بارور ہونا چاہیے۔

- ۹- وَإِنْ طَآئِفَتَيْنِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأْصَلِحُوا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأْصَلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ○
- ۱۰- إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأْصَلِحُوا بَيْنَ أَخْوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ○

ترجمہ

۹۔ جس وقت مؤمنین کے دو گروہ آپس میں نزاع اور جنگ کریں تو ان کے درمیان صلح کرادیا کرو، اور اگر ان میں سے ایک دوسرے پر تجاوز کرے تو جس نے تجاوز کیا ہے تو تم بھی اُس کے ساتھ جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف پلٹ آئے، جب وہ لوٹ آئے (اور صلح کے لیے زمین ہموار ہو جائے) تو ان دونوں کے درمیان عدالت کے مطابق صلح کرادو، اور انصاف سے کام لو، کیونکہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۰۔ مؤمنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہذا دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادو، اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت میں شامل ہو جاؤ۔

شان نزول

ان آیات کے شان نزول میں آیا ہے کہ (مدینہ کے دو مشہور قبیلوں) قبیلہ "اوس" و "خزرج" کے درمیان ایک اختلاف پیدا ہو گیا، اور اس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو گئے، اور لاکھوں اور جوڑوں سے ایک دوسرے کو مارنے لگے، (تو ادریالی آیت نازل ہوئی اور اس قسم کے حادثات سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو راہ بتائی، لہٰذا بعض نے یہ کہا ہے کہ "انصار" میں سے دو افراد کے درمیان خصومت و اختلاف پیدا ہو گیا تھا، ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ میں اپنا حق زبردستی تجھ سے لے لوں گا، کیونکہ میرے قبیلہ کی جمعیت اور تعداد زیادہ ہے اور دوسرے نے یہ کہا کہ فیصلہ کے لیے رسول اللہ کے پاس چلتے ہیں، پہلے شخص نے اسے قبول نہ کیا اور اختلاف بڑھ گیا اور دونوں قبیلوں کے ایک گروہ نے ہاتھوں، جوٹیوں اور شمشیر تک سے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا، تو ادریالی آیات نازل ہوئیں

(اور اس قسم کے اختلاف میں مسلمانوں کی ذمہ داری کو واضح کیا) ۱۰۹

تفسیر

مؤمنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں

قرآن یہاں ایک کلی اور عمومی قانون کے عنوان سے ہمیشہ اور ہر مقام کے لیے کہتا ہے: "جس وقت مؤمنین کے دو گروہ آپس میں نزاع کریں اور لڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو" (وان طائفان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحا بینہما) ۱۰۹

یہ ٹھیک ہے کہ "اقتتلوا" "قتال" کے مادہ سے جنگ کے معنی میں ہے، لیکن یہاں قرآن اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ ہر قسم کے نزاع اور جھگڑے کو شامل ہے، چاہے وہ جنگ اور لڑائی تک بھی نہ جا پہنچے، بعض شان نزول

۱۰۹ "جمع البیان" جلد ۹ صفحہ ۱۲۲

۱۰۹ "تفسیر قرطبی" جلد ۹ صفحہ ۲۱۳

۱۰۹ باوجود اس کے کہ "طائفان" شنیہ ہے، لیکن اس کا نفل "اقتتلوا" جمع کی صورت میں آیا ہے، کیونکہ ہر گروہ ایک مجموعہ سے مرکب ہے۔

اور چونکہ گروہی میلانات بعض اوقات افراد کو فیصلہ کرتے وقت ”دو متخاصم گروہوں“ میں سے ایک کی طرف مائل کر دیتے ہیں اور فیصلہ کرنے والوں کی بے طرفی اور غیر جانب داری کو توڑ دیتے ہیں، اس لیے قرآن چوتھے اور آخری حکم میں مسلمانوں کو تشبیہ کر رہا ہے کہ، ”عدل و انصاف سے کام لیں اور ہر قسم کی جانب داری کی نفی کریں، کیونکہ خدا عدالت کرنے والے لوگوں کو دوست رکھتا ہے“ (واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین)۔ لہ

بعد والی آیت میں اس امر کی تاکید اور اس کی علت بیان کرنے کے لیے مزید کہتا ہے،

”مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں اس لیے تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو“ (اسعنا المؤمنون اخوة

فاصلحوابین اخویکم)۔

جس طرح تم اپنے دو نسبی بھائیوں کے درمیان صلح کرانے میں سعی و کوشش کرتے ہو، اسی طرح دو متخاصم مومنین کے درمیان میں صلح کرانے کے لیے سنجیدگی اور دو ٹوک طریقہ سے وارد عمل ہوا کرو۔

کتنی پرکشش اور عمدہ تعبیر ہے کہ تمام مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ان کے درمیان جھگڑے اور نزاع کو دو بھائیوں کے درمیان نزاع کا نام دیا، جسے بہت جلد صلح و صفائی کو اپنی جگہ دینی چاہیے۔

اور چونکہ اکثر اوقات ”روابط“ اس قسم کے مسائل میں ”ضوابط“ کے جانشین بن جاتے ہیں، لہذا دوبارہ خبردار کرتے ہوئے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے، ”خدا کا تقویٰ اختیار کرو، تاکہ اس کی رحمت میں شامل ہو جاؤ“ (واتقوا اللہ لعلکم ترحمون)۔

اور اس طرح مسلمانوں کی ایک دوسرے کے لیے ایک اہم ترین اجتماعی ذمہ داری اجتماعی عدالت کے تمام پہلوؤں کے ساتھ بوقت اجراء واضح ہو جائے۔

چند نکات

۱۔ باغیوں سے جنگ کرنے کی شرائط

فقہ اسلامی میں کتاب جہاد میں ”اہل البغی“ سے قتال کے عنوان سے ایک بحث بیان ہوئی ہے، جن سے مراد

لہ ”مقسطین“ ”قسط“ کے مادہ سے ہے۔ اور وہ اصل میں عادلانہ حصہ کے معنی میں ہے، اور جس وقت ثلاثی مجرد کے نفل کی صورت میں استعمال ہوتا ہے (قسط بروزن ضوب) تو ظلم کرنے اور دوسرے سے عادلانہ حصہ لینے کے معنی میں ہوتا ہے۔ لیکن جب ثلاثی مزید کی صورت استعمال ہو اور ”اقسط“ کہا جائے تو عدالت اور ہر شخص کو اس کا عادلانہ حصہ دینے کے معنی میں ہے اس بارے میں کیا عدل و قسط کا ایک ہی معنی ہے یا آپس میں فسق رکھتے ہیں۔ ہم اس کی تشریح جلد ۶ سورۃ اعراف کی آیت ۲۹ کے ذیل میں بیان کر

پکے ہیں۔

وہ منکر ہیں، جو امام عادل اور مسلمانوں کے پچے پیشوا کے برخلاف قیام کریں، اور ان کے لیے بہت سے احکام ہیں، جو اس باب میں آئے ہیں۔

لیکن جو بحث اور پر والی آیت میں پیش ہوئی ہے وہ ایک دوسرا معنی کھتی ہے۔ اور یہ ایسے جھگڑے اور نزاع ہیں، جو مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان رونما ہوتے ہیں جس میں نہ تو امام معصوم کے خلاف قیام ہے اور نہ ہی صالح اور صحیح حکومت اسلامی کے خلاف قیام ہے، اگرچہ بعض فقہاء اور مفسرین نے اس آیت سے سابقہ مسئلہ میں بھی استفادہ کرنا چاہا ہے، لیکن "کنز العرفان" میں "فاضل مقداد" کے قول کے مطابق یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ لہ

کیونکہ امام معصوم کے خلاف قیام موجب کفر ہے، جب کہ دو مومنین کے درمیان نزاع صرف فسق ہے نہ کہ کفر، لہذا قرآن مجید نے اور پر والی آیت میں دونوں گروہوں کو مومن اور ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے، اس طرح سے "اہل بغی" یعنی باغیوں کے احکام کو اس قسم کے افراد کے لیے عمومیت نہیں دی جاسکتی۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فقہ میں اس گروہ کے احکام کے سلسلہ میں ہمیں کوئی بحث نہیں ملی، لیکن جو کچھ اور پر والی آیت سے، دوسرے قرآن کو ساتھ ملا کر، وہ خاص اشارے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ابواب میں آئے ہیں۔ ان سے ذیل کے احکام کا استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

الف: مسلمانوں کے متخاصم گروہوں کے درمیان صلح کرانا ایک واجب کفائی امر ہے۔

ب: اس کام کو سرانجام دینے کے لیے ابتدا میں نسبتاً سادہ مراحل سے شروع کرنا چاہیے، اور اصطلاح کے مطابق "الاسهل فالاسهل" کے قاعدے کی رعایت کرنی چاہیے، لیکن اگر وہ مفید واقع نہ ہو تو پھر مسلمانانہ مبارزہ اور جنگ قتال بھی جائز بلکہ لازم و ضروری ہے۔

ج: باغیوں اور تجاؤز کرنے والوں کے خون جو اس راہ میں گرائے جائیں، اور وہ مال جو اس دوران تلف ہوں وہ ہر اور رائیگاں ہیں، کیونکہ یہ شرع کے حکم اور ایک واجب و ذلیفہ کے انجام دینے میں واقع ہوئے ہیں اور اصولاً اس قسم کے موقعوں پر کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

د: گفتگو کے طریقہ سے اصلاح کے مراحل میں حاکم شرع کی اجازت ضروری نہیں ہے، لیکن شدت عمل کے مرحلہ میں، خصوصاً جہاں معاملہ خونریزی پر پہنچی ہو، وہاں حکومت اسلامی اور حاکم شرع کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، مگر ایسے مواقع پر جہاں کسی طرح سے دسترس نہ ہو تو وہاں مومنین عدول اور آگاہ افراد آپس میں صلاح مشورہ کریں گے۔

ه: اس صورت میں جب کہ باغی اور ظالم گروہ "مصلح گروہ" میں سے کسی کا خون گرائے گا یا کوئی مال تلف کرے گا، تو شریعت کے حکم کے مطابق وہ ضامن ہے اور قتل عمد کی صورت میں حکم قصاص بھی جاری ہوگا، اس طرح ان مواقع پر جہاں مظلوم گروہ کے خون بہائے گئے ہیں یا مال تلف ہوئے ہیں، وہاں بھی حکم ضمان "ذقصاص" ثابت ہے اور یہ جو بعض کے کلمات سے معلوم

ہوتا ہے کہ صلح کے وقوع کے بعد باغی اور ظالم گروہ ان خونوں اور اموال کے مقابلہ میں جو ہر گئے ہیں ذمہ دار نہیں ہیں کیونکہ زیر بحث آیت میں اس کی طرف اشارہ نہیں ہوا ہے۔ درست نہیں ہے، کیونکہ آیت ان تمام مطالب کے بیان کے درپے نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے امور میں، ان تمام قواعد و اصولوں کی طرف رجوع کرنا ہے، جو قصاص و اتلاف کے ابواب میں بیان ہوئے ہیں۔

و: چونکہ اس جنگ پیکار کا مقصد ظالم گروہ کو حق کے قبول کرنے پر آمادہ کرنا ہے، لہذا اس جنگ میں اسیران جنگ اور "غنائم" کا مسئلہ درپیش نہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں گروہ مسلمان ہیں، لیکن جھگڑے کی آگ کو خاموش کرنے کے لیے دفعتی طور پر قید کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، لیکن صلح کے بعد فوراً قیدیوں کو آزاد کرنا ہوگا

ز: بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے، کہ نزاع اور جھگڑے کے دونوں فریق، باغی اور ظالم ہوتے ہیں، انہوں نے دوسرے قبیلہ کے ایک گروہ کو قتل کیا اور ان کے مالوں کو تلف کیا ہے، اور انھوں نے بھی۔ یہی کام پہلے قبیلہ کے بارے میں انجام دیا ہے، بغیر اس کے کہ دفاع کے لیے مقدار لازم پرتناعت کریں، چاہے ایک ہی مقدار میں دونوں بغاوت دستم کریں، یا ایک زیادہ کرے اور دوسرا کم کرے۔

البتہ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں کوئی حکم صراحت کے ساتھ نہیں آیا، لیکن اس کا حکم القابض و صمیٹ کے طریق سے زیر بحث آیت سے معلوم کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا وظیفہ اور ذمہ داری یہ ہے کہ دونوں کے درمیان مصالحت کرائیں اور اگر وہ صلح کے لیے تیار نہ ہوں، تو دونوں کے درمیان جنگ کریں، یہاں تک کہ وہ حکم الہی کی طرف لوٹ آئیں، اور وہ احکام جو باغی اور متجاوز کے بارے میں بیان ہوئے ہیں، دونوں کے لیے جاری کیے جائیں۔ اس گفتگو کے آخر میں ہم پھر دوبارہ تاکید کرتے ہیں کہ ان باغیوں کا حکم، ان لوگوں کے حکم سے، جو امام معصوم یا اسلامی عادل حکومت کے خلاف قیام کریں، بالکل الگ ہے اور اس دوسرے گروہ کے لیے زیادہ سخت اور شدید احکام ہیں جو فقہ اسلامی کی کتاب الجہاد میں بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ اخوت اسلامی کی اہمیت

"انما المؤمنون اخوة" کا جملہ جو اوپر والی آیات میں آیا ہے ایک اساسی اور بنیادی اسلامی شعار ہے۔ ایسا شعار جو بہت ہی مضبوط، عمیق، مؤثر اور پرمعنی شعار ہے۔

دوسرے مسلک کے لوگ جب اپنے ہم مسلک لوگوں کے ساتھ زیادہ تعلق اور گاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔ تو وہ انھیں "رفیق" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں، لیکن اسلام مسلمانوں کے دوستی کے تعلقات اور رشتہ کی سطح اس قدر اوپر لے گیا ہے، کہ وہ اسے دو انسانوں کے ایک دوسرے کے ساتھ نزدیک ترین تعلق کی صورت میں، اور اس تعلق کو بھی مساوات اور برابری کی بنیاد پر پیش کرتا ہے، اور وہ "دو بھائیوں" کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق ہے۔ اس اہم اسلامی اصل کی بنا پر مسلمان چاہے جس نسل سے ہوں، یا جس قبیلہ سے، چاہے کوئی سی زبان بولتے ہوں، اور کسی سن و سال کے ہوں، ایک دوسرے سے برادری کا عمیق احساس رکھتے ہیں، چاہے ان میں سے

ایک دنیا کے مشرق میں رہتا ہو اور دوسرا مغرب میں زندگی بسر کرتا ہو۔

مقام ”حج“ میں جب مسلمان، تمام نقاط جہاں اور اطراف عالم سے اس مرکز توحید میں جمع ہوتے ہیں، تو وہاں یہ علاقہ اور لگاؤ، نزدیکی، پیوند اور ہم بستگی پورے طور پر محسوس ہوتی ہے اور وہ اس اہم اسلامی قانون کے بعینہ پورا ہونے کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسلام تمام مسلمانوں کو ایک خاندان سمجھتا ہے اور سب کو ایک دوسرے کے بہن بھائی کہہ کر خطاب کرتا ہے، نہ صرف الفاظ میں اور نعرے کے طور پر، بلکہ عمل میں، اور آپس کی ذمہ داریوں میں سب بہن بھائی ہیں۔

اسلامی روایات میں بھی اس مسئلہ پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے، خاص طور پر اس کے عملی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ہم ذیل میں چند پُر معنی احادیث آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے منقول ہے۔

”المسلم اخو المسلم، لا یظلمہ، ولا یخذلہ، ولا یسلمہ“
 ”مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، وہ ہرگز اس پر ظلم و ستم نہیں کرتا، اس کی مدد سے دستبردار نہیں ہوتا اور اس کو حوادث کے مقابلہ میں تنہا نہیں چھوڑتا۔“

۲۔ ایک اور حدیث میں انھیں جناب سے نقل ہوا ہے۔

”مثل الاخویین مثل الیدین یغسل احدہما الآخر“:

”دو دینی بھائی دونوں ہاتھوں کے مانند ہیں، جن میں سے ہر ایک دوسرے کو دھوتا ہے“ (ایک دوسرے کے ساتھ کھل ہمکاری رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے عیوب کو پاک صاف کرتے ہیں)۔

۳۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

”المؤمن اخو المؤمن، کالجسد الواحد، اذا اشتکی شیئاً منہ

وجد المذنب فی سائر جسده؛ وارواحہما من روح واحدۃ“:

”مومن، مومن کا بھائی ہے، اور وہ سب ایک جسم کے اعضاء کے مانند ہیں، اگر ان میں سے کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضاء کو قرار نہیں آتا اور ان سب کے احوال ایک ہی روح سے لیے گئے ہیں۔“

۱۔ ”لمحیۃ البیضاء“ جلد ۲ ص ۲۲۲ کتاب آداب الصعبۃ والمعاشرة باب ۲۔

۲۔ وہی درک ص ۳۱۹۔

۳۔ اصول کافی جلد ۲ ص ۱۳۳ باب اخوة المؤمنین بعضهم بعض حدیث ۴۲، ۳۔

۴۔ ایک دوسری حدیث میں اسی امام سے منقول ہے۔

”المؤمن اخو المؤمن عینہ ودلیلہ، لا یخونہ، ولا یظلمہ، ولا ینشد، ولا یعدہ عدۃ فی خلفہ،

”مومن، مومن کا بھائی ہے، وہ اس کی آنکھ کی مانند ہے اور اس کا رہنما ہے، وہ اس کے ساتھ کبھی خیانت نہیں کرتا اور اس پر ظلم دستم روا نہیں رکھتا، اس سے پھرتا نہیں، اور جو وعدہ اس کے ساتھ کرتا ہے اس سے تخلف نہیں کرتا، لہ

حدیث کے معروف اسلامی مآخذوں اور منابع میں، مومن کے اپنے مسلمان بھائی پر حقوق اور مومنین کے ایک دوسرے پر حقوق کے انواع و اقسام، ایمانی بھائیوں کے دیدار، مصافحہ، معاقتہ اور انھیں یاد کرنے اور ان کے دل کو مسرور اور خوش کرنے، خصوصاً مومنین کی حاجات کو پورا کرنے اور ان امور کی انجام دہی میں سعی و کوشش کرنے، اور ان کے دل سے غم و اندوہ کو دور کرنے اور انھیں کھانا کھلانے، کپڑے پہنانے اور ان کا اکرام و احترام کرنے کے ثواب کے بارے میں بہت زیادہ روایات وارد ہوئی ہیں، جس کے اہم حصوں کو ”اصول کافی“ کے مختلف ابواب میں اور پر والے عنوانات کے تحت مطالب کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ اس بحث کے آخر میں ہم ایک روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو پیغمبر اکرم سے مومن کے اس کے مومن بھائی پر تین حقوق کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو اس سلسلہ میں جامع ترین روایت ہے۔

قال رسول اللہ من، للمسلم علی اخیہ ثلاثون حقاً: لا براءۃ منہا الا بالاداء، او العفو، یخفر زلتہ، ویرحم عورتہ، ویستر عورتہ، ویقبل عثرتہ، ویقبل معذرتہ، ویزد غیبہ، ویدیم نصیحتہ، ویحفظ خلتہ، ویرعی ذمتہ، ویعود مرضہ۔

ویشہد میتہ، ویجیب دعوتہ، ویقبل ہدیتہ ویکافأصلتہ، ویشکر نعمتہ ویحسن نصرتہ، ویحفظ حلیتہ، ویقضى حاجتہ، ویشفع مسألته ویسمت عطستہ۔

ویرشد ضالته، ویرد سلامہ، ویطیب کلامہ، ویبر انعامہ، ویصدق اقسامہ، ویوالی ولیہ ولا یعادیہ، وینصرہ ظالمًا ومظلومًا: فانما نصرته ظالمًا فیردہ عن ظلمہ، واما نصرته مظلومًا فیعینہ علی اخذ حقہ، ولا یسلمہ ولا یخذلہ، ویحب لہ من الخیر ما یحب

لنفسه، ويكره له من الشر ما يكره لنفسه۔

”پیغمبر اسلام نے فرمایا: مسلمان اپنے مسلمان بھائی پر تیس حق رکھتا ہے، جن سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ ان حقوق کو ادا نہ کرے، یا اس کا مسلمان بھائی اس کو معاف کر دے۔

اس کی لغزشوں کو معاف کر دے، اس کی پریشانی میں اس پر مدد کرے۔ اس کے رازوں کو پوشیدہ رکھے، اس کی غلطیوں کی تلافی کرے، اس کے عذر کو قبول کرے، بدگوئی کرنے والوں سے اس کا دفاع کرے، ہمیشہ اس کا خیر خواہ رہے، اس کی دوستی کی پاسداری کرے۔ اس کے عہد و پیمان کی رعایت کرے، حالت بیمار میں اس کی عیادت کرے، اس کی موت کی حالت میں اس کے جنازہ میں حاضر ہو۔

اس کی دعوت کو قبول کرے، اس کے ہدیہ کو قبول کرے اس کے عطیہ کا بدلہ دے، اس کے احسان کا شکر یہ ادا کرے، اس کی مدد میں کوشش کرے، اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے، اس کی حاجت پوری کرے۔ اس کی درخواست کی شفاعت کرے، اور اس کی چھینک پر ”بیرحمت اللہ“ کہے۔

اس کی گمشدہ چیزوں کی رہنمائی کرے، اس کے سلام کا جواب دے، اس کی گفتگو کو اچھا سمجھے، اس کے انعام کو خوب قرار دے، اس کی قسموں کی تصدیق کرے، اس کے دوست کو دوست رکھے، اور اس کے ساتھ دشمنی نہ کرے، اس کی مدد میں کوشش کرے چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم، ظالم ہونے کی صورت میں اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روکے، اور مظلوم ہونے کی صورت میں اس کی مدد یہ ہے کہ اس کی اس کا حق حاصل کرنے میں مدد کرے۔

اسے حوادث زمانہ کے مقابلہ میں تنہا نہ چھوڑے، نیکیوں اور اچھائیوں میں سے جن چیزوں کو اپنے لیے پسند کرتا ہے اس کے لیے بھی پسند کرے اور برائیوں میں سے جن چیزوں کو اپنے لیے نہیں چاہتا اس کے لیے بھی نہ چاہے۔ لہ

بہر حال مسلمانوں کے ایک دوسرے پر حقوق میں سے ایک مدد کرنا اور آپس میں اصلاح کرنا ہے، جس طرح سے کہ اوپر والی آیات اور روایات میں آیا ہے اصلاح ذات البین کے سلسلہ میں ہم جلد ۴ سورہ انفال کی آیت ۱ صفحہ ۳۸۵ میں ایک اور بحث کر چکے ہیں۔

۱۱- يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ
يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاۤءِ عَسٰى
اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا
تَنَابَزُوْا بِاللُّقَابِ طِيْسٌ اِلَآئِمُ الْفُسُوْقِۙ بَعْدَ
الْاِيْمَانِۗ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الظَّالِمُوْنَ ۝

۱۲- يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ
اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌۙ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبَ
بَعْضُكُمْ بَعْضًاۙ اِيْحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّأْكَلَ لَحْمَ
اَخِيْهِۗ مَيِّتًاۙ وَكَرِهْتُمُوْهُۙ وَاتَّقُوا اللّٰهَۙ اِنَّ اللّٰهَ
تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

۱۱- اے ایمان لانے والو! تمہارے مردوں میں سے ایک گروہ دوسرے
گروہ کا ٹھٹھا اور مذاق نہ اڑائے، شاید وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ ہی عورتیں،
دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، شاید وہ ان سے بہتر ہوں، اور ایک دوسرے کو
طعن و تشنیع نہ کرو، اور بُرے اور ناپسند القاب کے ساتھ ایک دوسرے کو یاد نہ

کرو، اور یہ بات تو بہت ہی بُری ہے کہ کسی شخص پر ایمان کے بعد کفر کا نام (الزام) رکھو، اور جو توبہ نہ کریں وہی تو ظالم و ستمگر ہیں۔

۱۲۔ اے ایمان لانے والو! بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں، اور ہرگز (دوسروں کے کاموں میں) تجسس نہ کرو، اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے، (یقیناً) تم سب اس چیز سے کراہت رکھتے ہو، خدا کا تقویٰ اختیار کرو، کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

شان نزول

مفسرین نے ان آیات کے لیے مختلف شان ہائے نزول نقل کیے ہیں، مغلدہ اُن کے یہ ہے کہ، لایسخر قوم من قوم : کا جملہ ثابت بن قیس (پنزیب کے خطیب) کے بارے میں نازل ہوا ہے، جس کو کالوں سے کم سنائی دیتا تھا اور جس وقت وہ مسجد میں آتے تھے تو پنزیب کے نزدیک اس کے لیے جگہ چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ آنحضرت کے ارشادات سن سکے۔ ایک دن وہ مسجد میں وارد ہوئے تو لوگ نماز سے فارغ ہو چکے تھے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ مجمع کو چیرتا ہوا کہتا جا رہا تھا کہ جگہ دو جگہ دو،! یہاں تک کہ وہ ایک مسلمان کے پاس پہنچ گیا تو اس نے کہا کہ یہیں بیٹھ جا! تو وہ اس کے پیچھے بیٹھ گیا، لیکن بہت غصے ہوا جس وقت فضا روشن ہوئی تو ثابت نے اس مرد سے کہا، تو کون ہے؟ اس نے اپنا نام لیا اور کہا کہ میں فلاں شخص ہوں۔ ثابت نے کہا: کیا فلاں عورت کا بیٹا؟ اور اس کی ماں کا نام، اس بُرے لقب کے ساتھ، جو زمانہ جاہلیت میں لیا کرتے تھے، لیا۔ اس پر وہ شخص شرمندہ ہوا، اور اپنا سر نیچے کر لیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اس قسم کے بُرے کاموں سے منع کیا۔

مفسرین نے کہا کہ: "ولا نساء من نساء" جناب اتم سلمہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن کا بعض اراج پنزیب نے مخدومہ کے مخصوص لباس کی وجہ سے جو انھوں نے پہن رکھا تھا، یا اُن کے چھوٹے قد کی وجہ سے مذاق اڑایا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں اس عمل سے روکا۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ "ولا یغتب بعضکم بعضاً" کا مجملہ اصحاب رسول اللہ میں سے دو افراد کے بارے میں ہے۔ جب وہ اپنے اپنے ساتھی "مسلمان" کی غیبت کی تھی، کیونکہ انہوں نے اُسے پیغمبر کی خدمت میں بھیجا تھا تاکہ وہ انکے لیے کھانا لے آئیں۔ پیغمبر نے "مسلمان" کو "اسامہ بن زید" کے پاس جو "بیت المال" کے مسئول تھے، بھیج دیا۔ "اسامہ" نے کہا: اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے تو ان دو افراد نے "اسامہ کی غیبت کی اور کہا کہ اس نے سخل سے کام لیا ہے۔ اور "مسلمان" کے بارے میں کہا: اگر اُسے چاہ سمیجہ (ایک پانی سے بھرے ہوئے کنوئیں) کی طرف بھی بھیجیں تو اس کا پانی بھی نیچے چلا جائے گا: اس کے بعد وہ خود پہل پڑے تاکہ اسامہ کے پاس جا کر اپنے کام کے بارے میں جستجو کریں، تو پیغمبر نے فرمایا: مجھے تمہارے مُنہ سے گوشت کھانے کے آثار نظر آ رہے ہیں، انہوں نے عرض کیا: اے رسول خدا! ہم نے تو آج بالکل ہی گوشت نہیں کھایا ہے آپ نے فرمایا: ہاں! تم نے "مسلمان" اور "اسامہ" کا گوشت کھایا تھا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور مسلمانوں کو غیبت کرنے سے منع کیا۔

استہزاء، بدگمانی، غیبت، تجسس، اور بُرے القاب سے

یاد کرنا ممنوع ہے

چونکہ قرآن مجید اس سورہ میں اسلامی معاشرے کو اخلاقی معیاروں کی بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتا ہے، لہذا مختلف اسلامی گروہوں کے بارے میں نزاع و مخالفت کی صورت میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں بحث کرنے کے بعد، زیر بحث آیات میں ان کے اختلافات کی جڑوں کے ایک حصہ کی تشریح کرتا ہے تاکہ ان کے منقطع ہونے سے اختلافات بھی ختم ہو جائیں اور لڑائی جھگڑے اور نزاع کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

اوپر والی دونوں آیات میں سے ہر ایک میں اُن امور کے تین تین حصوں کو، جو جنگ اور اختلاف کی آگ کو روشن کرنے کے لیے چنگاری بن سکتے ہیں۔ صریح اور مُنہ بولتی تعبیروں کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! تمہارے مردوں میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا ٹھٹھا اور مذاق نہ اڑائے" (یا ایہا الذین امنوا لا یسخر قوم من قوم)۔

"کیونکہ شاید وہ لوگ جن کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، ان سے بہتر ہوں" (علی ان ینکونوا

خیراً منہم)۔

۱۔ "تفسیر مجمع البیان" جلد ۹ ص ۱۳۵۔ قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی شانِ نزول نقل کی ہے۔

”اسی طرح عورتوں میں سے بھی کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں (ولا نساء من نساء عسی ان یکن خیراً منھن)۔“

یہاں مخاطب مومنین ہیں چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں، قرآن سب کو خبردار کرتا ہے، کہ وہ اس بُرے عمل سے پرہیز کریں، کیونکہ استہزار اور تمسخر کا سرچشمہ، خود کو برتر سمجھنے کا احساس اور کبر و غرور ہے، جو طول تاریخ میں بہت سی خونیں جنگوں کا عامل رہا ہے۔

اور یہ ”اپنے آپ کو بڑا سمجھنا“ زیادہ تر ظاہری اور مادی اقدار سے پیدا ہوتا ہے، مثلاً فلاں شخص اپنے آپ کو دوسرے سے زیادہ مالدار، زیادہ خوبصورت یا زیادہ معروف قبیلہ میں شمار کرتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ خیال، کہ وہ علم و عبادت اور دوسرے معنویات میں فلاں جمعیت سے برتر ہے، اس کو تمسخر اور استہزار پر آمادہ کرتا ہے، درحالیکہ خدا کے نزدیک قدر و قیمت کا معیار تقویٰ ہے، اور اس کا تعلق نیت اور دل کی پاکیزگی، تواضع، اخلاق اور ادب کے ساتھ ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ: میں خدا کے نزدیک فلاں شخص سے برتر ہوں، اسی بنا پر دوسروں کی تحقیر اور اپنے آپ کو برتر سمجھنا، بدترین کاموں میں سے ایک ہے، اور قبیح ترین اخلاقی عیب ہے، جس کا رد عمل، ہو سکتا ہے کہ انسانوں کی ساری زندگی میں آشکار ہو۔

اس کے بعد دوسرے مرحلہ میں فرماتا ہے: ”اور ایک دوسرے کے عیب نہ نکالو اور طعن و تشنیع نہ کرو“؛ (و لا تلمزوا و انفسکم)۔

”لا تلمزوا“ ”لمز“ بروزن (طنز) کے مادہ سے، عیب نکالنے اور طعن کرنے کے معنی میں ہے۔ اور بعض نے ”ہمز“ اور ”لمز“ کے درمیان اس طرح فرق بیان کیا ہے۔ کہ ”لمز“ تو لوگوں کے سامنے ان کے عیوب گنوانا ہے اور ”ہمز“ ان کے پیٹھے پیچھے ان کے عیوب کو بیان کرنا ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ ”لمز“ تو آنکھ اور اشارہ سے عیب جوئی کرنا ہے، جبکہ ”ہمز“ زبان سے عیب جوئی ہے (اس موضوع کے سلسلہ میں مزید تشریح انشاء اللہ سورہ ہمزہ کی تفسیر میں آئے گی،

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں ”انفسکم“ کی تعبیر کے ساتھ مومنین کی وحدت اور ایک ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے، کہ تمام مومنین نفس واحد کی طرح ہیں، اگر تم کسی دوسرے کی عیب جوئی کرو تو واقع میں تم نے خود اپنی ہی عیب جوئی کی ہے۔

اور آخر میں تیسرے مرحلہ میں مزید کہتا ہے: ”اور ایک دوسرے کو بُرے اور ناپسندیدہ القاب کے ساتھ یاد نہ کرو“؛ (ولا تنابزوا باللقاب)۔

بہت سے منہ پھٹ اور بے ہمار لوگ گذشتہ زمانہ میں بھی اور آج بھی دوسروں کو بُرے القاب سے یاد کرنے پر مصر رہے ہیں اور ہیں، اور اس طریقہ سے ان کی تحقیر کرنے ان کی شخصیت کی سرکوبی کرنے یا بعض اوقات

ان سے انتقام لینے پر اصرار کرتے ہیں اور اگر کسی نے سابقہ زمانہ میں کوئی بُرا کام کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے توبہ کر لی، اور وہ مکمل طور پر پاک ہو گیا، لیکن اس کے بعد بھی وہ اس کے لیے اسی لقب کو جو اس کی سابقہ وضع کو بیان کرنے والا ہے۔ برقرار رکھتے ہیں۔

اسلام صریح طور پر اس بُرے عمل سے منع کرتا ہے، اور ہر وہ نام اور لقب جو معمولی سے معمولی غیر مطلوب مفہوم رکھتا ہے اور کسی مسلمان کی تحقیر و تذلیل کا سبب بنتا ہے اُسے ممنوع قرار دیتا ہے، ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن "صفیہ" دختر "حی بن اخطب" (وہی یہودی عورت جو فتح خیبر کے واقعہ کے بعد مسلمان ہو گئی اور پیغمبر اسلام کی زوجیت میں آئی) ایک دن پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوئی، در آنحالیکہ ان کے آنسو جاری تھے، پیغمبر نے ماجرا پوچھا تو اس نے کہا کہ عائشہ مجھے ملامت کرتی ہے اور کہتی ہے: اے یہودی کی لڑکی،! تو پیغمبر نے فرمایا تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ میرا باپ ہارون ہے، اور میرا چچا موسیٰ ہے، اور میرا شوہر محمد ہے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ لے

اسی بنا پر آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: بہت بُری بات ہے یہ کہ تم کسی پر اس کے ایمان لانے کے بعد کفر کا نام رکھو" (بئس الاسم الفسوق بعد الایمان)۔ بعض نے اس جملہ کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا مومنین کو اس بات سے منع کر رہا ہے کہ ایمان لانے کے بعد لوگوں کی عیب جوئی کی بنا پر اپنے لیے فسق کے نام کو قبول کر لیں۔ لیکن پہلی تفسیر صدر آئیہ اور اس شان نزول کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو بیان ہوئی ہے، زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: "اور وہ لوگ جو توبہ نہ کریں، اور ان اعمال سے دست بردار نہ ہوں، ظالم و ستمگر ہیں"؛ (ومن لم یتب فاولئك هم الظالمون)۔ اس سے بدتر ظلم اور کیا ہوگا کہ انسان اپنی نیش و ارباقوں سے، اور تحقیر اور عیب جوئی سے کسی صاحب ایمان کے دل کو آزار پہنچانے، جو عشق خدا کا مرکز ہے۔ اور ان کی شخصیت اور ابرو کو، جو ان کی زندگی کا سرمایہ ہے ختم کر دے ہم بیان کر چکے ہیں کہ دونوں زیر بحث آیات میں سے ہر ایک میں، اسلامی، اجتماعی اخلاق کے مسائل کے سلسلہ میں، تین تین حکم پیش ہوئے ہیں، پہلی آیت کے تین احکام ترتیب کے ساتھ تفسیر نہ کرنا، ترک عیب جوئی اور تنازعہ باللقاب تھے، اور دوسری آیت کے تین احکام بالترتیب، بدگمانی سے اجتناب، عیوب کا تجسس اور غیبت ہیں۔

اس آیت میں پہلے فرماتا ہے: "اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو، کیونکہ بعض

گمان گناہ ہیں“ (یا ایہا الذین امنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم)۔
 ”کثیراً من الظن“ سے مراد بُرے گمان ہیں، جو اچھے گمانوں کی نسبت لوگوں میں زیادہ ہیں، لہذا اس کو کثیر کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، ورنہ ”حسن ظن اور گمان نیک“ نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں ہے، بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ قرآن مجید سورہ نور کی آیت ۱۲ میں فرماتا ہے: لولا اذ سمعتموه ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسہم خیراً۔

”جس وقت تم نے اس ناروا نسبت کو سنا تھا تو باایمان مردوں اور عورتوں نے اپنی نسبت (اور اس کے لیے جو خود انہیں کی طرح تھا) اچھا گمان کیوں نہ کیا“؟!

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”نہی“ ”کثیر“ گمانوں سے ہوئی ہے، لیکن مقام تعلیل میں کہتا ہے، کیونکہ بعض گمان گناہیں ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق اس وجہ سے ہو کہ بعض بُرے گمان واقع کے مطابق ہوتے ہیں، اور بعض واقع کے مخالف ہو گمان واقع کے خلاف ہوتے ہیں وہ تو مسلماً گناہ ہیں۔ لہذا ان کی ”ان بعض الظن اثم“ سے تعبیر ہوئی ہے۔ اس بنا پر اسی گناہ کا وجود اس بات کے لیے کافی ہے کہ سب سے پرہیز کرے۔

یہاں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے، کہ بُرا اور اچھا گمان عام طور پر اختیاری نہیں ہوتا، یعنی وہ ایک سلسلہ مفدمات کے زیر اثر جو انسان کے اختیار سے خارج ہیں، ذہن میں منعکس ہوتا ہے، اس بنا پر اس سے کس طرح روکا جاسکتا ہے؟
 ۱۔ اس نہی سے مراد، ترتیب آثار سے نہیں ہے، یعنی جس وقت کسی مسلمان کے بارے میں تمہارے ذہن میں کوئی بُرا گمان پیدا ہو تو اس کے لیے عمل میں معمولی سے معمولی اختلاف بھی نہ کرو۔ اپنی طرز رفتار میں تبدیلی نہ کرو، اور دوسرے سے اپنے سلوک اور معاملات کو نہ بدلو، اس بنا پر جو چیز گناہ ہے وہ بُرے گمان کے مطابق عمل کرنا ہے۔
 لہذا ایک حدیث میں پغمبرِ گرامی اسلامؐ سے منقول ہے

”ثلاث فی المؤمن لا یتحسن، ولہ منہن مخرج، فمخرجہ من سوء الظن

ان لا یحققہ“

تین چیزیں ایسی ہیں جن کا وجود مؤمن میں پسندیدہ نہیں ہے، جبکہ اس کے لیے ان سے فرار کی راہ موجود ہے، منجملہ ان کے ایک سوء ظن ہے، جس سے راہ فرار یہ ہے کہ اس کو عمل میں نہ لایا جائے۔
 ۲۔ انسان مختلف مسائل میں غور و فکر کرنے سے، بہت سے مواقع پر بُرے گمان کو اپنے سے دور کر سکتا ہے، اور وہ اس طرح سے کہ ان کو صحت پر محمول کرنے کے راستوں میں غور کرے، اور ان سے صحیح احتمالات کو جو اس پر عمل کے بارے میں موجود ہیں اپنے ذہن میں مجسم کرے، اور آہستہ آہستہ بُرے گمان پر غلبہ حاصل کرے۔
 اس بنا پر بدگمانی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہمیشہ انسان کے اختیار سے خارج ہو۔

لہذا روایات میں بطور حکم آیا ہے کہ اپنے بھائی کے اعمال کو جہاں تک ہو سکے بہترین صورت پر محمول کر دو، جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے اور تیرے مسلمان بھائی سے جو سخت بات صادر ہو گئی ہے اس کے لیے ہرگز بدگمانی نہ کر جب تک تو اسکے لیے نیکی پر محمول کرنے کی گنجائش رکھتا ہے۔

”قال امیر المؤمنین علیہ السلام وضع امر اخیک علی احسنہ حتی یاتیک ما یقبلک منہ، ولا تظنن بکلمۃ خرجت من اخیک سوء و انت تتجد لها فی الخیر محملاً۔“

بہر حال یہ اسلامی دستور انسانوں کے اجتماعی روابط کے سلسلے میں ایک جامع ترین اور ایک انتہائی چچا حکم ہے جو معاشرے میں امن و امان کے مسئلہ کو کامل طور سے ضمانت دیتا ہے، جس کی تفصیل نکات کی بحث میں آئے گی۔ پھر بعد والے حکم میں ”تخس سے نہی“ کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور ہرگز دوسروں کے کاموں میں تخس نہ کرو“؛ (ولا تجتسوا)۔

”تخس“ اور ”تخس“ دونوں جستجو کرنے کے معنی میں ہیں، لیکن پہلا عام طور پر غیر مطلوب امور میں آتا ہے اور دوسرا عام طور پر امر خیر میں آتا ہے، جیسا کہ یعقوب اپنے بیٹوں کو حکم دیتے ہیں: (یا بنی اذہبوا فتحسوا من یوسف واخیه: اے میرے بیٹو جاؤ اور (میرے گمشدہ) یوسف اس کے بھائی کے بارے میں جستجو کرو۔ (یوسف: ۸۶) درحقیقت بڑا گمان ایک عامل ہے جستجو کرنے کا، اور جستجو کرنا ایک عامل ہے لوگوں کے راز ہائے نہانی اور اسرار کے کشف کے لیے اور اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ان کے خصوصی راز فاش ہوں۔

دوسرے لفظوں میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی خصوصی زندگی میں ہر لحاظ سے امن و امان میں رہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر یہ اجازت دے دی جائے کہ ہر آدمی دوسروں کے بارے میں جستجو کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے تو لوگوں کی حیثیت اور آبرو تباہ و برباد ہو جائے گی اور ایک جسم و وجود میں آجاتے گی جس میں معاشرے کے تمام افراد مغرب ہوں گے۔ البتہ یہ دستور، حکومت اسلامی میں سازشوں سے مبارزہ کرنے کے لیے اطلاعاتی اداروں (سی آئی ڈی) کے وجود کے ساتھ منافی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی اس معنی میں نہیں ہے، کہ یہ ادارے لوگوں کی خصوصی زندگی میں بھی جستجو کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ انشاء اللہ اس بارے میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

اور آخر میں تیسرے اور آخری دستور میں، جو حقیقت میں پہلے دو پروگراموں کا محلول اور نتیجہ ہے، فرماتا ہے: ”تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت نہ کرے“ (ولا یغتب بعضکم بعضاً)۔

اور اس طرح سے بڑا گمان تو تخس کا سرچشمہ بنتا ہے اور تخس، افشائے عیوب اور اسرار نہانی کا موجب ہوتا

۱۔ ”اصول کافی“ جلد ۲ باب التہمتہ وسودالظن حدیث ۲۱۔ اسی معنی کے مشابہ بیچ اسلانہ میں بھی مختصر سے فرق کے ساتھ آیا ہے۔

ہے اور ان امور سے آگاہی غیبت کا سبب بنتی ہے اور اسلام نے معلول اور علت دونوں سے منع کیا ہے۔ اس کے بعد اس عمل کی قباحت اور بُرائی کو کامل طور سے مجسم کرنے کے لیے اس کو ایک عمدہ مثال میں ڈھال کر کہتا ہے، "کیا تم میں سے کوئی بھی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے؟" (ایحب احدکم ان یأکل لحم اخیہ میتاً)۔

"یقیناً تم سب اس امر سے کراہت رکھتے ہو" (فکدھتموہ)۔

ہاں مسلمان بھائی کی آبرو اس کے بدن کے گوشت کی مانند ہے اور اس آبرو کو غیبت کے ذریعہ ختم کرنا، اور پوشیدہ بھیدوں کو افشا کرنا، اس کے بدن کا گوشت کھانے کے مانند ہے۔

اور "مردہ" کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ غیبت "لوگوں کے پیٹھ پیچھے کی جاتی ہے، جو مُردوں کی طرح اپنے آپ سے دفاع پر قدرت نہیں رکھتے۔

اور یہ ایک ایسا ظلم ہے جو انتہائی بزدلانہ ہے، کہ جسے انسان اپنے بھائی کے بارے میں روارکھ سکتا ہے۔

ہاں ایشیہ، غیبت کی حد سے زیادہ بُرائی، اور اس کے عظیم گناہ کو بیان کرنے والی ہے۔

اسلامی روایات میں بھی جیسا کہ بیان کیا جائے گا مسئلہ غیبت "کو حد سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور بہت کم ایسے

گناہ ہیں، جس کی سزا، اسلام کی نظر میں، اس قدر سنگین ہو،

اور چونکہ ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان تینوں گناہوں میں سے بعض سے آلودہ ہوں، اور وہ ان آیات کے سُننے سے متنبہ اور

بیدار ہو جائیں، اور تلافی کے لیے تیار ہوں، اس لیے آیت کے آخر میں ان کے لیے راستہ کھلا رکھتے ہوئے فرماتا ہے:

"تقوا لعلیٰ اختیار کرو، اور خدا سے ڈرو، کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے" (واقفوا اللہ ان اللہ لتواب

رحیم)۔

سب سے پہلے تقویٰ اور خدا سے ڈرنے کی رُوح زندہ ہونی چاہیے اور اس کے بعد گناہ سے توبہ کی جائے، تاکہ خدا کا

لطف اور اس کی رحمت ان کے شامل حال ہو۔

چند نکات

۱۔ معاشرے میں کامل اور ہر پہلو سے امن و امان

وہ چھ احکام جو اوپر والی دو آیات میں بیان کیے گئے ہیں۔ زَمخَر، غیبت جوئی، بُرے القاب، گمان بد، تجسس اور

میبیت سے نہی، اگر کسی معاشرے میں ان پر کامل طور سے عمل ہو، تو معاشرے کے تمام افراد کی عزت و آبرو کا ہر لحاظ سے بیمہ ہو

جاتا ہے۔ نہ تو کوئی شخص خود کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے دوسروں کو تفریح و تَمسخر کا ذریعہ بنا سکتا ہے، اور نہ ہی وہ کسی کی عیب جوئی کے

لیے زبان کھول سکتا ہے اور نہ بُرے القاب کے ساتھ لوگوں کی حرمت و شخصیت کو خراب کرتا ہے۔

نہ اُسے کسی کے بارے میں بُرا گمان کرنے کا حق ہے۔ نہ وہ افراد بشر کی شخصی زندگی کے بارے میں جستجو میں لگتا ہے، اور نہ ہی ان کے پوشیدہ عیوب دوسروں کے سامنے فاش کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں انسان کے پاس چار سرمائے ہیں۔ اور ان سب کو اس قانون کے قلعوں کے اندر محفوظ رہنا چاہیے اور وہ ہیں: جان، مال، اور عزت و آبرو،

اوپر والی آیات اور اسلامی روایات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ لوگوں کی آبرو اور حیثیت، ان کے مال و جان کی طرح ہے، بلکہ بعض پہلوؤں سے ان سے بھی زیادہ اہم ہے!

اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں کامل طور پر امن و امان کی حکمرانی ہو۔ لوگ ایک دوسرے پر نہ صرف عمل میں اور ہاتھ کے ساتھ حملہ نہ کریں۔ بلکہ لوگوں کی زبان کے لحاظ سے اور اس سے بھی بڑھ کر فسکر اور سونج کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے امن و امان میں ہوں اور ہر شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی دوسرا شخص اپنے افکار میں بھی تہمت کے تیرا سس کی طرف نہیں پھینکتا، اور یہ ایسی بلند ترین سطح کی امنیت ہے، جو ایک مذہبی اور مومن معاشرے کے سوا کہیں بھی امکان پذیر نہیں ہے۔ پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں۔

”ان الله حرم من المسلم دمه وماله وعرضه، وان يظن

به سوء:

”خدا نے مسلمانوں کا خون، مال اور عزت و آبرو دوسروں پر حرام کر دی ہے، اور اسی طرح یہ بھی کہ اس

کے بارے میں بُرا گمان کرے۔“

بُرا گمان کرنا، نہ صرف طرف مقابل اور اس کی حیثیت پر صدمہ وارد کرتا ہے، بلکہ بُرا گمان کرنے والے کے لیے بھی ایک بہت بڑی بلا و مصیبت ہے، کیونکہ وہ لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے، اور اجتماعی تعاون سے الگ تھلگ ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے۔

اور یہ نفل ایک ایسی وحشتناک دُنیا اس کے لیے فراہم کرتا ہے، جو غربت و بے کسی اور تنہائی و گوشہ نشینی سے پُر ہو۔ جیسا کہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں منقول ہوا ہے،

”من لم يحسن ظنه استوحش من كل احد:

”جو شخص بُرا گمان رکھتا ہو وہ ہر شخص سے ڈرتا ہے، اور وحشت رکھتا ہے۔“

دوسرے لفظوں میں وہ چیز جو انسان کی زندگی کو جانوروں سے جدا کرتی ہے، اور اسے رونق و حرکت اور تکامل و ارتقا بخشتی ہے، وہ رُوح تعاون اور سب کا مل جل کر کام کرنا ہی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں امکان پذیر ہے۔ جبکہ

لوگوں میں اعتماد اور خوش بینی ہو، درآخالیکہ بڑا گمان اس اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے، اور تعاون کے رشتوں کو توڑ دیتا ہے، اور رُوح اجتماعی کو کمزور کر دیتا ہے۔

نہ صرف سُورظن بلکہ تجسس اور غیبت کا مسئلہ بھی اسی طرح کا ہے۔

بدین افراد ہر چیز سے ڈرتے ہیں، اور ہر شخص سے وحشت رکھتے ہیں، اور ان کی رُوح پر ہمیشہ ایک جانکھ پریشانی چھائی رہتی ہے، نہ تو وہ کوئی دوست اور مونس و غم خوار پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے اجتماعی کاموں کے لیے کوئی ٹھیک و مہمکا بنا سکتے ہیں اور نہ پریشانی کے دنوں کے لیے کوئی یار و مددگار۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی لازم ہے کہ یہاں "ظن" سے مراد ایسے گمان ہیں جن کے لیے کوئی دلیل نہ ہو، اس بنا پر چہا گمان کا انحصار کسی دلیل یعنی ظن معتبر پر ہو وہ اس گمان سے مستثنیٰ ہے، اُس گمان کی طرح، جو دو عادل گواہوں کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ تجسس نہ کرو

ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن نے اوپر والی آیت میں تجسس کو پوری صراحت کے ساتھ منع کیا ہے، اور چونکہ اس کے پلے کسی قسم کی کوئی قید و شرط نہیں لگائی، لہذا یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ دوسروں کے کاموں میں جسے جو کرنا، اور ان کے بھیدوں کو فاش کرنے کی کوشش کرنا، گناہ ہے، لیکن وہ قرآن جو آیت کے اندر اور باہر موجود ہیں وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں، کہ یہ حکم افراد کی شخصی اور خصوصی زندگی سے مربوط ہے، اور اجتماعی زندگی میں بھی اس حد تک، کہ اس سے معاشرے کی سرفروشت میں کوئی اثر نہ پڑتا ہو، یہی حکم صادق ہے۔

لیکن یہ بات واضح اور روشن ہے کہ جہاں اس کا دوسروں کی سرفروشت اور معاشرے کی حالت سے تعلق ہو، تو پھر مسئلہ کی دوسری شکل ہو جاتی ہے، لہذا پینچبر نے کچھ اشخاص اطلاعات جمع کرنے کے لیے مقرر کیے ہوئے تھے، جنہیں "عیون" کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے تاکہ وہ ایسی اطلاعات جو داخل اور خارج میں اسلامی معاشرے سے متعلق ہیں آپ کے لیے اکٹھی کریں۔

اسی بنا پر حکومت اسلامی بھی مامورین اطلاعاتی رکھ سکتی ہے یا اطلاعات جمع کرنے کے لیے ایک وسیع ادارہ قائم کر سکتی ہے اور جہاں کہیں معاشرے کے برخلاف سازش کا خوف ہو، یا امن و امان کو خطرے میں ڈالنے یا حکومت اسلامی کو نقصان پہنچانے کا خطرہ ہو، وہاں تجسس کریں، یہاں تک کہ بعض افراد کی خصوصی و داخلی زندگی میں بھی جستجو کریں۔

لیکن یہ امر ہرگز اس اسلامی بنیادی قانون کی حرمت کو توڑنے کے لیے بہانہ نہیں بننا چاہیے، کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو اس بات کا مجاز قرار دے لیں کہ وہ مسئلہ "سازش" اور نقص امن کے بہانہ سے لوگوں کی خصوصی اور شخصی زندگی پر حملہ آور ہوں، ان کا اعمال نامہ کھولیں، ان کے ٹیلیفونوں پر کنٹرول کریں اور وقت بے وقت ان کے گھروں کی تلاشی لیں۔

خلاصہ یہ کہ "تجسس" اور معاشرے کے امن و امان کی حفاظت کے لیے لازمی اطلاعات کے درمیان کی سرحد

بہت ہی دقیق اور ظریف ہے، اور امورا اجتماعی کے ادارہ کے ذمہ داروں کو دقت کے ساتھ اس سرحد کی نگرانی کرنا چاہیے، تاکہ انسانوں کے اسرار کی حرمت کی حفاظت بھی ہو، اور معاشرے اور حکومت اسلامی کا امن و امان بھی خطرے میں نہ پڑے۔

۳۔ غیبت بہت بڑا گناہ ہے

ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی حیثیت، آبرو اور شخصیت ہے، اور جو چیز اسے خطرے میں ڈال دے، وہ ایسا ہے، جیسا کہ اس کی جان کو خطرے میں ڈال دیا، بلکہ بعض اوقات شخصیت کو قتل کرنا شخص کو قتل کرنے سے زیادہ اہم شمار ہوتا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں اس کا گناہ قتل نفس کے گناہ سے بھی زیادہ سخت اور سنگین ہے۔

غیبت کے حرام ہونے کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ یہ ہے، کہ عظیم سرمایہ برباد نہ ہو، اور اشخاص کی حرمت ضائع نہ ہو، اور ان کی حیثیت کو داغدار نہ کرے، یہ ایسی بات ہے جسے اسلام نے بہت ہی زیادہ اہمیت دی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ”غیبت“ بدنیٹی پیدا کرتی ہے، اجتماعی رشتوں کو کمزور کرتی ہے۔ اعتماد کے سراپوں کو ختم کرتی ہے اور تعاون اور مل جل کر کام کرنے کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اسلام مسئلہ وحدت اور جامعہ اسلامی کے اتحاد، تنظیم اور استحکام کو حد سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، جو چیز اس وحدت کو مضبوط بناتی ہو، وہ اسلام سے تعلق اور لگاؤ رکھتی ہے، اور جو چیز اس کو کمزور کرے وہ اس کے لیے قابل نفرت ہے، اور غیبت ضعف پہنچانے اور کمزور کرنے کا ایک اہم عامل ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر ”غیبت“ کی نہ عدالت کا بیج دلوں میں بولتی ہے، اور بعض اوقات خونیں نزاعوں اور قتل و کشتار کا سرچشمہ بنتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر اسلام میں غیبت بزرگ ترین گناہان کبیرہ میں شمار ہوتی ہے تو یہ اس کے انفرادی اور اجتماعی برے آثار کی وجہ سے ہے۔

روایات اسلامی میں اس سلسلہ میں بہت ہی ہلادینے والی تعبیریں دکھائی دیتی ہیں۔ جن کا ایک نمونہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

پیغمبر گرامی اسلام نے فرمایا:

”ان الدرہم یصیبہ الرجل من الربا اعظم عند اللہ فی الخطیئۃ من

سنت وثلاثین زنیۃ، یزنیہا الرجل! واربی الربا عرض الرجل المسلم!؛

”وہ درہم جو انسان ربا اور سود کے ذریعہ حاصل کرے، اس کا گناہ خدا کے ہاں چھتیس زناؤں سے

بڑھ کر ہے۔ اور ہر ربا سے بالاتر مسلمان کی آبرو ہے۔“

یہ موازنہ اس بنا پر ہے کہ ”زنا“ خواہ کتنا ہی بُرا ہو، وہ ”حق اللہ“ کا پہلو رکھتا ہے، لیکن سُودِ نخوری، اور اس بدتر غیبت یا کسی اور طریقہ سے اُبردوزی کرنا ”حق الناس“ کا پہلو رکھتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن پیغمبر نے بلند آواز میں خطبہ پڑھا اور بلند آواز میں فرمایا:

”یا معشر من آمن بلسانہ ولم یؤمن بقلبه! لا تغتابوا المسلمین، ولا تتبعوا عوراتہم، فانہ من تتبع عورة اخیه تتبع اللہ عورته، ومن تتبع اللہ عورته یفضحه فی جوف نیتہ!؟“

”اے وہ گروہ جو زبان سے تو ایمان لائے ہو، لیکن دل سے ایمان نہیں لائے، تم مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو، اور ان کے پوشیدہ عیبوں کی جستجو نہ کیا کرو، کیونکہ جو شخص اپنے دینی بھائی کے پوشیدہ امور کی جستجو کرے خدا اس کے اسرار اور رازوں کو فاش کر دیتا ہے، اور اُسے خود اسی کے گھر کے اندر رسوا اور ذلیل کر دیتا ہے“ لے

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے موسیٰ کو وحی کی:

”من مات تائباً من الغیبة فهو احر من یدخل الجنة، و

من مات مصراً علیہا فهو اول من یدخل النار!“

”جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس نے غیبت سے توبہ کر لی ہو تو وہ آخری شخص ہوگا جو جنت میں داخل ہوگا، اور جو اس حالت میں مرے کہ غیبت پر اصرار رکھتا ہو، تو وہ پہلا شخص ہوگا، جو جہنم میں داخل ہوگا“ ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے بھی منقول ہے کہ:

”الغیبة اسرع فی دین الرجل المسلم من الاكله فی جوفه“

غیبت کی تاثیر مسلمان کے دین میں اس کے جسم میں جذام کے اثر سے بھی زیادہ تیز ہے“ لے

یہ تشبیہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ غیبت، جذام کی طرح جو بدن کے گوشت کو کھا جاتا ہے، مُرعت کے ساتھ انسان کے ایمان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ غیبت کے منحرک، حسد، تکبر، بخل، کینہ پروری اور تنگ نظری جیسے قبیح و مذموم صفات ہیں۔ واضح ہو جاتا ہے، کہ غیبت اور اس طرح سے مسلمانوں کی عزت و اُبردوز کو تباہ کرنا، کیوں انسان کے ایمان کو اس طرح سے برباد کر دیتا ہے (غور کیجیے)

لے سابقہ مددک ص ۲۵۲

لے سابقہ مددک ص ۲۵۲

لے اصول کافی جلد ۲ باب الغیبتہ حدیث نمبر ۲۱۰۰۰ بر وزن تائباً ایک قسم کی بیماری ہے جو انسان کے بدن کا گوشت

کھا جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں منابع اسلامی میں بہت زیادہ روایات ہیں اور ہم ایک اور حدیث کو بیان کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔
امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”من روى على مؤمن رواية يريدها شينه، وهادم مسروته،
ليسقط من اعين الناس، اخرجہ اللہ من ولايتہ الی ولايتہ الشيطان، فلا
يقبلہ الشيطان،“

”جو شخص کسی مؤمن کی عیب جوئی اور آبروریزی کے لیے کوئی بات نقل کرے، تاکہ اس کو لوگوں کی نظروں سے گرا
دے تو خدا اس کو اپنی ولایت سے نکال کر شیطان کی ولایت میں داخل کر دیتا ہے، لیکن شیطان بھی اس کو
قبول نہیں کرتا“ لے

یہ تمام تاکیدیں، اور ہلا دینے والی عبارتیں، اس فوق العادہ کی اہمیت کی وجہ سے ہیں، جو اسلام میں مومنین کی آبرو اور ان
کی اجتماعی حیثیت کی حفاظت کے لیے ہے، اور اس مخرب تاثیر کی وجہ سے بھی ہے جو غیبت سے، معاشرت کی دست
آپس کے اعتماد اور دلی تعلقات میں پیدا ہوتی ہے اور اس سے بدتر بات یہ ہے کہ غیبت، اجتماعی سطح پر، کینہ و عداوت، اور
دشمنی و نفاق کی آگ بھڑکانے، اور فحشا و منکر کی اشاعت کا ایک عامل ہے، کیونکہ جس وقت لوگوں کے پوشیدہ عیوب غیبت کے
ذریعہ آشکار ہو جاتے ہیں تو گناہ کی عظمت و اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور اس میں آلودہ ہو جانا آسان ہو جاتا ہے۔

۴۔ غیبت کا مفہوم

”غیبت“۔ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے۔ یہ ہے، کہ کسی شخص کے پیٹھ پیچھے کوئی بات کہیں، البتہ وہ ایسی بات ہو جو
اس کے کسی خاص عیب کو ناش کرے، چاہے وہ عیب جسمانی ہو یا اخلاقی، اس کے اعمال میں ہو یا گفتگو میں، یہاں تک کہ ان
امور میں جو اس سے تعلق ہیں، مثلاً لباس، گھر، بیوی اور اولاد وغیرہ۔

اس بنا پر اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ظاہر و آشکار صفات کو بیان کرے تو وہ غیبت نہیں ہوگی، مگر یہ کہ اس کا مذمت
اور عیب جوئی کا ارادہ ہو، تو اس صورت میں وہ حرام ہے، مثلاً یہ کہ مذمت کے طور پر کہے کہ فلاں شخص نابینا، یا کوتاہ قد، یا کالا، یا کوسہ،
یعنی بے ڈاڑھی مونچھ کا۔

اس طرح سے پوشیدہ عیوب کا ذکر کرنا، چاہے کسی بھی نیت اور ارادہ سے ہو، غیبت اور حرام ہے، اور ظاہر عیوب کا ذکر
اگر مذمت کے لائحے سے ہو تو حرام ہے، چاہے ہم اس کو غیبت کے مفہوم میں داخل سمجھیں یا نہ سمجھیں۔
یہ سب کچھ اس صورت میں ہے، جبکہ یہ صفات واقعتاً اس شخص میں موجود ہوں۔ لیکن اگر ایسی اصلاً اس میں موجود ہی نہ ہو
تو وہ ”ہمت“ کے عنوان میں داخل ہوگی، جس کا گناہ کئی گنا زیادہ شدید اور زیادہ سنگین ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔

”الغیبة ان تقول فی اخیک ما ستره اللہ علیہ، واما الامر الظاہر فیہ،

مثل الحدیة والعجلة، فلا، والبہتان ان تقول ما لیس فیہ،

”غیبت“ یہ ہے کہ تو اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں وہ بات کہے، جسے خدا نے پنہاں رکھا ہے،

لیکن وہ پیر جو ظاہر ہے، مثلاً سخت مزاجی اور جلد بازی تو وہ غیبت میں داخل نہیں ہے، لیکن بہتان یہ ہے کہ تو ایسی چیز کہے کہ جو اس میں موجود نہ ہو۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عام عذر جو بعض لوگ غیبت کے بارے میں پیش کرتے ہیں، سننے کے لائق نہیں ہے۔

مثلاً بعض اوقات غیبت کرنے والا یہ کہتا ہے کہ غیبت نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اس کی صفت ہے، حالانکہ اگر وہ اس کی صفت نہ ہوتی تو پھر تو وہ تمہمت ہوتی نہ کہ غیبت۔

یابا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ تو ایسی بات ہے، جسے میں اس کے سامنے بھی کہتا ہوں، حالانکہ اس کو اس کے سامنے کہنا نہ صرف غیبت کے گناہ میں کوئی کمی نہیں کرتا، بلکہ اس کو ایذا و تکلیف پہنچانے کی بنا پر اس سے بھی زیادہ سنگین گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

۵۔ غیبت کا علاج اور اس سے توبہ

غیبت بہت سے مذموم صفات کے مانند آہستہ آہستہ ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اس طرح سے کہ غیبت کرنے والا اپنے کام سے لذت اٹھانے لگتا ہے اور اس سے کہ ہمیشہ کسی نہ کسی کی آبروریزی کرے، راضی اور خوش ہوتا اور یہ ایک بہت ہی خطرناک اخلاقی مرحلہ ہے۔

یہی وہ موقع ہے جب غیبت کرنے والے کو ہر چیز سے پہلے غیبت کے اندر ذہنی محرکات کا علاج کرنا چاہیے، جو اس کی رُوح کی گہرائیوں میں ہیں اور گناہ پر ابھار رہے ہیں، ایسے محرکات جیسے کہ ”بخل“ و ”حسد“ و ”کینہ پروری“ و ”عداوت“ اور خود کو افضل و بزرگ سمجھنا ہیں۔

اسے چاہیے کہ خود سازی کے طریقے سے اور ان بُرے صفات کے نتائج بد اور ان کے بُرے ثمرات کے بارے میں غور و فکر کرنے سے، اور اسی طرح ریاضت نفس کے طریقے سے، ان آلودگیوں کو اپنے حان و دل سے دھو ڈالے، تاکہ اپنی زبان کو غیبت کی آلودگی سے باز رکھ سکے۔

اس کے بعد توبہ کے مقام میں آئے، اور چونکہ غیبت ”حق الناس“ کا پہلو رکھتی ہے، اگر صاحب غیبت تک سوائی ہو اور اس سے کوئی نئی مشکل پیدا نہ ہوتی ہو، تو اس سے عذر خواہی کرے، چاہے وہ سربستہ شکل میں ہی ہو، مثلاً کہے میں بعض

اوقات نادانی اور بے خبری میں آپ کی غیبت کر بیٹھا ہوں مجھے معاف کر دو، اور اس سے زیادہ تشریح نہ کرے، تاکہ کہیں تازہ فساد کا سبب نہ بن جائے۔

اور اگر طرفِ مقابل تک دسترس نہیں ہے، یا اُسے پہچانتا نہیں ہے، یا وہ فوت ہو گیا ہے، تو اس کے لیے استغفار کرے اور نیک عمل انجام دے، شاید اس کی برکت سے خداوند متعال اس کو بخش دے، اور طرفِ مقابل کو راضی کر لے۔

۶۔ استثنائی مواقع

غیبت کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ قانونِ غیبت میں بھی، ہر دوسرے قانون کی طرح، کچھ باتیں مستثنیٰ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے، کہ بعض اوقات "مشورہ" کے طور پر مثلاً بیوی یا شوہر کے انتخاب میں، یا کسب و کار وغیرہ میں شریک ہونے کے لیے، کوئی شخص کسی سے سوال کرتا ہے، تو مشورت میں امانت کا جو اسلام کا ایک کلمہ قانون ہے۔ تقاضا یہ ہے کہ اگر طرفِ مقابل میں اُسے کوئی عیب معلوم ہو، تو وہ اُسے بتا دے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک مسلمان جاں میں بچھنس جائے، اور اس قسم کی غیبت جو اس قسم کی نیت سے انجام پائے حرام نہیں ہے۔

اسی طرح ایسے ہی دوسرے موقعوں پر، جہاں ایسے اہم مقاصد ہوں، جسے کاموں میں مشورہ کا مقصد ہوتا ہے، یا کسی حق کو ثابت کرنے کے لیے یا ظلم کے خلاف وادرسی کے لیے صورت پذیر ہو۔

البتہ جو شخص علی الاعلان اور آشکارا گناہ کرتا ہے اور اصطلاح کے مطابق "متجاہر بہ فسق" ہے وہ موضوعِ غیبت سے خارج ہے اور اگر کوئی اس کے گناہ کو اس کے پچھلے پیچھے بیان کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ حکم اُسی گناہ کے ساتھ مخصوص ہے جس کے بارے میں وہ متجاہر ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ نہ صرف غیبت کرنا حرام ہے، بلکہ غیبت کا سننا بھی حرام ہے اور غیبت کی مجلس میں حاضر ہونا بھی حرام کاموں میں سے ہے، بلکہ کچھ روایات کے مطابق تو مسلمانوں پر غیبت کا رد کرنا واجب ہے، یعنی غیبت کے مقابلہ میں دفاع کے لیے کھڑے ہوں، اور اس مسلمان بھائی کا جس کی حیثیت و شخصیت خطرے میں پڑ گئی ہے، دفاع کریں، اور کتنا زریا اور خوبصورت ہوگا وہ معاشرہ، جس میں یہ اخلاقی اصول دقیقاً اجراء ہوں۔

۱۳- يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

ترجمہ

۱۳- اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہارے قبیلے اور کنبے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، لیکن تم میں سے زیادہ محترم و گرامی خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے اور خدا علیم و خبیر ہے۔

تفسیر تقویٰ بہترین انسانی صفت

گذشتہ آیات میں روئے سخن مومنین کی طرف تھا، اور خطاب ”یا ایہا الذین امنوا“ کی صورت میں تھا، اور متعدد آیات کے ضمن میں، وہ باتیں، جو ایک ”مومن معاشرے“ کو خطرے سے دوچار کرتی ہیں، بیان کی ہیں، اور ان سے منع کیا ہے۔

جبکہ زیر بحث آیت میں، سارا انسانی معاشرہ مخاطب ہے اور وہ اہم ترین اصل اور بنیاد، جو نظم و ثبات کی ضمانت ہے، بیان کرتا ہے۔ اور کاذب اور چھوٹی اقدار کے مقابلہ میں حقیقی انسانی اقدار کی میزان کو مشخص کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ ”اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں شعوب و قبائل قرار دیا ہے۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو“ (یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم

شعوباً و قبائل لتعارفوا۔

لوگوں کی ایک مرد اور ایک عورت سے خلقت سے مراد، وہی انسانوں کے انساب کی آدم و حوا کی طرف بازگشت ہے، اس بنا پر چونکہ وہ سب کے سب ایک ہی جڑ سے ہیں، لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ نسب و قبیلہ کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فخر کریں اور اگر خدا نے ہر قبیلہ اور گروہ کے لیے کچھ خصوصیات خلق کی ہیں تو وہ لوگوں کی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کی حفاظت کے لیے ہے، کیونکہ یہ فرق اور تفاوت شناخت اور پہچان کے لیے ہے اور افراد کی پہچان کے بغیر انسانی معاشرے میں کوئی نظم و ضبط قائم نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر وہ سب کے سب یکساں اور ایک دوسرے کے مشابہ اور مانند ہوتے تو سارے انسانی معاشرے کو فتنہ و فساد گھیر لیتا۔

اس بارے میں کہ ”شعوب“ جمع ”شعب“ بروز صعب، لوگوں کے ایک عظیم گروہ کے معنی میں، اور ”قبائل“ جمع ”قبیلہ“ کے درمیان کیا فرق ہے؛ مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں۔

ایک جماعت نے تو یہ کہا ہے کہ ”شعوب“ کا دائرہ ”قبائل“ کے دائرے سے زیادہ وسیع ہے، جیسا کہ موجودہ زمانہ میں ”شعب“ کا ایک ”ملت و قوم“ پر اطلاق ہوتا ہے۔

بعض ”شعوب“ کو ”طوائف عم“ کی طرف اشارہ، اور ”قبائل“ کو ”طوائف عرب“ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ اور آخر میں بعض نے ”شعوب“ کو انسان کے جغرافیائی منطوقوں کی طرف منسوب ہونے کے لحاظ سے، اور ”قبائل“ کو نسل اور خون کی طرف منسوب ہونے سے متعلق سمجھا ہے۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

بہر حال قرآن مجید زمانہ جاہلیت کے بزرگ ترین فخر و مباہات کے سبب، یعنی نسب و قبیلہ پر فخر کو ختم کرنے کے بعد واقعی اور حقیقی انسانی اقدار کے معیار کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ: ”تم میں سے زیادہ محرم و گرامی خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے“ (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم)۔

اس طرح سے تمام ظاہری اور مادی امتیازات پر خطہ بطلان کھینچتے ہوئے بڑائی کی واقعیت و حقیقت کو مسئلہ تقویٰ و پرہیزگاری اور خوفِ خدا میں قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ خدا کے تقرب اور اس کی ساحتِ قدس سے نزدیکی کے لیے کوئی امتیاز سوائے تقویٰ کے مؤثر نہیں ہے۔

اور چونکہ تقویٰ ایک روحانی اور باطنی صفت ہے، جسے سب سے پہلے انسان کے دل و جان میں مستقر ہونا چاہیے اور ممکن ہے کہ اس کے مدعی تو بہت ہوں، مگر اس سے متصف بہت کم ہوں، لہذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے۔ ”خدا علیم و خبیر ہے“ (ان اللہ علیم خبیر)۔

وہ پرہیزگاروں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے، اور ان کے درجہ تقویٰ و خلوص نیت اور ان کی پاکیزگی اور صفائی سے آگاہ ہے ان کو اپنے علم کے مطابق محرم و محترم اور گرامی رکھتا ہے اور اگر وہ پاداش دیتا ہے، جھوٹے دعویداروں کو بھی پہچانتا ہے اور انہیں سزا اور عذاب دیتا ہے۔

نوکتہ

۱۔ سچی اور جھوٹی قدریں

اس میں نوکتہ یہ ہے کہ ہر انسان نظر تاً اس چیز کا خواہاں ہے کہ وہ ایک صاحب قدر و افتخار مہستی قرار پائے، لہذا اسی وجہ سے اقدار کو کسب کرنے کے لیے اپنے پورے وجود کے ساتھ کوشش کرتا ہے۔ لیکن اقدار کے معیار کی سچان تہذیبوں اور تمدنوں کے اختلاف کی وجہ سے کامل طور سے مختلف ہے، اور بعض اوقات جھوٹی قدریں سچی قدروں کی جگہ لے لیتی ہیں۔

کوئی گروہ اپنی واقعی اور حقیقی قدر و قیمت "کسی معروف و معتبر قبیلہ" کے ساتھ انتساب میں سمجھتا ہے، لہذا اپنے قبیلہ اور طائفہ کے مقام کی شان کے لیے ہمیشہ ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے، تاکہ اس کو بڑا اور بزرگ بنانے کے طریقہ سے خود کو اس سے منسوب کرنے کے ذریعہ بڑا کرے۔

خاص طور سے زمانہ جاہلیت کی اقوام کے درمیان النسب و قبائل کے ذریعہ افتخار سب سے زیادہ رائج مہموم افتخار تھا، یہاں تک کہ ہر قبیلہ خود کو "برتر قبیلہ" اور ہر نسل خود کو "والا نزل" سمجھتی تھی، افسوس کی بات یہ ہے کہ کبھی تک اس کی تلخٹ اور بقایا جات بہت سے افراد و اقوام کی روح کی گہرائیوں میں موجود ہیں۔

ایک دوسرا گروہ مال و دولت کے مسئلہ اور کاخ و قصر و قدم و حشم اور ایسی ہی چیزوں کا مالک ہونے کو قدر و قیمت کی نشانی سمجھتا ہے، اور ہمیشہ اسی کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے، جبکہ ایک اور جماعت اجتماعی اور سیاسی بلند مقامات کو شخصیت کا معیار سمجھتی ہے۔

اور اس طرح سے ہر گروہ اپنے مخصوص راستے پر قدم اٹھاتا ہے۔ اور کسی ایک خاص قدر و منزلت سے اپنا دل باندھتا ہے اور اسی کو معیار سمجھتا ہے۔

لیکن چونکہ یہ سب امور، ایسے منزلت اور ذات سے خارج اور مادی اور طبعی گزر جانے والے امور ہیں، اسلام جیسا ایک آسمانی دین ہرگز ان کی موافقت نہیں کر سکتا، لہذا ان سب پر خط بطلان کھینچتے ہوئے، انسان کی واقعی اور حقیقی قدر و قیمت کو اس کی ذاتی صفات، خصوصاً تقویٰ و پرہیزگاری ایفائے عہد اور پاکیزگی میں شمار کرتا ہے، یہاں تک کہ علم و دانش جیسے اہم موضوعات کے لیے بھی۔ اگر وہ ایمان و تقویٰ اور اخلاقی قدروں کی راہ میں کام نہ آئیں۔ کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ قرآن ایک ایسے ماحول میں ظاہر ہوا، جہاں قبیلہ کی قدر و قیمت تمام قدروں سے زیادہ اہم شمار ہوتی تھی، لیکن یہ خود ساختہ بہت بڑے ٹوٹے پھوٹے گیا اور انسانوں کو "خون" و "قبیلہ" و "زنگ" و "نژاد" (نسل) و

”مال“ و ”مقام“ اور مال و دولت کی قید سے آزاد کر دیا، اور اسے اپنے آپ کو پانے کے لیے اس کی جان و روح کے اندر اور اس کی بلند صفات میں رہبری کی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اُن شانِ ہائے نزول میں، جو اس آیت کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ ایسے نکات دکھائی دیتے ہیں جو اس دستورِ الہی کی گہرائی کی حکایت کرتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

فتح مکہ کے بعد پیغمبر نے حکم دیا کہ اذان کہیں ”بلال“ نے خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان کہی تو ”عتاب بن اسید“ نے جو آزاد کیے گئے لوگوں میں سے تھا، کہا، میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میرا باپ دُنیا سے رخصت ہو گیا اور اس نے یہ دن نہ دیکھا اور ”حارث بن ہشام“ نے بھی کہا: کیا رسول اللہ کو اس ”کائے کوئے“ کے علاوہ اور کوئی نہیں ملا؟! تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور حقیقی اور واقعی قدر و قیمت کا معیار بیان ہوا، لہ

بعض دوسرے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر نے یہ حکم دیا تھا کہ بعض ”موالی“ کو لوگ بیٹی کا رشتہ دیں۔ (موالی آزاد شدہ غلاموں یا غیر عرب کو کہتے ہیں) تو ان لوگوں نے تعجب کیا اور کہا اے رسول اللہ! خدا، کیا آپ یہ حکم دیتے ہیں کہ ہم اپنی بیٹیاں موالی کو دیں؟! تو یہ آیت نازل ہوئی اور ان بے ہودہ انکار پر خط بطلان کھینچا گیا ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ ایک دن پیغمبر نے مکہ میں لوگوں کے لیے خطبہ پڑھا اور فرمایا:

”یا ایہا الناس ات الله قد اذہب عنکم عیبة الجاہلیة، و تعالٰیہا
 با بائعہا، فالناس رجلاں، رجل برقی کریم علی اللہ، و فاجر شقی
 ہین علی اللہ، و الناس بنوا آدم، و خلق اللہ آدم من تراب، قال اللہ تعالیٰ: یا
 ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی و جعلناکم شعوبا و قبائل
 لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ان اللہ علیہم خیر:

اے لوگو! خدا نے جاہلیت کے ننگ و غیب اور آباؤ اجداد اور بزرگوں پر غرور و مہمات کرنے کو ختم کر دیا ہے، لوگوں کے صرف دو گروہ ہیں، نیکو کار صاحبِ تقویٰ اور خدا کے ہاں قدر و قیمت رکھنے والے یا بدکار و شقی اور بارگاہِ خداوندی میں پست و حقیر کے سب لوگ آدم کی اولاد ہیں، اور خدا نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں اس لیے شعوب و قبائل قرار دیا ہے، تاکہ تمہاری پہچان ہو سکے، خدا کے نزدیک زیادہ مکرم و گرامی وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اور خدا دانا اور آگاہ ہے۔“

لے ”روح البیان“ جلد ۹ ص ۹۰۔ تفسیر قرطبی میں بھی یہی شانِ نزول بیان کی گئی ہے جلد ۹ ص ۶۱۰۔

لے سابقہ مد رک۔

لے ”تفسیر قرطبی“ جلد ۹ ص ۶۱۱۔

کتاب "آداب النفوس" طبری میں آیا ہے کہ پیغمبر نے ایام تشریق کے دوران (جو ذی الحجہ کے ۱۱-۱۲ اور ۱۳ کے دن ہیں) سرزمین منیٰ میں، جبکہ آپ ایک اونٹ پر سوار تھے، لوگوں کی طرف رخ کر کے فرمایا:

"يا ايها الناس! الا ان ربكم واحد وان اباكم واحد، الا لا فضل لعربي على عجمي ولا بعجمي على عربي، ولا سود على احمر ولا لاحمر على اسود، الا بتقوى الاهل بلغت؟ قالوا نعم! قال ليلغ الشاهد الغائب"

اے لوگو! جان لو کہ تمہارا خدا ایک ہے، تمہارا باپ بھی ایک ہے نہ تو عرب کو عجم پر کوئی برتری ہے، اور نہ ہی عجم کو عرب پر، نہ کسی کا لے کو کسی گورے پر اور نہ ہی کسی گورے کو کسی کالے پر، مگر تقویٰ اور پرہیز گاری کے ساتھ کیا میں نے خدا کا حکم تمہیں پہنچا دیا ہے؟ سب نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: یہ بات حاضرین غائبین تک پہنچادیں۔ ۱۷

ایک اور دوسری حدیث میں بھی مختصر اور پر معنی جملوں میں آنحضرت سے یہ منقول ہوا ہے:

"ان الله لا ينظر الى اجسامكم، ولا الى انسابكم، ولا الى اجسامكم، ولا الى اموالكم ولكن ينظر الى قلوبكم، فمن كان له قلب صالح تحن الله عليه، وانما انتم بنو آدم واحبكم اليه اقلكم"

"خدا تمہارے گھرانے اور نسب کی وضع و کیفیت کو نہیں دیکھتا، نہ تمہارے جسموں کی طرف نہ تمہارے مال و متال کی طرف، لیکن وہ تو تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے، جو شخص صالح اور نیک دل رکھتا ہے تو خدا اس پر لطف و محبت کرتا ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محبوب وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔ ۱۸

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان وسیع بکثرت اور پُر بار تعلیمات کے باوجود اب بھی مسلمانوں کے درمیان کچھ لوگ "نسل" و "خون" اور "زبان" کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کی وحدت کو اخوت اسلامی اور وحدت دینی پر مقدم سمجھتے ہیں اور انہوں نے زمانہ جاہلیت کی عصبيت کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ اور اگرچہ ان پر اس راستے میں سخت مصائب اٹھانے پڑے ہیں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ بیدار ہونا ہی نہیں چاہتے اور نہ ہی اسلام کے حکم کی طرف لوٹنا

۱۷ مد رک سابق صفحہ ۱۰۶۲، اس روایت میں "امر کی تعبیر شرح جلد کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ گندم گوں کے معنی میں ہے، کیونکہ زیادہ تر لوگ اس ماحول میں اسی قسم کے تھے، اتفاقاً لفظ "احمر" روایات میں خود گندم پر بھی اطلاق ہوا ہے۔

چاہتے ہیں خداوند عالم سب لوگوں کو جاہلیت کے تعصبات کے شر سے محفوظ رکھے۔

اسلام نے ”جاہلیت کی عصیت“ سے۔ جو جس شکل و صورت میں ہو۔ مبارزہ کیا ہے۔ تاکہ پورے عالم کے مسلمانوں کو چاہے وہ جس نسل و قوم و قبیلہ سے ہوں ایک پرچم کے نیچے جمع کرے، نہ کہ قومیت و نسل کے پرچم تلے اور نہ ہی کسی دوسرے پرچم کے نیچے، کیونکہ اسلام ہرگز اس قسم کے تنگ محدود نظریات کو قبول نہیں کرتا اور ان سب کو موہوم اور بے بنیاد شمار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر نے جاہلیت کی عصیت کے بارے میں فرمایا:

”دعوها فانها منتنه“

”اسے چھوڑ دو، یہ بدبودار اور متعفن چیز ہے“۔

لیکن اس متعفن اور بدبودار فکر کو بہت سے ایسے لوگ جو ظاہراً اپنے آپ کو مسلمان شمار کرتے ہیں، اور قرآن اور اخوت اسلامی کا دم بھرتے ہیں، اب تک گلے کیوں لگائے ہوئے ہیں؟ کیا انھیں معلوم نہیں ہے!

کتنا زیبا اور خوبصورت ہوگا وہ معاشرہ جو اسلامی قدروں کے معیار ”ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم“ کی بنیاد پر تعمیر ہوگا، اور نسل، مال، دولت، اور جغرافیائی منطقتوں اور طبقوں کی جھوٹی قدریں ختم ہو جائیں گی، ہاں! تقوائے الہی، اندرونی مسئولیت کا احساس، خواہشات کے مقابلہ میں قیام، اور راستی و درستی، پاکی و حق و عدالت کا پابند ہونا، صرف یہی چیزیں انسانی قدروں کا معیار ہیں۔ نہ کہ ان کی غیر اگرچہ چہرہ معاشروں کے پریشان حال بازار میں یہ اصل قدریں بھلا دی گئی ہیں اور جھوٹی قدروں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔

زمانہ جاہلیت کی قدروں کے نظام میں، جو آباد اجداد، مال و دولت اور اولاد پر فخر کرنے کے محور پر چکر لگاتا تھا، ایک مسطحی بھر چور اور ڈاکو پرورش پاتے تھے، لیکن اس نظام کے بدل جانے سے اور ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کی بلند و بالا اصل کے احیاء سے، مسلمان و ابو ذر و عمر یا سر و مقدار جیسے انسان حاصل ہوئے۔

انسانی معاشروں کے انقلاب میں اہم چیز ان کی قدروں کے نظام کا انقلاب ہے اور اس اصل اصیل اسلامی کا احیاء ہے۔ ہم اس گفتگو کو پیغمبر گرامی اسلام کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ جس میں آپ نے فرمایا:

کلکم بنو آدم، و آدم خلق من تراب، و لئن تمہین قوم یفخرون بآبائہم او لیکونن اہون علی اللہ من الجعلان،

”تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، آباد اجداد کے ذریعہ ایک دوسرے پر فخر کرنے سے پرہیز کرو، ورنہ تم خدا کے نزدیک ان حشرات اور کیڑے مکوڑوں سے، جو گندگی میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، زیادہ حقیر اور لپٹ ہو جاؤ گے“۔

۲۔ تقویٰ کی حقیقت

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآن نے تقویٰ کو عظیم ترین امتیاز قرار دیا ہے اور صرف اسی کو انسانوں کی قدر و منزلت کے ناپنے کا معیار سمجھا ہے۔

ایک دوسری جگہ تقویٰ کو بہترین زادراہ اور توشہ شمار کیا ہے اور کہتا ہے ”وَسَرُّودَا فَا ن خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی“

(بقرہ - ۱۹۷)

ایک اور جگہ تقویٰ کے لباس کو انسان کے لیے بہترین لباس شمار کرتا ہے: ”وَلِبَاسِ التَّقْوٰی ذٰلِكَ خَیْرٌ“

(اعراف - ۲۶)

متحد آیات ہیں، انبیاء کی دعوت کے ابتدائی اصولوں میں سے ایک کو ”تقویٰ“ کہا ہے، اور آخریں ایک اور جگہ اس موضوع کی اہمیت کو اس حد تک اوپر لے گیا ہے کہ خدا کو ”اصل تقویٰ“ شمار کرتے ہوئے کہتا ہے: ”هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰی وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ“ (مدثر - ۵۶)

قرآن تقویٰ کو نور الہی سمجھتا ہے کہ جہاں وہ راسخ ہو جائے علم و دانش کی تخلیق کرتا ہے: ”وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ یَعْلَمْ کَمَا اللّٰهُ“

(بقرہ - ۲۸۲)

اور ”نیکی“ و ”تقویٰ“ کو ایک دوسرے کا قرین شمار کرتا ہے: ”وَتَعَاوَنُوا عَلٰی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی“ (مائتہ - ۲)

اور عدالت کو تقویٰ کا قرین کہتا ہے: ”اَعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی“ (مائتہ - ۸)

اب دیکھنا یہ چاہیے کہ اس عظیم معنوی سرمایے اور اس عظیم ترین انسانی امتیاز یعنی تقویٰ کی ان تمام امتیازات کے ساتھ حقیقت کیا ہے؟

قرآن نے کچھ ایسے اشارے بیان کیے ہیں جو تقویٰ کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں، متحد آیات میں ”تقویٰ“ کی جگہ ”قلب“ کو شمار کیا ہے، ان میں ایک جگہ کہتا ہے:

”اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلٰكِنْ قُلُوْبُهُمْ لِلتَّقْوٰی“ وہ لوگ جو رسول خدا کے سامنے اپنی آوازیں دھبی رکھتے

ہیں اور ادب کی رعایت کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جن کے دلوں کا تقویٰ کے قبول کرنے کے لیے خدا نے امتحان لے لیا ہے۔

(حجرات - ۳)

قرآن نے ”تقویٰ کو“ ”فجور“ کا مقابل قرار دیا ہے جیسا کہ سورہ شمس کی آیت ۸ میں بیان ہوا: ”فَالْهٰمِ هَآفِجٍ وَّ جُوْرٍ هَآوٍ“

تقواہا؟ خدا نے انسان کو پیدایا، اور اس کو فجور اور تقویٰ کی راہ دکھادی۔

قرآن ہر اس عمل کو، جس نے رُوحِ اِخْلَاصِ وَ اٰیْمَانِ یعنی نیک و پاکیزہ نیت سے سرچشمہ حاصل کیا ہو، تقویٰ کی بنیاد پر شمار

کرتا ہے جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت ۱۰۸ میں مسجد ”قبا“ کے بارے میں جس کے مقابلہ میں مسجد ضرار بنائی گئی تھی۔ فرماتا ہے:

”لِلْمَسْجِدِ الَّذِیْ عَلٰی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ یَّقُومَ فِیْهِ“ ”وہ مسجد جو پہلے دن سے ہی تقویٰ کی بنیاد

پر بنی ہے، زیادہ سچی رکھتی ہے کہ تو اسی میں نماز پڑھے،

ان آیات کے مجموعہ سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ”تقویٰ“ وہی مسؤلیت اور ذمہ داری کا احساس ہے، جو دل میں ایمان کے راسخ ہو جانے کے بعد انسانی وجود پر حکومت کرتا ہے اور اس کو ”منق و فخر“ اور گناہ سے باز رکھتا ہے اور نیکی و پاکی و عدالت کی طرف دعوت دیتا ہے، انسان کے اعمال کو خالص اور اس کی فکر و نیت کو آلودگیوں سے صاف کرتا ہے۔

جب ہم اس لفظ کی لغوی اصل و بنیاد کی طرف لوٹتے ہیں، تو پھر بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کیونکہ ”تقویٰ“ ”وقایہ“ سے کسی چیز کی حفاظت و نگہداری میں کوشش کرنے کے معنی میں ہے اور اس قسم کے مواقع پر مراد، رنج و جان کی ہرقسم کی آلودگی سے حفاظت اور ایسے امور میں جن میں خذکی رصنا ہو اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر لانا ہے۔

بعض بزرگوں نے تقویٰ کے لیے تین مراحل بیان کیے۔

۱- صحیح اعتقادات کی تحصیل کے ذریعہ عذابِ جاودانی سے نفس کو محفوظ رکھنا۔

۲- ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرنا چاہیے وہ ترک واجب ہو یا فعل محصیت۔

۳- اپنے آپ کو ہر اس چیز سے بچانا جو انسان کے دل کو اپنی طرف مشغول رکھتی ہے، اور سچی سے منحرف کرتی ہے، اور یہ خواص بلکہ خاص الخاص لوگوں کا تقویٰ ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے (بیج البلاغہ) میں تقویٰ کے سلسلہ میں کئی منہ بولتی اور زندہ تعبیریں بیان فرمائی ہیں۔ اور تقویٰ ان مسائل میں سے ہے جس میں حضرت کے بہت سے خطبوں، خطوط اور کلمات قصار میں تکیہ ہوا ہے۔ ایک جگہ تقویٰ کا گناہ اور آلودگی سے موازنہ کرتے ہوئے اس طرح فرماتے ہیں:

”الا وان الخطایا خیل شمس حمل علیہا اہلہا، و خلعت لجنہا، فتحت بہم فی النار! الا وان التقوی مطایا دلت علیہا اہلہا، و اعطوا ازمتہا، فاوردتہم الجنة!“

”جان کو کہ گناہ سرکش سواروں کے مانند ہیں، جن پر گنہگار سوار ہوتے ہیں اور جن کی لگامیں ٹوٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور وہ ان کو تعز جنم میں لے جا کر سر کے بل پٹک دیتی ہیں لیکن تقویٰ ایسی آرام دہ اور سبک رفتار سواری ہے جس کے مالک ان پر سوار ہوتے ہیں، تو ان کی لگامیں ہاتھ میں لیے ہوتے ہیں، اور وہ انہیں بہشت کے وسط میں لے جا کر داخل کر دیتی ہے“

اس لطیف تشبیہ کے مطابق، تقویٰ وہی اپنے آپ کو بچائے، نفس پر کنٹرول کرنے، اور شہوات پر تسلط کی حالت ہے۔ دھالیکہ تقویٰ کا نہ ہونا، سرکش شہوات کے مقابلہ میں سر تسلیم خم ہونا، اور ان پر ہرقسم کے کنٹرول کا ختم ہو جانا ہے۔ ایک اور دوسری جگہ فرماتے ہیں،

”اعلموا عباد الله ان التقوى دار حصن عزيز، والفجور دار حصن ذليل، لا يمنع اهلہ، ولا يحرز من لجأ اليه، الا وبالتقوى تقطع حماة الخطايا“

”اے بندگانِ خدا، جان لو کہ تقویٰ ایک مستحکم اور شکست ناپذیر قلعہ ہے، لیکن فسق و فجور اور گناہ ایک کمزور اور بے دفاع حصہ ہے، جو اپنے اہل کو آفات و بلیات سے نجات نہیں دیتا، اور جو شخص اس کی پناہ لے گا وہ امان میں نہیں ہے۔ جان لو کہ انسان صرف تقویٰ کے ذریعہ ہی گناہ کی گوند سے بچ سکتا ہے“

ایک اور مقام پر مزید فرماتے ہیں۔

”فاغتصموا بتقوى الله فان لها حبلاً وثيقاً عروته ومعقلاً منيعاً ذرورته“

”تقویٰ الہی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو کیونکہ وہ ایک محکم رشتہ اور عروۃ الوثقیٰ ہے، اور ایک قابلِ اطمینان پناہ گاہ ہے۔“

ان تعبیرات کے مجموعہ سے تقویٰ کی حقیقت اور رُوح اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

یہ نکتہ بھی یاد آوری کے لائق ہے کہ تقویٰ ایمان کے درخت کا پھل ہے، اور اسی بنا پر اس عظیم سرمائے کو حاصل کرنے کے لیے ایمان کی بنیادوں کو محکم بنانا چاہیے۔

البتہ العامت پر عمل درآمد اور گناہ سے پرہیز اور اخلاق پر درگرا مولیٰ پر توجہ تقویٰ کو نفس میں راسخ کرتی ہے اور اس کا نتیجہ انسان کی رُوح اور جان میں نورِ یقین اور ایمان شہودی کا پیدا ہونا ہے اور نورِ تقویٰ جتنا بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی نورِ یقین بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے، لہذا ہم اسلامی روایات میں دیکھتے ہیں کہ ”تقویٰ“ کو ”ایمان“ سے ایک درجہ بلند، اور ”یقین“ سے ایک درجہ نیچے شمار کیا جاتا ہے۔

امام علی بن موسیٰ رضا فرماتے ہیں:

”الایمان فوق الاسلام بدرجة، والتقوى فوق الايمان بدرجة، والیقین

فوق التقوى بدرجة، وما قسم في الناس شيء اقل من اليقين“

”ایمان اسلام سے ایک درجہ بلند ہے، اور تقویٰ ایمان سے ایک درجہ اُوچا ہے اور یقین تقویٰ سے ایک درجہ اُوچا ہے اور لوگوں کے درمیان کوئی چیز ”یقین“ جتنی کم تقسیم نہیں ہوتی“

۱۔ نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۱۵۷۔

۲۔ نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۱۹۰۔

۳۔ بحار الانوار، جلد ۷، ص ۱۳۶۔

ہم اس بحث کو ان معروف اشارے کے ساتھ، جو تقویٰ کی حقیقت کو ایک مثال کے ضمن میں واضح کرتے ہیں۔ ختم کرتے ہیں۔

خصل الذنوب صغیرها وکبیرها فہو التقوی
واصنع کما شق فوقہ ض الشوک یحذر ما یری
لا تخقرن صغیرہ ان الجبال من الحصى

” تمام چھوٹے بڑے گناہوں کو چھوڑ دے، بس تقویٰ یہی ہے۔“

” اور اس شخص کی مانند ہو جا، جو کسی غار زار زمین سے گزر رہا ہے، اور اپنے لباس اور دامن کو اس طرح سمیٹتا ہے

کہ کہیں اس میں کاٹھانہ بچھو جائے، اور ہمیشہ اپنے اطراف پر نظر رکھتا ہے۔“

” ہرگز کسی گناہ کو چھوٹا نہ سمجھنا، کیونکہ بڑے بڑے پہاڑ چھوٹی چھوٹی کسکیوں سے مل کر ہی بنتے ہیں۔“

۱۴۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا
يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا
يَلْسِكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ رَحِيمٌ ○

۱۵۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ
يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ○

ترجمہ

۱۴۔ بادیہ نشیں عربوں نے کہا، ہم ایمان لائے ہیں، کہہ دے! تم ایمان نہیں لائے ہو
لیکن تم یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے، اور ابھی تک ایمان تو تمھارے دلوں میں داخل ہی نہیں
ہوا، اگر تم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو وہ تمھارے اعمال کی پوری پوری
جزا دے گا، بیشک خدا غفور و رحیم ہے۔

۱۵۔ واقعی مومن تو صرف وہی لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور پھر انہوں
نے کبھی شک نہیں کیا اور اپنی جان اور مالوں کے ساتھ انھوں نے راہِ خدا میں جہاد کیا ہے اور
وہی سچے ہیں۔

شان نزول

بہت سے مفسرین نے اس آیت کے لیے ایک شان نزول بیان کی ہے، جس کا خلاصہ اس طرح ہے،

قبیلہ بنی اسد کا ایک گروہ، قحط اور خشک سالی کے ایک سال میں، مدینہ میں وارد ہوا، اور انہوں نے پیغمبر سے کچھ مدد حاصل کرنے کے لیے زبان پر شہادتیں جاری کیں، اور پیغمبر سے کہا کہ عرب کے دوسرے قبائل نے سوار یوں پر سوار ہو کر آپ سے جنگ کی لیکن ہم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آپ کے پاس آئے ہیں اور ہم نے آپ سے کوئی جنگ نہیں کی، دراصل وہ اس طریقہ سے یہ چاہتے تھے کہ پیغمبر پر احسان جتلائیں، اس وقت اُپر والی آیات نازل ہوئیں، (اور انہیں بتایا کہ ان کا اسلام ظاہری ہے اور ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں ہے، علاوہ ازیں اگر وہ ایمان لائے بھی ہیں، تو اس سے پیغمبر پر کوئی منت اور احسان نہیں رکھنا چاہیے بلکہ خدا نے ان پر احسان کیا ہے کہ انہیں ہدایت کی ہے) ۱۔

لیکن اس شانِ نزول کا وجود۔ دوسرے تمام مواقع کی طرح۔ آیت کے مفہوم کی عمومیت سے ہرگز مانع نہیں ہے۔

تفسیر

”اسلام“ اور ”ایمان“ کا فرق

گذشتہ آیات میں انسانوں کی تدر و قیمت کے معیار یعنی تقویٰ کے بارے میں گفت گو تھی، اور چونکہ ”تقویٰ“ ایمان کے درخت کا پھل ہے، وہ بھی وہ ایمان جو دل و جان کی گہرائیوں میں نفوذ کرے، لہذا زیر بحث آیات میں ”ایمان“ کی حقیقت کو پیش کرتے ہوئے اس طرح بیان ہوا۔

بادنیشین اعراب نے کہا: ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دے: تم ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں، لیکن ایمان تو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا ہے، (قالت الاعراب امتا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم)۔

اس آیت کے مطابق ”اسلام“ اور ”ایمان“ میں فرق یہ ہے، کہ ”اسلام“ ایک ظاہری قانونی شکل رکھتا ہے۔ اور جو شخص زبان پر شہادتیں جاری کرتا ہے، مسلمانوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے، اور اس پر اسلام کے احکام جاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایمان ایک واقعی اور باطنی امر ہے، اور اس کی جگہ انسان کا دل ہے، نہ کہ اس کی زبان اور اس کا ظاہر۔ ممکن ہے ”اسلام“ کے مختلف محرکات ہوں، یہاں تک کہ مادی محرکات اور شخصی منافع، لیکن ”ایمان“ حتمی طور پر معنوی محرکات سے علم و آگاہی سے غذا حاصل کرتا ہے، اور وہی ہے کہ جس کی شانوں پر تقویٰ کا حیات بخش پھل ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ایک واضح اور ناطق عبارت میں منقول ہوئی ہے،

الاسلام علانیة، والایمان فی القلب؛

”اسلام ایک آشکار اور ظاہری چیز ہے، لیکن ایمان کی جگہ دل ہے“ ۱۔

۱۔ ”تفسیر المیزان“ و ”روح البیان“ اور ”فی ضلال“ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۲۔ ”معجم البیان“ جلد ۹ صفحہ ۱۳۸۔

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے۔

”الاسلام یحقن بہ الدم وتؤدی بہ الامانۃ، وتتحل بہ الفروج،
والثواب علی الایمان۔“

”اسلام کے ساتھ انسان کا خون محفوظ، اس کی امانت کا ادا کرنا ضروری، اور اس سے شادی بیاہ حلال ہوتا ہے۔
لیکن ثواب ایمان پر ملتا ہے۔“

نیز اسی دلیل کی بنا پر بعض روایات میں اسلام کا مفہوم اقرار لفظی میں منحصر سمجھا گیا ہے، جبکہ ایمان کا عمل کے ساتھ اقرار کی صورت
میں تعارف کرایا گیا ہے: (الایمان اقرار وعمل، والاسلام اقرار بلا عمل، لہ
یہی معنی ایک دوسری تعبیر میں ”اسلام وایمان“ کی بحث میں بیان ہوئے ہیں۔“ ”فضیل بن یسار“ کہتا ہے کہ میں نے امام
صادقؑ سے سنا ہے، آپ نے فرمایا۔

”ان الایمان یشارک الاسلام، ولا یشارکہ الاسلام، ان الایمان ما وقر

فی القلوب، والاسلام ما علیہ المناکح والمواہب وحقن الدماء،

”ایمان تو اسلام کے ساتھ شریک ہے، لیکن اسلام ایمان کے ساتھ شریک نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں

ہر مومن مسلمان ہے، لیکن ہر مسلمان مومن نہیں ہے، ایمان وہ ہے جو دل میں ساکن ہو، لیکن اسلام ایک ایسی چیز

ہے جس کے مطابق نکاح، میراث اور خون کی حفاظت کے قوانین جاری ہوتے ہیں۔“

لیکن مفہوم کا یہ فرق اس صورت میں ہے جب یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے مقابلہ میں قرار پائیں، لیکن جب الگ

الگ بیان کیے جائیں، تو ممکن ہے کہ اسلام اسی چیز پر بولا جائے، جس پر ایمان کا اطلاق ہوتا ہے، یعنی دونوں الفاظ ایک ہی معنی میں
استعمال ہوتے ہیں۔

اس کے بعد زیر بحث آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے، ”اگر تم خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں تمہارے

اعمال کا ثواب کامل طور پر عطا کرے گا اور تمہارے اعمال کی جزا میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، (وان تطیعوا اللہ ورسولہ

لا یتکم من اعمالکم شیئاً)۔

”کیونکہ خدا غفور ورحیم ہے“ (ان اللہ غفور رحیم)۔

”لا یتکم“ ”لیت“ (بروزن ریب) کے مادہ سے حق کو کم کرنے کے معنی میں ہے۔“

۱۔ ”کافی“ جلد ۲ ”باب ان الاسلام یحقن بہ الدم“ حدیث ۲۶۱۔

۲۔ ”کافی“ جلد ۲ ”باب ان الاسلام یحقن بہ الدم“ حدیث ۲۶۱۔

۳۔ اصل کافی جلد ۲ ”باب ان الایمان یشارک الاسلام“ حدیث ۳۔

۴۔ اس بنا پر مذکورہ فعل اجوف یائی ہے، اگر ”ولت“ (مخال وواوی) کا مادہ بھی اسی معنی میں آتا ہے۔

آخری جملے حقیقت میں ایک مسلم قرآنی اصل کی طرف اشارہ ہیں، کہ اعمال کے قبول ہونے کی شرط "ایمان" ہے، کہتا ہے، اگر تم خدا اور رسول پر قلبی ایمان رکھتے ہو، جس کی نشانی خدا اور اس کے رسول کے فرمان کی اطاعت ہے تو تمہارے اعمال کی قدر کی جائے گی، اور خدا تمہاری چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی قبول کرے گا، اور ان کا اجر دے گا، یہاں تک کہ اس ایمان کی برکت سے وہ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے۔

اور چونکہ اس امر باطنی یعنی ایمان کا حصول کوئی آسان کام نہیں ہے، لہذا بعد والی آیت میں اس کی نشانیاں پیش کرتا ہے، الہی نشانیاں جو مومن کو، مسلم سے، اور پچھے کو جھوٹے سے، اور پیغمبر کی دعوت کو عاشقانہ طور پر قبول کرنے والوں کو، جان کی حفاظت یا مال دینا حصول کی خاطر ایمان کا اظہار کرنے والوں سے، اچھی طرح سے جدا کر دیتی ہیں، فرماتا ہے:

"واقعی مومنین وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں، اس کے بعد انہوں نے کبھی کوئی شک شبہ نہیں کیا اور اپنے اموال اور نفسوں کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کیا ہے" (اتما المؤمنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاهدوا باموالہم وانفسہم فی سبیل اللہ)۔

ہاں! ایمان کی سب سے پہلی نشانی، اسلام کی راہ میں شک شبہ اور دودلی نہ کرنا ہے، دوسری نشانی اموال کے ساتھ جہاد کرنا، اور تیسری نشانی جو سب سے زیادہ افضل ہے دربر ہے، نفسوں (جانوں) کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔ اس طرح اسلام نے واضح ترین نشانیاں بیان کر دی ہیں، قیام و ثبات قدم، اور شک و تردید ایک طرف سے، اور مال و جان کی قربانی دوسری طرف سے۔

کیسے ممکن ہے کہ ایمان دل میں راسخ نہ ہو، جبکہ انسان محبوب کی راہ میں مال و جان کے خرچ کرنے سے مضائقہ نہیں کرتا۔ لہذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے، "اسی قسم کے لوگ راست گو ہیں، اور ایمان کی روح ان کے وجود میں موجزن ہے" (اولئک ہم الصادقون)۔

اس معیار کو، جسے قرآن نے "پچھے مومنین" اور "اسلام کا اظہار کرنے والے" جھوٹوں کی شناخت کے لیے بیان کیا ہے، قبیلہ "بنی اسد" کے فقرا میں منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ہر زمانہ کے لیے واقعی مومنین کو جھوٹے دعویداروں سے جدا کرنے کے لیے، اور ان لوگوں کے دعوؤں کی قدر و قیمت کی نشاندہی کرنے کے لیے، جو ہر جگہ اسلام کا دم بھرتے ہیں، اور اپنے آپ کو پیغمبر کا طلب گار سمجھتے ہیں، لیکن ان کے عمل میں معمولی سے معمولی نشانی بھی ایمان و اسلام کی نظر نہیں آتی۔

ان کے مقابلہ میں ایسے لوگ ہیں جو نہ صرف کوئی دعویٰ نہیں رکھتے، بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو کم تر شمار کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایثار و قربانی کے میدان میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

اور اگر ہم اس قرآنی معیار کو واقعی مومنین کی جانچ کے لیے استعمال کریں تو معلوم نہیں لاکھوں کروڑوں مدعیان اسلام کے لہوؤں کے درمیان میں سے کس قدر واقعی مومن نکلیں، اور کس قدر ظاہری مسلمان؟!۔

- ۱۶۔ قُلْ أَتَعْلَمُونَ اللّٰهَ بِدِينِكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝
- ۱۷۔ يَمْشُوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ط قُلْ لَا تَمْنُوْا عَلٰى اِسْلَامِكُمْ بِلِ اللّٰهِ
يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هٰدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝
- ۱۸۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاللّٰهُ بِصٰمِرٍ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

- ۱۶۔ کہہ دے کیا تم خدا کو اپنے ایمان سے باخبر کر رہے ہو، حالانکہ وہ ان تمام چیزوں کو، جو آسمانوں اور زمین میں ہیں جانتا ہے، اور خدا ہر چیز سے آگاہ ہے۔
- ۱۷۔ وہ تجھ پر یہ احسان بتا رہے ہیں، کہ وہ اسلام لے آئے ہیں کہہ دے، تم اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ محبت لاؤ، بلکہ یہ تو خدا نے تم پر احسان کیا ہے کہ تمہیں ایمان کی طرف ہدایت کی ہے، اگر تم ایمان کے دعوے میں سچے ہو۔
- ۱۸۔ خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے، اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو، اس کو بھی دیکھ رہا ہے۔

شان نزول

مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ گزشتہ آیات کے نزول کے بعد بدر عربوں کا ایک گروہ پیغمبر کی خدمت میں آیا اور

قسم کھا کر کہنے لگے کہ وہ ایمان کے دعوے میں پستے ہیں، اور ان کا ظاہر و باطن ایک ہے، اس پر پہلی زیر بحث آیت نازل ہوئی اور انہیں آگاہ کیا کہ قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے خدا سب کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے، لہ

تفسیر

مسلمان ہونے کا احسانِ ممت جباراً

گذشتہ آیات میں پستے مسلمانوں کی نشانیاں بیان ہوئی تھیں۔ اور جیسا کہ شانِ نزول میں بیان ہوا ہے۔ اسلام کا دعویٰ رکھنے والی جماعت کا اصرار یہ تھا کہ ایمان کی حقیقت ان کے دل میں مستقر ہے۔ قرآن ان کے لیے بھی اور ان تمام افراد کے لیے بھی جو ان ہی جیسے ہیں یہ اعلان کر رہا ہے، کہ اصرار کرنے اور قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ "ایمان" و "کفر" کے مسئلہ میں تمھارا خدا کے ساتھ واسطہ ہے جو ہر چیز سے باخبر ہے، خصوصاً اس آیت میں عتابِ آمیز لہجہ میں کہتا ہے، "ان سے کہہ دے، کیا تم خدا کو اپنے ایمان سے باخبر کرنا چاہتے ہو، وہ ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، جانتا ہے" (قل اتعلمون اللہ بدینکم واللہ یعلم مافی السماوات وما فی الارض)۔

اور زیادہ سے زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے، "خدا ہر چیز سے آگاہ ہے" (واللہ بکل شیء علیہ)۔

اس کی ذات مقدس عین علم ہے، اور اس کا علم اس کا عین ذات ہے، اور اسی بنا پر اس کا علم ازلی وابدی ہے۔

اس کی پاک ذات ہر جگہ حاضر و موجود ہے، اور تمھاری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، وہ تو انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، انہی حالات میں تمھارے ادعا کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سچوں کو اور جھوٹے دعویٰ کرنے والوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان کی دل و جان کی گہرائیوں سے واقف ہے، یہاں تک کہ ان کے ایمان کی شدت و ضعف کے درجات بھی جو بعض اوقات خود ان سے بھی پوشیدہ ہوتے ہیں، اس کے نزدیک واضح و روشن ہیں، ان حالات میں خدا کو اپنے ایمان سے باخبر کرنے پر اصرار کیوں کرتے ہو؟

اس کے بعد پھر دوبارہ بدو عربوں کی گفتگو کی طرف لوٹتا ہے جو اپنے اسلام لانے کو پیغمبر پر احسان جتانے کے لیے کہتے تھے، "ہم تو آپ کے پاس تسلیم کے دروازے سے آئے ہیں، جبکہ بہت سے قبائل عرب جنگ کے دروازے سے آئے ہیں۔"

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: "وہ تجھ پر احسان جلاتے ہیں کہ وہ اسلام لائے ہیں" (یعنون علیک

ان اسلموا۔

”ان سے کہہ دے اپنے اسلام کا مجھ پر احسان نہ رکھو“ (قل لا تمنوا علی اسلامکم)۔
”بلکہ یہ تو خدا کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی طرف ہدایت کی، اگر تم ایمان کے دعوے میں سچے ہو“ (بل اللہ

یمن علیکم ان ھداکم للایمان ان کنتم صادقین)۔

”منت“۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ ”من“ کے ادھ سے، ایک خاص وزن کے معنی میں ہے، جس سے چیزوں کو وزن کرتے ہیں، اس کے بعد ہر وزنی اور گراں قدر نعمت پر اس کا اطلاق ہونے لگا، منت کی دو قسمیں ہیں، اگر اس میں عملی پہلو ہو (گر اللہ نعمت کے عطا کرنے کے معنی میں) تو مدوح ہے اور ضالکتیں اس قسم کی ہیں، لیکن اگر اس میں لفظی پہلو ہو، جیسا کہ بہت سے انسانوں کے احسان، تو یہ ایک قبیح اور ناپسندیدہ عمل ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلے جگہ میں کہتا ہے:، وہ تجھ پر یہ احسان رکھتے ہیں، کہ انہوں نے اسلام کو قبول کیا ہے، اور یہ اس بات پر ایک دوسری تاکید ہے کہ وہ ایمان کے دعوے میں سچے نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے ظاہری طور پر اسلام کو قبول کیا ہے۔ لیکن آیت کے ذیل میں کہتا ہے ”اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو یہ خدا کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی طرف ہدایت کی۔“

بہر حال یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ عام طور پر کوتاہ فکر افراد یہ تصور کرتے ہیں، کہ ایمان کو قبول کرنے، اور عبادات و اطاعت انجام دینے سے انہوں نے قدس الہی میں، یا اس کے پیغمبر یا اوصیاء کی بارگاہ میں کوئی خدمت کی ہے، اور اسی وجہ سے اجر و پاداش کی امید رکھتے ہیں۔

حالانکہ اگر کسی کے دل میں نور ایمان چمکنے لگے، اور یہ توفیق اسے نصیب ہو جائے، کہ وہ مومنین کے زمرہ میں شمار ہونے لگے، تو سچے و عظیم ترین لطف الہی اس کے شامل حال ہوا ہے۔

”ایمان“ ہر چیز سے پہلے عالم ہستی کے باسے میں انسان کو ایک نیا ادراک دیتا ہے، وہ خود خواہی اور غرور کے حجاب اور پردوں کو دور کر دیتا ہے، انسان کی نظر کے افق کو وسیع کرتا ہے۔ اور اس کی نظر میں عالم خلقت کے بے نظیر شکوہ اور عظمت کو مجسم کر دیتا ہے۔

اس کے بعد اس کے عواطف پر نور اور روشنی چھڑک کر ان کی پرورش کرتا ہے، اور انسان کی عظیم اور بلند بالا اقدار کو اس میں زندہ کرتا ہے، اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اس میں بڑھاتا ہے، اسے علم و قدرت، نہ امدت و شجاعت، ایثار و قربانی، عفو و درگزر اور اخلاص سے مالا مال کر دیتا ہے، اور ایک ضعیف انسانی موجود کو ایک قوی و پُر اثر انسان بنا دیتا ہے۔

اس کا ہاتھ پچوڑ کر مدراج کمال تک اُسے اُپرے جاتا ہے، اور اُسے افتخار کی تبتانی بلندی تک پہنچا دیتا ہے، اس کو عالم ہستی کے قوانین سے ہم آہنگ، اور عالم ہستی کو اس کے لیے مسخر قرار دیتا ہے۔

تو اب کیا یہ وہ نعمت ہے جو خدا نے انسان کو عطا کی ہے، یا یہ وہ منت و احسان ہے، جو انسان خدا کے پیغمبر پر جتلا

ہا ہے؟

اسی طرح عبادات و اطاعت میں سے ہر ایک تکامل و ارتقار کی طرف ایک قدم ہے: یہ قلب کو صفا بخشتا ہے، شہوات پر کنٹرول کرتا ہے، رُوحِ انخلاص کو تقویت دیتا ہے، اور اسلامی معاشرے کو وحدت و اتحاد، قوت اور عظمت عطا کرتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک، ایک عظیم تربیتی کلاس ہے، اور ایک اصلاحی درس ہے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں انسان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ صبح شام نعمت ایمان کا شکر بجالائے، اور نماز اور ہر عبادت کے بعد سر سجود میں رکھے، اور خدا کی اس ساری توفیق پر شکر ادا کرے۔

اگر خدا پر ایمان اور اس کی اطاعت کے بارے میں انسان کی نظر اور سوچ اس قسم کی ہو تو پھر نہ صرف یہ کہ وہ اپنے آپ کو طلبِ کمال نہیں سمجھتا، بلکہ ہمیشہ خدا پیغمبر کا ”مدیون“ (مقروض) اور خود کو احسانوں تلے دبا ہوا محسوس کرتا ہے۔

عبادات کو عاشقانہ انجام دیتا ہے، اور اس کی اطاعت کی راہ میں نہ صرف پاؤں کے ساتھ بلکہ سر کے بل دوڑتا ہے اور اگر خدا اس کے اس عمل کی کوئی جزا دیتا ہے تو وہ اس کو بھی اس کا ایک دوسرا لطف و کرم سمجھتا ہے، درنہ نیک کاموں کے انجام دینے کا فائدہ تو خود انسان ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ اور درحقیقت اس توفیق کے ساتھ ساتھ خدا کی طرف سے اس کے قرضوں کی میزان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

اس بنا پر اس کی ہدایت لطف ہے، اور اس کے پیغمبر کی دعوت ایک اور لطف ہے، اور اطاعت و فرمانبرداری کی توفیق ایک مزید لطف، اور اجر و ثواب ایک اور لطف بالائے لطف ہے۔

آخری ذریعہ نجات آیت میں، جو سورہ ”حجرات“ کا اختتام ہے، دوبارہ اسی چیز کی جو گذشتہ آیت میں آئی ہے، تاکید کرتا ہے، اور فرماتا ہے: ”خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے اور جو عمل بھی تم انجام دیتے ہو۔ انہیں دیکھتا ہے“ (ان الله يعلم غیب السماوات والارض والله بصیر بما تعملون)۔

تم اس بات پر اصرار نہ کرو کہ تم حتمی اور یقینی طور پر یقین ہو، اور قسم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ تمہارے دل کے زادیوں اور گوشوں کی خبر رکھتا ہے، اور جو کچھ اس میں گزرتا ہے، وہ اس سے مکمل طور پر آگاہ ہے، وہ زمین کی گہرائیوں اور اعماق کے اسرار اور آسمانوں کے غیب سے آگاہ ہے، اس بنا پر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے دلوں کے اندر سے بے خبر ہو؟

خداوند! تو نے ہم پر احسان کیا ہے، اور ہمارے دل میں ایمان کا نور روشن کیا ہے، تجھے ہدایت کی عظیم نعمت کی قسم، ہمیں اس راستہ پر ثابت قدم رکھ، اور تکامل و ارتقار کی راہ میں ہماری رہبری فرما۔

خداوند! تو ہمارے دل کی گہرائیوں سے آگاہ ہے، ہماری نیتوں کو اچھی طرح جانتا ہے، ہمارے عیوب کو اپنے بندوں سے پوشیدہ رکھ، اور اپنے فضل و کرم سے ہماری اصلاح فرما۔

بار الہا! ہمیں توفیق اور ایسی قدرت عطا فرما کہ ہم ان عظیم اخلاقی قدروں کو جو تو نے اس پر عظمت سورہ میں بیان فرمائی ہیں، اپنے وجود کے اندر زندہ کریں، اور ان کے احترام کی پاسداری کریں۔

”آمین یا رب العالمین“

سورۃ حجرات کا اختتام

اول محرم سال ۱۴۰۶ھ

۲۴ / ۴ / ۲۶

اختتام ترجمہ ۱۴۰۶ھ

۶ ماہ مبارک رمضان بوقت بارہ بجے دوپہر بزمکان حقیر قم المقدسہ
کوئی جمشیدی محل سلطان محمد شریف، جمہوری اسلامی ایران۔

احقر
سید صفدر حسین نجفی

سُورَةُ "ق"

یہ سُورہ "مکہ" میں نازل ہوا

۱۰۹

اس کی ۲۵ آیات ہیں

دوم محرم الحرام ۱۳۰۴

سُورَةُ ق

کے

مطالب و مضامین

اس سورہ کے مباحث کا محور مسئلہ "معاد" ہے، اور تقریباً اس کی تمام آیات اسی محور کے گرد گھومتی ہیں، اور اس میں دوسرے مسائل ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔

معاد سے مربوط مسائل میں امور ذیل بیان کیے گئے ہیں۔

- ۱۔ کفار کا مسئلہ معاد سے انکار اور تعجب (معاد جہانی سے)۔
- ۲۔ مسئلہ معاد پر نظامِ فریض کی طرف توجہ دلانے کے طریق سے استدلال، خصوصاً مردہ زمینوں کا بارش کے نزول کے ذریعہ احیاء۔

۳۔ مسئلہ معاد پر سبلی خلقت کی طرف توجہ دلانے کے طریقہ سے استدلال۔

۴۔ "یوم الحساب" کے لیے ثبوت اعمال کے مسئلہ کی طرف اشارہ اور اس کے لیے اقوال۔

۵۔ موت سے مربوط مسائل، اور اس جہان سے دوسرے گھر کی طرف انتقال،

۶۔ روز قیامت کے حوادث کا ایک گوشہ، اور جنت و دوزخ کے اوصاف۔

۷۔ اختتام جہان کے ہلا دینے والے حوادث کی طرف اشارہ، جو دوسرے جہان کے لیے ایک سر آغاز ہیں۔

اس کے ضمن میں گذشتہ اقلام کی وضع و کیفیت ان کی دردناک اور شوم سر نوشت کی طرف مختصر اور مؤثر اشارے ہیں۔ (جیسے

قوم فرعون، عاد، لوط، شعیب اور تبع کی سر نوشت، نیز خدا کی طرف توجہ اور اس کے ذکر کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام کو کچھ احکام دیئے گئے ہیں، اور سورہ کے آغاز اور اختتام پر عظمت قرآن کے بارے میں ایک مختصر سا اشارہ کیا گیا ہے۔

سورہ "ق" کی تلاوت کی فضیلت

روایات اسلامی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اس سورہ کو بہت اہمیت دیتے تھے، یہاں تک کہ ہر جمعہ کے دن نماز

مُجِبِّہ کے خطبہ میں اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ لہ

ایک اور حدیث میں آیا ہے، کہ آپ ہر عید اور ہر مُجِبِّہ کے دن اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، لہ
یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ مُجِبِّہ اور عید کا دن، انسانوں کی بیداری اور آگاہی کا دن ہے، یہ پہلی فطرت کی طرف لوٹنے، اور
خدا اور یوم الحساب کی طرف توجہ کرنے کا دن ہے، اور چونکہ اس سُورہ کی آیات، مسئلہ معاد، موت اور قیامت کے حوادث
کو بہت ہی مؤثر طریقہ سے بیان کرتی ہیں، علاوہ ازیں مسائل پر غور و فکر کرنا انسانوں کی بیداری اور ترویجیت میں عمیق اور گہری تاثیر
رکھتا ہے، لہذا آنحضرتؐ اس پر خاص توجہ فرماتے تھے،

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے؛

من قرأ سورة "ق" هون الله عليه تارات الموت وسكراتہ؛

”جو شخص سُورہ ”ق“ کی تلاوت کرے گا، خداوند عالم اس پر موت کی مشکلات اور سكرات کو آسان کر دے گا؛ لہ

نیز ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے؛ لہ

”من اذمن في فرائضه ونوافله سورة "ق" وسع الله في رزقه واعطاه كتابه

بيمينه وحاسبه حساباً يسيراً؛

”جو شخص ہمیشہ واجب اور مستحب نمازوں میں سُورہ ”ق“ کی تلاوت کرتا رہے گا، خدا اس کی روزی میں وسعت

پیدا کر دے گا اور اس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا۔ اور قیامت میں اس کا حساب کتاب آسان

کر دے گا؛ لہ

یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے، کہ یہ سب افتخار و فضیلت صرف الفاظ کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ

الفاظ کا پڑھنا تو انکار و نظریات کے بیدار ہونے کا وسیلہ ہے اور وہ عمل صالح اور سُورہ کے مطالب کے ساتھ ہم آہنگی کا ایک ذریعہ

بھی ہے۔

لہ ”تفسیر قرطبی“ جلد ۹ ص ۶۱۷۔

لہ ”تفسیر فی ظلال“ جلد ۷ ص ۵۴۔

لہ ”تفسیر مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۱۴۰۔

لہ ”تفسیر مجمع البیان“ جلد ۹ ص ۱۴۰۔

سورۃ "ق"

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

- ۱- ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ ۝
- ۲- بَلْ عَجِبُوْا اَنْ جَاءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شِیْءٌ عَجِیْبٌ ۝
- ۳- عَاذًا مِّنَّا وَكُنَّا تٰرِبًا ۝ ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِیْدٌ ۝
- ۴- قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حٰفِیْظٌ ۝
- ۵- بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِیْ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱- ق ، قرآن مجید کی قسم ۔
- ۲- انہوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ انہیں کے درمیان میں سے ایک ڈرانے والا پیغمبر آیا ہے ، اور کافروں نے یہ کہا ، : یہ تو ایک عجب چیز ہے ۔
- ۳- کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے ، تو دوبارہ زندہ کیے جائیں گے ۔ یہ بازگشت تو بہت ہی بعید ہے ۔
- ۴- لیکن ہم جانتے ہیں جو کچھ زمین ان کے بدن میں سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس

وہ کتاب ہے جس میں ہر چیز محفوظ ہے۔

۵۔ جب حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے اس کی تکذیب کی، لہذا وہ اپنے پراگندہ کام میں حیران و متحیر ہیں،

تفسیر

ہٹ دھرم منکرین اپنے کام میں سہرگردان ہیں

یہاں پر ہمیں اس سورہ کی ابتدا میں پھر بعض حروف مقطوعہ کا سامنا ہے اور وہ حرف "ق" ہے، اور — جیسا کہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں — حروف مقطوعہ کی ایک قابل توجہ تفسیر یہ ہے کہ قرآن اپنی عظمت کے باوجود "الف" "با" جیسے ایک عام مادہ سے بنا ہے، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ قرآن مجید کا ایجاد کرنے والا اور نازل کرنے والا بے انتہا علم و قدرت کا مالک ہے، جس نے ان عام اور سادہ آلات سے اس قسم کی اعلیٰ ترکیب تخلیق کی ہے۔

البتہ حروف مقطعات "ق" کے لیے اور دوسری تفسیریں بھی ہیں، جن کا آپ سورہ "بقرہ"، "آل عمران"، "اعراف" اور "حم" کے سوروں کی ابتدا میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بعض مفسرین نے "ق" کو خدا کے بعض اسماء کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ (جیسے "قادر" و "قیوم")

بہت سی تفسیروں میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ "ق" ایک بہت بڑے پہاڑ کا نام ہے جو پورے کرۂ ارض کو محیط ہے اب یہ بات کہ یہ کونسا پہاڑ ہے جو کرۂ زمین یا سارے جہان کا احاطہ کیے ہوئے ہے؟ اور اس سے کیا مراد ہے؟ یہاں اس پر بحث کا مقام نہیں ہے۔ اس جگہ ہم جس چیز کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ: یہاں "ق" کا "کوہ قاف" کی طرف اشارہ بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ یہ بات اس سورہ کے مباحث کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی، بلکہ یہاں حرف "ق" ان تمام دوسرے حروف مقطوعہ کی طرح ہے جو قرآن کی سورتوں کے ابتدا میں آئے ہیں، علاوہ انہیں اگر اس سے مراد "کوہ قاف" ہوتا، تو اسے "واؤ" قسم کے ساتھ ہونا چاہیے تھا "والطور" وغیرہ کی طرح سے، اور ایک لفظ کو ذکرنا بغیر مبتداء وغیرہ کے یا واؤ قسم کے کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر تمام قرآنوں کا "رسم الخط" یہ ہے کہ "ق" مفرد صورت میں لکھا ہوا ہے، حالانکہ "کوہ قاف" کو "قاف" کی صورت میں لکھتے ہیں۔

بمخدا ان امور کے، جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں، کہ حروف مقطعات میں سے اس حرف کا ذکر، قرآن کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، یہ ہے کہ اس کے بعد بلا فاصلہ قرآن مجید کی قسم کھاتے ہوئے فرماتا ہے:-
 ”قسم ہے قرآن مجید کی“ (والقرآن المجید)۔

”مجید“ ”مجد“ کے مادہ سے ”وسیع شرافت“ کے معنی میں ہے، اور چونکہ قرآن بے انتہا عظمت و شرافت رکھتا ہے، لہذا اس کے لیے لفظ ”مجید“ ہر لحاظ سے سزاوار ہے، اس کا ظاہر زیب اور خوبصورت ہے، اس کے مضامین و مطالب عظیم ہیں۔ اس کے احکام اعلیٰ ہیں اور اس کے پروگرام تربیتی اور حیات بخش ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ قسم کس مقصد کے لیے ذکر ہوئی ہے اور اصطلاح کے مطابق ”مقسم لہ“ کیا ہے؟ مفسرین نے بہت سے احتمالات دیئے ہیں، لیکن بعد والی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جواب قسم وہی پیغمبر اسلام کی ”نبوت“ یا موت کے بعد الناول کا دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا اور معاد کا مسئلہ ہے۔

اس کے بعد کفار و مشرکین عرب کے چند بے بنیاد اعتراضات کو بیان کرتے ہوئے، ان میں سے دو اعتراضات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے: ”بلکہ انہوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ایک ڈرانے والا پیغمبر خود انہیں میں سے آیا ہے، کافروں نے کہا: یہ تو ایک عجیب چیز ہے“ (بل عجبوا ان جاءهم منذر منهم فقال الكافرون هذا شئ عجیب)۔

یہ ایک ایسا اعتراض ہے کہ قرآن نے بار بار اس کی طرف اور اس کے جواب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس کو بار بار دہرانا، اور اس کی تکرار اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ یہ کفار کے اصل اور بنیادی اعتراضات میں سے تھا، جس کا وہ ہمیشہ تکرار کرتے تھے۔ نہ صرف پیغمبر اسلام پر بلکہ تمام پیغمبروں پر ان کا یہی اعتراض تھا، کبھی کہتے، ”ان انتم الا بشر مثلنا تریدون ان تصدونا عما کان یعبدا باؤنا: تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو اور یہ چاہتے ہو کہ ہمیں اس چیز سے جس کی ہمارے آباء اجداد پرستش کیا کرتے تھے، باز رکھو۔“ (ابراہیم - ۱۰)

اور کبھی کہتے، ”ما هذا الا بشر مثلکم یا کل مما تاکلون منه ویشرب مما تشربون، یہ تو تمہاری طرح ہی ایک بشر ہے، جو تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے، اور جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔“

(مؤمنون - ۲۳)

اور کبھی اس بات کا اضافہ کرتے، لولا انزل الیہ ملک فیکون معہ نذیراً، اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ ہونا نازل ہوا۔ تاکہ وہ اس کے ساتھ بل کر ڈراتا؟!

(فرقان - ۷)

لیکن یہ سب حق کو تسلیم نہ کرنے کے لیے بہانے تھے۔

قرآن زیر بحث آیت میں اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیتا، کیونکہ وہ اس کا بارہا جواب دے چکا ہے، کہ اگر بالفرض ہم کسی فرشتے کو بھی بھیج دیتے تو اس کو بھی بشر کی صورت میں بھیجتے، یعنی انسان کا رہبر و رہنما صرف انسان ہی ہو سکتا ہے، تاکہ وہ اس کے تمام دردوں، حاجتوں، میلانوں، خواہشوں اور مسائل زندگی سے باخبر ہو اور دوسری طرف سے عملی پہلوؤں سے وہ ان کے لیے نمونہ بن سکے اور وہ یہ نہ کہنے پائیں کہ اگر وہ ہمارا ہم جنس ہوتا تو کبھی بھی پاک و پاکیزہ نہ رہ سکتا، کیونکہ

قاضی ار بامانشیند بر نشان دست را
معتب گرمی خورد و معذور در دست را

اگر قاضی ہمارے ساتھ بیٹھتا تو اپنے ہاتھ کو جھاڑتا رہتا، معتب اگر شراب پی لیتا تو مست کو معذور سمجھتا۔
لہذا اس کے پروگرام صرف اسی کے لیے مفید ہیں نہ کہ نوع بشر کے لیے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس اعتراض کے بعد اور یہ کہ وہ کس طرح نوح بشر سے ہے؟ انہیں ایک دوسرا اعتراض جو پیغمبر کی دعوت کے مضمون پر تھا، وہ ایک ایسے مسئلہ پر تھا جو ان کے لیے ہر لحاظ سے عجیب و غریب تھا، وہ کہتے تھے: "جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے تو کیا پھر زندہ ہو جائیں گے، جیسا کہ وہ کہتا ہے۔ یہ بازگشت تو ایک بعید بات ہے"

(۱۶) اذ امتنا وکنا ترابا ذالک رجع بعید)

بہر حال وہ دوبارہ زندہ ہو جانے کو عقل سے دور ایک مسئلہ خیال کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات تو اسے محال سمجھتے تھے اور اس کے ادعا کو کہنے والے کے جنون کی دلیل قرار دیتے تھے، جیسا کہ سورۃ سبأ کی آیت ۷۰ میں بیان ہوا ہے: وقال الذین کفرو اهل نذرکم علی رجل ینبئکم اذا مضت مکمل محرق انکم لعی خلق جدید افترا علی اللہ کذبا امر بہ جنۃ: "کافروں نے کہا، آؤ ہم تمہیں ایک ایسا آدمی دکھائیں جو پہر کہتا ہے کہ جب ہم کامل طور سے منتشر اور پرانہ ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ نئے سرے سے زندہ ہو کر لوٹ آئیں گے، کیا اس نے خدا پر بہتان باندھا ہے؟ یا اُسے جنون ہو گیا ہے؟"

صرف یہی ایک مقام نہیں ہے کہ جہاں انہوں نے پیغمبر اسلام پر یہ اعتراض کیا، بلکہ انہوں نے بارہا یہی کہا، اور بارہا اس کا جواب سنا اور پھر ہٹ دھرمی کرتے ہوئے اس کا تکرار کیا،
بہر حال قرآن مجید میں چند ایک طریق سے اس کا جواب دیتا ہے۔
سب سے پہلے خدا کے غیر متناہی علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم جانتے ہیں جو کچھ زمین ان کے

۱۷ "اذا" کا جواب محذوف ہے اور وہ بعد والے جملہ سے سمجھ میں آتا ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے: "اذا امتنا وکنا ترابا ذالک رجع

ونرد حیا ذالک رجع بعید"

بدن میں سے کم کرے گی اور ہمارے پاس ایک ایسی کتاب ہے، جس میں ہر چیز محفوظ ہے۔" (قد علمنا ما تنقص الارض منہم وعندنا کتاب حفیظ)۔

اگر تمہارا اعتراض اس بنا پر ہے کہ انسان کی ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی، اور اس کا گوشت مٹی ہو جائے گا، اور وہ زمین میں مل جائے گا اور اس کے ذرات، بخارات اور گیسوں میں تبدیل ہو کر، ہوا میں پھیل جائیں گے، تو انہیں کون اکٹھا کر سکتا ہے؟ اور اصلاً کون ایسا ہے جو ان سے باخبر ہو؟

تو اس کا جواب لوم ہے، وہی خدا جس کا علم تمام اشیاء کا احاطہ کیے ہوئے ہے، وہ ان تمام ذرات کو سمجھتا ہے اور بوقت ضرورت وہ ان سب کو اسی طرح سے جمع کرے گا جس طرح مٹی کے ایک ٹیلے کے درمیان سے مقناطیس کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ لوہے کے بھرے ہوئے ذرات کو جمع کیا جاسکتا ہے، ہر انسان کے پرانے ذرات کی جمع آوری خدا کے لیے اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔ اور اگر ان کا اعتراض یہ ہے، کہ انسان کے اعمال کا حساب کتاب معاد و قیامت کے لیے کون محفوظ رکھے گا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب لوح محفوظ میں ثبت ہیں اور اصولی طور پر کوئی چیز اس عالم میں کم نہیں ہوتی یہاں تک کہ تمہارے اعمال بھی باقی رہتے ہیں۔ اگر چہ ان کی شکل بدل جاتی ہے۔

"کتاب حفیظ" اس کتاب کے معنی میں ہے جو تمام انسانوں اور ان کے غیر کے اعمال کی محافظ ہے، اور یہ لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے، جس کی تشریح و تفصیل ہم سورہ رد کی آیت ۳۹ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔ (جلد ۵ تفسیر نمونہ) اس کے بعد دوسرے جواب کی طرف رخ کرتا ہے جو زیادہ تر نفسیاتی پہلو رکھتا ہے، کہتا ہے، "لیکن جب حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے اس کی تکذیب کی" (بل، کذبوا بالحق لما جاؤہم)۔

یعنی وہ جان بوجھ کر حق کا انکار کرتے ہیں، اور نہ حق کے چہرے پر کوئی گرد و غبار نہیں ہے، اور جیسا کہ بعد والی آیات میں آئے گا۔ وہ اسی دنیا میں خود اپنی آنکھوں سے بار بار معاد کا منظر دیکھتے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کرتے۔

لہذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے، "چونکہ وہ مٹھلانے پر تھے ہوئے ہیں، لہذا ہمیشہ اٹھی سیدھی ہانکتے ہیں، خود اپنے کام میں حیران ہیں اور اٹلے پٹلے کاموں میں گرفتار ہیں" (فہم فی امر مریدج)۔

کبھی وہ پیغمبر کو سمجھتے ہیں، کبھی کاہن اور کبھی شاعر۔

کبھی کہتے ہیں: "اس کی باتیں" اساطیر الاقلین "گزشتہ لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

کبھی کہتے ہیں: "کوئی بشر اسے تعلیم دیتا ہے۔"

کبھی اس کے کلمات کے نفوذ و اثر کو "جاود" کی ایک قسم کہتے ہیں اور کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بھی اس کے مانند آیات ہیں۔ یہ اٹھی سیدھی باتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انہوں نے حق کو پہچان تو لیا ہے، لیکن تہانہ بازی میں گئے ہوئے ہیں اسی لیے ایک بات پر نہیں سمجھتے۔

"مریج" "مرج" کے مادہ سے (جو مرج کے وزن پر ہے) "مختلط مشوش اور متبہ" امر کے معنی میں ہے، اور اس لیے اس زمین کو جس میں مختلف قسم کی بکثرت گھاس اُگی ہوئی ہو۔ "مرج" (چراگاہ) کہا جاتا ہے۔

- ۶۔ اَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ۝
- ۷۔ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَالْقَيْنَا فِيهَا رِوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝
- ۸۔ تَبْصِرَةً وَذِكْرًا لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ ۝
- ۹۔ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبْرَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَبْتًا وَحَبَّ الْحَصِيدِ ۝
- ۱۰۔ وَالنَّخْلَ بَسَقَتِ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ۝
- ۱۱۔ رَزَقْنَاكَ لِلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلَدَةً مَيِّتًا كَذَلِكَ الْخُرُوجُ ۝

ترجمہ

- ۶۔ کیا انہوں نے آسمان کی طرف جو ان کے سر کے اوپر ہے نگاہ نہیں کی کہ ہم نے اس کو کس طرح سے بنایا ہے، اور کس طرح سے ستاروں کے ذریعہ اُسے سجایا ہے، اور اس میں کسی قسم کا شکاف اور غیر موزونہی نہیں ہے۔
- ۷۔ اور ہم نے ہی زمین کو پھیلا یا ہے، اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ قائم کیے ہیں، اور ہر قسم کی لہلہاتی ہوئی گھاس اس میں اُگادی ہے۔
- ۸۔ تاکہ ہر تو بہ کرنے والے بندے کے لیے بصیرت اور بیداری کا وسیلہ اور ذریعہ ہو۔

۹ اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل کیا، اور اس کے ذریعہ باغات اور ان دانوں کو اگایا جنہیں کاٹ کر تیار کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ اور بلند قامت کھجوروں کے درخت، جن کے پھل ایک دوسرے پر تہ بہ تہ لگے ہوئے ہوتے ہیں

۱۱۔ یہ سب کچھ بندوں کو روزی دینے کے لیے، اور ہم نے بارش کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کیا ہے، ہاں! مردوں کو زندہ کرنا بھی اسی طرح ہے۔

تفسیر

ایک لمحہ کے لیے آسمان کی طرف دیکھو

یہ آیات، اسی طرح سے "معاد کے دلائل" کو پیش کر رہی ہیں، کبھی "حق تعالیٰ کی غیر متناہی قدرت کے" طریقہ سے اور کبھی "اسی دنیا میں معاد کے مناظر کے وجود" سے مدد لیتی ہیں،

سب سے پہلے منکرین کو، آسمانوں کی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتا ہے: "کیا انہوں نے اپنے سر کے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا، کہ ہم نے انہیں کس طرح سے بنایا ہے، جس میں کوئی ستون اور پائے نہیں ہیں۔ اور کس طرح سے ہم نے اُسے ستاروں کے ذریعہ سے سجایا ہے جبکہ اس میں کوئی شکاف اور غیر موزونیت نہیں ہے؟ (افلم یظنرُوا الی السماء فوقہم کیف بنیناہا وزیناہا ومالہا من فروج)۔

یہاں دیکھنے سے مراد غور و فکر اور سوچ بچار کے ساتھ دیکھنا ہے جو انسان کو اس وسیع و عظیم آسمان اور اس کے عجائبات کے خالق کی عظیم قدرت سے آشنا کرتا ہے، جو خیرہ کرنے والی عظمت بھی رکھتا ہے اور بہت زیادہ زمینیاں بھی اور استحکام و نظم و حساب بھی۔

ومالہا من فروج (اس میں کوئی شکاف نہیں ہے، کا جملہ یا تو نقص و عیب اور غیر موزونیت کے نہ ہونے کے معنی

میں ہے۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے۔ یا خاص طور پر اس آسمان میں شکاف نہ ہونے کے معنی میں ہے جو اطراف

زمین کو احاطہ کے ہوئے ہے اور جسے فنائے زمین کہا جاتا ہے، اور قرآن کے قول کے مطابق وہ (ایک محفوظ چھت) ہے (انبیاء ۲۲) جو ان آسمانی پتھروں کو، جو مسلسل اور تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آتے ہیں، روکے ہوئے ہے اور سطح زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں جلا کر خاک کر دیتی ہے، اور اسی طرح نقصان دہ کہانی شاعروں سے بھی بچاتی ہے۔

درستاروں کی جگہ کے معنی میں جو آسمان ہے، وہ تو ایک خالی فضا ہے، جس میں یہ سیارے اور گزرتے تیر رہے ہیں۔

یہاں ایک تیسرا احتمال بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اد پر والا مجلہ "ایتھر" کے نظریہ کی طرف اشارہ ہو، اس نظریہ کے مطابق تمام عالم ہستی درستاروں کا درمیانی فاصلہ ایک بے رنگ بے وزن "ایتھر" نامی مادہ سے پُر ہے، جو نور و روشنی کی لہروں کو اٹھائے ہوتے ہے اور اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا ہے، اس نظریہ کے مطابق تمام عالم ہستی میں کوئی شگاف یا سوراخ نہیں ہے اور ثابت اور سیارے "ایتھر" کے اندر تیر رہے ہیں۔

البتہ یہ تینوں تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتی، اگرچہ تیسری تفسیر جس کا نتیجہ "ایتھر" کے مفروضے پر ہے قابل اعتماد نہیں ہے، کیونکہ "ایتھر" کا موضوع ماہرین کی نظر میں ابھی تک قطعی و یقینی طور پر ثابت نہیں ہوا ہے۔

اس کے بعد زمین کی خلقت کی عظمت کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے، "اور ہم نے زمین کو پھیلا دیا، اور اس میں بڑے بڑے پہاڑ قائم کیے، اور اس میں طرح طرح اور قسم قسم کی ہری بھری لہلہاتی ہوئی گھاس اگائی" (والارض مددناھا و العینا فیھا رواسی و انبتنا فیھا من کل زوج بھیج)۔

ہاں زمین کی پیدائش ایک طرف، اس کا پھیلاؤ دپانی کے نیچے سے باہر آنا، دوسری طرف، پہاڑوں کا پیدا ہونا، جن کی جڑیں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں، اور وہ زرہ کی طرح زمین کو اندر دیتی اور بیرونی دباؤ سے اور چاند اور سورج کی کشش سے پیدا ہونے والے مد و جزر سے محفوظ رکھتے ہیں، تیسری طرف انواع و اقسام کے گھاس ان تمام عجائب اور خوبصورتیوں کے ساتھ، چوتھی طرف، یہ سب کے سب اس کی بے پایاں قدرت کی دلیل ہیں۔ لہ

"من کل زوج" کی تعبیر عالم گیاہ و نباتات میں مسئلہ زوجیت کی طرف اشارہ ہے، جو ان آیات کے نزول کے موقع پر ہرگز ایک اصل کلی کے عنوان سے ظاہر نہیں ہوا تھا، اور علم و دانش بشر نے کئی صدیوں کے بعد اس کے رُخ سے پردہ اٹھایا ہے، اور یہ گھاس اور نباتات کے مختلف اصناف و انواع کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ عالم گیاہ و نباتات میں زیادہ فوق العادہ اور حیرت انگیز تنوع پایا جاتا ہے۔

بعد والی آیت میں نتیجہ نکالتے ہوئے کہتا ہے: "ہم نے ان سب کو ان بندوں کی بصیرت اور سیداری کے لیے خلق

لہ ہم پہاڑوں کی خلقت کے بارے میں، اسی طرح زمین کے پھانے اور پھیلائے کے سلسلہ میں اور عالم گیاہ کی زوجیت کے متعلق تفصیلی بحث سورہ رد کی آیت ۳ کے ذیل میں جلد ۱۰ ص ۱۰۰ سے آگے بیان کر چکے ہیں۔

کیا ہے، جو یہ چاہتے ہیں کہ ہماری طرف لوٹ آئیں اور حق کو پالیں (تبصرة و ذکرى لكل عبد منيب پرلہ ہاں: وہ ذات، جو آسمانوں کو اتنا عظیم اور خوبصورت، اور زمین کو اتنا پر نعمت و جمال و نظم و حساب کے ساتھ پیدا کرنے پر قدرت رکھتی ہے، تو وہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قادر نہ ہوگی، اور قیامت کیوں برپا نہ کر سکے گی؟ کیا یہ عظیم خیر ہر دینے والی قدرت امکان محاذ پر واضح دلیل نہیں ہے!

بعد والی آیت میں ایک دوسرے استدلال کی بنیاد رکھتے ہوئے کہتا ہے: ”اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی نازل کیا ہے، اور اس کے ذریعہ باغات اور ان دانوں کو اگاتے ہیں، جنہیں کاٹا جاتا ہے (و نزلنا من السماء ماء مبارکاً فابتننا به جنات وحب الحصيد)۔

”جنات“ یہاں پھل دار باغات کی طرف اشارہ ہے، اور ”حب الحصيد“ (ایسے دانے جن کو کاٹ کر تیار کیا جاتا، ایسے دانوں کی طرف اشارہ ہے، جیسے جو، گندم، اور ان کے مانند دوسرے غلے جن سے انسانوں کی غذا کے اصلی مواد کو تیار کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”اور اسی طرح کھجور کے ایسے بلند قامت درخت جن کے پھل اور پرنچے ملے ہوئے ہوتے ہیں“ (والنخل باسقات لها طلع نضيد)۔

”باسقات“ جمع ہے ”باسقہ“ کی جو مرتفع اور بلند کے معنی میں ہے، اور ”طلع“ کھجور کے درخت کے پھل پر جب وہ ظاہر ہونے لگتا ہے بولا جاتا ہے،

اور ”نضید“ کا معنی مترام اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں، خصوصاً کھجور کے درخت کے خوشے جس وقت غلاف کے اندر ہوتے ہیں تو پورے طور پر ایک دوسرے پر سوار اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور جس وقت غلاف سے باہر آتے ہیں تو بہت ہی عجیب خیز ہوتے ہیں۔

آخر میں کہتا ہے: ”ہم نے ان سب کو بندوں کو روزی دینے کے لیے خلق کیا ہے، اور بارش کے ان حیات بخش قطرات سے ہم نے مردہ زمینوں کو زندگی بخشی ہے، ہاں! مردوں کا زندہ ہونا اور ان کا قبروں سے باہر نکلنا بھی اسی طرح ہے“ (رزقاً للعباد و احینا به بلدة ميتاً كذلك الخروج)۔

اور اس طرح سے وہ بندوں پر اپنی عظیم نعمتوں کی یاد آوری کے ضمن میں اس کی شناخت کی راہ میں، ان کی شکر گزاری

لے ”تبصرة“ مفعول لہ، ”بھی ہو سکتا ہے اور مفعول مطلق“ بھی لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے ”ذکرى“ بھی اسی پر عطف ہے اور وہی معنی دیتا ہے۔

۱۰ دوسری آیات میں بھی اس سلسلہ میں بحث ہو چکی ہے۔ (اسی تفسیر کی جلد ۱۰ سورہ فاطر کی آیت ۹ کے ذیل میں اور اسی جلد میں سورہ یس کی آخری آیات کے ذیل میں رجوع فرمائیں۔

کی حس کو تحریک کرتے ہوئے، انہیں یاد دلاتا ہے کہ تم معاد کا نمونہ ہر سال اپنی آنکھوں کے سامنے اسی جہان میں دیکھتے ہو، کہ مردہ ہشک زمینیں جو ہر قسم کے آثار زندگی سے خالی ہوتی ہیں، بارش کے قطروں کے نزول کے زیر اثر حرکت میں آجاتی ہیں اور قیامت کا شور وغل برپا کر دیتی ہیں اور ہر گوشہ و کنار سے گھاس اُگنے لگتی ہے اور ”وحدہ لاشیلٹ لہ“ کہتی ہے۔

یہ عظیم جنبش اور عالم نباتات و گیہاہ میں حیات و زندگی کی طرف حرکت اس واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ آفریدگار عالم مردہ موجودات کو دوبارہ زندگی عطا کر سکتا ہے، کیونکہ کسی چیز کا واقع ہونا، اس کے ”امکان“ کی سب سے قوی دلیل ہے۔

- ۱۲۔ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ ۝
 ۱۳۔ وَعَادُ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ۝
 ۱۴۔ وَّأَصْحَابُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۝ كُلُّ كَذَّابٍ الرَّسُلَ فَحَقَّ
 وَعَيْدِ ۝
 ۱۵۔ اَفَعَيَّنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لُبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝

ترجمہ

۱۲۔ اُن سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرس (وہ قوم جو پیامہ میں رہتی تھی، اور اُن کی طرف ایک پیغمبر آیا تھا، جس کا نام حنظلہ تھا) اور قوم ثمود نے بھی (اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی)۔

۱۳۔ اور اسی طرح قوم عاد اور فرعون اور قوم لوط۔

۱۴۔ اور اصحاب الایکہ (قوم شعیب) اور قوم تبع (جو سرزمین یمن میں رہتی تھی) ان میں سے ہر ایک نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی تکذیب کی، اور عذاب کا وعدہ ان کے بارے میں پورا ہو کر رہا۔

۱۵۔ کیا ہم پہلی خلقت سے عاجز آگئے ہیں۔ (کہ معاد کی خلقت پر قادر نہ ہوں) لیکن وہ (ان تمام واضح و روشن دلائل کے باوجود) پھر بھی نئی خلقت میں شک و تردید رکھتے ہیں۔

تفسیر صرف تم ہی نہیں ہو جس کا دشمن سے مقابلہ ہے؟

یہ آیات اسی طرح معاد قیامت سے مرئوب مباحث کو مختلف طریقوں سے بیان کر رہی ہیں۔ پہلے پیغمبر کی دل داری کے لیے فرماتا ہے، ”صرف تو ہی نہیں ہے کہ اس کا فرگردہ نے تیری تکذیب کی ہے، اور تیری دعوت کے مطالب کو بھٹلایا ہے خصوصاً معاد کے بارے میں“ ان سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرس اور قوم ثمود نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی، (كذبت قبلهم قوم نوح واصحاب الرس و ثمود)۔

”قوم ثمود“ وہی خدا کے عظیم پیغمبر صالح کی قوم ہے، جو حجاز کے شمال میں ”حجر“ کی سرزمین میں رہتی تھی، اور ”اصحاب الرس“ کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بہت سو کا نظریہ، یہ ہے کہ وہ ایک قبیلہ تھا جو سرزمین یام میں رہتا تھا، اور ان کے پیغمبر کا نام حنظلہ تھا، انہوں نے اس کی تکذیب کی اور آخر کار اُسے کنوئیں میں پھینک دیا (اس بات پر توجہ رہے کہ ”رس“ کا ایک معنی کنواں ہے) اور اس کا دوسرا معنی وہ مختصر اثر ہے جو کسی چیز کا باقی رہ جائے، کیونکہ اس قوم کے بہت کم اثرات تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں)۔

بعض دوسرے اُسے شعیب کی قوم سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے پانی کے بہت زیادہ کنوئیں تھے، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”اصحاب الایحہ“ جو بعد والی آیت میں آیا ہے وہ اس قوم شعیب کی طرف اشارہ ہے، لہذا اس احتمال کی نفی ہو جاتی ہے۔

بعض انہیں قوم ثمود کے بقایا میں سے جانتے ہیں، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زیر بحث آیات میں ”ثمود“ جدا گانہ طور پر آیا ہے۔ لہذا یہ معنی بھی بعید نظر آتا ہے۔ اس بنا پر مناسب وہی پہلی تفسیر ہے، جس کی مفسرین کے ”مبایع“ عام شہرت ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”طائفہ عاد، قوم فرعون اور لوط کے بھائیوں نے بھی“ (وعاد وفرعون واخوان لوط)۔

لوط کے بھائیوں سے مراد وہی قوم لوط ہے، کیونکہ قرآن نے ان عظیم پیغمبروں کو بھائی کے عنوان سے یاد کیا ہے۔ اور اصحاب الایحہ اور قوم تبع نے بھی۔ (واصحاب الایحہ وقوم تبع)۔

”ایکد“ بہت زیادہ اور گھنے درختوں کے معنوں میں ہے۔ یاد دوسرے لفظوں میں جگمل کے مشابہ ہے، اور

اصحاب الایکھ قوم شیب کا ایک گروہ ہے، جو شہر "مدین" کے علاوہ کسی اور جگہ رہتا تھا، کسی ایسے شہر میں جس میں بہت زیادہ درخت تھے یہ

اور "قوم تبع" سے مراد یمن کے لوگوں کا ایک گروہ ہے "تبع" یمن کے بادشاہوں کا لقب ہے، کیونکہ لوگ ان کی اتباع اور پیروی کیا کرتے تھے، اور یہاں پر قرآن کی ظاہری تعبیر اور ایک اور دوسری آیت میں (۴۷- دخان) یمن کا ایک خاص بادشاہ ہے جس کا نام بعض روایات میں "اسعد البکرب" ذکر ہوا ہے، اور ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ ایک مومن آدمی تھا، اور زول کو انبیاء کی دعوت کی طرف بلاتا تھا، اگرچہ لوگوں نے اس کی مخالفت کی، لہذا اس کے بعد ان آٹھوں اقوام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "ان میں سے ہر ایک نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کی تکذیب کی اور ان کے بارے میں خدا کے عذاب کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔" (کل کذب التوہل فنح و عید)۔

یہ جو کہتا ہے: انہوں نے "خدا کے رسولوں" کی تکذیب کی۔ حالانکہ ہر ایک نے صرف اپنے پیغمبر کی تکذیب کی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو نفل ان سے سرزد ہوا وہ مجموعی طور پر تمام انبیاء کی تکذیب تھی، اگرچہ ہر ایک نے ایک ایک پیغمبر کی تکذیب کی تھی۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ ایک پیغمبر کی تکذیب بقیہ کی تکذیب بھی شمار ہوتی ہے، کیونکہ سب کی دعوت کا مطلب اور مفہوم ایک ہی ہے۔

بہر حال ان اقوام نے اپنے پیغمبروں کی بھی تکذیب کی اور مسئلہ توحید و معاد کی بھی، اور انجام کار دردناک عذاب میں گرفتار ہوئے، بعض طوفان میں گرفتار ہوئے، بعض سیلاب میں بعض دوسرے صاعقہ اور آسمانی بجلی میں، بعض زلزلہ میں، یا ان کے علاوہ دوسری چیزوں میں، اور انجام کار انہوں نے تکذیب کا تلخ پھل چکھا۔ لہذا تم مطمئن رہو اگر یہ کانفر قوم بھی جو تمہارے مقابلہ میں کھڑی ہے اسی حالت میں رہی تو ان کی سرنوشت بھی ان سے بہتر نہیں ہوگی۔

اس کے بعد امکان قیامت کے دلائل میں سے ایک اور کو ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا ہم پہلی خلقت سے تمک بار کر عاجز آ گئے ہیں کہ اب دوسری خلقت اور قیامت پر قدرت حاصل نہ ہو؟" (افعیینا بالخلق الاول، لہذا اس کے بعد مزید کہتا ہے: انہیں پہلی پیدائش کے بارے میں تو کوئی شک نہیں ہے، کیونکہ وہ خدا کو ہی انسانوں کا خالق سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ ان واضح دلائل کے باوجود نئی پیدائش اور قیامت کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں" (بل هم فی لبس من خلق جدید)۔

درحقیقت وہ خواہشات نفسانی، تعصب اور بہت دھرم کی بنا پر تناقض میں گرفتار ہیں، ایک طرف تو یہ سمجھتے ہیں

۱۔ مزید دقت کے لیے جلد ۶ اور جلد ۸ سورہ طہ کی آیت ۷۸ اور سورہ شمس کی آیت ۷۶ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ قوم تبع کے بارے میں مزید تشریح کیے جلد ۱۲ سورہ دخان کی آیت ۴۷ کے ذیل میں مطالعہ کریں۔

۳۔ اوپر دئے جلد میں ایک محدود ہے، اور فقہاء میں اس طرح ہے: "افعیینا بالخلق الاول حتی نعجز عن الشافی: کیا ہم پہلی

خلقت سے عاجز تھے کہ دوسری سے عاجز ہوں گے؟

کہ خدا نے ہی انسانوں کو خلق کیا ہے اور انہیں سب کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف جب انسانوں کی مٹی سے جدید خلقت کے مسئلہ تک پہنچتے ہیں، تو اس کو عجیب و غریب اور یاد دہنہ ہونے والا مسئلہ شمار کرتے ہیں، حالانکہ دونوں ایک ہی جیسے ہیں۔ "و حکم الامثال فی مای جوزو فی مالا یجوزو واحد"

اس طرح سے ان آیات میں اور گذشتہ آیات میں چار مختلف طریقوں سے مسئلہ معاد پر استدلال کرتا ہے، "علم خدا کے طریق سے اس کی قدرت کے طریق سے، اس کے بعد عالم گیاہ میں معاد کے مناظر کی تکرار کے طریق سے، اور انجاء کا پہلی خلقت کی طرف توجہ کرنے کے طریق سے۔ اور جب ہم معاد کے سلسلہ میں قرآن کی دوسری آیات کی طرف توجہ کرتے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہی دلائل دوسرے دلائل کے اضافہ کے ساتھ الگ الگ مختلف آیات میں آئے ہیں اور قرآن نے اپنی طاقتور منطق اور پُرکشش، سادہ، آسان اور قاطع تعبیروں کے ساتھ مکہین کے سامنے معاد جسمانی کے مسئلہ کو بہترین طریقہ پر ثابت کیا ہے، کہ اگر وہ اپنے آپ کو پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں، تعصب، ہٹ دھرمی، اور اندھی تقلید سے بچا لیتے تو وہ بہت جلد اس واقعیت کو تسلیم کر لیتے، اور یہ جان لیتے کہ قیامت د معاد کی کوئی پیچیدہ چیز نہیں ہے۔"

سب سے پہلے خدا کے غیر متناہی علم، اور انسانوں پر اس کے علمی احاطہ کی بات کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ہم نے انسان کو خلق کیا ہے، اور ہم اس کے نفس کے وسوسوں کو جانتے ہیں“: *وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلَهُ مَا تَوَسَّوَسُ بِهِ نَفْسِهِ*۔

”توسوس“ ”وسوسہ“ کے مادہ سے مفردات میں راغب کے کہنے کے مطابق ایسے غیر مطلوب انکار کے معنی میں ہے جو انسان کے دل میں گزرتے ہیں، اور اس کی اصل لفظ ”وسواس“ سے لی گئی ہے، جو آلات زینت کی صدا، اور اسی طرح مخفی پیغام و صدا کے معنی میں ہے۔

یہاں پر اس سے مراد یہ ہے کہ جب خدا دل میں گزرنے والے خیالوں اور اُن جلدی گزر جانے والے وسوسوں سے جو اس کی فکر سے گزرتے ہیں، آگاہ ہے، تو وہ یقینی طور پر ان کے تمام عقائد و اعمال و گفتار سے بھی باخبر ہے۔ اور روز حساب کے لیے سب کے حساب و کتاب پر نظر رکھتا ہے۔

”وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ“ کا جملہ ممکن ہے اس نکتہ کی طرف اشارہ ہو، کہ خالق بشر سے محال ہے کہ وہ اس کے وجود کے جزئیات سے بے خبر ہو، اور وہ خلقت بھی ایسی جو ہمیشہ کے لیے جاری ہے، کیونکہ خدا کی طرف سے ممکنات تک نہیں وجود پہنچتا رہتا ہے، کہ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ہمارا رابطہ اس سے منقطع ہو جائے تو ہم سب ختم ہو جائیں، جیسا کہ سورج کی روشنی اس منبع فیض بخش یعنی کثرہ آفتاب سے لمحہ بہ لمحہ جدا ہوتی اور فضا میں پھیلتی رہتی ہے، (بلکہ — جیسا کہ ہم بیان کریں گے، ہمارا اس کی ذات مقدس کے ساتھ ارتباط اس سے بھی زیادہ بالاتر ہے)

ہاں! وہ خالق ہے، اور اس کی خلقت دائم و مستمر اور ہم تمام حالات میں اس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں، ان حالات میں کس طرح ممکن ہے کہ وہ ہمارے ظاہر و باطن سے بے خبر ہو۔

اور آیت کے ذیل میں اس مطلب کو زیادہ واضح کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: ”ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں“ (*وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ*)

کتنی عمدہ دہلا دینے والی تعبیر ہے، ہماری حیات جسمانی اس رگ کے ساتھ وابستہ ہے جو ہمیشہ خون کو ایک طرف سے ہمارے دل میں داخل کرتی ہے، اور دوسری طرف سے خارج کرتی ہے اور تمام اعضاء تک پہنچاتی ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے عمل میں وقفہ آجائے تو فوراً موت واقع ہو جائے۔ خدا تو ہمارے دل کی رگ سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے۔

یہ وہی چیز کہ دوسری جگہ کہتا ہے: ”وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَهُ تَحْشُرُونَ“: ”جان لو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور تم سب ہی قیامت میں اس کے پاس جمع ہو جاؤ گے“ (الانفال - ۲۲)

البتہ یہ سب کی سب تشبیہ ہیں اور خدا کا قرب اس سے بھی برتر و بالاتر ہے، اگرچہ محسوسات میں اس سے زیادہ بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

- ۱۶- وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلْمَا تَوْسُوْسُ بِهِ نَفْسَهُ ۖ وَ
 نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝
 ۱۷- إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝
 ۱۸- مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝

ترجمہ

- ۱۶- ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور ہم اس کے نفس کے دوسوں کو جانتے ہیں، اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔
 ۱۷- اس وقت کو یاد کرو جب انسان کے ساتھ رہنے والے دونوں فرشتے دائیں اور بائیں طرف سے، اس کے اعمال کو لکھتے ہیں۔
 ۱۸- انسان کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا، مگر اس کے پاس ہی ایک نگران فرشتہ اپنے کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔

تفسیر

تمھاری چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی وہ لکھتے ہیں

ان آیات میں معاد سے مربوط مسائل کے ایک اور حصہ کو بیان کیا جا رہا ہے۔ اور وہ روز حساب کے لیے انسانوں کے اعمال کے ثبت و ضبط کا مسئلہ ہے۔

خدا کے اس احاطہ علمی اور اس کے قبضہ قدرت میں ہونے کی صورت میں، ہماری ذمہ داری واضح و روشن ہے، نہ تو ہمارے انفعال و کوتاہی اس سے پہنچا ہے، اور نہ ہی انکار و دنیا دہ دوس سے تک جو ہمارے دل میں گزرتے ہیں۔

اس واقعیت کی طرف توجہ، انسان کو بیدار کرتی ہے، اور دادگاہ عدل الہی میں، اس کی سنگین باز پرس، اور دقیق اعمال نامہ سے آشنائے کرتی ہے اور ایک بے خبر اور لاپرواہ انسان سے اُسے ایک ہوشیار صحیح راستہ پر قابل اعتماد اور با تقویٰ انسان بناتی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن "ابو حنیفہ" نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا، کہ میں نے آپ کے فرزند "موسیٰ" کو سنا ہے وہ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ ان کے سامنے سے گزر رہے تھے، اور وہ انہیں منع نہیں کرتے تھے، حالانکہ یہ کام درست نہیں ہے۔

امام صادقؑ نے فرمایا، میرے بیٹے "موسیٰ" کو بلاؤ، حضرت کو بلا لیا گیا، تو امام صادقؑ نے ابو حنیفہ کی بات اپنے بیٹے سے بیان کی، آپ نے جواب میں فرمایا، اے بابا جان!

"ان الذی کنت اصلی لہ کان اقرب الی منہم، یقول اللہ عزوجل و نحن اقرب الیہ من حبل الوریث!"

"میں جس کی نماز پڑھ رہا تھا، وہ ان کی نسبت مجھ سے زیادہ قریب تھا، جیسا کہ خداوند متعال فرماتا ہے، اہم انسان سے اس کی شریک سے بھی زیادہ قریب ہیں، امام صادقؑ نے انہیں اپنی آغوش میں لیا اور فرمایا:

"بابی انت وامی یا مستودع الاسرار"

"میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں، اے وہ کہ اسرار الہی جس کے دل میں ودیعت کئے گئے ہیں، لے

مفسرین اور ارباب لغت نے "ورید" کے معنی کے سلسلہ میں گونا گوں تفاسیر بیان کی ہیں، ایک گروہ کا نظریہ تو یہ ہے کہ ورید وہی رگ ہے کہ جو انسان کے دل یا جگر کے ساتھ ملی ہوئی ہے، اور بعض اُسے ان تمام رگوں کے معنی میں سمجھتے ہیں، جو انسان کے بدن سے گزرتی ہیں، جبکہ بعض دوسروں نے اس کی رگ گردن کے ساتھ تفسیر کی ہے، اور کبھی اس کو "وریدان" کہتے ہیں، یعنی گردن کی دونوں رگیں۔

لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے، خصوصاً سورۃ انفال کی آیت ۲۴ کی طرف توجہ رکھتے ہوئے، جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ لفظ "ورید" اصل میں لفظ "ورود" سے جو پانی کی تلاش میں جانے کے معنی میں ہے، لیا گیا ہے۔ اور چونکہ خون اس رگ کے ذریعہ دل میں داخل ہوتا ہے، یا دوسرے اعضاء میں وارد ہوتا ہے، لہذا اس کو "ورید" کہتے ہیں۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیے، کہ موجودہ زمانہ کی متداول اصطلاح "ورید" اور "شریان" سے متعلق اصطلاح

وہ رگیں جو خون کو تمام اعضاء سے دل کی طرف لے جاتی ہیں، اور وہ رگیں جو خون کو دل سے اعضاء کی طرف پہنچاتی ہیں، علم زبیت شناسی کے ساتھ مخصوص اصطلاح ہے، اور وہ اس لفظ کے لغوی معنی کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے، ”اس وقت کو یاد کرو، جب وہ دونوں فرشتے، جو انسان کی دائیں اور بائیں طرف نگرانی پر مامور ہیں۔ اس کے اعمال کو ضبط تحریر میں لاتے ہیں“ (اذ یتلقى المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعیدا)۔

یعنی انسان کے ظاہر و باطن پر خداوند عالم کے احاطہ علی کے علاوہ دو فرشتے بھی اس کے اعمال کے حساب و کتاب کی حفاظت اور نگہداری پر مامور ہیں، جو اس کی دائیں اور بائیں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں، اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے جدا نہیں ہوتے، تاکہ اس طریقہ سے زیادہ سے زیادہ اتمام حجت ہو، اور حساب اعمال کی تکمیل کے سلسلہ پر ایک تاکید ہو۔

”تلقى“ دریافت، اخذ اور ضبط کے معنی میں ہے، اور ”متلقیان“ دو فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال کو رقم کرنے پر مامور ہیں۔

”قعیدا“ قعود کے مادہ سے بیٹھنے والے کے معنی میں ہے۔ اور یہاں مراد مامور اور نگران ہے، دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ دو فرشتے انسان کی دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہیں، کیونکہ انسان کبھی بیٹھا ہوتا ہے اور کبھی چل رہا ہوتا ہے، بلکہ یہ تعبیر اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ وہ دونوں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ وہ دونوں انسان کے دائیں بائیں شانے پر یا دائیں بائیں داڑھوں پر ہمیشہ بیٹھے رہتے ہیں اور اس کے اعمال کو ثبت کرتے ہیں، اور بعض غیر معروف روایات میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

(بحار الانوار جلد ۵۹ ص ۸۶ روایت ۳۲)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ روایات اسلامی میں آیا ہے کہ دائیں طرف کافر شتہ تو نیکیوں کو لکھتا ہے اور بائیں طرف کافر شتہ

لہ اذ ” اذ یتلقى المتلقیان “ کے جملہ میں طرف ہے اور وہ ایک فعل محذوف سے متعلق ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے اذ کہروا اذ یتلقى المتلقیان، اس معنی کو مفسرین کی ایک جماعت نے قبول کیا ہے، لیکن ایک گروہ اس کو ”اقرب“ سے متعلق سمجھتا ہے۔ جو کہ اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورد اور اسی طرح اذ یتلقى المتلقیان کا جملہ اپنے استقلال کو محفوظ رکھتا ہے اور ایک دوسرے کو مقید نہیں کرتا، علاوہ انہیں دوسری تفسیر میں صدر ذیل کا تناسب چندال واضح نظر نہیں آتا۔

”قعیدا“ مغز ہے جبکہ ”متلقیان“ تشبیہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں ایک محذوف ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے ”اذ یتلقى المتلقیان عن الیمین قعیدا، وعن الشمال قعیدا“ جن میں سے ایک دوسرے کے قرینہ سے محذوف ہے۔

انہوں کو لکھتا ہے اور پہلا فرشتہ دوسرے کا حاکم ہے، جس وقت انسان کسی نیک کام کو انجام دیتا ہے تو دائیں طرف کا فرشتہ اس سے دس گنا لکھ لیتا ہے، اور جب بُرا عمل اس سے سرزد ہوتا ہے اور بائیں طرف کا فرشتہ اُسے لکھنا چاہتا ہے، تو پہلا فرشتہ اس سے کہتا ہے، "طلہی نہ کرو" لہذا وہ اس کے لکھنے میں سات گھنٹہ کی تاخیر کرتا ہے۔ چنانچہ اگر مرتکب پشیمان ہو گیا اور اس نے توبہ کر لی تو پھر فرشتہ کوئی چیز نہیں لکھتا، اور اگر اس نے توبہ نہ کی تو پھر اس کے لیے صرف ایک ہی گنا لکھتا ہے۔ ۱۷

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومن انسان کے مرنے کے بعد وہ فرشتے کہتے ہیں پروردگار! تو نے اپنے بند کی اور حق قبض کر لی ہے، اب ہماری ماموریت کہاں ہے؟

خدا فرماتا ہے: میرا آسمان میرے فرشتوں سے پُر ہے، جو ہمیشہ میری عبادت کرتے ہیں، اور زمین بھی مطیع و فرمانبردار مخلوق سے پُر ہے، تم میرے بندے کی قبر کی طرف جاؤ اور وہاں تسبیح و تحمید، تہلیل کہو، اور اُسے قیامت کے دن تک میرے بندے کی نیکیوں میں لکھو۔ ۱۸

ایک اور دوسری روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر نے فرمایا:

جو مسلمان بیمار ہو جاتا ہے، خدا اس کے اعمال کے محافظ فرشتوں سے کہتا ہے، جب تک وہ بیمار ہے، وہ اعمال جو وہ صحت کی حالت میں انجام دیا کرتا تھا، اس کے لیے لکھے رہو، اس کے بعد پیغمبر نے فرمایا:

"من مرض او سافر كتب الله تعالى له ما كان يعمل صحيحاً مقيماً؛

"جو شخص بیمار ہو جائے یا سفر میں ہو تو خدا وہی (نیک) اعمال جو وہ صحت میں اور حالت قیام میں انجام دیا کرتا تھا اس کے لیے لکھتا ہے۔ ۱۹

اور یہ سب کے سب الطاف خداوندی کی وسعت کی طرف پر معنی اشارے ہیں۔

آخری ذریعہ بحث آیت میں پھر ثبوت اعمال کرنے والے فرشتوں کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے کہتا ہے: انسان کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا، بلکہ اس کے پاس ایک نگرانی کرنے والا فرشتہ اپنی ماموریت کی انجام دہی کے آمادہ ہے، (ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید)۔ ۲۰

گذشتہ آیت میں انسان کے تمام اعمال رقم ہونے کے بارے میں گفتگو تھی، اور اس آیت میں خاص طور پر اس کے الفاظ اور باتوں پر بھی تکیہ کیا گیا ہے، اور یہ اس حد سے زیادہ اہمیت اور نقش مؤثر کی بنا پر ہے، جو انسانوں کی زندگی میں ان

۱۷ "صحیح البیان" ج ۹ ص ۱۳۳۔

۱۸ سابقہ مد رک

۱۹ "روح المعانی" جلد ۲۶ ص ۱۶۵ ذریعہ بحث آیات کے ذیل میں سی مضمون کتاب "کافی" میں امام صادق سے بھی نقل ہوا ہے۔

(بمبارالانوار جلد ۹ ص ۱۸۷ روایت ۳۲-۳۵)

۲۰ "لدیہ" کی ضمیر "قول" کی طرف لٹھی ہے یہ احتمال بھی ہے کہ کہنے والے کی طرف لٹھے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

کی گفتار کو حاصل ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ایک ہی جملہ اجتماعی راستے کو غیر یا شرکی طرف موڑ دیتا ہے۔ اور اس بنا پر بھی کہ بہت سے لوگ اپنی باتوں کو اپنے اعمال کا جز نہیں سمجھتے، اور وہ اپنے آپ کو بات کرنے میں آزاد آزاد خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے موثر ترین اور خطرناک ترین اعمال اُس کی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ اس بنا پر اس آیت کا ذکر گذشتہ آیت کے بعد، عام کے بعد خاص کے ذکر کے قبیل سے ہے۔

رقیب "مراقب اور نگران کے معنی میں ہے اور عتید "اس شخص کے معنی میں ہے، جو کسی کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہو، لہذا اس گھوڑے کو جو دوڑنے کے لیے تیار ہو "فوس عتید" کہتے ہیں اور جو شخص کسی چیز کو ذخیرہ، اور اس کی حفاظت کرتا ہے اسے بھی "عتید" کہا جاتا ہے (مادہ "عتاد" بر وزن جہاد سے ذخیرہ کرنے کے معنی میں ہے) اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ رقیب "عتید" وہی دو فرشتے ہیں جنہیں گذشتہ آیت میں "متلقیان" کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، دائیں طرف کے فرشتے کا نام "رقیب" ہے اور بائیں طرف کے فرشتے کا نام "عتید" اگرچہ زیر بحث آیت میں اس مطلب کی صراحت نہیں ہے، لیکن مجموع آیات کے ملاحظہ سے اس قسم کی تفسیر بعید نظر نہیں آتی۔

اس بار سے میں کہ یہ دونوں فرشتے کونسی باتوں کو لکھتے ہیں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ وہ سب کچھ لکھتے ہیں، یہاں تک کہ اس نالہ و فزاد کو بھی جو سرور رکھنے والا سرور کے موقع پر کرتا ہے، جب کہ بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ صرف خیر و شر، واجب و مستحب یا حرام و مکروہ الفاظ لکھتے ہیں، اور مباحات کے ساتھ انھیں کوئی سروکار نہیں ہے، لیکن آیت کی تعبیر کی عمومیت بتاتی ہے کہ انسان کے تمام الفاظ و گفتار ثبت ہوتی ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادق سے آیا ہے:

"ان المؤمنین اذا تعدايتحدثان قالت الحفظة بعضها البعض اعتزلوا بناء فلعل لهما سراً وقد ستر الله عليهما!"

"جب دو مؤمن ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں اور خصوصی باتیں کرنے لگتے ہیں، تو محافظ اعمال فرشتے ایک دوسرے سے کہتے ہیں، ہمیں ایک طرف ہو جانا چاہیے شاید ان کے درمیان کوئی ایسا راز ہو جسے خدا نے مستور رکھا ہو۔"

راوی کہتا ہے: کیا خدا یہ نہیں فرماتا: "ما يلفظ من قول الا ليد رقيب عتيد" انسان کوئی بات نہیں کرتا مگر یہ کہ نگران فرشتہ اور ثبت اعمال کے لیے آمادہ فرشتہ اس کے پاس حاضر ہے۔ امام نے فرمایا:

"ان كانت الحفظة لا تسمع فان عالم السميع ويرى؛
" اگر محافظین ان کی باتوں کو نہیں سنتے تو وہ خدا جو اسرار سے باخبر ہے وہ تو سنتا اور دیکھتا ہے۔"

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم مومن کے اکرام و احترام کے لیے اس کی بعض باتوں کو جو خاص راز کا پہلو رکھتی ہیں ان فرشتوں سے پوشیدہ رکھتا ہے، لیکن وہ خود ان تمام اسرار کا محافظ ہے۔
بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں کے علاوہ ہیں۔ جیسا کہ سورہ اسراء کی آیت ۷۸ میں ہم اس چیز کو پیش کر چکے ہیں۔

ایک نکتہ

دوست مجھ سے بھی زیادہ میرے نزدیک ہے

بعض فلاسفہ کہتے ہیں: "جس طرح شدت بصر پوشیدگی کا موجب ہے اسی طرح شدت قرب بھی پوشیدگی کا موجب ہے، مثلاً اگر سورج ہم سے بہت دور ہو جائے تو وہ دکھائی نہیں دے گا۔ اور اگر ہم اس سے بہت زیادہ نزدیک ہو جائیں، تو اس کی روشنی اتنی خیرہ کرنے والی ہے، کہ پھر بھی ہم اس کو دیکھنے پر قادر نہیں ہیں۔
اور درحقیقت خدا کی ذات پاک بھی اسی طرح کی ہے، "یا من هو اختلفی لفرط انوره" اے وہ کہ جو شدت نورانیت کی وجہ سے ہماری نگاہ سے پوشیدہ ہوا ہے!"
زیر بحث آیات میں بھی بندوں سے خدا کی حد سے زیادہ نزدیکی ایک عمدہ تشبیہ کے ضمن میں بیان ہوئی ہے، کہ وہ ہماری نظر سے بھی ہم سے زیادہ نزدیک ہے۔

یہ نزدیکی، ہماری اس سے زیادہ شدید وابستگی سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے۔
یہاں تک کہ اس قسم کی تشبیہیں بھی: کہ تمام عالم جسم ہے اور وہ روح عالم ہے۔ تمام عالم شعاع کی مانند ہے اور وہ قرص آفتاب ہے۔ یہ سب اس قرب کے رابطہ کو بیان نہیں کر سکتیں، اور بہترین تعبیر وہی ہے، جو امیر المومنینؑ نے (بیچ السبلانہ کے پہلے خطبہ میں) بیان فرمائی ہے:

"مع كل شیء لا بمقارنتہ وغیر كل شیء لا بمزایلتہ:"

"وہ تمام موجودات کے ساتھ ہے، لیکن اس طرح نہیں کہ ان کے قرین ہو، اور تمام موجودات سے جدا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ان سے الگ ہو"

فلاسفہ کی ایک جماعت نے اس حد سے زیادہ قرب کے بیان کے لیے ایک اور تشبیہ بیان کی ہے، انھوں نے خدا کی ذات کو "اسم" کے معنی ہے اور باقی موجودات کو "حرف" کے معنی سے تشبیہ دی ہے۔

اس کی وضاحت : یہ ہے کہ جس وقت ہم یہ کہتے ہیں (کعبہ کی طرف رخ کرو) ”رو بہ کعبہ کن“ تو لفظ ”بہ“ کا اکیلے کوئی مفہوم نہیں ہے، جب تک اس کے ساتھ لفظ ”کعبہ“ کا اضافہ نہ ہو، وہ گونگا، مبہم اور ناقابل فہم ہے، اس بنا پر کسی حرف کا اکیلے کوئی معنی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ کسی ”اسمی“ معنی کے ہمراہ نہ ہو۔

تمام موجودات عالم کی ہستی بھی اسی طرح ہے، کہ اس کی ذات کے ساتھ وابستگی اور پیوند کے بغیر نہ اصلاً اس کا کوئی مفہوم ہے اور نہ ہی اس کے لیے کوئی وجود و بقا ہے، اور یہ چیز خدا کے بندوں کے ساتھ انتہائی قرب اور بندوں کے خدا کے ساتھ انتہائی قرب کی نشاندہی کرتی ہے، اگرچہ بے خبر اس معنی سے غافل ہیں۔

دوست نزدیک ترا ز من بہ من است ویں عجب تر کہ من از وی دورم

چکنم با کہ تو ال گفت کہ دوست در کنار من و من مہجورم !

”میرا دوست مجھ سے خود مجھ سے بھی زیادہ نزدیک ہے، لیکن زیادہ عجمیت بات یہ ہے کہ میں پھر بھی اس سے دور ہوں، میں کیا کروں اور کس سے کہہ سکتا ہوں کہ دوست تو میرے پہلو میں ہے۔ لیکن میں پھر بھی ہجر

و فراق میں ہوں۔“

- ۱۹۔ وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ ○
 ۲۰۔ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ذَلِكَ يَوْمَ الْوَعِيدِ ○
 ۲۱۔ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ ○
 ۲۲۔ لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ
 فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ○

ترجمہ

- ۱۹۔ اور انجام کار سکرات موت حق کے ساتھ پہنچ جائے گی، (اور انسان سے کہا جائے گا) یہ وہی چیز ہے کہ جس سے تو بھاگا کرتا تھا۔
 ۲۰۔ اور صور بھونکا جائے گا، وہی دن تو دحشت ناک وعدہ کے پورا ہونے کا دن ہے۔
 ۲۱۔ اور ہر انسان محشر میں وارد ہوگا، جب کہ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ اس کے ساتھ ساتھ ہوگا۔
 ۲۲۔ (اس کو خطاب ہوگا) تو اس منظر (اور عظیم دادگاہ) سے غافل تھا، اور ہم نے تیری آنکھ سے پردہ ہٹا دیا ہے اور آج تیری نظر بہت تیز ہو گئی ہے۔

تفسیر قیامت اور تیز بین آنکھیں

ان آیات میں "معاد" سے مربوط مسائل میں سے کچھ اور دوسرے مناظر کو پیش کیا گیا ہے، "موت" کا منظر "نفع موت"

کا منظر اور ”محشر میں حاضر ہونے کا“ منظر۔

پہلے فرماتا ہے، ”آخر کار سکرات موت حق کے ساتھ پہنچ جائے گی“ (وجاءت سكرة الموت بالحق)۔
 ”سكرة الموت“ ”مستی“ سے مشابہ ایک حالت ہے جو موت کے مقدمات کے ظاہر ہونے کے اثر میں حد سے زیادہ ہیجان و انقلاب کی صورت میں انسان کو عارض ہوتی ہے، اور بعض اوقات اس کی عقل پر بھی غالب آجاتی ہے، اور اس کو اضطراب اور ایک شدید بے آرامی میں ڈبو دیتی ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو، درحالیہ موت ایک اہم انتقالی مرحلہ ہے جس میں انسان کو، اس جہاں سے جس میں اس نے ساہا ہاں تک رہنے کی عادت ڈالی تھی، اپنے تمام رشتوں اور تعلقات کو چھوڑنا پڑے گا، اور اُسے اس عالم میں قدم رکھنا ہوگا جو اس کے لیے کاٹا گیا اور اسرار آمیز ہے، خاص طور پر یہ بات کہ انسان موت کے وقت ایک نیا ادراک اور نئی نگاہ پیدا کر لیتا ہے، اس جہاں کی بے ثباتی کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے، اور موت کے بعد کے حوادث کو بھی کم و بیش دیکھ رہا ہوتا ہے، یہ وہ منزل ہے کہ ایک عظیم وحشت اس کو سر سے پاؤں تک گھیر لیتی ہے، اور مستی کے مشابہ ایک حالت اس کو عارض ہو جاتی ہے، لیکن وہ ”مست“ نہیں ہوتا۔ لہ

یہاں تک کہ انبیاء اور مردان خدا بھی جو موت کے وقت کامل اطمینان اور آرام کی حالت میں ہوتے ہیں، اس انتقالی لمحہ کی شدتوں اور مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں، جیسا کہ پیغمبر کے حالات میں آیا ہے کہ اپنی عمر مبارک کے آخری لمحات میں اپنا ہاتھ ایک پانی کے برتن میں ڈالتے تھے اور اپنے منہ پر پھیرتے تھے، اور ”لا الہ الا اللہ“ کہتے تھے اور فرماتے تھے؛

”ان للموت سكرات“؛ موت کے لیے سکرات ہے۔ لہ

علی موت کے لمحہ اور اس کی سکرات کی ایک بہت ہی عمدہ تصویر کھینچتے ہیں، فرماتے ہیں۔

اجتمعت علیہم سكرة الموت وحسرت الفوت، ففترت لہا اطرافہم وتغیرت لہا
 الواظہم، ثق ازداد الموت فیہم ولو جافیل بین احدہم و بین منطقہ، وانہ لبین
 اہلہ ینظر بصرہ ویسمع باذنہ، علی صحۃ من عقلہ، ولقاء من لبہ، یکفر فیوافنی
 عمرہ؛ وفیما اذہب دہرہ؛ وی تذکر اموالا جمعہا اغمض فی مطالبہا واخذھا من
 مصرحاتہا، ومشتبہا تھاقد لزمته تبعات جمعہا، واشرف علی فراقہا، تبقی لمن
 ورائہ ینعمون فیہا ویتمتعون بہا۔

لہ ”سکر“ (بروزن سکر) اصل میں پانی کی راہ کو مسدود کرنے کے معنی میں ہے اور سکر (بروزن سکر) مسدود مقام و محل کے معنی میں آیا ہے، اور چونکہ مستی کی حالت میں گویا انسان اور اس کی عقل کے درمیان ایک سد پیدا ہو جاتی ہے، لہذا اس کو ”سکر“ (بروزن سکر) کہا جاتا ہے۔

سکرات موت۔ اپنے پاس کی ہر چیز کو کھودینے کی حسرت کے ساتھ۔ ان پر هجوم کرتی ہے، ان کے بدن کے اعضاء سُست ہو جاتے ہیں، ان کے چہروں کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ موت ان میں نفوذ کرنے لگتی ہے، ان کے اور ان کی زبان کے درمیان جدائی ڈال دیتی ہے، حالانکہ وہ اپنے گھر والوں کے درمیان بے اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور اپنے کان سے سُن رہا ہوتا ہے، اور اس کی عقل دہوش صبح و سالم ہوتے ہیں، لیکن وہ بات نہیں کر سکتا۔

اس حالت میں وہ سوچتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کس راستے میں فنا کی؟ اور اپنا زمانہ کس راستے میں ختم کیا؟ اس دولت و ثروت کی یاد اُسے ستاتی ہے، جس کے جمع کرنے میں اس نے چشم پوشی سے کام لیا تھا، اور طلال و حرام اور مشکوت و مشتبہ اکٹھا کرتا رہا تھا، اور اس کے جمع کرنے کے نتائج اور ذمہ داری اپنے کندھے پر لے گا، حالانکہ اُن سے جدائی اور فراق کا وقت آن پہنچا ہے، اور وہ لپہانہ لگان کے ہاتھوں میں چلا جائے گا، وہ تو اس سے متنعم ہوں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن اس کا حساب و کتاب اور اس کے لیے جو ابد ہی اس کے ذمہ ہوگی۔ لے

اور دُنیا سے انسانیت کا یہ عظیم علم ایک دوسری جگہ خبردار کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

”انکم لو قد عاینتم ما قد عاین من مات منکم لجزعتم و وہلت و سمعتم و اطعتم و لکن محجوب عنکم ما قد عاینوا و قریب ما یطرح الحجاب!“ لے

اگر وہی چیز جس کا تمہارے مردوں نے مشاہدہ کیا ہے، تم بھی دیکھ لیتے، تو گھبرا جاتے، اور ڈر جاتے، حق کی باتوں کو سنتے اور اطاعت کرتے، لیکن انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ تم سے ستر ہے اور عنقریب پردے ہٹ جائیں گے اور تم بھی اس کا مشاہدہ کر دو گے۔ (لیکن افسوس.....)

اس کے بعد قرآن اس گفتگو کو جاری رکھتا ہے، ”اس شخص کو جو سکرات موت کی حالت میں ہے، کہا جائے گا،

یہ وہی چیز ہے جسے تو پسند نہیں کرتا تھا اور اس سے بھاگتا تھا“ (ذالک ما کنت منذ تحید) لے

ہاں ہوت ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے اکثر لوگ بھاگتے ہیں، کیونکہ وہ اس کو ”فنا“ سمجھتے ہیں کہ عالم ”بقار“ کا ایک دریچہ یا ان شدید رشتوں اور تعلقات کی وجہ سے جو وہ دُنیا اور مادی نعمتوں کے ساتھ رکھتے ہیں اور ان سے دل نہیں ہٹا سکتے یا اپنے نامہ اعمال کے سیاہ ہونے کی وجہ سے!

جو کچھ بھی ہے، وہ اس سے بھاگتے ہیں، لیکن کیا فائدہ، کیونکہ یہ ایک ایسی نوشت ہے جو سب کے انتظار میں ہے، اور ایک ایسا اونٹ ہے جو ہر گھر کے دروازے پر بیٹھا ہے، اور کسی میں اس سے ساگنے کی طاقت نہیں ہے، آخر کار سب

لے ”بیج البلاغہ“ خطبہ ۱۹۔

لے ”بیج البلاغہ“ خطبہ ۲۰۔

لے ”تجدید“ جلد بروزن صید کے مادہ سے۔

کے سب موت کے منہ میں چلے جائیں گے، اور ان سے کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے، جس سے تم بھاگتے تھے؟ اس بات کا کہنے والا ممکن ہے خدا ہو، یا فرشتے یا جبرائیل یا سب کے سب۔

اس حقیقت کو قرآن دوسری آیات میں بھی دل نشیں کراتا ہے۔ سورہ نساء کی آیت ۸، میں فرماتا ہے: "اینا ما نکونوا بیدرکم الموت ولو کنتم فی بروج مشیة: تم جہاں کہیں بھی ہوں گے موت تمہیں وہیں آئے گی چاہے تم مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو۔"

بعض اوقات مفرور انسان ان تمام عین حقائق اور واقعتوں کو آنکھ سے دیکھنے کے باوجود خود خواہی اور حسب دنیا کی وجہ سے بالکل ہی بھلا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ قسم کھانے لگتا ہے کہ میں تو عمر جاودانی رکھتا ہوں، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "اولم تکونوا اقمتمو من قبل مالکم من ذوال: کیا تم ہی نہیں تھے، جو پہلے یہ قسم کھایا کرتے تھے، کہ تمہارے لیے ہرگز فنا و زوال نہیں ہے؟" (حجر - ۴۴)

لیکن چاہے وہ قسم کھائے یا نہ کھائے، وہ یقین کرے یا نہ کرے، موت ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر شخص کو دامن گیر ہوگی اور اس سے راہ فرار نہیں ہے۔

اس کے بعد نفخ صور کے مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "صور ھو نکا جائے گا، اور وہ دن وحشتناک وعدوں کے پورا ہونے کا دن ہے" (ونفخ فی الصور ذالک یوم الوعد)۔

"نفخ صور" سے مراد وہی "دوسرا نفخ" ہے، کیونکہ - جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں - دوسری "صور" پھونکا جائے گا، پہلا نفخ جسے نفخ "فرع" یا "صعق" کہتے ہیں، وہ نفخ ہے جو اس عالم کے اختتام پر صورت پذیر ہوگا، اور تمام انسان اس کے سننے سے مرجائیں گے اور عالم دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اور دوسرا نفخ جو "قیام" و "جمع" و "حضور" کا نفخ ہے، وہ نفخ ہے جو قیامت کے آغاز میں انجام پائے گا، جس سے تمام انسان زندہ ہو جائیں گے اور اپنی قبروں سے نکل کر حساب کتاب کے لیے عدل الہی کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

"نفخ" اصل میں پھونکنے کے معنی میں ہے، اور "نفخ" ایک بار پھونکنے کے معنی میں ہے، اور "صور" "شہ پور" (بگل) کے معنی میں ہے، جس کے ذریعہ عام طور پر فوجیوں کو جمع ہونے، یا حاضر ہونے، یا آرام کرنے یا سونے کے لیے احکام دیتے ہیں، اور "صور اسرافیل" کے بارے میں اس کا استعمال ایک قسم کا کنایہ اور تشبیہ ہے جس کی تفصیل جلد ۱۱ (سورہ زمر کی آیت ۶۸) کے ذیل میں آئی ہے۔

بہر حال آیت کے ذیل میں (ذالک یوم الوعد) "آج عذاب کے وعدہ کا دن ہے" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ "نفخ صور" سے مراد یہاں وہی دوسرا نفخ اور قیامت ہے۔

بعد والی آیت میں محشر میں ورود کے وقت انسانوں کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے: "اس دن ہر انسان (خواہ نیک ہو یا بد) عرصہ محشر میں اس حال میں وارد ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک تو ہنکانے والا ہوگا اور ایک گواہ ہوگا" (وجاءت کل نفس معها سائق وشہید)۔

”سائق“ اُسے دادگاہ عدل الہی کی طرف ہانک کر لے جائے گا۔ اور ”شہید“ اس کے اعمال پر گواہی دے گا۔ ٹھیک اس جہان کی عدالتوں کی طرح کہ حکومت کا مامور شخص متہم کے ساتھ ہوتا ہے، اور اس کے اعمال کا شاہد گواہی دیتا ہے۔

بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ ”سائق“ وہ شخص ہے جو نیکو کاروں کو ہنکا کر جنت کی طرف لے جائے گا۔ اور بدکاروں کو جہنم کی طرف، لیکن لفظ ”شہید“ (شاہد گواہ) کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا معنی یعنی عدل الہی کی دادگاہ و عدالت کی طرف ہنکانا زیادہ مناسب ہے۔ اس بارے میں کہ ہنکانے والا اور شاہد فرشتوں میں سے ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور؟ طرح طرح کی تفسیریں کی گئی ہیں۔

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ ”سائق“ نیکیاں لکھنے والا فرشتہ ہے۔ اور ”شہید“ ستیات (برائیاں) لکھنے والا فرشتہ ہے۔ اس طرح سے وہ ایسے فرشتے ہیں جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ ایک روایت سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ”سائق“ موت کا فرشتہ ہے اور ”شہید“ پیغمبر اسلام ہیں، لیکن یہ روایت آیات کے لب و لہجہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ضعیف نظر آتی ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ”سائق“ وہ فرشتہ ہے، جو ہر انسان کو ہنکاتا ہے اور ”شہید“ انسان کا عمل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”سائق“ تو فرشتہ ہے اور ”شہید“ انسان کے بدن کے اعضاء ہیں، یا اس کا وہ نامہ اعمال ہے جو اس کی گردن میں لٹکایا جائے گا۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ”سائق“ اور ”شہید“ ایک ہی فرشتہ ہے اور ان دونوں کا ایک دوسرے پر عطف ان دو صفات کی معاشرت کی وجہ سے ہے، یعنی اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہے جو اس کو دادگاہ عدل الہی کی طرف ہنکاتا بھی ہے اور اس کے اعمال پر گواہ بھی ہے۔

لیکن ان میں سے اکثر تفاسیر ظاہر آیت کے خلاف ہیں اور آیت کا ظاہر۔ جیسا کہ اکثر مفسرین نے بھی یہی سمجھا ہے یہ ہے کہ دو فرشتے ہر انسان کے ساتھ آئیں گے، ایک اس کو چلائے گا اور دوسرا اس کے اعمال کی گواہی دینگا۔ یہ بات کہے بغیر واضح ہے، کہ بعض فرشتوں کی گواہی، قیامت کے دن، وہیں دوسرے گواہوں کے موجود ہونے کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتی، مثلاً ایسے گواہ جیسے انبیاء، اعضاء بدن، نامہ اعمال، وہ زمان و مکان جن میں گناہ انجام پایا ہے بہر حال پہلا فرشتہ حقیقت میں ”فرار“ سے مانع ہے، اور دوسرا فرشتہ ”انکار“ سے مانع ہے۔ اور اس طرح سے ہر انسان اس دن اپنے اعمال میں گرفتار ہوگا، اور ان کی جزا و سزا سے گریز کی کوئی راہ نہ ہوگی۔

یہاں مجرموں کو یا تمام انسانوں کو خطاب ہوگا کہ تو اس عظیم دادگاہ سے غافل تھا، اور اب ہم نے تیری آنکھ سے

پردہ ہٹا دیا ہے۔ آج تیری آنکھ اور نظر تیز ہو گئی ہے، ”لقد كنت في غفلة من هذا فكشفنا عنك غطائك فبصرك اليوم حديد۔“

ہاں! مادی دُنیا کے پردے، امیدیں، آرزوئیں، دُنیا کے ساتھ عشق اور لگاؤ، بیوی اور اولاد، مال و مقام، سرکش ہونا و ہوس، بغض و حسد، تعصب، جہالت اور ہٹ دھرمی تجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ آج کے دن کے لیے اسی زمانہ سے دیکھتا، جبکہ معاد و قیامت کی نشانیاں واضح تھیں، اور اس کے دلائل روشن و آشکار!

آج غفلت کا گرد و غبار بیٹھ گیا ہے، جہالت، تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے ہٹ گئے ہیں، خواہشات، امیدوں اور آرزوؤں کے پردے چاک ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ جو پردہ غیب میں ستور تھا وہ سب ظاہر ہو گیا ہے، چونکہ آج کا دن ”یوم البروز“ ہے، اور ”یوم الشہود“ اور ”یوم تہی السرائر“ ہے۔ اسی بنا پر آج تیری نظر تیز ہو گئی ہے، اور تو حقائق کو اچھی طرح سے درک کر سکتا ہے۔

ہاں! حقیقت کا چہرہ پوشیدہ نہیں ہے، اور جمال یا پردہ نہیں ہے، لیکن راستہ کے غبار کو بٹھانا چاہیے تاکہ اس کا دیدار کیا جاسکے۔

جمال یا رندادِ حجاب و پردہ دے غبارِ رہ نشان تا نظر توانی کرد
لیکن طبیعت کے کنویں میں ڈوب جانا، اور انواع و اقسام کے جابلوں میں گرفتار ہونا انسان کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ حقائق کو اچھی طرح سے دیکھ سکے، لیکن وہ دن جس میں تمام تعلقات اور رشتے ختم ہو جائیں گے تو انسان طبعی طور پر ایک نیا ادراک اور نئی نگاہ پیدا کر لے گا، اور اصولی طور پر قیامت کا دن حقائق کے ظہور اور آشکار ہونے کا دن ہے۔ یہاں تک کہ اس جہان میں بھی ان لوگوں کے لیے جو ان جابلوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا سکتے ہیں، اور اپنے آپ کو شہوات کی قید کے نیچے سے رہائی دلا سکتے ہیں، ایسا ادراک و نظر پیدا ہو جاتا ہے، جس سے دنیا والے محروم ہیں۔ اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ ”حسید“ اصل میں ”لوہے“ کے معنی میں ہے، اور تیز چاقو یا تیز تلوار کے معنی میں بھی ہے، اس کے بعد اس کا تیز بینی اور تیز فہمی پر اطلاق ہونے لگا، جیسا کہ ”برندہ“ (کاٹنے والی، تلوار اور چھری کی صفت ہے) لیکن فارسی زبان میں زبان گویا اور لفظ فصیح پر بھی برندہ کا اطلاق ہوتا ہے، اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ ”بصر“ سے مراد یہاں ظاہری آنکھ نہیں ہے، بلکہ وہی عقل اور دل کی آنکھ ہے۔

علی علیہ السلام روئے زمین میں خدا کی جنتوں کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں :

”هجم بهم العدم علی حقيقة البصيرة، و باشر و اروح اليقين، و استلانا ما استعوره المترفون، و انسابا ما استوحش منه الجاهلون و صحبوا الدنيا بابدان ارواحها معلقة بالمحل الاعلیٰ، اولئك خلفاء الله فی ارضه و الدعاة الی دینه“
”علم و دانش نے حقیقت بصیرت کے ساتھ ان کا رخ کیا ہے اور روح یقین کو انہوں نے لمس کیا ہے“

جس چیز کو دنیا پرست شکل شمار کرتے ہیں، وہ ان کے لیے آسان ہے، اور جس چیز سے جاہل لوگ وحشت رکھتے ہیں اس سے ان کو اُتس ہے، وہ اس دنیا میں ایسے بدنوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، جن کے اڑاع عالم بالا سے پوستانہیں، وہ زمین میں خدا کے خلفاء ہیں اور خدا کے دین کی طرف دعوت دینے والے ہیں؛ لہ

چند نکات

۱۔ موت کی حقیقت

عام طور پر لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ موت ایک علمی امر ہے اور وہ فنا کے معنی میں ہے، لیکن یہ نتیجہ ہرگز اس معنی کے ساتھ موافق نہیں ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، اور جس کی طرف دلائل عقلی رہنمائی کرتے ہیں۔

”موت“ قرآن کی نظر سے ایک امر وجودی ہے، ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف ایک انتقال اور عبور ہے اسی لیے قرآن کی بہت سی آیات میں ”موت“ کو ”توئی“ سے تعبیر کیا گیا ہے، جو داپس لینے اور فرشتوں کے ذریعہ رُوح کو بدن سے حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔

اور پر والی آیات ”وجاءت سكرة الموت بالحق“ ”موت کے شدائد حق کے ساتھ انسان کے پاس آتے ہیں“ کی تعبیر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ بعض آیات میں موت کو صراحت کے ساتھ خدا کی مخلوق شمار کیا ہے، اذی خلق الموت والحیوة: (ملک-۲)

اسلامی روایات میں موت کی حقیقت کے بارے میں مختلف تعبیریں آئی ہیں۔ ایک حدیث میں منقول ہوا ہے کہ علی بن الحسین امام سجاد علیہ السلام سے لوگوں نے سوال کیا: ”ما الموت؟“ موت کیا چیز ہے؟

آپ نے جواب میں فرمایا:

” للمؤمن كثرع ثياب وسخة قملة، وفك قيود، واغلال ثقيلة، والاستبدال بانخر الثياب، واطيبهار وائح، واوطى المراكب والنس المنازل۔“

لہ منج البلاغہ، ”کلمات قصار“ کلمہ ۱۴۷۔

لہ اس بارے میں کہ ”بالحق“ میں ”با“ کے کیا معنی ہیں؛ مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں، بعض نے اس کو ”با تعدیر“ لیا ہے اور حق کو موت کے معنی میں، جس نے اس جملہ کا معنی یہ ہوگا۔ سکرآت موت اس مطلب کو جو ایک حقیقت ہے۔ یعنی موت۔ کو ساتھ لاتے ہیں، اور کبھی اس کو ”ملاہست کے معنی میں“ لیتے ہیں یعنی ”سکرآت موت حق کے ساتھ آپہنچے ہیں“

” وللكافر كخلع ثياب فاخرة، والنقل عن منازل انيسة، و
والاستبدال باوسع الثياب واخشنها واوحش المنازل، واعظم
العذاب!؛

” مومن کے لیے تو ایسا ہے جیسے کہ میلا کچھ لاجوڑوں سے پُر لباس اتار بھیجنا، اور بھاری طوق وزنجیر کھولنا،
اور اس کو بہترین لباس، بہترین خوشبوؤں کے عطروں، اور نیک رفتار سواریلوں اور بہترین منزلوں سے بدل لینا،
اور کافر کے لیے ایسا ہے جیسے کہ فاخرہ لباس کو اتارنا اور مانوس منازل سے منتقل ہو کر میلے کچیلے اور سخت
ترین لباس کو تبدیل کرنا، اور وحشت ناک ترین منازل اور بزرگ ترین عذاب میں منتقل ہو جانا!“

امام محمد بن علی سے بھی یہی سوال ہوا تھا تو آپ نے فرمایا:

” هو النوم الذي يأتيكم كل ليلة الا انه طويل مدته، لا
يفتبه منه الا يوم القيامة“

” موت وہی نیند ہے جو ہر رات تمہیں آتی ہے، مگر یہ کہ اس کی مدت طولانی ہے اور انسان اس سے
قیات کے دن تک بیدار نہیں ہوتا۔“

ہم نے برزخ سے مربوط مباحث میں بیان کیا ہے، کہ برزخ میں اشخاص کی حالت مختلف ہے، بعض جیسے سوتے
ہوتے ہیں، اور بعض (شہداء) راہ خدا اور قوی الایمان مومنین کی مانند، طرح طرح کی نعمتوں میں غرق ہوں گے، جابر اور
اشقیاء کی جماعت عذاب میں گرفتار ہوگی۔

امام حسین بن علی سید الشہداء علیہ السلام نے بھی کربلا میں عاشورہ کے دن اور جنگ کے شدت اختیار کرنے کے وقت
موت کے بارے میں ایک لطیف تعبیر اپنے اصحاب سے بیان فرمائی تھی:

” صبرا بنی الکرام! فما الموت الا قنطرة تعبريكم عن البؤس
والضراء الى الجنان الواسعة، والتعيم الدائمة، فايكم يكره
ان ينتقل من سجن الى قصر، وما هو لاعدائكم الا كمن ينتقل
من قصر الى سجن وعذاب، ان ابى حدثني عن رسول الله (ص)، ان
الدنيا سجن المؤمن وجنة الكافر، والموت جسر هؤلاء
الى جناتهم، وجسر هؤلاء الى جحيمهم؛

” صبر کرو! اے کریم اور بزرگوار لوگوں کے بیٹو! موت تو صرف ایک پل ہے جو تمہیں تکلیفوں اور ناراحتیوں اور

رنج و الم سے بہشت کے وسیع باغات اور جاودانی نعمتوں کی طرف منتقل کر دیتی ہے، تم میں سے کون ایسا ہے، جو زندان سے قصر میں منتقل ہونے سے تکلیف میں ہو، لیکن تمہارے دشمنوں کی مثال اس شخص کی مانند ہے جسے قصر سے زندان اور عذاب کی طرف منتقل کریں۔ میرے باپ نے رسول خدا سے نقل فرمایا کہ دنیا مومن کے لیے زندان ہے اور کافر کے لیے بہشت اور موت اُن کے لیے تو جنت کے باغات کے لیے ایک پل ہے اور ان کے لیے جہنم کا پل ہے، لے

ایک اور حدیث میں منقول ہوا ہے کہ: امام موسیٰ بن جعفرؑ ایک ایسے شخص کے پاس گئے جو سکرات موت میں مبتلا تھا، اور کسی شخص کو اب نہیں دیتا تھا، لوگوں نے عرض کیا، اسے فرزند رسول (ﷺ) ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ موت کی حقیقت کی ہمارے لیے تشریح فرمائیے اور میں بتائیے کہ ہمارا بیباک کس حالت میں ہے؟

آپ نے فرمایا، ”موت تصفیہ کا ایک ذریعہ ہے۔“ جو مومنین کو گناہ سے پاک کرتی ہے، اور اس جہاں کی آخری تکلیف اور ناراحتی ہے اور ان کے گناہوں کا آخری کفارہ ہے جب کہ کافروں کو ان کی نعمتوں سے جدا کرتی ہے، اور وہ آخری لذت ہے جو انہیں پہنچتی ہے اور ان کے اچھے کام کا جو کچھ بھی کھرا انجام دیا کرتے تھے۔ آخری اجر ہے، باقی رہا تمہارا یہ شخص جو حالت احتضار میں ہے تو وہ کلی طور پر گناہوں سے پاک ہو چکا ہے اور معاصی سے خارج ہو چکا ہے، اور خاص ہو گیا ہے، جس طرح سے کہ میلا کھینچا لباس دھونے سے پاک صاف ہو جاتا ہے اور اس نے ابھی سے یہ نشاستگی اور لیاقت پیدا کر لی ہے کہ وہ ہمیشہ کے گھر میں ہم الہ بیت کی معاشرت میں رہے“ لے

۲۔ سکرات موت

اد پر والی آیت میں ”سکرات موت“ کے بارے میں گفتگو تھی، اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ ”سکرات“ ”سکرۃ“ کی جمع ہے، اور زندہ اس حالت کے معنی میں ہے، جو شدت حادثہ کے زیر اثر مستی کے مشابہ انسان کو عارض ہوتی ہے اور اس کو سخت مضطرب کر دیتی ہے، لیکن وہ مستی نہیں ہوتی،

یہ ٹھیک ہے کہ موت مومنین کے لیے ایک وسیع تر اور مواہب اللہیہ سے پر جہان کی طرف انتقال کا آغاز ہے۔ لیکن اس کے باوجود انتقال کی یہ حالت کسی بھی انسان کے لیے آسان نہیں ہے، کیونکہ رُوح سالہا سال سے اس بدن کے ساتھ جوگر رہی ہے، اور اس کے ساتھ تعلق رکھا ہے۔

اسی لیے جب امام صادق علیہ السلام سے یہ سوال کرتے ہیں کہ جب رُوح بدن سے خارج ہوتی ہے تو انسان تکلیف

کیوں محسوس کرتا ہے تو آپ نے فرمایا: لاندنمی علیہا البدن: "اس بنا پر کہ بدن کی نشوونما اسی کے ساتھ ہوئی ہے یہ ٹھیک اس طرح ہے کہ ایک فاسد دانت کو منہ سے نکال دیں تو یقیناً اس کے بعد سکون و آرام ہوتا ہے۔ لیکن جدائی کا لمحہ دردناک ہوتا ہے۔"

بعض اسلامی روایات میں آیا ہے کہ تین دن انسان کے لیے وحشتناک ہوتے ہیں: ایک وہ دن جس میں وہ پیدا ہوا اور اسے نا آشنا عالم کو دیکھتا ہے، اور ایک وہ دن جس میں وہ مرتا ہے، اور موت کے بعد والے عالم کا مشاہدہ کرتا ہے، اور ایک وہ دن جس میں وہ عرصہ محشر میں وارد ہوگا، اور ایسے احکام دیکھے گا جو دنیا میں نہیں تھے، اسی لیے خداوند عالم یحییٰ بن زکریا کے بارے میں فرماتا ہے: "وسلام علیہ لیوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیاً" اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی بھی اس کے مشابہ گھٹکے کو نقل کرتا ہے، اور ان دو پیغمبروں کو ان تین دنوں میں اپنی عنایت کا مشمول قرار دیتا ہے، لہٰذا لیکن یہ مسلم ہے کہ جو لوگ اس دنیا کے ساتھ خاص علاقہ رکھتے ہیں، اس سے ان کا انتقال بہت ہی زیادہ سخت ہے، اور اس سے دل کو توڑنا جس کے ساتھ ان کو لگاؤ ہے زیادہ مشکل ہے، علاوہ ازیں جو لوگ زیادہ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، سکرات موت ان کے لیے زیادہ شدید اور زیادہ دردناک ہے۔

۳۔ موت حقیقی ہے

نہ صرف زیر بحث آیات میں 'سکرات موت' کا "حقی" کے ساتھ تعارف ہوا ہے، بلکہ دوسری متعدد آیات میں موت کو حقی کہا گیا ہے۔ سورہ حجرات کی آیت ۹۹ میں آیا ہے: "واعبد ربک حتی یأتیك الیقین" اپنے پروردگار کی عبادت کر یہاں تک کہ "یقین" (موت) تیرے پاس آجائے، (سورہ مدثر کی آیت ۴۷ میں بھی اس کے مشابہ تعبیر نظر آتی ہے) یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ انسان ہر چیز کا تو انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا، کہ انجام کار موت ہم سب کے گھردل کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور سب کو اپنے ساتھ لے جائے گی۔

موت کی حقانیت کی طرف توجہ، تمام انسانوں کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر طریقہ پر غور و فکر اور سچ بچار کریں، اور اس راستہ سے کہ جو ان کے آگے ہے باخبر ہوں اور اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کریں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے: "ایک شخص عمر کے پاس آیا اور کہا: میں فتنہ کو دوست رکھتا ہوں،

۱۔ "بخاری"، جلد ۶، ص ۱۵۸۔

۲۔ وہی مددک (کچھ تخمینے کے ساتھ) یحییٰ (ع) کے بارے میں سورہ مریم کی آیت ۱۵ میں آیا: "وسلام علیہ لیوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیاً" اور حضرت یسح کے بارے میں اسی سورہ کی آیت ۲۳ میں آیا ہے۔ "والسلام علی لیوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیاً" محمد پر سلام ہو جس دن پیدا ہوا اور جس دن مردن گا اور جس دن زندہ ہو کر دوبارہ اٹھایا جاؤں گا۔

از حق سے بیزار ہوں، اور اس چیز کی گواہی دیتا ہوں جسے کبھی نہیں دیکھا۔ عمر نے اس کو قید کر دیا، یہ بات علیؑ کے کانوں تک پہنچی۔ آپ نے فرمایا: اے عمر! اس شخص کو قید کرنا ظلم ہے، اور تو ایک تم کا ترشح ہو، اس نے کہا کیوں؟ آپ نے فرمایا، کیونکہ (اپنے مال اور اولاد کو دوست رکھتا ہے، جنہیں خدا نے قرآن کی ایک آیت میں "فتنہ" سے تعبیر کیا ہے: "انما أموالکم واولادکم فتنۃ"۔ وہ موت سے بیزار ہے اور قرآن میں اسے "حق" سے تعبیر کیا گیا ہے "وجاءت سكرة الموت بالحق"۔ وہ خدا کی یکتائی کی شہادت دیتا ہے جس کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ اس مقام پر عمر نے کہا: لولا علی لہلک عمر، "اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"۔

- ۲۳۔ وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ۝
 ۲۴۔ اَلْقِيَافِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ۝
 ۲۵۔ مَتَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ ۝
 ۲۶۔ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَالْقِيَةُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ۝
 ۲۷۔ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطَّغَيْتَهُ وَ لَكِنْ كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ۝
 ۲۸۔ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدُنِّي وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ ۝
 ۲۹۔ مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلَ لَدَتِي وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ۝
 ۳۰۔ يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَ تَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ ۝

ترجمہ

۲۳۔ اس کا ہم نشین فرشتہ کہتا ہے، یہ اس کا نامہ اعمال ہے، جو میرے پاس حاضر اور تیار ہے۔

۲۴۔ (خدا حکم دے گا) جہنم میں ڈال دو، ہر کافر متکبر اور بہٹ دھرم کو۔

۲۵۔ وہ شخص جو شدت کے ساتھ خیر سے مانع ہے، متجاوز ہے، اور شک میں پڑا ہوا ہے، (یہاں

تک کہ دوسروں کو بھی شک میں ڈالتا ہے)

۲۶۔ وہ شخص کہ جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار دے دیا ہے (ہاں) اُسے شدید عذاب

میں ڈال دو۔

- ۲۷۔ اور شیاطین میں سے اس کا ہم نشین کہے گا، پروردگارا! میں نے اُسے سرکشی کے لیے نہیں اُبھارا تھا، لیکن وہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں تھا۔
- ۲۸۔ خدا کہے گا، میرے پاس جدال و مخالفت نہ کرو، میں نے تو پہلے ہی تم پر انعامِ حجت کر دیا ہے۔
- ۲۹۔ میرا کلام تغیرنا پذیر ہے، اور میں کبھی بھی اپنے بندوں پر ستم نہیں کروں گا۔
- ۳۰۔ اس دن کو یاد کرو، جب ہم جہنم سے کہیں گے، کیا تو پُرا ہو گئی؟ اور وہ کہے کیا اس سے کچھ زیادہ بھی ہے۔

تفسیر

فرشتوں اور شیاطین میں سے انسان کے ہم نشین

ان آیات میں پھر معاد و قیامت کے ایک اور منظر کی تصویر کشی ہوئی ہے، ایک ایسا ہلا دینے والا منظر کہ انسان کا قرین فرشتہ اس کے اعمال اور کرتوتوں کو کھول کر رکھ دے گا، اور اس کی سزا کے لیے خدا کا حکم صادر ہو جائے گا۔ پہلے فرماتا ہے: "اس کا قرین کہے گا یہ اس کا اعمال نامہ ہے، جو میرے پاس حاضر اور تیار ہے" اور وہ اس کے تمام بڑے بڑے کاموں سے جو اس نے ساری عمر میں کیے ہیں پردہ اٹھا دے گا، (وقال قرینہ ہذا ما سجدتی عتید)۔

اس سلسلے میں کہ یہاں "قرین" سے کون مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ لیکن اکثر نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتہ ہے جو دنیا میں انسان کے ہمراہ تھا، اور اس کے اعمال کو ضبط کرنے پر مامور تھا اور (ادگاہ عدل الہی میں گواہی دے گا۔

گذشتہ آیات جو یہ بتی تھیں کہ جو شخص بھی عرصہء محشر میں وارد ہوگا، اس کے ساتھ ایک "سائق" اور "شید" ہوگا۔ اس کے اس معنی پر گواہ ہے، علاوہ ازیں اس آیت اور اس کی بعد والی آیت کا لب و لہجہ بھی اس معنی کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ (غور کیجئے)

لیکن بعض نے کہا ہے کہ ”قرین“ سے مراد یہاں ”شیطان“ ہے کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں یہ لفظ اس شیطان کے لیے جو مجرموں کا ہم نشین ہے اطلاق ہوا ہے، اس تفسیر کی بنا پر آیت کا معنی اس طرح ہوگا، ”اس کا ہم نشین شیطان کہے گا: میں نے اس مجرم کو جہنم کے لیے آمادہ کیا ہے، اور انتہائی کوشش جو میں کر سکتا تھا وہ میں نے اس کام میں صرف کی ہے“

لیکن یہ معنی نہ صرف گذشتہ آیات سے، اور اس آیت سے جو اس آیت کے بعد بلافاصلہ آئی ہے۔ مناسب نہیں ہے، بلکہ شیطان کا انسانوں کے گمراہ کرنے کے گناہ سے خود کو بری کہنا، جو لہجہ کی چند آیات میں آئے گا۔ اس کے ساتھ بھی سازگار نہیں ہے، کیونکہ اس تفسیر کے مطابق شیطان مجرموں کے انکار کرنے میں اپنی ذمہ داری کا اعتراف کر رہا ہے، جبکہ آگے آنے والی آیات میں یہ آیا ہے، ”قال قرینہ ربتنا ما اطمینتہ ولکن کان فی ضلالٍ بعید:“ اس کا قرین کہے گا، میں نے اُسے سرکشی کے لیے نہیں ابھارا تھا، لیکن وہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں تھا۔“ اور یہ پورے طور پر اس کے ساتھ تضاد رکھتی ہے۔

یہاں ایک تیسری تفسیر بھی بیان ہوئی ہے جو سب سے زیادہ بعید نظر آتی ہے، اور کوئی بھی قرینہ اس پر گواہی نہیں دیتا اور وہ یہ ہے کہ قرین سے مراد انسان کے دوست و احباب اور ہم نشین ہیں۔

اس کے بعد خدا نیت اعمال پر مامور دو فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: ”جہنم میں ڈال دو ہر شکر خود خواہ اور ہٹ دھرم کافر کو“ (القیٰ فی جہنم کل کفار عنید)۔

”عنید“ ”عناد“ کے مادہ سے تکبر، خود پسندی اور حق کو تسلیم نہ کرنے کے معنی میں ہے۔

اس بارے میں کہ یہ دو افراد جو اس گفتگو کے مخاطب ہیں کون ہیں؟ پھر طرح طرح کی تفسیریں بیان کی گئی ہیں، ایک گروہ نے اوپر والی تفسیر کو انتخاب کیا ہے، جبکہ بعض نے خازنان جہنم (وہ دو نفر جو جہنم پر مامور ہیں) کو مخاطب سمجھا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ہو سکتا ہے مخاطب صرف ایک ہی شخص ہو، وہی شہید گواہ جو مجرم کے ہمراہ عرصہ محشر میں دارو ہوگا، اور جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے، اور فعل کو تاکید کے لیے تشنیہ لایا گیا ہے۔ گویا دو مرتبہ تکرار کرتا ہے۔ ”اللق“ ”اللق“ ”پھینک دے“ ”پھینک دے“۔ . . . اور مخاطب واحد کے لیے تشنیہ کا استعمال عربی زبان میں موجود ہے۔ لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے، اور پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعد والی آیت میں ان کفار عنید کی چند قبیح اور مذموم صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”وہ شخص شدت کے ساتھ خیر سے مانع ہے، متجاوز ہے اور شک و تردید میں گرفتار ہے، بلکہ دوسروں کو بھی شک میں ڈالتا ہے“ (متاع للخیر معتد مریب)۔

”متاع“ چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ لہذا اس شخص پر بولا جاتا ہے جو کسی چیز سے بہت زیادہ منع کرے، اس بنا پر ”متاع للخیر“ وہ شخص ہے جو ہر صورت میں ہر کار خیر کا مخالف ہو۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت "ولید بن میسرہ" کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ وہ اپنے بھتیجوں سے کہتا تھا، جو شخص تم میں سے اسلام قبول کرے گا تو میں جب تک زندہ ہوں اس کی مدد نہیں کروں گا"۔ سہ "معتد" متجاوز کے معنی میں ہے، چاہے وہ دوسرے لوگوں کے حقوق میں متجاوز ہو، یا احکام الہی کی حدود سے تجاوز کرے۔

"مریب" "ریب" کے مادہ سے اس شخص کے معنی میں ہے، جو شک میں پڑا ہو یا ہو۔ ایسا شک جو بدبینی کے ساتھ ہو، یا جو دوسروں کو اپنی گفتار و عمل کے ساتھ شک میں ڈالتا ہے، اور ان کی گمراہی کا باعث بنتا ہے۔

اس گروہ عنید کے اوصاف کو جاری رکھتے ہوئے بعد والی آیت میں پھر مزید کہتا ہے: "وہی شخص جس نے خدا کے ساتھ دوسرا محبوب قرار دیا ہے، اور اس نے شرک اور دوگانگی کی راہ اختیار کر لی ہے" (الذی جعل مع اللہ الہا آخر)۔

ہاں "اس قسم کے شخص کو عذاب شدید میں ڈال دو" (فالقیہ فی العذاب الشدید)۔ ان چند آیات میں اس دوزخی گروہ کی چھ صفات بیان ہوئی ہیں، جن میں سے پانچ پہلی حقیقت میں ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں، اور چھٹی ان تمام اوصاف کی اصل جڑ کی توضیح ہے، کیونکہ: "کفار" اس شخص کے معنی میں ہے جو کفر میں بہت زیادہ اصرار کرتا ہے۔ اور یہ عناد پر منتہی ہوتا ہے۔

شخص معاند بھی منع خیرات پر اصرار کرتا ہے اور اس قسم کا آدمی طبعاً و فطرتاً دوسروں کے حقوق اور حدود الہی پر تجاوز کرتا ہے، افراد متجاوز سے اصرار کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی شک میں ڈال دیں اور ان سے ایمان کو سلب کر لیں۔ اس طرح سے پانچوں صفتیں "کفار" و "عنید" و "مناع للخیر" و "معتد" اور "مریب" ایک دوسرے کے ساتھ نہ ٹوٹنے والا رشتہ رکھتی ہیں، گویا ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ چھٹی صفت یعنی "الذی جعل مع اللہ الہا آخر" میں ان تمام انحرافات کی اصل جڑ بنیاد جو شرک سے بیان ہوئی ہے، کیونکہ وقت کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے کہ شرک ان تمام بد بختیوں کا عامل ہے۔

بعد والی آیت اس کافر ہٹ دھرم گروہ کی سر نوشت کے ایک دوسرے ماجر سے پردہ اٹھاتی ہے، اور وہ قیامت میں ان کا شیطان کے ساتھ مخصوصہ، جھگڑا اور بحث ہے، وہ تو اپنے تمام گناہ اغوا کرنے والے شیطانوں کی گردن میں

ڈالتے ہیں، لیکن اس کا قرین شیطان کہے گا، پروردگار! میں نے اسے طغیان اور سرکشی کے لیے آمادہ نہیں کیا تھا، اور اسے جبراً اس راستے پر نہیں لایا تھا، اس نے خود ہی اپنے میل و ارادہ سے اس راستے کو اختیار کیا ہے۔ اور وہی دُور دراز کی گمراہی میں تھا“ (قال قرینہ ربنا ما اطفیتہ ولکن کان فی ضلال بعید)۔

یہ تعبیر اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ ابراہیم کی آیہ ۲۲ میں آئی ہے، کہ شیطان اپنی برأت کے لیے کہے گا: وما کان لی علیکم من سلطان الا ان دعوتکم فاستجبتم لی فلا تلو مونی و لو موی انفسکم: ”میرا تم پر کسی قسم کا کوئی تسلط نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی تو تم نے اُسے قبول کر لیا، اس بنا پر مجھے سزا نہیں نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو سزا بخش کرو“

البتہ شیطان یہ نہیں چاہتا کہ انسان کے اغوار کرنے میں اپنے نقش و اثر کا کلی طور پر انکار کر دے، بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس بات کو ثابت کرے کہ اس میں کوئی جبر و اکراہ نہیں تھا، اور انسان نے اپنے میل و رغبت سے اس کے دوسو سوں کو قبول کیا ہے، اس بنا پر ”لا عوبسہم اجیبین“ میں ان تمام کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔“ (ص - ۸۲) والی آیت کے ساتھ کوئی تضاد نہیں ہے:

اگرچہ ان آیات میں صرف شیطان کے دفاع کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے اور شیطان پر کفار کے اعتراض کے بارے میں کوئی گفتگو نظر نہیں آتی، لیکن قرآن کی باقی آیات اور بعد والی آیت کے قرینہ سے طرفین کی گفتگو اجمالی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ قیامت میں ایک دوسرے کے ساتھ کھینچا تانی اور محبت باحترام کریں گے، کیونکہ بعد والی آیت میں آیا ہے: ”خدا فرماتا ہے: میرے پاس جدال و مخالفت نہ کرو، میں نے پہلے سے تم پر تمام حجت کر دیا ہے“ اور نخص ان منحوس سر نوشت سے باخبر کر دیا ہے“ (قال لا تختصموا لدی وقد قدمت الیکم بالوعید)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو میں نے شیطان سے کہا ہے: اذہب فمن تبعك منهم فان جہنم جزاؤکم جزاءً موفوراً: ”جا! ان میں سے جو کوئی بھی تیری اتباع کرے گا، تو تم سب کی دافر سزا جہنم ہے“ (اسرار - ۶۳)

اور دوسری طرف سے انسانوں کو بھی خبردار کر دیا ہے: لا ملین جہنم منک ومن تبعک منهم اجیبین: ”یقیناً میں جہنم کو تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے پُر کر دوں گا“ (ص - ۸۵)

یہ تبدیلی اور وعیدیں قرآن کی دوسری آیات میں بھی آئی ہیں اور وہ سب اس بات کی ترجمانی کرتی ہیں کہ خدائے انسانوں پر بھی اور شیاطین پر بھی تمام حجت کر دیا تھا، اور انھیں گمراہ کرنے اور گمراہ ہونے سے ڈرایا تھا۔ اس کے بعد اور زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: ”میری بات تغیرنا پذیر ہے، اور میرے کسی کلام میں تبدیلی نہیں ہوتی، اور

میں سرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کروں گا" (ما یبدل القول لدتی وما انا بظلام للعبید) ایہ بیان "قول" سے مراد وہی تہدیریں اور وعیدیں ہیں، جن کی طرف خدا نے مختلف آیات میں اشارہ کیا ہے، اور ان کے کچھ نمونے ہم نے اوپر پیش کیے ہیں۔

"ظلام" کی تعبیر صیغہ مبالغہ کی شکل میں بہت ظلم کرنے والا، جبکہ خدا معمولی سے معمولی ظلم بھی نہیں کرتا، ممکن ہے یہ بات کی طرف اشارہ ہو کہ خدا کا مقام علم و قدرت و عدل اس قسم کا ہے کہ اگر وہ کوئی چھوٹا سا ظلم بھی کرے تو وہ بہت بڑا اور زیادہ ہوگا، اور "ظلام" کا مصداق ہوگا، اسی بنا پر وہ ہر قسم کے ظلم سے دُور ہے۔

یا افراد و مصداق کی طرف ناظر ہے، کیونکہ اگر وہ کسی بندے پر کوئی چھوٹا سا ظلم بھی کرے تو اس کے مشابہ افراد بہت ہیں اور مجموعی طور پر بہت سا ظلم ہو جائے گا۔

بہر حال یہ تعبیر بندوں کے اختیار اور ارادے کی آزادی کی دلیل ہے، نہ تو شیطان مجبور ہے کہ شیطنت کرے اور نہ ہی کفار مجبور ہیں کہ راہ کفر و عناد اور راہ شیطان کو اختیار کریں، اور نہ ہی کسی شخص کے لیے اس کے قصد و ارادہ سے باہر قطعی سرنوشنت مقرر کر دی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے، کہ وہ کیسے فرماتا ہے: میری بات تغیرنا پذیر ہے، جبکہ بعض لوگ اس کے عفو و درگزر اور بخشش کے مشمول ہوتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے، کہ عفو و بخشش بھی حساب شدہ پروگرام کے مطابق ہی ہوتی ہے، اور اس بات کی فرع ہے کہ انسان نے کوئی ایسا کام انجام دیا ہو، جس سے وہ مجرم ہونے کے ساتھ ساتھ عفو و بخشش کی قابلیت اور شائستگی بھی رکھتا ہو اور یہ بات خود راز کی منتوں میں سے ایک سنت ہے، کہ وہ لوگ جو عفو و بخشش کے لائق ہیں انھیں اپنی عفو کا مشمول قرارے اور یہ بات بھی تفسیرنا پذیر ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں حوادث قیامت کے ایک مختصر اور ہلادینے والے حصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ہم جہنم سے کہیں گے، کیا تو پُرا ہو گئی؟ اور وہ جواب میں کہے گی: کیا اس سے زیادہ کبھی موجود ہے؟

یسوم نقول لجهنم هل امثلت و تقول هل من مزید ایہ اس سلسلے میں کہ "هل من مزید" سے کیا مراد ہے؟ دو تفسیریں کی گئی ہیں، پہلی یہ کہ یہ استفہام انکاری ہے،

یعنی "لدی" "یبدل" سے متعلق ہے، بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ قول سے متعلق ہونا چاہیے، لیکن پہلا سنی زیادہ مناسب ہے۔

اس بارے میں کہ یہاں "یسوم" کس سے متعلق ہے؟ تین نظریے پائے جاتے ہیں، پہلا یہ کہ "اذکروا" مذکور سے متعلق ہے، اس کا مخاطب تمام انسان ہیں، دوسرا یہ کہ "یبدل" سے متعلق ہے اور تیسرا یہ کہ "ظلام" سے متعلق ہے، جو اس سے پہلے والی آیت میں آیا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

یعنی جہنم کہے گی، اس سے زیادہ کا امکان نہیں ہے، تو اس طرح سے یہ سورہ سجدہ کی آیت ۱۳ کے ساتھ جو یہ کہتی ہے: لاصْلِقُ جَمَلْتُمْ مِنَ الْجَنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِينَ؛ میں تم کھا کر کہتا ہوں کہ دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے پڑ کر دوں گا، کامل طور سے ہم آہنگ ہے، اور اس معنی پر ایک تاکید ہے کہ اس دن تہسبید الہی کامل طور سے پوری ہو جائے گی اور دوزخ کا فرول اور مجرموں سے بھر جائے گی۔

دوسرا یہ کہ اس جملہ سے مراد اور زیادہ کی طلب ہے، یعنی ”کیا اور افراد بھی ایسے ہوں گے، جو دوزخ میں آئیں گے؟ اور اصولی طور پر ہر چیز کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ہم جنس کی تلاش میں رہتی ہے اور کبھی سیر نہیں ہوتی، نہ بہشت نیکو کاروں سے اور نہ ہی دوزخ بدکاروں سے۔“

لیکن یہ سوال باقی رہ جاتا ہے، کہ اس بات کا مفہوم تو یہ ہے کہ دوزخ ابھی تک پڑ نہیں ہوئی اور یہ چیز اور پر والی آیت (سورہ سجدہ - آیت ۱۳) سے جو یہ کہتی ہے: ہم دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے پڑ کر دیں گے، سازگار نہیں ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ زیادتی کا مطالبہ پڑنے کی دلیل نہیں ہے، کیونکہ ”اولاً“ ممکن ہے کوئی ظرف مثلاً غذا سے پڑ ہو، پھر بھی کوئی تمنا کرے کہ اس کے اوپر اور ڈالا جائے کہ وہ چھلکنے لگے، ”ثانیاً“ یہ تقاضا ممکن ہے دوزخ پر مکان کے تنگ ہونے اور زیادہ دردناک عذاب کے تقاضا کے معنی میں ہو، یا وسعت پانے اور اس کے بعد بہت سے افراد کو اپنے اندر قبول کرنے کی تمنا اور ہو۔

بہر حال یہ آیت اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دوزخ بہت زیادہ ہیں اور دوزخ ایک ہولناک اور وحشتناک منظر رکھتی ہے اور خدا کی تہسبید واقعی اور یقینی ہے، اور ایسی ہے کہ اس کے بارے میں غور و فکر کرنا ہر انسان کو لرزہ بر اندام کر دیتا ہے، اور اس کو خردا کر کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن افراد میں سے ایک تو ہو، اور یہی فکر اُسے چھوٹے بڑے گناہوں سے کنٹرول کر سکتی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ دوزخ جس میں کچھ بھی شعور نہیں ہے، کیسے اس سے خطاب کیا جاتا ہے اور وہ جواب دیتی ہے؟ اس سوال کے تین جواب ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ ایک قسم کی تشبیہ اور زبان حال کا بیان ہے، یعنی خدا ”تکوینی“ زبان میں جہنم سے سوال کرے گا، اور وہ بھی ”زبان حال“ سے جواب دے گی اور اس تعبیر کی نظیر مختلف زبانوں میں فراواں ہے۔

دوسرا یہ کہ آخرت کا گھر حیات و زندگی واقعی کا گھر ہے، یہاں تک کہ بہشت اور جہنم جیسی موجودات بھی ایک قسم کی حیات اور ادراک و شعور رکھتی ہوں گی، بہشت شدت سے مومنین کی مشتاق ہوگی اور دوزخ شدت کے ساتھ مجرموں کے انتظاریں ہوگی۔

وہ مقام جہاں انسان کے بدن کے اعضاء کلام اور گفتگو کرنے لگیں گے، اور شہادت اور گواہی دیں گے وہاں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ بہشت و دوزخ اس طرح ہوں۔

بلکہ بعض کے نظریہ کے مطابق اس دُنیا کے تمام ذرات بھی ایک قسم کا ادراک و شعور رکھتے ہیں، اسی لیے وہ خدا کی

حمد و تسبیح کرتے ہیں اور ان کی یہ تسبیح و حمد قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوئی ہے۔ لہ
دوسرا یہ کہ مخاطب دوزخ پر مامور اور اس کے خازن ہیں اور وہی ہیں جو جواب دیں گے۔
یہ سب تفسیریں قابل قبول ہیں اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

- ۳۱- وَأَزْلِفَتِ الْجَنَّةَ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ۝
- ۳۲- هَذَا مَا تُوْعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ۝
- ۳۳- مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ ۝
- ۳۴- ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ذَلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ۝
- ۳۵- لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ۝
- ۳۶- وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيصٍ ۝
- ۳۷- إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝

ترجمہ

- ۳۱- (اس دن) بہشت پر پہنچنے والوں کے نزدیک ہو جائے گی، اور ان میں کوئی فاصلہ نہیں ہوگا۔
- ۳۲- یہ وہ چیز ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، اور (یہ وعدہ) ان لوگوں سے بھی ہے جو خدا کی طرف لوٹتے ہیں، اور اس کے عہد پیمان اور احکام کی حفاظت کرتے ہیں۔
- ۳۳- وہ شخص جو خدائے رحمن سے پوشیدہ طور سے ڈرے، اور توبہ و انابہ سے پُر

دل کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہو۔
۳۲۔ (ان سے کہیں گے) سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ، آج کا دن ہمیشگی کا دن ہے۔

۳۵۔ جو کچھ وہ چاہیں گے وہاں ان کے لیے موجود ہوگا، اور ہمارے پاس دوسری مزید نعمتیں بھی ہیں (جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گی)۔

۳۶۔ کتنی ہی بہت سی ایسی اقوام ہیں، جنہیں ہم نے اُن سے پہلے ہلاک کیا ہے، ایسی اقوام جو اُن سے زیادہ طاقتور تھیں اور شہروں اور (ملکوں) کو انہوں نے فتح کیا تھا، کیا فرار کی کوئی جگہ ہے؟

۳۷۔ یہ اس شخص کے لیے، جو عقل رکھتا ہے، یا کان دھر کے سنا ہے اور دل سے حاضر ہے، ایک تذکر اور نصیحت ہے۔

تفسیر

اے مجرمو! فرار کی کوئی راہ نہیں ہے!

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس سورہ کے مباحث عام طور پر مسئلہ معاد اور اس سے مربوط امور کے محور کے گرد چکر لگاتے ہیں، اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گذشتہ آیات میں بہت دھرم کفار کے جہنم میں پھینکنے، اور ان کے شدت عذاب کی کیفیت، اور ان صفات کے متعلق جو انہیں دوزخ کی طرف کھینچ لے گئے تھے، گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں ایک اور منظر کی تصویر کشی کرتا ہے، کامل احترام کے ساتھ پرہیزگاروں کے جنت میں داخل ہونے کا منظر، اور بہشت کی انواع و اقسام کی نعمتوں اور ان صفات کی طرف اشارہ جو انسان کو بہشتیوں کی صف میں قرار دیتی ہیں، تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کرنے سے حقائق زیادہ واضح اور روشن ہو جائیں۔

پہلے فرماتا ہے: "اس دن بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک ہو جائے گی اور ان سے اس کا کوئی فاصلہ نہیں ہوگا

(وازلفت الجنة للمتقين غير بعيد)۔

”ازلفت“ ”زلغی“ (بروزن کبریٰ) کے مادہ سے قرب و نزدیکی کے معنی میں ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ نہیں کہتا کہ پرہیزگاروں کو جنت کے قریب کریں گے، بلکہ یہ کہتا ہے کہ جنت کو ان کے قریب کریں گے! یہ ایک ایسا مطلب ہے، جو اس دُنیا کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے قابل تصور نہیں ہے، لیکن اس بنا پر کہ دارِ آخرت کے امور کچھ ایسے ہیں جو اس جہان کے حالات سے بہت مختلف ہیں، اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ خدا پرہیزگار مومنین کے انتہائی اکرام و احترام کی بنا پر بجائے اس کے کہ انہیں جنت کی طرف لے جائے، جنت کو ان کی طرف لے آئے گا، ۱۔

سورہ شعراء کی آیت ۹۰ و ۹۱ میں آیا ہے: وازلفت الجنة للمتقين وبرزت الجحيم للغاوين: اس دن جنت پرہیزگاروں کے قریب کر دی جائے گی، اور دوزخ کو گمراہوں کے لیے آشکار و ظاہر کریں گے، اور یہ خدا کا مومن بندوں پر انتہائی لطف و کرم ہے، جس سے بالاتر کا تصور نہیں ہو سکتا۔

”غیر بعید“ کی تعبیر بھی تاکید کے عنوان سے ہے۔ لہ

بہر حال آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مسئلہ قیامت میں واقع ہوگا۔ اگرچہ تعبیر فعل ماضی (ازلفت) کے ساتھ ہوئی ہے، کیونکہ وہ یقینی حوادث جو مستقبل میں واقع ہوں، بہت سی تعبیروں میں فعل ماضی کی صورت میں بیان ہوتے ہیں، لیکن بعض نے اس کا واقعات ماضی کے ساتھ معنی کیا ہے، اور یہ کہا ہے کہ جنت کا پرہیزگاروں کے نزدیک ہونا دُنیا میں حاصل ہو چکا ہے، کیونکہ جنت کے اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ادھر وہ دُنیا سے جائیں گے اور ادھر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

لیکن قبل و بعد کی آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو قیامت کے منظر کی گفتگو کر رہی ہیں، یہ معنی بعید نظر آتا ہے اور مناسب وہی پہلی تفسیر ہے۔

اس کے بعد بہشتیوں کے اوصاف کی تفصیل بتاتا ہے: ”یہ وہ جنت ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا کے حکم کی اطاعت کی طرف لوٹتے ہیں، اور اس کے عہد و پیمان اور احکام کی حفاظت کرتے ہیں“ (لہذا ما توعدون لکل اواب حفیظ)۔

یہاں ان کے اوصاف میں سے دو اوصاف کی طرف اشارہ ہوا ہے،

”اواب“ اور ”حفیظ“

”اواب“ ”اوب“ (بروزن ذوب) کے مادہ سے بازگشت کے معنی میں ہے، جو ممکن ہے چھوٹے بڑے گناہوں

لہ ”غیر بعید“ ممکن ہے کہ ”ظرف“ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”حال“ ہو، یا صفت ہو مخدوف مصدر کی اور تقدیر میں ”ازلافا“ غیر بعید ہو۔

سے توبہ کے معنی میں ہو یا اس کی اطاعت کی طرف بازگشت کے معنی میں ہو، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے، یہ نشانہ ہی کرتا ہے کہ بہشتی ایسے پرہیزگار لوگ ہیں کہ جو عامل بھی انھیں خدا کی اطاعت سے دُور کرتا ہو، وہ اس کی طرف فوراً توجہ ہو جاتے ہیں اور اس کی اطاعت کی طرف لوٹ آتے ہیں، اور اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں سے توبہ کرتے ہیں تاکہ نفس مطمئنہ کے مقام تک پہنچ جائیں۔

”حفیظ“ محافظ اور نگران کے معنی میں ہے، کیا اس سے مراد خدا کے عہد و پیمان کی حفاظت ہے، جو اس نے انسانوں سے لیا ہے۔ کہ اس کی اطاعت کریں اور شیطان کی عبادت نہ کریں (یس - ۶۰) یا خدا کے قوانین اور حدودِ الہی کی حفاظت؟ یا گناہوں کو چھوڑنا اور انھیں توبہ کے لیے یاد رکھنا اور ان کی تلافی کرنا؟ یا یہ سب امور؟۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ حکم مطلق صورت میں ذکر ہوا ہے۔ آخری تفسیر جو جامعیت رکھتی ہے زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

ان اوصاف کو جاری رکھتے ہوئے۔ جو حقیقت میں گذشتہ اوصاف کی تفسیر و توضیح ہیں۔ بعد والی آیت میں ان کے دو اور اوصاف کی طرف اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے: ”وہی شخص جو تنہائی میں خدائے رحمن سے ڈرے اور توبہ کرنے والے دل کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہو“ (من خشى الرحمن بالغیب وجاء بقلب منیب)۔

پوشیدہ طور پر خدا سے ڈرنے کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ اس کے باوجود کہ ہرگز خدا کو آنکھ سے نہیں دیکھتے، اس کے آثار میں غور کر کے اور استدلال کے طریقے سے اس پر ایمان لاتے ہیں، ایسا ایمان جو کامل مسولیت کے احساس سے توأم ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے، کہ لوگوں کی آنکھ سے پنہاں مراد ہو، وہ نہ صرف لوگوں کے سامنے بلکہ تنہائی اور خلوت میں بھی کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔

یہ خوف اور ”خشیت“ اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ ان کا دل ”منیب“ ہو، ہمیشہ کے لیے خدا کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کی اطاعت میں آگے بڑھے، اور ہر لغزش و گناہ سے توبہ کرے، اور اس حالت کو آخر عمر تک برقرار رکھے، اور اسی حالت میں عرصہ محشر میں وارد ہو،

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”جن لوگوں میں یہ چار صفات پائی جاتی ہیں، جب بہشت ان کے نزدیک ہو جائے گی تو خدا کے فرشتے احترام و اکرام کے عنوان سے ان سے کہیں گے، سلامتی کے ساتھ جنت میں وارد ہو جاؤ“ (ادخلوہا بسلاماً)۔

ہر قسم کی بُرائی، دکھ درد، آفت و بلا، سزا و عذاب سے مکمل جسمانی و روحانی سلامتی، اس کے بعد ان کے اطمینان قلب کے لیے مزید کہتا ہے: ”آج جاودانی اور ہمیشگی کا دن ہے، نعمتوں کی ہمیشگی، اور بہشت کی اپنی تمام نعمتوں کے ساتھ ہمیشگی“ (ذالک یوم المرسلین)۔

ان دو نعمتوں (سلامتی کی بشارت اور ہمیشہ ہمیشہ بہشت میں رہنے کی بشارت) کے بعد خداوند متعال انہیں دو بشارتیں اور دنیا ہے جو مجموعی طور پر چار بشارتیں ہو جاتی ہیں، ان چار اوصاف کی طرح جو ان میں پائے جاتے تھے، فرماتا ہے، ”وہ جو کچھ بھی چاہیں گے بہشت میں ان کے لیے موجود ہے“ (لہم ما لیشاءون فیہا)۔

اور اس کے علاوہ ”دوسری نعمتیں بھی ہمارے پاس موجود ہیں جو کبھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ کہ وہ ان کی تناکریں“ (ولدینا مزید)۔

اس سے زیادہ بہتر، عمدہ تر، اور دل پسند تعبیر کا تصور بھی نہیں ہوتا، پہلے کہتا ہے، ”بہشتی لوگ جو کچھ چاہیں اس جملہ کے معنی کی وسعت کے ساتھ، انواع و اقسام کی نعمتیں بغیر کسی استثنا کے ان کے اختیار میں ہوں گی، اور ان کے علاوہ بھی ایسی نعمتیں اور مواہب ہیں، جو ہرگز کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی ہوں گی۔ لیکن خداوند رحمن و رحیم، جس نے بہشتی پر مہیزگاروں کو، اپنے خاص الطاف سے نوازا ہے۔ انہیں ان نعمتوں سے بھی بہرہ ور کرے گا اور اس طرح سے جنت کی نعمتیں اتنی حد سے زیادہ وسیع پہلو پیدا کر لیں گی، جن کی توصیف بیان سے باہر ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائی اجر و پاداش اور مومنین کے اعمال کے درمیان کوئی موازنہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ اور بہت ہی برتر و بالاتر ہے۔ اور اس مرحلہ میں ہم ہر جگہ اس کے فضل و کرم کے روبرو ہیں، کیا اس کی سزائیں اور کیا اس کے عدل کے سامنے۔

بہشت و دوزخ، اور بہشتیوں اور دوزخیوں کے صفات اور ان کے درجات و مراتب کے بارے میں گفتگو کو ختم کرنے کے بعد اس بحث سے کمال طور پر نتیجہ نکالنے کے لیے، مجرموں کی طرف توجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”کتنی بہت سی قومیں ایسی ہیں جن کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے، وہ قومیں جو ان سے زیادہ قوی اور طاقتور تھیں انہوں نے کئی ملک فتح کے تھے اور کئی شہروں پر مسلط ہوئے تھے، لیکن وہ کفر و ظلم و ستم اور گناہ کی وجہ سے نابود ہو گئیں“ (و کم اھلکنا قبلہم من قرن ہما شد منہم بطشاً قنقبا وافی البلاد)۔

کیا اس قسم کے افراد کے لیے موت اور عذاب الہی سے فرار کی کوئی راہ ہے؟ (ھل من عیص)۔

”قرن“ اور ”اقران“ اصل میں دو چیزوں یا کئی چیزوں کے ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کے معنی میں ہے، اور اس جماعت کو جو ایک ہی زمانہ میں زندگی بسر کرتے ہیں ”قرن“ کہا جاتا ہے، اس کے بعد یہ لفظ زمانہ کے ایک حصہ پر بولا جانے لگا، جسے کبھی تو قیس سال اور کبھی سو سال کہا ہے۔

”اس بنا پر کئی ”قرنوں“ کو ہلاک کرنے کا معنی کئی گذشتہ اقوام کو ہلاک کرنا ہے۔“

”بطش“ کسی چیز کو قوت و قدرت کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے، اور کبھی جنگ جلال کے معنی میں بھی آتا ہے۔

”قنقبا“ ”نقب“ کے ادہ سے اس سوراخ کے معنی میں ہے جو دیوار یا چھڑے میں کرتے ہیں، لیکن ”نقب“ صرف اس

سوراخ کو کہتے ہیں جو گڑھی میں کرتے ہیں۔

یہ لفظ جب کسی فعل کی صورت میں استعمال ہو، تو سبب و حرکت اور اصلاح کے مطابق راستہ کھولنے اور پیش روی کرنے کے معنی میں آتا ہے، اور کشور کشائی اور مختلف علاقوں میں نفوذ کے معنی میں بھی آیا ہے

”منقبت“ بھی اسی مادہ سے ہے، اور یہ لفظ ان برجستہ اشخاص کے انحال و صفات پر۔ اس نفوذ و تاثیر کی بنا پر موجودہ لوگوں میں رکھتے ہیں، یا راستے کو ترقی کے لیے کھولتے ہیں۔ بولا جاتا ہے۔

”لقیب“ اس شخص کو کہتے ہیں، جو کسی جمیعت کے بارے میں بحث و تحقیق کرتا ہے اور ان کے اوضاع و احوال سے باخبر ہوتا ہے اور ان کے اندر نفوذ پیدا کرتا ہے۔

”محیص“ ”حیص“ (بروزن حیص) کے مادہ سے کسی چیز سے انحراف اور عدول کرنے کے معنی میں ہے، اور اسی مناسبت سے مشکلات سے فرار کرنے اور میدان جنگ میں شکست کھا جانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

بہر حال یہ آیت پیغمبر کے زمانے کے ہٹ دھرم کفار کو تنبیہ کر رہی ہے کہ وہ گذشتہ لوگوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں، اور ان کے آثار کو تاریخ کے صفحات میں اور دہے زمین پر دیکھیں، غور کریں کہ خدا نے اس سے پہلے کی سرکش اقوام کے ساتھ کیا کیا؟ وہ قومیں جو ان سے زیادہ کثرت میں تھیں اور زیادہ طاقتور تھیں، اور پھر وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچیں۔

یہ معنی بار بار قرآن مجید میں آیا ہے، منجملہ سورہ زمر کی آیت میں بیان ہوا ہے: ”فاهلكنا اشد منہم بطشاً“
”ہم نے ان اقوام کو جو ان سے زیادہ طاقتور تھیں ہلاک کر دیا“

بعض مفسرین زیر بحث آیت کو ”قوم نمود“ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو حجاز کے شمال میں ”حجر“ کی کوہستانی سرزمین میں زندگی بسر کرتی تھی وہ پہاڑوں کو کاٹ کر ان میں پرشکوہ گھراؤ اور قصر و محلات بناتی تھی، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور انھیں بھی اور ان کے علاوہ دوسری اقوام کو بھی شامل ہے۔

”هل من حیص“ ”کیا بھاگنے کی کوئی راہ ہے؟“ کا مجملہ ممکن ہے گذشتہ اقوام کی زبانی ہو، جو عذاب کے چنگل میں گرفتار تھے اس وقت اس مطلب کا ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے، یا پروردگار کی طرف سے پیغمبر کے زمانے کے ہٹ دھرم کفار کے بارے میں ہو، یعنی کیا اس دردناک سرنوشت سے جو گذشتہ سرکش اقوام کے سامنے آئی فرار کر سکتے ہیں؟
آخری زیر بحث آیت میں زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے:

”یقیناً گذشتہ لوگوں کی سرنوشت میں، اس شخص کے لیے جو عقل رکھتا ہے، یا کان لگا کر سُننا ہے اور حاضر (دماغ) ہے تذکر اور ایک نصیحت ہے“ (ان فی ذالک لذكری لمن کان له قلب او القی السمع وهو شہید)۔

یہاں بھی اور قرآن کی دوسری آیات میں بھی جو درک مسائل کے بارے میں بحث کرتی ہیں، ”قلب“ سے مراد وہی ”عقل“ (مشور و ادراک) ہے، لغت کی کتابوں میں بھی ”قلب“ کا ایک معنی ”عقل“ ہی بتایا گیا ہے۔ ”راغب“ نے ”مفردات“ میں زیر بحث آیت میں ”قلب“ کی علم و فہم سے تفسیر کی ہے، ”لسان العرب“ میں بھی یہی بیان ہوا ہے کہ بعض اوقات ”قلب“ عقل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے بھی اسی آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ ”قلب“ سے مراد عقل ہے بلکہ اصل میں اس لفظ ”قلب“ کی جڑ بنیاد، بدلنے اور ایک حالت سے دوسری حالت میں آنے کے معنی میں ہے، اور اصطلاح کے مطابق قلب انقلاب ہے، اور چونکہ انسان کی فکر و عقل ہمیشہ دگرگونی کی حالت میں ہے، اس لیے اس کو ”قلب“ کہا گیا ہے، اور اسی بنا پر قرآنی آیات میں دل کے سکینہ و آرام یا اطمینان قلب پر توجیہ ہوا ہے: ”هو الذی انزل السکینة فی قلوب المؤمنین“: ”وہ وہی ہے کہ جس نے مؤمنین کے دل میں سکینہ و آرام نازل کیا، (فتح-۴)“ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ”آگاہ رہو کہ خدا کی یاد دلوں کے اطمینان کا باعث ہے“ (رعد-۲۸) ہاں! اس بے قرار موجود کو صرف یاد خدا سے قرار سکون حاصل ہوتا ہے۔

”القی السمع“ (کان کوٹلے) کان دھرنے، اور انتہائی انہماک اور توجہ سے سننے سے کنایہ ہے، اس تعبیر کے مثلاً جو ہم فارسی میں بولتے ہیں، گوش مانند تو است، (ہمارا کان تمہارے پاس ہے یعنی ہم تیری باتوں کو اچھی طرح سے سن رہے ہیں۔) ”در شہید“ یہاں اس شخص کے معنی میں ہے جو حضور قلب رکھتا ہو، اور اصطلاح کے مطابق، اس کا دل مجلس میں ہے اور وہ وقت کے ساتھ مطالب کو سمجھتا ہے۔

اور اسی طرح سے آیت مجموعی طور پر اس طرح معنی دیتی ہے:

دو گروہ ان مواضع سے پسند و نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو عقل و ہوش رکھتا ہے، اور خود مستقل طور پر مسائل کا تحلیل و تجزیہ کر سکتا ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جو اس حد میں تو نہیں ہیں، لیکن وہ علماء اور دانشمندیوں کے لیے اچھے سامعین بن سکتے ہیں، اور حضور قلب کے ساتھ ان کی باتوں کو سنتے ہیں، اور حقائق کو ان کے ارشاد و رہنمائی کے طریق سے معلوم کرتے ہیں۔ اس گفتگو کی شبیہ سورہ ملک کی آیہ ۱۰ میں بھی آئی ہے جس میں دوزخیوں کے قول کو اس طرح نقل کرتا ہے: ”لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر“: اگر ہم سننے والے کان یا کافی عقل و ادراک رکھتے ہوتے تو ہرگز دوزخیوں کی صف میں قرار نہ پاتے۔ کیونکہ راہ حق کی نشانیاں واضح و آشکار ہیں، لہذا وہ لوگ جو خود اہل تحقیق ہیں اس کو اچھی طرح حاصل کر لیتے ہیں اور جو اس قسم کے نہیں ہیں، وہ عادل اور مہر و علماء کی رہنمائی کے ذریعے اپنی راہ معلوم کر سکتے ہیں، اسی بنا پر ضروری ہے کہ یا تو انسان کے پاس کافی مقدار میں علم و عقل ہو، یا سننے والے کان رکھتا ہو۔

- ۳۸۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ ۝
- ۳۹۔ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ۝
- ۴۰۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَادْبَارَ السُّجُودِ ۝

ترجمہ

- ۳۸۔ ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کو چھ دن (چھ دوروں) میں پیدا کیا ہے۔ اور ان کے پیدا کرنے میں ہمیں کسی قسم کی تکان اور کمزوری نہیں ہوئی۔
- ۳۹۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر و شکیبائی اختیار کر، اور طلوع آفتاب سے پہلے، اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالا۔
- ۴۰۔ اور رات کے ایک حصہ میں اس کی تسبیح کر اور سجدوں کے بعد۔

تفسیر

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے

گذشتہ آیات کو بیان کرنے اور مختلف دلائل کے بعد جو قیامت کے بارے میں ان میں بیان ہوئی ہیں، ان آیات میں امکان معاد کے دلائل میں سے ایک دلیل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کے بعد پیغمبر کو صبر و شکیبائی اور پروردگار کی تسبیح و حمد کا حکم دیتا ہے، تاکہ مخالفین کی کارشکینیوں کو اس طریقہ سے انہیں برداشت کرتے ہوئے بے کار کر دے۔

پہلے فرماتا ہے: ”ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کو چھ دن (چھ دوروں) میں پیدا کیا ہے، اور ان کے پیدا کرنے میں ہمیں کسی قسم کی تھکان اور کمزوری نہیں ہوئی (ولقد خلقنا السموات والارض وما بينهما في ستة ايام وما مستنا من لغوب)

”لغوب“ تعب اور خستگی کے معنی میں ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ جس کی قدرت محدود ہو اگر وہ کسی ایسے کام کو انجام دینا چاہے، جو اس کی توانائی سے زیادہ ہو تو وہ تھک کر چور ہو جائے گا، لیکن اس ہستی کے بارے میں جس کی قدرت غیر محدود اور اس کی توانائی غیر تنہا ہی ہو یہ امور کوئی مفہوم نہیں رکھتے، اس بنا پر وہ ذات جو قادر ہے کہ کسی قسم کے تعبے رنج کے بغیر ان با عظمت آسمانوں اور زمین کو اور ان سب ستاروں، سیاروں کر دلوں اور کہکشاؤں کو ایجاد کرے، وہ اس بات کی بھی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دے، اور زندگی کا لباس اس کے بدن پر پہنا دے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک شان نزول نقل کی ہے کہ: یہودی یہ خیال کرتے تھے کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو چھ ”دن“ (ہفتہ کے چھ دن) میں پیدا کیا ہے، اس کے بعد ہفتہ کے دن اس نے آرام کیا، اور اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھا، اور اسی بنا پر وہ اس طرح سے بیٹھے کو غیر مطلوب شمار کرتے ہیں، اور اُسے خدا کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، تو اوپر والی آیت نازل ہوئی ہے اور اس قسم کی ہنسانے والی خرافات کو ختم کر دیا۔

لیکن یہ شان نزول اس بات سے مانع نہیں ہے، کہ آیت امکان معاد کے مسئلہ کا تعاقب کرے، جبکہ اس کے ساتھ ساتھ پروردگار کی توحید، علم اور قدرت پر بھی ایک دلیل ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو ان تمام عجائبات اور غرائب کے ساتھ اور لاکھوں کروڑوں زندہ موجودات، اور عجیب و غریب اسرار اور اس کے مخصوص نظاموں کو پیدا کیا ہے، کہ جن کے ایک ہی گوشہ میں غور و فکر کرنا اس توانا پیدا کرنے والے کی طرف جس کے دست قدرت نے اس عظیم گردش کرنے والے کو حرکت دی ہے، اور ہر جگہ زور حیات و زندگی کو پھیلا یا ہے، ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

آسمانوں اور زمین کی ”چھ دن“ میں خلقت کا موضوع بارہا آیات قرآنی میں آیا ہے۔

کلمہ ”یوم“ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، عربی زبان میں اس کا تبادلہ ”روز“ فارسی زبان میں، یا باقی زبانوں میں بہت سے مواقع پر دوران کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نہ کہ جو بیس گھنٹوں کے معنی میں، یا بارہ گھنٹوں کے معنی میں، مثلاً ہم کہتے ہیں: ایک دن لوگ پیغمبر اسلام کے سایہ میں زندگی بسر کرتے تھے، اور دوسرے دن نبی امیہ اور بنی عباس کے جبار بادشاہ ان پر مسلط ہو گئے۔

واضح رہے کہ ”روز“ ان تعبیروں میں ”دور“ کے معنی میں ہے، چاہے وہ ایک سال ہو یا سو سال، یا ہزاروں لاکھوں سال، مثلاً ہم کہتے ہیں ایک دن کڑھ زمین آگ کا ایک ٹکڑا اٹھا، دوسرے دن وہ سرد ہوئی، اور زندگی کے لیے آمادہ، تو یہ تمام تعبیریں

اور ار کی طرف اشارہ ہیں۔

اس بنا پر اور پر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے آسمانوں زمین اور ان دونوں کی تمام موجودات کو چھ اور میں پیدا

کیا۔

اس گفتگو کی تفصیل و تشریح ہم جلد ۲ ص ۱۲۹ سورہ اعراف کی آیت ۵۴ کے ذیل میں کر چکے ہیں۔

اس بنا پر اس سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ سورج اور گڑھ زمین کی خلقت سے پہلے تو شب و روز تھے ہی نہیں تاکہ

خدا نے عالم کو چھ دن میں پیدا کیا ہو۔

معاد کے مختلف دلائل اور قیامت کے مختلف مناظر کی تصویر کشی کرنے کے بعد، چونکہ ایک گروہ حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں

کرتا اور باطل پر اڑے ہوئے ہٹ دھرمی کرتا رہتا ہے لہذا سب کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: ”جو کچھ وہ کہتے ہیں۔ اس پر صبر کرو اور شکیبائی سے کام لو“ (فا صبر علی ما یقولون)۔

کیونکہ صرف صبر و شکیبائی کی قوت سے ہی ان مشکلات پر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے، اور دشمن کی سازشوں کو درہم و برہم

کیا جاسکتا ہے، اور حق کی راہ میں ان کی ناروا نسبتوں کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔

چونکہ صبر و استقامت مدد و نصرت کی محتاج ہے، اور بہترین مدد و نصرت، خدا کی یاد، اور جہاں کو پیدا کرنے والے کے

علم و قدرت کے مبداء سے ارتباط پیدا کرتا ہے، اس حکم کے بعد مزید کہتا ہے:

”اور آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح و حمد بجالا“ (وسبح بحمد

ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب)۔

اسی طرح ”رات کے ایک حصہ میں اس کی تسبیح کر اور سجدوں کے بعد بھی“ (ومن اللیل فسبحہ وادبار

السجود)۔

یہ دوامی یاد اور مسلسل تسبیح، بارش کے حیات بخش قطروں کی طرح تیسے دل و جان کی سز زمین پر پڑنی چاہیے یہ اُسے سیراب

کرتی ہے، تجھے ہمیشہ نشا و حیات بخشی ہے، اور ہٹ دھرم دشمنوں کے مقابلہ میں استقامت کی دعوت دیتی ہے۔

اس بارے میں کہ خدا کی ان چار مواقع پر (طلوع آفتاب سے پہلے، اس کے غروب سے پہلے، رات کے وقت اور سجدوں

کے بعد) تسبیح کرنے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف ہے۔

بعض کا نظریہ تو یہ ہے کہ یہ تعبیریں روزانہ کی بیچگانہ نمازوں کی طرف اشارہ ہے اور بعض کے نزدیک پرفیضت نوافل کی طرف اشارہ ہے اس طرح سے کہ

”قبل طلوع الشمس“ نماز صبح کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس کا آخری وقت طلوع آفتاب ہے۔

اور ”قبل الغروب“ (غروب آفتاب سے پہلے) نماز ظہر و عصر کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان دونوں کا

آخری وقت غروب آفتاب ہے۔

”ومن اللیل“ (رات میں سے) نماز مغرب و عشاء کو بیان کرتا ہے جو ادبار السجود (سجدوں کے بعد) مغرب

کے نوافل کی طرف اشارہ ہے، جو مغرب کے بعد بجالائے جاتے ہیں۔

”ابن عباس“ نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے، اس قید کے ساتھ کہ ”ادبار السجود“ کو تمام نوافل نمازوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جو فرائض کے بعد انجام دیتے جاتے ہیں، لیکن چونکہ روزانہ کی نوافل میں ہمارے نظریہ کے مطابق صرف مغرب و عشاء کے نوافل ہیں جو ان نمازوں کے بعد انجام پاتے ہیں، لہذا یہ تعمیم صحیح نہیں ہے۔

بعض دوسروں نے ”قبل طلوع الشمس“ کو نماز صبح کی طرف اور ”قبل الغروب“ کو نماز عصر کی طرف اور من اللیل فتسبیحہ کو مغرب و عشاء کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور اس طرح سے بغیر کسی واضح وجہ کے نماز ظہر کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی یہ چیز اس تفسیر کے ضعف کی دلیل ہے۔

ایک روایت میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ جب آپؑ سے آئیہ ”وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب“ کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا، تو آپؑ نے فرمایا:

تقول حين تصبح وحين تمسي عشر مرات لا اله الا الله وحده لا شريك له، له الملك، وله الحمد، يحيى ويميت، وهو على كل شيء قدير:

”ہر صبح و شام دس مرتبہ یہ ذکر کہے لا اله الا الله“

یہ تفسیر پہلی تفسیر کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتی، اور ممکن ہے کہ یہ دونوں ہی آیت کے معنی میں جمع ہوں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس معنی کی نظیر تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ طہ کی آیت ۲۰ میں بھی آئی ہے۔ جہاں فرماتا ہے: وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن اثناء اللیل فسبح واطراف النهار لعلك ترضى۔

”طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے، اور اسی طرح رات کے دوران میں، اور دن کے اطراف میں پروردگار کی تسبیح کو تاکہ تو راضی و خوش ہو جائے۔“

لعلك ترضى کا جملہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ یہ عبادات اور تسبیحات فکر و نظر کے سکون اور دل کی مسرت میں اہم اثر رکھتی ہیں اور اس کو سخت قسم کے حوادثات کے مقابلہ میں قوت دلوانی بخشتی ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ سورہ طور کی آیت ۲۹ میں اس طرح آیا ہے، ومن اللیل فسبحه وادبار النجوم رات کے کچھ حصہ میں خدا کی تسبیح کر اور ستاروں کے پشت پھرنے کے وقت، اے

”جمع البیان“ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

”توجہ کرنا چاہیے کہ یہاں ”ادبار“ (بروزن اقبال) پشت کرنے کے معنی میں ہے، اور زیر بحث آیات میں ”ادبار“ (بروزن ابرار) ”ذہب“ کی جمع ہے جو پشت کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر ”ادبار السجود“ کا معنی سجدوں کے بعد ہے، اور ”ادبار النجوم“ کا معنی ستاروں کا پشت پھرنے کا وقت ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ علیؑ نے فرمایا: "ادبار السجود" وہ دو رکعت نافلہ ہے جو تم مغرب کے بعد پڑھتے ہو (توجہ ہے کہ مغرب کے نافلہ چار رکعت ہیں، جن میں سے یہاں دو رکعت کی طرف اشارہ ہوا ہے) اور "ادبار التجموم" دو رکعت نافلہ صبح ہیں، جو نماز صبح سے پہلے اور ستاروں کے غروب ہونے کے وقت بجالاتے ہیں۔ لہ

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ "ادبار السجود" سے وہی نواز وتر ہے جو آخر شب میں انجام دی جاتی ہے لہ بہر حال پہلی تفسیر کے مناسب نظر آتی ہے، اگرچہ مفہوم تسبیح کی وسعت اور کشادگی میں بہت سی دوسری تفسیریں جن کی طرف روایات میں اشارہ ہوا ہے۔ شامل ہو جاتی ہیں:

نکتہ

صبر و شکیبائی ہر کامیابی کا راز ہے:

یہ پہلا موقع نہیں ہے، جہاں قرآن مجید مشکلات اور ہٹ دھرم اور دشمن افراد کے مقابلہ میں صبر و شکیبائی کی تلقین کرتا ہے قرآن مجید عظیم پیغمبر اسلامؐ کو بھی اور عام مومنین کو بھی بار بار یہ اہم مسئلہ دل کشیں کرتا ہے، اور بجز تجربات بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ غلبہ نہ کامیابی انہی افراد کے لیے ہے، جو صبر و استقامت کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام صادقؑ نے اپنے دوستوں میں سے ایک سے (جو شاید اس زمانہ کے سخت حالات میں بے تاب ہو جاتا تھا) فرمایا: علیک بالصبر فی جمیع امورک: "تجھ پر لازم ہے کہ تمام کاموں میں صبر و شکیبائی رکھے" اس کے بعد مزید فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کو صبر و تحمل اور مدارات کا حکم دیا، اور انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ لوگوں نے ان کی طرف بہت سی ناروا نسبتیں بھی دیں۔ اور جب آپ کا سینہ تنگ ہو گیا تو خدا نے ان پر یہ آیت نازل کی: ولقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون فسبح بحمد ربک وکن من الساجدین: "ہم جانتے ہیں کہ تو ان کی باتوں سے بے چین ہو جاتا ہے، اور تیرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے۔

پس تو اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالا اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا" (حجر - ۹۷، ۹۸)

پھر بھی انہوں نے آپ کی تکذیب ہی کی اور ہر طرف سے تہمت کے تیرا آپ کی طرف پھینکے، اور اس بنا پر آپ محزون و غمگین ہوئے، خدا نے ان کی دل داری اور تسلی کے لیے یہ آیت نازل فرمائی:۔ قد نعلم انہ لیحزنک الذی یقولون فانہم لایکذبونک ولکن الظالمین بأیات اللہ یجحدون ولقد کذبت رسل من قبلك فصبروا علی ما کذبوا واذوا حتی اتاہم نصرنا، "ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں

تجھے اندوگین کرتی ہیں۔ لیکن یہ لوگ (صرف) تیری تکذیب نہیں کرتے بلکہ یہ متمکر آیات خدا کی تکذیب کرتے ہیں، انھوں نے تجھ سے پہلے بھی خدا کے رسولوں کی تکذیب کی تھی، اور انھوں نے تکذیبوں اور آزاروں کے مقابلہ میں صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری نصرت ان کی مدد کے لیے آن پہنچی۔ (انعام - ۳۳، ۳۴)

اس کے بعد امام مزید فرماتے ہیں: پیغمبرؐ نے اپنے آپ کو صبر و شکیبائی کے لیے آمادہ و تیار کر لیا، لیکن اس موقع پر ان لوگوں نے معاملہ کو حد سے زیادہ کر دیا، اور انھوں نے خدا کا نام لے کر اس کی ساحتِ قدس کی نسبت تکذیب کی، تو پیغمبرؐ نے فرمایا میں نے اپنے لیے اور اپنے گھر والوں اور اپنی حیثیت کے لیے نا ملائم باتوں پر تو صبر کر لیا۔ لیکن میں اپنے پروردگار کو برا بھلا کہنے پر صبر نہیں کر سکتا، اس موقع پر خداوند عزوجل نے اس دزیرِ بحث آیت کو نازل فرمایا: ولقد خلقنا السموات والارض وما بینہما... ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ چھ دوڑوں میں پیدا کیا ہے اور عالم کی خلقت میں ہم نے جلدی اور عجلت سے کام نہیں لیا، اور ہمیں کوئی دکھ اور رنج نہیں پہنچا، اس بنا پر تم بھی عجلت نہ کرو اور ان کی باتوں کے سامنے صبر کرو، یہ وہ مقام تھا کہ پیغمبرؐ نے صبر و شکیبائی کو تمام حالات میں پیش نظر رکھا، (یہاں تک کہ دشمنوں پر کامیاب ہوئے) لہ

- ۴۱- وَاسْتَمِعَ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ۝
- ۴۲- يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ ۝
- ۴۳- إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ۝
- ۴۴- يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذَٰلِكَ حَشْرُهُ
عَلَيْنَا يَسِيرٌ ۝
- ۴۵- نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكَرُ
بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدٌ ۝

ترجمہ

- ۴۱- کان دھر کے سن اور اس دن کا منتظر رہ جب ایک ندا کرنے والا قریب کے مکان سے ندا دے گا۔
- ۴۲- وہ دن جس میں سب لوگ قیامت کے صحیحہ (چیخ) کو حق کے ساتھ سنیں گے، وہ دن خروج کا دن ہے۔
- ۴۳- ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔
- ۴۴- وہ دن جب زمین ان کے اوپر سے پھٹ جائے گی، اور (وہ قبروں سے) تیزی کے ساتھ باہر نکلیں گے، اور یہ جمع کرنا ہمارے لیے آسان ہے۔
- ۴۵- وہ جو کچھ کہتے ہیں ہم اُس سے اچھی طرح آگاہ ہیں، اور تم ان کو مجبور کرنے پر مامور نہیں ہو پس اس بنا پر

تم تو قرآن کے ذریعہ ان لوگوں کو جو میرے عذاب سے ڈرتے ہیں، نصیحت کرتے رہو۔

تفسیر

قیامت کے صحیحہ (چیخ) کے ساتھ ہی سب زندہ ہو جائیں گے

یہ آیات جو سورہ "ق" کی آخری آیات ہیں اس سورہ کی باقی آیات کی طرح مسئلہ معاد و قیامت کو ہی بیان کرتی ہیں اور پھر اس کے ایک اور گوشہ کو پیش کرتی ہیں، اور وہ مسئلہ "نفع صور" اور مردوں کے قبروں سے اٹھنے کا ہے۔ فرماتا ہے: "کان دھر کے سن اور اس دن کا منتظر رہ جس دن ایک ندا کرنے والا نزدیک کے مکان سے ندا کریگا" (واستمع یوم یومیناد المناد من مکان قریب)۔

"وہ دن جس میں قیامت کے صحیحہ (چیخ) کو حق کے ساتھ سینیں گے، وہ دن خروج کا دن ہے" (یوم یسمعون الصیحة بالحق ذالک یوم الخروج)۔

"استمع" (کان دھر کے سن) میں مخاطب اگرچہ پیغمبر کی ذات ہے، لیکن مسئلہ طور پر اس سے مراد تمام انسان ہیں۔ "کان دھرنے سے مراد، یا تو انتظار کرنا ہے، کیونکہ جو لوگ کسی حادثہ کا انتظار کرتے ہیں جو ایک وحشتناک حادثہ سے شروع ہو گا وہ ہمیشہ کان کھڑے رکھتے ہیں، اور منتظر رہتے ہیں، یا خدا کی اس گفتگو پر کان دھرنا مراد ہے، اور معنی اس طرح ہوگا:

"اس گفتگو کو سن جو تیرا پروردگار قیامت کے صحیحہ (چیخ) کے بارے میں کر رہا ہے۔"

لیکن یہ ندادینے والا کون ہوگا؟ ممکن ہے کہ خدا کی ذات پاک جو جو یہ ندادے گی، لیکن زیادہ قوی احتمال یہی ہے کہ وہ افضل ہوگا، جو "صور" بھونکے گا، اور قرآن کی آیات میں نام کے ساتھ تو نہیں۔ لیکن دوسری تعبیروں کے ساتھ اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ "مکان قریب" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ صدا اس طرح فضا میں پھیل جائے گی، کہ گویا ہر ایک کے کان

لے پہلی تفسیر کے مطابق "یوم" "استمع" کا مفعول ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق "استمع" کا مفعول مزدوف ہے اور تقدیر میں "استمع حدیث ربک" ہوگا۔ باقی رہا "یوم" کا منصوب ہونا اس صورت میں اس فعل کی وجہ سے ہے جو یوم الخروج سے سمجھا جاتا ہے، اور معنی کے اعتبار سے اس طرح ہے: "یومیناد المناد"۔

کی جڑ میں ہے اور سب کے سب اس کو قریب سے سنیں گے، موجودہ زمانہ میں ہم مختلف مسائل سے کہنے والوں کی باتوں کو جو دنیا کے کہیں دور دراز مقام پر کر رہا ہوتا ہے، قریب سے سن سکتے ہیں، گویا وہ بالکل ہمارے قریب ہی بیٹھا ہوا ہے اور ہم سے بات کر رہا ہے، لیکن اس دن سب لوگ ان مسائل کی احتیاج کے بغیر، منادی حق کی آواز کو، جو قیامت کی صدا بلند کر رہا ہوگا اپنے قریب سے سنیں گے۔ لے

بہر حال یہ صبحہ، وہ پہلا صبحہ نہیں ہے جو اس جہاں کے ختم کرنے کے لیے ہوگا، بلکہ یہ دوسرا صبحہ ہے، یعنی وہی قیام و حشر کا صبحہ، اور حقیقت میں دوسری آیت پہلی آیت کی توضیح و تفسیر ہے: کہتا ہے: وہ دن جس میں صبحہ کو حق کے ساتھ سنیں گے، قبروں سے نکلنے اور زمین کی مٹی سے باہر آنے کا دن ہے۔

اور اس غرض سے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس عظیم دادگاہ اور عدالت میں حاکم کون ہے؟ مزید کہتا ہے: ”ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں، اور سب لوگ ہماری ہی طرف لوٹ کر آئیں گے“ (اننا نحن ونمیت والینا المصیر)۔

احیاء سے مراد وہی دنیا میں پہلی مرتبہ زندہ کرنا ہے، اور مارنے سے مراد عمر کے آخر میں مرنا ہے، اور الینا المصیر کا مجملہ قیامت میں زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

درحقیقت آیت اس نکتہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جس طرح پہلی موت و حیات ہمارے ہاتھ میں ہے، اسی طرح پھر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹانا، اور قیام قیامت بھی ہمارے ہی ہاتھ میں ہے، اور ہماری ہی طرف ہے۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے فرماتا ہے: ”ان کی بازگشت ہماری طرف اس دن ہوگی۔ جب زمین ان کے اُپر سے شکافت ہو جائے گی اور وہ زندہ ہو جائیں گے اور سرعت کے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے“ (ایوم تشقق الارض عنہم سراعاً) لے

لے مفسرین کی ایک جماعت نے یہ احتمال دیا ہے کہ ”مکان قریب“ ”صغرو بیت المقدس“ ہے اور یہ مخصوص پتھر جو بیت المقدس میں ہے، جس سے آسمان کی طرف پیغمبر کا معراج شروع ہوا تھا، منادی اس کے پاس کھڑا ہو جائے گا اور پکارے گا: ایتھا العظام البالیہ! والا وصال المنقطعة، واللحوم المتمزقة، قومی لفصل القضاء، وما اعد الله لکم من الجزاء!۔

اسے بوسیدہ ہڈیوں!، اور اے کٹی ہوئی رگوں!، اور اے بھرے ہوئے گوشتے فیصلہ اور جزا کے لیے جو تمہارے لیے مقرر ہو چکی ہوئی ہے، اٹھ کھڑے ہو،

لیکن اس احتمال پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔

لے ”سراع“ جمع ہے ”سرعی“ کی، جیسا کہ ”کرام“ جمع ہے ”کریم“ کی اور بیان حال ہے، پیغمبروں کے نازل کا جو محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح متناہی پیغمبروں سرعاً” بعض سراع کو مصدر سمجھتے ہیں جو حال کی جگہ واقع ہوا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "قیامت میں لوگوں کا یہ حشر اور جمع کرنا ہمارے لیے سہل اور آسان ہے" (ذالک حشر علینا یسیر)۔

"حشر" جمع کرنے اور ہر طرف سے اکٹھا کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ واضح ہے کہ وہ خدا جو آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، پیدا کرنے والا ہے، اس کے لیے مردوں کا حشر و نشر تو ایک سادہ اور آسان کام ہے۔ اصولی طور پر مشکل و آسان تو اس کے لیے ہوتا ہے، جس کی قدرت محدود ہو، وہ ذات جس کی قدرت غیر محدود ہے، تمام چیزیں اس کے لیے یکساں اور آسان ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں یہ آیا ہے: پہلا شخص جو زندہ ہوگا، اور قبر سے باہر نکل کر میدانِ حشر میں وارد ہوگا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں گے اور علی علیہ السلام ان کے ہمراہ ہوں گے۔ لہ

آخری زیر بحث آیت میں جو اس سورہ کی بھی آخری آیت ہے، باری تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ان کے سخت اور بھٹ دھرم مخالفین کے مقابلہ میں ایک بار پھر تسلی اور دلداری دے رہا ہے، اور فرماتا ہے: "جو کچھ وہ کہتے ہیں، ہم اس سے بخوبی آگاہ ہیں" (نحن اعلم بما یقولون)۔

اور تم انہیں ایمان کے لیے مجبور کرنے پر مامور نہیں ہوئے ہو، جو تم قہر اور جبر کے ساتھ انہیں اسلام کی طرف کھینچو" (وصانت علیہم بجبار)۔

تمہاری ذمہ داری تو صرف ابلاغ رسالت، حق کی طرف دعوت اور بشارت و اندازہ ہے "جب ایسا ہے تو ان لوگوں کو جو میرے عذابِ عقاب سے ڈرتے ہیں، قرآن کے ذریعہ میری یاد دلاؤ اور پند و نصیحت کرو" (فذكر بالقران من یخاف وعید)۔

تفسیر قرطبی میں آیا ہے کہ "ابن عباس" کہتے ہیں: کچھ لوگوں نے عرض کیا، اے رسولِ خدا! ہمیں انداز کیجئے اور ڈرائیئے تو اوپر والی آیت نازل ہوئی۔ اور کہا: "فذكر بالقران من یخاف وعید"۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مومن افراد کو خوف دلانے اور بیدار کرنے کے لیے کافی ہے، اس کا ہر صفحہ قیامت کی یاد دہانی کراتا ہے، اور اس کی مختلف آیات، گزشتہ لوگوں کی سرنوشت کو واضح کرتی ہیں اور بہشت کی نعمتوں، دوزخ کے عذابوں کا بیان اور ان حوادث کی توصیفیں، جو قیامت کے قریب اور دادگاہِ عدلِ الہی میں واقع ہوں گے، سب کے

۱۔ کتاب خصال" مطابق نقل زراعتین جلد ۶ صفحہ ۱۱۹۔

۲۔ توجہ رکھیں کہ "وعید" اصل میں "وعیدی" تھا "یار" حذف ہو گئی ہے، اور کسرہ جو اس پر درج ہے باقی رہ گیا ہے۔ اور وہ "یخاف" کا مفعول ہے۔

۳۔ "قرطبی" جلد ۹ ص ۲۱۹۔

سب بہترین بند و نصیحت کی صورت میں موجود ہیں۔
 واقعاً اس منظر کی یاد آوری کہ زمینیں پھٹ جائیں گی، اور مٹی میں جان پڑ جائے گی، مُردے لباس حیات پہن لیں گے اور
 حرکت میں آجائیں گے، قبروں سے باہر نکل کھڑے ہوں گے، درحالیکہ وحشت و اضطراب سب کو سرتاپا گھیرے ہوئے ہوگا
 اور انہیں درگاہ عدل الہی کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا، یہ ایک لرزہ خیز منظر ہوگا۔

خصوصاً جبکہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف انسانوں کی قبریں ایک قبر بن چکی ہوں گی۔ اور بہت سے افراد کو اس نے
 اپنے اندر جگہ دے رکھی ہوگی، جن میں سے بعض صالح اور بعض غیر صالح ہوں گے، اور بعض مومن اور بعض کافر ہوں گے، اور بقول شاعر:

رب قبر قد صار قبراً مزاراً ضاحک من تراحم الاضداد
 ودفن علی بقایا دفن فی طویل الاجال والاماد

کتنی بہت سی قبریں ایسی ہیں جو بارہا قبریں بنی ہیں ایسی قبریں جو تراحم اضداد سے ہنستی ہیں۔

اور کتنے بہت سے ایسے افراد ہیں جو دوسرے انسانوں کے بقیہ حصوں میں دفن ہوئے ہیں، طول زمان اور قرون
 و اعصار میں۔

پروردگارا! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے جو تیری "وعید" سے ڈرتے ہیں، اور تیرے قرآن سے نصیحت
 حاصل کرتے ہیں۔

خداوند! اس دن جب وحشت و اضطراب نے سب کو گھیرا ہوا ہوگا، ہمیں اپنی رحمت سے سکون
 عنایت فرما۔

بارالہا! زندگی کے دن تو جتنے بھی ہوں بڑی تیزی سے گزر جائیں گے۔ لیکن جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گا وہ تیرا آخرت کا گھر
 ہے، ہمیں حسن عاقبت اور آخرت میں نجات مرحمت فرما۔ آمین یا رب العالمین

سورہ "ق" کا اختتام

۱۱ رمضان المبارک بروز اتوار صبح

پونے پانچ بجے بر مکان حقیر بلاک الکوئی

جمشیدی محل سہ "۱" محمد شریف قم المقدسہ ایران

احقید
 صفدر حسین نجفی

سُورَةُ ذَا رِيَاءَاتٍ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۶ آیات ہیں

مشرع، المحرم الحرام ۱۴۰۶ھ

سُورَةُ ذَارِيَاتِ کے مطالب

اس سُورہ میں بحث کا محور پہلے درجہ میں معاد و قیامت اور زمین اور کفار کی جزا و سزا سے مربوط مسائل ہیں، لیکن اس لحاظ سے سورہٴ ق کی طرح نہیں ہے، بلکہ اس سُورہ میں بحث کے لیے دوسرے عنوانات بھی نظر آتے ہیں۔ کلی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس سُورہ کے مباحث ذیل کے پانچ محروں کے گرد گردش کرتے ہیں۔

۱- جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اس کے ایک حصہ میں معاد و قیامت اور اس کے متعلقات کے مباحث بیان ہوئے ہیں۔
۲- اس سُورہ کے دوسرے حصہ میں سزا و توجید اور نظام آفرینش میں خدا کی آیات اور نشانیوں کا بیان ہوا ہے، جو طبعی طور سے معاد کے مباحث کی تکمیل کرتا ہے۔

۳- تیسرا حصہ ان فرشتوں کی داستان کے بارے میں ہے۔ جو ابراہیم کے ہمان ہوتے تھے۔

۴- اس سُورہ کی دوسری آیات موسیٰ و قوم عاد و قوم ثمود اور قوم نوح کے داستانوں سے متعلق مختصر اشارے ہیں، اور ان کے ذریعہ دوسرے کفار اور مجرموں کو خبردار کرتا ہے۔

۵- اور آخر میں اس سُورہ کا ایک اور حصہ متعصب اور بہٹ و صدمہ اقوام کے گزشتہ انبیاء سے مبارزہ کرنے کو بیان کرتا ہے اور پیغمبر اسلام کو جو سخت ترین مخالفین کے مقابلہ میں قرار پائے تھے۔ تسلی دیتا ہے، اور استقامت کی دعوت۔

اس سُورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں امام صادق سے آیا ہے:

” من قرأ سورة الذاریات فی یومہ اولیلتہ صلح اللہ لہ معیشتہ
واتاہ برزق واسع ونور لہ قبرہ بسراج یزہرائی یوم القیامۃ
” جو شخص دن یارات کے وقت سُورہ ذاریات کو پڑھے گا خدا اس کی زندگی کے حالات اور معیشت

کی اصلاح کرے گا۔ اس کو دس روزی دے گا، اور اس کی قبر کو ایک ایسے چراغ سے روشن کرے گا، جو قیامت کے دن تک سمیکتا رہے گا۔ لے ہم بارہا بیان کر چکے ہیں، کہ ان عظیم اجروں کو حاصل کرنے کے لیے صرف زبان کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد ایسی تلاوت ہے، جو فکرو نظر میں تخریب پیدا کرے۔ اور انسان کو عمل پر ابھارے۔ ضمنی طور پر اس سورہ کی نامگذاری ”ذاریات“ کے ساتھ اس سورہ کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

سُورَةُ ذَارِيَاتٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

- ۱- وَالذُّرِّيَّتِ ذُرَّوًّا ۝
- ۲- فَالْحَمَلِ وَقَرًّا ۝
- ۳- فَالْجُرِّيَّتِ يُسْرًا ۝
- ۴- فَالْمُقَسَّمِ أَمْرًا ۝
- ۵- إِنَّمَا تُوْعَدُونَ لَصَادِقًا ۝
- ۶- وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

- ۱- ان ہواؤں کی قسم جو بادلوں کو چلاتی ہیں (اور گرد و غبار اور نباتات کے بیجوں کو حرکت میں لاتی ہیں۔
- ۲- اور پھر ان بادلوں کی قسم جو بارش کا، بار سنگین اپنے ساتھ اٹھاتے ہیں۔
- ۳- پھر قسم ہے ان کشتیوں کی جو آسانی کے ساتھ چلتی ہیں۔
- ۴- اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو کاموں کو تقسیم کرتے ہیں۔

- ۵- (ہاں! ان سب کی قسم) جو کچھ تجھے وعدہ دیا گیا ہے وہ یقیناً سچ ہے۔
۶- اور بلاشک و شبہ اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی۔

تفسیر

طوفانوں اور بارش لانے والے بادلوں کی قسم

سورہ "والصافات" کے بعد یہ دوسری سورت ہے جو بار بار کی قسموں کے ساتھ شروع ہوتی ہے، پرمعنی اور فکر انگیز قسمیں، بیدار کرنے والی اور آگاہی بخش قسمیں۔

قرآن کی بہت سی دوسری سورتیں، جن سے ہم انشا اللہ آئندہ کے مباحث میں گفتگو کریں گے، اسی قسم کی ہیں اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ قسمیں غالباً مسئلہ معاد و قیامت کے بیان کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہیں، چند موقعوں کے سوا جو مسئلہ توحید اور دوسری باتوں کے ساتھ مربوط ہیں، اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان قسموں کا مضمون قیامت کے مطالب کے ساتھ ایک خاص ربط رکھتا ہے، اور ایک خاص عمدگی اور زیبائی کے ساتھ قرآن اس اہم بحث کا مختلف طریقوں سے جواب دے رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنی قسمیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس آسمانی کتاب کے اعجاز کی صورتوں، اور قرآن کے زیب ترین اور روشن ترین حصوں میں سے ایک ہے، جن میں سے ہر ایک کی تشریح و تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

اس سورہ کے آغاز میں خدا نے پانچ مختلف موضوعات کی قسم کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چار تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، اور ایک حصہ علیحدہ صورت میں آیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے "قسم ہے ان ہواؤں کی جو بادلوں کو فضا میں چلاتی ہیں اور گرد و غبار اور گیہا اور بھولوں کے بیج روئے زمین میں ہر جگہ بکھیرتی ہیں" (والذاریات ذرّوا)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "قسم ہے ان بادلوں کی جو بارش کا سنگین بوجھ اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں" (فالحاملات وقرّا)۔

۱۔ "ذاریات" جمع ہے "ذریہ" کی، ایسی ہواؤں کے معنی میں جو چیزوں کو اڑاتی ہیں۔

۲۔ "وقرّ" اردوزن نکر، بھاری بوجھ کے کے معنی میں ہے۔ نیز کانوں کے بھاری ہونے کے معنی میں آیا ہے۔ "وقرّ" بھی سنگینی، حرکات اور سکون و ربادی کے معنی میں ہے۔

”اور رقم ہے ان کشتیوں کی جو عظیم دریاؤں اور سمندروں کی سطح پر آسانی کے ساتھ چلتی ہیں“ (فالجاریات یسراً)۔

”اور رقم ہے ان فرشتوں کی جو کاموں کو تقسیم کرتے ہیں“ (فالمقسمات امراً)۔
ایک حدیث میں جسے بہت سے مفسرین نے اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے یہ آیا ہے کہ ”ابن الکوا“ نے ایک دن علی علیہ السلام سے، جبکہ آپ منبر پر خطبہ دے رہے تھے، سوال کیا، ”الذاریات ذرواً“ کے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: ہوائیں!

اس نے عرض کیا: ”فالحاملات وقراً“ فرمایا: بادل!
اس نے عرض کیا: ”فالجاریات یسراً“ فرمایا: کشتیاں!
اس نے عرض کیا: ”فالمقسمات امراً“ فرمایا: فرشتے مراد ہیں!
اس کے باوجود دوسری تفسیریں بھی ہیں، جو اس تفسیر کے ساتھ قابل جمع ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ”جاریات یسراً“ سے مراد وہ نہریں اور دریا ہیں جو بارشوں کے ذریعہ جاری ہوتے ہیں اور ”فالمقسمات امراً“ سے مراد وہ رزق ہیں جو فرشتوں کے ذریعہ کھیتی باڑی کے طریق سے تقسیم ہوتے ہیں۔
اس طرح سے ہوائوں کے بائے میں پھر بادلوں کے بائے میں اور اس کے بعد دریاؤں اور نہروں کے بائے میں، اور آخر میں نباتات کے اگانے کے سلسلے میں گفتگو ہوئی ہے، جو مسئلہ معاد کے ساتھ جو اس کے بعد آیا ہے، قریبی مناسبت رکھتی ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امکان معاد کی ایک دلیل مردہ زمینوں کو بارش کے ذریعہ زندہ کرنے کا مسئلہ ہے جو قرآن میں بدہا مختلف عبارتوں میں مذکور ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ ممکن ہے یہ چاروں اوصاف سب کے سب ہواؤں کے اوصاف ہوں، وہ ہوائیں جو بادلوں کو پیدا کرتی ہیں۔ اور وہ ہوائیں جو انہیں اپنے دوش پر اٹھائے پھرتی ہیں اور وہ ہوائیں جو انہیں ہر طرف چلاتی ہیں اور وہ ہوائیں جو بارش کے قطروں کو ہر طرف بکھرتی ہیں۔
اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان آیات کی تعبیریں جامع اور کلی ہیں، لہذا وہ ان تمام معانی کو اپنے اندر

۱۔ ”جاریات“ جاریہ کی جمع ہے جو کشتی کے معنی میں ہے، باری پانی کی نہروں کے معنی میں بھی آیا ہے، ”فیہا عین جاریة“ (غاشیہ - ۱۲) اور اسی طرح سوہج کے معنی میں، آسمان میں اس کی حرکت کی بنا پر، اور نوجوان لڑکی کو بھی ”جاریة“ کہا جاتا ہے کیونکہ جوانی کی خوشی اس کے تمام وجود میں جاری ہوتی ہے۔

۲۔ اس کا نام عبداللہ تھا، جو امیر المؤمنین علیؑ کے زمانہ میں رہتا تھا اور آپ کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھا، خود کو ان کا دوست کہتا تھا اور کار شکنی کرتا تھا۔

جگہ دے سکتی ہیں۔ لیکن عمدہ وہی پہلی تفسیر ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر فرشتے مراد ہوں، تو فرشتے کن امور کو تقسیم کرتے ہیں؟

اس کے لیے ہمارا جواب یہ ہے کہ تقسیم کار ممکن ہے کہ اس عالم کے کل امور کی تدبیر سے مربوط ہو، کیونکہ فرشتگان الہی کے کچھ گروہ خدا کے فرمان سے اس کے امور کی تدبیر کو اپنے ذمہ لیے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تقسیم ارزاق، یا زمین کے مختلف منطقوں میں بارش کے قطرات کی تقسیم سے مربوط ہو، لہ

ان چار قسموں کو بیان کرنے کے بعد جو سب کی سب اس مطلب کی اہمیت کو بیان کرتی ہیں، جو ان کے بعد آ رہا ہے، فرماتا ہے، ”جو کچھ تمہیں وعدہ دیا گیا ہے، وہ یقیناً سچ ہے“ (انما توعدون لصادق) لہذا دوبارہ تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے، ”اس میں شک نہیں کہ اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی“ (وان الدین لواقع)۔

”دین“ یہاں جزا کے معنی میں ہے، جیسا کہ ”مالک یوم الدین“ میں آیا ہے، اور اصولاً قیامت کا ایک نام ”یوم الدین“ (روز جزا) ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے، کہ واقع ہونے والے وعدوں سے مراد، یہاں قیامت و حساب و جزا و سزا و بہشت و دوزخ سے مربوط وعدے، اور خدا سے مربوط تمام امور ہیں، اس بنا پر پہلا جملہ قیامت کے تمام وعدوں کو شامل ہے، اور دوسرا جملہ مسئلہ جزا پر ایک تاکید ہے۔

بعد کی چند آیات میں بھی ”یوم الدین“ کے بارے میں گفت گو آئی ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے وہ قسمیں جو اس سورہ کے آغاز میں آئی ہیں، وہ ان قسموں کے نتائج کے ساتھ ایک واضح درویشن تعلق اور مناسبت رکھتی ہیں، کیونکہ بادلوں کا چلنا، بارش کا برسنا، اور اس کے نتیجے میں سردہ زمینوں کا زندہ ہونا خود قیامت و خدا کے منظر کی اس دنیا میں نشاندہی کرتا ہے۔ بعض مفسرین نے ”ما توعدون“ کی یہاں ایک زیادہ وسیع مفہوم کے ساتھ تفسیر کی ہے، جو خدا کے تمام وعدوں، قیامت و دنیا و تقسیم ارزاق اور اس جہان میں اور دوسرے جہان میں مجرموں کی سزا کے ساتھ مربوط ہیں اور مؤمنین صالح کی کامیابی کو شامل ہیں، اسی سورہ کی آیت ۲۲ جو کہتی ہے۔ ”وفی السماء رزقکم و ما توعدون“ (تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا گیا ہے آسمانوں میں ہے) ممکن ہے اسی معنی کی تائید ہو، اور چونکہ آیت کا لفظ مطلق ہے۔ لہذا یہ عمومیت بعید نہیں ہے۔

بہر حال، خدا کے سب وعدے سچے ہیں، کیونکہ ”وعدہ کی مخالفت“ یا تو ”جہالت“ کے سبب سے ہوتی ہے، یا ”عجز“ ہے، وہ جہالت جو وعدہ کرنے والے کی فکر اور سوچ کو بدل کر رکھ دیتی ہے، اور وہ عجز جو اسے وعدہ کی وفا سے روک دیتا ہے، لیکن خدا ”عالم“ اور ”قادر“ ہے، لہذا اس کے وعدے مختلف ناپذیر ہیں، یعنی پکتے ہیں۔

لہذا اس نکتہ کی توجہ بھی ضرور ہے کہ ”والذاریات“ میں ”واو“ قسم کا داڑھے، اور ”فنا“ بعد اسے جملہ میں فنا، عاطفہ ہے، جو یہاں قسم کا مفہوم رکھتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان چار قسموں میں ایک قسم کے ربط کو بیان کرتی ہے۔
یعنی توجہ رکھنی چاہیے کہ ”انما“ میں ”ما“ موصولہ ہے ارشاداً، ”کا ام ہے اور“ صادق ”اس کی شہرہ ہے۔

- ۷۔ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُوكِ ۝
 ۸۔ اِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝
 ۹۔ يُؤْفِكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝
 ۱۰۔ قَتَلَ الْخَرُّ صَوْنَ ۝
 ۱۱۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُونَ ۝
 ۱۲۔ يَسْأَلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝
 ۱۳۔ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝
 ۱۴۔ ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ ۝ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝

ترجمہ

- ۷۔ قسم ہے آسمان کی جو خوبصورت شکنوں والا ہے۔
 ۸۔ یقیناً تم مختلف اور طرح طرح کی باتوں میں لگے ہوئے ہو۔
 ۹۔ وہی لوگ اس (روز جزا) پر ایمان لانے سے منحرف ہوتے ہیں جو حق کو قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں۔
 ۱۰۔ قتل ہو جائیں جھوٹے (اور موت انہیں آئے)
 ۱۱۔ وہی جو جہالت اور غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔
 ۱۲۔ اور ہمیشہ سوال کرتے ہیں کہ جزا کا دن کب ہوگا؟

- ۱۳۔ (ہاں!) وہ وہی دن ہے، جس میں انھیں آگ میں جلا دیں گے۔
۱۴۔ اپنا عذاب چکھو، یہ وہی چیز ہے، جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے۔

تفسیر قسم ہے آسمان کی اور اس کی زیباشکنتوں کی

یہ آیات بھی گزشتہ آیات کی طرح قسم کے ساتھ شروع ہو رہی ہیں، اور قیامت کے بارے میں کافروں کے اختلافات اور دوسرے مختلف مسائل مجملہ ان کے پیغمبر اسلام کی شخصیت اور مسئلہ توحید کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔ پہلے فرماتا ہے، ”قسم ہے آسمان کی جو خوبصورت شکنتوں والا ہے“ (والسما ذات الحیث)۔ ”حیث“ بروز کتب (جمع حیث) کے لغت میں بہت سے معنی بتائے گئے ہیں، مجملہ ان کے: راستے، بل، اور شکن ہے جو بیابان کی ریت پر ہواؤں کی وجہ سے یا پانی کی سطح پر یا آسمان کے بادلوں پر پیدا ہوتے ہیں۔ ”مجعد“ (گھنگھر یا لے) بالوں کو بھی ”حیث“ کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات مفسرین نے ”حیث“ کی زیبائی اور زینت میں بھی تفسیر کی ہے۔ اور اسی طرح موزوں و مرتب شکل و صورت کے معنی میں بھی۔

اور اس کا اصلی ریشہ اور جڑ ”حیث“ (بروزن لک) ہے جو باندھنے اور محکم کرنے کے معنی میں ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ سب معانی ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ ایسے خوبصورت بل اور شکن ہیں، جو موجوں کے درمیان، آسمان کے بادلوں، بیابان کے ریت کے ٹیلوں اور سر کے بالوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اب رہی اس معنی کی آسمانوں پر تطبیق تو یہ یا تو نکلی صورتوں اور عام ستاروں کی مختلف شکلوں کی وجہ سے ہے۔ ثابت ستاروں کا وہ مجموعہ جو ایک خاص شکل بنا لیتا ہے صورت نکلی کہلاتا ہے) یا آسمانی بادلوں میں چڑچڑکشی موجیں اور لہریں پیدا ہو جاتی ہیں ان کی وجہ سے ہے، جو بعض اوقات اس قدر خوبصورت اور زیبا ہوتی ہیں کہ مدتوں تک انسان کی آنکھ کو اپنی طرف متوجہ کیے رہتی ہیں۔

یا کہکشاؤں کا وہ عظیم انبوہ ہے جو مجعد اور گھنگھر یا لے بالوں کی طرح بیچ و خم کھاتی ہوئیں آسمان پر ظاہر ہوتی ہیں، خاص طور سے وہ عمدہ عکس، جو ماہرین نے دور بینوں کے ذریعہ ان کہکشاؤں کے لیے دیکھے ہیں۔ کامل طور سے مجعد اور گھنگر یا لے

اور پیچیدہ بالوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس معنی کی بنا پر، قرآن آسمان اور ان عظیم کھکشاؤں کی جن پر اس زمانہ میں علم و دانش کی تیز آنکھ ابھی تک نہیں پڑی تھی قسم لکھتا ہے۔ لے

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ یہ معانی ایک دوسرے سے کوئی منافات نہیں رکھتے، ممکن ہے کہ وہ سب ہی اس قسم میں جمع ہوں، سورہ مؤمنون کی آیت، امیں بھی یہ آیا ہے۔ ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق، ہم نے تمہارے اوپر سات راستے خلق کیے ہیں جو آسمانوں کے تنوع اور ان کی کثرت اور کردوں اور کھکشاؤں اور مختلف عوامل کی طرف اشارہ ہے۔ لے

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "جبک" کے ریشہ اصلی کا آسمانوں کے استحکام اور کرد کے ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط پیوند سے جیسا کہ نظام شمسی کا سورج کے ساتھ تعلق ہے۔ اشارہ ہو سکتا ہے۔

بعد والی آیت جواب قسم، یعنی وہ مطلب جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: تمہیں کے سب مختلف اور قسم قسم کی گفتگو میں پڑے ہوئے ہو" (انکم لفی قول مختلف)۔

تم ہمیشہ ایک دوسرے کی ضد اور نقیض باتیں کرتے ہو، اور یہی تناقض تمہاری باتوں کے بے بنیاد ہونے کی دلیل ہے۔ معاد و قیامت کے بارے میں کبھی تو یہ کہتے ہو کہ ہم اصلاً یہ بات باور نہیں کرتے کہ بوسیدہ ہڈیاں زندہ ہو جائیں۔ اور کبھی یہ کہتے ہو کہ ہمیں اس بارے میں شک و تردید ہے۔

اور کبھی اور بڑھا کر کہتے ہو کہ ہمارے آباء اجداد اور بڑوں کو لے آؤ تاکہ وہ گواہی دیں کہ موت کے بعد قیامت اور معاد ہے تو پھر ہم قبول کریں گے۔

اور پیغمبر اسلام کے بارے میں کبھی تو یہ کہتے ہو کہ وہ دیوانہ ہے، کبھی یہ کہتے ہو کہ وہ شاعر ہے، کبھی اُسے جادوگر بتاتے ہو اور کبھی یہ کہتے ہو کہ اس کا کوئی معلم و استاد ہے جو ان باتوں کی اُسے تعلیم دیتا ہے۔

اسی طرح قرآن کے بارے میں کبھی تو اُسے "اساطیر الاولین" (گذشتہ لوگوں کے افسانے اور خرافات، کا نام دیتے ہو، کبھی اُسے شعر کہتے ہو اور کبھی جادو، اور کبھی جھوٹ۔

قسم ہے آسمان کے شکنوں کی، کہ تمہاری باتیں تناقض اور بیچ و خم سے پر ہیں۔ گم کوئی اصل بنیاد رکھتے ہوئے، تو کم از کم ایک مطلب پر تو بٹھرتے، اور ہر روز کسی نئے مطلب کے پیچھے نہ جاتے۔

یہ تعبیر حقیقت میں مخالفین کے دعووں کے بطلان پر ایک استدلال ہے، جو وہ نو سید، معاد، پیغمبر اور قرآن کے

لے "لسان العرب" اور "مفردات راغب" میں اداہ "جبک" کی طرف رجوع کریں۔

لے اس آیت کی تفسیر میں مبسوط شرح تفسیر نمونہ جلد ۸ سورہ مؤمنون آیت ۸۱ کے ذیل میں آپ کی ہے۔

بارے میں کرتے ہیں۔

اگرچہ ان آیات کے قرینہ سے جو بعد میں آئیں گی، ان آیات کا اصلی تکیسہ مندرجہ معاد پر ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جھوٹے دعویداروں کے جھوٹ کا پورا کھولنے میں۔ چاہے قضائی مسائل میں ہو یا دوسرے مسائل میں۔ ان کی ایک دوسری کے خلاف باتوں سے استناد ہوتا ہے، قرآن بھی ٹھیک اسی مطلب پر تکیہ کرتا ہے۔ بعد والی آیت میں حتیٰ سے اس انحراف کی علت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "قیامت پر ایمان سے وہی لوگ منحرف ہوتے ہیں جو حتیٰ کے دلائل کو قبول کرنے اور منطق کے سامنے تسلیم خم کرنے سے روگردانی کرتے ہیں" ورنہ موت کے بعد کی زندگی کے دلائل واضح و آشکار ہیں، (لِیُؤْفَکَ عَنْہُ مِنْ اَفْکٍ)۔ توجہ رکھنی چاہئے کہ آیت کی تعبیر کلی اور سربستہ ہے، جس کا لفظی ترجمہ اس طرح ہے: "لوٹائے جائیں گے اس سے وہ جس سے وہ لوٹائے گئے ہیں۔"

"کیونکہ" "انک" اصل میں منصرف کرنے اور کسی چیز سے پھیرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے "جھوٹ" کو جو انحرافی پہلو رکھتا ہے، "انک" کہا جاتا ہے، جیسا کہ مختلف ہواؤں کو "موتلفکات" کہا جاتا ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ گذشتہ آیات میں قیامت کے بارے میں گفتگو تھی، لہذا ظاہر ہے کہ اصلی مقصود اسی عقیدہ سے انحراف ہے، اور چونکہ گذشتہ آیت میں گفتگو کافروں کی ایسی باتوں کے متعلق تھی جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں، لہذا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو واضح منطق اور دلیل سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

اس بنا پر مجموع آیت اس طرح معنی دیتی ہے: وہی لوگ قیامت پر ایمان رکھنے سے منحرف ہوں گے، جو دلیل عقل کی راہ اور حق طلبی کی منطق سے منحرف ہو گئے ہیں۔

البتہ کوئی مانع نہیں ہے کہ مراد ہر قسم کے حتیٰ سے انحراف ہو، چاہے وہ قرآن سے انحراف ہو یا توحید و نبوت پیغمبر و معاد سے ہو، (اور ان ہی میں سے آئمہ معصومین کی دلالت کا مسئلہ ہے، جو بعض روایات میں وارد ہوا ہے) لیکن اصل مسئلہ قیامت جو اصل موضوع ہے، یقینی طور پر اس میں شامل ہے۔

بعد والی آیت میں جھوٹ بولنے والوں اور اُسے بیان کرنے والوں کو شدت کے ساتھ مذمت اور تہدید کرتے ہوئے کہتا ہے: "قتل کیے جائیں جھوٹ بولنے والے اور ان کے لیے موت ہو (مردہ باد)" (قتل الخیڑاصون)۔

"خراس" مادہ "خرص" (بروزن درس) سے اصل میں ہر اس بات کے معنی میں ہے، جو گمان تخمینہ اور اندازے کی بنا پر کہی جائے (اٹکل بچو) اور چونکہ اس قسم کی باتیں جھوٹ ہوتی ہیں لہذا یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اس طرح سے "خراصون" وہ لوگ ہیں جو بے بنیاد اور بے سروپا باتیں کرتے ہیں، اور یہاں بعد والی آیات کے قرینہ سے وہ لوگ مراد ہیں، جو قیامت کے بارے میں بے بنیاد اور منطق سے دُور باتوں کے ساتھ فیصدہ کرتے ہیں۔

لیکن ہر صورت یہ جملہ ان پر نقرین کی صورت میں ہے۔ ایسی نقرین جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ ایسی موجودات

ہیں، جو موت اور نابودی کے لائق ہیں، اور وہ اس طرح ہیں جن کا عدم ان کے وجود سے بہتر ہے۔
بعض نے "قتل" کی یہاں لعن و طرد اور رحمتِ خدا سے محرومیت کے ساتھ تفسیر کی ہے۔
اور یہاں سے اس حکم کلی کو بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اصولی طور پر وہ فیصلے جن کا واضح مددک موجود نہ ہو اور اندازے
و تخمین اور بے بنیاد گمانوں پر قائم ہوں، ایسے کام ہیں، جو گمراہ کرنے والے اور نقرین و عذاب کے مستحق ہیں۔

اس کے بعد ان اگلی پچھو باتیں کرنے والے جھوٹے لوگوں کا تعارف کراتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ ایسے
لوگ ہیں جو جہالت، غفلت اور بے خبری میں ڈوبے ہوئے ہیں" (الذین ہم فی غمرة ساهون)۔
"غمرة" اصل میں اس زیادہ پانی کے معنی میں ہے، جو کسی جگہ کو ڈھانپ لے، اس کے بعد عمیق اور گہری
جہالت و نادانی پر جو کسی کو ڈھانپ لے، اطلاق ہوتا ہے۔

"ساہون" "سہو" کے مادہ سے ہر قسم کی غفلت کے معنی میں ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ جہالت کا پہلا
مرتبہ "سہو و اشتباہ" ہے، اس کے بعد "غفلت" اور پھر "غمرة" ہوتا ہے۔

اس بنا پر وہ سہو کے مرحلہ سے شروع کرتے ہیں، اس کے بعد غفلت و بے خبری تک پہنچتے ہیں، اور اس
راہ کو جاری رکھتے ہوئے مکمل طور پر "جہالت" میں ڈوب جاتے ہیں، اور ان دونوں تعبیروں - سہو و غمرة - کے درمیان
جمع کرنا ممکن ہے اور پر والی آیت میں اس حرکت کے آغاز و انجام کی طرف اشارہ ہو۔

اس طرح کہ "غراضون" سے مراد وہ لوگ ہیں، جو اپنی جہالت و نادانی میں غرق ہیں اور حق سے فرار کرنے کے
لیے ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ، اور بے بنیاد باتیں بناتے رہتے ہیں۔

اور اسی لئے ہمیشہ سوال کرتے ہیں کہ روز جزا کس وقت ہوگا اور قیامت کب آئے گی؟ (یسئلون ایاں یوم

الذین)۔
یسئلون کی تعبیر فعل مضارع کی صورت میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمیشہ ہی سوال کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ اصولی
طور پر ضروری ہے کہ قیامت کے برپا ہونے کا وقت مخفی اور پوشیدہ ہے، تاکہ ہر شخص ہر زمانہ میں اس کے واقع ہونے
کا احتمال دے اور قیامت پر ایمان کا تربیتی اثر جو ہمیشہ کی آمادگی اور خود سازی ہے، وہ حاصل ہو،
یہ گفتگو اس کے مانند ہے کہ بیمار ڈاکٹر سے بار بار سوال کرے کہ میری عمر کا اختتام کب ہوگا؟ تو ہر شخص اس
سوال کو بے بنیاد سمجھے گا اور کہے گا کہ اہم بات تو یہ ہے کہ تو یہ جانے کہ موت حق ہے تاکہ تو اپنا علاج کرے تاکہ کہیں
"جلدی آنے والی موت" میں گرفتار نہ ہو جائے۔

لیکن ان کا تو ٹھٹھا کرنے اور بہانہ جوئی کے سوا اور کوئی مقصد نہیں تھا، وہ واقعی طور پر قیامت کے برپا
ہونے کی تاریخ معلوم کرنا نہیں چاہتے تھے۔

لیکن اس کے باوجود قرآن انہیں چبھتا ہوا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے؛ قیامت اس دن ہوگی جب انہیں آگ پر جلایا جائے گا، (یوم ہم علی النار یفتنون)۔

اور انہیں کہا جائے گا: ”اپنے عذاب کو چکھو، یہ وہی چیز تو ہے، جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے“ (ذوقوا فتنکم هذا الذی کنتم بہ تستعجلون)۔
”فتنہ“ اصل میں سونے کو کھٹالی میں رکھنے کے معنی میں ہے، تاکہ اچھا اور خالص سونا کھوٹے اور ناخالص سے پہچانا جائے، اور اسی مناسبت سے ہر قسم کی آزمائش اور امتحان کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور ”انسان کے آگ میں داخل ہونے“ کے معنی میں بھی آیا ہے، اور کبھی بلا و عذاب اور پریشانی کے معنی میں بھی آیا ہے، جیسا کہ زیر بحث آیت میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

- ۱۵۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنَّتٍ وَعِيُوْنَ ۝
- ۱۶۔ اِخْذِيْنَ مَا آتٰهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُّحْسِنِيْنَ ۝
- ۱۷۔ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الْيَلِيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝
- ۱۸۔ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝
- ۱۹۔ وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝

ترجمہ

- ۱۵۔ پرہیزگار جنت کے باغوں اور چشموں کے درمیان ہوں گے۔
- ۱۶۔ اور جو کچھ ان کے پروردگار نے انھیں مرحمت فرمایا ہے، اُسے حاصل کریں گے، کیونکہ وہ اس سے پہلے (دار دنیا میں) نیکو کاروں میں سے تھے۔
- ۱۷۔ وہ رات کے کچھ ہی حصہ میں سوتے تھے۔
- ۱۸۔ اور سحر کے وقتوں میں استغفار کیا کرتے تھے۔
- ۱۹۔ اور ان کے مالوں میں سائل و محروم کے لیے ایک حق تھا۔

تفسیر نیکو کار سحر خیزوں کا اجر

گذشتہ آیات کے بعد، جن میں جاہل جھوٹ بولنے والوں، اور قیامت و معاد کے منکرین اور ان کے عذاب

کے بارے میں گفتگو تھی، زیر بحث آیات میں پرہیزگار مومنین اور ان کے اوصاف اور اجر و پاداش کی بات ہو رہی ہے تاکہ ایک دوسرے کا موازنہ کر کے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی روشنی سے — حقائق اور زیادہ واضح و روشن ہو جائیں۔
 فرماتا ہے: ”پرہیزگار جنت کے باغات اور چشموں کے درمیان ہوں گے“ (ان المتقین فی جنات و عیون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ باغ میں قدرتی طور پر پانی کی نہریں ہوتی ہیں، لیکن اس کا لطف اور عمدگی اس بات میں ہے کہ چشمے خود باغ کے اندر سے پھوٹیں اور درختوں کو ہمیشہ سیراب کرتے رہیں، یہ وہ امتیاز اور خصوصیت ہے جو جنت کے باغات میں پائی جاتی ہے نہ صرف ایک ہی قسم کا چشمہ بلکہ اس میں انواع و اقسام کے چشمے موجود ہیں، لہٰذا اس کے بعد جنت کی دوسری نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجمالی اور سرسبہ صورت میں کہتا ہے: ”ان کے پردہ گاہ نے جو کچھ انھیں مرحمت فرمایا ہے، وہ اسے حاصل کرتے ہیں“ (اخذین ما اتاہم ربہم)۔
 یعنی وہ انتہائی رغبت اور شوق اور کمال رضا کے ساتھ اور خوشی خوشی خدا کی ان نعمتوں کو قبول کریں گے۔
 اور آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے، کہ یہ عظیم اجزا اور جزا بلا وجہ نہیں ہیں، ”وہ اس سے پہلے دار دنیا میں نیکو کاروں میں سے تھے“ (انہم کانوا قبل ذالک محسنین)۔
 احسان اور نیکو کاری جو یہاں آئی ہے، ایک وسیع معنی رکھتی ہے جو خدا کی اطاعت کو بھی شامل ہے اور خلق خدا سے اللہ کی اطاعت کو بھی۔

بعد والی آیات ان کے نیکو کار ہونے کی کیفیت کو واضح کرتے ہوئے ان کے اوصاف میں سے تین اوصاف کو بیان کرتی ہیں۔
 پہلی یہ کہ ”وہ راتوں کے تھوڑے حصہ میں سوتے تھے“ (کانوا قلیلاً من اللیل ما یہجعون)۔
 ”یہ جعون“ ”ہجوع“ کے مادہ سے رات کو سونے کے معنی میں ہے۔
 بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رات کے اکثر حصہ میں بیدار رہتے ہیں اور تھوڑا حصہ سوتے تھے۔
 اور اصطلاح کے مطابق ہمیشہ شب زندہ دار تھے۔

لہٰذا لفظ ”فی“ کا ”جنات“ کے بارے میں مفہوم واضح ہے۔ کیونکہ پرہیزگار جنت کے اندر ہیں، لیکن ”عیون“ (چشموں) کے بارے میں اس معنی میں نہیں ہے، کہ وہ چشموں کے اندر ہوں گے بلکہ وہ بستے ہوئے چشموں کے درمیان میں ہوں گے۔
 لہٰذا ”قبل ذالک“ سے مراد۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ قیامت اور سبشت میں وارد ہونے سے پہلے ہے۔ یعنی عالم دنیا میں، لیکن بعض نے اسے شریعت کے آنے سے پہلے کے معنی میں لیا ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ”مستقلات عقلیہ“ پر وحی کے نازل ہونے سے پہلے ہی عمل کیا کرتے تھے، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

تفسیر ”درمنثور“ میں ایک روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر گرامی اسلام نے فرمایا:
”ان آخر الليل في التهجيد احب الى من اوله، لان الله يقول وبالاسحار
هم يستغفرون؛

”آخری رات تہجد (نماز شب) کے لیے میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔ اس کے اول سے کیونکہ خدا فرماتا
ہے: پرہیزگار سحر کے وقتوں میں استغفار کرتے ہیں“ ۱۷
ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہوا ہے:

”كانوا يستغفرون الله في الوتر سبعين مرة في السحر؛“
”بہشتی نیکو کار سحر کے وقت نماز وتر میں ستر مرتبہ خدا سے طلب مغفرت کرتے ہیں۔“ ۱۸

اس کے بعد بہشتی پرہیزگاروں کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: ”ان کے اموال میں مسائل و
محروم کے لیے ایک حق ہے“ (وفى اموالهم حق للساائل والمحروم)۔

”حق“ کی تعبیر یہاں یا تو اس بنا پر ہے کہ خدا نے ان پر لازم قرار دیا ہے (مثلاً زکوٰۃ، خمس اور سارے واجب شرعی حقوق)
یا انھوں نے خود سے اپنے اوپر لازم قرار دے لیا ہے، اور عہد کیا ہے تو اس صورت میں حقوق واجب کے علاوہ کو بھی شامل
ہوگا۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت صرف دوسری قسم کے لیے ہے، اور حقوق واجب کو شامل نہیں ہے، کیونکہ حقوق واجب
تو سب لوگوں کے اموال میں ہوتے ہیں، چاہے وہ پرہیزگار ہوں، یا دوسرے، یہاں تک کہ کفار بھی، اس بنا پر جب وہ یہ
کہتا ہے کہ، ان کے اموال میں اس قسم کا حق ہے، یعنی واجبات کے علاوہ وہ اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے اموال میں سے
راہ خدا میں سالوں اور محروموں پر خرچ کریں، لیکن کہا جاسکتا ہے، کہ نیکو کاروں کا دوسروں سے فرق یہ ہے کہ نیکو کار ان حقوق کو ادا
کرتے ہیں، جبکہ دوسرے اس کے پابند نہیں ہیں۔

یہ تفسیر بھی بیان کی گئی ہے کہ ”سائل“ کی تعبیر حقوق واجب کے بارے میں ہے، کیونکہ وہ سوال اور مطالبہ کرنے کا حق رکھتے
ہیں، اور ”محروم“ کی تعبیر سبب حقوق میں ہے جن میں مطالبہ کا حق نہیں ہے۔

”فاضل مقداد“ ”کنز العرفان“ میں تصریح کرتے ہیں کہ ”حق معلوم“ سے مراد وہ حق ہے جو وہ خود اپنے مال میں قرار دیتے
ہیں، اور خود کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ۱۹

اس معنی کی نظیر سورہ معارج کی آیہ ۲۲، ۲۵ میں بھی آئی ہے فرماتا ہے: والذین في اموالهم حق معلوم

۱۷ در المنثور طبرہ صفحہ ۱۱۳۔

۱۸ ”مجمع البیان“ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

۱۹ ”کنز العرفان“ جلد ۱ صفحہ ۲۲۶۔

للسائل والمحرور۔ اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا، اور اس سورہ کی تمام آیات مکی ہیں، آخری نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ ان روایات سے بھی جو منابع اہل بیت سے پہنچی ہیں، اس بات کی تاکید ہوئی ہے کہ "حق معلوم" سے مراد زکوٰۃ واجب کے علاوہ کی کوئی چیز ہے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے :

" لکن اللہ عزوجل فرض فی اموال الاغنیاء حقوقاً غیر الزکاة، فقال عزوجل : والذین فی اموالہم حق معلوم للسائل، فالحق المعلوم غیر الزکاة، وهو شیء یفرضہ الزجل علی نفسه فی مالہ ان شاء فی کل یوم وان شاء فی کل جمعة وان شاء فی کل شهر....."

" لیکن خدا نے دولت مندوں کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ کچھ حقوق قرار دیئے ہیں، منجملہ ان کے فرمایا ہے: ان کے اموال میں سائل و محروم کے لیے حق معلوم ہے، اس بنا پر "حق معلوم" زکوٰۃ کے علاوہ ہے اور وہ ایسی چیز ہے جو انسان خود اپنی ذات پر لازم کرتا ہے کہ وہ اپنے مال میں سے دے چاہے تو روزانہ دے یا ہر جمعہ کو دے یا ماہانہ دے"

اس سلسلہ میں دوسری متعدد احادیث مختلف تعبیروں کے ساتھ امام علی بن الحسینؑ، امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہیں، لہ

اور اس طرح سے آیت کی تفسیر واضح و روشن ہے۔

اس بارے میں کہ "سائل" اور "محروم" میں کیا فرق ہے؟ ایک گروہ نے تو یہ کہا ہے: "سائل" وہ شخص ہے جو لوگوں سے مدد کا تقاضا کرے، لیکن "محروم" وہ آبرو مند شخص ہے جو معاش کے لیے اپنی انتہائی جدوجہد اور کوشش کرتا ہے، لیکن اس کا ہاتھ کہیں نہیں پہنچتا اور اس کا کسب و کار اور زندگی پچیدہ ہو گئی ہے، اور اس کے باوجود اپنی غیرت کی حفاظت کرتا ہے، اور کسی سے مدد نہیں مانگتا،

یہ وہی شخص ہے جسے "مخارف" سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ مخارف کی تفسیر میں کتب لغت اور روایات اسلامی میں یہ بیان کیا گیا ہے۔

"وہ ایک ایسا آدمی ہے، جو جس قدر بھی کوشش کرتا ہے اس کی کوئی درآمد نہیں ہوتی، گویا زندگی کے راستے اس

کے سامنے بند ہو گئے ہیں۔“

بہر حال یہ تعبیر اس بحث کی طرف اشارہ ہے کہ ہرگز اس انتظار میں نہ بیٹھے رہو کہ حاجت مند تمہارے پاس آئیں، اور مدد کی درخواست کریں۔ بلکہ تم پر لازم ہے کہ تم جستجو کرو، اور آبرو مند محروم افراد کو جو قرآن کے قول کے مطابق (بقرہ ۲۷۳) بحسبہم الجاہل اغنیاء من التعفف؛

بے خبر لوگ پاک دامنی کی وجہ سے انہیں غنی اور بالدار خیال کرتے ہیں“ پیدا کرو، اور ان کی مدد کرو، ان کی مشکلات کی گراہ لھولو اور ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کرو، اور یہ ایسا اہم حکم ہے، جو محروم مسلمانوں کی شخصیت و حیثیت کی حفاظت کے لیے بہت اہم ہے۔

یقیناً ان لوگوں کو اسی سورہ بقرہ کی آیت میں قرآن کے قول کے مطابق ان کے چہروں سے پہچانا جاسکتا ہے۔
تعرفہم بسیماہم؛

ہاں! اگرچہ وہ خاموش ہیں، لیکن آگاہ افراد کے لیے ان کے چہرے کی گہرائی میں ان کی اندرونی جانکاہ تکلیفات کی نشانیاں واضح و آشکار ہیں، اور ”ان کے چہرے کا رنگ ان کے اندرونی بھید کی خبر دیتا ہے۔“

چند نکات

۱۔ ”خدا“ اور ”خلق خدا“ کی طرف توجہ

ان آیات میں ”متقین“ اور ”محسنین“ کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں حقیقت میں ان کا دو حصوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے، خالق کی طرف توجہ وہ بھی ایسے لمحات میں جو ہر لحاظ سے اس کے ساتھ راز و نیاز اور حضور قلب کے لیے فراہم ہیں اور فکری مشغولیت کے عوامل، اور ذہنی مصروفیات کم سے کم ہوتے ہیں، یعنی رات کے آخری حصوں میں۔ اور دوسرے حاجت مندوں کی حاجات کی طرف توجہ، چاہے وہ اپنی حاجت کو ظاہر کریں یا پوشیدہ رکھیں۔ یہی وہ مطلب ہے جس کے لیے قرآن کی آیات میں بارہا نصیحت و وصیت کی گئی ہے۔ اور وہ آیات جو نماز و زکوٰۃ کو یکے بعد دیگرے بیان کرتی ہیں اور ان دونوں پر تاکید کرتی ہیں، ان میں اسی سلسلہ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ”نماز“ خالق کے ساتھ تعلق کا، نمایاں ترین مظہر ہے، اور زکوٰۃ مخلوق خدا کے ساتھ تعلق کی واضح ترین راہ ہے۔

۲۔ شب خیز کہ عاشقان بہ شب راز کنند!

رات کو اٹھ کیونکہ عشاق رات کے وقت راز و نیاز کرتے ہیں!
باوجودیکہ نماز شب نوافل اور مستحب نمازوں میں سے ہے، لیکن قرآن مجید میں بارہا اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اور یہ اس کی حد سے زیادہ اہمیت کی نشانی ہے، یہاں تک کہ قرآن اُسے ”مقام محمود“ تک پہنچنے کا وسیلہ (سورۃ اسرار- ۷۹) اور روشنی چشم کا سبب (جیسا کہ سورۃ الم سجدہ کی آیہ ۷۰ میں آیا ہے) شمار کرتا ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس شبانہ راز و دنیا ز اور سحر گاہانہ ہیڈ لری پر حد سے زیادہ تکیہ ہوا ہے۔ ایک جگہ بغیر اکرم اے گناہوں کا کفارہ شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یا علی ثلاث کفارات، منها التہجد باللیل والناس نیام؛
”تین چیزیں گناہوں کا کفارہ ہیں ان میں سے ایک رات کو تہجد پڑھنا ہے۔ جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ لے
ایک دوسری حدیث میں رسول خدا سے منقول ہے:

”اشراف امتی حملة القرآن واصحاب اللیل“

”میری امت میں زیادہ شریف حاملین قرآن اور رات کے وقت عبادت کرنے والے ہیں“ لے
ایک اور حدیث میں بھی آنحضرت کی علی کے وصایا میں آیا ہے کہ آپ نے چار مرتبہ تکرار فرمایا ہے:

”علیک بصلوة اللیل“

”نماز تہجد کو ہرگز ترک نہ کرنا“ لے

اور امام صادق سے زیر بحث آیت (کانوا قلیلاً من اللیل ما یدہجون) کی تفسیر میں اس طرح نقل ہوا ہے:

”کانوا اقل اللیالی تفوتہم لایقومون فیہا“

”بہت کم راتیں ایسی گزرتی ہیں کہ وہ بیدار نہ ہوں اور عبادت نہ کریں“ لے

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر نے فرمایا:

”المرککتان فی جوف اللیل احب الی من الدنیا وما فیہا“

”دو رکعت نماز جو رات کی تاریکی میں پڑھی جائے میرے نزدیک دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے“ لے

یہ ایک حدیث میں منقول ہے کہ امام صادق نے (اپنے ایک صحابی) ”سیمان دلمی“ سے فرمایا:

”لا تدع قیام اللیل فان المغبون من حرم قیام اللیل“

لے ”وسائل الشیعہ“ جلد ۳ ص ۲۰۰۔

لے ”وسائل الشیعہ“ جلد ۵ ص ۲۰۰۔

لے ”وسائل الشیعہ“ جلد ۵ ص ۲۰۰۔

لے ”وسائل الشیعہ“ جلد ۵ ص ۲۰۰۔

لے ”بیمار الاوزار“ جلد ۱ ص ۱۰۰۔

”عبادت کے لیے قیامِ شب کو فراموش نہ کرو، وہ شخص خُصاً سے میں ہے جو رات کے قیام سے محروم ہے۔ لے
البتہ اس سلسلے میں بہت زیادہ روایات ہیں اور ان میں حد سے زیادہ عمدہ تعبیریں نظر آتی ہیں، خاص طور سے نمازِ شب گناہوں
کی بخشش، فکر و نظر کی بیداری، دل کی روشنی، جلبِ رزق و فراوانِ روزی اور تندرستی کے لیے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر تصارف
ہوئی ہے اگر ان روایات کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جاتی ہے۔ لے

اس سلسلے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۶ ص ۶۵۳، سورۃ اسرار کی آیہ ۹، کے ذیل میں، اور جلد ۹ ص ۵۱۶، سورۃ الم سجدہ کی آیت ۱، کے
ذیل میں، اور دوسرے مباحث بھی ہم نے پیش کئے ہیں۔

۳۔ سائل و محروم کا حق

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ادبِ پر والی آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ ہمیشہ نیکو کاروں کے اموال میں سائل و محروم کے لیے حق ہے یہ
تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حاجت مند اور محروم افراد کے لیے دیندار سمجھتے ہیں اور
انہیں حق دار اور طلب گار جانتے ہیں، ایسا حق جسے ہر حالت میں ادا ہونا چاہیے اور اس کے ادا کرنے میں کسی قسم کا کوئی احسان نہیں ہے
ٹھیک دوسرے طلب گاروں کی طلب کے مانند۔

اور جیسا ہم بیان کر چکے ہیں، کہ مختلف قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ تعبیر زکوٰۃ واجب ہے اور اس قسم کے امور
سے مربوط نہیں ہے، بلکہ مستحب قسم کے انفاقات سے مربوط ہے، جنہیں پرہیزگار اپنے اور پر دین اور قرض سمجھتے ہیں، لے

لے ”بجارا لائبر“ جلد ۶ ص ۱۲۶

لے ان روایات سے آگاہی کے لیے ”وسائل الشیعہ“ کی جلد ۵ اور ”مسئد رک الواسئل“ کی جلد اول، اور ”بجارا لائبر“ کی جلد ۶، کی طرف
رجوع کریں۔

لے ان آیات کا مکہ میں نزول، اور اس حکم کا خصوصیت کے ساتھ جنتی نیکو کاروں کے بارے میں ورد، اور انہیں اہل بیت کی روایات ایسے قرائن ہیں
جو ان آیات کی زکوٰۃ کے علاوہ دوسری چیزوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

- ۲۰۔ وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝
 ۲۱۔ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝
 ۲۲۔ وَفِي السَّمَاءِ رِشْرِقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝
 ۲۳۔ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ ۝

ترجمہ

- ۲۰۔ اور زمین میں طالبانِ حق کے لیے نشانیاں ہیں۔
 ۲۱۔ اور خود تمہارے وجود کے اندر (بھی آیات ہیں) کیا تم دیکھتے نہیں؟
 ۲۲۔ تمہاری روزمی آسمان میں ہے، اور وہ جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔
 ۲۳۔ قسم ہے آسمان و زمین کے پروردگار کی کہ یہ مطلب حق ہے، جیسا کہ تم گفتگو کرتے ہو۔

تفسیر

خدا کی نشانیاں تمہارے وجود کے اندر ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں؟

گزشتہ آیات کے بعد جن میں معاد اور دوزخیوں اور جنتیوں کے صفات کے بارے میں بیان ہوا تھا، زیر بحث آیات میں ان نشانیوں کے بارے میں جو زمین اور خود انسان کے وجود کے اندر ہیں گفتگو ہو رہی ہے، تاکہ ایک طرف تو مسئلہ اوجید، خدا کی معرفت، اور اس کی صفات کی پہچان سے، جو تمام خیرات کی طرف مبدا حرکت ہے، وہ آشنا ہوں اور دوسری طرف مسئلہ معاد اور موت کے بعد کی زندگی پر اس کی قدرت کا اٹھیں پتہ چلے۔ کیونکہ جو روئے زمین میں ان تمام عجائبات میں حیات کا خالق ہے، وہ تجدید حیات پر بھی قادر ہے۔

پہلے فرماتا ہے، ”زمین میں ان لوگوں کے لیے جو اہل حق ہیں اور حق کے طلب گار ہیں، اہم نشانیاں ہیں“ (وفی الارض

ایات للموقنین)۔

واقعاً اس کڑھ خاکی میں خدا کے غیر محدود علم و حکمت اور حق و قدرت کی بے پایاں نشانیاں اس قدر فراداں ہیں کہ کسی بھی انسان کی عمر ان سب کو پہچاننے کے لیے کافی نہیں ہے۔

زمین کا حجم، اس کا سُوج سے فاصلہ، اس کی اپنے گرد حرکت اور اس کی سُوج کے گرد حرکت، اور وہ قوت جاذبہ و دافعہ جو اس حجم اور اس حرکت سے وجود میں آتی ہے، اور کامل طور سے ایک دوسرے کے برابر اور یکساں ہے، اور پھر ان سب کی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی، تاکہ صفحہ زمین پر حیات اور زندگی کے لیے ماحول فراہم کرے، یہ سب چیزیں خدا کی عظیم آیات میں سے ہیں

در حالیکہ اگر ان حرکات و روابط اور خصوصیات میں سے کوئی ایک چیز بھی کم سے کم تغیر پیدا کرے تو صفحہ زمین پر حیات و زندگی کے حالات درہم برہم ہو جائیں۔

وہ مواد جن سے زمین بنی ہے اور مختلف منابع جو سطح زمین اور زیر زمین حیات و زندگی کے لیے آمادہ ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

پہاڑ اور صحرا، درے اور جنگل، دریا اور چشمے جن میں سے ہر ایک حیات کو جاری رکھتے اور اس کے حالات کو ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک نقش مؤثر رکھتے ہیں، دوسری نشانیاں ہیں۔

لاکھوں قسم کی نباتات و حشرات و حیوانات (جی ہاں لاکھوں قسم کے) ہر ایک اپنے خصوصیات اور عجائبات کے ساتھ جو زمین شناسی نباتات شناسی اور حیوان شناسی کی کتابوں کے مطالعہ کے وقت انسان کو حیرت میں ڈبو دیتی ہے اور دوسری نشانیاں ہیں۔

اس کڑھ خاکی کے گوشہ و کنار میں ایسے ایسے عمدہ اسرار ہیں۔ کہ شاید بہت ہی کم افراد ان کی طرف توجہ کرتے ہیں، لیکن ماہرین کی محققانہ نظروں نے ان سے پردہ اٹھا دیا ہے، اور آفریڈ گار کی عظمت کو واضح و آشکار کر دیا ہے۔ ہم یہاں اگر دنیا کے ایک مشہور ماہر فن کی باتوں کے ایک گوشہ کی طرف، جس نے اس سلسلے میں کافی مطالعہ کیا ہے، ذرا توجہ دیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

”کرسٹی مورسین“ کہتا ہے،: ”عوامل طبیعی کی تنظیم میں انتہائی دقت اور باریکی یعنی بے کام لیا گیا ہے، مثلاً اگر کڑھ زمین کا خارجی قشر، اس سے کہ جواب ہے، دس حصہ زیادہ ضخیم ہوتا، تو آکسیجن یعنی زندگی کا اصل مادہ۔ وجود میں نہ آتا، یا اگر سمندوں کی گہرائی موجودہ گہرائی سے کچھ حصہ زیادہ ہوتی تو اس وقت زمین کا سارا آکسیجن اور کاربن جذب ہو جاتا، اور پھر سطح زمین پر نباتاتی یا حیوانی زندگی کا کسی قسم کا امکان باقی نہ رہتا۔“

ایک دوسری جگہ قشر ہوائی کے بارے میں، جو اطراف زمین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، کہتا ہے: اگر اطراف زمین کی ہوا موجودہ حالت سے تھوڑی سی تپلی اور رقیق ہوتی، تو وہ شہاب ثاقب جو ہر روز لاکھوں کی تعداد میں زمین کی طرف جذب ہوتے ہیں، اور زمین سے باہر کی اسی فضا میں (قشر ہوا سے ٹکرانے کی وجہ سے) نابود ہو جاتے ہیں، ہمیشہ سطح زمین تک پہنچتے اور اس کے ہر گوشہ کو نقصان پہنچاتے۔

اور یا اگر شہابوں کی حرکت کی سرعت جتنی ہے اس سے کم تر ہوتی، (تو ہرگز ہوا کے ساتھ ٹکرانے سے نہ پھٹنے) وہ سب کے سب سطح زمین پر آکر گرتے، اور ان کی تباہ کاری کا نتیجہ معلوم تھا۔

ایک اور دوسری جگہ کہتا ہے: "آطراف زمین کی ہوا میں صرف اکیس فی صد اکیسجن ہے۔ اگر ہوا میں موجودہ آکسیجن کی مقدار اکیس فی صد کی بجائے پچاس فی صد ہوتی، تو اس عالم کے تمام جلنے والے مواد جل کر خاکستر ہو جاتے اور اگر کوئی چنگاری جگمگ کے کسی درخت تک پہنچ جاتی تو تمام جنگل مکمل طور پر رکھ ہو جاتے۔"

زمین پر محیط ہوا کی موٹائی اس قدر ہے کہ سورج کی شعاعوں کو اپنی مقدار میں زمین کی طرف عبور کرنے دیتی ہے کہ جتنی مقدار نباتات کی رشد اور نشوونما کے لیے ضروری ہے اور تمام مضر جراثیم کو فضا میں ہی معدوم کر دیتی ہے، اور مفید ویٹامنوں کو بچا درتی ہے۔

یا مختلف بخارات کا وجود جو طویل زمانوں کے عرصہ میں زمین کی گہرائیوں سے باہر نکلا ہے، اور ہوا میں پھیل گیا ہے۔ اور ان میں زیادہ تر ہیں بھی زہریلی گیسیں، لیکن اس کے باوجود زمین کے محیط ہوا میں آلودگی پیدا نہیں ہوتی، اور ہمیشہ سے اسی بحال حالت میں جو حیات انسانی کو جاری رکھنے کے لیے مناسب ہے، باقی ہے۔

وہ عظیم دستگاہ جو اس عجیب توازن کو ایجاد کرتی ہے اور یکسانیت کی حفاظت کرتی ہے، وہی بڑے بڑے دریا اور سمندر ہیں، جن کے وجود کے بغیر سے، مواد حیاتی و غذائی، بارش و اعتدال ہوا و نباتات اور آخر میں خود انسان، زندگی حاصل کرتے ہیں، جو شخص حقیقت کا ادراک رکھتا ہے اسے چاہیے کہ سمندر کی عظمت کے سامنے تسلیم خم کر دے (اور سمندروں کے پیدا کرنے والے) اور اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہو، لے

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "خود تمہارے وجود میں بھی خدا کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں" (وفی انفسکم)۔ کیا تم انہیں نہیں کھولتے، اور حق کی ان تمام آیات اور ظاہر نشانیوں کو نہیں دیکھتے؟ (اخلا تبصرون)۔ بلاشک انسان عالم ہستی کا ایک عجب ہے، اور جو کچھ عالم کبیر میں ہے وہ سب کچھ اس عالم صغیر میں بھی موجود ہے۔ بلکہ اس میں کیسے عجائبات ہیں جو دنیا میں کسی جگہ بھی نہیں ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ انسان اس ہوش و عقل و علم کے ہوتے ہوئے، اور اس تمام خلاقیت و ابتکارات اور عجیب و غریب صنائع کے باوجود، پہلے دن ایک چھوٹے سے بے قدر و قیمت لطفہ کی صورت میں تھا، لیکن جو نہی کہ وہ عالم رحم میں قرار پاتا ہے تو عجیب سرعت کے ساتھ تکامل و ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے، روز بروز شکل تبدیل کرتا ہے۔ اور لمحہ بہ لمحہ دیگر گوں ہوتا ہے، اور وہ لطفہ ناچیز مختصر سی مدت میں انسان کامل میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

ایک غلیہ جو اس کے اجزاء و بدن کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے، تہ بہ تہ اور عجیب و غریب ساخت رکھتا ہے، اور

ماہرین کے قول کے مطابق ایک صنعتی شہر کے برابر تشکیلات اس میں موجود ہیں۔

علم الحیات کا ایک ماہر کہتا ہے: ”یہ عظیم شہر، ہزار ہا عجیب و غریب عمدہ دروازوں، ہزار ہا کارخانوں، سٹورڈن، آب رسانی کے جال، فسرماندہی کا مرکز اس کی فزاداں تاسیسات، عمارتوں بہت سے رابطوں اور دوسرے حیاتی کاموں کے ساتھ، وہ بھی ایک چھوٹے سے خیلے ہیں، پیچیدہ ترین اور عجیب ترین شہروں میں سے ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ ایسی عمارتیں بنائیں، جو وہی اعمال انجام دیں۔ اور ہم ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہیں۔ تو ہمیں دسیوں ہزار ایکویٹزین کو تاسیسات، مختلف عمارتوں اور پیچیدہ آلات والی مشینوں کے نیچے لے جانا پڑے گا، تاکہ وہ اس قسم کے پردگرام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ دستگاہ آفریش نے ان سب کو ”پندرہ میلیون ملی میٹر“ کے برابر رقبہ میں قرار دیا ہے۔ لہ

وہ کارخانے جو انسان کے بدن میں ہیں۔ مثلاً دل، گردے، پھیپھڑے، اور خاص طور سے دسیوں ہزار کلو میٹر کی موٹی اور پتلی رگیں، یہاں تک کہ وہ بال جیسی باریک رگیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتیں اور وہ پانی، غذا اور ہوا پہنچانے کا کام انجام دیتی ہیں، دس ملیون میلارڈ) بدن انسانی کے خیلے ہیں، اور مختلف حواس، جیسے بینائی، اشتوائی اور دوسرے حواس میں سے ہر ایک اس کی عظیم آیات میں سے ہر ایک آیت ہے۔

اور سب سے زیادہ ”حیات و زندگی“ کا معما ہے، جس کے اسرار اسی طرح سے غیر شناختہ ہے جوئے ہیں اور انسان کی کونج و عقل کی عمارت ہے، جس کے ادراک سے تمام انسانوں کی عقلیں عاجز ہیں اور یہ وہ منزل ہے کہ انسان بے اختیار خدا کی تسبیح اور حمد و ثنا کے لیے بول اٹھتا ہے۔ اور اس کی باہر گاہ عظمت میں سر تعظیم جھکا دیتا ہے، اور ان اشعار کے ساتھ ترنم کرتا ہے:

فیک یا اعجوبة الڪون غذا الفکر كلیلا

انت حیرت ذوی اللب وبلبلت العقولا

كلما قدم فکری فیلث شبرا فرمیدا

ناکصا یخبط فی عمیاء لا یهدی سبیلا

”اے عالم ہستی کے اعجوبہ (اے خدائے بزرگ) تجھ میں فکر خستہ و ماندہ ہو کر رہ گئی ہے“

”تو نے ما جان فکر و دماغ کو حیران کر دیا ہے اور عقول کو مضطرب بنا دیا ہے“

”جس وقت میری فکر تجھ سے ایک بالشت قریب ہوتی ہے، تو ایک میل فرار کر جاتی ہے“

”ہاں وہ پیچھے کی طرف پلٹ جاتی ہے اور تارایکوں میں غرق ہو جاتی ہے، اور اُسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے“

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر گرامی اسلام نے فرمایا:

”من عرف نفسه فقد عرف ربه“

”جو شخص اپنے آپ کو پہچان لے گا وہ اپنے خدا کو پہچان لے گا“

لہ ”سفری براعماق وجود انسانی“ (بخش سلولہا)

لہ سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۶۰۳ مادہ ”نفس“

ہاں! خود شناسی "تمام مراحل میں" خدا شناسی کی راہ ہے۔

"ان فلا تبصرون" (کیا تم نہیں دیکھتے، کی تعبیر ایک لطیف تعبیر ہے، یعنی یہ آیات الہی تمہارے گرداگرد، تمہاری جان کے اندر، تمہارے سانسے پیکر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر تم تھوڑی سی آنکھ کھولو تو انہیں دیکھ لو گے اور تمہاری رُوح اس کی عظمت کے ادراک سے سیراب ہو جائے گی۔

تیسری زیر بحث آیت میں عظمت پروردگار کی نشانیوں کے تیسرے حصے، اور محاد پر اس کی قدرت کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تمہاری روزی آسمان میں ہے اور اس چیز کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے" (وفى السماء رزقكم وما تعدون)۔

اگرچہ بعض اسلامی روایات میں "رزق" کی اس آیت میں بارش کے حیات بخش قطرات سے تفسیر ہوئی ہے، جو زمین میں ہر نیرو و برکت کا منبع ہے، اور سورہ جاثیہ کی آیت ۵ بھی اس کے موافق ہے،:

وما انزل الله من السماء من مازق فاحياء الارض بعد موتها:

"جو کچھ خدا نے آسمان سے رزق نازل کیا ہے تو اس کے ذریعہ مردہ زمینوں کو زندہ فرمایا ہے۔ لیکن یہ معنی ہو سکتا ہے کہ آیت کے واضح مصادیق میں سے ایک ہو، جبکہ مفہوم رزق کی وسعت بارش کو بھی شامل ہے، اور سورج کی روشنی کو بھی جو آسمان سے ہماری طرف آتی ہے اور اس کا نقش و اثر پوری زندگی میں حد سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، اور اس طرح ہوا کو بھی جو تمام زندہ موجودات کے لیے سبب حیات ہے، رزق میں شامل سمجھے۔

یہ سب اس صورت میں ہے کہ ہم "سما" کی اسی ظاہری آسمان کے ساتھ تفسیر کریں، لیکن بعض مفسرین نے "سما" کو عالم الغیب، اور ارض طبعیت اور لوح محفوظ کے معنی میں لیا ہے، کہ انسانوں کے ارزاق کی تقدیر وہاں سے ہوتی ہے۔

البتہ دونوں معانی میں جمع ممکن ہے، اگرچہ پہلی تفسیر زیادہ واضح اور روشن نظر آتی ہے۔

باقی ہا "ما تعدون" جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے، کا جملہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ سکہ رزق اور اس سلسلے میں وعدہ الہی پر ایک تاکید ہو، یا بہشت موعود کے معنی میں ہو، کیونکہ "والنجم" کی آیت ۱۵ میں یہ آیا ہے کہ: عندھا جنة العاوی، بہشت موعود سدرة المنتہی کے پاس آسمانوں میں ہے، اور یا ہر قسم کی خیر و برکت یا اس عذاب کی طرف اشارہ ہے، جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ اور یا ان تمام مفاہیم کی طرف ناظر ہے، کیونکہ "ما تعدون" کے جملہ کا مفہوم وسیع اور کشادہ ہے۔

بہر حال ان تینوں آیات میں ایک لطیف ترتیب پائی جاتی ہے: پہلی آیت کہہ زمین میں انسان کے عوامل وجود کے بارے میں گفتگو کرتی ہے، اور دوسری آیت خود انسان کے وجود کے بارے میں، اور تیسری آیت اس کے دوام و بقا کے عوامل کے بارے میں۔

یہ محنت بھی قابل توجہ ہے کہ، وہ چیز، "انسان" کی بصیرت میں مانع ہے، اور اس کو اسرار آفرینش کے مطالعہ، یعنی اسرار زمین اور خود اس کے وجود کے عجائب سے آگاہ ہونے سے باز رکھتی ہے، وہ روزی کی حرص ہے، خدا آیت کے آخر میں اطمینان دلاتا ہے کہ اس کی روزی کی ضمانت دی جا چکی ہے، تاکہ وہ راحت و آرام کے ساتھ عالم ہستی کے عجائبات میں غور و

شکر کر کے، اور "افلا تبصرون" کا جملہ اس کے حق میں پورا ہو۔

لہذا اس مطلب کی تاکید کے لیے آخری زیر بحث آیت میں قسم کھاتے ہوئے کہتا ہے: "آسمان وزمین کے خدا کی قسم یہ مطلب حق ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے تم بات کرتے ہو" (فصرت السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون)۔

معاشرہ میاں تک پہنچ گیا ہے کہ خدا اپنی عظمت و قدرت کے باوجود بہت شک کرنے والوں، دیر سے یقین کرنے والوں، ضعیف النفس اور جلیس بندوں کو اطمینان دلانے کے لیے قسم کھا رہا ہے، کہ رزق و روزی اور قیامت کے ثواب و عقاب کے وعدوں کے بارے میں جو وعدہ تم سے کیا گیا ہے، وہ سب حق ہے، اور اس میں شک و شبہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ لے "مثل ما انکم تنطقون" (جس طرح تم بات کرتے ہو) کی تعبیر ایک لطیف اور چچی تلی تعبیر ہے۔ ایک محسوس ترین چیز کے بارے میں کیونکہ بعض اوقات انسان کے دیکھنے اور سننے میں تو خطا اور غلطی واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن بات کرنے میں اس قسم کی کوئی خطا اور غلطی نہیں ہوتی کہ انسان یہ احساس کرے کہ اس نے بات کی ہے، حالانکہ اس نے بات نہ کی ہو، لہذا قرآن کہتا ہے: جس قدر تمہارا بات کرنا تمہارے لیے ایک محسوس حقیقت ہے اور واقعیت رکھتا ہے، رزق اور خدائی وعدے بھی اسی طرح ہیں۔

اس سے قطع نظر، بات کرنے کا مسئلہ، خود پروردگار کی ایک عظیم ترین روزی اور نعمتوں میں سے ہے، کیونکہ انسان کے سوا کسی بھی زندہ موجود کو یہ نعمت نہیں ملی، اور انسانوں کی اجتماعی زندگی، تعلیم و تربیت، علوم و دانش کے انتقال، اور زندگی کے مشکلات کے حل کے بارے میں بات کرنے کا اثر و نفوذ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

چند نکات

۱۔ اصمعی کی لرزا دینے والی داستان

"زمخشری" تفسیر کشاف میں اصمعی سے نقل کرتا ہے کہ میں بصرہ کی مسجد سے باہر آیا تو اچانک میری نگاہ ایک بیابانی عرب پر پڑی جو اپنی سواری پر سوار تھا، وہ میرے سامنے آیا تو مجھ سے پوچھا: تم کس قبیلہ سے ہو؟ میں نے کہا "بنی اصمعی" سے اس نے کہا: کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے کہا وہاں سے جہاں خداوند رحمن کا کلام پڑھتے ہیں، اس نے کہا میرے لیے بھی پڑھو۔

لے "انہ" کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اس میں مفسرین کے درمیان اختلافات ہیں۔ بعض اسے "رزق" کی طرف، بعض "ما لوعودون" کی طرف اور بعض اس کو پتھر اور قرآن کی طرف راجع قرار دیتے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

لے اس کا نام عبدالملک ابن قریب" تھا ہارون الرشید کے زمانہ میں ہوا ہے، اس کا حافظہ عجیب و غریب اور اس کے معلومات تاریخ و ادب اور اشعار عرب سے بہت زیادہ تھے اور اس نے ۱۱۱ھ میں بصرہ میں وفات پائی، (الکنی واللقاب ج ۲ ص ۲۷)

میں نے اس کے لیے سورہ "الذاریات" کی کچھ آیات پڑھیں، یہاں تک کہ میں آیت "وفی السماء رزقکم" تک پہنچا، اس نے کہا، بس کافی ہے، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اونٹ جو اس کے ساتھ تھا اُسے نخر کر ڈالا، اور اس کا گوشت، ان ضرورت مندوں میں جو آجارے تھے تقسیم کر دیا۔ اس نے اپنی تلوار اور کمان بھی توڑ ڈالی اور ایک طرف پھینک دی اور پشت پھیر کر چلتا بنا، یہ واقعہ گزر گیا۔

جس وقت میں ہارون الرشید کے ساتھ خانہ خدا کی زیارت کے لیے گیا تو میں طواف میں مشغول ہو گیا، ایک میں نے دیکھا کہ کوئی آہستہ آواز کے ساتھ مجھے پکار رہا ہے، میں نے نگاہ کی تو دیکھا کہ وہی مرد عرب ہے، لاغر اور کمزور ہو چکا ہے، اس کے چہرہ کارنگ زرد پڑ گیا ہے، (صاف ظاہر تھا کہ آتش عشق کا اس پر غلبہ ہو گیا ہے جس نے اس کو بے قرار کر دیا ہے) اس نے مجھ پر سلام کیا، اور دوبارہ مجھ سے خواہش کی کہ اسی سورہ "ذاریات" کو اس کے لیے پڑھوں جب میں اس آیت پر پہنچا، تو اس نے چلا کر کہا، ہم نے اپنے خدا کے وعدہ کو اچھی طرح پایا ہے، اس کے بعد اس نے کہا کیا اس کے بعد بھی کوئی آیت ہے تو میں نے بعد والی آیت کو پڑھا: فورب السماء والارض انه لحق، تو اس نے دوبارہ چیخ مار کر کہا،

"يا سبحان الله من ذا الذي اغضب الجليل حتى حلف لي صدقوه بقوله حتى الجئوه الى اليمين ؟"

"یہ کتنی عجیب بات ہے، کون تھا وہ جس نے خداوند جلیل کو غضبناک کیا، اور اُسے اس طرح قسم کھانی پڑی؟ کیا انہوں نے اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا، کہ وہ قسم کھانے کے لیے ناپا رہوا؟! اس نے اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا، اور زمین پر گر پڑا، اور اس کی رُوح آسمان کی طرف پرواز کر گئی، لے

۲۔ بہشت کہاں ہے؟

جیسا کہ ہم آیات کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ بعض نے "وما توعدون" کے جملہ کی بہشت کے ساتھ تفسیر کی ہے انہوں نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت آسمانوں میں ہے، لیکن ان کی یہ بات اس چیز سے جو سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۳ میں آئی ہے، جو کہتی ہے کہ بہشت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ سازگار نظر نہیں آتی۔ اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، یہ تفسیر جملہ "ما توعدون" کے لیے مسلم نہیں ہے، بلکہ ممکن ہے کہ یہ وعدہ رزق یا آسمانی غذاؤں کی طرف اشارہ ہو۔

اور اگر سورہ نجم کی آیت ۱۵ میں یہ آیا ہے کہ "جنة المأوی" آسمانوں میں "سدرۃ المنتهی" کے پاس ہے، تو یہ اس معنی پر دلیل نہیں ہوگی، کیونکہ "جنة المأوی" بہشت کے باغات کا ایک حصہ ہے نہ کہ تمام بہشت (غور کیجئے گا)

۳۔ حق تعالیٰ کی نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے آمادگی ضروری ہے

جس وقت قرآن کی آیات، عالم ہستی میں خدا کی نشانیوں اور اسرار آفرینش کے متعلق گفت گو کرتی ہیں، تو کبھی فرماتا ہے "یہ ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کان دھر کے سنتے ہیں" (لقوم یسمعون) (یونس - ۶۷) کبھی کہتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں" (لقوم یتفکرون) (رعد - ۲) کبھی فرماتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جو تعقل کرتے ہیں" (لقوم یعقلون) (رعد - ۴) کبھی کہتا ہے: ان لوگوں کے لیے جو بہت زیادہ صبر کرنے والے اور بہت زیادہ شکر گزار ہیں۔ (الکمل صبار شکور) (ابراہیم - ۵)

کبھی کہتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں" (القوم یؤمنون) (نحل - ۷۹) کبھی کہتا ہے: "صاحبان دماغ کے لیے نشانیاں ہیں" (الآیات لا ولی النہی) (طلحہ - ۵۴) کبھی فرماتا ہے: "جو ہوش میں سرشار ہیں" (الآیات للمتوسمین) (حجر - ۷۵) اور بالآخر کبھی یہ کہتا ہے: صاحبان علم کے لیے نشانیاں ہیں (الآیات للعالمین) (روم - ۳۲) زیر بحث آیات میں کہتا ہے: "کیا تم دیکھتے نہیں؟ کہ خدا کی آیتیں، زمین میں اور تمہارے وجود کے اندر، ان لوگوں کے لیے جو چشم بینا رکھتے ہیں، واضح و آشکار ہیں۔

یہ سب تعبیریں اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بے شمار آیات اور بہت سی نشانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے جو اس کے وجود پاک کے لیے، سائے عالم آفرینش میں موجود ہیں۔ ایک آمادہ زمین کی ضرورت ہے، ایک پینا آنکھ، ایک سننے والا کان ایک بیدار فکر اور ایک باہوش دل، اور ایک ایسی رُوح جو حقائق کی پیاسی اور اُسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو، ضروری ہے، ورنہ ممکن ہے کہ انسان سالہا سال ان آیات کے درمیان زندگی بسر کرتا رہے لیکن جانوروں کی طرح اصمطیل اور گھاس کے علاوہ کسی چیز کو نہ پہچانے۔

۴۔ رزق حق ہے

منجملہ ان امور کے جن پر ایک دقیق نظام حاکم ہے، یہی روزی کا سلسلہ ہے، جس کی طرف زیر بحث آیت میں واضح اشارے ہوئے ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے تلاش و کوشش شرط ہے، اور کاہلی و سستی محرومیت اور دراندگی کا سبب بنتی ہے، لیکن یہ گمان کر لینا بھی اشتباہ اور غلط ہے کہ حرص و طمع اور نامناسب کاموں سے انسان کی روزی میں اضافہ ہوتا ہے، اور عفت و مسامت اور خودداری سے روزی کم ہو جائے گی۔

اسلامی احادیث میں اس سلسلے میں عمدہ تعبیریں نظر آتی ہیں۔ ایک حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے،

ان الرزق لایجره حرص حریص ، ولا یصرفه کره کاره :

” روزی خدا کی طرف سے مقدر شدہ ہے ، حریص کا حرص اُسے جلب نہیں کرتا ، اور نہ ہی لوگوں کی ناپسندیدگی اُسے روکتی ہے “ لہ

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے اس شخص کے جواب میں جس نے موعظہ کا تقاضا کیا تھا فرمایا
 ” وان کان الرزق مقسوماً فالحرص لماً اذا ؟..... “

” جب رزق تقسیم شدہ ہے تو پھر حرص دلاج کس بنا پر..... ؟ “ لہ

ان بیانات کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کوئی کوشش ہی نہ کی جائے ، بلکہ حریص اور لالچی لوگوں کو رزق کے مقدر ہونے کی وجہ سے ان کے حرص سے روکا گیا ہے۔

یہ حکمت بھی قابل توجہ ہے کہ احادیث اسلامی میں جلب رزق یا اس کے موانع کے عنوان سے بہت سے امور بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی نوعیت میں کارآمد ہے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے۔

والذی بعث جدی بالحق نبیاً ان اللہ تبارک و تعالیٰ یرزق العبد علی قدر

المروءة ، وان المعونة تنزل علی قدر شدۃ البلاء :

” اس ذات کی قسم جس نے میرے جد کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے کہ خداوند تعالیٰ انسان کو اس کی مردت و شخصیت کے

مطابق روزی دیتا ہے ، اور پروردگار کی کمک اور مدد شدت بلا اور حادثہ کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ لہ

ایک اور دوسری حدیث میں انہی حضرت سے منقول ہے :

کف الاذی وقلة الصخب ینزیدان فی الرزق :

” لوگوں کو تکلیف و آزار پہنچانے سے رُکنا اور شور شرابہ اور جھگڑے کو ختم کرنے سے ، روزی میں اضافہ ہوتا ہے “ لہ

پیغمبر اسلامؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

” التوحید نصف الدین واستئصال الرزق بالصدقة :

” توحید نصف دین ہے اور روزی کو راہ خدا میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے نازل کرو “ لہ

اس طرح کچھ اور امور جیسے گھر کے اطراف کو صاف ستھرا رکھنا اور برتنوں

سھونا روزی کی زیادتی کے اسباب میں سے بیان کیے گئے ہیں۔

لہ رشتہ ”نور الثقلین“ جلد ۵ ص ۱۲۶

لہ نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۲۵ (حدیث ۳۱)

لہ رشتہ وہی مد رک جلد ۵ ص ۱۲۶ (حدیث ۲۵ و ۲۶)

- ۲۴۔ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثٌ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ۝
- ۲۵۔ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ قَوْمٌ مُنْكَرُونَ ۝
- ۲۶۔ فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ ۝
- ۲۷۔ فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ۝
- ۲۸۔ فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ۝
- ۲۹۔ فَأَقْبَلَتْ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ
عَجُوزٌ عَقِيمٌ ۝
- ۳۰۔ قَالُوا كَذَلِكَ قَالَ رَبُّكَ إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۝

ترجمہ

- ۲۴۔ کیا تمہارے پاس ابراہیم کے محترم مہانوں کی خبر آئی ہے؟
- ۲۵۔ جس وقت وہ ان کے پاس پہنچے تو کہا: تجھ پر سلام! اس نے کہا: تم پر بھی سلام، تمہیں پہچانا نہیں!
- ۲۶۔ اس کے بعد چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف گیا، اور ایک موٹا تازہ بچھڑا اور بچھنا ہوا ان کے لیے لایا۔
- ۲۷۔ اور اس کو ان کے پاس رکھ دیا (لیکن تعجب سے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ غذا کی طرف نہیں بڑھاتے) کہا! کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟

۲۸۔ اور اس کام سے وحشت محسوس کی، انہوں نے کہا: ڈرو نہیں (ہم تو تیرے پروردگار کے رسول ہیں) اور اُسے ایک عالم و دانای بیٹے کے تولد کی بشارت دی۔

۲۹۔ اسی اثنا میں اس کی بیوی آگے بڑھی در حالیکہ (خوشی اور تعجب سے) چلا رہی تھی، اور اپنے مُنہ پر ہاتھ مارا اور کہا (کیا میرے بیٹا ہوگا حالانکہ میں) ایک بانجھ بڑھیا ہوں۔

۳۰۔ انہوں نے کہا تیرے پروردگار نے اسی طرح کہا ہے اور وہ حکیم و دانای ہے۔

تفسیر

ابراہیم کے مہمان

ان آیات سے آگے گزشتہ مطالب کی تاکید و تائید کے لیے، گزشتہ انبیاء اور گزشتہ اقوام کی سرگزشت کا ایک گوشہ پیش کیا جا رہا ہے اور اس کا پہلا حصہ ان فرشتوں کی سرگزشت ہے، جو قوم لوط کو عذاب کرنے کے لیے آدمیوں کی شکل میں ابراہیمؑ پر ظاہر ہوئے اور ایک بیٹے کے تولد کی بشارت دی، جبکہ ابراہیمؑ بھی بڑھاپے کے سن کو پہنچے ہوئے تھے اور ان کی بیوی بھی سن رسیدہ اور بانجھ تھی۔

اس باعزت بیٹے کا اس سن و سال میں بوڑھے ماں باپ کو عطا کرنا، ایک طرف تو، اس چیز کے لیے، جو ہر قسم کی روزیوں کے مقدر ہونے کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں آئی تھی، ایک تاکید ہے۔ اور دوسری طرف حق تعالیٰ کی قدرت و توانائی پر ایک دلیل اور خدا شناسی کی آیات میں سے ایک آیت ہے، جسے کے بارے میں گزشتہ آیات میں بحث ہوئی ہے۔

اور تیسری طرف صاحب ایان اقوام کے لیے جو حمایت حق کے ممتوں کے لیے، ایک بشارت ہے، جیسا کہ بعد والی آیات جو قوم لوط کے ہولناک عذاب کی بات کرتی ہیں۔ بے ایمان مجرموں کے لیے ایک تہدید اور تشبیہ ہے۔ پہلے رُوئے سخن پیمبر کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیا ابراہیم کے محترم مہمانوں کی خیر تہ تک پہنچی ہے" (ہل اتاک حدیث ضیف ابراہیم المکرمین)۔

”مکرمین“ (اکرام کئے گئے) کی تعبیر یا تو اس بنا پر ہے کہ یہ فرشتے حق تعالیٰ کے مامور تھے، اور سورۃ انبیاء کی آیت ۲۶ میں بھی فرشتوں کے بارے میں یہ آیا ہے: بل عباد مکرمون: ”وہ مکرم و محترم بندے ہیں“ یا ان احترامات کی وجہ سے ہے جو ابراہیم ان کے لیے بجالانے: اور یادوں جہات سے۔

اس کے بعد ان کے حالات کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے: ”جس وقت وہ ابراہیم پر وارد ہوئے اور کہا: تجھ پر سلام! تو اس نے کہا: تم پر بھی سلام ہو، تمہیں پہچانا نہیں“ (اذ دخلوا علیہ فقالوا سلاماً قال سلاماً قوماً منکرون)۔

بعض نے کہا ہے کہ ابراہیم نے ان کے ناشناختہ ہونے کی بات اپنے دل میں کی نہ کہ آشکارا صورت میں دیکھ کر یہ بات مہمان کے مسئلہ احترام کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

لیکن یہ بات معمول کے مطابق ہے، کہ بعض اوقات میزبان مہمان کے احترام کے باوجود کہتا ہے: معلوم نہیں میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟ اور میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا نہیں ہوں۔ اس بنا پر ظاہر آ رہا ہے کہ محفوظ رکھا جاسکتا ہے، کہ ابراہیم نے یہ بات ان کے سامنے ہی کی ہو، اگرچہ پہلا احتمال بھی بعید نظر نہیں آتا، خاص طور سے جبکہ مہمانوں کی طرف سے اپنے تعارف کے سلسلے میں یہاں کوئی جواب بھی نظر نہیں آتا، اور اگر ابراہیم نے اس قسم کی کوئی بات آشکارا کی تھی، تو ضرور وہ اس کا جواب دیتے۔

بہر حال ابراہیم جیسے مہمان نواز اور سخی نے اپنے مہمانوں کی پذیرائی کے لیے فوراً کام شروع کر دیا، پوشیدہ طور پر اپنے گھر والوں کی طرف گئے اور ایک موٹا تازہ مٹھنا ہوا بچھڑا ان کے لیے لے آئے“ (فراغ الی اہلہ فجاہ بجمل سمین)۔

”راغ“ جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے ”روغ“ (بروزن مشوق) ایک پوشیدہ منصوبے کے ساتھ چلنے کے معنی میں ہے۔

(بقیہ حاشہ صفحہ گزشتہ) اس کی توصیف ہوئی ہے، اور یہ جو بعض نے کہا ہے کہ وہ مصدر ہے اور اس کا تشبیہ اور جمع نہیں ہے۔ شیک نظر نہیں آتا۔ لیکن کشاف میں ”مخشری“ کے قول کے مطابق چونکہ اصل میں وہ مصدر تھا، جب اس نے اپنے آپ میں وصفی معنی لے لیا تو مفرد جمع دونوں میں استعمال ہونے لگا۔

لہ ”سلاماً“ ایک فعل مخذوف کی وجہ سے منصوب ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے: ”نسلم علیکم سلاماً“ اور سلام بہت دہا ہے، اور اس کی خبر مخذوف ہے اور اصل میں ”علیک سلام، یا سلام علیکم، تھا، گو یا ابراہیم چاہتے تھے کہ ان کے سلام سے بالاتر سلام اور تحیت کہیں، کیونکہ جملہ اسمیہ“ اثبات و دوام پر دلالت کرتا ہے (تفسیر کشاف ج ۴ ص ۴۰)۔

ابراہیم نے ایسا کیوں کیا؟ کیونکہ ممکن تھا، کہ اگر مہمان متوجہ ہو جائیں، تو اس قسم کی پُرخرج میزبانی سے منع کر دیں۔ لیکن ابراہیم نے محدودے چند مہانوں کے لیے، جو بعض کے قول کے مطابق تین افراد اور زیادہ سے زیادہ بارہ افراد تھے، یہ اتنا فراوان اور با فراغت کھانا کیوں تیار کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ عام طور پر سخی افراد ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی مہمان آجائے تو وہ صرف مہانوں کے اندازے کے مطابق کھانا تیار نہیں کرتے، بلکہ وہ اتنی غذا تیار کرتے ہیں کہ مہانوں کے علاوہ وہ تمام لوگ جو ان کے لیے کام کرتے ہیں اس میں شریک ہو جائیں، یہاں تک کہ وہ ہسالیوں قرابت داروں اور دوسرے گرد و پیش کے لوگوں کو بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ اس بنا پر ہرگز اس قسم کی اضافی غذا اسراف اور فضول خرچی میں شمار نہیں ہوتی، اور یہ چیز موجودہ زمانہ میں بہت سے قبیلوں اور ان لوگوں میں جو سابقہ طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، نظر آتی ہے۔

”عجل“ (بروزن طفل) بچھڑے کے معنی میں ہے، (اور یہ جو بعض نے کہا ہے کہ گو سفند کے معنی میں ہے وہ متون لغت کے مطابق نہیں ہے) یہ لفظ اصل میں ”عجلہ“ کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ جانور اس سن و سال میں عجلانہ حرکات کرتا ہے اور جب بڑا ہو جاتا ہے تو انھیں کلی طور پر پھوڑ دیتا ہے۔

”سمین“ موٹے تازے کے معنی میں ہے اور اس قسم کے بچھڑے کا انتخاب مہانوں کے احترام اور اس پاس کے اشخاص کے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے تھا۔

سورہ ہود کی آیت ۶۹ میں آیا ہے کہ یہ بچھڑا بھنا ہوا تھا، (بعجل حنیذ) اگرچہ زیر بحث آیت اس باسے میں کوئی بات نہیں کرتی، لیکن اس کے منافی بھی نہیں ہے۔

”ابراہیم خود یہ کھانا مہانوں کے لیے لے کر آئے، اور ان کے نزدیک رکھ دیا“ (فقہ ربہ البہم)۔ لیکن انتہائی تعجب کے ساتھ مشاہدہ کیا کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تو ابراہیم نے کہا: کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟ (قال الا تاکلون)۔

ابراہیم خیال کرتے تھے کہ وہ جنس بشر میں سے ہیں، ”جب انھوں نے دیکھا کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تو دل میں وحشت محسوس کی“ (فاوجس منهم خيفة)۔

کیونکہ اس زمانہ میں۔ اور اس زمانہ میں بھی بہت سی اقوام ہیں جو سنتی اخلاق کے پابند ہیں۔ جب کوئی کسی کے دسترخوان پر کھانا کھا لیتا تھا تو پھر اس کو تکلیف آزار نہیں پہنچاتا تھا، اور کوئی خیانت نہیں کرتا تھا، اور جہاں نمک کھاتے ہیں وہاں نمک دان کو نہیں توڑتے (نمک حرامی نہیں کرتے)، لہذا اگر مہمان غذا کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاتا، تو یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی خطرناک کام کے لیے آیا ہے، یہ ضرب المثل بھی عربوں میں مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں؛ ”من لم يأكل طعاماً لم يحفظ ذماتاً“۔

”جو شخص تیرا کھانا نہیں کھاتا وہ تیرے عہد و پیمان کی وفا نہیں کرے گا۔“

”ایجاس“ ”جس“ (بروزن مکث) کے مادہ سے اصل میں مخفی آواز کے معنی میں ہے، اسی بنا پر ”ایجاس“ پنہانی اور اندر دنی احساس کے معنی میں آیا ہے، گویا انسان اپنے اندر سے آواز سنا ہے اور جب ”خیفۃ“ کے ہمراہ ہو، تو احساس خوف کے معنی میں ہے۔

یہاں پر مہاتوں نے - جیسا کہ سورۃ ہود آیت - میں آیا ہے - ”اس سے کہا کہ ڈرو نہیں“ اور اس کو تسلی دی، :
(قالوا لا تخف۔)

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”انہوں نے اُسے ایک دانا اور عالم بیٹے کی بشارت دی“ (و بشر وہ بغلام علیم۔)

واضح ہے کہ بیٹا تولد کے وقت تو ”عالم“ نہیں ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ اس میں استعداد ہو کہ وہ آئندہ عالم اور عظیم دانشمند بنے اور یہاں ہی مراد ہے۔ اس بابے میں کہ یہ بیٹا ”اسمعیل“ تھا ”یا“ ”اسحق“؛ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، اگرچہ مشہور یہی ہے کہ وہ حضرت ”اسحق“ تھے۔ لیکن یہ احتمال کہ اسماعیل تھا، سورۃ ہود کی آیہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو کہتی ہے: ”فبشرناہا باسحاق“ درست نظر نہیں آتا اس بنا پر کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عورت جس کے بابے میں بعد کی آیات میں گفتگو آئی ہے، وہ ابراہیم کی بیوی سارہ ہے اور یہ بیٹا ”اسحق“ ہے۔

”اس وقت ابراہیم کی بیوی آگے آئی، درحالیکہ وہ خوشی اور تعجب سے بلند آواز میں بول رہی تھی۔ اس نے اپنے پہرے پر ہاتھ مارا اور کہا: کیا میرے فرزند ہوگا؟ حالانکہ میں ایک بانجھ بڑھیا ہوں“ (فاقبلت امراتہ فی صرة فضکت وجہا وقالت عجوز عقیم۔)

سورۃ ہود کی آیت ۲۲ میں بھی یہ آیا ہے: قالت یا ویلئتی والد وانا عجوز وھذا بعلی شیخاً؛ اس نے کہا: وائے ہو مجھ پر کیا میں اب بچہ جنونگی، جب کہ میں بانجھ بڑھیا ہوں، اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، یہ تو واقفاً ایک عجیب چیز ہے۔

اس بنا پر اس کا چیخنا تعجب اور خوشی کی وجہ سے چیخنا تھا۔ (یعنی بلند آواز میں اظہارِ مسرت و حیرت)
لفظ ”صرة“ ”صر“ (بروزن شرا) کے مادہ سے دراصل باندھنے اور وابستگی کے معنی میں ہے، اور شدت سے چیخنے اور اسی طرح پے در پے جمعیت پر بھی بولا جاتا ہے، چونکہ اس میں شدت اور ایک دوسرے سے پبستگی ہوتی ہے، شدید اور سرد ہو اؤل کو بھی ”صر صر“ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسانوں کو لپیٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اور ”صردۃ“ اس عورت یا سرد کو کہتے ہیں جس نے ابھی تک رنج نہ کیا ہو، یا شادی کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو، کیونکہ ان میں ایک قسم کی بستگی اور امتناع ہے اور زیر بحث آیت میں اسی شدت کے ساتھ چلانے کے معنی میں ہے۔
”صکت“ ”صک“ (بروزن شک) کے مادہ سے شدت سے مانے یا چہرے پر مارنے کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ ابراہیم کی بیوی نے جس وقت بیٹے کے تولد کی بشارت سنی۔ تو جیسا کہ عورتوں

کی عادت ہے۔ شدت تعجب اور شرم و حیا سے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر مارے۔
بعض مفسرین کے قول کے مطابق اور اسی طرح تورات کے سفر تئوین کے مطابق، ابراہیم کی بیوی نوے سال یا اس سے زیادہ عمر
کی تھی، اور خود ابراہیم تقریباً سو سال یا اس سے زیادہ تھے۔

لیکن قرآن بعد والی آیت میں، فرشتوں کے جواب کو، جو انھوں نے اُسے دیا۔ نقل کرتا ہے: "انھوں نے کہا کہ تیرے
پروردگار نے اسی طرح کہا ہے، اور وہ حکیم و دانا ہے" (قالوا كذلك قال ربك ان الله هو الحكيم العليم)۔
اگرچہ تو بڑھیا ہے اور تیرا شوہر بھی اس طرح ہے، لیکن جب تیرے پروردگار کا فرمان صادر ہو اور اس کا ارادہ کسی چیز سے متعلق
کو جائے تو بلا شک و شبہ وہ پورا ہو جاتا ہے۔

یہاں تک کہ اسی جہان جیسا ایک اور عظیم جہان امرکن (ہو جا) کے ساتھ پیدا کر دینا اس کے لیے سہل اور آسان ہے۔
"عظیم" اور "علیم" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تو اپنے بڑھاپے اور پانچ ہونے
اور اپنے شوہر کے کہن سال ہونے کی خبر دے، خدا ان سب باتوں کو جانتا ہے اور اگر ابھی تک اس نے تمہیں بیٹا نہیں دیا اور
اب آخر عمر میں مرحمت کر رہا ہے تو اس میں بھی حکمت ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورہ ہود کی آیہ ۷۳ میں یہ آیا ہے کہ فرشتوں نے اس سے کہا: "تعجبین من امر
الله رحمة الله وبركاته عليكم اهل البيت انه حميد مجيد": "کیا تو خدا کے حکم پر تعجب کر رہی
ہے، یہ خدا کی رحمت اور اس کی برکات تمہارے گھرانے پر ہیں اور وہ حمید و مجید ہے۔"

ان دونوں تعبیروں کا فرق اس بنا پر ہے، کہ فرشتوں نے یہ سب باتیں سارہ سے کہی تھیں، فرق یہ ہے کہ سورہ ہود میں
اس کے ایک حصے کی طرف اور یہاں دوسرے حصے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ وہاں خدا کی رحمت اور برکات کی گفتگو ہے
اور وہ حمید و مجید ہونے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ (وہ ذات جس کی نعمتوں کے مقابلہ میں اس کی حمد و تعجب کرتے ہیں۔)

لیکن یہاں ان دونوں میاں بیوی کے بچہ جننے کے لیے عدم آمادگی کی نسبت خدا کی آگاہی، اور اس خاتون کے ظاہری
اسباب کی بنا پر عقیم ہونے کے سلسلہ میں گفتگو ہے، لہذا مناسب یہ ہے کہ کہا جائے۔ خدا ان سب چیزوں سے آگاہ
ہے، اور اگر یہ سوال ہو کہ جوانی میں یہ نعمت انھیں کیوں نہیں دی؟ تو کہا جائے گا: اس میں کوئی حکمت ہوگی، کیونکہ وہ حکیم ہے۔

ایک نکتہ

پیغمبروں کی سخاوت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض خشک قسم کے افراد سخاوت اور بلند نظری کا اسراف اور فضول خرچی سے اشتباہ کرتے
ہیں اور خیال نہیں ہونے اور تنگ نظری کو زہد و پارسائی کے مسئلہ سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

قرآن اُپر والی آیات اور سورہ ہود کی آیات میں اس حقیقت کو کھول کر بیان کر رہا ہے کہ جہان کی پذیرائی کھلے دل سے اور معقول طریقے سے کرنا ہرگز مخالف شریعت نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر کہ ایک پیغمبر نے یہ کام کیا ہے، لہذا یہ اس کے پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے، لیکن وہ ایسی پذیرائی ہو جس کی شعاع دوسروں کو بھی بہرہ ور کرے، جیسا کہ شریف اور سخی افراد کی رقم ہے۔

خدا نے کبھی بھی زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کو حرام نہیں کیا، اور اموال حلال اپنے پاس رکھنا، جیسا کہ ابراہیم کے پاس تھے، جن سے دوسرے لوگ بھی فائدہ اٹھاتے تھے، اُسے کبھی عیب شمار نہیں کیا۔
ابراہیم اتنا بہت سارا مال ہونے کے باوجود کبھی بھی یادِ خدا سے غافل نہیں ہوئے، اور کبھی اس سے خواہ مخواہ کی دستگیری نہ رکھی اور کسی زمانہ میں بھی اس کے منافع کو اپنے تک منحصر نہیں رکھا۔

قرآن سورہ اعراف کی آیہ ۳۲ میں کہتا ہے: **قل من حرم زینۃ اللہ الّتی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق قل ہی للذین امنوا فی الحیوۃ الدنیا خالصۃ لیوم القیامۃ کذلک انزلنا فی الآیات لقوم یعلمون**، کہہ دے خدا کی زینتوں کو جو اس نے بندوں کے لیے خلق کی ہیں، اور پاکیزہ روزیوں کو کس نے حرام کیا ہے؟ کہہ دے: یہ دنیا کی زندگی میں انھیں لوگوں کے لیے تو ہیں جو ایمان لائے ہیں (اگرچہ دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ شریک ہیں) لیکن قیامت میں تو یہ خالصتاً مؤمنین کے لیے ہی ہوں گی، ہم اسی طرح سے اپنی آیات کی ایسے لوگوں کے لیے جو آگاہ ہیں، تشریح و تفصیل کرتے ہیں۔
اس سلسلہ میں ہم تفصیلی بحث جلد ۱۲ سورہ اعراف کی آیہ ۳۲ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

- ۳۱۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ○
 ۳۲۔ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ○
 ۳۳۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ ○
 ۳۴۔ مُّسَوِّمَةً عِشْرَةً بِكَ لِلْمُسْرِفِينَ ○
 ۳۵۔ فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ○
 ۳۶۔ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ○
 ۳۷۔ وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ○

ترجمہ

- ۳۱۔ (ابراہیم نے) کہا: اے خدا کے فرشتو! پھر تم کس لیے بھیجے گئے ہو؟
 ۳۲۔ انھوں نے کہا: ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔
 ۳۳۔ تاکہ ان پر ”مٹی کے پتھروں“ کی بارش کریں۔
 ۳۴۔ ایسے پتھر جن پر تیرے پروردگار کی طرف سے، اسراف کرنے والوں کے لیے نشان لگے ہوئے ہیں۔
 ۳۵۔ ہم نے ان تمام مومنین کو جو (قوم لوط) کے ان شہروں میں زندگی بسر کرتے تھے، (عذاب کے نازل ہونے سے پہلے) باہر نکال لیا۔
 ۳۶۔ اور ہم نے اس میں ایک گھرانے کے سوا کوئی باایمان گھرانہ پایا ہی نہیں۔

۳۷۔ اور ہم نے ان (بلا دیدہ شہروں) میں، ایسے لوگوں کے لیے، جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں، ایک واضح نشانی چھوڑی ہے۔

تفسیر

قوم لوط کے بلا دیدہ شہر ایک آیت اور عبرت ہیں

فرشتوں کے ابراہیم کے پاس آنے، اور انہیں اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دینے کے واقعہ کے بعد، اس گفتگو کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، جو ”ابراہیم“ اور ”فرشتوں“ کے درمیان قوم ”لوط“ کے سلسلہ میں ہوئی۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ: ابراہیم شام کی طرف جلا وطن ہونے کے بعد لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے اور ہر قسم کے شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ کرنے میں مصروف تھے، حضرت ”لوط“ جو ایک عظیم پیغمبر تھے، ان ہی کے زمانہ میں ہوئے ہیں اور احتمال یہ ہے کہ آپ ہی کی طرف سے مامور ہوئے تھے، کہ گمراہوں کو تبلیغ و ہدایت کرنے کے لیے شام کے ایک علاقہ (یعنی سدوم کے شہروں کی طرف) سفر کریں۔ وہ ایک ایسی گناہگار قوم کے درمیان آئے جو شرک اور بت پرستی سے گناہوں میں آلودہ تھی، اور سب سے قبیح گناہ اغلام اور لواطت تھی، آخر کار فرشتوں کا ایک گروہ، اس قوم کی ہلاکت پر مامور ہوا، لیکن وہ پہلے ابراہیم کے پاس آئے۔

ابراہیم مہمانوں کی وضع قطع سے سمجھ گئے کہ یہ کسی اہم کام کے لیے جا رہے ہیں، اور صرف بیٹے کی ولادت کی بشارت کے لیے نہیں آئے، کیونکہ اس قسم کی بشارت کے لیے تو ایک ہی شخص کافی تھا، یا اس عجلت کی وجہ سے جو وہ چلنے کے لیے کر رہے تھے، اس سے محسوس کیا کہ کوئی اہم ڈیوٹی رکھتے ہیں۔

لہذا پہلی آیت میں کہتا ہے: ”اے خدا کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کو نے اہم کام کے لیے مامور ہوئے ہو؟“
(قال فما خطبکم انہا المرسلون)۔ لہ

فرشتوں نے اپنی ڈیوٹی بیان کی، اور ابراہیم سے ”کہا ہم ایک مجرم اور بتاہ کار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں“ (قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین)۔

لہ توجہ رکھنی چاہیے کہ ”خطبے“ ہر قسم کے کام کو نہیں کہتے، بلکہ یہ اہم کاموں کے معنی میں ہے، جبکہ شغل، امر، نفل اور اس قسم کے افعال ایک عام مفہوم رکھتے ہیں۔

گروہ
اس
”سجیلہ“
کی صورت
پر شاہ
کی بی
ان پر
ہوئے
مفسر
تھی کہ
لیے نش
مجرم
اور حیا
لہ
بھیجے گئے
اشارہ کرتے
میں ہیں۔

ایسی قوم جو عقیدہ کے فساد اور خرابی کے علاوہ انواع و اقسام کی آلودگیوں، اور مختلف گناہوں میں جو قبیح اور شرمناک ہیں۔ گرفتار ہیں۔ لہ

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: ”ہم اس بات کے لیے مامور ہوئے ہیں کہ ان پر ”سنگ۔ گل“ کی بارش کریں، اور انھیں اس کے ذریعہ تہ وبالاکر کے ہلاک کر دیں“ (المنزل علیہم حجارة من طین)۔

”حجارة من طین“ (مٹی کے پتھر) کی تعبیر اوہی چیز ہے، جسے سورہ ہود کی آیت ۸۲ میں اس کی بجائے ”سجیل“ کہا ہے، اور ”سجیل“ اصل میں ایک فارسی لفظ ہے، جو ”سنگ“ و ”گل“ سے لیا گیا ہے، اور عربی زبان میں ”سجیل“ کی صورت اختیار کر لی ہے، تو اس بنا پر یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہ پتھر کی طرح سخت ہے اور نہ مٹی کی طرح نرم اور مجموعی طور پر شاید اس معنی کی طرف اشارہ ہو کہ اس مجرم قوم کو نابود کرنے کے لیے آسمان سے بڑے بڑے پتھروں کے نازل کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی، بلکہ چھوٹے چھوٹے ریت کے ذرات کی بارش جو زیادہ محکم نہیں تھے، بارش کے قطرات کی مانند ان پر بر سے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، ”یہ پتھر تیرے پروردگار کی طرف سے اسراف کرنے والوں کے لیے نشان لگائے ہوئے تھے“ (مسوۃ عند ربک للمسرفین)۔

”مسوۃ“ اس چیز کو کہتے ہیں، جس پر کوئی علامت اور نشانی ہو، اور اس بارے میں کہ وہ کس طرح کے نشاندار تھے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ: ان کی ایک مخصوص شکل تھی جو اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ یہ عام پتھر نہیں ہیں، بلکہ عذاب کا ذریعہ ہیں۔

اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے: ہر ایک پر ایک علیحدہ نشانی تھی اور ایک معین فرد اور ایک خاص نقطہ کے لیے نشان بنا یا گیا تھا تاکہ لوگ جان لیں کہ خدا کے عذاب ایسے حساب شدہ ہوتے ہیں کہ بیک معلوم ہے، کہ کون سا مجرم شخص کس پتھر کے ساتھ ہلاک ہوگا!

”مسرفین“ کی تعییر ان کے گناہوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، اس طرح سے کہ وہ حد سے گزر گئے تھے اور حیار و شرم کا پردہ چاک کر چکے تھے، اگر کوئی شخص قوم لوط کے حالات اور ان کے گناہوں کے اقسام میں غور کرے

لہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورہ ہود میں اس واقعہ کو ذکر کرتے وقت کہتا ہے: ”اقا ارسلنا الی قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں“۔ تعبیر کا یہ فرق جو زیر بحث آیات اور سورہ ہود کی آیات کے درمیان ہے اس بنا پر ہے کہ ان میں سے ہر ایک واقعہ کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں دوسرے لفظوں میں یہ تمام مسائل واقع ہوئے ہیں البتہ ان میں سے بعض زیر بحث آیات کے ضمن میں آئے ہیں اور بعض دوسرے، دوسری سورتوں میں ہیں۔

تو وہ دیکھ لے گا کہ ان کے بارے میں یہ تعبیر بہت ہی پُر معنی ہے لہ
ہر انسان ممکن ہے کبھی کبھی کسی گناہ سے آلودہ ہو جائے، لیکن اگر وہ جلدی بیدار ہو جائے اور اس کی تلافی اور اصلاح
کر لے تو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کام اسراف کی حد تک پہنچ جائے۔
یہ تعبیر اس کے ساتھ ہی ایک اور مطلب کو بھی واضح کرتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ یہ آسمانی پتھر قوم لوط کے لیے نشان
لگائے گئے بلکہ یہ تمام اسراف کرنے والے گنہگاروں کے انتظار میں ہیں۔

قرآن نے یہاں پر زور دگار کے ان فرشتوں کے بعد کے واقعہ کو۔ کہ وہ لوط کے پاس آئے، اور جہانوں کے عنوان
سے وارد ہوئے، اور وہ بے شرم قوم، اس خیال سے کہ وہ نوع بشر کے خوبصورت جوان ہیں، ان کی طرف آئی۔ لیکن
بہت جلد ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اور ان سب کی آنکھیں اندھی ہو گئیں — چھوڑ دیا ہے، اور خدا کی گفتگو کے
آخری حصہ کو بیان کرتا ہے، لہ

فرماتا ہے، ”ہم نے ان تمام مومنین کو جو قوم لوط کے شہروں میں رہتے تھے، بلا کے نازل ہونے سے پہلے ہی
نکال دیا“ (فاخر جنان من كان فيهما من المؤمنين)۔
لیکن ان تمام علاقوں میں ہمیں ایک گھرانے کے سوا اور کوئی صاحب ایمان نہ ملا!“ (فما وجدنا فيها غير
بيت من المسلمين)۔

ہاں! ہم ہرگز خشک وتر کو ملا کر نہیں جلاتے، اور ہماری عدالت اجازت نہیں دیتی کہ مومن کو کافر کی سزا میں گرفتار
کریں یہاں تک کہ اگر کھوکھا بے ایمان اور مجرم لوگوں میں ایک فرد بھی با ایمان اور پاک ہو تو ہم اسے بھی نجات دیتے ہیں،
یہ وہی مطلب ہے جو سورہ حجر کی آیت ۵۹، ۶۰ میں اس صورت میں آیا ہے، ”الا ال لوط انا لمنجوهم
اجمعين الا امرأته قد زنا فلها من الغابرين“ مگر لوط کا خاندان کہ ہم ان سب کو نجات دیں گے سوائے اس کی بیوی
کے، جس کے لیے ہم نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ وہ شہر میں رہے اور ہلاک ہو جائے۔

لے تفسیر نمونہ کی جلد ۹ ص ۸۳ کی طرف رجوع کریں (سورہ ہود کی آیت ۸۱ کے ذیل میں)۔

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہ ماجرا سورہ ہود کی آیات میں نقل ہوا ہے، لیکن اس کی تعبیریں اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی
ہیں، کہ ابراہیم سے ان فرشتوں کی ملاقات قوم لوط کے عذاب سے پہلے تھی، جب کہ زیر بحث آیات میں کچھ تعبیریں یہ بتاتی ہیں
کہ یہ ملاقات بعد میں ہوئی، اس مسئلہ کے حل کا راستہ یہ ہے کہ ”مسومة عند ربك للمسرفين“ تک فرشتوں
کی گفتگو ہے۔ اور بعد کی تین آیات جو اوپر ذکر ہو چکی ہیں، خدا کا کلام ہے، اور اس کے مخاطب پیغمبر اسلام اور مسلمان ہوں، اور
وہ اسے ایک واقعہ کے عنوان سے جو گزشتہ زمانہ میں صورت پذیر ہوا بیان کر رہا ہے۔

(غور کیجئے)

اور سورہ ہود کی آیت ۸۱ میں آیا ہے: "فاسر باهلك بقطع من اللیل ولا یلقت منکم احد الا امراتك انتہ مصیہا ما اصابہم" رات کے وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ روانہ ہو جا، اور تم میں سے کوئی بھی اپنے پیچھے کی طرف مڑ کر نہ دیکھے، سوائے تیری بیوی کے کہ وہ بھی اسی عذاب میں جس میں وہ گرفتار ہوں گے، گرفتار ہوگی۔

اور سورہ عنکبوت کی آیت ۲۲ میں یہی واقعہ اس صورت میں بیان کیا گیا ہے:

قال ان فیہا لوطا قالوا نحن اعلم بمن فیہا لننجینہ واهلہ الا امراتہ کانت من الغابریں۔ "ابراہیم نے کہا: اس شہر اور آبادی میں تم جسے نابود کرنے کا (تم اے فرشتو!) ارادہ رکھتے ہو، لوط بھی رہتا ہے، انہوں نے کہا، ہم ان نیکیوں سے جو اس میں ہیں بخوبی آگاہ ہیں، ہم اس کو اور اس کے گھر والوں کو تو نجات عطا کریں گے، مگر اس کی بیوی شہر کے لوگوں کے درمیان ہی رہ جائے گی۔"

پھر یہی موضوع سورہ اعراف کی آیت ۸۳ میں اس طرح بیان ہوا ہے: فانجیناہ واهلہ الا امراتہ کانت من الغابریں، ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو نجات بخشی، مگر اس کی بیوی جو شہر میں رہ جانے والوں میں سے تھی (اور انہی کے انجام کو پہنچی)۔"

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں قوم لوط کے ماجرے کا یہ حصہ قرآن کی ان پانچ سورتوں میں مختلف عبارتوں میں بیان ہوا ہے۔ جو سب کے سب ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں، لیکن چونکہ ایک حادثہ کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے، اور ہر نگاہ میں اس کے کسی ایک پہلو کو مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، اس لیے قرآن مجید میں بھی تاریخی حوادث عام طور پر اسی طرح پیش ہوئے ہیں، اور دہرائے گئے ہیں، اور اوپر والی آیات کی مختلف تعبیریں بھی اسی معنی کی گواہ ہیں، علاوہ ازیں چونکہ قرآن ایک تربیتی اور انسان سازی کی کتاب ہے، اور مقام تربیت گاہ میں ضروری ہے کہ ایک اہم مسئلہ پر بار بار مائل کیا جائے تاکہ پڑھنے والوں کے ذہن میں گہرا اثر چھوڑے، البتہ ضروری ہے کہ یہ تکرار عمدہ، دلنشیں اور گونا گوں تعبیروں کے ساتھ صورت پذیر ہو، تاکہ دل کو ملال حاصل نہ ہو اور فصیح و بلیغ ہو، (ابراہیم کے جہانوں کے واقعہ اور ابراہیم کی ان سے گفتگو، اور پھر قوم لوط کے دردناک اور عبرت انگیز انجام، کی مزید وضاحت کے لیے، تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۲۱۲ سے آگے اور جلد ۹ ص ۱۸۳ اور جلد ۱۱ ص ۱۰۳ اور جلد ۱۶ ص ۲۲۴ سورہ اعراف، ہود، حجر اور عنکبوت کی آیات کے ذیل میں رجوع فرمائیں)۔

بہر حال خداوند عالم نے اس آلودہ قوم کو زمین کے ایک سخت اور دیران کرنے والے زلزلہ سے تہ و بالا کر دیا، اس کے بعد آسمانی پتھروں کی بارش برساتی اور ان کا نام و نشان مٹا دیا۔ یہاں تک کہ ان کے پلید بدن بھی آسمانی گرد و غبار اور تپڑوں کے نیچے دفن ہو گئے، تاکہ وہ آئندہ آنے والوں، اور تمام بے ایمان مجرم اور آلودہ افراد کے لیے، ایک عبرت ہوں۔

اسی لیے آخری زیر بحث آیت میں مزید کہتا ہے: "ہم نے ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں، اس سرزمین میں ایک واضح نشانی رکھ چھوڑی ہے" (وטרکنا فیہا آیت لتذین یخافون العذاب الالیم)۔

یہ تعبیر اچھی طرح سے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ان آیات اور خدا کی نشانیوں سے وہی لوگ پسند و نفیحت حاصل کرتے ہیں، جن میں قبول کرنے کے لیے آمادگی ہو۔ اور جو مسولیت اور ذمہ داری کا احساس کریں۔

ایک نکتہ

قوم لوط کے شہر کہاں تھے؟

یہ بات مسلمہ ہے کہ ابراہیم عراق اور سرزمین بابل سے ہجرت کرنے کے بعد شامات کی طرف گئے، کہتے ہیں کہ لوط بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد (توحید کی طرف دعوت دینے اور فتنہ و فساد سے مبارزہ کے لیے) شہر "سدم" کی طرف گئے۔

"سدم" قوم لوط کے ایک شہر اور آبادی کا نام تھا جو شامات (ملک اردن میں) بحر المیت کے قریب واقع تھا جو آباد اور درختوں اور سبزہ زار سے بھرا تھا، لیکن اس بدکار و بے غیرت قوم پر عذاب الہی کے نازل ہونے کے بعد، ان کے شہر مسمار اور تہ و بالا ہو گئے، چنانچہ انہیں "مدائن مؤتلفات" (تہ و بالا ہونے والے شہر) کہتے ہیں۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ ان شہروں کے ویرانے زیر آب آگئے ہیں، اور ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے بحر المیت کے ایک گوشہ میں کچھ ستون اور دوسرے آثار جو ان شہروں کے خرابوں پر دلالت کرتے ہیں دیکھتے ہیں۔

اور یہ جو بعض اسلامی تفسیر میں آیا ہے کہ "وטרکنا فیہا آیۃ" کے جملہ سے مراد وہی گندے پانی ہیں جنہوں نے ان شہروں کی جگہ کو ڈبو دیا ہے۔ ممکن ہے کہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہو کہ شدید زلزلوں اور زمین کے شگافتہ ہونے کے بعد بحر المیت سے ایک راستہ اس سرزمین بلا دیدہ کی طرف کھل گیا ہو اور یہ سب شہر زیر آب آگئے ہوں۔

جب کہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ قوم لوط کے شہر زیر آب نہیں آئے اور اب بھی بحر المیت کے قریب ایک علاقہ ہے جو سیاہ پتھروں کے نیچے ڈھکا ہوا ہے، احتمال ہے کہ قوم لوط کے شہروں کی یہی جگہ ہے۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ ابراہیم کامرگز شہر "حبرون" میں تھا، جو شہر "سدم" سے چندال دور فاصلہ پر نہیں تھا، اور جس وقت زلزلہ یا صاعقہ کے زیر اثر ان کے شہروں کو آگ لگی تو اس وقت ابراہیم حبرون کے قریب کھڑے ہوئے تھے، اور شہر سے جو دونوں اٹھ رہا تھا اُسے اپنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے اے

اس گفتگو کے مجموعہ سے ان شہروں کے قریباً قریباً حد و واضح ہو گئے، اگرچہ ان کے جزئیات ابھی تک پردہ اہما

میں ہیں۔

- ۳۸- وَفِي مُوسَى إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۝
- ۳۹- فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سِحْرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝
- ۴۰- فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ۝
- ۴۱- وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَةَ ۝
- ۴۲- مَا تَذَرُونَ شَيْءًا أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ ۝
- ۴۳- وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمُ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ۝
- ۴۴- فَتَعَتُوا عَنِ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۝
- ۴۵- فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُتَّصِرِينَ ۝
- ۴۶- وَقَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ ۝

ترجمہ

۳۸- موسیٰ (کی زندگی) میں بھی ایک نشانی اور درس عبرت تھا جب ہم نے اسے واضح و آشکار دلیل کے ساتھ فرعون کی طرف بھیجا۔

۳۹- لیکن اس نے اپنے تمام وجود کے ساتھ اس سے منہ پھیر لیا اور کہا: یہ آدمی یا تو جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔

۴۰- ہم نے اسے بھی اور اس کے لشکروں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا اور انہیں دریا میں پھینک دیا۔ دریا خالی کہ وہ قابل ملامت تھا۔

۴۱۔ اسی طرح عاد کی سرگذشت میں بھی ایک آیت ہے، جب کہ ایک تند و تیز آندھی، بارش کے بغیر ان کے اوپر بھیجی۔

۴۲۔ وہ جس چیز کے اوپر سے گذرتی تھی اسے چھوڑتی نہیں تھی، یہاں تک کہ اسے بوسیدہ ہڈیوں کی طرح کر دے۔

۴۳۔ قوم ثمود کی سرگذشت میں بھی ایک عبرت ہے، جب کہ ان سے یہ کہا گیا، تھوڑی سی دیر کے لئے تم بھی فائدہ اٹھا لو، (اور اس کے بعد عذاب کے منتظر رہو)

۴۴۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی، تو انہیں صاعقہ نے پکڑ لیا، حالانکہ وہ (جیرانگی کے ساتھ) دیکھ رہے تھے (مگر ان میں دفاع کی کوئی قدرت نہیں تھی)

۴۵۔ وہ اس طرح سے زمین پر گرے کہ ان میں اٹھنے کی طاقت ہی نہ رہی اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کر سکے۔

۴۶۔ اسی طرح ہم نے ان سے پہلے قوم نوح کو ہلاک کیا تھا۔ کیونکہ وہ فاسق قوم تھی۔

تفسیر

گذشتہ لوگوں کی تاریخ میں یہ سب عبرت کے درس ہیں

قرآن ان آیات میں، قوم لوط کی داستان اور اس دردناک انجام کو، جو انہوں نے قبیح اور شرمناک گناہوں کی وجہ سے پایا تھا، بیان کرنے کے بعد، گذشتہ اقوام میں سے چند قوموں کی سرگذشت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: ”موسیٰ اور اس کی زندگی کی تاریخ میں بھی ایک نشانی اور درس عبرت تھا، جب ہم نے اسے فرعون کی طرف واضح اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا (و فی موسیٰ اذا ارسلناہ الیٰ فرعون بسطان مبین)۔“

”سلطان“ اس چیز کو کہتے ہیں جو تسلط کا سبب بنے، اور یہاں معجزہ یا عقلی قوی دلیل و منطق ہے، یا دونوں ہیں، کہ موسیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں ان سے فائدہ اٹھایا۔

کی بھی محافظ ہے، اور اس نے ان کے ظلم و جرم اور کبر و غرور سے اس طرح سے پردہ اٹھایا ہے کہ ہمیشہ کے لیے قباہ مذمت بن گئے ہیں،

اس کے بعد ایک دوسری قوم یعنی "عاد" کی اجمالی سرنوشت پیش کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے:

"قوم عاد کی سرگزشت میں بھی ایک آیت و عبرت ہے، جبکہ ہم نے ان پر ایک عقیم اور بغیر بارش کا طوفان بھیجا"

(وفی عاد اذا رسلنا عليهم الريح العقيم)۔

ہواؤں کا عقیم اور بانجھ ہونا اس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ بارش برسائے والے بادل اپنے ساتھ لے کر نہ چلیں، گیاہ و نباتات میں اپنے عمدہ اثرات نہ چھوڑیں، اور ان میں کوئی فائدہ اور برکت نہ ہو، اور ہلاکت و نابودی کے سوا کوئی چیز ہمراہ نہ لائیں۔

اس کے بعد اس سخت آندھی کی خصوصیت جو قوم عاد پر مسلط ہوئی تھی۔ بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ جس چیز کے پاس سے گزرتی تھی اس کو نابود کئے بغیر نہ چھوڑتی تھی، اور خشک کٹی پھٹی گھاس یا بوسیدہ ہڈیوں کی صورت میں لے آتی تھی، (ما تذر من شیء اتت عليه الا جعلته كالرميم)۔

"رميم" "رمة" (بروزن منة) کے مادہ سے بوسیدہ ہڈیوں کے معنی میں ہے۔ اور "رمة" (بروزن قبه) بوسیدہ رسی کو کہا جاتا ہے اور "ررم" (بروزن جن) ان چھوٹے چھوٹے اجزاء کو کہا جاتا ہے جو لکڑی یا گھاس میں سے زمین پر گر پڑتے ہیں لے "رم" اور "ترميم" پرانی اور بوسیدہ اشیاء کی اصلاح کے معنی میں آتا ہے۔

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قوم عاد کی تیز آندھی ایک عام تیز آندھی نہیں تھی، بلکہ انہیں تباہ کرنے اور کوٹنے پھینٹنے کے علاوہ اور اصطلاح کے مطابق۔ فزیکل دباؤ سے، جلانے اور زہریلا بنانے کی خاصیت رکھتی تھی، جو طرح طرح کی اشیاء کو بوسیدہ اور کہنہ بنا دیتی تھی۔

ہاں! خدا کی قدرت ایسی ہے، جو "نیم" کی ایک حرکت سر بلع کے ذریعہ طاقتور اور مشہور و معروف اقوام کو اس طرح سے درہم برہم کر دیتی ہے، کہ صرف ان کے بوسیدہ جسم ہی باقی رہ جاتے ہیں، یہ طاقتور اور ثروتمند قوم عاد کی سرنوشت کی طرف جو سرزمین احقاف (عمان اور حضرموت کے درمیان کا علاقہ) میں رہتے تھے — ایک مختصر سا اشارہ تھا۔

اس کے بعد قوم "ثمود" کی نوبت آتی ہے۔ اور ان کے بارے میں فرماتا ہے: قوم ثمود میں بھی ایک آیت اور عبرت ہے، جبکہ ان سے کہا گیا: تم زندگی کی تھوڑی سی مدت کے لیے فائدہ اٹھا لو۔ (اور پھر عذاب الہی کے منظر رہو)

(وفی ثمود اذا قيل لهم تمتعوا حتى حين)۔

"حتى حين" سے مراد وہی ہمت کے تین دن ہیں جن کی طرف سورہ ہود کی آیت ۶۵ میں اشارہ ہوا ہے:

فَعَقَرُوهَا فَتَمْتَعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَٰلِكَ وَعَدْ غَيْرَ مَكْدُوبٍ؛
”انہوں نے اس اونٹنی کی جو بطور اعجاز آئی تھی، کوچھین کاٹ دیں، اور ان کے پیغمبر صالح نے ان سے کہا، بس تین دن اپنے

گھروں میں مزے اٹالو، اور اس کے بعد عذاب الہی کے منتظر ہو، یہ نہ ٹلنے والی وعید ہے۔“
بادجو داس کے کہ خدا ان کے پیغمبر صالح کے ذریعہ انہیں بارہا انذار فرما چکا تھا، لیکن پھر بھی مزید اتمام حجت کے لیے انہیں تین دن کی بہت اور دی گئی، تاکہ وہ اپنے تاریک ماضی کی تلافی کر لیں، اور گناہ کا زنگ تو بہ کے پانی کے ساتھ دل و جان سے دھو لیں، بلکہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق ان تین دنوں میں انکے بدن کی جلد میں کچھ تبدیلیاں ظاہر ہوئیں پہلے زرد ہوئیں پھر سرخ ہوئیں اور بعد میں سیاہ ہو گئیں، تاکہ اس مشرک سرکش قوم کے لیے تینہیں ہوں، لیکن افسوس ان امور میں سے کوئی چیز بھی فائدہ مند نہ ہوئی۔ اور وہ غرور کی سواری سے نیچے نہ اترے۔

ہاں! ”انہوں نے اپنے پروردگار کے فرمان سے سزنا ہی کی، اور صاعقہ نے انہیں ناگہانی طور پر آگھیرا۔ جب کہ وہ حیرانی کے ساتھ دیکھ رہے تھے، اور ان میں اپنا دفاع کرنے کی کوئی قدرت نہ تھی“ (فَعَتُوا عَن أَمْرِ رَبِّهِمْ فَآخَذَتْهُمْ الصَّاعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُونَ)۔

”عتوا“، ”عتو“ (بروزن غلو) کے مادہ سے، اطاعت سے روگردانی کرنے کے معنی میں ہے، ظاہر ہے کہ یہ جملہ ان تمام روگردانیوں کی طرف اشارہ ہے، جو وہ صالح کی دعوت کے سارے عرصہ میں کرتے رہے، مثلاً بت پرستی، ظلم و تم اور صالح کی اونٹنی کی کوچھینوں کا کاٹنا جو ان کا ایک معجزہ تھا، نہ کہ صرف وہ روگردانیاں جو ان تین دنوں میں انہوں نے انجام دیں، اور بارگاہ خدا میں تو بہ و انا بہ کے بجائے غفلت اور غرور میں ڈوبے رہے۔

اس بات کی شاہد سورہ اعراف کی آیت،، ہے جو یہ کہتی ہے، : فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتُوا عَن أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يَا صَالِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ؛
پھر انہوں نے ناقہ کی کوچھین کاٹ دیں، اور پروردگار کے فرمان سے سرپیچی کی اور کہا: اے صالح اگر تو خدا کا بھیجا ہوا ہے، تو جس چیز کی تو ہمیں دھمکی دے رہا ہے وہ لے آ۔“

”صاعقہ“ اور ”صاققہ“ دونوں قریب المعنی ہیں، اصل میں شدید آواز کے ساتھ نیچے گرنے کے معنی میں ہے، اس فرق کیساتھ کہ ”صاعقہ“ آسمانی اجسام میں کہا جاتا ہے اور ”صاققہ“ زمینی اجسام میں اور بعض اہل لغت کے قول کے مطابق ”صاعقہ“ کبھی ”موت“ کے معنی میں کبھی ”عذاب“ کے معنی میں، اور کبھی ”آگ“ کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ عام طور پر ”شدید آواز پر بولا جاتا ہے، جو آسمان سے مرگ بارگاہ کے ساتھ بلند ہوتی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس میں (موت و عذاب اور...) تینوں ہی معنی جمع ہیں۔

ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ جس وقت وہ بادل جن میں مثبت بجلی رتی ہے، ایسی زمین کے نزدیک ہو جائیں، جو منفی بجلی کی حامل ہے، تو ان دونوں کے درمیان سے بجلی کا ایک عظیم شعلہ نکلتا ہے، جس کے ساتھ ایک وحشتناک آواز اور جلانے والی آگ ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے واقع ہونے کے مقام کو لرزا کر رکھ دیتی ہے۔
قرآن مجید میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۹ میں اس معنی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ بادل و بارش اور وعدہ

و برقی کی گفتگو کرنے کے بعد مزید کہتا ہے :

يَجْعَلُونَ اَصَابِعَهُمْ فِي اِذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ :

مناقتین ان راستہ چلنے والے لوگوں کے مانند ہیں جو اندھیری رات میں — جس میں رعد کرٹک رہی ہو اور بجلی چمک رہی ہو — بیابان سے گزرتے ہیں، اور مرنے کے خوف سے (اور اس لیے کہ صاعقہ آواز کو نہ سنیں) اپنے کان میں انگلی رکھ لیتے ہیں۔

انجام کار آخری جملہ جو اس سرکش قوم کے بارے میں فرماتا ہے یہ ہے کہ ”وہ اس طرح سے زمین پر گر پڑے کہ ان میں کھڑے ہونے کی بھی قدرت نہ تھی، اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کر سکتے تھے“ (فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُنْتَصِرِينَ)۔

ہاں! صاعقہ نے انہیں اس طرح غفلت میں پکڑ کر زمین پر دے ڈیٹا کہ نہ تو ان میں کھڑے ہونے کی طاقت تھی نہ اپنا دفاع کرنے کی قدرت اور نہ ہی نالہ و فریاد اور مدد طلب کرنے کی قوت، اور انہوں نے اسی حالت میں جان دے دی، اور ان کی سرگذشت دوسروں کے لیے ایک درس عبرت بن گئی۔

ہاں! قوم ثمود جو عرب کے معروف قبیلوں میں سے تھی، اور سرزمین ”حجر“ میں (جو حجاز کے شمال میں ایک علاقہ ہے) امکانات و وسائل، فراوان ثروت، طولانی عمر، اور محکم عمارتوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، فرمان خدا سے روگردانی، سرکشی، طغیان، شرک اور ظلم و ستم کی بنا پر نابود ہو گئے اور ان کے آثار دوسروں کے لیے ایک درس گویا منہ بولتا سبق بن گئے۔

آخری زیر بحث آیت میں پانچویں قوم یعنی قوم نوح کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور ہم نے قوم نوح کو ان سے پہلے ہلاک کیا تھا، کیونکہ وہ ایک فاسق قوم تھی“ (وَقَوْمِ نُوحٍ مِنْ قَبْلِ اِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ)۔

”فاسق“ اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کے فرمان کی حدود سے باہر قدم نکالے اور کفر و ظلم یا دوسرے تمام گناہوں میں آلودہ ہو۔

”من قبل“ (ان سے پہلے) کی تعبیر، شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قوم فرعون، لوط، عاد و ثمود نے قوم نوح کی افسوسناک سرگذشت — جو ان سے پہلے تھی — سن رکھی تھی، لیکن افسوس کہ اس نے انہیں بیدار نہ کیا، اور خود اس سے مشابہ سرنوشت میں گرفتار ہو گئے۔

لے اس جملہ میں ایک مزدوف ہے اور ”کشاف“ میں ”زمشری“ کے قول کے مطابق تقدیر میں اس طرح ہے ”واھلکنا قوم نوح“ اگرچہ پہلی آیات میں ”اھلکنا“ نہیں تھا، لیکن ان کے مضمون سے اس کا اچھی طرح سے استفادہ ہوتا ہے۔

چند نکات

۱۔ عذاب الہی کی مختلف صورتیں

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات اور گزشتہ آیات میں گزشتہ اقوام میں سے پانچ قوموں کی سرگذشت کی طرف اشارہ ہوا ہے، (قوم لوط، فرعون، عاد، ثمود اور قوم نوح) جن میں سے پہلی چار قوموں کے عذاب کا بیان تو ہوا ہے لیکن قوم نوح کے عذاب کی طرف اشارہ نہیں ہوا، اور جس وقت ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی چار اقوام میں سے ہر ایک کو چار مشہور عناصر میں سے کسی ایک کے ساتھ سزا ملی ہے، قوم "لوط" زلزلہ اور آسمانی پتھروں سے تباہ ہوئی یعنی "مٹی" کے ساتھ، قوم "فرعون" "پانی" کے ساتھ، قوم "عاد" تیز آندھی اور ہوا کے ساتھ، اور قوم "ثمود" "صاعقہ اور آگ" کے ساتھ۔

یہ ٹھیک ہے کہ موجودہ زمانہ میں یہ چاروں چیزیں ایک "عصر" یعنی جسم لسیط کے عنوان سے نہیں پہچانی جاتیں کیونکہ ہر ایک دوسرے اجسام کے ساتھ مرکب ہے، لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ چاروں اہم ارکان انسانوں کی زندگی کو برقرار رکھتے ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی انسان کی زندگی سے کلی طور پر حذف ہو جائے تو زندگی کا برقرار رہنا ناممکن ہو جائے گا، چہ جائیکہ یہ سب کے سب۔

ہاں! خدا نے ان اقوام کی موت اور نابودی ایسی چیزیں قرار دی، جو ان کی زندگی کا عامل اصلی تھی، جس کے بغیر وہ اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے، اور یہ ایک عجیب قدرت نمائی ہے۔ اب اگر قوم نوح کے عذاب کے عامل کو بیان نہیں کیا تو شاید وہ اسی بنا پر ہے کہ ان کا عذاب بھی قوم فرعون کی طرح پانی سے تھا، اور یہاں اس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ تولید کرنے والی اور بانجھ ہوائیں

اوپر والی آیات میں بیان ہوا ہے کہ خدا نے قوم عاد کو تیز اور بانجھ ہوا کے ذریعہ سزا دی، اور سورہ "حجر" کی آیت ۲۲ میں یہ آیا ہے:

وارسلنا الرياح لواقح فأنزلنا من السماء ماء

"ہم نے ہواؤں کو تلیق اور بارور کرنے کے لیے بھیجا، اور آسمان سے پانی نازل کیا۔"

اگرچہ یہ آیت زیادہ تر بادلوں کی تلیق اور بارش کے نزول کے لیے ایک دوسرے سے ملنے کی طرف ناظر ہے۔ لیکن یہ کلی طور پر انسانوں کی زندگی میں ہواؤں کے نقش و اثر کو واضح کرتی ہے، ہاں! ان کا کام بارور کرنا ہے۔ بادلوں کو بارور کرنا گیاہ و نباتات کو بارور کرنا، یہاں تک کہ مختلف جانوروں کے اجناس و انواع کو "بارور ہونے" کے لیے آمادہ کرنے کے لیے بھی موثر ہے۔

لیکن یہی ہوا جب عذاب کے فرمان کی حامل ہو، تو وہ حیات و زندگی پیدا کرنے کی بجائے، موت اور نابودی کا عامل

بن جاتی ہے۔ اور سورہ قمر آیت ۲۰ میں۔ قرآن کے قول کے مطابق — جس میں قوم عاد کے بارے میں گفتگو ہے یہ کہا ہے : تنزع الناس كأنهم اعجاز نخل منقعر، « انہیں (جو قدر آور سخت و مضبوط جسم رکھتے تھے) وہ زمین سے اکھاڑ پھینکتی تھی اور سر کے بل زمین پر پٹک دیتی تھی اس طرح سے کہ ان کے سر تن سے جدا ہو جاتے تھے، جیسے کہ کسی کھجور کا درخت ہے جو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہو۔

- ۴۷- وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ ○
 ۴۸- وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمَاهِدُونَ ○
 ۴۹- وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○
 ۵۰- فِقِرُّوْا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ○
 ۵۱- وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ○

ترجمہ

- ۴۷- ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا ہے، اور ہمیشہ اس کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔
 ۴۸- اور ہم ہی نے زمیں کو پھیلا یا ہے، اور ہم کیا ہی اچھے پھیلا نے والے ہیں۔
 ۴۹- اور ہم نے ہر ہر چیز کے جوڑے جوڑے خلق کئے ہیں۔ تاکہ شاید تم متذکرہ ہو۔
 ۵۰- پس تم خدا ہی کی طرف دوڑو، کیونکہ میں اس کی طرف سے تمہارے لئے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔

- ۵۱- اور خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار نہ دو بے شک میں اس کی طرف سے ایک آشکار ڈرانے والا ہوں۔

تفسیر ہم ہمیشہ آسمانوں کو وسعت دیتے رہتے ہیں

یہ آیات ایک مرتبہ پھر عالم آفرینش میں آیات خدا کی عظمت کے مسئلہ کو پیش کرتی ہیں، اور حقیقت میں ان مباحث کو جو اسی سورہ کی آیت ۲۰ و ۲۱ میں، زمین اور انسانی وجود میں اس کی نشانیوں کے بارے میں، گزر چکی ہیں — تکمیل کرتی ہیں، اور ضمنی طور پر مسئلہ معاد اور موت کے بعد کی زندگی پر خدا کی قدرت کی ایک دلیل ہے پہلے فرماتا ہے، ”ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنا کیا، اور ہم ہمیشہ اُسے وسعت دیتے رہتے ہیں“ (والسماء بنینا ہا باید وانا للموسعون)۔
”اور ہم نے زمین کو بچھایا، اور ہم کیا ہی اچھا بچھانے والے ہیں“ (والارض فرشنا ہا فنعم الماهدون)

”اید“ (بروزن صید) قدرت و قوت کے معنی میں ہے، اور قرآن مجید کی آیات میں بارہا اس معنی میں آیا ہے، اور یہاں آسمانوں کی خلقت کے بارے میں خدا کے عظیم کی قدرت کا طہ کی طرف اشارہ ہے۔
اس عظیم قدرت کی نشانیاں آسمانوں کی عظمت میں بھی اور اس خاص نظام میں بھی، جو ان میں کار فرما ہے، اچھی طرح سے واضح ہے، لہ

اس بارے میں کہ ”انا للموسعون“ (ہم ہمیشہ وسعت دیتے رہتے ہیں) سے یہاں کیا مراد ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے اسے بندوں پر بارش کے نزول کے ذریعہ خدا کی جانب سے وسعت رزق کے معنی میں سمجھا ہے، اور بعض اسے ہر لحاظ سے وسعت رزق کے معنی میں سمجھتے ہیں، اور بعض نے اس کی، خدا کے غنی

لہ یہاں ان چند اشتباہات کا ذکر جو بعض مفسرین یا غیر مفسرین کو ہوئے ضروری ہے۔

۱۔ بعض مفسرین نے ”اید“ کی دو معانی میں تفسیر کی ہے، ”قدرت“ و ”نعمت“ جب کہ لغت کے لحاظ سے ”اید“ قدرت کے معنی میں ہے، لیکن ”اید“ جس کی جمع ”ایدی“ اور جمع الجحج ”ایادی“ بنتی ہے، وہ قدرت و نعمت دونوں معنی میں آیا ہے، (ہم نے بھی سورہ ص کی آیت، اکی تفسیر میں طبری کی صحیح البیان کی پیروی کرتے ہوئے ”اید“ کے لیے دو معانی ذکر کئے ہیں جس کی اب اصلاح کر رہے ہیں)۔

۲۔ المنجم المفسرین (محمد فواد عبدالباقی) میں زیر بحث آیت ”اید“ کے مادہ میں (باد ویاہ کے ساتھ) ذکر ہوا ہے اور اس کو ”اید“ کے مادہ سے الگ کیا ہے یا اشتباہ ظاہر بعض قرآنوں کے رسم الخط سے پیدا ہوا ہے۔ درنہ سب مفسرین نے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ زیر بحث آیت میں وہی ”اید“ قدرت کے معنی میں ہے۔

اور بے نیاز ہونے کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے، کیونکہ اس کے خزانے اس قدر وسیع ہیں کہ مخلوقات کو رزق عطا کرنے سے کبھی بھی ختم نہیں ہوتے، اور نہ ان میں کوئی کمی ہوتی ہے۔

لیکن اس سے پہلے جملہ میں آسمانوں کی خلقت کے مسئلہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، اور ماہرین کے آخری انکشافات کو مد نظر رکھتے ہوئے — جو انہوں نے جہان اور عالم ہستی کے پھیلاؤ اور وسعت کے سلسلے میں کئے ہیں، اور حسی مشاہدات کے طریقہ سے بھی جس کی تائید ہوتی ہے — آیت کا ایک اور زیادہ لطیف معنی حاصل کیا جاسکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا نے آسمانوں کو پیدا کیا اور ہمیشہ انہیں وسعت دیتا رہتا ہے۔

موجودہ علم یہ بتاتا ہے، نہ صرف کہ زمین آسمانی مادوں کو جذب کرتے کرتے بتدریج موٹی اور زنی ہوتی جا رہی ہے بلکہ آسمان بھی وسیع، اور پھیلتے جا رہے ہیں، یعنی وہ ستارے جو ایک کہکشاں میں ہیں، بڑی تیزی کے ساتھ کہکشاں کے مرکز سے دور ہوتے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ بہت سے موقعوں پر اس پھیلاؤ کی سرعت کا اندازہ بھی لگایا ہے۔

کتاب ”مرزہای نجوم“ تالیف فر دھویل میں یہ بیان کیا گیا ہے، کہ وہ پھیلنے کی زیادہ سے زیادہ سرعت کا اب تک جو اندازہ لگایا گیا ہے وہ تقریباً ۶۶ ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے! زیادہ دوری پر واقع کہکشاں میں ہماری نگاہ کے آگے اتنی کم نور ہیں کہ کافی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سرعت کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ آسمان سے جو تصویریں حاصل کی گئی ہیں، وہ اس اہم انکشاف کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہیں کہ: ان کہکشاؤں کا فاصلہ نزدیک کی کہکشاؤں کی نسبت بہت سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔

مؤلف مذکور نے اس کے بعد ”ابر سنبلہ“ و ”اکلیل“ اور ”شجاع“ وغیرہ نام کی کہکشاؤں کی سرعت کی تحقیق پیش کی ہے، اور حساب لگانے کے بعد اس سلسلہ میں بہت سی حیران کن اور عجیب و غریب سرعتوں کو بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتیں آقائے ”جان الدر“ کی بھی سن لیں وہ کہتا ہے: ستاروں سے جو موجیں نکلتی ہیں، وہ جدید ترین اور دقیق ترین اندازوں کے مطابق ایک عجیب اور حیرت انگیز حقیقت کے رخ سے پردہ اٹھاتی ہیں، یعنی اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ستاروں کا وہ مجموعہ جس سے مل کر یہ جہان بنا ہے، ہمیشہ زیادہ سرعت اور تیزی کے ساتھ ایک مرکز سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اور ان کا فاصلہ اس مرکز سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی ان کی رفتار کی تیزی بڑھتی جا رہی ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ ایک وقت یہ سب ستارے اس مرکز میں جمع تھے۔ اور اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہو گئے، اور بڑے ستاروں کا مجموعہ ان سے الگ ہو کر تیزی اور سرعت کے ساتھ ہر طرف کو روانہ ہو گیا۔

ماہرین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ جہان ایک نقطہ آغاز کا حامل تھا۔

”ڈرڈ کا موف“ کتاب ”آفرینش جہان“ میں اس بارے میں اس طرح لکھتا ہے: عالم کی فضا جو اربوں کہکشاؤں سے مل کر بنی ہے ایک ایسی حالت میں ہے جو تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ جہان حالت سکون میں نہیں ہے، بلکہ اس کا پھیلتے جانا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

اس بات کی حقیقت کو معلوم کرنے، اور تک پہنچنے سے، کہ ہمارا جہان مسلسل پھیل رہا ہے، اور حالت انبساط میں ہے، جہاں شناسی کے معمول کے خزانوں کی اصلی کلید معلوم ہو جاتی ہے، کیونکہ اگر اس وقت جہاں حالت انبساط میں ہو تو یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ کسی وقت میں بہت شدید حالت انقباض میں تھا۔

صرف مذکورہ ماہرین ہی نے اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا، بلکہ دوسرے افراد نے بھی اس معنی کو اپنی تحریروں میں نقل کیا ہے جن کے کلمات کے نقل کرنے سے عبارت طویل ہو جائے گی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ”اتالموسعون“ (رہم و سعادت دینے والے ہیں) کی تعبیر جملہ اسمیہ اور اسم فاعل کے جملہ سے استفادہ کرتے ہوئے، اس موضوع کے ہمیشہ ہمیشہ ہوتے رہنے کی دلیل ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ یہ ہمیشہ سے تھی اور اسی طرح جاری رہے گی۔ اور یہ ٹھیک وہی چیز ہے، جس تک موجودہ زمانے میں پہنچے ہیں کہ تمام کرات آسمانی اور کہکشاؤں ابتداء میں ایک ہی مرکز میں جمع تھیں (ایک خاص وزن کے ساتھ جو حد سے زیادہ بوجھل تھا) اس کے بعد ایک انتہائی وحشتناک اور عظیم انفجار واقع ہوا (یعنی یہ مرکز پھٹ پڑا) اور اس کے ساتھ ہی اس جہان کے اجزاء ایک دوسرے سے جدا ہو کر بکھر گئے۔ اور انہوں نے کدوں کی صورت اختیار کر لی، اور وہ بڑی سرعت کے ساتھ پیچھے ہٹتے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔

لیکن زمین کی خلقت کے بارے میں ”ماہد و ن“ کی تعبیر ایک لطیف تعبیر ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے، کہ خدا نے انسانوں کی زندگی کے لیے تمام آرام و آسائش کے وسائل اور ذرائع کے ساتھ (ایک گہوارے کے طور پر) آمادہ اور تیار کیا ہے، کیونکہ ”ماہد“ ”مہد“ کے مادہ سے گہوارہ کے معنی میں ہے۔ یا ہر اس جگہ کے معنی میں ہے جسے راحت و آرام کے لیے آمادہ اور تیار کرتے ہیں۔ اس قسم کی جگہ راحت و آنا، مہلک، محفوظ اور گرم و نرم ہونی چاہیے اور یہ تمام چیزیں کہ زمین میں حاصل ہیں۔ فرمان الہی سے ایک طرف تو پتھر نرم اور مٹی میں تبدیل ہو گئے اور دوسری طرف سے پہاڑوں کی سختی اور زمین کی سخت جلد نے اسے مدوجزر کے دباؤ سے بچایا، اور تیسری طرف سے وہ قشر ہوئی جس نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، سورج کی روشنی کو حسب ضرورت پہنچنے دیتا ہے اور ایک عظیم لحاف کی طرح اس کو وسیع بستر پر ڈالتا ہے اور ان آسمانی پتھروں کے حملہ کے مقابلہ میں، جنہیں وہ قلمرو زمین میں داخل ہوتے ہی آگ لگا کر خاکستر کر دیتا ہے، ایک مضبوط اور قوی ڈھال بھی ہے۔

اور اس طرح انسان کی پذیرائی اور جہانی کے لیے خدا کی طرف سے (جو اس کو خالی میں خدا کا جہان ہے) آرام و

آسائش کے تمام اسباب فراہم ہوئے ہیں۔

آسمانوں اور زمین کی خلقت کے بعد آسمان اور زمین کے مختلف موجودات اور انواع و اقسام کے نباتات و حیوانات کی نوبت آتی ہے اور اس سلسلے میں بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ”ہم نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کئے ہیں، تاکہ تم غور کرو سمجھو“ (ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذكرون)۔

بہت سے مفسرین نے یہاں ”زوج“ کو مختلف اصناف کے معنی میں سمجھا ہے، اور اوپر والی آیت کو اس جہان کے موجودات کے مختلف اصناف کی طرف اشارہ لیا ہے۔ جو ”زوج“ ”زوج“ کی صورت میں آئے ہیں، مثلاً ”رات اور دن“ ”نور اور ظلمت“ ”دریا اور صحرا“ ”سورج اور چاند“ ”نر اور مادہ“ وغیرہ۔

لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی مشابہ آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے اس قسم کی آیات میں ایک زیادہ دقیق معنی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر لفظ ”زوج“ نر و مادہ کی دو جنسوں کو کہتے ہیں چاہے وہ عالم حیوانات میں ہو یا عالم نباتات میں، اور اگر ہم اسے تھوڑی سی وسعت اور ذریعہ، تو یہ معنی تمام مثبت و منفی قوی کو شامل ہوگا۔

اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، کہ قرآن اوپر والی آیت میں کہتا ہے: (من کل شیء) تمام موجودات میں سے) نہ صرف موجودات زندہ، بلکہ ممکن ہے کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو، کہ مثبت و منفی ذرات سے بنی ہوئی تمام اشیاء عالم، اور آج کے علمی نکتہ نظر سے یہ بات مسلم ہے کہ ”ایٹم“ مختلف اجزاء سے مل کر بنے ہیں، منجملہ ان کے وہ اجزاء جو منفی برقی بار کے حامل ہیں اور انہیں ”الکٹرون“ کہا جاتا ہے اور وہ اجزاء جو مثبت برقی بار کے حامل ہوتے ہیں جو ”پروٹون“ کہلاتے ہیں۔

اس بنا پر ”من کل شیء“ کی حتمی طور پر حیوان یا نبات کے معنی میں تفسیر کرنا لازمی اور ضروری نہیں ہے، اور نہ ہی زوج کو جنس یا صنف کے معنی میں سمجھنا، (اس سلسلہ میں ہم دوسری توضیحات جلد ۸ تفسیر نمونہ سورہ شعراء کی آیت ۷ کے ذیل میں اور جلد ۵ ص ۶۲۱ اور جلد ۱۰ ص ۳۲۲ میں بیان کر چکے ہیں) توجہ رکھنا چاہیے کہ اس کے باوجود دونوں تفاسیر قابل جمع ہیں۔

ضمنی طور پر ”لعلکم تذكرون“ کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ تمام اشیاء جہان میں زوجیت و کثرت اور دوگانگی، انسان کو اس مطلب سے آگاہ کرتی ہے، کہ جہان کا خالق واحد و یگانہ ہے کیونکہ دوگانگی مخلوقات کی خصوصیات میں سے ہے۔

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ الرضا سے بھی اس معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے، جہاں آپ فرماتے ہیں:

”بمضادته بین الاشیاء عرف ان لا ضد له، بمقارنته بین الاشیاء عرف ان لا قرین له، بضاد النور بالظلمة والیبس بالبلل، والنخشن باللین، والصد بالحرور، مؤلفاً بین متعادیاتھا، مفرقاً بین متدانیاتھا، دالة بتغریقھا علی مفرقھا، وبتالیفھا علی مؤلفھا، وذاك قوله ”ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذكرون“

”اس نے دنیا جہان کی چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد پیدا کیا ہے۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ اس کے لیے کوئی ضد نہیں ہے، اور انہیں ایک دوسرے کا قرین قرار دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس کا کوئی قرین نہیں ہے، نور کو ظلمت کی ضد، خشکی کو تیزی کی ضد، سختی کو نرمی کی ضد اور سردی کو گرمی کی ضد قرار دیا، اس کے باوجود ان اشیاء کو جو ایک دوسرے کی ضد ہیں جمع کر دیا، تاکہ یہ جدائی جدا کر کے والے پر دلیل ہو اور یہ پیوستگی ملانے والے پر دلیل ہو، اور یہ ہے معنی (ومن کل شیء مخلقنا زوجین لعلکم تذكرون)“

بعد والی آیت میں گزشتہ توحیدی مباحث سے نتیجہ نکالتے ہوئے مزید کہتا ہے، ”اس بنا پر تم خدا کی طرف دوڑو کیونکہ میں اس کی طرف سے تمہارے لیے واضح طور پر ڈرانے والا ہوں“ (ففرروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین)۔

یہاں ”فرار“ کی تعبیر ایک عمدہ اور لطیف تعبیر ہے۔ عام طور پر فرار ایسی جگہ کہا جاتا ہے جہاں انسان ایک طرف سے کسی موجود یا وحشتناک حادثہ سے رو برد ہو گیا ہو، اور دوسری طرف سے کسی جگہ کوئی پناہ گاہ رکھتا ہو، لہذا پوری تیزی کے ساتھ جاتے حادثہ سے دور ہو جاتا ہے اور امن و امان کے نقطہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ تم بھی شرک و بت پرستی سے جو ایک وحشتناک عقیدہ ہے گریز کرو، اور توحید خالص کی طرف جو واقعی امن و امان کا علاقہ ہے تیزی سے رخ کرو۔

عذاب خدا سے گریز کرو اس کی رحمت کی طرف جاؤ۔
اس کی نافرمانیوں اور عصیوں سے فرار کرو اور توبہ و انابه سے توسل اختیار کرو۔
خلاصہ یہ کہ قباحتوں، برائیوں، بے ایمانی، جہالت کی تاریکی اور عذاب جاودانی سے بھاگو اور رحمت حق کی آغوش اور جاودانی سعادت میں داخل ہو جاؤ۔

پھر مزید تاکید کے لیے وحدت پرستی کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”خدا کے ساتھ دوسرا معبود قرار نہ دو، کہ میں تمہارے لیے اس کی طرف سے واضح ڈرانے والا ہوں“ (ولا تجعلوا مع اللہ الہا اخری لکم منہ نذیر مبین)۔

یہ احتمال بھی ہے کہ گزشتہ آیت اصل ایمان باللہ کی طرف دعوت کرتی ہو، اور یہ آیت اس کی ذات پاک کی یگانگت کی طرف دعوت ہو، لہذا ”انی لکم منہ نذیر مبین“ ایک موقع پر ایمان باللہ کے ترک کرنے پر ڈرانے کے عنوان سے ہو، اور دوسرے موقع پر شرک اور دُوی کے مقابلہ میں انذار ہو، تو اس طرح سے ہر ایک الگ

اگ مطلب کی طرف اشارہ ہو۔
 بعض روایات میں جو امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہیں ”خدا کی طرف فرار“ سے مراد حج اور اس کے گھر کی زیارت ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اس سے مراد، خدا کی طرف فرار کے ایک واضح مصداق میں سے ہوتا ہے، کیونکہ حج انسان کو حقیقت توحید، اور توبہ و انابہ سے آشنا کرتا ہے، اور الطاف خداوندی کی پناہ میں جگہ دیتا ہے۔

درو
 ہ
 کسی
 نیزی
 تپتی
 سے

دولا
 پاک کی
 زڈر نے
 الگ

۱۔ اس سلسلہ میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے چند احادیث تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۱۳۰ و ۱۳۱ پر نقل ہوئی ہیں۔

- ۵۲۔ كَذٰلِكَ مَا اَتٰى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا
سٰحِرًا وَّ اَوْ مَجْنُوْنًا ۝
- ۵۳۔ اَتَوٰصَوْا بِهٖۤ اَبْلٌ هُمْ قَوْمٌ طٰغُوْنَ ۝
- ۵۴۔ فَتَوَلَّوْا عَنْهُمْ فَمَا اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝
- ۵۵۔ وَذَكَرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

- ۵۲۔ اسی طرح ہے کہ کوئی پیغمبر ان سے پہلے کسی قوم کی طرف نہیں بھیجا مگر یہ کہ انہوں نے کہا وہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔
- ۵۳۔ کیا وہ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے تھے (کہ عموماً اس قسم کی تہمتیں لگائیں) نہیں! بلکہ وہ ایک سرکش اور طوفان اٹھانے والی قوم تھی۔
- ۵۴۔ اب جب کہ ایسا ہے تو ان سے منہ پھیر لے، اور تو ہرگز لائق ملامت نہیں ہے۔
- ۵۵۔ اور ہمیشہ نصیحت کرتا رہ کیونکہ نصیحت مؤمنین کے لیے فائدہ مند ہے۔

تفسیر

نصیحت کر کیونکہ نصیحت و تذکر فائدہ مند ہے

اسی سورہ کی آیت ۳۹ میں یہ آیا ہے کہ فرعون نے، موسیٰ کی طرف سے خداوند کی تائید اور علم و بیداد گری کے ترک کرنے

کی دعوت کے مقابلہ میں، موسیٰ کو متہم کیا کہ وہ ”ساحر“ یا ”مجنون“ ہے، یہ نسبت مشرکین کی طرف سے پیغمبر اسلام کو بھی دی جاتی تھی، یہ بات ابتدائی دور کے تھوڑے سے مومنین کے لیے بہت گراں تھی، اور پیغمبر کی روح کو آزرده کرتی تھی، زیر بحث آیات میں پیغمبر اور مومنین کی دلداری کے لیے کہتا ہے، ؛ صرف تو ہی نہیں ہے جو ان زہر آلود تہمت کے تیروں کا صدف قرار پایا ہے، ؛ ”اسی طرح ہے کہ ان سے پہلے کی کسی قوم کی طرف کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا، مگر یہ کہ انہوں نے کہا، وہ جادو گر یا دیوانہ ہے، (کذالك ما اتى الذين من قبلهم من رسول الا قالوا ساحرا و مجنوناً)۔

وہ انہیں اس لیے ”ساحر“ کہتے تھے، کیونکہ ان کے پاس ان کے عینی معجزات کا کوئی منطقی جواب نہیں تھا، اور ”مجنون“ کہہ کر اس لیے خطاب کرتے تھے کیونکہ وہ محیط اور ماحول کے ساتھ ہم رنگ نہیں تھے، اور مادی امتیازات کے مقابلہ میں تسلیم خم نہیں کرتے تھے۔

اس بنا پر تم پریشان نہ ہو اور غم و اندوہ نہ کرو اور اپنی استقامت و پائیداری اور صبر و شکیبائی میں اضافہ کرو، کیونکہ اس قسم کی بے بنیاد باتیں اور لہجے ہمیشہ مردان حق کے مقابلہ میں کہی جاتی رہی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: ”کیا نہ کا فر اور عناد رکھنے والی اقوام ایک دوسرے کو وصیت کیا کرتی تھیں، کہ تمام انبیاء پر یہ تہمتیں لگائیں؟ (التواصوا بہ)۔

اس طرح سے ہم آہنگی کے ساتھ اور ایک ہی طرز پر عمل کرتے ہیں جیسا کہ انہوں نے ماوراء تاریخ میں کوئی مجلس تشکیل دی ہو، اور مشورہ کے لیے بیٹھے ہوں، اور ایک دوسرے کو وصیت و نصیحت کرتے رہے ہوں، کہ انبیاء کو عموماً سحر و جنوں کے ساتھ متہم کرتے رہنا، تاکہ عوام میں ان کے اعتبار کا نفوذ کم ہو جائے۔

اور شاید ان میں سے ہر ایک جب اس دنیا سے جانا چاہتا تھا، تو اپنی اولاد اور دوستوں سے یہ بات کہتے تھے اور وصیت کرتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، ؛ ”بلکہ وہ ایک سرکش اور طوفان اٹھانے والی قوم ہے“ (بل هو قوم طاغون)۔ یہ سرکشی اور شرانگیزی کا ہی اثر ہے کہ مردان حق کو میدان سے نکلانے کے لیے ہر قسم کے بھوٹ اور تہمت سے متوسل ہوتے تھے، اور چونکہ انبیاء معجزات اور نئے احکام کے ساتھ قوموں کے درمیان آتے تھے، تو وہ ان کے لیے بہترین لیبل یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ”جادو اور جنون“ سے متہم کریں۔ اس بنا بران کے ”وحدت عمل“ کا عامل سرکشی و شرانگیزی کی وہی مشترکہ روح تھی۔

پھر دوبارہ تسلی خاطر اور زیادہ سے زیادہ دلداری کے لیے پیغمبر سے فرماتا ہے، ؛ ”اب جب کہ یہ طاعنی و سرکش قوم حق بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے، تو ان سے منہ پھیر لے“ (فتول عنہم)۔

۱۔ ”کذالك“ ایک معذوف بتداء کی خبر ہے، اور تقدیر میں (الامر کذالك) (معاہدوں ہی ہے) ہے۔

۲۔ اوپر والی آیت میں ”بل“ اضراب ہے۔

اور تو مطمئن رہ کہ تو نے اپنے وظیفہ اور ذمہ داری کو کامل طور سے انجام دے دیا ہے، اور تو ”ہرگز سزائش اور ملامت کے لائق نہیں ہے“ (فما انت بمعلوم)۔

اگر وہ حق کو قبول نہ کریں تو غم نہ کھاؤ، کیونکہ شاکستہ اور صلاحیت رکھنے والے دل اس کو قبول کر لیں گے۔ یہ جملہ حقیقت میں دوسری آیات کی یاد دلاتا ہے۔ اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اس قدر دلسوز تھے، کہ بعض اوقات ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا ہو جاتیں، جیسا کہ سورہ کہف کی آیت ۶ میں آیا ہے:-

فلعلک باخع نفسك علی اثارہم ان لم یؤمنوا بہذا الحدیث اسفاً
”گویا تو چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو ان کے اعمال پر غم و اندوہ کی بنا پر ہلاک کر دے، کیونکہ وہ اس قرآن پر ایمان نہیں لائے ہیں“

یقیناً ایک سچے رہبر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

مفسرین کا بیان ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبرؐ اور مومنین اندوہگین ہوئے اور خیال کیا کہ مشرکین کے مقابلہ میں یہ آخری بات ہے، اور وحی آسمانی قطع ہو گئی ہے، اور جلدی ہی عذاب الہی نازل ہو گا، لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بعد والی آیت نازل ہوئی۔ اور پیغمبرؐ کو حکم دیا: ”تم ہمیشہ پند و نصیحت کرتے رہو، کیونکہ پند و نصیحت سے مومنین کو فائدہ پہنچتا ہے“ (و ذکر فان الذکر یتنفع المؤمنین)۔ یہ وہ منزل تھی کہ سب نے اطمینان و سکون کا سانس لیا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آمادہ و تیار دل گوشہ و کنار میں تیری باتوں کے انتظار میں ہیں، اگر ایک گروہ حق کے مقابلہ میں مخالفت کے لیے کھڑا ہے تو دوسرا گروہ دل و جان سے اس کا مشتاق ہے اور تیری دل نشین گفتگو ان کے نفوس میں اپنی تاثیر چھوڑتی ہے

ایک نکتہ

حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ دلوں کی ضرورت ہے کسی کسان کو نظر میں رکھو جو بیچ بکھرنے میں مشغول ہے، ممکن ہے وہ ان بیچوں کے ایک حصہ کو پتھر پر ڈال دے یقینی طور پر وہ کبھی بھی بار آور نہیں ہو گا۔

دوسرے حصہ کو مٹی کی ان باریک تھوں پر گراتا ہے جنہوں نے سخت پتھروں کو ڈھانپ رکھا ہے، یہاں بیچ کو پل تو نکالے گا۔ لیکن چونکہ اس کی جڑوں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے تو وہ بہت جلد خشک ہو جائے گا اور ختم ہو جائے گا۔ ایک دوسرے حصہ کو ایسی مٹی کے اوپر ڈالتا ہے جو زیادہ گہری ہے، لیکن اس بیچ کے درمیان مٹی میں فضول قسم کی گھاس بھی رکاد کر کے والی موجود ہے، تو یہ بیچ نمو بھی کرے گا، جڑیں بھی پکڑے گا، لیکن بہت جلد کانٹے

اور فضول گھاس اس سے پرٹ جائیں گے اور اس کا گلاد بادیں گے۔

ان تمام بیجوں میں سے زیادہ خوش نصیب بیج وہ ہے جو گہری مٹی کے درمیان بغیر کسی مزاحمت و رکاوٹ کے قرار پائے۔ کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ کوئل نکالتا ہے شاخیں اور پتے نکالتا ہے اور تناور ہو کر پھلنا پھولتا ہے۔ وہ حق کی باتیں جو انبیاء اور خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں اور ان کے معصوم جانشینوں کے دہن مبارک سے نکلتی ہیں انہیں بیجوں کی طرح ہیں، وہ دل جو سخت پتھر کے مانند ہے وہ انہیں ہرگز قبول نہیں کرتے، اور وہ دل جن میں کمزور سی اور تھوڑی سی بھی نرمی ہے وہ وقتی طور پر اسے قبول کر لیتے ہیں اس کے بعد اسے باہر نکال پھینکتے ہیں، اور وہ دل جو قبول کرنے کے لیے آمادہ و تیار تو ہیں، لیکن ہوا و ہوس اور صفاتِ رذیلہ اور شہوات کے کانٹے ان میں اُگے ہوئے ہیں، وہ ان کے اثر کو ختم کر دیتے ہیں۔

صرف وہی دل ان عظیم پیشواؤں کی باتوں کو قبول کرتے ہیں۔ اور ان کی پرورش کر کے انہیں بارور کرتے ہیں، جو حق جوئی اور حق طلبی کی روح کے حامل ہیں اور وہ ان صفات سے بھی خالی ہیں۔ اور وہ مؤمنین کے دل ہیں، ہاں! (و ذکر فات الذکر ای تنفع المؤمنین)۔ پسند و نصیحت کرتے رہو کیونکہ یہ مؤمنین کو فائدہ دیتی ہے۔

- ۵۶۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ○
 ۵۷۔ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُونَ ○
 ۵۸۔ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ○

ترجمہ

- ۵۶۔ میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں (اور اس طرح سے تکامل و ارتقاء حاصل کریں اور مجھ سے نزدیک ہوں)۔
 ۵۷۔ میں ہرگز ان سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے روزی دیں، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔
 ۵۸۔ خدا ہی روزی دینے والا اور صاحبِ قوت و قدرت ہے۔

تفسیر

قرآن کی نظر میں انسان کی خلقت کا مقصد

اہم ترین سوالات میں سے وہ سوال جو ہر شخص اپنے آپ سے کرتا ہے یہ ہے کہ، ”ہم کس لیے پیدا کیے گئے ہیں“ اور انسان کی خلقت اور اس جہان میں آنے کا مقصد کیا ہے؟
 اوپر والی آیات، اس اہم اور ہمیشہ کے سوال کا مختصر اور پر معنی تبصروں کے ساتھ جواب دے رہی ہیں، اور اس بحث کی، جو گوشہ آ آیات میں سے آخری آیت میں یونین کی یاد آوری کے سلسلہ میں بیان ہوئی تھی، تکمیل کر رہی ہیں، کیونکہ یہ ایک اہم ترین اصول ہے کہ جس کی پیروی کو پیروی کرنی چاہیے، ضمنی طور پر خدا کی طرف فرار کا مطلب بھی جو گذشتہ آیات میں بیان ہوا تھا واضح ہو جاتا ہے۔

فرماتا ہے: ”میں نے جن و انس کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں“ (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ

والانس الالیعبدون)۔

میری ان سے کوئی حاجت نہیں ہے؛ ”اور میں ہرگز ان سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں“ (ما ارید منہم من رزق و ما ارید ان یطعمون)۔

”خدا ہی ہے جو کل بندوں کو روزی دیتا ہے اور وہ صاحب قدرت و قوت ہے“ (ان اللہ هو الرزاق ذو القوۃ المتین)۔

یہ چند آیات جو انتہائی مختصر اور جامع ہیں، اس حقیقت سے پردہ اٹھا رہی ہیں، کہ جس سے آگاہی کے تمام خواہاں ہیں، اور یہیں ایک عظیم مقصد سے روشناس کر رہی ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: بلاشک و شبہ ہر دانش مند اور عاقل جو کام بھی انجام دیتا ہے، کوئی نہ کوئی مقصد اس کے پیش نظر ہوتا ہے، اور چونکہ خدا سب سے زیادہ عالم اور حکیم ہے، بلکہ کسی شخص کے ساتھ اس کا قیاس کیا ہی نہیں جاسکتا، یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس نے انسان کو کیوں پیدا کیا ہے؟ کیا کوئی کمی تھی جو انسان کی خلقت سے پوری ہو جاتی؟

یا اسے کوئی حاجت اور ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لیے اس نے ہمیں پیدا کیا ہے؟

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس کا وجود ہر جہت سے کامل اور انتہائی لاتناہی ہے اور وہ غنی بالذات ہے۔

پس پہلے مقدمہ کے مطابق تو ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد تھا، اور دوسرے مقدمہ کے مطابق ہمیں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ انسان کی پیدائش سے اس کا کوئی ایسا مقصد نہیں تھا جو اس کی پاک ذات کے لیے ہو۔

نتیجتاً اس مقصد کو کسی ذات سے باہر تلاش کرنا پڑے گا، ایسا مقصد جو خود مخلوقات کی طرف لوٹتا ہے اور انہیں کے کمال کا سبب

ہے۔

اور دوسری طرف قرآن کی آیات میں انسان کی پیدائش کے مقصد کے بارے میں مختلف تعبیریں بیان کی گئی ہیں۔

ایک جگہ بیان ہوا ہے: الذی خلق الموت والحیوة لیبلوکم ایتکم احسن عملاً وہی ہے کہ جس نے موت اور زندگی کو خلق کیا تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔ (ملک-۲) یہاں انسانوں کی آزمائش اور امتحان کا مسئلہ ”حسن عمل“ کے لحاظ سے ایک ہدف اور مقصد کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک دوسری آیت میں آیا ہے: اللہ الذی خلق سبع سماوات ومن الارض مثلہن یتنزل

الامر بینہن لتعلموا ان اللہ علی کل شیء قدیر وان اللہ قد احاط

بکل شیء علمًا؛ ”خدا وہ ہے جس نے سات آسمان اور اتنی ہی زمینیں خلق فرمائی ہیں اس کا فرمان ان

کے درمیان نازل ہوتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، اور اس کا علم تمام موجودات پر احاطہ رکھتا ہے۔“

(طلاق-۱۲)۔

یہاں ”خدا کی قدرت اور علم سے علم و آگاہی“ آسمانوں اور زمین (اور جو کچھ ان کے درمیان ہے) کی خلقت کے لیے ایک

هدف اور مقصد کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں۔

ایک دوسری آیت میں بیان ہوا ہے: **ولو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة ولا يزالون مختلفين الا من رحم ربك ولذلك خلقهم**: ”اگر تیرا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو (بغیر کسی اختلاف کے) امت واحدہ قرار دے دیتا، لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے، سوائے ان کے جن پر تیرا پروردگار رحم کرے، اور اسی ”رحمت“ کے لیے انہیں پیدا کیا ہے“ (صود- ۱۱۹-۱۱۸)۔

اس آیت کے مطابق رحمت الہی انسان کی خلقت کا اصلی ہدف ہے، لیکن زیر بحث آیات صرف عبودیت اور بندگی کے مسئلہ پر تنکیر کرتی ہیں، اور پوری صراحت کے ساتھ اس کو جن و انس کی خلقت کے اصلی ہدف اور مقصد کے عنوان سے تعارف کراتی ہیں۔

ان آیات اور ان سے مشابہ آیات میں تصور اساتما مل اور غرور و فکر یہ نشاندہی کر دیتا ہے کہ ان کے درمیان کسی قسم کا تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ فی الحقیقت ان میں سے بعض ہدف اور مقصد تو مقدمہ کے طور پر بیان ہوئے ہیں بعض وسطی اور بعض آخری، اور بعض ان کا نتیجہ ہیں۔

اصلی ہدف وہی ”عبودیت“ ہے، جس کی طرف زیر بحث آیات میں اشارہ ہوا ہے، اور مسئلہ ”علم و دانش“ اور ”امتحان و آزمائش“ ایسے احوال و مقاصد ہیں جو عبودیت کی منزلیں طے کرتے ہوئے راستہ میں آتے ہیں۔ اور رحمت خداوندی اس عبودیت کا نتیجہ ہے۔

اس طرح سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم سب پروردگار کی عبادت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں، لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ ”عبادت“ کی حقیقت کیا ہے؟

کیا صرف رکوع و سجود، قیام و قعود اور نماز و روزہ جیسے مراسم کا انجام دینا مراد ہے، یا ان کے علاوہ کوئی اور حقیقت ہے؟ اگرچہ رسمی عبادات بھی سب کی سب اہمیت کی حامل ہیں۔

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ”عبد“ و ”عبودیت“ کے الفاظ پر غور کرنا ہوگا، اور ان کی تحلیل و تجزیہ کرنا پڑے گا۔

”عبد“ لغت کے لحاظ سے اس انسان کو کہتے ہیں جو سرتاپا اپنے مولا اور آقا و مالک سے تعلق رکھتا ہے، اس کا ارادہ اس کے ارادہ کے تابع، اور اس کی خواہش اس کی خواہش اور مرضی کے تابع ہے یہ اس کے مقابلہ میں کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ اور اس کی اطاعت میں کسی قسم کی کوتاہی اور سستی نہیں کرتا۔

دوسرے لفظوں میں ”عبودیت“ جیسا کہ متون لغت میں آیا ہے۔ معبود کے سامنے آخری درجہ کے خضوع کا اظہار ہے اور اسی بنا پر صرف وہی ذات معبود ہو سکتی ہے جس نے انتہائی انعام و اکرام کیا ہو، اور وہ خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، اس بنا پر ”عبودیت“ ایک انسان کے ارتقاء و تکامل کی انتہائی معراج اور خدا سے اس کا قرب ہے۔

”عبودیت اس کی ذات پاک کے آگے انتہائی تسلیم ہے، عبودیت، بلا قید و شرط اطاعت اور تمام مراحل میں فرمانبرداری کرنا ہے۔“

اور آخر میں عبودیت کامل یہ ہے کہ انسان سوائے معبود حقیقی یعنی کمال مطلق کے کسی کا بھی تصور اور خیال نہ کرے، اس کی راہ کے علاوہ اور کسی راہ پر قدم نہ اٹھائے، اس کے سوا ہر چیز کو بھول جائے، یہاں تک کہ خود اپنے آپ کو بھی۔ اور خلقت بشر کا صدف اصلی یہی ہے، جس تک پہنچنے کے لیے خدا نے آزمائش کا میدان فراہم کیا ہے، اور انسان کو علم و آگاہی عطا فرمائی ہے۔ اور اس کا اصلی اور واقعی حقیقی نتیجہ بھی اس کی ”رحمت“ کے سمندر میں خود کو سمونا ہے۔

چند نکات

۱۔ خدا غنی مطلق ہے

”ما ارید منهم من رزق و ما ارید ان یطعمون“ کا جملہ حقیقت میں پروردگار کی ہر شخص اور ہر چیز سے بے نیازی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اگر اس نے اپنے بندوں کو اپنی عبودیت کی دعوت دی ہے۔ تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کرے، بلکہ وہ تو انسانوں کے درمیان مسئلہ عبودیت کے برعکس، یہ چاہتا ہے کہ ان پر ”سخاوت اور بخشش“ کرے، کیونکہ لوگ غلاموں کو اس لیے انتخاب کرتے تھے تاکہ وہ ان کے لیے آمدنی کے حصول اور رزق و روزی کے لیے کام کریں، یا گھر کا کام کاج کریں، اور کھلانا کھلانے اور پذیرائی کرنے میں مشغول رہیں، اور دونوں حالتوں میں اس کا فائدہ مالکوں کو ہی ہوتا ہے، اور یہ چیز انسان کی نیاز اور احتیاج سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں خدا کے بارے میں بے معنی ہیں، کیونکہ نہ صرف یہ کہ وہ سب سے بے نیاز ہے، بلکہ سب کی نیاز اور حاجت کو اپنے لطف و کرم سے پورا کرتا ہے، اور سب کا رزاق وہی ہے۔ ۲۔ وہ صاحب ”قوت“ اور ”متین“ ہے۔

”متین“ ”متن“ کے مادہ سے اصل میں اس قومی پٹھے کے معنی میں ہے، جو پیٹھے کے مہروں کے ستون کے دونوں طرف ہوتا ہے۔ اور انسان کی پشت کو مضبوط بناتا ہے، اور اسے بھاری دباؤ کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے، اور اسی مناسبت سے کمال قدرت و قوت کے معنی میں آیا ہے، اس بنا پر ”ذوالقوہ“ کے لفظ کے بعد اس کا بیان تاکید کے عنوان سے ہے، کیونکہ ”ذوالقوہ“ پروردگار کی اصل قوت کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور ”متین“ اس کے کمال قدرت کی طرف، اور جس قوت وہ ”رزاق“ کے لفظ کے ہمراہ ہو کہ وہ بھی ایک بالانگہ کا صیغہ ہے تو اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ خدا بندوں کو روزی دینے کے سلسلے میں انتہائی قدرت و طاقت اور تسلط رکھتا ہے، چاہے وہ اس وسیع جہان کے جس کو نے میں ہوں۔ سمندروں کی گہرائیوں میں ہوں، دروں کے درمیان ہوں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہوں، پتھروں کے اندر ہوں، اور آسمانی کرول کے جس مقام میں ہوں، ان کی ضرورت کے مطابق روزی انہیں پہنچاتا ہے۔ اور سب کے سب اسی کے خوان احسان پر جمع ہیں پس اگر انہیں پیدا کیا ہے تو کسی ضرورت و حاجت کی بنا پر نہیں، بلکہ ایک لطف خاص اور فیض پہنچانے کی بنا پر۔

۳۔ جنوں کا ذکر پہلے کیوں؟

باد وجود اس کے کہ قرآنی آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسان گروہ جن سے افضل و برتر ہیں، لیکن اس کے باوجود اوپر والی آیت میں ان کا نام مقدم رکھا ہے۔ ظاہر ہے اس بنا پر ہے کہ ان کی خلقت انسان کی خلقت سے پہلے ہوئی تھی،

جیسا کہ سورۃ شجر کی آیت ۲۷ میں بیان ہوا ہے، : والجان خلقناہ من قبل من نار السموم، اور ہم نے جنوں کو پہلے (انسان کی خلقت سے پہلے) جلائے والی آگ سے پیدا کیا تھا۔

۴۔ فلسفہ کی نظر سے خلقت کا فلسفہ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے یہ سوال اپنے آپ سے یاد دوسروں سے نہ کیا ہوگا، کہ ہماری خلقت کا حدف اور مقصد کیا ہے؟ کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں، کچھ اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں، اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں، اس آمد و رفت کا مقصد کیا ہے؟

واقعاً اگر ہم انسان اس کرۂ خاکی پر زندگی نہ گزارتے، تو اس عالم میں کون سی خرابی آجاتی؟ اور کیا مشکل پڑ جاتی؟ کیا ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ہم کیوں آئے ہیں، اور کیوں چلے جاتے ہیں؟ اور اگر ہم اس چیز سے آگاہ ہونا چاہیں تو کیا ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں، اور اس سوال کے پیچھے بہت سے دوسرے سوالات فکر انسانی کا احاطہ کر لیتے ہیں۔

یہ سوال اگر مادہ پرستوں کی طرف سے پیش ہو تو ظاہراً اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ کیونکہ مادہ اور طبیعت اصلاً کوئی عقل شعور نہیں رکھتے، کہ ان کا کوئی حدف ہو۔ اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے آپ کو اس لحاظ سے آسودہ کر لیا ہے، اور انہوں نے یہ عقیدہ اپنا لیا ہے کہ خلقت بے مقصد اور فضول ہے! اور کتنی قابل مذمت اور تکلیف دہ بات ہے یہ کہ انسان اپنی زندگی کے جزئیات کے لیے چاہے وہ تحصیل علم ہو یا کرب کار کے لیے یا بیماری و صحت ہو یا ورزش کے لیے، تو دقیق مقاصد حاصل اور منظم پروگرام نظر میں رکھتا ہے۔ لیکن مجموعہ زندگی کو فضول، بے حدف اور بے مقصد سمجھتا ہے؟

اس کے لیے تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ ان میں سے ایک گروہ جب ان مسائل میں غور و فکر کرتا ہے تو اس فضول اور بے مقصد زندگی سے سیر ہو جاتا ہے، اور خود کشی پر تیار ہو جاتا ہے۔

لیکن یہی سوال جب ایک خدا پرست اپنے آپ سے کرتا ہے تو وہ کسی قسم کی الجھن اور تنگی سے دوچار نہیں ہوتا کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ جانتا ہے کہ اس جہان کا خالق حکیم ہے، حتیٰ و یقینی طور پر اس کی خلقت میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے، چاہے ہم اس حکمت سے بے خبر ہوں، اور دوسری طرف اپنے اعضاء کے ایک ایک جز پر نظر ڈالتا ہے، تو اسے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مقصد اور فلسفہ نظر آتا ہے، نہ صرف دل و دماغ اور عروق و اعصاب جیسے اعضاء کے لیے، بلکہ نائٹوں، پلوں، انگلیوں کی لکیروں، ہتھیلیوں اور پاؤں کے تلوے کے نشیب میں سے ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی فلسفہ ہے، جو موجود نہانے میں سب کے سب معلوم کر لیے گئے ہیں۔

کس قدر کوتاہ فہمی کی بات ہے کہ ہم ان سب کے لیے تو حدف اور مقصد کے قائل ہوں، لیکن مجموعی زندگی کو بے مقصد سمجھیں۔

یہ کیسی سادہ لوحی کا فیصلہ ہے کہ ہم شہر کی ہر ہر منزل و مکان کے لیے تو فلسفہ کے قائل ہوں، لیکن مجموعہ شہر کے لیے کسی فلسفہ کے قائل نہ ہوں؟

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انجینئر ایک عظیم عمارت تعمیر کرے، اور کمرے، صحن، کھڑکیاں، دروازے، حوض، باغیچے اور آرائشیں

تو ہر ایک حساب و کتاب اور خاص مقصد کے لیے بنائے، لیکن اس نے اس عظیم عمارت کے مجموعہ کو بغیر کسی مقصد کے بنا دیا ہو۔ یہی باتیں ہیں جو ایک خدا پرست مومن انسان کو اطمینان دلاتی ہیں، کہ اس کی خلقت ایک ہی عظیم مقصد رکھتی ہے، لہذا اس کو کوشش کرنی چاہیے، اور عقل و علم کی قوت سے اسے اصل حقیقت معلوم کرنا چاہیے۔

تعب کی بات ہے کہ یہ خلقت کو فضول جاننے والے، اور اس کے بے مقصد ہونے کے طرفدار، علوم طبعی کے جس سلسلہ میں بھی داخل ہوتے ہیں، تو مختلف انکشافات کی تفسیر کے لیے، کسی نہ کسی مقصد اور حدف کی تلاش میں لگے رہتے ہیں، اور جب تک اس کا حدف اور مقصد دریافت نہ کر لیں چین سے نہیں بیٹھتے، یہاں تک کہ وہ ایک چھوٹی سی طبعی گلی (غدد) کو، جو بدن کے کسی کونہ میں واقع ہوتی ہے، بیکار سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور ممکن ہے کہ اس کے وجود کا فلسفہ معلوم کرنے کے لیے ساہا سال مطالعہ اور آزمائش کرتے رہیں، لیکن جب وہ انسان کی اصل آفرینش و خلقت پر پہنچتے ہیں تو صراحت کے ساتھ کہتے ہیں، کہ اس کا کوئی حدف اور مقصد نہیں ہے۔

کتنا حیرت انگیز اور تعجب خیز تناقض ہے؟

بہر حال ایک طرف خدا کی حکمت پر ایمان، اور دوسری طرف انسان کے وجود کے اعضاء کا معنی خیز ہونا، اس بات پر ہمارا ایمان پختہ کر دیتا ہے، کہ انسان کی آفرینش و خلقت میں ایک عظیم مقصد ہے۔

اب ہمیں اس حدف اور مقصد کو تلاش کرنا چاہیے اور حتی المقدور اسے معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، اور اس راہ میں قدم اٹھانا چاہیے۔

چند مقدمات کی طرف توجہ ایسے چراغ اور روشنی ڈالنے والی چیزیں مہیا کر سکتی ہے جو اس تاریک راستہ کو ہمارے لیے روشن کرے گی۔

(۱) ہم اپنے کاموں میں کوئی نہ کوئی حدف رکھتے ہیں، اور یہ حدف عام طور پر ہماری کسی کمی یا حاجتوں کو دفع کرنا ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر ہم کسی دوسرے کی خدمت کرتے ہیں، یا کسی مصیبت میں گرفتار شخص کی دست گیری کرتے ہیں، اور اسے مصیبت سے نجات دلاتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی ایثار و قربانی بھی کرتے ہیں تو یہ بھی ہماری کسی معنوی کمی کو دور کرتا ہے اور ہماری مقدس حاجات و ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

اور چونکہ ہم صفات و افعال خدا کے بارے میں اکثر اپنے پر قیاس کرنے اور موازنہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں، لہذا ہو سکتا ہے کہ کبھی یہ تصور کر لیا جائے کہ خدا میں وہ کونسی کمی تھی جو ہماری خلقت سے دور ہوتی تھی؟ اور یا اگر ہم اوپر والی آیات میں یہ پڑھتے ہیں کہ انسان کی خلقت کا حدف عبادت ہے، تو ہم کہتے ہیں، اسے ہماری عبادت کی کیا حاجت اور ضرورت ہے۔

حالانکہ یہ طرز فکر خالق و مخلوق اور واجب و ممکن کی صفات میں قیاس اور موازنہ کی پیداوار ہے۔

اس بنا پر کہ ہمارا وجود محدود ہے ہم اپنی کمیوں اور نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمارے سب

اعمال اسی سلسلہ میں ہوتے ہیں، لیکن ایک غیر محدود وجود کے بارے میں یہ معنی امکان پذیر نہیں ہے۔ لہذا اس کے افعال کے

حذف ہو، میں اس نکتے وجود کے علاوہ دوسرے موجودات میں تلاش کرنا چاہیے۔

وہ تو ایک فیض بخش چشمہ ہے، اور ایک نعمت آفرین مبدہ ہے، جو موجودات کو اپنی حمایت کے سائے میں لے لیتا ہے اور ان کی پرورش کر کے نقص سے کمال کی طرف لے جاتا ہے، اور ہماری عبودیت و بندگی کا حقیقی و واقعی حذف ہی ہے، اور ہماری عبادات اور بندگیوں کا فلسفہ بھی یہی ہے، جو سب کی سب ہمارے تکامل و ارتقاء کے درجات ہیں۔

اس طرح ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہماری آفرینش و خلقت کا حذف و مقصد ہماری ہستی کی پیش رفت اور تکامل و ارتقاء ہے۔ بنیادی طور پر اصل آفرینش و خلقت ہی تکامل کی طرف ایک عظیم قدم ہے یعنی کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا اور نیست سے ہست کرنا اور صفر سے عدد کے مرحلہ میں لانا۔

اس عظیم تکاملی قدم کے بعد تکامل و ارتقاء کے دوسرے مراحل شروع ہوتے ہیں، اور تمام دینی اور خدائی پروگرام اسی طریقہ سے وقوع میں آتے ہیں۔

(۲) یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے۔ کہ اگر خلقت کا حذف و مقصد بندوں پر سخاوت و بخشش کرنا ہے اور اس میں پیدا کرنے والے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور یہ سخاوت انسانوں کے ارتقاء کے طریقہ سے ہے، تو پھر اس جو او کو کریم خدا نے ابتدا سے ہی بندوں کو کامل پیدا کیوں نہ کیا؟ تاکہ سب ہی اس کے جو اقرب میں جگہ حاصل کرتے، اور اس کی پاک ذات کی قربت کے برکات سے بہرہ ور ہوتے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے، انسان کا تکامل و ارتقاء کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس کو "جبر" کے ساتھ پیدا کیا جاسکے۔ بلکہ ایک ایسا طولانی اور دور و دراز راستہ ہے جسے انسانوں کو خود اپنے پاؤں سے چل کر ہی طے کرنا چاہیے، اور تقسیم و ارادہ اور اختیاری افعال کے ساتھ اس کی بنیاد ڈالنی چاہیے۔

اگر کسی شخص سے ایک ہسپتال بنانے کے لیے بہت زیادہ رقم، زبردستی، جبری طور سے، نوک نیزہ کے زور پر، وصول کر لی جائے۔ تو کیا اس کے لیے اس عمل کا کوئی اثر اخلاقی و روحانی ارتقاء پر مرتب ہوگا؟ یقیناً نہیں، لیکن اگر وہ اپنے ارادہ اور خوشی سے ایک آنہ یا دس پیسے کے ساتھ بھی اس مقصد اور مقصد کے لیے مدد کرے تو اس نے اسی نسبت سے اخلاقی کمال کی راہ طے کر لی ہے۔

اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، کہ خدا کے لیے لازم ہے کہ وہ اوامر و نواہی اور تزیینی پروگراموں کے ساتھ جو قوت عقل کے وسیلہ سے اور اس کے پیغمبروں کے ذریعہ پہنچاتے جاتے ہیں — اس راہ کو ہمارے لیے واضح درویش کر دے۔ اور ہم اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ اس راستے کو طے کریں۔

(۳) پھر یہاں ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ جس وقت بعض لوگ اپنی والدی توضیحات کو سنتے ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں: بہت خوب، مانا کہ خلقت کا حذف اور مقصد تو تکامل انسانی ہے، یا دوسرے لفظوں میں پروردگار کا قرب، اور ایک ناقص وجود کی ایک لائق ہی کامل وجود کی طرف حرکت ہے، لیکن اس تکامل و ارتقاء کا بذاتِ خود حذف کیا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی اس جملہ کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے کہ تکامل و ارتقاء ہی اصلی حذف اور آخری مقصد ہے، یا دوسرے

لفظوں میں "غایۃ الغایات" ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ: اگر ہم کسی طالب علم سے یہ سوال کریں کہ تم سبق کیوں پڑھتے ہو؟ تو وہ کہے گا، تاکہ میں یونیورسٹی تک پہنچ سکوں۔

اگر ہم پھر سوال کریں کہ تم یونیورسٹی کیوں جانا چاہتے ہو؟ تو وہ جواب دے گا: اس لیے کہ مثلاً ڈاکٹر یا ایک لائق انجینئر بنوں۔

ہم اس سے پھر پوچھتے ہیں کہ تم ڈاکٹری اور انجینیری کا علم کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو؟ تو وہ جواب دے گا: اس لیے کہ کچھ اچھے کام سرانجام دوں اور اچھی آمدنی پیدا کروں۔

ہم پھر کہتے ہیں: تم اچھی آمدنی کس لیے چاہتے ہو؟ تو وہ جواب دے گا: اس لیے کہ آبرو مندانا اور خوشحال زندگی بسر کر سکوں۔

آخر میں ہم پوچھتے ہیں کہ تم خوشحال اور آبرو مندانا زندگی کس لیے چاہتے ہو؟

اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی گفتگو کالبد و لہجہ بدل جاتا ہے، اور کہتا ہے: بس میں چاہتا ہوں کہ خوشحال اور آبرو مندانا زندگی بسر کروں، یعنی پھر اسی پہلے جواب کو دہرا دیتا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے آخری جواب، اور اصطلاح کے مطابق "غایۃ الغایات" تک پہنچ گیا ہے جس کے بعد کوئی اور جواب نہیں ہے۔ اور وہی اس کا آخری حدف اور مقصد ہے، یہ بات تو مادی زندگی کے مسائل میں سے ہے، معنوی زندگی میں بھی مطلب اسی طرح کا ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء کا آنا، آسمانی کتابوں کا نازل ہونا، اور اوامر و نواہی کی ذمہ داریاں اور سارے تربیتی پروگرام کس لیے ہیں؟ تو ہم کہتے ہیں: انسانی تکامل و ارتقاء اور قرب خدا کے لیے۔

اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ تکامل و ارتقاء اور قرب پروردگار کس مقصد کے لیے ہے، تو ہم جواب دیں گے کہ قرب پروردگار کے لیے! یعنی یہ اصلی اور آخری مقصد ہے۔ اور دوسرے لفظوں میں ہم ہر چیز تو تکامل اور قرب خدا کے لیے چاہتے ہیں، لیکن قرب خدا کو خود اسی کے لیے چاہتے ہیں (یعنی قرب پروردگار کے لیے)۔

(۴) یہاں پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے، خداوند فرماتا ہے: کنت کنتاً مخفیاً فاحبیت ان اعرف و خلقت الخلق لکی اعرف" میں ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا تاکہ میں پہچانا جاؤں۔

تم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے یہ حدیث کیا مناسبت رکھتی ہے۔

ہم جواب میں کہتے ہیں: قطع نظر اس سے کہ یہ حدیث ایک خبر واحد ہے، اور اعتقادی مسائل میں خبر واحد کام نہیں دیتی، حدیث کا مفہوم یہ ہے، مخلوق کے لیے خدا کی پہچان ان کے تکامل کا ذریعہ ہے، یعنی میں نے یہ چاہا کہ میری رحمت کا فیض ہر جگہ کو گھیر لے، پس اسی بنا پر میں نے مخلوق کو پیدا کیا، اور ان کی سیر کمالی کے لیے اپنی معرفت کے راہ و رسم اسے سکھائے، کیونکہ میری معرفت و شناخت ہی ان کے تکامل کی رمز ہے۔

ہاں! بندوں کو چاہیے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ذات کو جو تمام کمالات کا منبع ہے — پہچانیں، اپنے آپ کو اس کے کمالات کے مطابق ڈھالیں، اور اس کا سایہ اپنے وجود پر ڈالیں (اس کے رنگ میں خود فروزاں کو رنگ لیں) تاکہ ان صفات کمال و جمال کا نور ان کے وجود میں ہو، کیونکہ تکامل و ارتقا اور قرب خدا، اس کے اخلاق کو اپنائے بغیر ممکن نہیں ہے، اور اس کے اخلاق کو اپنانا اس کی معرفت و شناخت کی فرع ہے، (غور کیجئے)

(۵) جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم آخری نتیجہ سے قریب ہوتے جا رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ خدا کی عبادت اور عبودیت یعنی اس کی مشیت کی راہ میں قدم اٹھانا، اور روح اور جان کو اس کے سپرد کر دینا، اور اس کے عشق کو اپنے دل میں جگہ دینا، اور اپنے آپ کو اس کے اخلاق سے آراستہ کرنا۔ اور اگر اوپر والی آیات میں عبادت کو خلقت کا آخری صدف اور مقصد بیان کیا گیا ہے۔ تو اس کا مفہوم یہی ہے کہ اس کو دوسرے لفظوں میں ”تکامل انسانی“ کے عنوان سے یاد کیا جائے۔

ہاں! انسان کامل ہی خدا کا سچا بندہ ہے۔

۵۔ انسان کی خلقت کے فلسفہ کے سلسلہ میں اسلامی روایات پر ایک نظر ہم نے اوپر دو طریقوں سے انسان کی خلقت کے صدف کا تعاقب کیا ہے۔ ایک آیات قرآنی کی تفسیر کے طریقہ سے اور دوسرے فلسفہ کے طریقہ سے اور دونوں نے ہمیں ایک ہی نقطہ تک پہنچایا ہے۔

اب تیسری راہ سے، یعنی اسلامی روایات کے طریقہ سے، اس نصیب ساز مسئلہ کو بیان کرنے کی باری ہے۔ ذیل کی روایات میں غور و فکر جو ان روایات کا حصہ ہے۔ اس مسئلہ میں ایک زیادہ عمیق اور گہری بصیرت عطا کرتا ہے ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفر سے آیا ہے کہ آنحضرت سے لوگوں نے سوال کیا کہ پیغمبر کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے:

اعملوا فکل میسر لما خلق له

”جہاں تک ہو سکے عمل کرو کیونکہ تمام انسان جس مقصد کے لیے خلق کئے گئے ہیں اس کے لیے آمادگی رکھتے ہیں؟“

امام نے فرمایا:

ان الله عز وجل خلق الجن والانس ليعبدوه و هو لم يخلقهم ليعصوه و ذلك قوله عز وجل وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون فيسر كلا لما خلق له، فويل لمن استحب العمى على الهدى

”خداوند تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت اور اطاعت کریں، اس لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ اس کی نافرمانی کریں، اور یہ وہی چیز ہے کہ جو فرماتا ہے: ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون“ اور چونکہ انہیں اطاعت کے لیے پیدا

کیا ہے، لہذا اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ان کے لیے راستہ کو آسان اور ہموار کر دیا ہے پس وائے
ہے اس شخص کے لیے جو آنکھ بند کر کے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دے۔^۱

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف ایک پر معنی اشارہ ہے کہ چونکہ خدا نے انسانوں کو تکامل و ارتقاء کے مقصد کے لیے پیدا
کیا ہے، لہذا اس نے تکوین و تشریح کے لحاظ سے اس کے وسائل و ذرائع فراہم کئے ہیں اور اس کے اختیار میں دے دیے ہیں۔
ایک دوسری حدیث میں امام صادق^۳ سے منقول ہے کہ امام حسینؑ اپنے اصحاب کے سامنے آئے اور اس طرح فرمایا:

ان الله عز وجل ما خلق العباد الا ليعرفوه، فاذا عرفوه عبده،
فاذا عبده استغثوا بعبادته عن عبادة من سواه۔

”خدا نے عزوجل نے بندوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ اس کو پہچانیں، جب اس کو پہچان
لیں تو اس کی عبادت کریں، اور جب وہ اس کی عبادت کریں گے تو اس کے غیر کی عبادت و
بندگی سے بے نیاز ہو جائیں گے۔“^۲

۴۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ایک اور سوال جو سامنے آتا ہے یہ ہے کہ اگر خدا نے بندوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ تو پھر ایک
گروہ کفر کی راہ کیوں اختیار کر لیتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا ارادہ اس کے حدف کے خلاف ہو؟
جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، انہوں نے ارادہ تکوینی اور ارادہ تشریحی میں اشتباہ کیا ہے، اور انہیں ایک دوسرے
میں غلط ملط کر دیا ہے کیونکہ حدف عبادت جبری نہیں تھا بلکہ یہ عبادت و بندگی ارادہ و اختیار کے ساتھ تھی، اور ایسے حالات ہیں حدف
حالات کو آمادہ کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے یہ مسجد نماز پڑھنے کے لیے بنائی
ہے، تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اسے اس کام کے لیے آمادہ کیا ہے۔ نہ یہ کہ میں لوگوں کو جبراً نماز پڑھاؤں گا، اسی
طرح دوسرے موقوفوں میں جیسے تحصیل علم کے لیے مدرسہ بنانا، اور علاج کے لیے ہسپتال بنانا، اور مطالعہ کے لیے کتاب خانہ
بنانا۔

اس طرح سے خدا نے انسان کو اطاعت و بندگی کے لیے آمادہ کیا ہے۔ اور ہر قسم کے وسائل و ذرائع جیسے عقل اور دوسرے
عواطف اور قومی اندوئی طور سے۔ اور پیغمبر، آسمانی کتابیں اور تشریحی پروگرام باہر سے اس کے لیے فراہم کئے ہیں۔
مسلمہ طور سے یہ بات مومن و کافر دونوں کے لیے یکساں ہے، اگرچہ مومن نے اپنے وسائل و ذرائع سے فائدہ
اٹھایا ہے، اور کافر نے یہ فائدہ نہیں اٹھایا۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادق^۳ سے منقول ہے، کہ جس وقت آپ سے (وما خلقت الجن والانس

۱۔ توحید صدوق (مطابق نقل المیزان ج ۱۸ ص ۲۲۳۔)

۲۔ ”علل الشرائع صدوق (مطابق نقل مدرک اول)۔“

الایعبدون) والی آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا :
 خلقہم للعبادة : ”انہیں عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے سوال کیا :
 خاصة ام عامة ؟ ”کیا اس سے کوئی خاص گروہ مراد ہے یا سب لوگ“ ؟

امام نے فرمایا :

عامة : ”سب لوگ“ لے

ایک دوسری حدیث میں اسی امام سے منقول ہوا ہے کہ جب آپ سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا، تو آپ نے

فرمایا :

خلقہم لیأمرہم بالعبادة

انہیں اس لیے خلق کیا ہے تاکہ انہیں عبادت کا حکم دے سکے

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مقصد بندگی اور عبادت پر مجبور کرنا نہیں تھا، بلکہ اس کے لیے حالات کو سازگار بنانا

تھا اور یہ بات سب لوگوں کے حق میں صادق آتی ہے۔ لے

۱۔ بحار الانوار جلد ۵ ص ۲۱۴ حدیث ۷۔

۲۔ وہی درک حدیث ۵۔

۳۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ الانس اور الجن میں الف ولام استغراق کے لیے ہے، اور اس میں تمام افراد شامل ہیں
 نہ کہ جنس کے لیے اس طور پر کہ صرف ایک ہی گروہ شامل ہو، جیسا کہ بعض تفسیر میں آیا ہے۔

۵۹۔ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُنُوْبًا مِّثْلَ ذُنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا
يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝
۶۰۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوْعَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۹۔ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ہے، ایسے ہی ایک عظیم عذاب کا حصہ ہے، جیسا کہ ان کے ساتھیوں کے حصہ میں آیا تھا، (جنہوں نے گزشتہ اقوام سے ظلم کیا تھا) اس بنا پر جلدی نہ کریں۔
۶۰۔ واٹے ہے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے۔ اس دن سے جس کا انہیں وعدہ دیا گیا ہے۔

تفسیر

یہ بھی عذاب الہی میں حصہ دار ہیں

اوپر کی دو آیات جو سورہ ذاریات کی آخری آیات ہیں، درحقیقت اس سورہ کی مختلف آیات سے ایک قسم کا نتیجہ پیش کرتی ہیں، خصوصاً وہ آیات جو گزشتہ اقوام جیسے قوم فرعون و قوم لوط و عاد و ثمود کی سرنوشت کے سلسلہ میں گفتگو کرتی ہیں، اسی طرح وہ گزشتہ آیات جو حدف آفریش اور مقصد خلقت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

فرماتا ہے: "اب جبکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ مشرک و گنہگار قوم آفریش کے اصلی حدف سے منحرف ہو چکی ہے تو انہیں جان لینا چاہیے کہ ان کے لیے بھی عذاب الہی کا ایک عظیم حصہ ہے، ایسا ہی حصہ جیسا کہ گزشتہ اقوام میں سے ان کے ساتھی رکھتے تھے؛ (فان للذین ظلموا ذنوباً مثل ذنوب اصحابہم)۔

"اس بنا پر جلدی نہ کریں، اور بار بار یہ مطالبہ نہ کریں کہ اگر عذاب الہی حق ہے تو پھر وہ ہماری طرف کیوں نہیں

آتا؟ (فلا يستعجلون) یہ

اس گروہ کے بارے میں ظلم کی تعبیر اس بنا پر ہے کیونکہ ”شُرک“ اور کفر عظیم ترین ظلم ہے، ظلم کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے لائق جگہ میں نہ رکھا جائے، اور مسلمہ طور سے بت کو خدا کی جگہ قرار دینا ظلم کا اہم ترین مصداق شمار ہوتا ہے، اور اسی بنا پر وہ بھی اسی سلوک کے مستحق ہیں، جس کی گزشتہ مشرک اقوام مستحق تھیں۔

”ذنب“ (بروزن قبول) اصل میں اس گھوڑے کے منہ میں ہے، جس کی دم لمبی ہو، اسی طرح وہ بڑے ڈول ہو دنبالہ رکھتے ہوں۔

گزشتہ زمانے میں حیوانات کے ذریعہ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے بڑے بڑے ڈول مہیا کئے جاتے تھے، جن کے ایک دنبالہ ہوتا تھا، اور ڈول کے دہانے کے علاوہ، اس کے دنبالہ کے ساتھ ایک رسی بھی متصل ہوتی تھی، جس سے اس بڑے ڈول کو خالی کرنے کے لیے استفادہ کیا کرتے تھے۔

اور چونکہ بعض اوقات چند گروہوں کے درمیان پانی تقسیم کرنے کے لیے ان ڈولوں سے کام لیا جاتا تھا، اور ہر ایک کو ایک یا چند ڈول دیتے تھے، لہذا یہ لفظ حصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے نیز بچشت آیت میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ یہاں بڑے حصہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کیا اس آیت میں دنیا کے عذاب کی دھمکی مراد ہے یا آخرت کے عذاب کی؟ مفسرین کے ایک گروہ نے دوسرے معنی کو قبول کیا ہے، جب کہ بعض نے پہلے معنی کا احتمال دیا ہے۔

ہمارے نظریہ کے مطابق قرآن عذاب دنیا کی گواہی دیتے ہیں، کیونکہ اولاً وہ عجلت بول بعض کفار رکھتے تھے زیادہ تر اسی لیے تھی، کہ وہ پیغمبر سے کہا کرتے تھے: اگر تو سچ کہتا ہے تو پھر ہم پر عذاب الہی کیوں نازل نہیں ہوتا اور یہ مسلمہ طور سے عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرے یہ کہ ”مثل ذنوب اصحابہم“ کی تعبیر ظاہراً ایسی اقوام کی سرگزشت کی طرف اشارہ ہے، جن کا اسی سورہ میں ذکر آیا ہے، مثلاً قوم لوط و قوم فرعون و عاد و ثمود، جن میں سے ہر ایک دنیا کے کسی نوع کے عذاب میں گرفتار ہوئی ہے اور تباہ و برباد ہوئی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہ آیت عذاب دنیا کے ساتھ مربوط ہے، تو پھر یہ خدائی وعدہ ان کے بارے

۱۔ توجہ کرنا چاہیے کہ ”یستعجلون“ کی نون مکسورہ ہے، حالانکہ جمع کی نون کو مفتوح ہونا چاہیے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں ”یستعجلونی“ (مجھ سے جلدی نہ کریں) تھا۔

۲۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے: لنا ذنوب وکم ذنوب ؛ فان ابیت و فلنا القلب ہمارے لیے بڑا ڈول ہے اور تمہارے لیے بھی بڑا ڈول ہے۔ اور اگر تم قبول نہیں کرتے تو تمام کنواں بجا رہے۔

۳۔ سورۃ النام کی آیت ۵۸، ۵۹ اور سورۃ نمل کی آیت ۲، اور اسی قسم کی دوسری آیات کی طرف رجوع کریں۔

البتہ یہ تعبیرات قرآنی آیات میں بعض اوقات قیامت کے بارے میں بھی استعمال ہوئی ہیں۔

میں کیوں پورا نہ ہوا۔؟

اس سوال کے دو جواب ہیں :

۱- یہ وعدہ ان میں سے بہت سوں کے لیے، مثلاً ابوجہل اور ایک اور جماعت کے بارے میں جنگ بدر وغیرہ میں پورا ہو گیا۔

۲- ان سب کے لیے اس عذاب کا نزول خدا کی طرف بازگشت نہ کرنے، اور شرک سے توبہ نہ کرنے کے ساتھ مشروط تھا، لیکن جب ان میں سے اکثر فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے تو یہ شرط دور ہو گئی اور عذاب الہی برطرف ہو گیا۔ اور آخری آیت میں دنیا کے عذاب کی تہدید کی، آخرت کے عذاب کی تہدید کے ساتھ تکمیل کرتے ہوئے کہتا ہے:

”ان لوگوں پر دائے ہے جو کافر ہو گئے، اُس دن سے جس کا ان سے وعدہ دیا گیا ہے“ (فویل للذین کفروا من یومہم الذی یوعدون)۔

جس طرح سے یہ سورہ معاد و قیامت کے ساتھ شروع ہوا تھا، اسی مسئلہ پر تاکید کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔

”ویل“ لغت عرب میں ان موقعوں پر بولا جاتا ہے جہاں ایک فرد یا کئی افراد ہلاکت میں جا پڑیں، اور یہ عذاب و بدبختی کا معنی دیتا ہے، اور بعض کے قول کے مطابق عذاب سے بھی زیادہ شدید مفہوم رکھتا ہے۔

”ویل“ و ”ویس“ و ”ویح“ کے الفاظ لغت عرب میں ان موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں، جہاں ایک شخص دوسرے کی حالت پر افسوس کرے، البتہ ”ویل“ بُرے اور قبیح کاموں کے موقعوں پر بولا جاتا ہے اور ”ویس“ حقیر سمجھنے کے موقعوں پر اور ”ویح“ رحم کھانے کے مقام پر۔

ایک جماعت کا کہنا ہے کہ ”ویل“ دوزخ میں ایک کنواں یاد رہ ہے، لیکن یہ کہنے والوں کی مراد یہ نہیں ہے کہ لغت میں اس معنی میں آیا ہے، بلکہ حقیقت میں ایک قسم کے مصداق کا بیان ہے۔

یہ تعبیر قرآن مجید میں بہت سے موقعوں پر، جیسے کفار، مشرکین، دروغ گوئی کرنے والوں، تکذیب کرنے والوں، گنہگاروں کم فروشی کرنے والوں اور بے خبر نماز گزاروں کے بارے میں استعمال ہوتی ہے، لیکن اس کا زیادہ تر استعمال قرآن مجید میں تکذیب کرنے والوں کے لیے ہوا ہے، منحلہ ان کے سورہٴ مسلمات میں اس جملہ کا دس مرتبہ تکرار ہوا ہے، ویل یومئذ للمکذبین

”قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے دائے ہے جنہوں نے پیغمبروں اور آیات الہی کی تکذیب کی“

خداوند! ہمیں اس عظیم دن کے عذاب اور وحشتناک رسوائی سے اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھ۔

بارالہا! ہمیں قبول کرنے کے لیے آمادہ ہونے، اور اپنی عبودیت اور بندگی کے افتخار کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمیں ان اقوام کی دردناک سرنوشت میں جنہوں نے تیرے پیغمبروں اور آیات کی تکذیب کی ہے یا

۱۷ بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ ممکن ہے یہ آیت بھی عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہو، حالانکہ اس قسم کی تعبیر قرآن مجید میں عام طور پر قیامت کے لیے ہوتی ہے۔

ہاں! بندوں کو چاہیے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ذات کو جو تمام کمالات کا منبع ہے — پہچانیں، اپنے آپ کو اس کے کمالات کے مطابق ڈھالیں، اور اس کا سایہ اپنے وجود پر ڈالیں (اس کے رنگ میں خود فروزاں کو رنگ لیں) تاکہ ان صفات کمال و جمال کا نور ان کے وجود میں ہو، کیونکہ تکامل و ارتقا اور قرب خدا، اس کے اخلاق کو اپنائے بغیر ممکن نہیں ہے، اور اس کے اخلاق کو اپنانا اس کی معرفت و شناخت کی فرع ہے، (غور کیجئے)

(۵) جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم آخری نتیجہ سے قریب ہوتے جا رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ خدا کی عبادت اور عبودیت یعنی اس کی مشیت کی راہ میں قدم اٹھانا، اور روح اور جان کو اس کے سپرد کر دینا، اور اس کے عشق کو اپنے دل میں جگہ دینا، اور اپنے آپ کو اس کے اخلاق سے آراستہ کرنا۔ اور اگر اوپر والی آیات میں عبادت کو خلقت کا آخری صدف اور مقصد بیان کیا گیا ہے۔ تو اس کا مفہوم یہی ہے کہ اس کو دوسرے لفظوں میں ”تکامل انسانی“ کے عنوان سے یاد کیا جائے۔

ہاں! انسان کامل ہی خدا کا سچا بندہ ہے۔

۵۔ انسان کی خلقت کے فلسفہ کے سلسلہ میں اسلامی روایات پر ایک نظر ہم نے اوپر دو طریقوں سے انسان کی خلقت کے صدف کا تعاقب کیا ہے۔ ایک آیات قرآنی کی تفسیر کے طریقے سے اور دوسرے فلسفہ کے طریقے سے اور دونوں نے ہمیں ایک ہی نقطہ تک پہنچایا ہے۔ اب تیسری راہ سے، یعنی اسلامی روایات کے طریقے سے، اس نصیب ساز مسئلہ کو بیان کرنے کی باری ہے۔ ذیل کی روایات میں غور و فکر جو ان روایات کا حصہ ہے۔ اس مسئلہ میں ایک زیادہ عمیق اور گہری بصیرت عطا کرتا ہے ایک حدیث میں امام موسیٰ بن جعفرؑ سے آیا ہے کہ آنحضرتؐ سے لوگوں نے سوال کیا کہ پیغمبر کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے:

اعملوا فکل میسر لما خلق له

”جہاں تک ہو سکے عمل کرو کیونکہ تم کو تمام انسان جس مقصد کے لیے خلق کئے گئے ہیں اس کے لیے آمادگی رکھتے ہیں؟“

امامؑ نے فرمایا:

ان الله عز وجل خلق الجن والانس ليعبدوه، ولم يخلقهم ليعصوه
وذلك قوله عز وجل وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون فيسر كلا لما
خلق له، فويل لمن استحب العمى على الهدى

”خداوند تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت اور اطاعت کریں، اس لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ اس کی نافرمانی کریں، اور یہ وہی چیز ہے کہ جو فرماتا ہے: ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون“ اور چونکہ انہیں اطاعت کے لیے پیدا

کیا ہے، لہذا اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ان کے لیے راستہ کو آسان اور ہموار کر دیا ہے پس وائے
ہے اس شخص کے لیے جو آنکھ بند کر کے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دے۔^۱

یہ حدیث اس حقیقت کی طرف ایک پر معنی اشارہ ہے کہ چونکہ خدا نے انسانوں کو تکامل و ارتقاء کے مقصد کے لیے پیدا
کیا ہے، لہذا اس نے تکوین و تشریح کے لحاظ سے اس کے وسائل و ذرائع فراہم کئے ہیں اور اس کے اختیار میں دے دیے ہیں۔
ایک دوسری حدیث میں امام صادق^۳ سے منقول ہے کہ امام حسینؑ اپنے اصحاب کے سامنے آئے اور اس طرح فرمایا:

ان الله عز وجل ما خلق العباد الا ليعرفوه، فاذا عرفوه عبدوه،
فاذا عبدوه استغنتوا بعبادته عن عبادة من سواه۔

”خدا نے عزوجل نے بندوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ اس کو پہچانیں، جب اس کو پہچان
لیں تو اس کی عبادت کریں، اور جب وہ اس کی عبادت کریں گے تو اس کے غیر کی عبادت و
بندگی سے بے نیاز ہو جائیں گے۔“^۲

۴۔ ایک سوال کا جواب

یہاں ایک اور سوال جو سامنے آتا ہے یہ ہے کہ اگر خدا نے بندوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے تو پھر ایک
گروہ کفر کی راہ کیوں اختیار کر لیتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا کا ارادہ اس کے حدف کے خلاف ہو؟
جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں، انہوں نے ارادہ تکوینی اور ارادہ تشریحی میں اشتباہ کیا ہے، اور انہیں ایک دوسرے
میں خلط ملط کر دیا ہے کیونکہ حدف عبادت جبری نہیں تھا بلکہ یہ عبادت و بندگی ارادہ و اختیار کے ساتھ تھی، اور ایسے حالات میں حدف
حالات کو آمادہ کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے یہ مسجد نماز پڑھنے کے لیے بنائی
ہے، تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے اسے اس کام کے لیے آمادہ کیا ہے۔ نہ یہ کہ میں لوگوں کو جبراً نماز پڑھاؤں گا، اسی
طرح دوسرے موقعوں میں جیسے تحصیل علم کے لیے مدرسہ بنانا، اور علاج کے لیے ہسپتال بنانا، اور مطالعہ کے لیے کتاب خانہ
بنانا۔

اس طرح سے خدا نے انسان کو اطاعت و بندگی کے لیے آمادہ کیا ہے۔ اور ہر قسم کے وسائل و ذرائع جیسے عقل اور دوسرے
عواطف اور قوی اندرونی طور سے۔ اور پیغمبر، آسمانی کتابیں اور تشریحی پروگرام باہر سے اس کے لیے فراہم کئے ہیں۔
مسئلہ طور سے یہ بات مومن و کافر دونوں کے لیے یکساں ہے، اگرچہ مومن نے اپنے وسائل و ذرائع سے فائدہ
اٹھایا ہے، اور کافر نے یہ فائدہ نہیں اٹھایا۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادق^۳ سے منقول ہے، کہ جس وقت آپ سے (وما خلقت الجن والانس

۱۔ توحید صدوق (مطابق نقل المیزان ج ۱۸ ص ۴۲۳)۔

۲۔ ”علل الشرائع صدوق (مطابق نقل مدرک اول)۔“

الایعبدون) والی آیت کی تفسیر کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا :
 خلقهم للعبادة : ”انہیں عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے سوال کیا:
 خاصة ام عامة؟ ”کیا اس سے کوئی خاص گروہ مراد ہے یا سب لوگ؟“

امام نے فرمایا :

عامة ، ”سب لوگ“ لے

ایک دوسری حدیث میں اسی امام سے منقول ہوا ہے کہ جب آپ سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا، تو آپ نے

فرمایا :

خلقهم ليأمرهم بالعبادة

انہیں اس لیے خلق کیا ہے تاکہ انہیں عبادت کا حکم دے لے

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مقصد بندگی اور عبادت پر مجبور کرنا نہیں تھا، بلکہ اس کے لیے حالات کو سازگار بنانا

تھا اور یہ بات سب لوگوں کے حق میں صادق آتی ہے۔ لے

۱۔ بحار الانوار جلد ۵ ص ۳۱۴ حدیث ۷۔

۲۔ وہی مد رک حدیث ۵۔

۳۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ الانس اور الجسن میں الف ولام استغراق کے لیے ہے، اور اس میں تمام افراد شامل ہیں نہ کہ جنس کے لیے اس طور پر کہ صرف ایک ہی گروہ شامل ہو، جیسا کہ بعض تفسیر میں آیا ہے۔

۵۹- فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُنُوبًا مِّثْلَ ذُنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا
يَسْتَعْجِلُونَ ○
۶- فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ○

ترجمہ

۵۹- ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ہے، ایسے ہی ایک عظیم عذاب کا حصہ ہے، جیسا کہ ان کے ساتھیوں کے حصہ میں آیا تھا، (جنہوں نے گزشتہ اقوام سے ظلم کیا تھا) اس بنا پر جلدی نہ کریں۔
۶- وائے ہے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے۔ اس دن سے جس کا انہیں وعدہ دیا گیا ہے۔

تفسیر

یہ بھی عذاب الہی میں حصہ دار ہیں

اوپر کی دو آیات جو سورہ ذاریات کی آخری آیات ہیں، درحقیقت اس سورہ کی مختلف آیات سے ایک قسم کا نتیجہ پیش کرتی ہیں، خصوصاً وہ آیات جو گزشتہ اقوام جیسے قوم فرعون و قوم لوط و عاد و ثمود کی سرنوشت کے سلسلہ میں گفتگو کرتی ہیں، اسی طرح وہ گزشتہ آیات جو حدف آفریش اور مقصد خلقت کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔

فرماتا ہے: "اب جبکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ مشرک و گنہگار قوم آفریش کے اصلی حدف سے منحرف ہو چکی ہے تو انہیں جان لینا چاہیے کہ ان کے لیے بھی عذاب الہی کا ایک عظیم حصہ ہے، ایسا ہی حصہ جیسا کہ گزشتہ اقوام میں سے ان کے ساتھی رکھتے تھے؛ (فان للذین ظلموا ذنوباً مثل ذنوب اصحابہم)۔

"اس بنا پر جلدی نہ کریں، اور بار بار یہ مطالبہ نہ کریں کہ اگر عذاب الہی ہی حق ہے تو پھر وہ ہماری طرف کیوں نہیں

آتا؟ (فلا یتعجلون) ایہ

اس گروہ کے بارے میں ظلم کی تعبیر اس بنا پر ہے کیونکہ ”شُرک“ اور کفر عظیم ترین ظلم ہے، ظلم کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے لائق جگہ میں نہ رکھا جائے، اور مسلمہ طور سے بت کو خدا کی جگہ قرار دینا ظلم کا اہم ترین مصداق شمار ہوتا ہے اور اسی بنا پر وہ بھی اسی سلوک کے مستحق ہیں، جس کی گزشتہ مشرک اقوام مستحق تھیں۔

”ذنب“ (بروزن قبول) اصل میں اس گھوڑے کے معنی میں ہے، جس کی دم لمبی ہو، اسی طرح وہ بڑے ڈول ہو دنبالہ رکھتے ہوں۔

گزشتہ زمانے میں حیوانات کے ذریعہ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے بڑے بڑے ڈول ہیا کئے جاتے تھے، جن کے ایک دنبالہ ہوتا تھا، اور ڈول کے دبانے کے علاوہ، اس کے دنبالہ کے ساتھ ایک رسی بھی متصل ہوتی تھی، جس سے اس بڑے ڈول کو خالی کرنے کے لیے استفادہ کیا کرتے تھے۔

اور چونکہ بعض اوقات چند گروہوں کے درمیان پانی تقسیم کرنے کے لیے ان ڈولوں سے کام لیا جاتا تھا، اور ہر ایک کو ایک یا چند ڈول دیتے تھے، لہذا یہ لفظ حصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، نیز بحث آیت میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ یہاں بڑے حصہ کی طرف اشارہ ہے۔

کیا اس آیت میں دنیا کے عذاب کی دھمکی مراد ہے یا آخرت کے عذاب کی؟ مفسرین کے ایک گروہ نے دوسرے معنی کو قبول کیا ہے، جب کہ بعض نے پہلے معنی کا احتمال دیا ہے۔

ہمارے نظریہ کے مطابق قرآن عذاب دنیا کی گواہی دیتے ہیں، کیونکہ اولاً وہ عجلت جو بعض کفار رکھتے تھے زیادہ تر اسی لیے تھی، کہ وہ پیغمبر سے کہا کرتے تھے: اگر تو سچ کہتا ہے تو پھر ہم پر عذاب الہی کیوں نازل نہیں ہوتا اور یہ مسلمہ طور سے عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرے یہ کہ ”مثل ذنوب اصحابہم“ کی تعبیر ظاہراً ایسی اقوام کی سرگزشت کی طرف اشارہ ہے، جن کا اسی سورہ میں ذکر آیا ہے، مثلاً قوم لوط و قوم فرعون و عاد و ثمود، جن میں سے ہر ایک دنیا کے کسی نوع کے عذاب میں گرفتار ہوئی ہے اور تباہ و برباد ہوئی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہ آیت عذاب دنیا کے ساتھ مربوط ہے، تو پھر یہ خدائی وعدہ ان کے بارے

۱۔ لے تو جہر کرنا چاہیے کہ ”یستعجلون“ کی نون مسور ہے، حالانکہ جمع کی نون کو مفتوح ہونا چاہیے، اور اس کی دہر یہ ہے کہ یہ اصل میں ”یستعجلونی“ (مجھ سے جلدی نہ کریں) تھا۔

۲۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے، لنا ذنوب وکم ذنوب ؛ فان ایبتہ فلنا القلیب
ہمارے لیے بڑا ڈول ہے اور تمہارے لیے بھی بڑا ڈول ہے۔ اور اگر تم قبول نہیں کرتے تو تمام کنواں ہمارا ہے۔

۳۔ سورہ النعام کی آیت ۵۸، ۵۹ اور سورہ نمل کی آیت ۲۷ اور اسی قسم کی دوسری آیات کی طرف رجوع کریں۔

البتہ یہ تعبیرات قرآنی آیات میں بعض اوقات قیامت کے بارے میں بھی استعمال ہوئی ہیں۔

میں کیوں پورا نہ ہوا۔؟

اس سوال کے دو جواب ہیں :

۱۔ یہ وعدہ ان میں سے بہت سوں کے لیے، مثلاً البہل اور ایک اور جماعت کے بارے میں جنگ بدر وغیرہ میں پورا ہو گیا۔

۲۔ ان سب کے لیے اس عذاب کا نزول خدا کی طرف بازگشت نہ کرنے، اور شرک سے توبہ نہ کرنے کے ساتھ مشروط تھا، لیکن جب ان میں سے اکثر فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے تو یہ شرط دور ہو گئی اور عذاب الہی برطرف ہو گیا۔ اور آخری آیت میں دنیا کے عذاب کی تہدید کی، آخرت کے عذاب کی تہدید کے ساتھ تکمیل کرتے ہوئے کہتا ہے: "ان لوگوں پر دوائے ہے جو کافر ہو گئے، اُس دن سے جس کا ان سے وعدہ دیا گیا ہے" (فویل للذین کفروا من یومہم الذی یوعدون)۔

جس طرح سے یہ سورہ مسئلہ معاد و قیامت کے ساتھ شروع ہوا تھا، اسی مسئلہ پر تاکید کے ساتھ ختم ہو رہا ہے۔ "ویل" لغت عرب میں ان موقعوں پر بولا جاتا ہے جہاں ایک فرد یا کئی افراد ہلاکت میں جا پڑیں، اور یہ عذاب و بدبختی کا معنی دیتا ہے، اور بعض کے قول کے مطابق عذاب سے بھی زیادہ شدید مفہوم رکھتا ہے۔

"ویل" و "ویس" و "ویح" کے الفاظ لغت عرب میں ان موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں، جہاں ایک شخص دوسرے کی حالت پر افسوس کرے، البتہ "ویل" بڑے اور قبیح کاموں کے موقعوں پر بولا جاتا ہے اور "ویس" حقیر سمجھنے کے موقعوں پر اور "ویح" رحم کھانے کے مقام پر۔

ایک جماعت کا کہنا ہے کہ "ویل" دوزخ میں ایک کنواں یا درہ ہے، لیکن یہ کہنے والوں کی مراد یہ نہیں ہے کہ لغت میں اس معنی میں آیا ہے، بلکہ حقیقت میں ایک قسم کے مصداق کا بیان ہے۔

یہ تعبیر قرآن مجید میں بہت سے موقعوں پر، جیسے کفار، مشرکین، دروغ گوئی کرنے والوں، تکذیب کرنے والوں، گنہگاروں کم فروشی کرنے والوں اور بے خبر نماز گزاروں کے بارے میں استعمال ہوئی ہے، لیکن اس کا زیادہ تر استعمال قرآن مجید میں تکذیب کرنے والوں کے لیے ہوا ہے، منجملہ ان کے سورہٴ مسلات میں اس جملہ کا دس مرتبہ تکرار ہوا ہے، ویل یومئذ للمکذبین "قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے دوائے ہے جنہوں نے پیغمبروں اور آیات الہی کی تکذیب کی"

خداوند! ہمیں اس عظیم دن کے عذاب اور وحشتناک رسوائی سے اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھ۔

بارالہا! ہمیں قبول کرنے کے لیے آمادہ ہونے، اور اپنی عبودیت اور بندگی کے افتخار کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمیں ان اقوام کی دردناک سرنوشت میں جنہوں نے تیرے پیغمبروں اور آیات کی تکذیب کی سے یا

۱۔ بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ ممکن ہے یہ آیت بھی عذاب دنیا کی طرف اشارہ ہو، حالانکہ اس قسم کی تعبیر قرآن مجید میں عام طور پر قیامت کے لیے ہوتی ہے۔

انہیں پس پشت ڈالا ہے، بتلانہ کر، اور وقت کے ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے میں خواب غفلت سے بیدار کر دے۔

آمین یا رب العالمین

اختتام سوۃ ذاریات

جمعہ ۱۰ صفر ۱۴۰۶، ہجری قمری

مطابق ۱۳ آبان ماہ ۱۳۶۳، ہجری شمسی

اختتام ترجمہ بوقت پونے پانچ بجے صبح بروز اتوار

بتاریخ ۱۸ رمضان المبارک ۱۴۰۶، ہجری قمری

واقع محل سلطان محمد شریف کوئی جھنڈی بلاک ۱۱

قم المقدسہ ایران



ادارہ امامیہ قرأت کالج

تشریح و تفسیر

یہ کتاب تفسیر نمونہ جلد ۱۲

کے اسلوب کو حرف بگرن بنور پڑھائیں

تصدیق کرتا ہوں کہ تفسیر یہ کتاب عربی

یا لفظ غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان انارکلی)

مدرسہ/مینیجر

امامیہ قرأت کالج

اندر روڈ، مریچہ روڈ، لاہور

اشاریہ

تفسیر نمونہ جلد ۱۲

ترتیب و تزئین سید شکیل حسین موسوی

سید محمد حسین زیدی الباہروی

مضامین:

۶۳۰

اصول و عقائد

۶۳۳

احکام

//

اخلاقیات

۶۳۵

اقوام گذشتہ

۶۳۶

شخصیات

۶۵۰

علماء و دانشور

//

کتب سماوی

۶۵۳

کتب تاریخ و تفسیر و سیر

۶۵۵

لغات قرآن

۶۶۱

متفرق موضوعات

۶۶۳

مقامات

۴۸۱، ۴۲۲، ۳۵۳

غفور

۲۱۳

قدیر

توحید

ہم نے قرآن کو مبارک رات میں نازل کیا، ہم نے ہی محمدؐ کو بھیجا، ہمارے سوا کوئی معبود نہیں ۲۴، ۲۳

ہم نے ان سے پہلے سب لوگوں کو ہلاک کر ڈالا، وہ مجرم تھے، آسمانوں اور زمین کو بے مقصد نہیں حق کے ساتھ پیدا کیا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۶۱

وہی عزیز و حکیم ہے ۶۷

تاکہ اللہ اس دن ہر قوم کو اس کے عمل کی جزا دے ۱۰۲

اللہ وہ ہے جس نے آسمان و زمین کے درمیان ہوا، پانی، دریا، کشتیاں تمہارے لیے مسخر کر دیں۔ ۱۰۳، ۱۰۴

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا فرمایا ۱۱۵

ہم نے آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان ہر شے کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ ۱۳۹

جو کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر قائم ہیں انہیں کوئی خوف و غم نہ ہوگا۔ ۱۷۰

جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تھکا بھی نہیں، وہی مردوں کو زندہ کرے گا، وہ ہر شے پر قادر ہے۔ ۲۱۳

ہم نے تمہارے لیے واضح کامیابی فراہم کر دی ۳۲۱

اصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

اللہ ۱۶۵، ۱۵۷، ۱۳۹، ۱۳۹، ۸۹، ۶۷، ۲۳

۳۲۱، ۲۹۱، ۲۶۰، ۲۵۴، ۲۲۷، ۲۱۳، ۲۰۰

۳۶۸، ۳۶۱، ۳۵۳، ۳۳۸، ۳۳۳، ۳۲۸

۳۳۷، ۳۲۲، ۳۰۵، ۳۹۹، ۳۹۲، ۳۵۸

۳۹۲، ۳۸۵، ۳۸۱، ۳۷۱، ۳۵۶، ۳۴۷

۵۵۳

۳۸۵

۳۵۶

بصیر

تو اب

حکیم

نجیر

رب

رحمن

رحیم

سمیع

عزیز

علیم

۳۸۵، ۳۶۸، ۳۳۸، ۳۳۳، ۱۳۹، ۱۳۹، ۸۹، ۲۳

۳۷۱، ۳۵۳

۳۶۶، ۳۱۳، ۱۶۵، ۱۳۹، ۱۳۱، ۸۵، ۲۳

۵۸۱، ۲۷۲

۵۵۴، ۳۹۲، ۳۳۱، ۳۲۷، ۱۳۹، ۱۳۹، ۸۹، ۶۷، ۲۳

۳۵۳، ۳۳۱، ۳۲۷، ۱۳۹، ۸۹، ۶۷، ۲۳

۵۵۴، ۳۹۲، ۳۸۱، ۳۵۶، ۳۲۲

۳۲۲، ۲۳

۳۶۸، ۳۳۸، ۱۳۹، ۱۳۹، ۸۹، ۶۷

۳۷۱، ۳۳۷، ۳۲۲، ۳۹۲، ۳۳۳، ۲۳

۵۸۱، ۳۸۵

ہم نے آسمان بنائے، انہیں وسعت دیتے
رہتے ہیں، زمین کو پھیلایا، ہر چیز کے جوڑے
پیدا کیے، پس تم اللہ کی طرف دوڑو۔ ۶۰۲ تا ۶۰۸
میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت
کے لیے پیدا کیا اور اللہ ہی روزی دینے والا ہے ۶۱۳ تا ۶۲۳

عدل

ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔ کسی
پر ظلم نہ ہوگا۔ ۱۱۵
میں کبھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا
۵۲۶
اعمال کی جزا یقیناً واقع ہو کر رہے گی
۵۵۵
ہم نے قوم کو طوطا کے شہروں سے مومنین کو پہلے
ہی نکال لیا۔ ان کو کفار کی سزا میں کیوں
گرفتار کرتے! ۵۹۲

نبوت

ہم ہی نے محمدؐ کو بھیجا، ہماری طرف سے
ایک حکم تھا۔ ۲۳
رسولؐ تو معجزات لے کر آچکا جس سے روگرداں
ہوئے، دیوانہ کہا۔ ۳۳ تا ۳۶
کہہ دیجیے کہ جن کی عبادت کرتے ہو۔ انہوں
نے کچھ بتایا ہے تو ثبوت پیش کرو۔ ۱۵۲ تا ۱۵۶
میں نیا رسول نہیں ہوں، اللہ ظالموں کو ہدایت
نہیں فرماتا۔ ۱۵۷ تا ۱۶۳

۳۲۸ شکست ناپذیر کامیابی عطا کی
وہی تو ہے جس نے مومنین کے قلب کو سکون عطا
فرمایا، زمین و آسمان کے لشکر اللہ کے لیے ہیں۔
۳۳۳ بیشک اللہ علیم و حکیم ہے۔
زمین و آسمان کے لشکر صرف اللہ کے لیے ہیں اور
اللہ شکست ناپذیر و دانا ہے۔ ۳۳۹
ہم نے تمہیں بشارت و انداز کے لیے بھیجا ہے
۳۴۶ اللہ آسمانوں اور زمین کے غیب سے باخبر ہے، جو
کچھ تم کرتے ہو وہ اس سے بھی باخبر ہے۔ ۴۸۵
ہم نے آسمان کو ستاروں سے سجایا اس میں
کوئی شگاف نہیں۔ ۴۹۷
ہم نے زمین کو پھیلایا، پہاڑ قائم کیے، گھاس اگائی،
آسمان سے پربکت پانی نازل فرمایا، مردہ زمین کو
زندہ کر دیا۔ ۴۹۸ تا ۵۰۱
ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ ہم اس کی شاہ رگ
سے قریب تر ہیں۔ ۵۰۶
ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان
ہے سچا اور میں پیدا کیا۔ ۵۲۰
طلوع و غروب سے پہلے، رات کے حصہ میں اور
سجدوں کے بعد اس کی تسبیح کرو۔ ۵۲۳
ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہماری ہی
طرف لوٹ کر آتا ہے۔ ۵۲۶
ہاں! ہواؤں، بادلوں، کشتیوں، فرشتوں کی قسم! جو
وعدہ تجھے دیا گیا ہے، یقیناً سچ ہے۔ ۵۵۵

- صبر کرو جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا!
عذاب کے لیے جلدی نہ کرو۔ ۲۱۴
- ہم نے تمہیں بشارت و انذار کے لیے بھیجا ہے
انہوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ انہی میں سے
ڈرانے والا پیغمبر آیا۔ ۳۴۶
- جب حق آیا تو تکذیب کی، لہذا اپنے پرگندہ کام
میں محیر ہیں۔ ۴۹۲
- صرف تمہارا ہی دشمن سے مقابلہ نہیں۔ عاد و ثمود،
اصحاب الرس، ایک، قوم نوح اور فرعون نے
بھی اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ ۴۹۳
- تم قرآن کے ذریعہ ڈرانے والوں کو نصیحت کرتے ہو
جس پیغمبر کو بھیجا اسے قوم نے جھٹلایا، جادوگر
کہا۔ تو ان سے منہ پھیر لے۔ نصیحت کر نصیحت
میں مومن کا فائدہ ہے۔ ۵۱۴ تا ۵۰۲
- انتظار کر کہ جب آسمان سے دھواں نکلے گا،
اس عذاب کو دور کر، رسول کو جھٹلایا، دیوانہ
کہا، بدلہ تو سخت عذاب کے دن لیں گے۔ ۵۲۷ تا ۳۳
- ان سب کے لیے حق کے باطل سے جدا ہونے
کا دن مقرر ہے، کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا، مگر
جس پر اللہ رحمت نازل فرمائے۔ وہ عزیز و حکیم
ہے۔ ۶۷ تا ۶۹
- جو اللہ کے دن (قیامت) کی توقع نہیں رکھتے
ان سے درگزر کرو، اللہ ان کے اعمال کی جزا
دے گا۔ ۱۰۲
- قیامت کے دن تیرا پروردگار ان کے اختلافات
کا فیصلہ کر دے گا۔ ۱۰۹
- معاذ کے بارے میں دہریوں کی بہانہ تراشیاں
اللہ زندہ کرتا ہے، جمع کرے گا، زمین و آسمان
کا مانک، اہل باطل گھاٹے میں ہوں گے۔
کتاب حق کہتی ہے کہ مومنین رحمت میں
داخل ہوں گے۔ ۱۲۹
- اللہ کا وعدہ حق ہے، قیامت میں کوئی شک
نہیں۔ ۱۳۹ تا ۱۳۷
- وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے، خرافات سمجھتے
اور مذاق اڑاتے ہیں۔ ۱۸۳
- کافر جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ کیا یہ حق نہیں
ہے؟ ہاں! بیشک حق ہے۔ ۲۱۳
- جب ہم مرجائیں گے، خاک ہو جائیں گے تو
پھر زندہ کئے جائیں گے؟ ۲۹۲
- ہم نے بارش کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کیا۔
مردوں کا زندہ کرنا بھی اسی طرح ہے۔ ۲۹۸
- انجام کار سکرات موت پہنچ جائے گی جس سے
انسان بھاگتا تھا، صور بھونکا جائے گا۔ وحشتناک
دن۔ غفلت کا پردہ ہٹایا جائے گا۔ ۵۲۰ تا ۵۱۴

جہنم

تھوہر کا درخت پگھلی ہوئی دھات کی طرح پیٹ
میں اُبال کھائیگا، کھولتا ہوا پانی، مجرم کو جہنم میں
پھینک دو، سر پر کھولتا ہوا عذاب ڈالو۔ مزاحیچہ
تو توطا تو تر تھا۔ ۷۴ تا ۷۰

جہنم اُن کے پیچھے ہی پیچھے ہے، یعنی وہ جہنم سے
بچ کر نہیں جاسکتے۔ وہ پیچھے لگا ہوا ہے۔ ۹۹ تا ۹۶

کافر جہنم کے سامنے لائے جائیں گے۔ تم اپنی
زندگی میں مزہ لوٹ چکے۔ آج سزا ملے گی۔ ۱۸۸

کافروں کو جہنم میں کھولتا ہوا پانی ملے گا جو آنتوں
کو کاٹ ڈالے گا۔ ۲۷۰ تا ۲۶۶

جہنم میں ایک شہر معدینہ ہے جس میں پیمان شکنوں
کے ہاتھ ہیں۔ جب جہنم سے پوچھیں گے کہ پُر
ہو گئی تو کہے گی کہ اس کے سوا اور کچھ بھی ہے۔ ۵۲۶

معجزہ

ان کے پاس روشن معجزات اور دلائل کے
ساتھ رسول اُچکے۔ ۳۳

میں واضح دلائل لے کر آیا ہوں، واضح
معجزات اور دلائل! ۴۲

قریش نے آنحضرتؐ سے معجزات طلب کیے۔
آپ نے بعض معجزات انہیں دکھائے۔ ۵۹

جس نے دوسرے کو اللہ کا شریک بنایا اُسے
شدید عذاب میں ڈال دو۔ ۵۲۵

قریب کے مکان سے نڈا، سب صیغہ کو حق کے
ساتھ سنیں گے، زمین ان کے اوپر سے پھٹ

جائے گی، وہ تیزی کے ساتھ قبروں سے نکلیں گے
بلاشک و شبہ اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی۔ ۵۴۶

روگردان، قیامت کے منحرف، جزا کا دن کب
ہوگا؟ وہی دن ہے جب انہیں آگ میں جلائیں

گے۔ یہ وہی چیز ہے جس کی جلدی کیا کرتے تھے۔ ۵۹۳ تا ۵۵۸

جنت

پرہیزگار امن و امان میں، باغوں اور چشموں میں،
ریشمی لباس، سوراخین سے تزویج، ہر قسم کے

پھل، موت کی تلخی ختم، یہ اللہ کا فضل ہے۔ ۸۰ تا ۷۶

پرہیزگاروں کے لیے جنت میں صاف پانی،
شرابِ طہور، دودھ اور شہد کی نہریں۔ ۲۷۰ تا ۲۶۶

جنت پرہیزگاروں کے نزدیک ہو جائے گی،
اس کا تم سے وعدہ کیا تھا۔ سلامتی کے ساتھ

جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ۵۳۳

بہشت کہاں ہے، جنت المادوی، سدرۃ المنتقی
کے پاس۔ ۵۷۸

فرشتگان

رقیب و عقید دو فرشتے۔ دائیں طرف رقیب، بائیں طرف عقید۔ اعمال لکھتے ہیں۔
اس کا ہم نشین فرشتہ کہتا ہے کہ اس کا نام اعمال میرے پاس حاضر و تیار ہے۔

۵۱۱

۵۲۵

احکام

جہاد

۲۳۱، ۲۳۸

۲۴۱

۲۵۵

۲۸۲

شہداء کا بلند مقام

اسلام میں جنگ کے مقاصد

تم اللہ کی مدد کرو گے، وہ تمہاری مدد فرمائے گا

منافقین جہاد کے نام سے بھی ڈرتے ہیں

عمرة القضاء

حدیبیہ میں عمرہ ملتوی ہو کر آئندہ سال کیا گیا
اس وجہ سے قضا شمار ہوا۔

۲۰۵، ۲۰۴

تسبیح

طلوع و غروب سے پہلے رات کے ایک حصہ
میں اور سجدوں کے بعد اس کی تسبیح کرو۔

۵۴۲

نماز

اس سے مراد رات کو نماز پڑھنے کے لیے
بیدار رہنا ہے۔

۴۱۰

ادبار السجود سے مراد دو رکعت نافلہ ہے جو مغرب
کے بعد پڑھتے ہو۔ (علیؑ)

۵۴۴

بہت کم راتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ بیدار نہ
ہوں اور عبادت نہ کریں۔

۵۴۰

۵۴۰

۵۴۱

۶۲۳

نماز تہجد کو ہرگز ترک نہ کرنا (علیؑ)

عبادت کے لیے قیام شب کو فراموش نہ کرو

جن وانس کو عبادت کے لیے پیدا کیا

ذکر

۵۴۰

ہر صبح و شام بطور ذکر کہو "لا الہ الا اللہ"

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

۱۷۹

بہشتی انسان کی صفات
مومنین میں قرار و اطمینان جو اللہ پر ایمان و اعتقاد
اور اس کے لطف سے پیدا ہوا تھا، انہیں
ضبطِ نفس پر تسلط کی دعوت دی اور غصہ کی
آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔

۳۹۴

وال

منا

کافر

یہی

مومن

بنی تم

آنحضرت

حجر

پیغمبر

ظالم

پرٹ

- دہ لوگ جو اپنی آواز کو پیغمبر کے سامنے دھیمی رکھتے ہیں، ان کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے کشادہ فرما دیا ہے۔ ۴۲۸
- استہزاء، بدگمانی، غیبت، تجسس اور بُرے القاب بدخلقی ہے۔ ۴۵۸
- اپنی زبان سے مومن کے دل کو جو عشقِ الہی کا مرکز ہے آزار پہنچانا بہت بڑا ظلم ہے۔ ۴۶۰
- غیبتِ مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے ۴۶۳

اقوام سابقہ (بنی اسرائیل)

- ہم نے بنی اسرائیل کو عذاب سے نجات دلائی، منتخب کیا، برتری دی، اپنی نشانیاں دیں انہوں نے کفرانِ نعمت کیا اور سزا پائی۔ ۵۳
- کتاب، حکومت اور نبوت عطا کی، پاکیزہ رزق دیا اور لوگوں پر فضیلت دی، انہوں نے ظلم و برتری کی خواہش کی، اختلاف کیا۔ ۱۰۸
- بنی اسرائیل کی ناشکری، نعمات کی تفصیل ۱۰۴ تا ۱۰۹

اصحاب الایکہ

- قومِ شعیب کی ایک جماعت جو مدین کے علاوہ کہیں اور رہتے تھے۔ ۵۰۴

اصحاب الرّس

- پیامد میں رہتے تھے، ان کی طرف پیغمبر حنظلہ مبعوث ہوئے۔ ۵۰۳

- ادب افضل ترین سرمایہ ہے، آنحضرت کے سامنے مؤدب رہنا بدرجہ اولیٰ۔ ۴۲۶ تا ۴۳۰
- کسی فاسق کی جھوٹی خبر پر پر بلا تحقیق عمل نہ کرنا۔ واقعہ بنی مصطلق۔ ۴۴۰ تا ۴۴۵
- دو فریقوں میں نزاع ہو جائے تو صلح کرا دو ۴۴۷ تا ۴۵۰
- ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائیں، عورتیں ایک دوسری کو طعن و تشنیع نہ کریں، بُرے القاب سے یاد نہ کریں اسلام کے بعد کفر اختیار نہ کریں۔ ۴۵۸

اخلاقِ رؤیلہ

- والدین کے حقوق پامال کرنے والے منافقین اپنے اندازِ گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں ۳۰۰ تا ۳۹۷
- کافر اپنے دلوں میں غم و غصہ و نخوت رکھتے تھے یہی بات ایمان قبول کرنے میں مانع تھی، بلکہ مومنین کو تکلیف پہنچانے کا سبب تھی۔ ۳۹۳
- بنی تمیم کے کچھ لوگ آئے، حُردوں کے عقب سے آنحضرت کو اونچی آواز سے پکارا، اس پر سورہ حجرات کی آیات اُن کی مذمت میں نازل ہوئیں۔ ۴۲۴
- پیغمبر کی محفل میں بلند آواز سے بولنا بے ادبی ہے ۴۲۷
- ظالم کے خلاف جنگ کرو حتیٰ کہ وہ اللہ کی طرف پلٹ آئے۔ ۴۲۹

ایک بزرگ پیغمبر آیا اور کہا میں رسولِ امین ہوں۔ اگر ایمان نہیں لاتے تو دوسروں کو منع

تو نہ کرو۔ ۲۴ تا ۲۰

۱۹۹ موسیٰ کو فرعون کی طرف بھیجا

قوم لوطؑ

۲۰۳ راوشام میں رہتی تھی

۱۹۸، ۱۹۴ عذاب کا ذکر

قوم نوحؑ

۵۱۳ حضرت نوحؑ کی قوم کا ذکر

جن

جب آنحضرتؐ طائف سے واپس ہوئے تو

جنات کی ایک جماعت نے نماز کے دوران

۲۰۸ آپ کی تلادت سنی اور ایمان لائے۔

شخصیات

حضرت ابراہیمؑ

۲۳ قوم نے ابراہیمؑ کو رجم (سنگساری) کی دھمکی دی

تم اور تمہارے خدا قیامت میں ایک دوسرے

۱۵۶ سے کافر ہو جاؤ گے اور لعنت کرو گے۔

قوم تبع

یمن کے تبع بادشاہوں کے زمانہ کی ایک

۲۹۳، ۶۴ قوم اور جماعت۔

قوم ثمود

۵۳۸، ۵۰۳، ۲۰۳ حضرت صالحؑ کی قوم، سرزمینِ حجر میں رہتی تھی

قوم سبا

۲۰۳ سرزمینِ یمن میں رہتی تھی

قوم شعیبؑ

۲۰۳ سرزمینِ مدین میں رہتی تھی

قوم عاد

حضرت ہودؑ نے سرزمینِ احقاف میں قوم عاد

۱۹۳ کو ڈرایا۔

ہم نے عاد کو وہ طاقت دی تھی جو تمہیں (قریش کو)

نہیں دی۔ عذاب کے وقت آنکھوں، کانوں اور

۲۰۰ عقول نے کچھ فائدہ نہ دیا۔

۵۹۵ عاد کی سرگزشت میں بھی ایک نشانی ہے

قوم فرعون

ابوسعید خدریؓ

۲۹۸، ۳۹ لحن القول سے مراد علیؑ سے بغض سے

ابولہبؓ

۲۱۹ نزدیک ترین رشتہ دار ہونے کے باوجود آنحضرتؐ کا صفِ اول کا دشمن تھا۔

ابوماک اشعریؓ

۳۹، ۳۸ اللہ نے تین چیزوں سے ڈرایا: دُھواں
دابۃ الارض، دجال، (رسولِ پاک)

اسامہ بن زیدؓ

۲۳۵ آنحضرتؐ نے اپنے آخری وقت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں اسلامی لشکر کو جمع ہونے اور جنگ پر جانے کا حکم دیا جس پر عمل نہ کیا گیا۔

اسعد البوکربؓ

۵۰۴، ۶۴ یمن کے تبع بادشاہوں میں ایک

حضرت اسماعیلؑ

۴۰۲ ابراہیمؑ نے خواب میں اپنے فرزند (اسماعیلؑ) کو قربان کرتے ہوئے دیکھا۔

۴۰۲

فرزند کو قربان کرنے کے لیے سچا خواب

۵۸۲، ۵۸۱

آپ کے پاس فرشتے مہمان ہوئے

ابن سینا

۱۴۱

دورِ قدیم کا ایک ماہر و مشہور طبیب

حضرت ابوبکرؓ

۳۸۳ آنحضرتؐ سر میں درد کی وجہ سے دو ایک روز خیمہ سے باہر نہیں آئے۔ اس دوران حضرت ابوبکرؓ نے علم سنبھالا اور قلعہ خیمہ کی طرف آئے۔

ابوجہلؓ

۹۸، ۵۸ اس نے آنحضرتؐ سے کہا کہ اپنے جدِ قصی بن کلاب کو زندہ کر لانا کہ ہم اس سے حالاتِ موت دریافت کریں۔

ابوجہزہ ثمالیؓ

۲۲ سورۃ دخان کی تلاوت کے ثواب میں امام محمد باقرؑ کی حدیث بیان کی۔

ابوزر غفاریؓ

۱۶۶ آپ اور قبیلہ غفار کے انبیاء نے پر سورۃ احقاف آیت ۱۱ کی شانِ نزول

اقرع

اشرافِ بنی تمیم کا ایک شخص جس نے اسلام کی برتری کا اعتراف کیا۔

۴۲۴

حضرت ام سلمہؓ (ام المؤمنین)

بعض ازواجِ رسولؐ نے مخصوص لباس کی وجہ سے ان مخدومہ کا مذاق اڑایا۔

۴۵۷

بلالؓ

نیک دل، مفلس، سب سے پہلے اسلام لانے والے سادہ لوگوں میں ایک فرد۔ سورہ احقاف آیت ۱۱ کی شانِ نزول میں شامل۔

۱۶۶

ثنا بٹ بن قیس (صحابی و خطیب)

آپؐ نے آنحضرتؐ کے حکم سے بنی تمیم کے افتخارات کا جواب دیا۔

۴۲۴

وہ میں تھا جو پیغمبر کے سامنے بلند آواز سے بات کرتا تھا، پس میرے اعمال ضبط ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا نہیں، وہ اہل جنت سے ہے۔ اس کا یہ عمل خدمتِ اسلام کے لیے ہوتا تھا۔

۴۲۸

ثقلِ سماعت کی وجہ سے رسولِ پاک کے قریب بیٹھے تھے، جبکہ نہ ملی تو ایک شخص کو ناپسندیدہ طور پر مال کے نام سے پکارا۔

جالینوس

دورِ قدیم کا ایک مشہور و ماہر طبیب

۱۴۱

حضرت امام جعفر صادقؑ (امام ششم)

مبارک رات سے شبِ قدر مراد ہے جس میں

۲۷

قرآن نازل ہوا۔

سیحیٰ بن زکریا اور حسین بن علیؑ پر آسمان روتا رہا

۵۱، ۵۰

بیچ نے اوس و خزرج سے کہا تم یہیں رہ جاؤ۔

پیغمبر کا ظہور ہو جائے گا، اگر مجھے اس کا زمانہ

۶۴

نصیب ہوتا تو میں اس کی خدمت کرتا۔

اگر اللہ نے قرآن کو آسان نہ کر دیا ہوتا تو کوئی

اس کا ایک حرف بھی زبان پر نہ لاسکتا۔ یہ

۸۵

خدا نے ازلی وابدی کلام ہے۔

جو سورہ جاثیہ کی تلاوت کرے گا، آتشِ جہنم کو

نہ دیکھ پائے گا۔ رسولِ پاک کی ہم نشینی نصیب

۸۸

ہوگی۔

خواہشاتِ نفسانی سے ایسے بچو جیسے دشمن

۱۰۴

سے بچتے ہو۔

ان پیشواؤں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام

۱۲۰

قرار دے دیا۔

تین قسم کے لوگ ظالم، بادشاہوں کے ساتھی،

۱۲۴

نفس پرست، واضح مرتکبِ گناہ

- جو شخص ہر جمعہ یا ہر رات سورہ احتفاف کی تلاوت کرے اللہ اس سے دنیا کی وحشت اور خوف اٹھالیتا ہے اور وہ قیامت کی وحشت سے بھی امان میں ہے۔ ۱۴۸
- انبیاء و مرسلین کے سردار پانچ ہیں: نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمدؐ۔ ۲۱۸
- جو شخص سورہ محمد کی تلاوت کرے گا، شک و شبہ اس کے دین میں کبھی داخل نہ ہوگا، ہمیشہ اللہ اور محمدؐ کی امان میں رہے گا۔ ۲۲۵
- جو راہ خدا میں مارے جاتے ہیں یا معرفتِ خدا و رسولؐ و اہل بیتؑ کے حامل اپنی طبعی موت مرتے ہیں، شہید ہیں۔ ۲۴۱
- مومن غلام سات سال کے بعد آزاد ہے۔ سات سال سے زیادہ اس سے خدمت لینا حلال نہیں۔ ۲۴۹
- میرے والد مشکل کام میں غلام کی خود مدد فرماتے تھے ۲۵۱
- تمہارے پاس دل بھی ہے اور کان بھی۔ اللہ جس کی ہدایت کرتا ہے اس کے دل اور کان کھول دیتا ہے۔ ۲۹۰
- بنی امیہ حضرت علیؑ کی ولایت کے بارے میں نزول فرمانِ الہی کو پسند نہیں کرتے۔ ۲۹۴
- اللہ کا غضب اس کا عذاب اور رضا اس کا ثواب ہے۔ ۲۹۵
- اللہ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا جو ان سے کئی گنا بہتر تھے انہیں جانشین مقرر کیا۔ ۳۱۴
- اپنے اموال، اولاد و ازواج کو سورہ فتح تلاوت کر کے محفوظ کر لو، جنت کے باغوں کی بشارت ہو ۳۲۰، ۳۱۹
- ایمان کے سیرھی کی طرح دس درجے ہیں جن سے درجہ بدرجہ اوپر جاتے ہیں۔ ۳۳۷
- اللہ نے ایمان کو سات حصوں میں تقسیم کیا، صدق، یقین، رضا، وفا، علم، حلم میں تقسیم فرما دیا ہے۔ ۳۳۷
- اللہ مومن صادق دعا کرنے والے کی نیت جان لینے کے بعد دعا قبول کر لیتا ہے۔ ۳۷۰
- اللہ کی کچھ ایمان والی امانتیں کفار و منافقین کے صلیبوں میں تھیں، ان کے جدا ہو جانے تک انہیں عذاب نہیں کیا۔ ۳۹۱
- ہم تقویٰ کا کلمہ اور راہ ہدایت ہیں ۳۹۵
- اس سے مراد رات کو نماز پڑھنے کے لیے بیدار رہنا ہے جس کے آثار دن کے وقت ان کے چہروں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ۴۱۰
- مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اس پر ظلم نہیں کرتا نہ اسے تنہا چھوڑتا ہے۔ ۴۱۶
- دین و عقل و حیا و محسن خلق و محسن ادب انسان کی پانچ امتیازی صفات ہیں۔ تکبر کرنے والوں سے ذکرِ خیر کی توقع ہرگز نہ رکھنا چاہیے۔ ۴۳۱
- کیا تمہیں یہ علم نہیں کہ انبیاء کے گھروں میں بجا لیتے جنابت داخل نہیں ہوتے، مومن، مومن کا بھائی، ایک جسم کے اعضاء کی مانند ہے، ایک عضو کو تکلیف ہو تو دوسرے کو قرار نہیں آتا۔ ۴۵۳

- مومن، مومن کا بھائی ہے، وہ اس کی آنکھ کی مانند ہے، کبھی خیانت نہیں کرتا۔ ۴۵۴
- جو مومن کی عیب جوئی کرے اللہ اسے اپنی ولایت سے ولایت شیطان میں منتقل کر دیتا ہے۔ ۴۶۸
- غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کے بارے میں وہ بات کرے جسے اللہ نے پوشیدہ رکھا ہے۔ ۴۶۹
- اسلام کے ساتھ انسان کا خون محفوظ ہے، شادی بیاہ حلال ہوتا ہے لیکن ثواب اعمال پر ملتا ہے ۴۸۲
- اسلام ایمان کے ساتھ شریک ہے لیکن ایمان اسلام کے ساتھ شریک نہیں۔ ۴۸۳
- ہر صبح و شام بطور ذکر دس مرتبہ کہو "لا الہ الا اللہ" ۵۴۳
- صبر و شکیبائی پر آپ کی طویل حدیث بہشتی و نیکو کار سحر کے وقت نماز وتر میں ستر مرتبہ اللہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ ۵۶۷
- اللہ نے دولت مندوں کے اموال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق قرار دیئے ہیں۔ ۵۶۸
- جب دو مومن آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو محافظ اعمال فرشتے الگ ہو جاتے ہیں مبادا کوئی ایسی گفتگویاراز ہو جسے اللہ نے مستور کر رکھا ہو۔ ۵۶۹
- بہت کم راتیں ایسی گزرتی ہیں کہ وہ بیدار نہ ہوں اور عبادت نہ کریں۔ ۵۷۰
- عبادت کے لیے قیام شب کو فراموش نہ کرو ۵۷۱
- جب رزق تقسیم شدہ ہے تو پھر حرص و لالچ کس بنا پر! ۵۸۰
- اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی موت و شخصیت کے مطابق رزق دیتا ہے۔ ۵۸۰
- لوگوں کو آزار نہ پہنچانے اور جھگڑوں کو ختم کرنے سے روزی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ۵۸۰
- جن و انس کو عبادت کے لیے پیدا کیا۔ پوچھا، "خاص گروہ؟" فرمایا، "سب کو" ۶۲۳
- خدیفہ میمانی**
- علاماتِ قیامت، ظہور و جمال، نزولِ عیسیٰ، عدن سے آگ اٹھانا اور دھواں (رسولِ پاک) ۳۸
- حسان بن ثابت**
- بنی تمیم کے شاعر کے بیان کردہ افتخارات کا جواب دیا۔ ۴۲۴
- حضرت امام حسن (امام دوم)**
- آپ کے تابوت کو بغرضِ دفنِ روضہ رسول پر لے جانا اور حضرت عائشہؓ کا انکار ۴۳۴
- حضرت امام حسین (امام سوم)**
- اے زمانہ تجھ پر افسوس ہے تو اچھا دوست ثابت نہیں ہوا۔ ۱۲۸

زہری

ایک مشہور تابعی۔ اس کا قول ہے کہ کوئی فتح
حدیبیہ سے بڑھ کر نہیں تھی۔

۳۲۶

سہیل بن عمرو

مشرکین مکہ کا نمائندہ، حدیبیہ میں آنحضرتؐ
سے گفتگو کے لیے آیا۔

۳۰۸/۳۲۳

شامول

یہودیوں کا سب سے بڑا عالم جس نے تیج
سے گفتگو کی۔

۶۵

حضرت شعیبؑ

آپؐ کی قوم نے آپؐ کو رجم (سنگساری)،
کی دھمکی دی۔

۴۳

شعیبہ بن ربیعہ

طائف کی راہ میں ان کے سرسبز باغ تھے

۲۰۷

شیطان

اس کا ہم نشین کہے گا کہ میں نے اسے سرکشی
کے لیے نہیں اُبھارا تھا۔ وہ خود ہی دُور دراز
کی گراہی میں تھا۔

۵۲۶

امام حسنؑ کی میت بھاری رسولؐ میں دفن نہ کرنے کا
حضرت عائشہؓ کا بلند آواز میں انکار و شور و غوغا
اور آپؐ کا آیت لا ترفعوا اصواتکم.....
تلاوت فرمانا۔

۳۳۳

اے کریم و بزرگ لوگوں کے بیٹو! صبر کرو، موت
صرف ایک پل ہے جو تمہیں مقام رنج سے مقام
راحت کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

۵۲۲/۵۲۱

اللہ نے بندوں کو اس لیے پیدا کیا کہ خالق کو پہچان
لیں پھر اس کی عبادت کریں اور غیر کی عبادت سے
بے نیاز ہو جائیں۔ (امام جعفر صادقؑ)

حئی بن اخطب

ایک یہودی سردار (أم المؤمنین صفیہؓ کا والد)

خالد بن ولیدؓ

رسولِ پاکؐ نے ولید بن عقبہ کے بیان کی تحقیق
کے لیے بھیجا تو اس نے بنی مصطلق کا صاحب
ایمان ہونا بیان کیا۔

۳۳۸

ذی نیرہؓ

ایک رومی کینز مکہ میں رہتی تھی، مسلمان ہو گئی تو
ابو جہل نے اس پر تشدد کیا۔

۵

عبدالرحمن ابن ملجم

۳۴۰

حضرت علی علیہ السلام کا قاتل

عبداللہ ابن سلام

۱۶۳

ایک یہودی عالم جس نے رسول پاک کی تصدیق کی تو یہودیوں نے اسے گالیاں دیں اور جھوٹا کہا ۱۶۴

سورہ احقاف، آیت ۱۱ کی شان نزول میں

۱۶۷

بھی آپ کا ذکر ہے۔

عبداللہ ابن عباس

۱۷۵

اگر مدت حمل نو ماہ ہو تو رضاعت اکیس ماہ ہونی چاہیے۔ مدت حمل چھ ماہ ہو تو رضاعت دو سال ہے۔

۱۷۶

چالیس سال کی عمر میں بھی جس کی نیکی برائی پر

۱۸۶

غالب نہ آئے وہ جہنم کے لیے آمادہ ہو۔

۱۳۹

جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب

۲۱۸

ہمک زمین پر ایک بھی بت پرست مشرک

۱۸۶

باقی ہے۔

اولوالعزم پیغمبر پانچ ہیں۔

عبدالرحمن بن ابوبکر

دوست دار علیؑ تھا۔ مروان کو نیرید کے لیے بیعت

۱۸۶

لینے پر مجبور کیا۔

حضرت صالح

۵۹۸

اپنی قوم سے کہا بس تین دن کی مہلت ہے، عذاب کے منتظر رہو۔

حضرت صفیہ (ام المومنین)

۴۶۰

آپؑ نے رسول پاک سے شکایت کی کہ عائشہ مجھے یہودی کی لڑکی کہتی ہے۔

صہیب رومی

۱۶۶

نیک دل مگر سادہ مفلس لوگ، ابتدا اسلام لائے، سورہ احقاف آیت ۱۱ کی شان نزول میں جن کا ذکر ہوا۔

حضرت عائشہ (ام المومنین)

۱۸۶

مروان سے کہا کہ تو ابھی پشت پدر میں تھا کہ رسول پاک نے تجھ پر لعنت فرمائی۔

۴۳۴

جو اہل رسولؐ میں امام حسنؑ کو دفنانے سے انکار

۴۶۰

جناب صفیہؓ پر طعن

عباس ابن عبدالمطلب

۴۲۸

بحکم رسولؐ جنگ حنین میں بھاگنے والوں کو بلند آواز سے پکارا۔

- کچھ فرشتے اللہ کی طرف سے روزانہ نازل ہو کر
 ۱۳۶ بنی آدم کے اعمال دیکھتے ہیں۔
 بھٹی ہوئی کلہی، نرم روٹی افطار کے وقت پیش
 ۱۹۲ کی گئی۔ سائل آیا آپ نے اُسے دے دی۔
 جو معرفتِ خدا و رسولِ و اہل بیت رکھتے ہوئے
 ۲۳۱ اپنے بستر پر بھی مرے وہ شہید ہے۔
 ۲۲۹، ۲۳۸ اپنے ہاتھوں کی کمائی سے ایک ہزار غلام آزاد کیے
 قبر سے فرمایا مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ تجھ
 ۲۵۱ سے بہتر لباس پہنوں۔
 قرآن کی ترتیل سے سوچ سمجھ کر تلاوت کرنا اور
 اپنے درد کی دوا اس میں تلاش کرنا اہل ایمان
 ۲۹۰، ۲۸۹ کا شیوہ ہے۔
 بات دیر تک دل میں چھپی نہیں رہتی، یکایک
 ۲۹۸ زبان پر آہی جاتی ہے۔
 جو دشمن ایسی صلح چاہے جس میں اللہ کی رضا
 ۳۰۸ ہو تو نہ ٹھکراؤ۔ (ماکبِ اشتر سے)
 ۳۲۲ حضرت علیؑ نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ تحریر فرمایا
 وہ اپنے آپ کو متم کرتے ہیں، اپنے اعمال سے
 ڈرتے ہیں جس وقت ان میں کسی ایک کا تذکرہ و
 ۳۲۳ تعریف کی جائے۔ (خطبہ بہام)
 ہر آنے والا دن کہتا ہے اے انسان نیک
 کام کرتا کہ میں تیرے کام کی قیامت میں
 ۳۳۸ گواہی دوں۔

عتیب بن ربیعہ

۲۰۷ طائف کی راہ میں ان کے سرسبز باغ تھے

عثمان بن عفان

۲۰۸، ۳۲۳ مشرکین مکہ سے بات کرنے گئے، قتل کی شہرت
 ہوئی، پھر زندہ واپس آئے۔

عداس

۲۰۷ عتبہ و شیبہ ابن ربیعہ کا عیسائی غلام تھا جسے انکور
 دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا، آپ کی تبلیغ
 سے وہ مسلمان ہو گیا۔

عروہ بن مسعود ثقفی

۳۲۲ مشرکین مکہ کا نمائندہ جو حدیبیہ میں آنحضرتؐ
 سے گفتگو کرنے آیا۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ (امامِ اول)

۵۲، ۵۱ نوشیروان کے آثار پر ایک ساتھی نے شعر پڑھا۔
 فرمایا یہ کیوں نہ پڑھا فما بکت
 روایات اہل بیت سے ہے کہ **إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ**
 سے امیر المؤمنینؑ مراد ہیں۔
 ۶۹ پوچھا کون سی طاقت غالب ہے؟ فرمایا خواہشاتِ نفسانی
 ۱۲۳

جہنم میں ایک شہر حصینہ ہے جس میں پیمان شکنوں

۳۵۲، ۳۵۱

کے ہاتھ ہیں۔

بشکل، بزدلی اور حرص ایسی صفات ہیں جو اللہ

۳۵۷

کے بارے میں سوئے ظن میں جمع ہیں۔

اللہ نے ہمارا صدق و خلوص دیکھا تو ذلت و خواری

۳۷۱

و دشمنی پر اور کامیابی و نصرت کو ہم پر نازل فرمایا۔

میں ایسے لوگوں میں بھنس گیا کہ حکم کی اطاعت

۳۹۶

نہیں کرتے، دعوت کو قبول نہیں کرتے۔

ادب کی رعایت و زینت کے لیے فاخرہ لباس

کی طرح ہے۔ ادب انسان کو اپنے بزرگوں پر

۴۳۰

فخر کرنے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

جو شخص بُرا گمان رکھتا ہو وہ ہر شخص سے ڈرتا

۴۶۴

اور وحشت رکھتا ہے۔

گناہ سرکش سواروں کی مانند ہیں لیکن تقویٰ آرام دہ

۴۷۸

اور سبک سواری ہے۔

تقویٰ محکم اور شکست ناپذیر قلعہ ہے، انسان صرف

۴۷۹

تقویٰ کے ذریعہ گناہ سے بچ سکتا ہے۔

وہ تمام موجودات کے ساتھ ہے مگر اس طرح نہیں

۵۱۲

کہ ان کے قرین ہو، تمام موجودات سے جدا ہے

لیکن اس طرح نہیں کہ ان سے الگ ہو۔

سکرات موت اپنے پاس کی ہر چیز کو کھودینے

۵۱۶، ۵۱۵

کی حسرت کے ساتھ ہجوم کرتی ہے۔

علم و دانش نے حقیقت بصیرت کے ساتھ ان کا

۵۱۹

رنج کیا ہے۔

ادبار السجود سے مراد دو رکعت نماز نافلہ ہے

۵۴۴

جو تم مغرب کے بعد پڑھتے ہو۔

۵۷۰

نماز تہجد کو ہرگز ترک نہ کرنا

حضرت امام علی بن الحسین (امام چہارم)

کوئی بندہ میری خواہشات کو اپنی خواہشات

پر مقدم نہیں کرتا، مگر یہ کہ میں اس کی تمام تر

توجہات کو آخرت کی طرف مبذول کر دیتا

۱۲۳

ہوں۔ فرمان خدا

اولو العزم پیغمبر پانچ ہیں۔ نوح، ابراہیم، موسیٰ

علیؑ اور محمدؐ، کیونکہ یہ مشرق و مغرب، جن و

۲۱۷

انس کے لیے مبعوث ہوئے۔

تم کسی کو اسیر کرو، سواری نہ ہو اور وہ پیدل نہ

۲۴۴

چل سکے تو اسے رہا کر دو۔

۲۴۹

ایک غلام کو آزاد کرنے کا واقعہ

اپنی قوم کے بُرے آدمیوں کو دوسری قوم کے

افراد سے اچھا سمجھنا ایسا تعصب ہے جو گناہ

۳۹۷

کا سبب ہے۔

جو تجھے تعلیم دیتا اور تربیت کرتا ہے اس کا احترام

کرے تو ایسا ہے گویا علم خدا کے لیے حاصل کیا۔

۴۳۳

(استاد کے احترام میں طویل حدیث)

موت مومن کا غلیظ و کثیف لباس اتار کر پاکیزہ و معطر

لباس پہن لینا ہے اور کافر کا عمدہ لباس اتار کر گندہ و

۵۲۱، ۵۲۰

اودہ لباس پہننا ہے۔

آپ کے قتل کی نسبت زمانہ (دہر) کی تعبیر استعمال ہوئی۔

۱۲۹

فرعون

متکبر اور تجاؤز کرنے والوں میں سے تھا
کسایہ تو جادو گر ہے

۵۳

۵۰۰

فضیل بن یسار

امام جعفر صادقؑ کے صحابی جنہوں نے امام کے اکثر اقوال بیان کیے۔

۴۸۳

قصی بن کلاب

آنحضرتؐ کے چہرہ مجہدین زندہ کرنے کی
ابو جہل نے طنزاً خواہش کی۔

۵۸

حضرت لوط علیہ السلام

فرشتوں کا قوم لوط کی طرف جانا

۵۸۸

حضرت ماریہ (ام المومنین)

ماریہ والدہ نریت ابراہیم کے پاس ان کے چچا زاد کا
آنا، حضرت علیؑ کا تعاقب کرنا، پھر آنحضرتؐ سے
صحیح حال عرض کرنا۔

۴۳۹

حضرت امام علیؑ ابن موسیٰ رضاؑ (امام ہشتم)

۲۴۱ سب سے پہلے شہید بہشت میں جائیں گے
اللہ کے بارے میں اپنے ظن و گمان کو اچھا رکھو کہ
اللہ تم سے اچھا سلوک کرے۔
۳۴۵ ہم کلمہ تقویٰ اور اللہ کی مضبوط رستی ہیں
۳۹۵ ایمان اسلام سے ایک درجہ بلند ہے اور تقویٰ
ایمان سے ایک درجہ اونچا ہے۔
۴۷۹ اس نے دنیا کی چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد
۶۰۷ پیدا کیا ہے۔ (طویل حدیث)

عمار ابن یاسر

نیک دل، سادہ، مفلس لوگ ابتداءً اسلام لائے،
شان نزول سورہ احقاف، آیت ۱۱

حضرت عمر بن خطاب

۱۹۲، ۱۹۱ مشرکہ ام ابراہیم کا واقعہ
۳۲۳ حدیبیہ میں مشرکین مکہ سے بات کرنے میں عذر کیا
جنگ خیبر میں ایک روز علم سنبھالا، قلعہ کی طرف
گئے، کامیابی نہ ہوئی۔
۳۸۳ قلم دوات، کاغذ لانے سے منع کیا۔ (واقعہ قرطاس) ۴۳۶

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

- حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
- جو شب و روز جمع سورہ دخان کی تلاوت کرے
اللہ اُسے جنت میں گھر دے گا۔ ۲۲
- جو رات کو سورہ دخان پڑھے اس کے لیے ستر ہزار
ذشتے استغفار کریں گے۔ ۲۲
- قیامت کے نزدیک دجال کا ظہور، عیسیٰ کا نزول
عدن سے آگ اور آسمان پر دھواں چھا جائے گا
جو چالیس روز تک رہے گا۔ ۳۸
- قیامت کی دس نشانیاں۔ حدیث بذریعہ جناب امیر
آسمان کے ایک دروازہ سے مومن کے اعمال اوپر
جاتے ہیں اور دوسرے سے رزق نازل ہوتا ہے۔
وہ مر جائے تو دونوں دروازے گریہ کرتے ہیں۔ ۵۱
- بیع کو بُرائے کہو وہ ایمان لا چکا تھا
جو سورہ جاثیہ کو تلاوت کرے اللہ اُس کے عیب
چھپالے گا، خوفِ اطمینان سے بدل جائے گا۔ ۸۸، ۸۷
- ایام اللہ خدا کی نعمات کے ایام ہیں۔ آزمائش
اہتلاؤں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ۱۰۶
- زمانہ کو گالی نہ دو، اللہ ہی زمانہ ہے
فرزند آدم زمانہ کو گالی دے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے
میں زمانہ ہوں۔ ۱۲۸
- جو سورہ احقاف کی تلاوت کرے آیت کے ہر جملہ
سے اُسے دس گنا نیکیاں ملیں گی۔ ۱۴۸
- شیطان اُن کے مُنہ پر ہاتھ بھرتا ہے جو چالیس
سال کے ہو کر بھی توبہ نہیں کرتے۔ ۱۴۹
- کس سے نیکی کروں؟ فرمایا ماں سے، پھر ماں سے
پھر ماں سے، پھر باپ سے۔ ۱۸۰، ۱۷۹
- ایسے لوگ جن کے طیبات دُنیا میں دیے گئے،
ہمارے طیباتِ آخرت کا ذخیرہ ہیں۔ ۱۹۲
- دُنیا و آخرت میں پلک بھینکنے کا فاصلہ ہے ۲۱۸، ۲۱۹
آنحضرت صبر و استقامت کا نمونہ تھے۔ ۲۱۹ تا ۲۲۲
- سورہ محمد اکا قاری انہارِ جنت سے سیراب ہوگا ۲۲۶
میری بعثت سے لے کر آخری مُسلمان دجال سے
لڑتا رہے گا، جہاد جاری رہے گا۔ ۲۳۶
- شہادت سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں۔ مجاہدین
راہروانِ جنت کے قائد ہوں گے۔ ۲۳۹
- عرضہ محشر میں انبیاء بھی شہداد کے احترام میں
سوار یوں سے اتر جائیں گے۔ ہر شہید ستر ہزار
لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ ۲۴۰
- جو حصولِ علم کے راستے میں مر جائے وہ شہید ہے ۲۴۱
غلاموں کی آزادی کے لیے جبریلؑ مجھ سے بار بار
سفارش کرتے رہے۔ ۲۵۰
- جس شخص کا بھائی اس کا زیر دست ہے وہ جیسا
خود کھائے اُسے بھی کھلانے۔ ۲۵۱
- اللہ تین گناہ معاف نہ کرے گا: زوجہ کے مہر
کا انکار، مزدوری غصب کرنا اور انسانوں کو
فروخت کرنا۔ ۲۵۲، ۲۵۳

- ۳۸۲ میں تجھ سے اس آبادی اور اس کے اہل میں جو خیر ہے، اس کا طلب گار ہوں۔
- ۳۸۳ خدا کی قسم! یہ علم ایسے مرد کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے۔
- ۴۰۷ دنیا میں کوئی مٹی، پتھر کا گھر یا خیمہ ایسا نہ ہوگا جس میں اللہ نے اسلام داخل نہ کیا ہو۔
- ۴۱۴ تم میرے اصحاب ہو میرے بھائی تو وہ ہیں جو بعد میں آئیں گے۔
- ۴۲۲، ۴۲۱ حُسنِ ادب پر آپ کی طویل حدیث تاخیر و تحقیق اللہ کی طرف سے ہے، جلد بازی شیطان کی طرف سے۔
- ۴۳۹ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، وہ ہرگز اس پر ظلم نہیں کرتا اور حوادث کے مقابلہ میں تنہا نہیں چھوڑتا۔
- ۴۵۳ دینی بھائی دونوں ہاتھوں کی طرح ہیں جو ایک دوسرے کو دھوتے ہیں۔
- ۴۵۵، ۴۵۴ مومن اپنے مومن بھائی پر تین آہن رکھتا ہے۔ (طویل حدیث)
- ۴۶۱ میں ایسی ہیں جن کا وجود مومن میں پسندیدہ نہیں جبکہ ان سے راہ فرار موجود ہے۔
- ۴۶۴ اللہ نے مسلمانوں کا خون، مال و عزت و آبرو دوسروں پر حرام کر دی اور بدگمانی بھی۔
- ۴۶۶ سُود کا درہم چھتیس زنا سے بڑھ کر ہے اور مسلمان کی آبرو سُود سے بڑھ کر ہے۔
- ۲۵۹ مشرک نے تلوار کھینچ کر کہا: "اب آپ کو کون بچانے گا۔ فرمایا: "اللہ"
- ۲۶۳ تو محبوب شہر ہے۔ اگر یہ نہ نکالتے تو میں تجھے نہ چھوڑتا۔ (ابن عباسؓ)
- ۲۷۴ (دوائگیاں اٹھا کر، میری بعثت اور قیامت ان دو کی طرح متصل ہیں۔
- ۲۷۵ فقدانِ علم، جہالت، شراب و زنا کی کثرت، قیامت کی نشانیاں ہیں۔
- ۲۷۶ قربِ قیامت پر آپ کی حدیث۔ عصر و مغرب کے درمیانی وقت کی مثال
- ۲۸۱ تا ۲۷۸ اشراط الساعت پر حدیث۔ سلمان فارسیؓ سے طویل گفتگو۔
- ۲۸۷ شرابی، جادوگر، قطع رحمی کرنے والا ہرگز جنت میں داخل نہ ہوں گے۔
- ۳۰۴ جس طرح نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں اسی طرح برائیاں نیکیوں کو مٹا دیتی ہیں۔
- ۳۱۳ امت میں بہترین لوگوں سے کون مراد ہیں؟ فرمایا: (سلمانؓ کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر) یہ اور اس کی قوم جو شخص سورہ فتح پڑھے ایسا ہے گویا حدیبیہ میں اس نے درخت کے نیچے میری بیعت کی اور فتح مکہ میں میرے ساتھ رہا۔
- ۳۲۵ اللہ سے حسن ظن رکھنا جنت کی قیمت ہے
- ۳۷۵ تین شخص ایسے ہیں جن سے اللہ بات تک نہ کرے گا

- ۵۶۷ آخر شب مجھے تہجد کے لیے زیادہ محبوب ہے
تین چیزیں گناہوں کا کفارہ ہیں جن میں ایک
تہجد پڑھنا ہے۔
- ۵۷۰ جو دو رکعت نمازرات کی تاریکی میں پڑھی
جائے دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہے۔
- ۵۷۰ جو شخص اپنے آپ کو پہچان لے گا وہ اپنے اللہ
کو پہچان لے گا۔
- ۵۷۵ توحید نصف دین ہے اور روزی کے نزول
کا سبب راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے۔
- ۵۸۰
- حضرت امام محمد باقرؑ (امام پنجم)**
- فرض و نافلہ نمازیں سورہٴ دخان کی تلاوت،
دائیں ہاتھ میں نامہٴ عمل، قیامت میں امان،
زیر سایہٴ عرشِ مقام۔
- ۲۲ مبارک رات شبِ قدر ہے، قرآن ایک ہی
مرتبہ بیت المعمور کی طرف نازل کیا، پھر
درجہ بدرجہ ۲۲ سال تک نزول۔
- ۲۷ یہود و نصاریٰ اپنے پیشواؤں کے لیے نماز،
روزے بے جا نہیں لائے۔ ان پیشواؤں نے
حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا۔
- ۱۲۰ گذشتہ انبیاء و اوصیاء کا باقی ماندہ علم
آپؐ نے حلوہ کھانے سے انکار کیا اور آیہ
اذہبتم طیباتکم.... تلاوت فرمائی۔
- ۱۹۲
- ۲۶۷ یومسلمانوں کے پوشیدہ امور افشاء کرے، اللہ اس
کے راز فاش کر دیتا ہے۔
- ۲۶۷ جس نے غیبت سے توبہ کر لی وہ آخری شخص
ہے جو جنت میں داخل ہوگا۔
- ۲۶۷ غیبت کی تاثیر جذام کے اثر سے بڑھ کر ہے
اللہ نے جاہلیت کے تنگ و عیب اور بزرگوں پر
فخر کرنے کو ختم کر دیا۔
- ۲۷۴ صرف دو گروہ: صاحبانِ تقویٰ اور بدکار
لوگو! تمہارا اللہ ایک ہے، باپ بھی ایک ہے،
عرب کو عجم پر کوئی فضیلت نہیں۔
- ۲۷۵ اللہ تمہارے گھرانوں، نسب اور جموں کو نہیں
دیکھتا، دلوں کو دیکھتا ہے۔
- ۲۷۵ تم سب اولادِ آدمؑ ہو جو مٹی سے پیدا ہوئے۔
آباد و اجداد کے ذریعہ فخر کرنے سے گریز کرو۔
- ۲۷۶ اسلام ظاہری چیز ہے لیکن ایمان کی جگہ دل ہے
جو سورہٴ ق کی تلاوت کرے گا، اللہ اس پر مشکلات و
سکراتِ موت آسان کر دے گا۔
- ۲۹۱ جب انسان بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اللہ وہی نیک
اعمال جو وہ حالتِ صحت و قیام میں کیا کرتا تھا،
اس کے لیے لکھتا ہے۔
- ۵۱۰ ان للموت سکوات؛ موت کے لیے سکرات ہے
آنحضرتؐ کو صبر کی تلقین اور نزولِ آیت "لقد
خلقنا السّٰوات"
- ۵۲۵

میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ، دریا کو کھلا
چھوڑ دو۔ غرق ہونے والا لشکر، باغات و
چشتے چھوڑ گئے۔

۴۹ تا ۳۵

جو کتاب موسیٰ پر نازل ہوئی پیشوا اور حمت تھی

۱۶۹

بعد کے انبیاء کو واضح طور پر بیان کیا۔

۵۹۳

ہم نے موسیٰ کو فرعون کی طرف بھیجا

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ (امام ہفتم)

باباجان ہیں جس کی نماز پڑھ رہا تھا وہ ان گزرنے

۵۰۸

والوں کی نسبت مجھ سے زیادہ قریب تھا۔

۵۲۲

موت تصفیہ کا ایک ذریعہ ہے

اللہ تعالیٰ نے جن و انس کو عبادت کے لیے

۶۲۱

پیدا کیا، نافرمانی نہ کریں۔

نضر بن حارث

یہ آنحضرتؐ کے پاس مسجد الحرام میں بیٹھا تھا،

اس نے اور دیگر قریش نے کہا محمدؐ جو کتاب ہے

۹۸

ہیں اس کی سفارش کی ضرورت نہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام

قوم نے آپؑ کو رجم (سنگساری کی دھمکی دی) ۳۳

ۛ

کوئی قطرہ اللہ کو خون (شہید) کے قطرہ سے زیادہ
محبوب نہیں۔

۲۴۰، ۲۳۹

جاؤ تم آزاد ہو، مجھے پسند نہیں کہ اہل جنت سے
خدمت لوں۔

۲۴۹

ان لوگوں نے ہر اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے
علیؑ کے حق میں نازل فرمائی۔

۲۹۲، ۲۵۷

اعمال کی حفاظت ان کی بجا آوری سے زیادہ
مشکل ہے۔

۳۰۵، ۳۰۴

جو ہمیشہ واجب و مستحب نمازوں میں سُورۃ ق
تلاوت کرے گا، اللہ اس کی روزی وسیع اور
قیامت کا حساب آسان کر دے گا۔

۴۹۱

حضرت امام محمد تقیؑ (امام نہم)

موت وہی نیند ہے جو ہر رات تمہیں آتی ہے مگر

یہ کہ اس کی مدت طولانی ہے، بیداری قیامت

۵۲۱

میں ہوگی۔

مروان بن حکم

معاویہ کے دور میں مدینہ کا گورنر جس نے یزیدؑ

۱۸۶

کے لیے بیعت لینا چاہی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

میں تمہارے لیے واضح دلیل لے کر آیا ہوں

۴۲

بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔

۲۱۴	ترمذی
۶۰۴	جان الدر۔ ایک محقق
	برجی زیدان (عیسائی مؤرخ) اسلام غلاموں پر
۲۵۲	مہربان ہے۔
۷۱، ۴۱، ۳۹، ۳۴، ۲۶	راغب (صاحب مفردات)
۲۳۱، ۲۲۹، ۲۱۶، ۲۰۹، ۱۳۷، ۱۰۲	
۵۸۳، ۵۶۰، ۵۳۸، ۵۰۷، ۳۴۱، ۲۹۷	
۵۸۳، ۵۷۷، ۲۲۸، ۱۶۸	زمخشری (مفسر)
۶۰۴	ژرژرگاموف۔ (دانشور)
۲۹۸	سیوطی۔ مفسر صاحب درفشور
۱۷۸	طباطبائی
۱۷۸، ۱۶۷، ۹۵	طبری
۵۶۷، ۲۴۴	فاضل مقداد
۳۱۴، ۱۷۸، ۳۷	فخر الدین رازی
۶۰۴	فرد ہویل (مؤلف مرزبانے نجوم)
۳۱۴، ۱۶۷	قرطبی
۵۷۳	کرسی مورسین (دانشور، ماہر طبیعیات)
۲۹۸	گنجی (علامہ)
۲۸	مجلسی (علامہ)

کُتب آسمانی

انجیل

قرآن تورات و انجیل کی تصدیق کرتا ہے ۱۶۹

ولید بن عقبہ

آنحضرتؐ نے نبی مصطلق سے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا۔ واپسی پر بتایا کہ وہ زکوٰۃ دینے سے انکاری ہیں ۲۳۸

ولید بن مغیرہ

ولید اور ابوہبل کا مکالمہ اپنے بھتیجیوں سے کہا کہ تم میں جو اسلام قبول کرے گا میں اس کی مدد نہیں کروں گا۔ ۵۲۸

حضرت ہود علیہ السلام

ہود کی داستان یاد دلاؤ جب عاد کو احقاف میں ڈرایا۔ ۱۹۴

علماء و دانشور

۲۹۸	آوسی (صاحب روح المعانی)
۲۹۸	ابن اثیر
۲۳۴	ابن عربی
۳۱۴، ۱۸۶	ابوالفتوح رازی (مفسر روح البیان)
۳۱۴	بیہقی

ہم نے یہ قرآن آسان کر دیا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اگر نصیحت حاصل کریں تو تم کامیابی اور وہ شکست کے منتظر رہیں۔ ۸۵ تا ۸۳

سورہ جاثیہ

مضامین :

یہ نئی سورہ توحید، قرآن کی عظمت اور گمراہوں کی تنبیہ پر مشتمل ہے۔ ۸۷

ثواب تلاوت :

اللہ تعالیٰ کے عیوب چھپانے کا، خوف کو امن سے بدل دے گا۔ (رسول پاک) آتش جہنم کو نہ دیکھ پائے گا۔ رسول کی ہم نشینی نصیب ہوگی۔ (امام جعفر صادق)

۸۸، ۸۷

یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی جو غالب و دانا ہے۔ ۸۹

یہ قرآن ہدایت ہے، منکر کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۱۰۱

قرآن اور شریعت لوگوں کے لیے بینائی، ہدایت اور رحمت کا وسیلہ ہے۔ ۱۰۹

سورہ احقاف

مضامین :

عظمت قرآن، معاد، عدالت پروردگار ۱۳۷

یہ گواہی انجیل میں بھی ہے "مثلہم فی الانجیل" ۴۰۵
اصحاب رسول کی صفات جو انجیل میں بیان ہوئیں ۴۱۰، ۴۱۱

تورات

تورات جو موسیٰ پر نازل ہوئی لوگوں کے لیے پیشوا اور رحمت تھی۔ بعد کے انبیاء کے اوصاف بیان کیے۔ ۱۶۹

اس کی گواہی تورات میں بھی ہے "مثلہم فی التورات" ۴۰۵

اصحاب رسول کی صفات جو تورات میں بیان ہوئیں ۴۱۰، ۴۱۱

قرآن

سورہ دخان

مضامین :

مبارک و معاد، قرآن کے بارے میں گفتگو، توحید اور کائنات میں اللہ کی عظمت اور نشانیاں۔ ۲۱

ثواب تلاوت :

آنحضرت اور ائمہ کی احادیث۔ قاری کے لیے ستر ہزار فرشتے استغفار کریں گے۔ نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں۔ ۲۲

اس واضح کتاب کی قسم جسے ہم نے مبارک رات میں نازل فرمایا۔ ۲۳

ثوابِ تلاوت :

قاری کو دنیا میں موجود ریت کے ذروں سے

دس گنا زیادہ نیکیاں ملیں گی۔ (حدیثِ رسولؐ) ۱۴۸

یہ کتاب عزیز و حکیم خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے ۱۴۹

سورہ محمد

مضامین :

زمین کی سیر، گزشتہ اقوام، جنگ

۲۲۴

ثوابِ تلاوت :

قاری کو اللہ انہما جنت سے سیراب کرے گا۔

۲۲۵

(رسولِ پاکؐ)

یہ کتاب صرف تلاوت کے لیے نہیں بلکہ اس میں

۲۸۸

ذکر، تدبیر اور انداز ہے۔

سورہ فتح

مضامین :

حدیبیہ سے واپسی پر آنحضرتؐ کا چہرہ بپاش ہوا۔

سورہ فتح نازل ہوئی جسے آپؐ نے بیان فرمایا۔

سات حصے بشارتِ فتح، صلح حدیبیہ، نزولِ سکینہ،

پیغمبر کا مرتبہ، منافقین کی رسوائی، ان کے نامناسب

تقاضے، معذورین جہاد اور مؤمنین کی خصوصیات و

۳۱۸، ۳۱۷

صفات۔

ثوابِ تلاوت :

قاری گویا اس سفر میں آنحضرتؐ کے ہمراہ رہا،

صلح حدیبیہ کے وقت بیعتِ رسولؐ کی حدیث

۳۱۹

(عبداللہ ابن مسعود)

قاری کے اموال، اولاد، ازواج محفوظ، جنت

۳۲۰، ۳۱۹

میں داخلہ۔ (امام جعفر صادقؑ)

سورہ حجرات

مضامین :

۳۱۹

بیشتر اخلاقی مضامین بیان ہوئے ہیں

ثوابِ تلاوت :

قاری کو ان افراد کی تعداد سے جنہوں نے اللہ

کی اطاعت یا نافرمانی کی دس گنا نیکیاں دی

۳۲۰

جائیں گی۔ (رسولِ پاکؐ)

ہردن یا رات میں قاری زائرینِ رسولؐ میں

شمار ہوگا۔ (امام جعفر صادقؑ)

سورہ ق

مضامین :

معاذ کے مطالب، عاد و ثمود، قوم فرعون و لوطؑ و

۳۹۰

شعیب اور تبتح کے حالات کا بیان ہے۔

ثوابِ تلاوت :

اللہ تعالیٰ قاری پر مشکلاتِ موت و سکرانہ کو آسان

۳۹۱

کر دے گا۔ (رسولِ پاکؐ)

۲۲۰، ۲۰۸	السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)
۹۷، ۹۸	الغزیر
۴۶۴، ۴۳۵	المراجعات
۵۹۳	المنجد
تا ۲۳۹، ۱۲۴ تا ۱۱۰، ۳۹، ۲۸	بهار الانوار
۳۳۷، ۳۲۴، ۲۵۳، ۲۵۱، ۲۳۹، ۲۳۱	
تا ۴۳۰، ۳۲۶، ۳۲۰، ۳۲۵، ۳۲۴	
۴۷۹، ۴۷۸، ۴۵۵، ۴۳۵، ۴۳۲	
۶۲۳، ۵۷۱، ۵۷۰، ۵۲۳، ۵۲۱، ۵۱۰، ۵۰۹	
۴۳۶، ۴۲۸، ۲۰۷	بخاری
۲۵۱	تاریخ تمدن اسلام
۲۵۳، ۲۲۸، ۱۸۹، ۱۷۸، ۱۲۱، ۵۸	تفسیر المیزان
۴۸۲، ۴۴۹، ۳۴۹، ۳۲۲، ۲۹۵	
۵۹۴، ۵۲۸، ۴۸۴	
۴۳۵، ۱۹۲	تفسیر برہان
۳۸۸، ۳۴۹، ۳۴۰، ۳۲۲، ۵۸	تفسیر تبیان (طوسی)
۴۲۶	تفسیر جوامع الجوامع
۲۹۸، ۲۱۸، ۱۲۰، ۶۴، ۵۱، ۳۹	تفسیر در المنثور
۵۶۷، ۵۵۱، ۳۹۴، ۳۲۶، ۳۱۴	
۴۸۲، ۴۷۴، ۴۱۴، ۳۰۴، ۲۵۹، ۱۲۱	تفسیر روح البیان
۵۸۳، ۵۲۴، ۵۱۵، ۴۸۶	
۳۲۲، ۱۹۶، ۱۸۶	تفسیر روح البیان (ابوالفتوح)
۳۸۸، ۳۴۰	

واجب و مستحب نمازوں میں سورہ ق پڑھنے والے
کی اللہ روزی وسیع فرمادے گا۔ (امام محمد باقرؑ)
ہمارے پاس وہ کتاب ہے جس میں ہر چیز محفوظ ہے ۴۹۳، ۴۹۲

سورۃ ذاریات

مضامین:

۵۵۲	قیامت و فرشتوں و کفار کی جزا و سزا سے مربوط مسائل
	ثواب تلاوت:
	دن یا رات کو سورۃ ذاریات کی تلاوت کرنے والے
	کی اللہ تعالیٰ روزی وسیع اور قبر کو منور فرمادے گا۔
۵۵۳، ۵۵۲	(امام جعفر صادقؑ)

کتب تفسیر و تاریخ و سیر

۶۰۵، ۶۰۴	آغاز و انجام جہاں
۶۰۵	آفرینش جہاں
۲۹۸	احقاق الحق
۲۹۸	استیعاب (ابن عبدالبر)
۳۳۷، ۲۸۷، ۲۱۸، ۱۵۵، ۱۲۳، ۸۲	اصول کافی
۴۵۳، ۴۴۶، ۴۳۴، ۴۱۶، ۳۹۴	
۵۳۹، ۵۱۱، ۴۸۳، ۴۶۷، ۴۶۲	
۵۳۵	
۶۶، ۶۵	اعلام القرآن

۲۲۸، ۲۸۸، ۳۳۰، ۱۲۴، ۱۲۱، ۴۳	تفسیر مرغی	۷۳، ۷۱، ۶۵، ۶۴، ۵۸، ۳۷	تفسیر روح المعانی
۲۲۲، ۲۲۲	تفسیر مفاتیح الغیب (فخر رازی)	۲۵۸، ۲۲۸، ۲۲۶، ۱۸۰، ۱۷۶	
۲۲۱، ۱۵۵، ۱۲۰، ۱۰۶، ۸۲، ۶۹، ۲۸	تفسیر نور الثقلین	۳۳۹، ۳۳۰، ۳۲۲، ۲۹۸، ۲۷۶	
۲۹۰، ۲۸۶، ۲۸۱، ۲۷۵، ۲۳۹، ۲۲۶		۵۲۸، ۵۱۰، ۴۳۳، ۳۸۸	
۳۹۵، ۳۹۴، ۳۹۱، ۳۲۷، ۳۲۶، ۳۱۹		۳۳۹، ۳۲۲، ۲۸۲	تفسیر صفائی
۳۳۶، ۳۳۸، ۳۲۸، ۳۱۰، ۳۰۲، ۳۹۷		۳۰۲، ۲۸۱، ۱۰۵، ۲۷	تفسیر علی ابن ابراہیم
۶۰۸، ۶۰۷، ۵۸۰، ۵۱۰، ۵۰۸		۲۷۵، ۲۷۲، ۱۹۶، ۱۸۰ (قطب)	تفسیر فی ظلال القرآن (قطب)
۶۰۷	توحید (صدوق)	۳۲۸، ۳۰۳، ۳۲۴، ۳۲۲، ۳۱۸	
۳۱۹، ۲۲۵	ثواب الاعمال	۳۸۲، ۳۷۶، ۳۳۸	
۲۹۸	جامع الاصول	۲۶۳، ۱۹۹، ۱۶۷، ۱۲۸، ۱۲۱، ۷۲	تفسیر قرطبی
۵۴۹، ۳۹۵، ۳۷۵، ۲۸۷	خصال (صدوق)	۳۸۸، ۳۳۹، ۳۰۷، ۳۹۱، ۳۸۸، ۲۷۵	
۵۹۳	دائرة المعارف وپنجا	۵۴۹، ۳۸۶، ۳۷۴، ۳۵۸	
۳۱۰، ۲۷۸	روضۃ الواعظین	۳۱۸	تفسیر قمی
۲۹۸	ریاض نضرہ	۳۱۴، ۱۹۹، ۱۷۸، ۱۱۲، ۷۳ (فخر الدین رازی)	تفسیر کبیر (فخر الدین رازی)
۵۷۵	سفری بر اعماق وجود انسانی	۳۳۹، ۳۲۲، ۲۲۸، ۱۶۸، ۵۸	تفسیر کشاف
۵۷۵، ۲۴۲، ۱۹۲، ۵۲	سفینۃ البحار	۵۸۲، ۵۷۸	
۳۶۰، ۳۲۳	سیرۃ ابن ہشام	۶۵، ۶۴، ۵۸، ۵۱، ۵۰، ۳۷، ۲۸	تفسیر مجمع البیان
۲۵۱، ۲۵۰، ۲۳۵	شراعیع الاسلام	۱۹۲، ۱۷۸، ۱۶۷، ۱۲۸، ۱۱۰، ۹۵، ۷۱	
۳۳۱	صاح الملت	۲۵۷، ۲۳۸، ۲۳۶، ۲۲۶، ۲۲۵، ۲۰۸	
۳۷۶، ۳۳۶، ۳۱۳، ۲۰۷	صحیح مسلم	۳۱۹، ۳۱۸، ۳۱۴، ۲۹۴، ۲۷۷، ۲۷۵	
۶۲۲	علل الشرائع	۳۸۸، ۳۶۹، ۳۳۹، ۳۳۰، ۳۲۴، ۳۲۲	
۳۶۴	غرر الحکم	۳۵۸، ۳۳۸، ۳۳۲، ۳۲۸، ۳۰۵، ۳۰۳	
۲۴۴	فروع کافی	۵۶۷، ۵۴۴، ۵۴۳، ۳۸۶، ۳۸۲، ۳۶۰	

۲۶۷	آسن: بدبو	۲۹۸	فضائل (احمد)
	آفقا: مادہ 'الف' ناک، صاحبِ عزت و	۵۹۳	قاموس مقدس
۲۲۸	حیثیت لوگ	۳۷۳، ۳۲۲	کامل ابن اثیر
	آختموهم: شمن (بروزن شمن)، ٹھوس	۲۹۸	کفایت الطالب
۲۳۳	اور سخت ہونا، دشمن پر غلبہ پانا	۵۶۷، ۴۵۱، ۲۳۵	کنز العرفان
	اشیم: مادہ 'اٹم' گناہوں میں غرق رہنے والا،	۵۶۰، ۵۳۸، ۲۳۳، ۷۱	لسان العرب
۹۷، ۷۲	صیغہ مبالغہ	۴۶۶، ۴۵۳، ۴۳۳	مجموعہ البیضاء
	احقاف: حقیقت (بروزن رزق) کی جمع۔ ریت	۶۰۳	مرزبانئے نجوم
	جو ہوا چلنے سے مستطیل اور ٹیڑھی شکل	۲۰۷	مشد احمد حنبل
۱۴۸	میں جمع ہوتی رہتی ہے، قوم عاود کا مسکن۔	۵۲۲	معانی الاخبار
	ارتقب: مادہ رقبہ (بروزن طلبہ) گردن، مراد	۱۳۷، ۱۰۲، ۷۱، ۴۱، ۳۹، ۳۳، ۲۵	مفردات راغب
۸۴	گردن اٹھا کر انتظار کرنا۔	۳۴۰، ۲۹۷، ۲۳۱، ۲۲۹، ۲۱۶، ۲۰۹	
۴۱۱	أزر: مادہ 'موازرہ' معاونت	۵۸۳، ۵۶۰، ۵۳۸، ۵۰۷	
	أزلفت: مادہ 'زلفی' (بروزن کبریٰ) قرب،	۳۷۲	مقدمہ ابن خلدون
۵۳۵	نزدیکی۔	۴۱۰	من لایحضرہ الفقیہ
۴۱۱	أستغلاظ: مادہ 'غلظت' سخت، مستحکم	۳۷۱، ۳۵۷، ۳۰۸، ۲۹۸، ۲۹۰، ۲۲۱	منج البلاغہ
	اسحار: سحر (بروزن بشر) کی جمع۔ پوشیدہ،	۴۳۰، ۳۹۷، ۳۹۶، ۳۷۷، ۳۷۶	
۵۶۶	نہال، مخفی۔	۵۲۰، ۵۱۶، ۴۷۹، ۴۷۸	
۲۷۴	أشراط: شرط (بروزن شرف) کی جمع علامات	۵۷۰، ۵۶۸، ۴۶۸، ۲۵۰، ۲۴۹، ۲۲۳	وسائل الشیعہ
	اصلاح بال: زندگی بھر کے امور کو سنوارنا،		
۲۲۹	مکمل کرنا، سدھارنا		
	أضغان: مادہ 'ضغن' (بروزن حرص)۔		
۲۹۷	سخت و شدید کہنا۔		

لغات قرآن

(۱)

آثارہ: (بروزن حلاوہ) کسی چیز سے باقی رہ جانے والا حصہ۔

بطش: (بروزن نقش) مضبوطی سے پکڑنا،

جنگ و جدال، سزا کے لیے گرفت میں لینا ۵۳۷، ۳۶

(ت)

- ۴۹۳ تیغ: شاہانِ مین کا لقب
تحمید: مادہ 'حمید' (بروزن صید) ناپسند کرنا،
بھاگنا۔ ۵۱۶
تدمر: مادہ 'تدمیر' ہلاک کرنا، نیست و نابود کرنا ۱۹۹
تذیلوا: مادہ 'زوال'، زوال، متفرق ہونا ۳۹۱
تعذروہ: مادہ 'تعزیر'، سزا کرنا ۳۴۹
تفسار: تعس (بروزن نخس) ڈگدگانا، منہ کے بل کرنا ۲۵۶
تفیضون: کسی کام میں خلل ڈالنے کی غرض سے
داخل ہونا۔ ۱۶۰
تلاوت: مادہ 'تلو' (بروزن فکر) بات کو مسلسل
بیان کرنا۔ ۹۵
تلقی: دریافت، اخذ ضبط ۵۰۹
توسوس: مادہ 'وسوسہ' غیر مطلوب افکار و جمل
میں گزرتے ہیں۔ ۵۲۷
توقروہ: مادہ 'توقیر' سنگینی۔ یہاں تعظیم کے
معنی میں۔ ۳۴۹

(ج)

جاشید: جم غفیر، ٹولے، عدالت میں گھنٹوں کے
بل بیٹھنا۔ ۱۳۴

- آف: گندگی و میل جو ناخن کے نیچے جمع ہوجاتی ہے ۱۸۴
افالک: صیغہ مبالغہ، بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا ۹۷
اقفال: مادہ 'قفول'، قفل کی جمع، واپس لوٹ جانا ۲۸۸
القی السمیع: کان میں ڈالے، توجہ و انہماک سے سُننے ۵۲۹
امتحان: مادہ 'امتحان'، سونے کو گھسیلا کرخالص کرنا،
آزمائش۔ ۴۲۸
امعا: معی (بروزن سعی) کی جمع، آنت، شکم کے
اندرونی چیزیں۔ ۲۶۸
اصلی: طویل آرزوئیں ۲۹۲
انصتو: مادہ 'انصات'، خاموشی و یکسوئی سے سُننا ۲۰۹
اواب: مادہ 'اوب' (بروزن ذوب) بازگشت
واپسی۔ ۵۲۵
اودیۃ: وادی کی جمع۔ درہ اور پانی بہنے کی جگہ ۱۹۸
اوزار: وزر کی جمع، بھاری بوجھ، گناہ ۲۴۰
اوزعنی: مادہ 'ایزاع'، ہدایت کرنا، برائی سے روکنا
توفیق دینا۔ ۱۷۶
ایجاس: مادہ 'وجس' (بروزن مکث) مخفی آواز
پہنائی و اندرونی احساس۔ ۵۸۵
ایدا: (بروزن صید) قدرت و قوت ۶۰۳
ایکہ: جنگل کے مشابہ گھنے درخت ۵۰۳

(ب)

ماسقات: باسقہ کی جمع، مرتفع و بلند ۵۰۰

درجات: درجہ کی جمع، سیڑھیاں، اوپر چڑھنے والی ۱۸۵

درکات: درک کی جمع، سیڑھیاں، نیچے اترنے والی ۱۸۵

دین: قیامت کا ایک نام، جیسے یوم الدین،

روز جزا۔ ۵۵۷

(ذ)

ذاریات: ذاریہ کی جمع، چیزوں کو اڑانے والی

تیز ہوائیں۔ ۵۵۵

ذنب: بڑے کام کے آثار و نتائج ۳۳۰

ذنوب: (بروزن قبول) لمبی دم والا گھوڑا، حصہ ۶۲۵

(مر)

راغ: 'رُوغ' (بروزن شوق) پوشیدہ منصوبہ پر چلنا ۵۸۳

رجز: (بروزن حرص) اضطراب، لرزہ، بد نظمی ۱۰۲

رس: کنواں، مختصراً اثر جو باقی رہ جائے ۵۰۳

رقیب: مراقب، نگران، محافظ ۵۱۱

رکن: ستون، پایہ اصلی، چیز کا اہم حصہ ۵۹۶

رمیمہ: مادہ 'ریمہ' (بروزن منہ) بوسیدہ ہڈیاں ۵۹۷

(مر)

زقوم: تھوہر کا درخت، بدبودار، بدذائقہ،

نفرت انگیز پودا۔ ۶۲

ۛ

جاریات: جاریہ کی جمع۔ جاری پانی کی لہریں، کشتی

سورج، نوجوان لڑکی۔ ۵۵۶

(ح)

حاق: مادہ 'سوق'، داخل ہونا، نازل ہونا، جاگنا

حباک: (بروزن کتب) راستے بل، شکن، باندھنا

محل کرنا۔ ۵۵۹

حجرات: مادہ 'حجر' (بروزن اجر) حجرہ کی جمع،

منع کرنا۔ (حجرہ دوسرے لوگوں کو حرم زندگی

میں داخل ہونے سے مانع ہے۔ ۴۲۹

حشر: جمع کرنا، ہر طرف سے اکٹھا کرنا

حفیظ: محافظ، نگران، حمد و پیمان کی حفاظت

حمیت: مادہ 'حمی' (بروزن حمد) آگ، حرارت،

خشم آلود تعصب۔ ۳۹۳

حمیمہ: کھولتا ہوا پانی، گہرا دیکھا دوست

(خ)

خراص: مادہ 'خرص'، جوبات گمان یا اندازہ

کی بنا پر کہی جاتے۔ ۵۶۱

خطب: اہم کام ۵۸۹

(د)

دائرہ: اچھے یا بڑے حوادث و روئیداد جو انسان

کو پیش آتے ہیں۔ ۳۳۰

شعوب: شعب (بروزن صعب) کی جمع

۴۷۲

ایک عظیم گروہ

شہید: مادہ 'شہود' متعدد معنی، فرشتگان

رحمت کا مشاہدہ، حضورِ قلب کا

۵۳۹/۲۳۹

مالک شخص۔

(ص)

صاعقہ، صاعقہ: دونوں کے معنی شدید

۵۹۸

آواز کے ساتھ نیچے گرنا۔

صبرفتا: مادہ 'صرف'، کسی چیز کو ایک

۲۰۸

سے دوسری میں تبدیل کرنا۔

صترہ: مادہ 'صر' (بروزن شر) باندھنا،

۵۸۵

والبشگی، شدت سے چیننا۔

صکت: مادہ 'صک' (بروزن شک)

۵۸۵

شدت سے چہرہ پر مارنا۔

(ط)

۵۰۰

طلع: کھجور کا پھل جب ظاہر ہونے لگے

(ظ)

۵۳۰

ظلام: صیغہ مبالغہ، نہایت ظلم کرنے والا

(ع)

عارض: مادہ 'عرض' یہاں وہ بادل مراد ہے

۱۹۸

جو آسمان پر پھیل جائے۔

(س)

۵۶۲

ساہون: مادہ 'سہو' ہر طرح کی غفلت

۲۳۰

سقاوا: انہیں پلایا جائے گا

۵۱۵

سکر: (بروزن فکر) پانی کی راہ کو مسدود کرنا

سلطان: جو چیز تسلط کا سبب بنے، معجزہ، قوی

۵۹۵

دلیل و منطق یا دونوں۔

سکرت الصوت: ہستی سے مشابہ حالت، شدید

اضطراب و بے چینی جو موت کے وقت

۵۱۵

لاحتی ہوتی ہے۔

۲۳۴

سکینتہ: مادہ 'سکون'، دلی آرام و اطمینان

۵۸۴

سمین: موٹا تازہ

۳۴۱

سوء: (بروزن توقع) نامطلوب

۷۲

سوار: درمیان، مرکز، ہر طرف سے برابر فاصلہ

۴۱۱

سوق: ساق کی جمع، پٹلی، ٹانگ، قدم

سؤل: مادہ 'سؤل' (بروزن قفل) ایسی حاجت

۲۹۲

جس کا نفس تریص ہو۔

(ش)

۷۲

شجرہ: صفت، کبھی پودہ کے معنی میں بھی آیا ہے

شریعت: راستہ جو پانی تک پہنچنے کے لیے دریا

۱۱۲

کے کنارے بنایا جاتا ہے۔

۴۱۱

شطا: چوزہ، ٹہنی جو تنے میں سے چھوٹی ہے

(ق)

- قاب : اندازہ، کمان کو درمیان سے پکڑنے کی
 ۳۲۸ جگہ سے مڑی ہوئی نوک تک کا فاصلہ
 قرن : دو یا کئی چیزوں کا باہم قریب ہونا ایسی
 دو جماعتیں جو ایک زمانہ میں موجود ہوں
 ۵۳۷ عرصہ ۳۰ سال یا ستائیس سال۔
 ۵۰۹ قعیید : مادہ قعود، بیٹھنا، مامور، نگران
 قلب : عقل، علم، فہم کے معانی میں استعمال
 ۵۳۸ ہوا ہے۔
 قوس : کمان۔ بعض نے قیاس کے مادہ سے
 ۳۲۹ مقیاس معنی لیے ہیں۔

(ل)

- لا تلمزوا : مادہ لمز (بروزن طنز) عیب نکالنا،
 ۴۵۹ طنز کرنا۔
 لتاقلنا : مادہ اقل، جھوٹ، حق سے انحراف
 ۱۹۶ لحن : لفظ کے اعراب بدل دینا۔ بُرے طریقہ
 ۲۹۷ سے قرأت کرنا۔
 لعب : ایسا کھیل جس میں خیالی نظم و نسق پایا جائے
 ۳۱۰ لعنتہ : مادہ لعنت، ایسے کام میں پڑنا جس
 کے عواقب خوفناک ہوں، ٹوٹی ہوئی ہڈی
 ۴۴۲ پر دباؤ پڑنا۔ مشقت

- ۶۰۵ عبد : اپنے مالک سے تعلق رکھنے والا انسان
 عتوا، مادہ عتوا، (بروزن غلو) اطاعت سے
 ۵۹۸ روگردانی۔
 ۵۱۱ عتید : مادہ عتاد، (بروزن جہاد) ذخیرہ کرنا۔
 ۵۸۳ عجل : (بروزن طفل) پچھڑا
 ۱۹۱ عذاب الہون : حقارت و توہین آمیز عذاب
 عزم : پختہ ارادہ کرنا، صبر، ایفائے عہد، حکم و
 ۲۱۶ شریعت۔
 ۵۲۷ عنید : مادہ عناد، تکبر، خود پسندی، حق کا انکار

(غ)

- غمرہ : زیادہ پانی جو کسی جگہ کو ڈھانپ لے
 ۵۶۲ جہالت و نادانی جو کسی کو ڈھانپ لے۔

(ف)

- ۵۹۹ فاسق : فرمان خدا کی حدود سے باہر قدم نکالنے والا
 فاعتلوه : مادہ عتل (بروزن قتل) پکڑنا، گھسیٹنا،
 ۷۲ پھینکنا۔
 فاکھون : پھلوں سے استفادہ کرنا، فکاہت،
 ۴۹ دل لگی کی باتیں کرنا۔
 فتناء : مادہ فتنہ، سونے کو کھٹالی میں کندن بنانا،
 ۵۶۳، ۴۱ آزمائش، امتحان۔
 فوز : کامیابی و خیرات کا سلامتی کے ساتھ حصول ۳۴۰، ۲۳۳

۳۸۹ معکوفاً: مادہ 'عکوف' نہ چلنا، ساکن رہنا
 ۴۵۰ مقسطنین: مادہ 'قسط' عادلانہ حصہ
 ۵۲۷ متاع: صیغہ مبالغہ، بہت زیادہ منع کرنے والا
 ۳۶ منتقمون: مادہ 'انتقام' سزا دینا
 مولیٰ: مادہ 'ولای' دو چیزوں کا باہمی رابطہ (۲۷۷ معنی ہیں)
 ۲۵۸، ۶۸ سرپرست، دوست، مددگار
 ۷۲ مہل: پگھلی ہوئی دھات

(ن)

۵۹۶ نبذناہد: ہم نے ان کو پھینک دیا
 نستسخ: مادہ 'استساخت' ایک چیز کو دوسری
 سے زائل کرنا۔
 ۱۳۵ نضید: تراکم، تہ بہ تہ، ایک دوسرے کے اوپر
 ۵۰۰ نفع: پھونکنا، نفع، ایک بار پھونکنا
 ۵۱۷ نفر: مل کر سفر کرنے والی جماعت (تین سے دس
 تک کی جماعت)
 ۲۱۰ نقبوا: مادہ 'نقب' دیوار یا چڑھ میں سوراخ کرنا
 ۵۲۸ نقیب: جمعیت کے بارے میں بحث و تحقیق
 کرنے والا۔
 ۵۳۸

(و)

وثاق: رسی یا زنجیر جس سے دشمن کو باندھا گیا
 قید کیا جائے۔
 ۲۳۴

۵۶۶ لغوب: لعب، نشتگی، تکان
 ۲۳۳ لقاء: ملاقات، دشمن سے ٹکریٹ
 ۳۱۰ لہو: بے مقصد کھیل، بے مقصد شغل

(م)

۶۰۵ ماہد: مادہ 'مہد' گہوارہ، آرام و راحت کی جگہ
 ۱۳۴ مبطل: مادہ 'ابطال' بھوٹ بولنا، ہنسی مذاق اڑانا
 مثل: ایسی گفتگو جو اس مطلب کے مشابہ کے بارے
 میں کی گئی۔
 ۲۳۱ معجید: مادہ 'مجد' وسیع شرافت
 ۴۹۴ محیص: مادہ 'حیص' (بروزن حیص)، انحراف
 عدول، فرار، شکست
 ۵۳۸ مریب: مادہ 'ریب' شک میں پڑا ہوا
 ۵۲۸ مریج: مادہ 'مرج' (بروزن مرج)، مختلط
 مشوش، مشتبیہ (چراگاہ)
 ۴۹۶ مسرفین: مادہ 'اسراف' ہر قسم کا تجاوز
 ۵۴ مسومہ: ایسی چیز جس پر نشان لگا ہوا ہو، مہر
 چھاپ۔
 ۵۹۰ مصیراً: مختلف حالات
 ۳۴۲ معتد: متجاوز جو دوسروں کے حقوق میں متجاوز ہو
 یا احکام الہی کی حدود سے تجاوز کرے۔
 ۵۲۸ معرضون: مادہ 'اعراض' نشہ پھیرنا
 ۱۵۱ معترہ: مادہ 'ع' (بروزن شر) خارش کی بیماری۔
 ۳۹۰ ضروریاں

ہم نے آسمان وزمین کو چھ دن (ادوار) میں بنایا،
طلوع وغروب سے پہلے، رات کے ایک حصہ میں
اور سجدوں کے بعد اس کی تسبیح کرو۔
۵۴۳ تا ۵۴۰

ابراہیمؑ کے مہمان

ابراہیمؑ کے مہمانوں کی نمبر پہنچو؛ بھٹنا ہوا گوشت لائے
مگر نہ کھایا، بیٹے کی بشارت، بڑھیا بانچھ بیوی کا اظہار
تعب، تیرے رب نے اسی طرح کہا ہے۔
۵۸۶ تا ۵۸۲

ادب افضل ترین سرمایہ ہے

رسول اللہ کا سفیر ہے، اس کا ادب اللہ کا ادب
ہے، اونچی آواز سے بولنا بے ادبی ہے، گذشتہ
سے توبہ کرو، اللہ غفور و رحیم ہے۔
۴۳۶ تا ۴۳۰

استہزاء، بدگمانی، غیبت وغیرہ ممنوع ہیں

ذائق اڑانے اور استہزاء کے واقعات، غیبت کی
مثال اور حماقت۔
۴۶۳ تا ۴۵۸

اسلام اور ایمان کا فرق

زبان پر شہادتین جاری کرنے والا داخل اسلام
ہے، ایمان باطنی امر ہے، اس کی جگہ انسان
کا دل ہے۔
۴۸۳ تا ۴۸۲

۵۰۸ ورید: مادہ 'ورود' پانی کی تلاش میں جانا
وقر: (بروزن فکر) بھاری بوجھ، کانوں کا بھاری پن
۵۵۵ ثقل سماعت۔

۶۲۶ ویل: وہاں بولا جاتا ہے جہاں ایک یا کئی فرد ہلاکت
میں جا پڑیں۔ افسوس

(ی)

۲۱۰ یجدرکم: مادہ 'ایجار' فریاد کو پہنچنا، عذاب سے
بچانا، پناہ دینا، حفاظت کرنا
۳۱۱ یحکمکم: مادہ 'احقا' مطالبہ و سوال پر اصرار کرنا
۱۳۴ یخسر: مادہ 'خسران' سرمایہ کو ضائع کر دینا
۴۲۸ یغضون: مادہ 'غض' (بروزن حظ) نگاہ یا آواز
کو کم کرنا، نیچی کرنا، کوتاہ کرنا۔

۴۲۸ یلعبون: مادہ 'لعاب' تھوک سے تشبیہ،
بے مقصد کام، کھیل
۳۴

۵۹۴ یم: سمندر، نیل جیسے بڑے دریا کو بھی کہتے ہیں
۱۴۲ یوم لقاء اللہ: اللہ سے ملاقات کا دن
۵۶۵ یہجعون: مادہ 'ہجوع' رات کو سونا

متفرق موضوعات

آسمانوں اور زمین کا خالق مُردوں کو زندہ
کرنے پر قادر ہے

ہم نشین فرشتہ کے پاس اعمال نامہ موجود ہے۔
ہر کافر و مکبر کو جہنم میں ڈال دو۔ قول شیطان؛
میں نے سرکشی کے لیے نہیں اُجھارا۔ وہ خود
مگر اسی میں پڑا ہوا تھا۔

۵۲۲ تا ۵۲۵

اولاد کی پرورش میں ماں کی تکلیف

باپ کے مقابلہ میں بچوں کی پرورش میں ماں
کی تکلیف زیادہ ہیں۔

۱۷۹

آیام اللہ سے مراد

تین دن، ظہورِ امام کا دن، موت یا روزِ قیامت

۱۰۶

اے انسان اپنے والدین سے نیکی کر

ہم نے وصیت کی کہ والدین سے نیکی کر۔ اولاد
کی پرورش میں والدین کا کردار۔ جو احسان تو نے
مجھ پر اور میرے والدین پر کیے ان کا شکر بجالانے
کی توفیق دے، میری اولاد کو صالح بنا۔

۱۸۱ تا ۱۷۱

ایک لمحہ کے لیے آسمان کی طرف دیکھو

ہم نے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا، اس میں
کوئی شکاف نہیں۔ پُر برکت بارش سے مَرُوہ
زمین کو زندہ کیا، مُردوں کو زندہ کرنا بھی اسی
طرح ہے۔

۵۰۱ تا ۴۹۸

اسلام لانے پر احسان نہ جتلاؤ

مسلمان ہو کر تم نے اللہ پر احسان کیا نہ رسول پر
بلکہ یہ تم پر اللہ کا احسان ہے۔

۴۸۸ تا ۴۸۶

اسلام میں جنگ کے مقاصد

جنگ کو خلافِ اقدار سمجھا گیا، لیکن قومی وجود کو
خطرہ ہو تو جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

۲۳۳ تا ۲۳۱

اگر حدیبیہ میں جنگ ہو جاتی

اگر مشرکین مکہ حدیبیہ میں تمہارے ساتھ جنگ
کرتے تو بھاگ کھڑے ہوتے اور کوئی ولی و یاور
نہ پاتے۔

۳۹۱ تا ۳۸۶

ان پر آسمان نے گریہ کیا نہ زمین نے

اس آیت سے مراد حقارت، ہمدردوں اور
دوستوں کا فقدان ہے۔

۵۰

انسان کی بہترین صفت تقویٰ ہے

تمہارے کنبے قبیلے تو تعارف و پہچان کے لیے بنائے
ہیں، البتہ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو متقی و پرہیزگار ہے

۴۷۲ تا ۴۷۱

انسان کے ہم نشین فرشتے و شیاطین

آنحضرتؐ نے ایک درخت کے نیچے اصحاب سے دوبارہ بیعت لی کہ اب ان لوگوں سے بیعت ناگزیر ہے۔

۳۶۸ تا ۳۷۱

پرہیزگار اور نعماتِ جنت

امن وامان، باغ و چشمے، ریشمی لباس، حورالعین سے تزویج، انواع و اقسام کے پھل، موت کی تلخی ختم، یہ اللہ کا فضل ہے۔

۸۰ تا ۸۰

پہلی موت کیا ہے؟

وہی موت جو دنیوی زندگی کے بعد آئی، جنت میں بطور خوشخبری اس کا ذکر ہوا۔

۸۰ تا ۸۲

پچھے رہ جانے والوں کا عذر

پچھے رہ جانے والوں کی سرزنش اور قلبی کیفیت کا اظہار ہوا۔ پھر وہ توبہ میں بھی مخلص نہیں ہیں ۳۵۳ تا ۳۵۸

پچھے رہ جانے والوں کا اب ساتھ چلنے پر اصرار

جو حد میں آنحضرتؐ کے ساتھ نہیں تھے وہ خیبر میں چلنے کی آرزو رکھتے ہیں۔

۳۶۳ تا ۳۶۷

ۛ

باغیوں سے جنگ کی شرائط

باغیوں کی جنگ اور دو مومنوں کے درمیان نزاع، دو مختلف موارد ہیں۔ زیر بحث آیت دو مومن مردوں کے درمیان نزاع کو بیان کرتی ہے ۳۵۰ تا ۳۵۲

بنی اسرائیل کی آزمائش

ہم نے بنی اسرائیل کو منتخب کیا، نعمتیں دیں، انہوں نے کفران کیا تو مورد عذاب ہوئے۔

۵۲ تا ۵۶

بہشتی انسان کی صفات

توفیق شکر اور توبہ، والدین و اولاد کے لیے دعائیں

۱۷۹

بے جا و رسوا کن صلح

کبھی ہمت نہ ہارو، رسوا کن صلح کی دشمن کو دعوت نہ دو، اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

۳۰۶

بیعت اور اس کی خصوصیات

بیعت کے معنی و تشریح، احادیث رسول پاک اور ارشادات جناب امیرؓ

۳۷۱ تا ۳۷۸

بیعت رضوان والوں سے اللہ کی خوشنودی

پیغمبر کی سخاوت

کھلے دل سے مہمان کی پذیرائی کرنا ۵۸۴، ۵۸۶

تجسس نہ کرو

کسی کی داخلی زندگی کے راز معلوم کرنا منع ہے لیکن حکومت کو معاشرہ کی حفاظت کے لیے

جاسوسی کا حق ہے۔ ۳۶۶، ۳۶۵

تم اللہ کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کرے گا

اللہ کی مدد کرنا اس کے دین کی مدد کرنا ہے۔

طاہرات کے ساتھیوں کا ثابت قدمی سے

جاہلوت کے لشکر کو شکست دینا۔ ۲۵۹ تا ۲۵۵

تم نے روگردانی کی تو تم سے بہتر لوگ تمہاری جگہ آجائیں گے

زندگی ایک کھیل ہے، ایمان و تقویٰ اختیار

کرو، اجر پورا ملے گا۔ راہِ خدا میں خرچ کرنے

سے بخل کرتے ہو، اللہ بے نیاز ہے۔ وہ تم

سے بہتر لوگ لے آئے گا۔ ۳۱۰ تا ۳۱۳

تمہاری چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی فرشتے لکھتے ہیں

پیغمبران اولوالعزم کی طرح صبر کرو

ان کے لیے عذاب میں جلدی نہ کرو۔ عذاب تو

ان کے لیے طے ہو چکا ہے جب یہ دوزخ کے

سامنے پیش کیے جائیں گے تو دیکھ لیں گے۔ ۲۱۲ تا ۲۱۶

پیغمبران اولوالعزم کون ہیں؟

بزرگ انبیاء کا ایک گروہ خاص جو صاحبانِ شریعت

تھے۔ نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد (پانچ) ۲۱۶

پیغمبر کا سچا خواب

جدید بیہوشی سے پہلے کا خواب، لوگوں کا عمر کیے بغیر

واپس آنا اور شک میں پڑنا جبکہ خواب ایک

سال بعد پورا ہونا تھا۔ (نکات) ۴۰۰ تا ۴۰۲

پیغمبر کی بارگاہ کے آداب

پس حجرہ سے آواز دو، شور و آواز بلند نہ کرو،

اعمال ضبط ہو جائیں گے۔ ۳۲۵ تا ۳۲۰

پیغمبر کی بیعت اللہ کی بیعت ہے

عمل کرو، اللہ اس کا رسول اور مومنین (آئمہ)

تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ ۳۴۷ تا ۳۵۲

انسان کے دائیں بائیں ساتھ رہنے والے دونوں فرشتے اعمال لکھتے ہیں، زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالتا کہ فرشتے لکھنے کو آمادہ ہوتے ہیں۔ ۵۱۱ تا ۵۰۶

ثواب ضائع ہونے کے اسباب

حسد، احسان جتنا اور تکلیف پہنچانا جیسے عمل سے مومنین کے اعمال بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ ۳۰۳

جس دن انسان کے اعمال بد ظاہر ہو جائیں گے

ان کے کرمات کی برائیاں ان پر ظاہر ہو جائیں گی جس کی وہ ہنسی اڑاتے تھے۔ ۱۴۴ تا ۱۴۳

جسمانی اور روحانی سرزائش

روحانی سرزائش کو حقارت، ڈانٹ ڈپٹ اور سرزائش سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ۷۵

جنات ایمان لاتے ہیں

طائف سے واپسی پر جنوں کے ایک گروہ نے آنحضرتؐ سے تلاوت سنی، ایمان لائے، اپنی قوم کو تبلیغ کر کے دوسروں کو مسلمان کیا۔ ۷۱۲، ۲۰۵

جنت کی صفات

صاف پانی، دودھ اور شہد اور شرابِ طہور کی نہریں، پرہیزگاروں کے لیے، جبکہ جہنم میں وہ پانی جو آنتوں کو کاٹ ڈالے۔ ۲۶۶ تا ۲۷۰

حالتِ کفر میں مرنے والے بخشے نہیں جائیں گے

کافر ہو گئے، لوگوں کو راہِ خدا سے رسولؐ کی مخالفت کی، اعمالِ اکارت ہو گئے، حالتِ کفر میں مرے، بخشش نہ ہوگی۔ پس اللہ و رسولؐ کی اطاعت کرو۔ ۳۰۱ تا ۳۰۳

حقیقتِ تقویٰ

قرآنی آیات سے تقویٰ کی وضاحت، انسان کا عظیم ترین امتیاز۔ ۲۷۷

حمیتِ جاہلیت کیا ہے

حمیت اگر جاہلیت کے ساتھ نہ ہو تو محدود معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ۳۹۲ تا ۳۹۸

خدا اور خلقِ خدا کی طرف توجہ

متقیین و محسنین رات کے آخری حصوں میں اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، زکوٰۃ سے اللہ کی مخلوق کی خدمت کرتے ہیں۔ ۵۶۹ تا ۵۷۱

خدا غنی مطلق ہے

خدا ہر شخص اور ہر چیز سے بے نیاز ہے، دعوت

عبودیت میں اس کا کوئی مفاد نہیں۔

۶۱۶

خدا کے بارے میں سوئے ظن رکھنے والے

خدا کے وعدوں اور بے پایاں رحمت کے بارے

میں سوئے ظن رکھنے والے ناقص الایمان بلکہ

بے ایمان ہیں۔

۳۲۳ تا ۳۲۵

خدا کی نشانیاں تمہارے وجود میں ہیں

انسانی وجود، اعضاء و جوارح، آنکھ، ناک، کان

سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔

۵۴۲ تا ۵۴۴

خدا کی نشانوں سے معاہدے کیے آماجگی

تو تیرے، تغافل، غور و فکر، صبر، ایمان، ہوش و حواس

کی آماجگی کے بغیر استفادہ ممکن نہیں۔

۵۸۰، ۵۷۹

خدا کی ہدایت اور ارادہ کی آزادی

تمام انسانوں میں ایمان کے ساتھ عشق اور

کفر سے نفرت بلا استثنا موجود ہے۔

۴۴۶، ۴۴۵

خواہشِ نفسانی سب سے خطرناک بُت

ایمان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

خواہشاتِ نفسانی کی پیروی ہے۔

۱۲۱

داستانِ اصمعی

ایک عرب کی فرمائش پر ذاریات کی آیت
پڑھنا، عرب کا اونٹ کو نحر کر کے تقسیم کر دینا،

۵۷۸، ۵۷۷

پھر کعبہ میں ملاقات اور انجام۔

داستانِ صلح حدیبیہ اور اس کے نتائج

سہیل بن عمرو اور آنحضرتؐ کے درمیان معاہدہ،

فتح کا دروازہ کھل گیا اور دو سال بعد مکہ

۳۲۲ تا ۳۲۴

خون ریزی کے بغیر فتح ہو گیا۔

دخان کیا ہے؟

آنحضرتؐ کی بددعا سے مکہ میں قحط، فاقہ زدوں

کی آنکھوں میں آسمان سیاہ، قیامت کی نشانی،

۳۷، ۳۶

آسمان پر دھواں چھا جاتا۔

دشمنوں پر سخت، دوستوں پر مہربان

اصحابِ پیغمبرؐ کی خصوصیات جو تورات و

۴۰۶ تا ۴۱۷

انجیل میں بھی بیان ہوئیں۔

مسخر کر دیا۔ ہر شخص کا اچھا یا بُرا کام اس کے اپنے لیے ہے۔

۱۰۷ تا ۱۰۱

سچی اور جھوٹی قدریں

مال و دولت، قوم و قبیلہ کے افتخارات کو ختم کرتے ہوئے اللہ نے سچی قدر یعنی قلب

کی پاکیزگی اور تقویٰ کو انتخاب کیا۔

۴۷۳ تا ۴۷۶

شہداء کا بلند مقام

بے حد ایثار و قربانی، فداکاری و جانفشانی کے

مواقع پر قوم کے لیے جان دینا بلند مرتبہ و مقام

۲۳۹ تا ۲۴۲

صالح و بدکار لوگوں کا مزاجینا ایک جیسا نہیں

جو بُرائی کے مرتکب ہوئے کیا وہ ایمان لانے

والوں کے برابر ہیں؟ ہم نے ان کے کان و

دل پر مہر لگا دی، آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔ ایسی

حالت میں اللہ کے سوا کوئی ہدایت نہیں کر سکتا۔

۱۱۶ تا ۱۲۱

صبر و شکیبائی ہر کامیابی کا راز ہے

۵۴۴، ۵۴۵

عجلت نہ کرو، ان کی باتوں پر صبر کرو

دوست مجھ سے زیادہ میرے نزدیک ہے

اللہ کا شہ رگ سے قریب تر ہونا ہماری اس سے

۵۱۲، ۵۱۳

شدید وابستگی کا سرچشمہ ہے۔

دوسروں کو ایمان لانے سے نہ روکو

موسیٰ نے دلائل کے بعد آخری بات کہی کہ خود ایمان

۴۴۴، ۴۴۵

نہیں لاتے تو دوسروں کو تو منع نہ کرو۔

دہریوں کے عقائد

ہماری زندگی و موت اسی دنیا کے لیے ہے ۱۲۵ تا ۱۳۰

زہد اور آخرت کا ذخیرہ

کافر جہنم کے سامنے لانے جائیں گے، دنیا میں

۱۸۸

عیش کر چکے ہو، اب جہنم کا مزہ چکھو۔

سب اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے

اس دن ہر امت خوف و دہشت کی شدت

سے گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی، جو کچھ کرتے

۱۳۲ تا ۱۳۸

تھے آج اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

سب تیرے زیر فرمان طلبگار ہیں

دریاؤں اور زمین و آسمان کے درمیان ہر چیز کو تمہارے لیے

شخصیت کو قتل کرنا شخص کو قتل کرنے سے

۴۶۸ تا ۴۶۹

بڑا گناہ ہے۔

غیبت کا مفہوم کسی کے پیٹھ پیچھے خلاف

۴۶۸

بات کرنا۔

غیبت کا علاج، جس کی غیبت کی اس سے

۴۶۹

معافی چاہنا، اس کے لیے استغفار کرنا۔

استثنائی مواقع، شادی بیاہ کے موقع پر بطور

۴۷۰

مشورہ کسی کے عیوب بیان کرنا غیبت نہیں۔

طوفان و بارش لانے والے بادلوں کی قسم

ہواؤں کی، بادلوں کی، کشتی جو پانی پر چلتی

ہے، فرشتوں کی جو کاموں کی تقسیم کرتے ہیں، کی

قسم جو تجھ کو وعدہ دیا ہے وہ سچ ہے۔ بلاشبہ

۵۵۴ تا ۵۵۷

اعمال کی جزا واقع ہو کر رہے گی۔

فاسقوں کی خبر پر اعتبار نہ کرو

ولید بن عقبہ کی دی ہوئی خبر، خالد بن ولید

۴۴۵ تا ۴۴۷

کی تحقیق، بنی مصطلق کا واقعہ۔

فتحِ مبین

ہم نے تمہارے لیے واضح کامیابی فراہم کر دی ۳۲۱، ۳۲۲

صرف تم ہی نہیں ہو جس کا دشمن

سے مقابلہ ہے

تم سے پہلے اقوام نوح و فرعون و عاد و ثمود وغیرہم

۵۰۲ تا ۵۰۵

نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

صلح حدیبیہ

۶ صہیں مسلمانوں اور قریش مکہ کے درمیان

ایک معاہدہ طے ہوا۔ رسولِ پاک کے حکم سے

مسلمانوں نے سر منڈوائے، اسی جگہ قربانی کے

۳۲۲ تا ۳۲۷

جانور ذبح کیے اور احرام کھول دیے۔

صلح حدیبیہ کی مزید برکات

فتحِ خیبر اور وہاں سے ملنے والے غنائم کی طرف

۳۷۹، ۳۸۰

اشارہ۔

عمرة القضاء

عمرة جو صلح حدیبیہ کے موقع پر ملتوی کرنا پڑا اور

۴۰۳، ۴۰۴

آئندہ سال ادا کیا گیا۔

غیبت بہت بڑا گناہ

ہم نے قرآن کو با برکت رات میں نازل کیا ہے ۲۵،۲۴

قرآن مجید کا شب قدر سے رابطہ

سورہ قدر سے واضح ہے کہ قرآن شب قدر میں نازل ہوا۔ ۳۲،۳۱

قرآنی آیات میں خاندانی رشتے

والدین کا احترام اور اولاد کی تربیت کو خصوصی طور پر بیان کیا گیا۔ ۱۸۱، ۱۸۰

قرآن کی بارگاہی نازل ہو یا تدریجی طور پر

آنحضرت کی تیس سال کی زندگی میں نازل ہوتا رہا، مبارک رات میں نازل کرنے سے مراد نزول کی ابتداء ہے۔ ایک دفعہ ماہ رمضان کی شب قدر میں دوسرا تدریجی نزول ۳۱ تا ۲۵

قسم ہے آسمان کی اور اس کی زیبائشگنوں کی

یقیناً تم مختلف باتوں میں مصروف ہو، جزا کا دن کب ہوگا ۵۶۳ تا ۵۵۸

قوم عاد اور تباہ کن آندھی

قوم عاد کی تباہ کن آندھی کے ذریعہ تباہی جو ریت کے ٹیلے جمع کر دیتی تھی۔ ۱۹۳ تا ۱۹۹

فتحِ مبین کے عظیم نتائج

مشرکین مکہ نے آنحضرت پر تہمتیں لگائیں، انہیں گناہ قرار دیا، حدیبیہ سے ان کا دروازہ بند ہو گیا۔ آئندہ کے لیے تہمت لگانے کی جرأت نہ رہی۔ ۳۲۸ تا ۳۲۲

فتحِ مبین کے مزید نتائج

مومنین و مومنات کا پربہار جنت میں نوید داخلہ اور منافقین کے لیے انذارِ عذاب۔ ۳۳۹ تا ۳۳۳

فرار کی کوئی راہ نہیں

کتنی بہت سی ایسی قومیں ہیں، جنہیں ان سے پہلے ہلاک کیا۔ کیا ان افراد کے لیے موت اور عذابِ الہی سے فرار کی کوئی راہ ہے۔ ۵۲۳ تا ۵۲۹

قرآن کی نظر میں انسان کی خلقت

کا مقصد

جن وانس کو عبادت کے لیے پیدا کیا نہ کر مجھے کھانا کھلائیں۔ روزی میں دیتا ہوں، رحمتِ الہی انسان کی خلقت کا ہدف ہے۔ عبودیت سے اس ہدف کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ ۶۱۳ تا ۶۱۷

قرآن مبارک رات میں نازل ہوا

قوم عاد (مشرکین مکہ) سے زیادہ طاقتور تھی

جب ایسی طاقتور قوم عذابِ خدا کے مقابل نہ ٹھہر سکی تو تم کس میں شمار ہو!

۲۰۰ تا ۲۰۴

قوم لوط کے بے دیکھے شہر نشانِ عبرت ہیں

زشتہ تمہیں کس لیے بھیجا، مجرم قوم پر عذاب کے لیے۔ ہم نے مومنوں کو نکال لیا تھا۔ ایک گھر کے سوا کوئی مومن نہ تھا۔ ان بے دیکھے شہروں کو نشانِ عبرت بنایا۔

۵۸۸ تا ۵۹۳

قیامت کی چرخ سے سب لوگ زندہ ہو جائیں گے

وہ دن جب زمین ان کے اوپر سے پھٹ جائے گی، وہ قبروں سے نکلیں گے۔ یہ جمع کرنا ہمارے لیے آسان ہے۔

۵۴۶ تا ۵۵۲

قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں

کیا یہ لوگ ایمان لانے کے لیے قیامت کے منتظر ہیں، اس کی نشانیاں تو ظاہر ہو چکی ہیں۔

۲۷۴

کائنات کی تخلیق حق کی بنیاد پر ہے

ہم نے تمام آسمان، زمین اور ان کے درمیان ہر شے حق

کے ساتھ پیدا کی

کامیابی کی دو شرطیں

جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر ہمیشہ قائم رہے، انہیں خوف و غم نہ ہوگا۔ وہی محسنین ہیں جو توحید پر اعتقاد اور صبر و استقامت پر عمل کرتے ہیں۔

۱۷۰

گذشتہ لوگوں کی تاریخ و درسِ عبرت

موسیٰ کو فرعون کے پاس بھیجا، اس نے کہا جا دو گر ہے، ہم نے لشکر سمیت پکڑ لیا، عاد کا انجام و ثمود کی سرگذشت بھی نشانی ہے، ان اقوام کو بھی ہلاک کیا۔

۵۹۴ تا ۶۰۱

گمراہ ترین لوگ

بڑا گمراہ وہ ہے جو اللہ کے سوا ایسے کو پکارے جو قیامت تک جواب نہ دے، قیامت میں ان کے یہ معبود دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا انکار کریں گے۔

۱۵۶ تا ۱۵۲

گناہ کی توجیہ کرنا ایک عام بیماری ہے

گناہ کی توجیہ انسان کو گناہ پر اصرار سکھاتی ہے بہت بُری بیماری ہے۔

۳۵۸ تا ۳۶۰

منافقین جہاد کے نام سے بھی ڈرتے ہیں

جہاد کا حکم آئے تو ایسے دیکھتے ہیں جیسے موت
آنے لگے، حالانکہ وہ ان کی اس حالت سے
بہتر ہے۔
۲۸۸ تا ۲۸۲

منافقین قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے!

حق واضح ہونے کے بعد روگردانی، شیطان
نے ان کے اعمال سجا دیے۔ وحی کو ناپسند
کرتے ہیں۔ جس میں خدا خوش ہو اس سے
بیزار ہیں۔ موت کے فرشتے منہ اور پشت
پر ماریں گے اور جان نکال لیں گے۔
۲۹۵ تا ۲۹۲

موت کی حقیقت

ایک طویل نیند، ایک پل، آنحضرتؐ اور آنحضرتؐ
کے ارشادات۔
۵۲۲ تا ۵۲۰
موت حق ہے، متعدد حوالے
۵۲۳، ۵۲۲

مومن حق کا اور کافر باطل کا اتباع کرتے ہیں

کفر کرنے اور اللہ کی راہ سے روکنے والوں
کے اعمال اکارت اور ایمان والے بخشش
دیے جائیں گے۔
۲۲۷ تا ۲۳۱

گنہگار مجھوٹے پرافسوس

اس پر آیاتِ خدا پڑھی جاتی ہیں، وہ غور میں اگڑا
ہوا ہے اس کے لیے عذاب ہے۔ جہنم اس
کے پیچھے لگا ہوا ہے جس سے نجات نہ ہوگی۔
۹۶ تا ۱۰۰

ماضی میں غلاموں کا انجام

غلام کسی ایک کا نہیں پورے معاشرہ کا ہوتا تھا
اور پورا معاشرہ اس پر جی بھر کر ظلم کرتا تھا۔
۲۴۶

معاشرہ میں کامل امن وامان

تمسخر، غیبت، عیب جوئی، بُرے القاب،
بدگمانی اور تجسس سے اجتناب معاشرہ میں
امن وامان کا سبب بنے گا۔
۲۶۳ تا ۲۶۵

منافقین

تیری باتیں کان لگا کر سنتے ہیں، پھر پوچھتے ہیں
ابھی اس شخص نے کیا کہا تھا، ان کے دلوں
پر مٹر لگا دی، سمجھتے نہیں۔
۲۴۳

منافقین انداز گفتگو سے پہچانے جاتے ہیں

اللہ ان کے دلوں کا مرض اور کینہ ظاہر کرے گا،
ہم ضرور آزمائیں گے کہ مجاہد اور صابر کون ہے!
۲۹۷ تا ۳۰۰

مومنوں کے دلوں پر نزول سکینہ

زمین و آسمان کے لشکر اللہ کے لیے ہیں۔ اللہ حکیم و دانایا ہے۔ اس نے مومنوں کے دلوں کو آرام بخشا۔

۳۳۳، ۳۳۷

مومنین اور کفار کا انجام

نیک عمل والوں کو جنت، کافروں کو جہنم ملے گا۔ جو اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہو گیا اس کے برابر ہے جو اعمال بد کو اچھا سمجھتا ہے۔

۲۶۰ تا ۲۶۵

مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں

اگر دو مسلمان فریقوں میں نزاع ہو جائے تو صلح کرادو۔ ظالم کے خلاف مظلوم کا ساتھ دو یہاں تک کہ صلح ہو جائے۔

۴۴۷ تا ۴۵۰

میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں

یہ توحید کی پہلی دعوت نہیں۔ مجھ سے پہلے بہت نبی آئے، وہ سب بشر تھے۔ ہم وہی کچھ جانتے ہیں جو ہمارے رب نے بتایا۔

۱۵۷ تا ۱۶۴

نیکو کار سحر خیزوں کا اجر

پرہیزگار جنت کے باغوں میں جو انہیں مرحمت فرمایا وہ حاصل

کریں گے۔ رات کو کم سوتے ہیں، استغفار کرتے ہیں۔ ان کے اموال میں سائلوں اور محروموں کا حق ہے۔

۵۶۳ تا ۵۶۹

والدین کے حقوق پامال کرنے والے

اولاد کا والدین کو اُف کہنا، قیامت میں اٹھنے کا انکار، والدین کی نافرمانی، جتوں اور انسانوں کی گذشتہ کافر امتیں، دردناک عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

۱۸۲

وہ بہترین قوم ہیں یا قوم تبع

تبع یمن کے بادشاہوں کا لقب اور قوم کا نام۔ واقعات تبع۔

۶۱ تا ۶۶

ہٹ دھرم منکرین اپنے کام میں سرگرداں ہیں

اس بات پر تعجب کیا کہ ڈرانے والا انہی میں سے آیا۔ کیا ہم مٹی میں مل جانے کے بعد پھر زندہ کیے جائیں گے۔

۴۹۳ تا ۴۹۶

ہر جگہ اس کی نشانیاں موجود ہیں

مومنین کے لیے آسمان، زمین اور مخلوق میں بہت سی نشانیاں ہیں، شب و روز کی آمد و رفت آسمانی رزق (پانی) کا نزول صاحبانِ عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔

۹۰ تا ۹۵

یہی موت ہے بس!

مشرکین مکہ کے اعتراضات۔ آنحضرتؐ سے آپ کے جد قحطی بن کلاب کی زندگی کا تقاضا ۶۱ تا ۵۷

مقامات

احساء

۱۹۵ احقاف کے حدود اور بکر کا ایک علاقہ

احقاف

۱۳۷ قوم عاد کا مسکن
۱۹۵ نجد، احساء، حضرت اور عمان سے گھرا ہوا علاقہ
سرزمین عراق میں کلاہ و بابل کا علاقہ، بطور طبری
شام میں ایک پہاڑ کا نام۔
۱۹۶

امرکیہ

۲۳۵ ۱۸۶۵ تک غلامی کا رواج رہا۔

انگلستان

۲۳۵ ۱۸۴۰ تک غلامی کا رواج رہا

بابل

۵۹۳ تا ۱۹۶ جسے احقاف بھی بتایا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کا پہلا وطن۔

ہم ہمیشہ آسمانوں کو وسعت دیتے رہتے ہیں

ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا اور ہمیشہ اس کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔ ہم کیا ہی اچھا پھیلانے والے ہیں۔
۶۰۸ تا ۶۰۲

ہولناک دُھواں آسمان پر چھپا جائے گا

عذابِ الہی کے اظہار میں آسمان پر دُھواں ہم سے عذابِ دُور کر، عذاب کا موقوف ہونا، پھر سخت دن کا عذاب۔
۳۶ تا ۳۳

یوم الفصل

قیامت کا دن جب کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا، مگر جس پر رحمت ہو۔
۶۹ تا ۶۷

یہ آیت بنی اُمیہ کی طرف کیسے تحریف کی گئی!

۱۸۷ تا ۱۸۷ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کا حاکم مدینہ مروان کو لعنتی قرار دینا۔

یہ بھی عذابِ الہی میں حصہ دار ہیں

جنہوں نے ظلم کیا ان کے لیے بھی ان کے ساتھیوں جیسا عذاب ہے، اس بنا پر جلدی نہ کریں۔ وائے ہے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے۔
۶۲۴ تا ۶۲۷

۵۶	<u>سینا</u> مصر سے ملحق ایک وسیع صحرا	۱۹۶	<u>برسلز</u> ۱۸۹۰ء میں یہاں کانفرنس ہوئی، غلامی کو ختم کیا گیا
۱۹۶	<u>شام</u> مشہور ملک جہاں بقول طبری احقاف نام کا ایک پہاڑ ہے۔	۷۱	<u>تہامہ</u> عرب علاقہ جہاں زقوم کا پودا لگتا ہے
۵۹۳، ۱۹۶	<u>عراق</u> مشہور ملک حضرت ابراہیمؑ کا پہلا وطن	۵۶	<u>تیبہ</u> وہ قطعہ زمین جہاں نبی اسرائیل بچھکتے رہے
۳۲۲	<u>عسقلان</u> مکہ کے قریب ایک مقام	۵۹۳	<u>جرون</u> سدرم کے قریب حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغ کا مرکز
۱۹۵	<u>عمان</u> احقاف کے حدودِ اربعہ کا ایک علاقہ	۳۱۷	<u>حدیبیہ</u> مکہ سے بیس کلومیٹر دور ایک بستی کا نام
۲۴۵	<u>فرانس</u> ۱۸۴۸ء تک غلامی کا رواج رہا	۱۹۵	<u>حضرموت</u> احقاف کے حدودِ اربعہ کا ایک علاقہ
۱۹۶	<u>کلاہ</u> اسے احقاف بھی بتایا گیا ہے	۳۱۷	<u>ذی الحلیفہ</u> مدینہ کے قریب ایک مقام جہاں ۷۰ سالہ میں مسلمانوں نے آنحضرتؐ کی معیت میں عمرہ کا احترام باندھا۔
۳۱۷	<u>مسجد الحرام</u> خانہ کعبہ کا ایک نام (مقام محترم)	۵۹۱	<u>سدرم</u> قوم لوط کا ایک شہر، ایک آبادی
۹۳	<u>مشر بہ ام ابراہیم</u> مدینہ کا ایک مقام		

یہمامہ

۳۶۶

ایک جنگی مقام

یہمن

۶۲

یہاں ایک درخشندہ تمدن قوم تھی جس کے
طاقتور بادشاہ تہج کہلاتے تھے۔
یہاں کے جنات کا ایک گروہ آنحضرتؐ سے
قرآن سن کر ایمان لایا۔

۲۰۸

‡

موتہ

یہاں ایک مشہور جنگ (سریہ) لڑی گئی۔
حضرت جعفر طیار کی شہادت گاہ

۳۶۵

نسجد

۱۹۵

احقاف کے حدود اربعہ کا ایک علاقہ

نصیبین

۲۰۸

یہاں کے جنات نے آنحضرتؐ سے قرآن پاک سنا

ہالینڈ

۲۴۵

۱۸۶۳ء تک غلامی کا رواج تھا

مَطْبُوعَاتِ مِصْبَاحِ الْقُرْآنِ

۲۵۰ روپے	ہدیہ	از مولانا فرمان علیؒ	قرآن پاک (معربی) رنگین
۵۰ روپے	ہدیہ	ترجمہ مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ	قرآن پاک (معربی) سفید کاغذ
۲۰۰ روپے	ہدیہ	" " " " " "	قرآن پاک مترجم
۱۲۵ روپے (فی جلد)	ہدیہ	" " " " " "	تفسیر نمونہ (۲۷ جلدیں)
۱۲۵ روپے	ہدیہ	" " " " " "	قرآن کا دائمی منشور
۱۲۵ روپے	ہدیہ	" " " " " "	تفسیر پیام قرآن
۲۴۰ روپے (فی سیٹ)	ہدیہ	" " " " " "	ہمارے آئمہ (۱۲ کتابوں کا سیٹ)
۱۳۰ روپے	ہدیہ	" " " " " "	ولایت فقیہ (جلد اول)
۱۵۰ روپے	ہدیہ	" " " " " "	ولایت فقیہ (جلد دوم)
۱۲۵ روپے (فی جلد)	ہدیہ	علامہ سید علی نقی النقیؒ	تفسیر فصل الخطاب (۷ جلدیں)
۲۵ روپے	ہدیہ	" " " " " "	تحریف قرآن کی حقیقت
۱۰ روپے	ہدیہ	" " " " " "	صلح اور جنگ
۲۰ روپے	ہدیہ	" " " " " "	مذہب اور عقل
۳۰ روپے	ہدیہ	" " " " " "	رہنمایان اسلام
۲۵ روپے	ہدیہ	" " " " " "	اسوۂ حسینی
۲۰ روپے	ہدیہ	" " " " " "	اثبات پردہ
۱۵ روپے	ہدیہ	" " " " " "	معارض انسانیت
۲۵ روپے	ہدیہ	" " " " " "	زندگی کا حکیمانہ تصور
۳۰۰ روپے	ہدیہ	ترجمہ و حواشی مولانا ذیشان حیدر جوادی	انوار القرآن
۲۵۰ روپے	ہدیہ	ترجمہ مولانا محمد علی فاضل	میزان الحکمت (جلد اول)
۱۵۰ روپے	ہدیہ	ڈاکٹر محمود رامیار	تاریخ قرآن

قرآن سنٹر ۲۴۲ الفضل مارکیٹ - اردو بازار لاہور

فون: ۴۳۱۲۳۱۱

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان